ماہر القادری

رضوی برادرز لمیٹڈ

کراچی —— لاہور —— ڈھاکہ

ترتیب

قیمت فی پرچہ:- ۶۲ پیسے — پبلشر:- ماہر القادری — چندہ سالانہ:- ۷ روپے

مقام اشاعت:- دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

باہتمام مستفیض احمد صدیقی پبلشر ماہر القادری نے انٹرنیشنل پریس کراچی میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقش اوّل

کفر، شرک، ارتداد، فسق، نفاق کی اصطلاحیں ملاؤں اور مولویوں کی ایجاد کی ہوئی نہیں ہیں، قرآن کریم اور احادیث رسولؐ میں یہ اصطلاحیں بہ تکرار ملتی ہیں' یہ الفاظ اور اصطلاحیں مفروضہ بھی نہیں ہیں کہ ان کا وجود صرف خیالی اور ذہنی ہو' اور محسوس و مشہود طور پر کہیں نہ پائی جائیں۔

کوئی شک نہیں مسلمانوں میں بہت سے فرقے پائے جاتے ہیں! ان متعدد فرقوں کا وجود ہی "اختلاف" کی دلیل ہے' یہ فرقے ایک دوسرے کو گمراہ سمجھنے کے باوجود، مسلمانوں ہی کے فرقے شمار کئے جاتے ہیں، ان کے درمیان بعض عقائد کی بحث میں ایک دوسرے کے درمیان تکفیر کی گرم بازاری بھی رہی ہے، مگر مجموعی طور پر یہ فرقے اسلام ہی سے منسوب ہیں۔

جسے ملتِ اسلامیہ کہا جاتا ہے وہ مسلمانوں کے انہی مختلف فرقوں کے مجموعہ کا نام ہے' اس لئے ملت کی شیرازہ بندی کی خاطر اس کی ضرورت ہے کہ یہ فرقے اپنے تمام اختلافات کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ رواداری کا سلوک کریں اور دینی بھائیوں کی طرح مل جل کر رہیں!

مسلمانوں کے ان فرقوں میں سنی اور شیعہ سب سے نمایاں اور تعداد کے لحاظ سے سب سے بڑے فرقے ہیں' ان دونوں فرقوں کے اختلافات بھی شدید ہیں۔ یہاں تک کہ بعض عقائد کی پیچیدگی اور شدت تو "کفر" کے قریب تک پہونچ جاتی ہے، مگر ان کے درمیان بنیادی عقائد قدر مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہی اشتراکِ عقائد ان فرقوں کی دینی اخوت کا سبب قرار پاتا ہے۔ اس لئے سنیوں اور شیعوں کے درمیان بیاہ شادی بھی ہوتی رہی ہے، جو اس کی دلیل ہے کہ ان دونوں فرقوں کے لوگ ایک دوسرے کو کافر نہیں سمجھتے!

اس دنیا میں دو ایسے مذاہب بھی پائے جاتے ہیں جن کے ماننے والوں کے نام مسلمانوں جیسے ہیں مگر ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے! بہائی فرقہ اس اعتبار سے قابلِ تعریف ہے کہ وہ اپنے کو مسلمان کہہ کر دنیا کو دھوکا نہیں دیتا، بہاء اللہ اُن کا نبی ہے۔ مظہرِ الٰہی اور داعیِ حق ہے' اس لئے بہائی فرقہ اسلام سے اپنا جوڑ نہیں ملاتا، اس فرقہ کے اکابر نے کھل کر اعلان کیا ہے کہ ہمارا اسلام سے کوئی تعلق اور واسطہ نہیں ہے" بہائیت" اسلام سے ایک جداگانہ مذہب ہے!

اس کے مقابلہ میں قادیانی فرقہ خود کو مسلمان کہتا ہے اور اسلام کی دعوت کا مدعی ہے حالانکہ مرزا غلام احمد قادیانی نبوت کا دعویٰ کرتے ہی مرتد ہو گیا۔ یہی ارتداد قادیانی مذہب کی بنیاد ہے' یعنی امت مسلمہ اور مسلمانوں کے تمام فرقوں کے نزدیک جو شخص کافر اور مرتد ہے وہ اس مذہب کا مجدد، نبی اور بانی مبانی ہے! اس لئے قادیانی فرقہ بہائی مذہب کی طرح جداگانہ مذہب ہے، اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے

مسلمانوں کے تمام فرقے قادیانیوں کے کفروارتداد پر متفق ہیں اور اس بارے میں کوئی شخص بہ صحت ہوش وحواس یہ نہیں کہہ سکتا کہ پوری ملت اسلامیہ کو قادیانیت کے بارے میں مغالطہ ہوگیا ہے یا قادیانیت کے "کفر" پر "اجماع" میں تمام مسلمان غلط فہمی کا شکار اور گمراہی میں مبتلا ہوگئے ہیں ۔ قادیانیوں کے کفر اور دینِ اسلام اور ملتِ اسلامیہ سے اُن کے خارج ہونے پر مسلمانوں کے تمام فرقوں کا اتفاق اتحاد اور اجماع دین کی حقانیت کی روشن ترین صداقت ہے ۔

اس بات کو عقل کسی طرح باور نہیں کرسکتی کہ ۶۵ کروڑ مسلمانوں کی مت ماری گئی ہے اُن کی عقل خبط اور ہوش وحواس مسلوب ہوگئے ہیں کہ وہ مرزا غلام احمد کی مجددیت ، موعودیت اور نبوت کو نہ پہچان سکے ، بس ساری دنیا میں تین چار لاکھ قادیانی اہلِ نظر اور صاحبِ بصیرت ہیں اور صداقت ، حقانیت اور ایمان اسی فرقہ میں محدود ہے ، اس کے علاوہ ساری اسلامی دنیا جہالت میں مبتلا ہے! یہ بات ہم اپنی طرف سے نہیں کہہ رہے ہیں ، قادیانیوں کا لٹریچر اس کی شہادت دیتا ہے کہ وہ تمام مسلمانوں کو بے دین سمجھ کر اپنے مسلکِ ضلال کی طرف دعوت دیتے ہیں ۔

"ختم نبوت" کا مسئلہ فقہ یا علم کلام کا کوئی فروعی مسئلہ نہیں ہے کہ جس کی مختلف پیرایوں میں تعبیر وتاویل کی جاسکتی ہے یا جس کے ماننے یا نہ ماننے کا ایمان واسلام پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا "ختم نبوت" ایمان واسلام کا وہ بنیادی عقیدہ ہے کہ جس کی کوئی تاویل نہیں کی جاسکتی ، جس کے بارے میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں ! امام الاولین والآخرین حضرت سیدنا محمد ابن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی قسم کا کوئی نیا نبی دنیا میں نہیں آسکتا ، جو کوئی بھی حضورؐ کے بعد نبوت کا دعویٰ کرے گا ، وہ کافر قرار پائے گا اور اس کفر پر جو مذہب اور فرقہ کی بنیاد ہوگی ، وہ مذہب اور فرقہ مسلمانوں کا فرقہ نہیں کافروں اور بے دینوں کا فرقہ ہوگا ۔

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے بڑھ کر کتاب وسنت ، نبوت اور ختم نبوت کے حقائق کا جاننے والا اور کون ہوسکتا ہے ، ان نفوسِ قدسیہ کے زمانے میں جس جاہل وخبیث نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا ، اس کے وجودِ ناسود کو دنیا سے مٹانے کے لیے ان کی تلواریں حرکت میں آگئیں ، اگر کسی قسم کے بھی ظلی ، بروزی ، طفیلی ، یا "امتی نبی" آنے کا امکان ہوتا یا کتاب وسنت میں کوئی خفیف سا بھی اشارہ ملتا تو صحابہ کرام نبوت کے ان دعویٰ کرنے والوں کے حالات کی سب سے پہلے تحقیق کرتے ، ظاہر ہے نبی کے ماتھے پہ تو "نبی اور رسول" نہیں لکھا ہوتا اور نہ آسمانوں سے اُس کی شہادت وصداقت کی آوازیں آتی ہیں ، نبی تو اپنے پیام کی صداقت اور کردار کی عصمت وپاکیزگی سے پہچانا جاتا ہے! صحابہ کرام نے ان متنبیّوں کے ساتھ جدال وقتال کا سلوک کیا ، جس کے وہ مستحق تھے انہوں نے نبوت کے کسی مدعی سے نبوت کی صداقت کا ثبوت یا معجزہ طلب نہیں فرمایا نہ اُن کے حالات کا پتہ لگایا بلکہ نبوت کے دعوے کی خبر سُنتے ہی اُن کا ذہن تیغ وسناں کے علاوہ اور کسی طرف منتقل ہی نہیں ہوا ، کہ تلوار ہی جھوٹے نبیوں کا فیصلہ کرسکتی ہے ! صحابہ کرام کا یہ اجماع اس کی دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو کوئی بھی کسی قسم کی نبوت کا دعویٰ کرے گا وہ لازمی طور پر سو فی صدی جھوٹا ، کذاب ، خداع اور مفتری سمجھا جائے گا ۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر خدا کی رحمت ہو ، کتنی سچی بات آپ نے فرمائی ہے کہ جو کوئی نبوت کا دعویٰ کرے اور اُس مدعیٔ نبوت سے جو مسلمان ثبوت طلب کرے وہ "کافر" ہے ! حضرتِ امام کا یہ قول ہر جہت سے روشن اور واضح ہے — یہ کہ جو مسلمان کسی مدعیٔ نبوت سے نبوت یا دلیل طلب کرتا ہے ، وہ ختم نبوت پر یا تو سرے سے ایمان ہی نہیں رکھتا یا اس بارے میں مذبذب ہے ، اس لیے وہ کفر اپنے اندر چھپائے ہوتے ہے !

کسی مسلمان کی پچھلی زندگی کیسی ہی اچھی کیوں نہ رہی ہو، وہ کتنا ہی بڑا عالم اور فاضل کیوں نہ ہو، نبوت کا دعویٰ کرنے کے بعد وہ کافر، مرتد اور دین سے خارج ہو جاتا ہے، اور کافر و مرتد کا کوئی نیک عمل آخرت میں اس کے لئے فائدہ بخش اور سود مند نہیں ہوتا جو کوئی فرد یا جماعت اس مرتد و کافر مدعی نبی کو مجدد، مصلح یا نبی مانتی ہے، تو وہ فرد بھی کافر ہے اور وہ جماعت بھی کافر ہے، ان کا نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ، کفر و ارتداد کی حالت میں ذرہ برابر کوئی وقعت نہیں رکھتا، یہ تمام اعمال قیامت کے دن ان کے منہ پہ مار دئے جائیں گے، اللہ تعالیٰ ارکانِ دین کی پابندی کا مطالبہ مسلمانوں اور ایمان والوں سے کرتا ہے، کافروں اور مرتدوں سے نہیں کرتا!

قادیانی اپنی حماقت کے سبب اپنے کو مشقت میں ڈالے ہوئے ہیں اُن کا کوئی عملِ خیر آخرت میں اُن کے کام نہیں آسکتا — اب رہی ان کی تبلیغ تو یہ لوگ اسلام کی نہیں بلکہ "قادیانیت" کی دعوت دیتے ہیں اور اپنے خود ساختہ مسلک کی تبلیغ کرتے ہیں! ان کو جو کوئی تبلیغ اسلام سمجھتا ہے وہ نہ تو اسلام سے واقف ہے اور نہ قادیانیت کا اُسے پتہ ہے! "قرآن کریم" کی طرف بھی ان کی دعوت، مرزا غلام احمد کی نبوت منوانے کے لئے ہے کیونکہ وہ تمام قرآنی آیتیں —— انا اعطینٰک الکوثر —— سے لیکر وما ارسلنٰک الا رحمۃ للعٰلمین —— تک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں نازل ہوئی ہیں مرزا غلام احمد قادیانی نے ان تمام آیتوں کا مصداق اپنی ذات کو ٹھیرایا ہے، یہاں تک کہ خود کو "احمد" اور "محمد" تک کہا ہے، اس صورت میں مرزائے قادیان، قرآنِ کریم کا معلم و مفسر نہیں، "محرف" ہے۔

جو کوئی غیر مسلم قادیانیت کو قبول کرتا ہے تو عقیدے کی اس تبدیلی کے باوجود وہ مسلم اور مومن نہیں ہو جاتا، اُس نے قادیانیت قبول کی ہے، اسلام قبول نہیں کیا، اُس کے اس فکری انقلاب نے قادیانیوں میں ایک نئے قادیانی کا اضافہ کیا ہے، ملّتِ اسلامیہ کی تعداد میں اضافہ نہیں ہوا!

صاحب قاب قوسین، محبوب رب المشرقین والمغربین، شفیع المذنبین، خاتم النبیین، رحمۃ للعٰلمین حضرت سیدنا محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایسی نبوت کا دعویٰ جس میں "امر و نہی" بھی ہے، یعنی ایک صاحب شریعت نبی کے —— منظر عام پر آنے کے اس کے علاوہ اور کیا معنی لیئے جاسکتے ہیں کہ دعویٰ کرنے والا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مد مقابل اور حریف ہے اس صورت میں مرزا غلام احمد کا حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی مدح و توصیف کرنا، ذاتِ رسالت مآب کے ساتھ سفاکانہ مذاق نہیں تو اور کیا ہے، اس منافقانہ نعت و منقبت میں یہ چال بھی چھپی ہوئی ہے کہ اس طرح مسلمانوں میں کشش پیدا ہو گی کہ یہ شخص تو بڑا عاشقِ رسولؐ ہے! حالانکہ عشقِ رسولؐ کے ساتھ نبوت کا دعویٰ کھلا ہوا تضاد اور نفاق بلکہ عداوت ہے۔

مرزا غلام احمد نے دو ٹوک الفاظ میں اپنی نبوت اور ایسی نبوت کا دعویٰ کیا جس میں امر و نہی (شریعت) بھی ہے، مرزا کے نام کے ساتھ نبیوں اور رسولوں کے ناموں کی طرح "علیہ السلام" لکھا اور بولا جاتا ہے، مرزا کی شریک زندگی کا لقب "ام المومنین" مرزا کے ساتھی صحابہ اور رضی اللہ عنہم! مرزا کی نبوت کو نہ ماننے والا کافر! یہاں تک کہ غیر قادیانیوں کے بچے بھی کافروں کے زمرے میں داخل ہیں، غیر قادیانیوں کے جنازے کی نماز تک یہ لوگ نہیں پڑھتے (یہ بات تو مشہور عوام ہے اور اس کے سینکڑوں عینی شاہد موجود ہیں کہ سر ظفر اللہ نے قائداعظم کے جنازے کی نماز نہیں پڑھی) غرض جدید نبوت کا مستقل انسٹی ٹیوشن اپنے تمام لوازم کے ساتھ قائم ہے، نبوت کا یہ سوانگ رچا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "خاتم النبیین" کہنا کس قدر مکروہ نفاق، کیسا گمراہ کن

ریب اور کتنی ضلالت آمیز چالبازی ہے ۔

ظلی، بروزی یا طفیلی نبوت دین کی کوئی اصطلاح ہی سرے سے نہیں ہے، نبوت کی یہ اقسام ہی لغو اور بے معنی ہیں، اب ہے مں صوفیا رکے اقوال، جن میں وہ محتاط نہیں رہے، قرآن کا دین میں ذرہ برابر کوئی درجہ نہیں ہے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ، ذات گرامی پر نبوت ختم ہو چکی، اب قیامت تک کسی قسم کا بھی کوئی جدید نبی نہیں آئے گا، اس مسلمہ عقیدہ کو اگر کسی صوفی، مجدد شیخ طریقت کا کوئی قول مجروح کرتا ہے تو اُسے رد کر دیا جائے گا، اس قسم کے اقوال "شطحیات" ہیں اور "شطحیات" سے دلیل انا اور کسی عقیدہ کا اثبات کرنا، دین سے جہالت و بے خبری کی دلیل ہے، اُس نبوت کے افلاس کی بھلا کوئی انتہا ہے، جس کے اثبات ے لئے صوفیا رکے شطحیات سے دلیل لائی جاتی ہے! کسی صوفی کا قول و عمل دین میں حجت نہیں ہے، دین کے مسلمہ اصول و قوانین ے مقابلہ میں کسی پیر اور صوفی کا قول ذرہ برابر لائق اعتنا نہیں ہے ـــــ پھر کسی صوفی نے "نبوت" کا دعویٰ نہیں کیا، کسی صوفی کی ولی امت نہیں ہے، امت میں کسی صوفی کی یہ دینی حیثیت نہیں ہے کہ اُس کے کسی دعوے کا انکار "کفر" سمجھا جائے، اور اُس کا ماننا یمان کا لازمی تقاضا ہو، کسی بڑے سے بڑے صوفی اور شیخ طریقت کے نام کے ساتھ "علیہ السلام" نہیں لکھا جاتا۔ اُمت نے کسی صوفی و نبی کا درجہ نہیں دیا اور رسول کا ہمسر اور مماثل نہیں سمجھا ۔

یہ جو قادیانیوں کے رسالوں، اخباروں اور کتابوں میں مرزا غلام احمد کی پیش گوئیاں درج کی جاتی ہیں، اور اُن کو درست ابت کرنے کے لئے عجیب غریب دلیلیں دی جاتی ہیں، ان کا کوئی حاصل نہیں ہے! بعض اوقات پیش گوئیاں تو کاہنوں، نجومیوں اور ندت سادھوؤں کی بھی پوری ہو جاتی ہیں! بہائی مذہب کے بانی بہاء اللہ کی بعض پیش گوئیاں اتفاق سے درست ثابت ہوئیں ـــــ شلاً اس نے پیش گوئی کی تھی کہ نپولین سوم کی حکومت ختم ہو جائے گی، چنانچہ چار سال بعد یہ پیش گوئی پوری ہو گئی (المذاہب الاسلامیہ) ـــ تو کیا بعض پیش گوئیوں کے درست ثابت ہونے کو معیار صداقت اور دلیل نبوت سمجھ کر، مسلمان "بہائیت" کو قبول کر لیں اور ہاء اللہ کی نبوت پر ایمان لے آئیں۔

صورت حال یہ ہے کہ مرزا غلام احمد نبوت کا دعویٰ کرنے کے بعد مُرتد اور دائرہ اسلام سے خارج ہو گیا، اس لئے اُس کی زندگی شاعری، تفسیر، فقہ دانی، پیش گوئی اور حکمت و دانائی کے اقوال کی دین میں کوئی حیثیت ہی سرے سے باقی نہیں رہتی، اور نہ یہ باتیں جدید نبوت کے لئے دلیل و ثبوت بن سکتی ہیں! اگر بہ فرض محال مرزا کی سو فی صدی پیش گوئیاں بھی درست ثابت ہو گئی ہوں، تو بھی اُس کا کفر و ارتداد ایمان و اسلام نہیں بن سکتا ۔

حقائق جہاں تک امت کے اختلاف، فرقہ واریت اور مذہبی کشمکش کا تعلق ہے، تو جس دن مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنی نبوت کا اعلان کیا، نفرت و عداوت، اختلاف، فرقہ واریت اور مذہبی کشمکش کی اُسی دن بنیاد پڑ گئی! قادیانیت کا وجود ہی اپنی جگہ اختلاف و فرقہ واریت کا سب سے بڑا فتنہ ہے! جو کوئی اس نہج پر سوچتا ہے وہ غلط سوچتا ہے کہ قادیانیوں کی تردید سے پاکستان کی وحدت کو صدمہ پہونچتا ہے اور پاکستان میں انتشار پھیلانے کے لئے یہ بحث چھیڑی جا رہی ہے ـــــ حالانکہ انگریزوں کے دور حکومت میں مسلمانوں نے کسی فترت کے بغیر مسلسل قادیانیت کی تردید کی ہے، اور جھوٹی نبوت کی تکذیب کو مسلمانوں نے ایمان و اسلام کا لازمی تقاضا سمجھا ہے، جس دل میں مرزائے قادیان کے لئے تل کے برابر بھی گنجائش یا کوئی نرم گوشہ ہے،

کی مطلقاً پریشان کی نیر منانی چاہئے ! اب جب قادیانیوں پر کوئی قدغن نہیں ہے، اُن کے اخبار، رسالے اور کتابیں دھڑا دھڑ شائع ہورہی ہیں، جن میں تحریف قرآن سے لے کر اہانت نبوت تک کی خباثتیں پائی جاتی ہیں، تو مسلمان کس طرح خاموش رہ سکتے ہیں اور اُن کی جانب سے جو تردید ہوتی ہے، اُس پر انتشار کی پھبتی جو کوئی کستا ہے، وہ پاکستان کی سالمیت کی آڑ میں درحاصل قادیانیت کی پشت پناہی کرتا ہے !

امت مسلمہ میں ایک شخص نبوت کا دعویٰ کرتا ہے، جو لوگ اُس کی نبوت پر ایمان لے آتے ہیں، اُن کی باقاعدہ جماعت بلکہ اُمت قائم ہو جاتی ہے، نبوت کے اس دعوے کی تائید اور تبلیغ کے لئے اخبار، رسالے، پمفلٹ اور کتابیں چھپتی ہیں —— خدا کے لئے انصاف سے بتایئے کہ مسلمان اس صورت میں کیا کریں ! اُن کے لئے دو ہی صورتیں ممکن ہیں یا تو وہ اُس مدعیٔ نبوت پر ایمان لا کر اُس کی امت میں شامل ہو جائیں یا پھر اُس نبی کے دعوے کی تردید کریں ! جب کسی نبی کے ماننے سے انکار کیا جائے گا تو لازمی طور پر اُس کے لئے تکریم و احترام کے الفاظ استعمال نہیں کئے جا سکتے، اس نبی کو جھوٹا اور افترا پرداز ہی کہا جائے گا کہ اسی قسم کے القاب دآداب کا وہ مدعیٔ نبوت مستحق ہے!

نبیٔ کاذب کی تردید میں اُس کی زندگی بھی ضرور زیر بحث آئے گی، مسلمان اہل قلم اور ارباب فکر تفصیل سے بتائیں گے انہیں بتانا ہی چاہئے اور یہ فرض وہ ادا بھی کرتے رہے ہیں —— کہ اس مدعیٔ نبوت نے انگریزوں کی نیاز مندی اور ہوا خواہی کا حق ادا کیا تھا، ملکہ وکٹوریہ کی بارگاہ میں اُس نے عاجزانہ عرضیاں گزرانی تھیں، یہ شخص اوائل شباب میں مراق، مرگی اور ضعف باہ کا مریض رہا ہے، اس کی کتنی ہی پیش گوئیاں خود اُس کی زندگی ہی میں غلط ثابت ہوئی ہیں، اس کی گھریلو زندگی اس قدر ٹھاٹ باٹ کی تھی کہ بعض عقیدت مند عورتوں نے خانگی تکلفات کو دیکھ کر اپنے اس پیشوا کو امداد دینے سے ہاتھ کھینچ لیا، اس مدعی نبوت کے مضامین اور شاعری میں زبان و بیان کی غلطیاں پائی جاتی ہیں اس کے دعووں میں حد درجہ کا تضاد ملتا ہے جس عقیدہ (دعوئ نبوت) کو وہ ایک زمانے میں کفر بتاتا رہا ہے بعد میں جا کر اُسی کفریہ دعوے کو لے کر وہ خود اُٹھتا ہے اور وہی کفریہ عقیدہ اُس کی نبوت اور اُمت کی اساس قرار پاتا ہے، قرآن اور احادیث میں اُس مدعی نبوت نے صریحاً معنوی تحریفیں کی ہیں اور خود کو مسیح موعود ثابت کرنے کے لئے اُس سے ایسی ایسی حرکتیں سرزد ہوتی ہیں کہ ایک معقول آدمی سے ان حرکتوں کی توقع نہیں کی جا سکتی —— یہ بھی بتایا جائے گا کہ اس شخص نے اپنے نہ ماننے والوں کے لئے "کنجریوں کی اولاد" جیسی ناشائستہ زبان استعمال کی ہے اور حضرت مریم علیہا السلام کی توہین اس جذبہ کے تحت کی ہے کہ مسلمان ان کے فرزند (حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام) کو مسیح موعود کیوں مانتے ہیں !

یہ عجیب منطق ہے کہ قادیانیوں کے لٹریچر سے کروڑوں مسلمانوں کی جو دل آزاری ہوتی ہے اُس سے ملک میں کسی قسم کا کوئی انتشار نہیں پھیلتا، انتشار دو ڈھائی لاکھ قادیانیوں کی برہمی اور خفگی سے پھیلتا ہے —— مسلمانوں کو اس کا پورا حق حاصل ہے کہ "ختم نبوت" کے عقیدے کی پوری قوت کے ساتھ وہ مدافعت بھی کریں اور جھوٹی نبوت کی تردید و تکذیب کا فرض بھی انجام دیں، ہم مسلمان حضور ختمی مرتبت امی و ابی لہ الفداء کی محبت اور مرزا غلام احمد قادیانی کی دشمنی اور نفرت پر اپنی زندگی کا خاتمہ چاہتے ہیں ! ہم تلوار کی دھار پر گولیوں کی بوچھاڑ میں اور پھانسی کے تختہ پر اس کا اعلان کرنے کے لئے بحمد اللہ خود کو آمادہ پاتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم کر دی گئی اور مرزا غلام احمد کی نبوت خود ساختہ اور جھوٹی نبوت ہے۔

مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے جس کا خلاصہ اور مفہوم یہ ہے —— کہ میرا کام مسلمانوں کے ملکوں میں

میں نہیں چل سکتا، یعنی قادیانیت اسلامی حکومتوں میں نہیں، لادینی اور کافر حکومتوں میں برگ وبار لا سکتی ہے ــــ اپنے "نبی" (؟) کے اس ارشاد کی تعمیل میں قادیانی کسی ملک میں بھی اسلامی نظامِ حکومت کو گوارا نہیں کر سکتے، ان کا جہاں تک بس چلے گا یہ لوگ مسلمانوں کے کسی ملک میں بھی اسلامی نظام قائم نہ ہونے دیں گے، اقامتِ دین کی راہ میں یہ لوگ طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالیں گے، ان کی وفاداری تو غیر مسلم فرمانرواؤں یا اُن اربابِ اقتدار کے لئے غیر مشروط ہوگی جو اسلامی نظام سے گریز کے بہانے تلاش کرتے ہیں۔

یہ کیا؟ اور کیوں؟

ہم قطعی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ پاکستان کے موجودہ اربابِ اقتدار" قادیانیوں" کے مذہب کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟ لیکن ہمارا دل یہی کہتا ہے اور یہی چاہتا بھی ہے کہ اُن کا عقیدہ جمہور امت ہی کے عقیدہ کے مطابق ہوگا ــــ کہ "قادیانیت" کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے، یہ مسلمانوں کا فرقہ بھی نہیں ہے! اس کے نبی کے دعوے کو ہم سچا نہیں سمجھتے! ــــ مگر اس کو کیا کیجئے کہ دو چیزیں ایسی ظہور میں آئی ہیں، جنہوں نے مسلمانوں کو بڑا دکھ پہونچایا ہے ــــ پہلی خبر یہ کہ "تبلیغِ اسلام" کے نام پر قادیانیوں کو لاکھوں روپیہ کا زرمبادلہ دیا گیا۔ یہ کوتاہی اگر کسی غلط فہمی اور ناواقفیت کی بنا پر ہوئی ہے تو اس کا پھر کبھی اعادہ نہ ہونا چاہئے اور اگر دانستہ ایسا کیا گیا ہے تو پھر اس غلطی اور کوتاہی پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے! اسی قسم کی غلطیوں پر تو غضبِ الٰہی جوش میں آتا ہے!

قادیانی چونکہ مسلمان نہیں ہیں اس لئے حدودِ حرم میں وہ داخل نہیں ہو سکتے، اور نہ اُن کو داخل ہونے دینا چاہئے۔ بالکل اسی طرح جس طرح سکھوں، ہندوؤں، یہودیوں اور عیسائیوں کو حدودِ حرم میں داخلہ کی اجازت نہیں دی جا سکتی! ترکوں کے زمانہ سے لے کر شاہ سعود کے دورِ حکومت تک قادیانیوں کو حج بیت اللہ کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ شاہ ابن سعود کے دور میں ایسا ہوا کہ ہندوستان سے کسی قادیانی کے جدہ پہونچنے کی اطلاع ملی، تو اُس قادیانی کو جدہ سے بالا بالا ہی واپس کر دیا گیا۔ مگر دو سال سے ایسا ہو رہا ہے کہ پاکستان سے قادیانی حج کے لئے جا رہے ہیں! آخر اس غفلت کا ذمہ دار کون ہے؟ ان لوگوں کو حدودِ حرم میں داخلہ کی اجازت کس نے دی۔ اور کیوں دی؟ ان کا "مسلمان" ہونا کس نے تسلیم کیا اور کس بنیاد پر کیا؟ ایسے مسائل و معاملات میں رواداری، وسعتِ ظرف اور چشم پوشی اختیار نہیں کی جاتی، غیرتِ نبوت اس قسم کی رواداری کو برداشت نہیں کر سکتی! ہم سب کو ایک نہ ایک دن مرنا اور خدا کے سامنے جواب دہی کے لئے حاضر ہونا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن کو قیامت کے دن شفاعت کی اجازت دی جائیگی اور لواء الحمد اور مقامِ محمود عطا ہوگا، اللہ تعالیٰ کے حضور آپ اپنے اُمتیوں کے مقابلے میں استغاثہ کریں گے، جنہوں نے حضورؐ کے "حریف نبی کاذب" (علیہ ما علیہ) کے اُمتیوں سے مسلمانوں جیسا معاملہ کیا تھا؟

ماہر القادری
۲۲ مارچ ۶۸ء

مُلّا واحدی

تأثرات

میں کراچی آکر پانچ سال ایک جگہ رہا، بزنس لائنز میں، اور دس سال دوسری جگہ، جیکب لائنز میں، اب پانچ سوا پانچ سال سے تیسری جگہ ہوں، نارتھ ناظم آباد میں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ خانہ بدوشی کی زندگی ختم فرمائے اور مجھے یہاں سے سیدھا اپنے ہی پاس بلائے، چوتھی رہائش گاہ نہ دکھلائے۔ فَغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا۔ دلّی میں باسٹھ برس کی عمر تک ایک مکان میں رہا تھا۔

موجودہ رہائش گاہ شہر سے آٹھ نو میل باہر ہے۔ دلّی میں آدمیوں سے اتنا گھرا رہتا تھا کہ بعض اوقات بولا اُٹھتا تھا۔ یہاں اتنی تنہائی ہے کہ بھولا بسرا کوئی آنکلتا ہے تو خوش ہو جاتا ہوں اور کہتا ہوں ؎

تم آگئے تو رونق کاشانہ ہوگئی

بس لکھنے پڑھنے کا شغل ہے۔ یا تین منٹ کے فاصلے پر پہاڑ ہے، اُس کا نظارہ بھی دل بہلاتا ہے۔ صبح یہاں کی بہت اچھی ہوتی ہے خصوصاً جاڑے میں طویل اور عریض جنگل شبنم سے پٹ جاتا ہے اور سمندر سا نظر آتا ہے۔

مکان کے اندر چاروں طرف پھولوں کے درخت ہیں۔ آج کی کلی دوسرے دن پھول بن جاتی ہے اور تیسرے دن مرے ہوؤں کی یاد دلاتی ہے ؎

مل جائے تو بتلاؤں کہ کیا ڈھونڈ رہا ہوں
شبنم میں، نسیمِ سحری میں، گلِ تر میں

پینسٹھ برس قبل کی بات ہے، جس زمانے میں علی گڑھ کالج کے لوائز اور اولڈ لوائز پر "صاحبیت" کا بے حد غلبہ تھا، وہاں کے ایک اولڈ بوائے مسوری پہاڑ تشریف لے گئے۔ شام کے وقت پہنچے۔ صبح بیدار ہو کر غسل کیا اور ہوٹل کے بیرے سے فرمایا، چائے کے ساتھ کچے شلجم لانا۔ تھوڑی دیر بعد اُنہیں اس زور کا بخار چڑھا کہ ڈاکٹر کو بلانا پڑا۔ ڈاکٹر نے پوچھا، کیا کھایا تھا؟ ڈاکٹر انگریز تھا، جب اُسے معلوم ہوا کہ ناشتے میں کچے شلجم کھائے تھے تو وہ بولا "انگریز ناشتے میں کچے شلجم یوں کھاتے ہیں کہ رات کو شراب پیتے ہیں۔ کچا شلجم شراب کی حدت کم کر دیتا ہے۔ آپ نے شراب نہیں پی تھی تو کچے شلجم صبح صبح کیوں کھائے۔ ٹھنڈی جگہ، پھر صبح کی ٹھنڈ، اور صبح صبح غسل اور کچے شلجم، آپ نے سخت غلطی کی!" خیر اللہ نے بچا لیا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد سے کھانا کھانے کا ایک نیا اور انوکھا طریقہ نکلا ہے۔ اہلِ جنگ کو اطمینان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے کا

نہیں ملتا تھا، اُنہوں نے کھڑے رہ کر کھانا شروع کر دیا اور اس کا نام بوفے (BUFFET) رکھا۔ جس طرح کپڑے کی قلت سے فیشن ایجاد ہوئی۔ اسی طرح مجبوراً کھڑے کھڑے کھانا اختیار کیا گیا۔ ہمیں کوئی مجبوری نہیں ہے لیکن ہم فرنگیوں کی تقلید کرتے ہیں۔

رئیس الاحرار مولانا محمد علی کے مشہور رفیق عبدالرحمٰن صدیقی کا واقعہ یاد آ گیا۔ کلکتے میں اُنہیں اسی شان کی دعوت سے سابقہ پڑا تو انہوں نے میزبان سے کہا:- بھائی! میں بچپن میں کبھی کھڑے کھڑے پانی پی لیتا تھا تو والدہ ڈانٹتی تھیں کہ اللہ کی نعمت کی ناقدری مت کرو، کھڑے کھڑے کیسے کھا سکتا ہوں۔ میزبان نے صدیقی صاحب کے واسطے فوراً کرسی منگا دی۔ صدیقی صاحب نے فرمایا:- یہ اور زیادہ بدتمیزی ہے۔ سب کھڑے رہیں اور میں کرسی پر بیٹھ جاؤں۔

دنیا میں سیاحت کر کے کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ جو لوگ ان سے پہلے ہو گذرے ہیں اُن کا انجام کیا ہوا۔ وہ لوگ قوت میں (بھی) آج سے بڑھ کر تھے اور اُن کے آثار جو دنیا میں (باقی رہ گئے) ہیں (موجودہ زمانے کی نسبت) زیادہ مستحکم ہیں (لیکن جب اُنہوں نے سرکشی اختیار کی) تو اللہ نے اُن کے گناہوں کی بنا پر اُن کی گرفت کر لی اور اللہ کی گرفت سے اُنہیں بچانے والا کوئی نہیں تھا (مفہوم سورہ المؤمن آیت ۲۱)

کھیل تماشوں، ناچ گانے کی محفلوں، فلمی پوسٹروں، فحش رسالوں، حسن کے مقابلوں اور آفتابی غسلوں کے دور میں کیا نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ پارسا رہیں گے، ہم انہیں پارسا دیکھنے کی کوشش کئے جائیں یا مایوس ہو کر بیٹھ جائیں؟ اس سوال کو سوچنے کے لئے کچھ عرصہ گزرا، بڑے بڑے عیسائی پادریوں کا ایک جلسہ ہوا تھا، جس کے سربراہ پاپائے روم تھے، جلسے نے فیصلہ کیا کہ ہمت نہیں ہارنی چاہئے۔ اور اپنا کام کئے جانا چاہئے۔ بُرے سے بُرے حالات میں بھی پارسا رہنا ممکن ہے۔ پارسا رہنے والا بُری سے بُری فضا میں پارسا رہ سکتا ہے۔

عیسائیوں نے فیصلہ ٹھیک کیا۔ جنہوں نے بے راہ روی کا احساس کر لیا ہے وہ اپنی قوم کو ضرور راہِ راست پر لے آئیں گے، تشخیص ہو جائے تو مرض کا علاج دشوار نہیں ہوتا اور موت کے سوا ہر مرض کا علاج ہے، لیکن بے راہ روی کا احساس اور مرض کی خبر ہی نہ ہو، جیسا کہ ہم آج کل کے مسلمانوں کو نہیں ہے، تو ہمارے حق میں تو موجودہ دور مرض الموت کا دور ہے، ہم کھیل تماشوں کو لہو و لعب نہیں سمجھتے، ناچ گانوں کو مادی ثقافت کی تکمیل ہونے لگی ہے، فلمی پوسٹروں اور فحش رسالوں کے خلاف زبان کھولنا آرٹ کی توہین ہے، حسن کے مقابلے اور آفتابی غسل تنزل کی نہیں ترقی کی نشانیاں ہیں۔

ہم ان چیزوں میں خرابی نہیں پاتے تو ہمیں اپنے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے پارسا رہنے نہ رہنے کی فکر کیوں ہو اور انہیں پارسا رکھنے کا خیال ہمارے ہاں کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟

میں مایوس نہیں ہوں۔ اسلام نے مایوسی کو کفر کہا ہے، الیاس من الکفر۔ فرداً فرداً ہر مسلمان موجودہ حالات میں بھی اپنی اصلاح کر سکتا ہے، مگر مسلمانوں کی پوری قوم میرے اور آپ کے بس کی نہیں ہے اور جن کے بس کی ہے، رونا اُن ہی کے بگاڑ کا ہے۔ ہمارا اونچا طبقہ درست ہو جائے تو ساری قوم درست ہو سکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں گذشتہ قوموں کی تاریخ پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ اُن کی تباہی اور بربادی کے اسباب پر نظر غائر ڈالو، اور ایسی باتوں سے بچو، جنہوں نے گذشتہ قوموں کو تباہ و برباد کیا تھا۔ ورنہ تمہیں بھی اُن کی طرح آفات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

"اُن کو شہرت سے کیا حاصل ہوا جو ہم کو تم کو ہوگا" یہ ایک بہت مشہور اور بہت بڑے شخص کا فقرہ ہے، جس کی قابلیت کا اعتراف علامہ اقبالؔ ان الفاظ میں کر گئے ہیں ۔

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا

اور مولانا حالیؔ نے فرمایا ہے ——

طالب و عرفی و اسیر و کلیم
لوگ جو چاہیں اُن کو ٹھہرائیں
ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے
ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں
غالبِ نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت

اب تو آپ سمجھ گئے ہوں گے، وہ مشہور اور بڑے شخص مرزا اسداللہ خاں غالبؔ ہیں ۔ مندرجہ بالا فقرہ انہوں نے اپنے شاگرد منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھا تھا ۔

غالبؔ نے زندگی میں بھی عزت پائی اور آج بھی اُن کی قدر کی جا رہی ہے ۔ پاکستان کے اُردو نوازوں سے زیادہ بھارت کے ہندی نواز اُن کی قدر کر رہے ہیں ۔ طرح طرح سے اُنہیں یاد رکھا جا رہا ہے، سنتا ہوں کہ اگلے برس بھارت اور روس اُن کی صد سالہ برسی تزک و احتشام سے منانے والے ہیں ۔

انسان ان ہی باتوں پر جان دیا کرتا ہے کہ زندگی میں عزت ملے اور مرنے کے بعد نام چمکے ۔ غالبؔ کا نام مرنے کے بعد جتنا چمکا ہے اُتنا بادشاہوں کا نہیں چمکتا ۔ مگر غالبؔ کہتے ہیں :—

"اُن کو شہرت سے کیا حاصل ہوا جو ہم کو تم کو ہوگا"

حقیقت یہی ہے کہ مرنے کے بعد اگر اللہ کی خوشنودی میسر نہ آئی تو دنیا کی عزت و شہرت سے کیا حاصل ہے ۔

غالبؔ مولوی صاحب یا شاہ صاحب نہیں تھے، لیکن سو برس پہلے کے شاعروں اور ادیبوں کے جذبات اور خیالات اس قسم کے ہوتے تھے ۔ اب ذرا سو برس بعد کے شاعروں اور ادیبوں کے جذبات اور خیالات کا نمونہ ملاحظہ کیجئے :—

"امیر خاں کیلے کھاتا رہا ۔ ہم پیتے رہے ، وزیر خاں بولا ۔ امیر نہیں پیتا ۔ میں نے کہا ، اُس کی مرضی
وزیر خاں بولا ، یہ سالا کیسا ادیب ہے ، بغیر پیئے لوگوں کو ادیب بننے کا حق کیا ہے ۔ میں نے کہا
واقعی میری سمجھ میں بھی نہیں آتا کہ تمام اچھی اچھی چیزیں اسلام نے ممنوع کیوں قرار دی ہیں ۔ جاوید
نے پوچھا ، مثلاً ؟ میں نے کہا ۔ جیسے شراب، موسیقی، سنگ تراشی، مصوری "

یہ فقرے بجنسہٖ ایک نوجوان ادیب کے مضمون سے نقل کئے گئے ہیں جو ایک ادبی ماہنامے میں چھپا ہے ۔

غالب بھی شراب پیتے تھے۔ لیکن شراب پینا اُن کے نزدیک خوبی اور وصف نہیں تھا۔ غالب بھی کبھی جوان تھے، اُس وقت اُن کا
ں است تھا۔ جوانی میں اُنہوں نے فرمایا تھا۔

ہستی کے مت فریب میں مت آجائیو اسد

میں نے آج پہلے "ناظر" میں دُعا مانگی ہے کہ اللہ تعالیٰ موجودہ رہائش گاہ سے جو کراچی میں میری تیسری رہائش گاہ ہے، مجھے سیدھا
پاس بلاتے، چوتھی رہائش گاہ نہ دکھائے۔

میں دو سال سے فالج زدہ ہوں اور ویسے بھی ہجری حساب سے بیاسی سال ختم کر چکا ہوں۔ لہذا اس دُعا میں تھوڑا سا اضافہ ضروری ہے
تعالیٰ نے فالج زدگی کے دو سال اتنے آرام و آسائش سے گذروائے ہیں کہ سوائے کسی قدر اپاہج رہ جانے کے دو سال بعد بھی میرے
ی خان بہادر حبیب الرحمٰن اور معالج کرنل سید شوکت مصر ہیں کہ علاج کئے جاؤں۔

خیر دعا میں اضافہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سلسلہ بالاکرم تادم مرگ جاری رکھے۔ عام صحت بالکل ٹھیک ہے۔ فالج زدگی اور بڑھاپے
جہ سے ایک طرف ہر آن موت کا منتظر ہوں اور دوسری طرف صبح سے جو لکھنا پڑھنا شروع کرتا ہوں تو شام کر دیتا ہوں۔ الحمدللہ لکھنے پڑھنے
منگ باقی ہے سہ میں مستحق نہ تھا کرم بے حساب کا تو مجھ پہ یہ التفات عجیب اتفاق ہے۔ ذلک فضل اللہ
اللہ سے مانگنا ہے تو دل کھول کر کیوں نہ مانگوں۔ ایمان اور اطمینان دونوں کا طلب گار ہوں۔ مرنے کا دن اور مرنے کی رات
اطمینان کے ساتھ بسر کرنے کی خواہش ہے جس اطمینان کے ساتھ فالج زدگی کے دو سال بسر کئے ہیں، بلکہ ساری عمر بسر کی ہے۔

جس طرح ذمہ دار ملازم ایک جگہ سے تبادلہ ہونے پر آخر وقت تک کام کر کے دوسری جگہ جاتے ہیں اُسی طرح میں اپنے معمولات
کرتا ہوا عالم فانی سے عالم باقی میں منتقل ہوں۔ ہاں سہ

دھوم تیرے کرم کی سن کر میں آرزوئے نجات لایا ہوں

ازراہِ کرم ناظرین فاراں آمین کہیں۔ اتنا غالباً میرا حق ہے۔ اسی لئے یہ نوٹ لکھا ہے، ورنہ دُعا تو چپکے چپکے مانگ لیتا۔ دُعا کے
ان کی ضرورت نہیں تھی۔ آمین ہی نہ کہئے، میری دعا کی مقبولیت کے لئے دعا کیجئے۔ اللہ آپ کو اس کی جزا دے گا۔

۵
آزمودہ دواؤں کا مرکب
انالجین
سر درد - کمر کا درد - دانت کا درد
ایام - انفلوئنزا اور ہر قسم کے دوسرے درد کے لئے
یقینی زود اثر اور بے ضرر علاج ہے
Opal
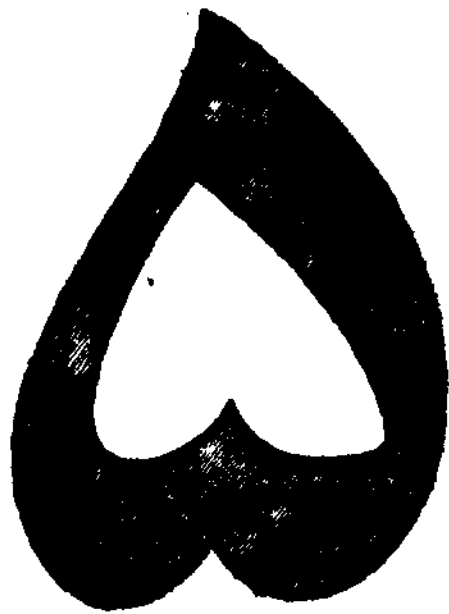
[...]۔ حکیم حاجی آل حسن مسرور (علیگ)
ڈی۔ آئی۔ ایم۔ ایس

ارشادِ نبویؐ و اقوالِ خلفاءِ راشدینؓ

ارشاداتِ نبویؐ :-

- کسی بھائی کی حاجت برآری کرنے والا ایسا ہے گویا تمام عمر [خ]دا کی خدمت میں گزار دی۔
- جس کو مسلمان کا غم نہ ہو، وہ میری امت میں سے نہیں۔
- ایمان کے بعد افضل نیکی خلقِ خدا کو آرام پہنچانا ہے۔
- جو شخص سلام سے پہلے بات کرے اُس کا جواب مت دو جب تک پہلے سلام نہ کرے۔
- پڑوسی کو ستانے والا دوزخی ہے اگرچہ تمام رات عبادت کرے اور تمام دن روزے رکھے۔
- ہمسایہ کا حق نہ ستانے کے علاوہ اُس کے ساتھ احسان کرنا بھی ضروری ہے۔
- حق ہمسایہ اُس سے ادا ہوتا ہے۔ جس پر خدا کی رحمت ہوتی ہے۔
- جب جنازے کے ساتھ جائے تو خیال کر کہ وہ تو ملک الموت کا منہ دیکھ چکا مجھے ابھی دیکھنا ہے۔ وہ موت کا مزہ چکھ چکا مجھے ابھی چکھنا ہے۔ وہ خاتمہ کے ڈر سے نکل گیا مجھے ابھی باقی ہے۔
- تو بوڑھوں کی تعظیم کر۔ جب تو بوڑھا ہوگا۔ خدا نوجوانوں سے تیرے بڑھاپے کے وقت تعظیم کرائے گا۔
- جو شخص بوڑھوں کی تعظیم نہ کرے اور چھوٹوں پر شفقت نہ کرے وہ میری امت میں نہیں۔
- تین دن سے زیادہ کسی ملنے والے سے ترک کلام نہ کر۔ بحالت رنجش صلح میں سبقت اور سلام علیک بہتر ہے۔
- کوئی مسلمان تیرے ہاتھ اور زبان سے ایذا نہ پائے۔
- ہر قوم کے معزز آدمی کی تعظیم کر۔
- تین باتوں میں توقف مت کرو۔ نماز میں جب اس کا وقت ہو جائے، جنازہ میں جب تیار ہو اور بیوہ کے نکاح میں۔
- جس شخص نے اپنی زبان اور شرمگاہ کو قابو میں رکھا اس کے واسطے جنت کا میں ضامن ہوں۔
- بغیر سختی اٹھائے حلیم اور بغیر تجربہ کے حکیم نہیں ہو سکتا۔
- نجات کیا ہے؟ زبان کا بند رکھنا۔ گھر میں قیام کرنا، گناہ پر نادم ہونا۔
- کوئی مرد دوسرے مرد کے ساتھ بغلگیر ہو کر ایک ہی کپڑے میں نہ سوئے اسی طرح عورتیں بھی۔
- زمانے کو بُرا نہ کہو اُس کا فاعل حقیقی خدائے برتر ہے۔
- ایمان کے دو نصف ہیں ایک صبر اور دوسرا شکر۔
- جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں مارا جائے یا جان کی حفاظت میں یا عیال کی حفاظت میں یا دین کی حفاظت میں وہ شہید ہے۔
- جو شخص بغیر اجازت بھائی کا خط دیکھے گا وہ آگ کو دیکھے گا۔
- مظلوم کی دعا سے ڈرو کیونکہ اُس کے اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں
- اپنی جانوں، اپنی اولاد، اپنے خدام، اور اپنے مال کے حق میں بددعا نہ کیا کرو شاید کہ وہ گھڑی اجابت کی ہو اور تمہاری بددعا قبول ہو جائے۔

● اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل طلب کیا کرو۔

● ایماندار آدمی کو جب خوشی حاصل ہوتی ہے وہ شکر کرتا ہے اور اگر دکھ پہونچتا ہے تو صبر کرتا ہے۔

● باپ کا بیٹے کے لئے بہتر عطیہ اچھی تعلیم و تربیت ہے۔

● صدقہ کیا ہے ؟ دو شخصوں کے درمیان صلح کرا دینا، کسی کو سہارا دیکر سواری پر سوار کرا دینا، اس کا مال دلوا دینا، اچھا قول بھی صدقہ ہے۔ نماز یا نیک کام کے واسطے ہر قدم صدقہ ہے، راستہ سے اذیت کی شے ہٹا دینا بھی صدقہ ہے۔

● خدا اس شخص پر مہربانی کرتا ہے جو قیمت وصول کرنے کے تقاضے میں سہولت اور نرمی اختیار کرتا ہے۔

● درختوں کے پھل مت فروخت کرو جب تک ان کی صلاحیت نہ ظاہر ہو جائے

● جب نماز کی جماعت کے تم امام بنو تو تھوڑا پڑھو کیونکہ جماعت میں ضعیف، بیمار اور کام کاج والے ہوں گے، جب اکیلے پڑھو، تو جتنا جی چاہے

● مسکین کو صدقہ دینا ایک صدقہ ہے اور قرابتی کو صدقہ دینا دو صدقے ہیں ایک اصل صدقہ دوسرے رشتہ داری کی نگہداشت کا۔

● ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر پانچ حق ہیں (۱) سلام کا جواب دینا (۲) بیمار پرسی کرنا (۳) جنازے کے ساتھ جانا (۴) دعوت یعنی بلاوے کو قبول کرنا (۵) چھینک کا جواب دینا۔

● دوست سے محبت اعتدال کے ساتھ رکھو کیونکہ ممکن ہے کبھی تمہارا بگاڑ ہو جائے۔ اور دشمن سے دشمنی حد سے زیادہ نہ کرو ممکن ہے کبھی تمہاری محبت ہو جائے۔

● گوشہ نشینی کو لازم پکڑو کہ وہ عبادت ہے۔

● جو شخص کوئی کپڑا ایسی قیمت سے خریدے جس میں ایک درم حرام ہو تو وہ کپڑا جب تک بدن پر رہے گا نماز قبول نہ ہوگی۔

● تمہارا ہمسایہ مدد مانگے مدد کرو۔ قرض مانگے قرض دو۔ اس کا کوئی کام ہو اس کو پورا کرو۔ بیمار ہو اس کی عیادت کرو۔ مر جائے تو جنازے میں جاؤ۔ کوئی خوشی کی بات ہو مبارکباد دو۔ مصیبت میں تعزیت کرو۔

● رحم رحمٰن سے مشتق ہے جو کوئی اس کو ملائے گا رحمٰن سے ملے گا قطع کرنے پر رحمٰن سے قطع کرے گا۔

● مومن جب بولتا ہے تو دل میں سوچ لیتا ہے تب زبان سے نکا

● جب کوئی دعا دے تم بھی دعا دو یا اس سے بہتر یا وہی۔

● زیادہ باتیں کرنے سے بڑھ کر انسان کے لئے کوئی چیز بری نہیں

● آگ خشک لکڑی میں اتنی جلدی نہیں لگتی جتنی غیبت بندہ کے ہر کو خشک کرتی ہے۔

● بہتر وہ ہے جو دیر میں خفا ہو اور جلد من جائے - بدتر وہ ہے جو جلد غصہ ہو دیر میں راضی ہو۔

● دنیا کی چار چیزیں ہوں تو تجھے فکر نہیں ۱۔ راست گفتاری ۲۔ حفظ امانت ۳۔ خوش خلقی ۴۔ غذائے حلال۔

● آدمی کے دوست تین ہیں پہلا قبض روح تک ساتھ دیتا ہے دوسرا قبر تک اور تیسرا قیامت تک۔ پہلا مال ہے دوسرا گھر والے۔ تیسرا اعمال۔

● جو میانہ روی اختیار کرتا ہے مفلس نہیں ہوتا۔

● سخی گنہگار بخیل عابد سے اچھا ہے۔

● اللہ کے نزدیک دو قطرے پسندیدہ ہیں ۱۔ ایک آنسو کا جو اللہ کے خوف سے نکلا ہو دوسرا خون کا قطرہ جو خدا کے راستے میں گرا ہو۔

● جو کسی قوم سے مشابہت پیدا کرتا ہے وہ اسی میں سے ہے۔

● جو چیز اولاد کے لئے بازار سے لائے پہلے لڑکی کو دے پھر لڑکے کو

● نیک عورت وہ خزانہ ہے جو سب سے اچھا ہے۔

● ایک بیٹی والا سے کہہ رہے دو بیٹیوں والا گر نبار اور تین والے کو کہ وہ جنت میں میرا ہمسایہ ہوگا۔

● حلال چیزوں میں کوئی چیز خدا کے نزدیک ایسی بری نہیں جتنی طلا

● تمہارے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا اگر درست ہو تو سارا جسم درست رہتا ہے اگر وہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ وہ دل ہے۔

● جب دو شخص ایک ہی وقت میں دعوت دیں تو ان میں سے نزدی

ہ بلانے والے کی دعوت قبول کرو ۔
اگر کسی شخص کی دعوت کی جائے اور وہ قبول نہ کرے تو اس نے اللہ اور رسولؐ کی نافرمانی کی ۔
اگر کوئی شخص نیک عمل کرتا ہو اور بیماری یا سفر کی وجہ سے اس نیک کام سے رک جائے تو اللہ تعالیٰ اُس کے نیک کام کو لکھا کرے گا ۔
آپ سے پوچھا گیا سب سے اچھا شخص کون ہے ؟ فرمایا جس کی عمر لمبی ہو اور اعمال نیک ۔
حضورؐ نے فرمایا کہ خادم کا قصور ایک دن میں ستر بار معاف کرو
حضورؐ نے فرمایا کہ مکان میں ماں سے اجازت لیکر جایا کرو ممکن ہے کہ تم بے اطلاع چلے جاؤ اور وہ برہنہ ہو ۔
دشمن پر رحم کرنا آسان کام نہیں خاص کر جب بدلہ لینے کا موقع حاصل ہو
اللہ تعالیٰ پانچ چیزوں کے ساتھ پانچ چیزیں عطا فرماتا ہے ۔ شکر کے ساتھ مال کی زیادتی ۲ ۔ دعا کے ساتھ اجابت ۳ ۔ استغفار کے ساتھ آمرزش ۴ ۔ صدقہ کے ساتھ قبولیت ۵ ۔ رحم کے ساتھ رحمت ۔
حضورؐ نے فرمایا مختصر بات چیت بہتر ہوتی ہے ۔
حضورؐ نے فرمایا لوگ خدا کی عیال ہیں اور خدا کے نزدیک زیادہ پیارا اس کے عیال کو زیادہ فائدہ پہنچانے والا ہے ۔
جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے وہ بدلہ نہیں لیتا ۔
مومن کی فراست سے بچتے رہو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے
میں حکم دیتا کہ کوئی کسی کو سجدہ کرے تو بیوی کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے ۔
جو عورت مر جائے اس حال میں کہ اُس کا خاوند اُس سے راضی ہو تو وہ جنت میں داخل ہوگی ۔
بدگمانی سے پرہیز کرو ۔ عیب جوئی مت کرو ۔ چھپ کر باتیں نہ سنو ، کرو ، حسد اور کینہ نہ رکھو ، منہ نہ موڑو ، اللہ کے بندے اور بھائی بنے رہو ۔

● مومن کا چہرہ بشاش رہتا ہے اور دل غمگین ۔
● نیکی کا بتانے والا مثل اس کے کرنے والے کے ہے ۔
● بہتر صدقہ وہ ہے جو مقدرت کے موافق ہو اور اُسے وہ اپنے عیال سے شروع کرے ۔
● اے بنی آدم تیرا کوئی مال نہیں سوائے اس کے کہ جو تو نے کھا کر فنا کر دیا یا پہن کر گھسا دیا یا کار خیر پر صرف کر کے اُسے جاری رکھا ۔
● غیر کے لئے کوئی صدقہ نہیں جب قریبی رشتہ دار محتاج ہیں ۔
● حتی المقدور ہر ایک کے ساتھ نیکی کرو خواہ وہ نیک ہو یا بد ۔
● ادب سکھاؤ اپنی اولاد کو جب چھ برس کی ہو جائے ۔ حکم کرو اپنی اولاد کو نماز کا جب سات برس کی ہو جائے ۔ بستر جدا کر دو اپنی اولاد کا جب وہ نو برس کی ہو جائے ۔ نگاہ رکھو اپنی اولاد کی حرکات و سکنات پر جب وہ بارہ برس کی ہو جائے نکاح کر دو اپنی اولاد کا جب وہ سولہ برس کی ہو جائے ۔
● شیطان ایک سجدے کے انکار سے مردود ہوا ۔ بے نمازی بہتر سجدہ کا ہر روز نافرمان ہے ۔

اقوال حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

● فقیر کے سامنے عاجزی اور ادب سے صدقہ پیش کر کیونکہ خوشدلی سے صدقہ دینا قبولیت کا نشان ہے ۔
● نہیں حاصل ہوتی دولت ساتھ آرزو کے ، جوانی ساتھ خضاب کے صحت ساتھ دواؤں کے ۔
● گناہ سے توبہ کرنا واجب ہے مگر گناہ سے بچنا واجب تر ۔
● توبہ بوڑھے سے خوب ہے لیکن جوان سے خوب تر ہے ۔
● جو امر پیش آتا ہے وہ نزدیک ہے لیکن موت اس سے بھی نزدیک تر ہے ۔
● شرم مردوں سے خوب ہے مگر عورتوں سے خوب تر ہے ۔
● گناہ جوان کا بھی اگرچہ بد ہے ، لیکن بوڑھے کا بدتر ہے ۔

● اللہ کی عبادت میں سستی عام لوگوں سے عجیب بات ہے لیکن عالموں اور طالب علموں سے اس کا صدور اور بھی زیادہ برا ہے۔

● تواضع غریبوں سے خوب ہے لیکن امیروں سے خوب تر ہے۔

● تکبر کرنا امیروں کا بد ہے لیکن غریبوں اور محتاجوں کا بدتر ہے۔

● پورا کرتا ہے نماز کو سجدہ سہو، روزہ کو صدقۂ فطر، حج کو فدیہ اور ایمان کو جہاد۔

● زبان کو شکوہ سے روک خوشی کی زندگانی عطا ہوگی۔

● اس دن پر رو جو تیری عمر سے گذر گیا اور اس میں نیکی نہیں کی۔

● ہر چیز کے ثواب کا ایک اندازہ ہے لیکن ثواب صبر بے اندازہ ہے

● جہاد کف ر جہاد اصغر ہے اور جہاد نفس جہاد اکبر ہے۔

● اخلاص یہ ہے کہ اعمال کا عوض نہ چاہے۔ دنیا کو آخرت کے لئے اور آخرت کو اللہ کے لئے چھوڑ دے۔

● تو دنیا میں رہنے کے سامانوں میں لگا ہے۔ اور دنیا تجھ کو اپنے سے نکالنے میں سرگرم ہے۔

● آپ جب کسی کی ماتم پرسی کے لئے جاتے تو فرماتے کہ صبر میں کوئی مصیبت نہیں۔ اور رونے میں کوئی فائدہ نہیں۔ رسول خدا کی وفات کو یاد کرو تو تم کو اپنی مصیبت بہت کم معلوم ہوگی۔

● جو شخص ابتدائے اسلام میں مرگیا وہ بہت خوش نصیب تھا۔

● لوگو! خدا سے شرم کرو۔ اپنے اعمال و افعال میں خدا کو حاضر و ناظر سمجھ کر ڈرتے اور شرم کرتے رہو۔

● صبح خیزی میں مرغان سحر کا سبقت لے جانا تیرے لئے باعث ندامت ہے

● اقوال حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

● ایمان کے بعد بڑی نعمت نیک عورت ہے۔

● بزرگ بننے کے لئے علم حاصل کرو۔

● جو شخص اپنا راز پوشیدہ رکھتا ہے وہ گویا اپنی سلامتی کو اپنے قبضے میں رکھتا ہے۔

● جو آدمی اپنے کو عالم کہے وہ جاہل ہے اور جو اپنے کو جنتی کہے وہ جہنمی ہے۔

● توبۃ النصوح اس کا نام ہے کہ توبہ کے بعد پھر اس کام کو نہ کرے۔

● قوت فی العمل یہ ہے کہ آج کا کام کل پر نہ اٹھا رکھے۔

● کسی مسلمان کو یہ زیبا نہیں کہ تلاش رزق میں بیٹھ جائے اور دعا کرے کہ اے خدا مجھ کو رزق دے کیونکہ تم کو معلوم ہے کہ آسمان سے چاندی، سونا نہیں برستا۔

● اگر غیب دانی کے دعوے کا خیال نہ ہوتا تو میں کہتا کہ پانچ اشخاص بہشتی ہیں۔ ۱۔ وہ محتاج جو عیال دار مگر صابر ہو ۲۔ وہ عورت جس کا شوہر اس سے راضی اور خوش ہو ۳۔ وہ عورت جس نے اپنے شوہر کا حق مہر معاف کر دیا ہو ۵۔ وہ شخص جو اپنے گناہوں سے سچی توبہ کرے۔

● تین چیزیں محبت بڑھانے کا ذریعہ ہیں ۱۔ سلام کرنا ۲۔ دوسروں کیلئے مجلس میں جگہ خالی کر دینا ۳۔ مخاطب کو بہترین نام سے پکارنا۔

● ندامت چار قسم کی ہوتی ہے: ۱۔ ندامت ایک دن کی جب کوئی شخص گھر سے بلا کھانا کھائے چلا جائے ۲۔ ندامت سال بھر کی کہ زراعت کا وقت غفلت میں گذر جائے ۳۔ ندامت عمر بھر کی جب بیوی سے موافقت نہ ہو ۴۔ ندامت ابدی کہ خدائے برتر ناخوش ہو۔

● آدمی تین قسم کے ہوتے ہیں۔ کامل، کاہل، لاشئے۔ کامل وہ ہے جو لوگوں سے مشورہ کر کے اس پر غور کرے۔ کاہل وہ ہے جو اپنی رائے پر چلے اور کسی سے مشورہ نہ کرے۔ لاشئے وہ ہے کہ جو نہ خود صاحب الرائے ہو اور نہ دوسرے سے مشورہ کرے۔

● خشوع و خضوع کا تعلق دل سے ہے نہ کہ ظاہری حرکات سے۔

● مقدمات کا جلد تصفیہ کرنا چاہئے تاکہ دعویٰ کرنے والا دیر کے سبب کہیں اپنے دعوے سے مجبوراً دستبردار نہ ہو جائے۔

● بدخواہ کی دوستی سے احتراز یعنی پرہیز لازم ہے کیونکہ اگر وہ بھلائی بھی کرنا چاہتا ہے تو بھی اس سے برائی سرزد ہوتی ہے۔

● خدا اس شخص پر رحمت فرمائے جو میرے عیب سے مجھے مطلع کرتا ہے۔

[ج]ب عالم کو لغزش ہوتی ہے تو اس سے ایک عالم لغزش میں پڑ جاتا ہے
[ک]سی کے خلق پر اعتماد نہ کرنا تاوقتیکہ غصہ کے وقت اسے نہ دیکھ لے۔
[●] جو عیب واقف کرے وہ دوست ہے اور منہ پر تعریف کرنا گویا ذبح
[ک]رنا ہے۔

● ہنسنے سے عمر کم ہوتی ہے، رعب وداب جاتا رہتا ہے اور موت سے غفلت کا نشان ہے۔

● طمع کرنا مفلسی ہے، بے غرض ہونا امیری اور بدلہ نہ چاہنا صبر ہے،

● نیکی کے عوض نیکی حق ادائیگی ہے، اور بدی کے عوض نیکی احسان ہے

● کم بولنا حکمت ہے، کم کھانا صحت، کم سونا عبادت اور عوام سے کم ملنا عافیت ہے۔

● بڑھاپے سے پہلے جوانی اور موت سے پہلے بڑھاپا غنیمت جان۔

● سخی حبیب خدا ہے اگر فاسق ہو۔ بخیل دشمنِ خدا ہے اگرچہ زاہد ہو۔

● ظالموں کو معاف کر دینا مظلوموں پر ظلم ہے۔

● جب حرام وحلال جمع ہوں تو حرام غالب ہوتا ہے چاہے وہ تھوڑا ہی سا ہو۔

● نہیں دوستی رکھتے مومن مخالفینِ خدا اور رسولؐ سے اگرچہ ماں باپ ہوں

● بدترین آوازیں دو ہیں راگ کی اور نوحہ کی۔

● سلامتی گمنامی میں ہے یا خلوت میں۔

● عزتِ دنیا مال سے ہے اور عزتِ آخرت اعمال سے۔

● نہیں حاصل ہوتا مطلب بغیر خوف کے، خصلت اچھی بغیر ادب کے، خوشی بغیر امن کے، تونگری بغیر بخشش کے، فقیری بغیر قناعت کے، رفعت بغیر تواضع کے اور جہاد بغیر توفیقِ خدا کے۔

● مشغولیت سے پہلے فراغت اور موت سے پہلے بڑھاپا غنیمت جان

● دوزخ سے بچ اگرچہ آدھے خرما ہی کی بدولت ہو، اگر یہ بھی نہ ہو تو میٹھی بات ہی سہی۔

● ہم حرام کے خوف سے نو حصے حلال بھی ترک کر دیتے ہیں۔

● آدمی کے نماز وروزہ کو نہیں اس کی خوش معاملگی، انسانی ہمدردی

دانائی اور راستبازی کو دیکھنا چاہئے۔

● جب تم کسی صاحب علم کو دنیا کی طرف مائل دیکھو تو سمجھ لو کہ دین کے بارے میں وہ قابل الزام ہے کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ جو شخص جس چیز کا خواہاں ہوتا ہے اسی دھن میں ہر وقت لگا رہتا ہے۔

● ایمان اس کا نام ہے کہ خدائے واحد کو دل سے پہچانے اور زبان سے اس کا اقرار کرے اور حکم شرع پر عمل کرے۔

اقوال حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

● تعجب ہے اس پر جو موت کو حق جانتا ہے اور پھر ہنستا ہے۔

● تعجب ہے اس پر جو دنیا کو فانی جانتا ہے۔ اور پھر اس کی محبت رکھتا ہے۔

● تعجب ہے اس پر جو تقدیر کو پہچانتا ہے اور پھر جانے والی چیز کا غم کرتا ہے،

● تعجب ہے اس پر جو حساب کو حق جانتا ہے اور پھر مال جمع کرتا ہے۔

● تعجب ہے اس پر جو دوزخ کو برحق جانتا ہے اور پھر گناہ کرتا ہے۔

● تعجب ہے اس پر جو جنت پر ایمان رکھتا ہے اور پھر دنیا کے ساتھ آرام پکڑتا ہے۔

● تعجب ہے اس پر جو شیطان کو دشمن جانتا ہے اور پھر اس کی اطاعت کرتا ہے۔

● ضائع ہے وہ ہتھیار جس کو استعمال نہ کیا جائے وہ مال جس کو کار خیر میں خرچ نہ کیا جائے، وہ علم جس پر عمل نہ کیا جائے وہ مسجد جس میں نماز نہ پڑھی جائے۔ وہ نماز جو مسجد میں نہ پڑھی جائے، وہ اچھی رائے جس کو قبول نہ کیا جائے وہ مصحف جس کی تلاوت نہ کی جائے۔ وہ زاہد جو خواہش دنیا دل میں رکھے، وہ لمبی عمر جس میں توشہ نہ لیا جائے۔

● بعض اوقات جرم معاف کر دینا مجرم کو زیادہ خطرناک بنا دیتا ہے۔

● اے انسان تجھے خدا نے اپنے لئے پیدا کیا ہے اور تو دوسروں کا ہونا چاہتا ہے،

● جو شخص مصیبت کے وقت اول اپنی تدبیروں اور پھر خلق خدا کی امداد سے عاجز ہو کر خدا کی جانب رجوع کرتا ہے خدا تعالیٰ بھی اس کی جانب سے منہ پھیر لیتا ہے

- محب اللہ کو تنہائی محبوب ہوتی ہے۔
- تواضع کی کثرت نفاق کی نشانی اور عداوت کا پیش خیمہ ہے۔
- حق رکھ امید تو کسی سے مگر اپنے رب سے اور مت ڈر کسی سے مگر اپنے گناہ سے
- دنیائے فانی کی لذتیں لینے سے عالم باقی کے اجر و ثواب میں کمی ہو جاتی ہے —
- لوگوں کو جس طرح چاہے آزما دیکھ، سانپ بچھوؤں سے کم نہ پائے گا
- باوجود نعمت وعافیت موجود ہونے کے زیادہ طلبی بھی شکوہ ہے۔
- علم بغیر عمل کے تو فائدہ دے سکتا ہے لیکن عمل بغیر علم کے فائدہ نہیں بخشتا
- اپنا بوجھ خلقت میں سے کسی پر نہ رکھ خواہ کم ہو یا زیادہ۔
- ایک پرہیزگار فقیہ شیطان پر ہزار عابد سے بھاری ہے۔
- دنیا بے سود ہے جس سے مقصود آخرت نہ ہو۔
- خاموشی عقل کا بہترین علاج ہے۔
- دوسروں کا بوجھ اٹھانا عابدوں کی عزت کا تتمہ ہے۔
- دنیا خدا کی سرائے ہے جو آخرت کے مسافروں کے لئے رکھی ہے۔ اپنا توشہ لے اور جو کچھ سرائے میں ہے اس کا لالچ نہ کر۔
- زبان کی لغزش پاؤں کی لغزش سے زیادہ خطرناک ہے۔
- فقیر کا ایک درہم صدقہ بہتر ہے غنی کے لاکھ درہم سے۔
- اگر تو گناہ پر آمادہ ہے تو کوئی ایسا مقام تلاش کر جہاں خدا نہ ہو۔
- ظالموں اور ان کے متعلقین سے معاملہ مت کر۔
- اے انسان! اگر تو معبود حقیقی کی پرستش نہیں کرنا چاہتا تو اس کی بنائی چیزوں کو بھی استعمال نہ کر۔
- بہتر ہے کہ دنیا تجھ کو گنہگار جانے بہ نسبت اس کے کہ تو خدا کے نزدیک ریاکار ہو۔
- تونگروں کے ساتھ عالموں اور زاہدوں کی دوستی ریاکاری کی دلیل ہے
- جنت کے اندر رہنا عجیب ہے اور دنیا کے اندر ہنسنا عجیب تر ہے۔
- اگر آنکھ روشن ہو تو ہر روز روز حشر ہے۔
- حیادار کے اعمال مجاہدین کے اعمال کے ساتھ آسمان پر جاتے ہیں۔
- امراء کی تعریف کرنے سے بچ کہ ظالم کی تعریف سے غضب الٰہی نازل
- ترغیب دلانے کی نیت سے علانیہ صدقہ دینا خفیہ سے بہتر ہے۔
- اللہ تعالیٰ کو ہر وقت اپنے ساتھ سمجھنا افضل ترین ایمان ہے۔
- متواضع دنیا و آخرت میں جو چیز چاہے گی پوری ہوگی۔
- خدا سے صدق اور خلوص کے ساتھ معاملہ کر۔
- جانور اپنے مالک کو پہچانتا ہے لیکن انسان اپنے خدا کو نہیں پہچانتا
- بدگو تین آدمیوں کو مجروح کرتا ہے اول اپنے آپ کو دوم جس کی برائی ہے سوم جو اس کی برائی کو سنتا ہے۔
- جو اپنی جوتی آپ دھو لیتا ہے۔ غلام کی عیادت کرتا ہے۔ اپنے کپڑے دھو لیتا ہے۔ اور ان میں پیوند لگا لیتا ہے۔ وہ غرور اور تکبر سے بری
- لوگ تمہارے عیبوں کے جاسوس ہیں۔
- تلوار کا زخم جسم پر ہوتا ہے اور بری گفتار کا روح پر۔
- ایسی بات مت کہہ جو مخاطب کی سمجھ سے باہر ہو۔
- تو کتنا بھی مغلوک الحال ہو لیکن مغلوب الحال نہ ہو۔
- جب زبان صلاح پذیر ہو جاتی ہے قلب بھی صالح ہو جاتا ہے۔
- حقیر سے حقیر پیشہ اختیار کرنا، ہاتھ پھیلانے سے بدرجہا بہتر ہے۔
- گناہ کسی نہ کسی صورت سے دل کو بے قرار رکھتا ہے۔
- نعمت کا بے مناسب جگہ خرچ کیا جانا ناشکری ہے۔
- اس نے خدا کا حق نہیں جانا جس نے لوگوں کا حق نہیں پہچانا۔
- جس شخص کو سال بھر تک کوئی تکلیف یا رنج نہ پہونچے پس وہ جان لے کہ مجھ سے میرا رب ناراض ہے۔
- بندہ حقیقت ایمان کو نہیں پہنچتا جب تک کہ اس کو فقر محبوب ہو تو غنا سے۔ اور اس کے نزدیک اس کی تعریف اور خدمت کرنے والے برابر نہ ہو جائیں۔
- بہترین صدقہ مرد مسلمان کا اس کا گھر ہے جو روکتا ہے اس کی زبان — شرمگاہ اور نظر کو۔
- بڑا سمجھدار لوگوں میں وہ ہے جس کو لوگوں کی برائیوں کا ذکر کرنے کی فرصت نہ ملی ہو—

سلمان کی ذلت اپنے مذہب سے غافل بن جانے میں ہے نہ کہ بے زر ہونے میں
حاجت مند غربا کا تمہارے پاس آنا خدائے پاک کا انعام ہے۔
حق پر قائم رہنے والے مقدار میں کم ہوتے ہیں مگر منزلت و اقتدار میں
زیادہ۔
عمدہ لباس کے ہولیعں کفن کو یاد رکھو۔ عمدہ مکان کے شیدائی قبر کا گڑھا
مت بھول۔ عمدہ غذاؤں کے دلدادہ کیڑے مکوڑوں غذا بننا یاد رکھو۔
سخاوت پھل ہے مال کا۔ اعمال پھل ہے علم کا۔ خوشنودی خدا پھل
ہے اخلاص کا۔
جو شخص التجائے نگاہ کو نہیں سمجھ سکتا اس کے سامنے اپنی زبان کو شرمندہ کر
مجبوبین کو یاد خدا سے راحت ملتی ہے۔

اقوال حضرت علی کرم اللہ وجہہ

- خندہ روئی سے پیش آنا سب سے پہلی نیکی ہے۔
- کارخانہ قدرت میں فکر کرنا بھی عبادت ہے۔
- عقیدہ میں شک رکھنا شرک کے برابر ہے۔
- قابل محبت بہت کم لوگ ہیں۔
- شکر نعمت حصول نعمت کا باعث ہے اور ناشکری حصول زحمت کا موجب اور سبب۔
- ادب بہترین کمال اور خیرات افضل ترین عبادت ہے۔
- موت ایک بے خبر ساتھی ہے ● زمانہ کے پل پل کے اندر آفتیں پوشیدہ ہیں ● عادت پر غالب آنا کمال فضیلت ہے ● معافی نہایت اچھا انتقام ہے ● عقلمند اپنے آپ کو پست کر کے بلندی حاصل کرتا ہے اور نادان اپنے آپ کو بڑھا کر ذلت اٹھاتا ہے ● جب تک بصارت نہ ہو سورج کی روشنی بیکار ہے ● گناہوں پر نادم ہونا ان کو مٹا دیتا ہے اور نیکیوں پر غرور ہونا ان کو برباد کر دیتا ہے ● عقلمند ہمیشہ غم و فکر میں مبتلا رہتا ہے، بیکاری میں حمق بازی سوجھتی ہے ● سخاوت کے ساتھ احسان جتانا کمینہ پن ہے ● فاسق کی برائی بیان کرنا غیبت نہیں ہے ● سچائی میں اگرچہ خوف ہے مگر باعث نجات ہے اور جھوٹ میں گو اطمینان ہے مگر موجب ہلاکت ہے ● غریب وہ ہے جس کا کوئی دوست نہ ہو ● علم بے عمل بیکار ہے اور عمل بغیر اخلاص بے کار ہے ● تنگدستی اس مال سے اچھی ہے جس سے انسان گناہوں میں مبتلا ہو کر ذلیل و رسوا ہو ● مصیبت میں گھبرانا کمال درجہ کی مصیبت ہے ● جلدی سے معاف کر دینا انتہائی شرافت ہے اور انتقام لینے میں جلدی کرنا انتہائی رذالت اور کمینگی ہے ● کمینے سے جب کوئی نرمی کرے تو سختی سے پیش آتا ہے اور جب سختی کی جائے تو ڈھیلا پڑ جاتا ہے ● حرص سے کچھ روزی نہیں بڑھ جاتی مگر آدمی کی قدر گھٹ جاتی ہے۔
- برا آدمی کسی کے ساتھ نیک گمان نہیں رکھتا کیونکہ وہ ہر ایک کو اپنے جیسا خیال کرتا ہے ● علم مال سے بہتر ہے کیونکہ علم تمہاری حفاظت کرتا ہے اور تم مال کی حفاظت کرتے ہو ● اعمال کے میزان کو خیرات کے وزن سے بھاری کرو ● عاجز آدمی اس سے اچھا ہے جو قوت رکھے اور برے کام نہ چھوڑے ● شرافت عقل و ادب سے ہے نہ کہ مال و نسب سے
- حرام کاموں سے نفس کو روکنا صبر کی دوسری قسم ہے ● اقرار جرم مجرم کے لئے ایک اچھا سفارشی ہے ● دوسروں کے سینے سے شر اس وقت دور کر سکے تو اپنے سینے کی صفائی کرے ● جو شخص خدا تعالیٰ کو بھول جاتا ہے اللہ اس کو اپنی جان بھی بھلا دیتا ہے ● جو شخص کسی کے عیب کی تلاش میں رہتا ہے اسے کوئی نہ کوئی عیب مل ہی جاتا ہے ● جو شخص خواہ مخواہ اپنے کو محتاج بناتا ہے وہ محتاج ہی رہتا ہے ● جس شخص کے دل میں جتنی زیادہ حرص ہوتی ہے اس کو خدا تعالیٰ پر کم یقین ہوتا ہے
- جب تک کوئی بات تیرے منہ میں بند ہے تب تک تو اس کا مالک ہے، جب زبان سے نکل چکے تو وہ تیری مالک ہو چکی ہے ● اول عمر میں جو وقت ضائع کیا آخر عمر میں اس کا تدارک کر تاکہ انجام بخیر ہو ● زیادہ علم والوں سے علم حاصل کر اور جو نادان ہیں ان کو اپنا علم سکھا ● جب تو اپنی اجل کا مالک نہیں تو اپنی امیدیں مت بڑھا ● بخیل دنیا میں فقیروں کی سی زندگی بسر کرتا ہے اور عاقبت میں امیروں کا سا حساب بھگتے گا
- لمبی امیدیں باندھنے سے پرہیز کر کیونکہ تو شکر گذاری نہیں کرتا۔

● ہمسایہ کی بدخواہی اور نیکوں کے ساتھ برائی انتہائی شقاوت اور بدبختی ہے ● جو مال تو نے آخرت کے لئے بھیج دیا وہ تیرا ہے اور جو دنیا میں چھوڑا وہ تیرے وارثوں کا مال ہے تیرا نہیں ● اگر تو کسی کے ساتھ احسان کرے تو اسے مخفی رکھو اور جب تیرے ساتھ کوئی احسان کرے تو اس کو ظاہر کر ● جو شخص بندوں کے حقوق ادا کرتا ہے وہ خدا تعالیٰ کے حقوق بھی ادا کرے گا ● غیبت کا سننے والا غیبت کرنے والوں میں داخل ہے ● جو شخص خود کو گمراہ کرے اس کو دوسرا شخص کس طرح راہ راست پر لائے ● بخشش وہ اچھی ہے جو جلدی دے دی جائے اس کے واسطے کسی کو انتظار میں نہ رکھا جائے ● مثالیں عبرت حاصل کرنے والوں کیلئے بیان کی جاتی ہیں نادانوں کو ان سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا ● جو شخص حق کے خلاف کرتا ہے حق تعالیٰ خود اس کا مقابلہ کرتا ہے ● جس کی امیدیں چھوٹی ہوں اس کے عمل بھی درست ہوتے ہیں ● جو شخص جلدی سے ہر ایک بات کا جواب دے دیتا ہے اس کا جواب ٹھیک نہیں ہوتا ● جو شخص چھوٹی مصیبتوں کو بڑا خیال کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو بڑی مصیبتوں میں مبتلا کرتا ہے ● جو شخص اپنا بھید محفوظ نہیں رکھ سکتا وہ دوسروں کے بھید کو بھی محفوظ نہیں رکھ سکتا ● جو اپنی قدر آپ نہیں کرتا اس کی قدر دوسرا بھی نہیں پہچانتا ● خلق خدا کی نیکیوں کا ضرور شکر گزار رہ ● جو گناہ سے پاک ہو وہ دلیر ہوتا ہے اور جس میں عیب ہوں بزدل ہوتا ہے ● جو شخص کل کو موت کا دن سمجھتا ہے موت کے آنے سے اسے تکلیف نہیں ہوتی ● جو کام لوگوں کے سامنے کرنا مناسب نہیں اسے چھپ کر بھی نہ کرنا چاہیے ● خدا کی اطاعت اپنی جان پر جبر کئے بغیر حاصل نہیں ہوتی ● دنیا داروں کی دوستی ایک معمولی اور ادنیٰ بات سے منقطع ہو جاتی ہے ● صدق یقین کے ساتھ سو رہنا اس نماز سے کہیں اچھا ہے جو شک کے ساتھ ادا کی جائے ● شریر عورتوں سے بالکل بچ کر رہو اور بھلی مانس عورتوں سے بھی ہوشیار رہو ● لوگوں کے سامنے کسی کو نصیحت کرنا ایک طرح کی ملامت ہے ● جب تک کسی کا پوری طرح حال معلوم نہ ہو اس کی بزرگی کا اعتقاد نہ رکھو ● جب تک کسی شخص سے بات چیت نہ ہو اسے حقیر مت جان ● کسی کے گرنے پر خوشی مت منا کیا معلوم کل تیرے ساتھ کیا پیش آئے ● دشمن کے حسن سلوک پر بھروسہ مت کر کیونکہ پانی کو آگ سے کتنا ہی گرم کیا جائے پھر بھی وہ اس کے بجھانے کو کافی ہے ● مصائب کا مقابلہ صبر سے اور نعمتوں کی حفاظت شکر سے کرو ● جلد باز نقصان اٹھاتا ہے اور صبر کرنے والا کامیاب ہوتا ہے ● اپنا واجبی حق لینے میں کبھی کوتاہی نہ کرو اور دوسرے کے غصب حقوق سے بچو ● آدمی کی عقل اس کے کلام کی خوبی سے اور شرافت اس کے افعال کی عمدگی سے ظاہر ہوتی ہے ● دولت مندی کی مستی سے خدا کی پناہ مانگو یہ ایسی مستی ہے جس سے دیر میں ہوش آتا ہے ● بدکاروں کی صحبت سے بچے رہو کیونکہ برائی دوسرے کی برائی سے جلد مل جاتی ہے ● ہر ایک چیز کے لئے زکوٰۃ ہے اور عقل کی زکوٰۃ نادانوں کی باتوں پر تحمل کرنا ہے ● نیک کام میں کسی کے پیچھے ہونا بہتر ہے کہ برے کاموں میں تو اوروں کا پیشوا ہو ● تیرا نفس تجھ سے وہی کام کرائے گا جس کے ساتھ تو نے اسے مانوس بنایا ہے ● اپنی جان پر حد سے زیادہ سختی بھی نہ کر ایسا نہ ہو کہ ہمت ہار کر بیٹھ جائے ● سفر کرنے میں کوئی عیب نہیں، عیب کی بات یہ ہے کہ اپنے وطن میں دوسروں کا محتاج ہو ● اللہ تعالیٰ سے صلح رکھو کہ آخرت سلامت ہے اور لوگوں سے صلح رکھو کہ دنیا برباد نہ ہو ● حلم اور بردباری یہ نہیں کہ جب عاجز ہو تو کچھ نہ کہے اور جب قدرت پائے تو انتقام لینے میں ہاتھ دکھلائے ● خدا تعالیٰ کے راضی ہونے کی علامت یہ ہے کہ بندہ اس کی تقدیر پر راضی ہو ● اہل بصیرت کے لئے ہر ایک نگاہ میں عبرت اور تجربہ میں نصیحت ہے ● دیدہ و دانستہ یعنی جان بوجھ کر غلطی قابل معافی نہیں ہوتی ● شکریہ میں کمی کرنے سے محسن لوگ بے رغبت ہو جاتے ہیں ● اگر کسی سوال کا جواب معلوم نہ ہو تو اپنی لاعلمی کے اظہار کو برا نہ سمجھو ● انسان اس عمر پر کس طرح خوش ہوتا ہے جو گھنٹوں کے گذرنے سے گھٹتی جاتی ہے ● کبھی تو لڑکے بار خالی جاتے اور کبھی خواب سچے نکل آتے ہیں ● ہر ایک بات میں ہاں میں ہاں ملانا منافقوں کی خصلت اور ہر بات میں اختلاف کرنا باعث عداوت ہے ● جس کلام کو تو اچھا سمجھتا ہے اسے مختصر کر دے۔ ● شریر کی کوئی اچھی بات دیکھ کر اس کے دھوکے میں نہ آ ● انسان کو لازم

ہے کہ قبرستان کو دیکھ کر عبرت حاصل کرے ● دنیا میں جو چیز بہت کم ہے وہ سچائی اور امانت ہے اور جو سب سے زیادہ ہے وہ جھوٹ اور خیانت ہے ● دنیا اور آخرت کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کی دو بیویاں ہوں جب ایک کو راضی کرتا ہے تو دوسری ناخوش ہو جاتی ہے ● دنیا مصیبتوں کا گھر ہے اس سے جتنی جلدی دور ہو جائے اچھا ہے ● ہر شمار شدہ چیز کم اور ہر خوشی ایک نہ ایک دن کالعدم ہو جاتی ہے ● جب آدمی کا خلق اچھا ہو تو کلام لطیف ہو جاتا ہے ● جب کسی احسان کا بدلہ ادا کرنے سے تیرے ہاتھ قاصر ہوں تو زبان سے اس کا شکریہ ضرور ادا کر ● جب کسی کلام میں اللہ تعالیٰ کی حکمت معلوم نہ ہو تو اپنے خیالات کو آگے نہ بڑھا ● جب تو کمزوروں کو کچھ دے نہ سکے تو ان کے ساتھ رحمت اور مہربانی سے پیش آ ● جب کسی آدمی میں کوئی بُری خصلت معلوم ہو تو منتظر رہ کہ اس میں ایسی اور بھی خصلتیں ہوں گی ● جس شخص نے بندوں کا شکریہ ادا نہیں کیا وہ خدا تعالیٰ کے شکر سے بھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتا ● آدمی کے چہرے کا حُسن خدا تعالیٰ کی عمدہ عنایت ہے ● خوشامد اور تعریف کی محبت شیطان کے نہایت مضبوط داؤں ہیں ● بہترین کلام وہ ہے جس سے سننے والے کو ملال نہ ہو۔
● ہر ایک شخص سے اس کی فہم کے مطابق کلام کر۔

اقوال حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

● دروغ گو کو مروت اور حاسد کو راحت نہیں ● بدخلق کو سرداری اور ملوک کو اخوت نہیں ● جو کوئی خالق تعالیٰ سے محبت رکھتا ہے اُس کو خلق سے وحشت ہو جاتی ہے ● جو کچھ قسمت میں ہو گیا اُس پر راضی رہو۔
● فاجر سے صحبت مت رکھ تجھ پر بھی فسق و فجور غالب آ جائے گا ● مشورت ایسے لوگوں سے کر جو طاعت خدا خوب کرتے ہوں ● جو شخص ہر آدمی کے ساتھ صحبت رکھتا ہے وہ سلامت نہیں رہتا اور جو کوئی بُرے راستے جاتا ہے اس کو اتہام لگتا ہے اور جو شخص اپنی زبان کو قابو میں نہیں رکھتا وہ پشیمان ہوتا ہے ● بہت سی ایسی نیکیاں ہیں کہ جس سے بندہ اللہ تعالیٰ سے دور ہو جاتا ہے کیونکہ مطیع مغرور گنہگار اور گنہگار نادم مطیع ہوتا ہے ● خوشامدی لوگ تیرے لئے تکبر کا تخم ہیں ● درویش صابر غنی شاکر سے افضل تر ہے تو قناعت کر کیونکہ تونگر کا دل کیسہ میں لٹکا رہتا ہے اور درویش کا اللہ تعالیٰ میں۔
● عبادت بلاتوبہ کے درست نہیں ہوتی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے توبہ کو عبادت کو مقدم کیا ہے ● ایک گناہ بہت ہے اور ہزار اطاعت قلیل ● بے صدق اخلاق بربادی ہے اور نکتہ چینی بدنصیبی ● علماء کا فقر اختیاری ہوتا ہے اور جہلا کا اضطراری ● آدمی کی نیک بختی اس میں بھی ہے کہ اس کا دشمن عقلمند ہے ● متکبر اطاعت کرنیوالا عاصی ہے اور عاصی عذر کے سبب اطاعت کرنے والا ہے ● توبہ کرنا آسان ہے لیکن گناہ چھوڑنا مشکل ہے ● اُس کو خوشی ہو جس کی آنکھ شہوات دیکھتی ہے اور اس کا دل اُن شہوات کو نہیں چاہتا۔
● ہمارا دین سراپا ادب ہے جو اس کو ملحوظ نہ رکھے گا وہ حرماں نصیب ہے۔
● بہتر زہد دنیا میں وہ ہے کہ لوگوں کی ملاقات سے کنارہ کش ہو جائے ● فضیلت اگرچہ جماعت میں ہے لیکن سلامتی گوشہ نشینی میں ہے ● زیادہ شکم سیری اور فاقہ کشی دونوں مانع عبادت ہیں ● قدرت انتقام رکھتے ہوئے غصہ کو پی جانا افضل ترین جہاد ہے ● کھلی ہوئی عداوت منافقانہ موافقت سے بہتر ہے ● مصیبت میں آدم کی تلاش مصیبت کو ترقی دیتی ہے ● جہاد بالسیف سے جہاد بالمال سخت تر ہے ● غذا سے جسم کو اور قناعت سے روح کو آرام ملتا ہے ● سعید وہ ہے جس کا دل عالم ہو اور بدن صابر اور موجودہ پر قانع رہے ● کم عمر والے کے گناہ اپنے سے کم جان کر اس کی عزت کر ● دوسروں کے مال کی طمع نہ کرنا بھی ایک قسم کی سخاوت ہے ● نزولِ بلا ہلاکت کے لئے نہیں بلکہ امتحان کے لئے ہوتا ہے ● نفس اللہ تعالیٰ کا مخالف ہے اور نفس کی مخالفت خدا کی رضا ہے ● گناہ ناسور ہے اگر ترک نہ کرو تو بڑھتا رہے گا ● شکایت کا ترک کرنا صبر

سید زاہد احسن گیلانی

محترمی و مکرمی مدیر فاران ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں پاکستان میں رہنے والے دیگر مسلمانوں کی طرح ایک عام وضع کا مسلمان ہوں، میرا تعلق نہ تو کسی سیاسی پارٹی سے ہے اور نہ کسی اور قسم کی
ںیوں کا حامی یا منسلک ہوں، بلکہ محض ایک عام انسان کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہا ہوں ——— انسان خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو اور وہ خواہ کسی جگہ
ٹی یا جماعت سے منسلک کیوں نہ ہو، بہرحال اجتماعی خیالات اور اجتماعی افعال کے علاوہ کچھ نہ کچھ ذاتی خیالات واحساسات بھی ضرور رکھتا ہے ۔
ں کی زندگی جہاں اجتماعی طور سے گذرتی ہے وہاں انفرادی زندگی، اپنے اصول وشغل کی بنیاد پر گذارنے کی اہلیت بھی ہر انسان اپنے اند
ی پاتا ہے اور انسان کی انفرادی خصوصیات کی بنیاد یہی ہے، ——— یہی وجہ ہے کہ انسان کے اجتماعی افعال پر انفرادی افعال اور حرکات
سکنات زیادہ تر حاوی ہی نظر آئیں گے ۔ اور پھر وہ انہیں خیالات وافعال کو دوسروں سے خصوصیات کے لحاظ سے فرق ظاہر کرنے کی وجہ
ـرار دیتا ہے ———

المختصر جس طرح اس دنیا میں بسنے والے دیگر تمام انسانوں میں انفرادی طور پر کچھ نہ کچھ خیالات واحساسات اور جذبات و اعمال
، معیار اونچے نیچے پائے جاتے ہیں اسی طرح میں بھی انفرادی حیثیت کی بنا پر کچھ احساسات رکھتا ہوں، جو کہ میرے دل میں ایک عرصے سے موجود ہیں ۔
ربھی کبھار یہی احساسات مجھے اس قدر بیقرار کر دیتے ہیں کہ طبیعت میں اضطراب کی کیفیت کافی دنوں تک موجود رہتی ہے ۔ لیکن ۔ جب ماحول کی
منگھور گھٹاؤں میں خود کو چھپا لیتا ہوں تو دیگر تمام حقائق بھی ماحول کے پیدا شدہ ان کالے بادلوں ہی کی طرح سیاہ نظر آنے لگتے ہیں اور یہی
لسلہ ایک عرصے سے قائم ہے ۔

مطالعہ کا شوق مجھے بچپن ہی سے ہے اور ہمیشہ بعض اچھے رسالوں، کتابوں یا اخباروں کا مطالعہ کرتا ہی رہتا ہوں ۔ مطالعہ کے اس
رق ہی کی وجہ سے آپ کا " فاران " بھی کئی مرتبہ زیر نظر آیا ۔ اس کے علاوہ اسی نوعیت کے دوسرے کئی اور رسائل جن میں خاص طور پر چراغ
ہ" " البلاغ " " ترجمان القرآن " اور آئین وایشیا وغیرہ قابل ذکر ہیں، ایک عرصے تک میرے شوق مطالعہ کی تشنگی کو دور کرتے رہے کافی
نوں تک تو میں ان رسائل کا مطالعہ محض تاریخی واقعات اور اپنے مشاہیر واسلاف کے کارناموں کو جاننے ہی کے لئے کیا کرتا تھا ———
ر مطالعہ جوں جوں گہرا اور پختہ ہوتا گیا میں نے یہ تجزیہ کیا کہ ان رسالوں میں سوائے تنقید اور اعتراضات کے اور کچھ نہیں ۔ کہیں کسی رسالے
ں کسی اہل قلم نے حکومت کے پرخچے اڑانے میں اپنی صلاحیت کا پورا لیکن بے فائدہ اور ناجائز استعمال کیا ہے، کہیں کسی مضمون نگار نے

کسی سیاسی پارٹی کی فعال کارکردگی پر مجرمانہ حملے کئے ہیں اور کہیں کوئی اہل دانش کسی عالم دین ہی کی تحریر کو توڑ مروڑ کر غلط طریقے پر بیان کرنے کی کوشش میں مستغرق نظر آتا ہے۔ یہ تو ان اہل قلم کا ذکر ہے جن کا احساس زیادہ تر سیاست پر ہوتا ہے۔ اب ذرا ہمارے علمائے کرام کی حقیقت پر بھی نظر دوڑا دیجئے! ـــــ تو معلوم ہوگا کہ دنیا میں جس قدر برائیوں کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے اس سے کہیں زیادہ علمائے دین کے مسئلے مسائل کی کتابوں اور نسخوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا نظر آئے گا۔ جس کا فائدہ صرف ان کی ذات یا خاندان تک ہی محدود رہتا ہے اور نہ بھی صرف نام و نمود اور مادی وسائل کی فراہمی کی صورت میں! ـــــ ایک معمولی سا جائزہ بطور مثال پیش خدمت ہے کہ پاکستان میں اس وقت ظاہرا ایسے لوگوں کی اکثریت نظر آتی ہے جو دین اسلام سے محبت کا اظہار اس قدر کرتے ہیں کہ اس کی بقا کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار ہیں۔ ان کے قلم سے نکلے ہوئے الفاظ اس بات کا انکشاف کرتے ہیں کہ وہ نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا کے ہر گوشے میں اسلام کو پھیلانا چاہتے ہیں۔ اُن کی تقریریں سنیں تو دل میں یہ خیال ضرور آئے گا۔ کہ یہ تقریر کرنے والا اور وہ گروہ جس سے اس مقرر کا تعلق ہے یقیناً اس بات کا خواہشمند ہے کہ اسلام کا بول بالا ہو، دنیا سے تمام برائیاں یکسر ختم ہو جائیں۔ اُن کی تقریروں میں یہ جملے اکثر سننے میں آتے ہیں کہ "یہ سینما جس میں لوگ حسیناؤں کے رقص و سرود دیکھ کر اپنے وجود اور اپنی اوقات تک کو فراموش کر دیتے ہیں، بالکل ختم ہو جائیں، یہ جوؤں کے اڈے جن کے وجود سے بسا اوقات نہایت ہی برے نتائج رونما ہوتے رہے ہیں، تباہ ہو جائیں، اور یہ شراب خانوں کی دیواریں بھی منہدم ہو جائیں تاکہ اشرف المخلوقات میں سے ہر کوئی شخص بدنامی و ویران مجبوری کو شراب خوری جیسے گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے محفوظ رہے۔ اور یہ ــــ کہ ــــ مخلوط تعلیم کے رواج کو بھی ختم کر دینا چاہئے تاکہ لوگوں میں بڑھتی ہوئی بے حجابیاں اور بے حیائیاں دور ہو جائیں۔ . . بعض حضرات نے تو ان برائیوں کے ختم کر دینے کے جذبہ سے سرشار ہوتے ہوئے بڑی بڑی ضخیم کتابیں تک تصنیف کر ڈالیں جنہیں دنیائے ادب کے لئے تو بیش بہا متاع قرار دیا جا سکتا ہے لیکن عوامتہ الناس ان کتابوں کی اہمیت حقیقت اور افادیت کو جاننے سے محروم رہتے ہیں۔

پاکستان میں جب خاندانی منصوبہ بندی کا شور اٹھا تو بیشتر علماء اور دیگر اسلام پسندوں نے قرآن و احادیث کے دلائل و براہین کے ساتھ خوب خوب اعتراضات کئے۔ ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کو فضول سمجھا، رویت ہلال کمیٹی کو پروپیگنڈا جانا ــــ اور ــــ سائنس کی نت نئی ایجادات کو مکروہ مانا! لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ تمام چیزیں جنہیں ہم غلط اور برا سمجھتے ہیں یا سمجھ رہے تھے۔ آج بتدریج اپنے وجود کو ٹھوس اور مستحکم بناتی جا رہی ہیں۔ آج پاکستان میں خاندانی منصوبہ بندی بھی زور و شور سے رائج ہے، ادارۂ تحقیقات اسلامی بھی باضابطہ سرگرم عمل ہے اور قوم کی اکثریت سود اور رشوت وغیرہ کے ذریعہ سے حاصل کئے ہوئے مال ہی کو کسب حلال تصور کئے ہوئے ہے، اور اسی طرح کی بے شمار برائیاں اور خامیاں ہماری قومی زندگی کے ہر شعبوں میں رواں دواں ہیں۔

میرے تحریر کا مقصد صرف یہ ہے کہ کیا ان علماء اور دانشوروں نے آج تک عملی طور پر بھی کچھ کیا ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ برائیوں کو ختم کرنے کے لئے جہاد ضروری ہے اور جو صورت حال کا صحیح تجزیہ کرنے کے بعد اور قوم کی حالت کو مسلسل کی حالت میں بدلتے اور بگڑتے ہوئے دیکھنے کے بعد یہ رائے دیتے ہیں کہ برائیوں کو دور کرنا عین اسلامی احکام کی تعمیل ہے ــــ آج اسلام کے نام پر اس ملک میں کئی پارٹیاں موجود ہیں جن کے کارکنوں کی تعداد بے شمار ہے، جن کے پاس ذرائع و وسائل لامحدود ہیں۔ جن کا مطالعہ عمیق ہے جن کے کردار ٹھوس ہیں اور جن کی نیتیں صاف ہیں اور جو فکر و عمل کے لحاظ سے خاصی شہرت بھی رکھتے ہیں۔ لیکن کیا آپ یا کوئی دوسرے بزرگ، علمائے دین اور اسلام پسند حضرات دلیل اور ثبوت کے ساتھ یہ واضح کر سکتے ہیں کہ قیام پاکستان کے بعد آن کی نظروں کے سامنے روز افزوں نئی نئی برائیوں نے جنم لیا تو اس کے جواب میں کیا ان

ارشیوں اور اسلام کے مخلص کارکنوں نے سوائے تحریر و تقریر کے کبھی اس قسم کا بھی کوئی عمل کیا جس کے نتیجہ میں قوم ان برائیوں کے ارتکاب سے بچ
باقی اسیہ برائیاں جنہیں ہم معاشرے کی صحت کے لئے نہایت مضر قرار دیتے آرہے ہیں، ختم ہو جاتیں ——— مجھے یقین کامل ہے کہ میرے
س سوال کا جواب کوئی بھی شخص نہیں دے سکتا، اس لئے کہ آج تک اس قوم نے برائیوں کو زندگی کے ہر شعبوں میں بڑے پیمانے پر ختم دیا لیکن
ن کے خلاف عملی سرگرمیوں کی توفیق غالباً پاکستان کی تاریخ میں کسی کو بھی میسر نہیں آئی۔ البتہ جواب دینے والے میرے اس سوال کے جواب میں
صرف یہ بتا سکتے ہیں کہ فلاں کتاب کے فلاں صفحے پر فلاں عالم دین نے ان برائیوں پر ان الفاظوں میں اعتراض کیا ہے اور اس عمل کو ختم اور رد
رنے کے لئے قرآن اور احادیث کے ایک مجموعہ کو بطور استدلال اس خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

لیکن

محترم و مکرم! — جہاں تک خاکسار کا خیال ہے اُن کے ان الفاظ اور تحریروں کی خوبصورتی قطعی طور پر اس پھول کی خوبصورتی اور
جاذبیت سے مشابہت رکھتی ہے جو صرف وقت مقررہ تک خوبصورت اور جاذب نظر معلوم ہوتا ہے اور پھر کچھ دیر بعد ہی اس کی اس خوب صورتی
اور جاذبیت کے اثرات زائل ہو جاتے ہیں ——— جس کے بارے میں ہم یہ کہتے ہیں کہ "اب پھول مرجھا چکا ہے" گستاخی معاف ہو! ——— مگر یہ حقیقت
ہے کہ ہمارے علمائے دین و دیگر اسلام پسند لوگوں کا حال بھی اسی پھول کی خصوصیات سے ملتا جلتا ہے، جب کبھی بھی اندرونِ ملک یا بیرونِ ملک
کسی قسم کی ایسی بات جو اسلام کی شان کے خلاف ہو، ظہور پذیر ہوتی ہے تو یہ حضرات سفید کاغذوں پر حروف کے اسلحہ تیار کرتے ہیں اور پھر اپنے یقین کے ساتھ
کہ ان اسلحہ اور ہتھیاروں کے استعمال سے تمام برائیاں بیک وقت ختم ہو جائیں گی۔ حتی الامکان لوگوں میں عام کر دینا چاہتے ہیں مگر افسوس کہ ان کے
ان ہتھیاروں نے آج تک ہمیں مقصد میں کامیابی کا کوئی راستہ نہیں بتلایا۔

جناب محترم! آپ میرے ان الٹے سیدھے حروف کو پڑھ کر میرے کہنے کا اصل مقصد تو یقیناً سمجھ چکے ہوں گے اس لئے کہ آپ خود بھی موجودہ معاشرے
سے مطمئن نظر نہیں آتے، جس کا ثبوت خود آپ کی تحریریں ہیں۔ آپ نے ایک مرتبہ "فاران" کے ذریعہ "ملائیت کے خاتمہ" پر قلم اٹھاتے ہوئے جاوید
صاحب مارٹن روڈ کے اس مکتوب پر بڑی زندہ دلی اور حقائق پر مبنی دلائل کے ساتھ تنقید کی تھی جو کہ انہوں نے صدر پاکستان کے نام مرقوم کیا تھا۔
اور پھر جب ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی نے اسلامی اصول و قوانین کی آڑ لے کر لوگوں کو غلط باتوں پر یقین دلانے کی کوشش رائیگاں کی تو بھی آپ کا
قلم جنبش سے باز نہ رہا اور پھر اسی سلسلہ کو قائم رکھتے ہوئے آپ نے ماہنامہ فاران بابت ماہ مئی ۶۶ء میں ایک تنقیدی مقالہ (نقش اول)
تحریر کیا تھا جس کا لب لباب ہی یہ تھا کہ اسلام نہ کبھی زمان و مکاں کا پابند رہا ہے اور نہ کبھی ایسا ممکن ہی ہو سکتا ہے، بلکہ زمان و مکاں کو اسلام
کا تابع ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ اسلام دین فطرت ہے جو ہر زمانہ میں انسانی زندگی کے ہر شعبوں پر اپنا سبق دیتا رہا اور ہر زمانہ میں اس دین نے بنی نوع
انسان کی راہ نمائی کی ہے۔ آپ نے صفحہ ۸ پر یہ تحریر فرمایا ہے کہ زمانہ کو اسلام کے مطابق ڈھلنے یا ڈھالنے کی ضرورت ہے۔ اگر زمانہ اپنی خود سری
ناسمجھی اور غفلت و جہالت کے سبب اسلام کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں ہے تو زمانہ کی اس باغیانہ روش کے آگے سپر انداختہ ہونے کی بجائے زمانہ سے
مصالحت اور ساز باز نہیں اس سے جنگ کی جائے گی ———

گستاخی معاف . ——— لیکن ایک سوال کرنے کی جسارت کروں گا۔ امید ہے کہ آپ اس پر واضح طور پر روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے
تاکہ مجھ جیسے بے شمار لوگوں کے شک و شبہات ختم ہو جائیں اور ہم حقیقت حال سے بھی واقف ہو جائیں، اور وہ سوال یہ ہے کہ "آپ نے جو یہ فرمایا
کہ زمانہ کی اس باغیانہ روش پر تسلیم خم کرنے کے بجائے جنگ و جدال کی ضرورت ہے تو کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ یہی الفاظ جو زمانہ کے لئے زمانہ سے

ہمارے بزرگ دہراتے چلے آ رہے ہیں کس حد تک قابل عمل تصور کئے گئے۔ اور اگر ایسا نہیں ہو سکا تو آخر کیوں؟ قیام پاکستان سے قبل بھی زمانہ خراب تھا اور اس کے بعد بھی زمانہ خراب سے خراب تر ہوتا گیا لیکن مجھے ذرا یہ بتائیں کہ اس قوم نے یا ان علمائے کرام نے یا دیگر اسلام پسند حضرات نے زمانہ سے کتنی مرتبہ جنگ کی!

آپ نے بجا طور پر زمانہ کو سخت درشت کہتے ہوئے انسان کی طرز زندگی کا بالکل صحیح نقشہ کھینچتے ہوئے صفحہ، پر آخری پیراگراف میں یہ تحریر فرمایا ہے کہ "اس ہوس زدہ معاشرے اور معصیت پرورده ماحول میں ایک مسلمان پر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟ کیا وہ وقت کی اس غلط رو میں بہہ جائے، زمانہ کے ان تقاضوں پر لبیک کہے، معاشرے کی برائیوں کے سانچے میں ڈھل جائے اور اس بگڑے ہوئے معاشرے نے جو فلسفی اور ارباب فکر پیدا کئے ہیں ان کے افکار و نظریات کے آگے سپر انداختہ ہو جائے ——— مگر ایک مسلمان جو سچے دل سے اللہ، رسول، آخرت اور دین کے اخلاقی نظام پر یقین رکھتا ہے، ان برائیوں میں زمانہ کے تقاضوں کا ایک قدم بھی ساتھ نہیں دے سکتا اور وہ یہ بھی نہیں کر سکتا اور نہ کرنا چاہئے کہ خاموش تماشائی بن کر دنیا کے بگاڑ کے اس تماشے کو دیکھتا رہے، مسلمانوں پر تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ وہ ان برائیوں سے جنگ کریں اور وقت کے دھارے پر بہنے کے بجائے اپنی تمام کوشش وقت کے دھارے کا رخ بدلنے میں صرف کر دیں ——— یہ تو آپ نے مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ذمہ داریاں عائد کی گئی ہیں ان کی مختصر تشریح کی ہے اور پھر آگے مسلمانوں کی شان اور حقیقت بیان کرتے ہوئے آپ یوں رقمطراز ہیں" مسلمان اس سے مرعوب نہیں ہوتا کہ دنیا کس راہ پر جا رہی ہے وہ تو یہ سوچتا ہے کہ دنیا کو کس راہ پر چلنا چاہئے مسلمان نہ تو بت گر ہوتا ہے اور نہ بت فروش اسے تو اللہ نے بت شکنی کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور یہ بت پتھروں ہی کے نہیں افکار و نظریات، رسوم اور خواہشوں کے بت بھی ہوتے ہیں"۔

قبلہ محترم ——— یہ وہی الفاظ ہیں جو مختلف اوقات میں مختلف انداز کے ساتھ مختلف لوگوں نے تحریر کئے ہیں، لیکن کیا کوئی مجھے یہ بتا سکتا ہے کہ آج تک کسی فرد واحد نے اس پر جائز طریقوں سے عمل بھی کیا ہو؟ آپ یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو وقت کی اس رو میں نہ بہنا چاہئے اور نہ زمانہ کے تقاضوں پر اسے لبیک کہنا چاہئے اور نہ اسے معاشرے کی برائیوں کے سانچے میں ڈھل جانا چاہئے۔ بلکہ اس کا تو فرض ہے کہ وہ ان تمام برائیوں کو ختم کر دے۔ تو مجھے آپ یہ بتائیں کہ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے آپ نے بھی کبھی زمانہ سے جنگ کی ہے؟ یا کوئی اس قسم کا ارادہ مستقبل قریب میں ہے؟ اگر آپ اپنی ذات سے متعلق اس سوال کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھتے تو پھر مجھے پاکستان کی تاریخ میں کسی بھی ایسی ہستی کا نام بتائیں جس نے ان برائیوں کو ختم کرنے کے لئے اس قوم کو صف آرا اور سربکف ہونے کا مشورہ ہی دیا ہو۔ اور خود حق و باطل کے مابین اس جنگ کی قیادت کی ہو۔ آخر مجھے یہ بتائیں کہ یہ تمام قسم کے فرائض جن کے بارے میں آئے دن ہمارے بزرگ اور علماء دین اپنے قلم کے ذریعہ لوگوں کو بتاتے ہیں، کب پورے ہوں گے اور جب یہ فرائض تمام مسلمانوں پر یکساں واجب ہیں تو آخر وہ حضرات سب کچھ سمجھنے کے باوجود بھی قدم آگے بڑھانے سے کیوں جھجکتے ہیں یا تو اس سوال کا موثر جواب دیں یا پھر اس حقیقت کو تسلیم کر لیں کہ پاکستان میں ابھی وہ مسلمان پیدا ہی نہیں ہوتے جو ان فرائض کی ادائیگی کے قابل ہو سکتے ہیں اور یہ تمام الفاظ اور وہ تمام لوگ صرف وقت گزارنے کے لئے اسلام کو ایک کھلونے کی حیثیت قرار دیتے آرہے ہیں جو دوسروں کو تو تحریروں کے ذریعہ اس بات پر اکساتے ہیں کہ زمانہ خراب ہے، اسے اسلام کے بتلائے ہوئے راستہ پر لگانا ہی ہمارا اور تمہارا فرض ہے، لیکن عمل کے میدان میں ان میں سے ایک شخص بھی سچا اور اسلامی تعلیم کی وردی پہنے ہوئے مجاہد بنا کھڑا نظر نہیں آتا تو جب ہمارا یہ عالم ہے کہ ہم قطعی طور پر مفلوج ہو کر رہ گئے ہیں تو پھر ہمیں زمانہ سے اس قسم کے شکووں شکایت کی کیا ضرورت۔

مذکورہ بالا حوالہ میں آگے بڑھ کر آپ یہ فرماتے ہیں کہ مسلمان نہ تو بت گری کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور نہ اس کا شیوہ بت فروشی ہے، اسے تو اللہ تعالیٰ نے صرف بت شکنی کے لئے پیدا کیا ہے۔ تو جہاں تک خاکسار کے علم کا تعلق ہے بت شکنی کے مانع معنی تو یہی ہیں کہ ایسے وجود جو متصادم ہو اللہ تعالیٰ کے ارشاد "قل ھو اللہ احد" کو رد کرتا ہو ——— آپ نے بت کے اقسام کی وضاحت کرتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ بت سے مراد صرف پتھروں کے تراشے ہی نہیں بلکہ افکار و نظریات، ہوا و ہوس اور خواہشات کے بت بھی ہوتے ہیں۔

لیکن محترم! اگر میں خواب نہیں دیکھ رہا ہوں تو پھر یہ یقیناً حقیقت ہی ہے کہ آج کے معاشرے میں افکار و نظریات اور ہوا و ہوس اور خواہشوں کے بت جس پیمانے پر بنائے جا رہے ہیں اور جن جن طریقوں پر انہیں عوام میں مقبول کیا جا رہا ہے اس کا صحیح گوشوارہ تیار کرنا ہمارے اور آپ کے بس سے تو ضرور باہر ہے ——— اور پھر ——— ہماری نظریں جو یقیناً دھوکہ کھانے کی عادی نہیں، یہ دیکھ رہی ہیں کہ یہی افکار و نظریات اور ہوا و ہوس کے بت مسلسل استحکام پذیر ہوتے چلے جا رہے ہیں اور کسی حد تک یہی غلط افکار و نظریات آج مسلم قوم کے شعار بنے جا رہے ہیں اور شاید یہ انہی افکار و نظریات کے بتوں کی پختگی کا اثر ہے کہ آج ہم اپنے مذہبی اصول و قوانین کو گھر کے ایک کونے میں کپڑوں میں لپیٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ اور پھر اپنے دماغی اصول و قوانین کی پابندی شروع کر دیتے ہیں۔ یہ ہمارے فکر و نظریات ہی کا تو نتیجہ ہے کہ آج ہماری اکثریت صبح سویرے اٹھ کر یا تو دفتروں میں جی حضوری اور جی سرکار کرنے کے لئے حاضر ہوتی ہے یا پھر اپنے کاروبار کو ترقی دینے کے لئے صبح سے شام تک ہر قسم کی غلط باتوں کو اپنائے رہتی ہے، نہ اسے خدا کے خوف کا کچھ احساس ہوتا ہے اور نہ اسے اپنے جیسے دوسرے لوگوں پر رحم آتا ہے۔ اور جب انہیں اس جی حضوری اور جی سرکاری یا لوٹ کھسوٹ سے چھٹکارا حاصل ہوتا ہے تو چند ساتھیوں اور اگر کوئی ساتھی نہ ملا تو دل بہلانے کے لئے اپنی ماں بہنوں اور بیوی بیٹیوں ہی کو ساتھ لے کر کسی ایسے فلم ہال میں گھس جاتے ہیں جہاں شہر کی سب سے زیادہ "بہترین" اور دوسرے لفظوں میں سب سے زیادہ "عریاں" فلم کی نمائش ہو رہی ہو۔ وہاں سے آنے کے بعد جو وقت ملا اسے اس فلم کے تبصرہ کے لئے وقف کر دیا اور یا پھر ریڈیو سوئچ آن کر کے شیطانوں کی آوازیں سننے بیٹھ جاتے ہیں، اور جب اس سے بھی طبیعت بھر جاتی ہے تو کچھ گنگناتے ہوئے خواب غفلت میں پناہ گزیں ہو جاتے ہیں۔ یہ ہے ہماری قوم کی روزانہ کی زندگی سے متعلق سرگرمیوں کا اختصار کے ساتھ جائزہ ——— یہ ہیں افکار و نظریات کے زندہ بتوں کے پجاریوں کا افسانۂ زندگی ——— تو محترم و مکرم — کیا آپ میری اس ناچیز رائے کو رد کر سکتے ہیں کہ جس قوم کا اخلاق دیوالیہ ہو جاتا ہے اس کے پاس پھر کوئی اور ایسی قدریں نہیں رہ جاتیں جن کے ذریعہ سے وہ خود کو ایک مہذب قوم کہلانے کی مستحق ہو سکے۔ اور کیا اس سے کسی کو انکار ہو سکتا ہے کہ ہم اس قوم کے افکار و نظریات کے ان بتوں کا سر تن سے جدا اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک کہ ان چیزوں ہی کو سرے سے ضائع نہ کر دیا جائے جن کے باعث اس قوم کو اس غلط قسم کے افکار و نظریات کے بتوں کو سجدہ کرنے میں مدد ملی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قلم کا جہاد بھی اپنی نوعیت کے لحاظ سے بہت بڑا جہاد ہے اور مجھے یقین ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ آپ کو اور دیگر تمام اہل قلم کو ان کاوشوں کا صلہ ضرور دے گا۔ لیکن آج کے ایٹمی دور میں تلوار سے میدان مار لینا نہ صرف مشکل بلکہ قدرے ناممکن بھی ہے ہمیں اس سے انکار نہیں کہ ہمارا یہ قلمی جہاد کفر و بدعت اور اسلام و حق کے مابین اپنا الگ مقام حاصل کئے ہوئے ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہمیں عملی طور پر بھی میدان میں صف آرا ہو جانا چاہئے اور تمام عالم میں" دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے" کا مکمل اور عملی ثبوت پیش کر کے دکھائیں آپ نے اپنے مضمون میں بیشتر مقامات پر علامہ اقبال مرحوم کو قوم کا نبض شناس تعین کرتے ہوئے ان کے اشعار کو دلائل کے طور پر وضاحت کے لئے تحریر فرمایا ہے ——— تو ——— یہ بھی علامہ اقبال مرحوم ہی کا کہنا ہے کہ عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی ——— اور ——— ہمیں نہ صرف

یا بلکہ پوری قوم کی زندگی کو خوشگوار اور عاقبت کو آسان بنانے کے لئے عملی زندگی بھی اختیار کرلینا چاہئے۔ ہمیں چاہئے کہ ایسے لوگوں کو تیار کریں جو غربت اور ضعف کے باوجود محنت و مشقت کے عادی ہوں ۔۔۔ جو اسلام کی بقا کے لئے ان کھوکھلے اور بے معنی انسانوں کے دماغی اختراع کے نتیجہ میں پیدا شدہ اصول و قوانین کی عمارت کو ڈھادیں۔ جو حق و باطل میں تمیز کرتے ہوئے ہر اس بات کو جائز قرار دیں جو ہمارے لئے قرآن و احادیث کی روشنی میں مفید ہو اور ہر اس بات پر نہ صرف قلمی طور پہ اعتراض کریں بلکہ سربکف ہوکر اللہ کے بھروسہ پر قدم بڑھائیں ۔۔۔ اور یہ عہد کریں کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے مسلمان بنا کر بھیجا ہے لہٰذا ہمارا یہ فرض اولین ہونا چاہئے کہ ہم ہر وہ کام کریں جن کے ذریعہ سے ہمیں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوسکے۔ اور اس حصول خوشنودی یا رضائے الٰہی کے لئے ہمیں اسی کے بتائے ہوئے طریقوں کو اپناتے ہوئے سرگرم عمل رہنا چاہئے۔

محترم و مکرم ۔۔۔ مجھ ناچیز کے اس مشورہ میں آپ وزن تو ضرور محسوس کریں گے جو کہ آپ کا شوق اور فکر کی عین ترجمانی کرتا ہے ۔۔۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ آپ نتائج سے اس اعتراض کے ساتھ رد نہ کردیں کہ، اس پر عمل کرنا درحقیقت جان کنی کے برابر ہے ۔۔۔ لیکن ان جان کنی کے عوض اللہ تعالیٰ ہمیں انعام کے طور پر جو کچھ بھی یہاں اور آخرت میں عطا فرمائے گا اس کی حقیقت بھی آپ سے پوشیدہ نہیں۔

فاران :۔ سید زاہد الحسن صاحب گیلانی کے اس مکتوب میں بڑا اخلاص اور درد مندی پائی جاتی ہے، معاشرے کی اخلاقی برائیوں کا انہیں بہت زیادہ غم بھی ہے انہیں ساتھ ہی اس کا بھی اعتراف ہے کہ علماء اور بعض دینی جماعتیں منکرات کو مٹانے کے لئے زبان و قلم اور تحریر و تقریر کے ذریعہ کوششیں بھی کرتی رہی ہیں، مگر صاحب موصوف کو اس کا شکوہ اور رنج ہے کہ اس تحریر و تقریر کی ان تمام کوششوں کے باوجود معاشرے کی برائیاں گھٹنے کی بجائے اور بڑھتی ہی چلی جارہی ہیں، اور تبلیغ و اصلاح کی مساعی کارگر نہیں ہورہی ہیں۔

وہ دیندار حضرات جو معاشرے کی اصلاح کا جذبہ رکھتے ہیں، اُن کے اور مکتوب نگار کے درمیان عقیدہ اور نظریہ کا کوئی اختلاف نہیں ہے، وہ تحریر و تقریر کی اصلاحی کوششوں کو بھی استحسان کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اُن کی تمنا یہ ہے کہ منکرات کو قوت کے ساتھ مٹا دینے کی ضرورت ہے جب تک یہ کام نہ ہوگا معاشرے کی اصلاح نہ ہوسکے گی!

سید صاحب موصوف کی خدمت میں عرض ہے کہ پہلے تو عقلی طور پہ برائی کو برائی سمجھنا یہ خود بھلائی کی دلیل ہے، پھر اُس کو دل سے بُرا جاننا اُس کے ساتھ زبان و قلم سے اس بُرائی کی مذمت کرنا اور لوگوں کو اُس سے نفرت دلانا یہ مرحلے بھی معصیت کے خلاف جہاد ہی کی منزلیں ہیں ! ان کوششوں کو حقیر نہیں سمجھنا چاہئے، آج مسلمانوں میں دین و اخلاق اور خشیت الٰہی کی جتنی مقدار بھی پائی جاتی ہے اور معاشرے میں خیر و نیکوکاری اور اسلامی روایات کی جو جھلکیاں ملتی ہیں، اُن میں تحریر و تقریر کے ذریعہ تبلیغ دین و اخلاق کا بہت کچھ ہاتھ ہے!

معاشرے کی اصلاح کی سب سے اولین شرط اور کارگر تدبیر یہ ہے کہ جو خیر و تقویٰ کا داعیہ رکھتے ہیں اور اصلاح حال چاہتے ہیں، اُن کو چاہئے کہ وہ خود عامل بالعمل ہوں، اُن کے قول و عمل میں پوری طرح یک رنگی ہونی چاہئے، راقم الحروف اپنے حالات کا جائزہ لیتا ہے تو خدا جانتا ہے کہ عمل کی کمزوری کے احساس سے ندامت ہوتی ہے! جو حضرات اپنی ذات کی حد تک عامل بالعمل ہیں وہ خود اپنے گھرانے کی اصلاح پر پوری توجہ نہیں دیتے اور محنت نہیں کرتے! مذہبی گھرانوں میں یہ دیکھا گیا ہے، کہ بڑی عمر کے لوگ نماز روزے کے پابند ہیں اور اُن کا رجحان نیکی کی طرف ہے، مگر نوجوانوں کی تربیت کی کوئی فکر نہیں۔ اگر کوئی لڑکا امتحان میں فیل ہوجائے تو گھر ماتم کدہ بن جاتا ہے لیکن اگر بالغ نوجوان کی نمازوں پہ نمازیں قضا ہوتی ہیں، اس خرابی کا کوئی احساس نہیں ہوتا، اور ادھر کم ہی لوگوں کا خیال جاتا ہے کہ تعلیمی امتحان میں ناکامی کوئی گناہ کی بات نہیں ہے اس کی تلافی بھی ہوسکتی ہے، آخرت میں سالانہ امتحانات کے بارے میں باز پرس نہیں ہوگی مگر نماز کی قضا پہ شدید گرفت

نے گی۔ مقصود عرض کرنے کا یہ ہے کہ ہمارے مذہبی گھرانوں تک میں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی دنیا بنانے پر تو پوری توجہ دی جاتی ہے مگر ان
ت کے لئے کم ہی سوچا جاتا ہے، اس کی سب فکر کرتے ہیں کہ اولاد دنیا میں عیش و آرام سے رہے، زندگی کو خوشحال بنانے کے لئے زیادہ سے زیادہ
جہیا ہو جائیں لیکن اس طرف دھیان نہیں جاتا کہ اولاد کو عذاب جہنم سے بچانے کی تدبیر بھی کی جائے!

اصلاح معاشرہ کے لئے ہم سب جو اصلاح کے مبلغ و منادی ہیں، خود نمونہ عمل بنیں، اور اپنے گھر، محلہ اور بستی میں اپنی استطاعت
لک وگوں پر محنت کریں، اپنا وقت دیں، ان کی جھڑکیاں سنیں۔ طرح طرح کی ناگواری برداشت کریں، وقت، نفس، آرام
و پیہ پیسہ کی قربانی اور ایثار کے ساتھ اصلاح معاشرہ کی کوششیں ضرور بار آور ہوں گی!

جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، وہاں تو منکرات کو طاقت کے ذریعہ مٹانے کا سوال مشکل ہی سے پیدا ہوتا ہے، جن ملکوں میں
نوں کی غالب اکثریت ہے وہاں کے عوام مسلمان قانون کو تو ہاتھ میں نہیں لے سکتے، مثلاً سود گناہ کبیرہ ہے، قرآن اور احادیث میں
کے لئے شدید وعیدیں آئی ہیں، مسلمان ممالک میں آخر عوام طاقت کے ذریعہ سود کو کس طرح مٹائیں کیا وہ بنکوں اور سودی کارو
نے والے اداروں پر دھاوا بول دیں، یہی صورت شراب کی ہے، شراب خانوں کی توڑ پھوڑ خود ایک جرم قرار پائے گی، زانیوں کو عوام
سا نہیں کر سکتے!

اسلامی ممالک میں معاشرے کو درست کرنے کی سب سے زیادہ کارگر اور مؤثر تدبیر یہ ہے کہ ان ملکوں کی حکومت ایسے غیر پسند مسلمانوں کے
ل میں ہو جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا جذبہ اور داعیہ رکھتے ہوں، مسلمانوں کے جس ملک میں بھی اقتدار ایسے صالح افراد کے قبضہ
جائے گا۔ طاقت اور قانون کے ذریعہ منکرات پر پابندی لگائی جاسکتی ہے بلکہ ان کو بڑی حد تک مٹایا جاسکتا ہے، مگر اس بدقسمتی کا
علاج ہے کہ آئینی طور پر انقلاب حکومت کے لئے جو جماعت کوشش کرتی ہے اس کو دنیا دار، اقتدار کا بھوکا اور سیاست باز کہہ کر
دون کیا جاتا ہے۔

معاشرہ کتنا ہی خراب ہو اور حالات کیسے ہی بگڑے ہوئے کیوں نہ ہوں اصلاح حال کی کوششوں سے غافل نہ رہنا چاہئے! حرکت
برکت ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو نیک بننے اور نیکی پھیلانے کی زیادہ سے زیادہ توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

مولانا شمس تبریز خاں

ابوالعتاہیہ

ابوالعتاہیہ لقب ، اسماعیل بن قاسم نام ، اور کنیت ابواسحاق تھی ۔ ۱۳۰ھ میں کوفہ میں پیدا ہوا ، شروع زندگی میں اس کا شمار ارباب نشاط اور طائفہ چنگ و آہنگ میں تھا ۔ اور ایک عرصہ ظروف کے کاروبار میں بھی گزرا ۔ اخیر دور میں شعر کا ذوق غالب ہوا تو عباسی خلفاء کے دربار سے تعلقات استوار ہو گئے جس کے نتیجہ میں " شعر کی داد بھی پائی اور مدح کا صلہ بھی "

۲۱۱ھ میں وفات ہوئی ۔ بغداد میں اس کی قبر " منظرۃ الزیاتین " کے سامنے نہر عیسیٰ پر واقع ہے ، وفات سے پہلے یہ خواہش ظاہر کی کہ مشہور مغنی مخارق سے اپنے یہ دو شعر سننا چاہتا ہوں ۔

اذا ما انقضت عنی من الدھر مدتی فان عزاء والباکیات قلیل
سیعرض عن ذکری وتنسیٰ مودتی ویحدث بعدی للخلیل خلیل

(جب میری زندگی ختم ہوگی تو ماتم سرائیوں کے بعد میری یاد اور محبت بھی فراموش ہو جائیگی اور دوست کا نیا دوست پیدا ہو جائیگا)

اور اپنے کتبۂ قبر کے لئے یہ شعر پسند کیا :

ان عیشا یکون آخرہ الموت
لعیش معجل التنغیص

عربی نقادوں کی رائے ہے کہ " کان شعرہ کثیر المعنی ، قلیل التکلف ، غزیر المادہ ، لطیف المعانی ، سہل الالفاظ کثیر الافتنان " (اس کے شعر معنی خیز ، بے تکلف ، گہرے ، سہل اور لطیف ہوتے ہیں)

بدیہہ گوئی ، ارتجال ، اور زود گوئی کے لئے بھی اپنے معاصرین میں ممتاز تھا ۔ اردو میں جس معنی کے لئے " طباع " ہے عربی میں اسے مطبوع سے تعبیر کرتے ہیں ۔ چنانچہ ناقدوں کا کہنا ہے اپنے زمانے کے " اطبع الناس " تین تھے ، بشار ، سید حمیری ، اور ابوالعتاہیہ ۔

اس لئے ان تینوں شاعروں کا کلام جمع نہیں ہو سکا اور دواوین کا بڑا حصہ ضائع ہو گیا ۔ ابونواس سے اس نے پوچھا دن میں کتنے شعر کہہ لیتے ہو ؟ اس نے کہا بس ایک یا دو شعر ۔ اس پر ابوالعتاہیہ نے کہا ۔ مگر میں تو سو دو سو کہہ لیتا ہوں ، ابونواس نے چوٹ کی اگر مجھ سے یا عتب ما دلی ، یالیتنی لم ادل جیسے چلتے پھرتے ہلکے شعر کہنا ہوتے ہزار دو ہزار کہہ لیتا ۔ میں تو ایسے شعر کہتا ہوں جس سے تم مدت العمر عاجز رہ جاؤ گے " یہ صحیح ہے کہ اس کی کثرت کلامی میں ہلکی بحروں کو دخل ہے مگر سب کے لئے یہ کام آسان نہیں ۔ کہیں کہیں تو اس کے اشعار پر سہل ممتنع کا دھوکہ ہوتا ہے ۔

اس کی زود گوئی کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ زہد واشال کے لئے مشہور ہے مگر اس کا دیوان صرف صوفیانہ مضامین پر مشتمل ہے اور امثال

پر مشتمل ۴ ہزار اشعار میں سے صرف ... ہم ملے ہیں (کتاب الاغانی) تا دلکلام اتنا تھا کہ شعر میں بات کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ "لوشئت ان اجعل کلامی کلہ شعرا لفعلت" اور کہتا تھا کہ "انا اکبر من العروض" اس لئے کہ اس کے ہاں بعض اوزان عروض سے الگ ہیں۔ اس کا کمال ہے کہ نہایت مضمون کی یک لی اور یکرنگی کے باوصف اس کا انداز ابلاغ اور طرز ادا بدلتا رہتا ہے۔ مواد کی بے رنگی ہیئت (FORM) کی نیرنگی سے دلچسپ ہو جاتی ہے۔

پند و وعظ کے لئے اس کا اسلوب مناسب ہے تفنن وطباعی کے لحاظ سے وہ اس کا قائل معلوم ہوتا ہے کہ ع

اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

بہرحال اس کا کلام اپنے زمانہ کے "اسلامی ادب" کا اچھا نمونہ ہے ابونواس، بشار، کثیر عزہ، اور صریع الغوانی ایسے تشبیب و نسیب دلخواہ رائے شاعروں کے ماحول میں اس سے صالح ادب کی بنیاد مضبوط کی یہ اس کا کم کارنامہ نہیں، گو اس کے پیشرو ابن المقفع نے اس رنگ میں کم لکھا اور ابوالاسود دؤلی، احنف بن قیسؓ اوران سے بھی پہلے لبیدؓ، نابغہ جعدی، کعب بن زہیرؓ اور عبداللہ بن رواحہؓ اور حضرت حسانؓ اس کے پہلے مکمل نمونے گزر چکے تھے۔ اس کے بارے میں اصمعی کی رائے تھی "شعرہ کساحۃ الملوک فیہا الجوھر والذھب والتراب والخزف والنوی" دینی حلقوں میں اس کا کلام ہمیشہ مقبول رہا ہے۔ حتیٰ کہ لوگوں نے مثنوی رومی کی طرح دیوان ابوالعتاہیہ بھی بعض لوگوں کو حفظ تھا۔

مگر اس کی زندگی اس کے ادب کی ترجمان نہ تھی۔ وہ بخل اور عشق بازی کے لئے مشہور تھا اور مہدی کی باندی عتبہ کا شکستہ آستان اس کا کعبۂ عشق تھا۔ ابن اثیر نے الکامل میں لکھا ہے کہ نوروز کی تقریب پر اس نے خلیفہ کی خدمت میں ہدیہ میں ایک عمدہ کپڑا بھیجا جس کے کناروں پر یہ شعر لکھ بھیجے جو عتبہ کے لئے حسن طلب تھے:

یا معلقۃ اللہ والقائم المہدی یکفیہا
ثم یلطفنی فیہا احتقارن للدنیا ومافیہا

جب مہدی نے عتبہ کو ہدیہ میں دینا چاہا تو وہ بہت گھبرائی اور حق صحبت کا واسطہ دلا کر اسے باز رکھا۔ مہدی نے ہدیۃً جمال کی جگہ ہدیۃً مال کا حکم دیا تو شاعر اور درباریوں میں یہ اختلاف ہو گیا کہ درہم دئے جائیں۔ یا دینار۔ اور یہ جھگڑا سال بھر تک چلتا رہا۔ عتبہ نے یہ دیکھ کر کہا۔ اگر یہ عاشق ہوتا تو میرے عشق سے درگزر کر کے درہم و دینار کی بحث میں نہ پڑتا۔ عتبہ سے منسوب اس کے چند شعر یہ ہیں۔

وتعل صوت الیٔ حتٰی ھام من فرط التصابی
یکدالجلیس اذا دنا ریح التصابی فی ثیابی

(فرط محبت میں میرا حال یہ ہے کہ ہم جلیس میرے کپڑوں سے لپٹے محبت محسوس کرتے ہیں)

ابونواس اور بشار کے ساتھ اس کے معاصرانہ تعلقات تھے، صاعد لغوی نے کتاب الفصوص میں لکھا ہے کہ اس نے بشار کے ان شعروں کی تعریف کی ہے

کم من صدیق لی اسا رقۃ البکاء من الحیاء
واذا تفطن لامنی فاقول مالی من بکاء
لکن ذھبت لاتدی فطرفت عینی بالرداء

بشار نے اعتراف کیا کہ میں نے یہ مضمون آپ ہی سے لیا ہے۔

وقالوا قد بکیت فقلت کلا وهل یبکی من الجزع الجلیل ؟

ولکن قد اصاب سواد عینی عوید قذی له طرف حدید

فقالوا ما لدمعهما سواء اکلتا مقلتیک اصاب عود

(اگر جب میرے رونے کو پوچھتے ہیں تو میں بیان کرتا ہوں کہ آنکھ میں تنکا آپڑا تھا تو لوگوں نے کہا کیا دونوں میں تنکے آگرے تھے ؟)

صاحب کہتا ہے کہ حطیئہ ان دونوں سے پہلے کہہ گیا ہے :

اذا ما العین فاض الدمع منها اقول بها قذی وهو البکاء

ابوالعتاہیہ اور خلفائے عباسیہ

ابوالعتاہیہ کا تعلق مہدی، ہادی، ہارون اور مامون کے درباروں سے رہا ہے، عقد الفرید، ابن خلکان اور اغانی وغیرہ میں تفصیل ہے۔ مامون کی شریشی، ابن عبدالبر، مسعودی جیسے علما اور ادیبوں نے اس کے تذکرے نقل کئے ہیں ——— اشجع سلمی کی روایت ہے کہ میں مہدی کے دربار میں بشار کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا، دربار پر خاموشی چھائی ہوئی تھی، کہ ابوالعتاہیہ آپہنچا۔ بشار نے پوچھا کیا یہاں بھی وہ شعر پڑھے گا ؟ اتنے میں مہدی نے اس سے فرمائش کی اور اس نے پڑھنا شروع کیا۔

الا ما لسیدتی ما لها ادلت فاجمل ادلالها

بشار نے یہ سن کر مجھ سے کہا "اس سے اچھا کیا کہا جاسکتا ہے ہے ؟" اور جب وہ گیت کے شعروں پر پہنچا تو نابینا بشار نے سن کر کہا کہ "دیکھو خلیفہ اس کی داد کے لئے اٹھ تو نہیں گیا ہے ؟" آخر میں انعام ابوالعتاہیہ کو ہی ملا۔ ابوالفرج نے صولی اور عنزی سے روایت کی ہے کہ ہارون کو دریا کی سیر میں ملاحوں کے گیت سننے کا بہت شوق تھا۔ مگر لہو ولعب پر مشتمل کلام اسے ناپسند تھا اس نے کہا کہ میرے شاعر نے اس موقعہ کے لئے کچھ کیوں نہیں کہا، سب نے کہا کہ ابوالعتاہیہ ایسا کہہ سکتا ہے مگر وہ جیل میں ہے ہارون نے اس سے فرمائش کی مگر اسے آزاد نہیں کیا جس پر اس نے حزنیہ شعر کہے جنہیں سن کر ہارون زار زار رونے لگا وہ بہت رقیق القلب تھا مورخین کہتے ہیں "کان من اغزر الناس دموعا وقت الموعظة" فضل بن ربیع نے جب یہ حال دیکھا تو ملاحوں کو روک دیا ۔

ایک بار اس نے رزاق کی دکان پر بیٹھے بیٹھے وہ قطعہ لکھا ؎

الا اننا کلنا بائد وای بنی آدم خالد

ادھر ابونواس کا گزر ہوا تو اس نے کہا کاش میرے سارے کلام کے بدلے یہ اشعار ہوتے !

اصفہانی کہتا ہے کہ فضل، ابوالعتاہیہ کا شیدا تھا، مگر برامکہ سے جلتا تھا۔ چنانچہ ان کے حسرتناک انجام کے بعد اس نے ابوالعتاہیہ سے فرمائش کی تو اس نے یہ شعر کہے ۔

ولی الشباب فما له من حیلة وکسا ذوائبی المشیب خمارا

این البرامکة الذین عهدتهم بالامس اعظم اهلها اخطارا

(عہد شباب جاچکا، وہ میرے قدر دان برامکہ کہاں چلے گئے ۔ جو بڑی شان والے تھے)

یہ سنکر فضل کا رنگِ رخ بدل گیا ۔ اور اس نے ابوالعتاہیہ سے توجہ ہٹالی ۔

اس کے کچھ خاص شعر جو پسند آئے درج ذیل ہیں :-

ع　امنت باللہ والقیت، واللہ حسبی ایما کنت　　کم من اخ لی خاننی ودہ، رماتید لت وما خنت

تخب دمن الدنیا فانک انما　　سقطت الی الدنیا وانت مجرد

ع　برمت بالناس واخلاقھم　　نصرت است انس بالوحدۃ

ما اکثر الناس لعمری وما　　اقلھم فی حاصل العدۃ

علیکم سلام اللہ انی مودع　　وعینای من مض التفرق تدمع

فان نحن عشنا یجمع اللہ بیننا　　وان نحن متنا فالقیامۃ تجمع

ع　لعمرک ما شیء من العیش کلہ　　اقر لعینی من صدیق موافق

وکل صدیق لیس فی اللہ ودہ　　فانی بہ فی ودہ غیر واثق

ع　والان صار لی الزمان مودبا　　فغدا اعلی وراح بالامثال

ع　ما احسن الدین والدنیا اذا اجتمعا　　وما اقبح الکفر والافلاس بالرجل

اذل الی صرت فی زی مسکین　　وصرت اذا استغنیت عنی تنحینی

تباعدت اذا باعدتنی وطرحتنی　　وکنت قریب الدار اذ کنت یعنی

وما العز الا عز من عز بالتقی　　وما الفضل الا فضل ذی الفضل والدین

حلبیات کے دو شعر ہیں جس پر اسے رنا ئی ملی تھی ۔

زکلفتنی ما حلت بینی وبینہ　　وقلت سا لبغی ما تریدوما تھوی

فلو کان لی قلبان کلفت واحداً　　ھواک وکلفت الخلق لما یھوی

فتشت ذی الدنیا فلیس بھا　　احداً اراہ لاخر ما مل

حتی کان الناس کلھم قد افرغوا　　قل افرغوا فی قلب ما حل

عجبت حتی غمنی السکوت　　صرت کانی حائر مبہوت

فکل ما یزوی وان قل الم　　ما اطول اللیل علی من لم ینم

ان کان لا یغنیک ما یکفیکا　　فکل ما فی الارض لا یغنیکا

یہ اشعار اس نے اپنے کتبۂ قبر کے لئے کہے تھے :-

عشت تسعین حجۃ　　فی دیار التزعزع

لیس زاد سوی التقی　　فخذی منہا او دعی

این اخوانی الذین　　کان الیھم تطلعی

مت وحدی فلم یمت　　واحدٌ منھم معی

ترجمہ اشعار :—

- اللہ پر ایمان لایا اور اللہ ہر جگہ میرے ساتھ رہا، میرے دوستوں نے دھوکہ دیا اور میں نے نہ دھوکہ دیا نہ عہد وفا توڑا
- دنیا میں مجرد ہی رہو اس لئے کہ تم تنہا ہی آئے بھی تھے۔
- میں نے لوگوں کا جائزہ لینے کے بعد خلوت اختیار کی، دیکھنے پر انسان کتنے ہیں مگر در اصل ایک بھی نہیں۔
- تمہیں میں فی امان اللہ رخصت کرتا ہوں اور میری آنکھیں اشکبار ہیں اگر زندہ ہے تو صحبت باقی ورنہ قیامت میں ترجیع ہوں گے۔
- موافق دوست سے بہتر عیش ممکن نہیں اور جس کی محبت اللہ کے لئے نہ ہو مجھے ایسے دوست پر بھروسہ نہیں۔
- زمانہ میرا استاد بن گیا ہے وہ شام و سحر مجھے امثال سے سمجھاتا رہتا ہے۔
- دین دنیا کا اجتماع کتنا خوشگوار اور کفر و افلاس کا اتفاق کیا ناگوار ہوتا ہے۔
- میرے لئے سوا میری امید کے کوئی حیلہ نہیں۔ آپ کے عفو اور اپنے حسن ظن سے مجھے امید ہے۔
- مجھے پھٹے حالوں میں دیکھ تم نے آنکھ بدل لی۔ اور آج تم کترا رہے ہو۔
- آج تم اتنے دور ہو گئے ہو حالانکہ میں تمہارا پڑوسی ہوں۔ عزت تو تقویٰ سے ہے اور فضیلت علم و دینداری کو ہے۔
- تو نے جب میری مرضی کے خلاف حکم دیا، تو میں نے کہا کہ میں ایسا ہی کروں گا، مگر ایسا اس وقت ہو سکتا ہے جب میرے سینے پر دو دل ہوں۔
- عجائب دنیا نے مجھے سکوت پر مجبور کیا گیا ہے میں مبہوت و حیران رہ گیا انسان ہوں۔
- ہر انیا پیالم ہے۔ رات ، جاگنے والے پر کستد بجاری ہے۔
- اگر تمہیں تم میں قناعت نہیں تو دنیا تمہیں غنی نہیں بنا سکتی۔
- عالم بے ثبات ہیں، ۹ سالی رہا۔ تقویٰ کے سوا کوئی زاد راہ نہ کام آیا۔
- میرے وہ دوست کہاں ہیں جو رات دن کے ہم جلیس تھے، میں آج تنہا مرتا ہوں تو میرے لئے کوئی نہیں مرتا۔

مضمون لکھنے کے بعد نیاز فتحپوری کے نگار میں اور مولانا سرر کے دلگداز میں مضامین دیکھے گر نقطہ نظر کا فرق ہے۔ اس لئے میرے مضمون پر "تکرار" کا اطلاق شاید نہ ہو۔ (اس مضمون کا مسودہ گم ہو گیا اس لئے کاپیاں پڑھنے میں کتابت کی غلطیوں کی اصلاح نہ ہو سکی)

مولانا عبدالباری ندوی
(سابق پروفیسر فلسفہ عثمانیہ یونیورسٹی)

سائنس اور مذہب

سنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سنی نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

یاد رکھنے کی پہلی بات یہ ہے کہ اصولاً سائنس اور مذہب کا موضوع بحث اور ان کے مسائل و حدود بالکل جدا جدا ہیں ۔
نس اپنے محدود دائرہ میں کائنات ہستی کی صرف درمیانی داستان سناتی ہے ، بالذات کائنات کی ابتدا و انتہا کے سوالات سائنس
سروکار نہ اس کی رسائی یعنی موجودات عالم کا جو آج براہ راست یا بواسطۂ آلات ہمارے مشاہدہ و تجربہ میں آتا ہے سائنس کا کام بس
، کے باہمی روابط و علائق کے قوانین و قواعد کا انضباط ہے بہ الفاظ دیگر قرآنی اصطلاح میں سائنس کا اصل موضوع بحث و تحقیق صرف
لم شہادت ہے یا بہ اصطلاح فلسفہ عالم مشاہدات و مظاہر (فنامنا) باقی اس عالم شہادت یا مظاہر کے پس پردہ اس کے غیب اول و آخر
باطن میں کیا حقیقت (REALITY) چھپی ہوئی کا سفر ما ہے یہ انسانی علوم فلسفہ خصوصاً فلسفہ مابعد الطبیعیات کا دائرہ بحث رہا ہے
، دائرہ میں بھی ہماری انسانی عقل و منطق کو رہنمائی چاہے نا چار ہستی کی درمیانی داستان کے مطالعہ و مشاہدہ ہی سے حاصل کرنا پڑتی ہے ،
درمیانی مشاہدات و تجربات زندگی طور پر دو مختلف بلکہ متضاد صورتوں کے معلوم ہوتے ہیں ۔ ایک وہ جن کو ہم خود اپنی ذات و ذہن سے بلط ہر
کل باہر ایک خارجی مکان و زمان کی نا محدود وسعتوں میں ان گنت گوناگوں رنگ روپ ، ہیئت و صورت اور قد و قامت کی جاندار
بے جان جسمانی صورتوں میں زمین سے آسمان تک پھیلا ہوا پاتے ہیں ۔ کچھ ان جسمانی موجودات کا گویا آنکھوں دیکھا خارجی وجود
ر بہت کچھ اپنی زندگی کی ہر روز کیا ہر لمحہ کی حاجتوں کی ان سے وابستگی کی بنا پر یہ خارجی دنیا اور اس کی اہمیت ہماری نظروں میں اتنی کھب
باتی ہے کہ اس کے مقابلہ میں خود اپنی ذات و ذہن کی داخلی دنیا کی کسی اہمیت و معنویت کی طرف التفات نہ ہونے ہی کے برابر رہتا ہے بس کچھ
بچوں جیسا حال کہ ان کی ساری توجہ کھانے پینے ، کھیل کود کی چیزوں میں ایسی بٹی رہتی ہے کہ خود اپنے وجود کا شعوری احساس تک نہیں
ہوتا ، یا جیسے کوئی دلچسپ کھیل تماشہ ، سینما وغیرہ دیکھنے میں عوام و خواص ہر ایک کو ایسی محویت طاری رہتی ہے ، کہ بس تماشہ ہی تماشہ کے سوا
ود تماشائی یا خود اپنی ذات کے معاملہ میں خود فراموشی کا عالم رہتا ہے ۔

اور اس عالم شہادت کی عام عملی زندگی کے لیئے عین تکوینی حکمت و مصلحت بھی یہی تھی کہ خارجی دنیا کو آدمی ویسا ہی جوں کا توں اپنی
داخلی ذات و ذہن سے باہر بذات خود مستقلاً موجود سمجھتا یا جانتا رہے ، جیسا کہ وہ حواس و مشاہدہ و تجربہ میں دن رات محسوس ہوتی رہتی ہے ۔ مغالطہ

فقط ایک ہی ہوا۔ وہ بھی صاف سیدھی معمولی عقل وفہم (Common Sense) کو نہیں بلکہ نام نہاد غیر معمولی فلسفیانہ اور سائنسی فہ
وتحقیق والوں کو ان ہی میں ایک جماعت نے دھوکا یہ کھایا کہ ہماری ذات وذہن سے باہر ہمارے ہی جیسے باشعور انسانوں کے پہلو بہ پہلو ان سے بہ
زیادہ کثرت تعداد میں اور پہاڑوں سمندروں جیسی بلکہ ان سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر عظیم ومہیب اجرام سماوی کی جو اتھاہ کائنات پھیلی ہو
ہے ہو نہ ہو ان ہی کنکر پتھر جیسے بے ذہن وزندگی والے جمادی جسموں ہی کے کسی نہ کسی حصہ کے اربوں کھربوں سال کے دوران اپنے ہ
سے کسی نہ کسی الٹ پھیر سے انسانی ذہن ابھر آیا۔ پھر ان بے شعور وبے ذہن اجسام ہی کو مادہ کا ایک کلی یا تجریدی[1] نام دے دیا۔ اس مادہ کی ابتد
ہیولائی (بہ رنگ ارسطو) یا بہ رنگ دیمقراطیسی صورت نے بلا کسی بیرونی عامل کی مداخلت کے آپ ہی آپ ساری سماوی وارضی جمادی دنیا کی
طرح حیوانی وانسانی موجودات کو بھی کسی نہ کسی طرح اپنے ہی بطن سے جنم دے دیا۔ اسی بے شعور وبے ذہن مادہ کی خود بخود تخلیق کے نظریہ کا نام
مادیت ہے، یہ فلسفہ خود قدیم وجدید فلسفہ کی سرزمین میں تو زیادہ پنپنے نہیں پایا، البتہ جب سائنس کی ابتدائی دو تین صدیوں میں اس فتح کا
نقارہ اس زور سے پیٹا گیا کہ یہ پورے جدید فلسفہ کی تصوریتی تاریخ کی آواز بن کر رہ گئی۔

تحقیقات واکتشافات بالآخر انیسویں صدی کے اواخر سے خود سائنس نے ایسا پلٹا کھایا کہ بڑے سے بڑے رجال سائنس کو عین
سائنس کی راہوں سے بالکل "برعکس نام نہاد نہنگی کافور" کا اکتشاف ہو کر رہا اور برکلے جیسے قطعی منکر مادہ فلسفی تک کی بولیاں بولی جانے لگیں
اتنا مسلم ہی ہو کر رہا کہ ہمارے ذہن سے باہر اگر کوئی نام نہاد مادی دنیا پائی بھی جاتی ہے تو وہ الکٹران وغیرہ برقی ذرات کی صرف مجنونانہ
حرکت ہے۔ پھر خود برق یا برقی ذرات کی بجائے خود حقیقت معلوم ہی نامعلوم ہے۔ باقی رہی ہماری زمین سے آسمان تک کی حواسی اور اکات والی
دنیا جس کو ہم تمام تر ذہن سے باہر محسوس کرتے رہتے ہیں۔ بلکہ خود اپنا بے شمار اندرونی بیرونی اعضاء وجوارح والا چلتا پھرتا جسم تک ہمارے اپنے
ذہنوں سے باہر قطعاً نابود ہی نابود اور بالکلیہ ذہن ہی ذہن کی تعمیر وتخلیق ہوتا ہے اور ذہن سے خارج ان کا کیا ان کے مماثل یا ملتی جلتی
چیزوں کا بھی دور دور کوئی وجود نہیں ہوتا۔

دیکھنے سے بھی زیادہ ہم کو ٹھوس (SOLID) اجسام یا ٹھوس مادہ کے خارجی وجود کا مغالطہ چھونے ٹٹولنے ٹکرانے وغیرہ کے
لمسی احساسات سے ہوتا ہے۔ اس کی بجائے خود سائنسی یا طبیعیاتی حقیقت کیا ہوتی ہے برٹرنڈرسل کی زبان سے سنو۔

"جس چیز کو تم ٹھوکر مارتے ڈھکیلتے یا جس سے ٹکراتے ہو اس کو تو (بظاہر) حقیقی وواقعی (یا بجائے
خود خارج میں موجود۔ م) ہونا ہی چاہئے۔ یہی عام آدمی کی مابعد الطبیعیات ہے۔
لیکن عالم طبیعیات اس کے بالکل برخلاف ثابت کرتا ہے،
کہ تم فی الواقع کبھی کسی چیز سے سرے سے ٹکراتے ہی نہیں۔ حتیٰ کہ جب تمہارا سر مثلاً جب پتھر کی کسی دیوار سے ٹکراتا ہے
تو واقعہ وحقیقت کے اعتبار سے تم اس کو چھوتے یا اس تک نہیں کرتے ہو۔ ... ہوتا دراصل صرف اتنا ہے کہ کچھ
الکٹران اسپروٹان جو تمہارے جسم کا حصہ ہوتے ہیں ان میں اور اس چیز کے الکٹران وپروٹان میں جس کو تم سمجھ رہے

---

[1] اس تجریدی کلیات سازی کے مغالطہ کے لئے فلسفہ، برکلے (شائع کردہ دار المصنفین) کا ضمیمہ بعنوان "تصورات کلیہ" پڑھنے
سے انشاء اللہ ذہن صاف ہو جائے گا۔

کہ مجبور ہے جو صرف جذب واقع (ATTRACTION AND REPULSION) کا عمل ہوتا ہے لیکن اس عمل میں کوئی نفس الامری لمس یا اتصال (CONTACT) قطعاً نہیں پایا جاتا۔ بس تمہارے جسم اور اس دوسری چیز کے جسم کے الکٹرانوں اور پروٹانوں کے قرب کی وجہ سے ان میں ایک ہیجان —— (AGITATION) پیدا ہو جاتا ہے۔

یہی ہیجان و اختلاف جو تمہارے اعصاب کے واسطے سے دماغ تک پہنچتا (یا اس کو متاثر کرتا ہے۔ م) طبعیاتی طور پر وہ تاثر و تصور پیدا کرنے کے لئے ضروری ہوتا ہے، جس کو کسی چیز کا لمس و اتصال (یا اس کو چھونا ٹکرانا) کہا جاتا ہے؟

(بلا اس کے کہ تم واقعاً کسی چیز کو چھو یا ٹکرا رہے ہو۔

" مناسب اختبارات (EXPERIMENTS) کے ذریعہ سے بالکل ایسے ہی (چھونے ٹکرانے کا۔ م) مغالطہ یا دھوکا دینے والا (DECEPTIVE) احساس بھی پیدا کیا جا سکتا ہے۔"

غرض سائنسی یا طبعیاتی طور پر الکٹران و پروٹان وغیرہ کے ذاتی ہیجان کے سوا آنکھ کان ناک اور زبان کے رنگ و بو مزہ وغیرہ کے سے کیا ذکر جن چیزوں کی سختی نرمی گرمی سردی وغیرہ خود اپنے ہاتھوں سے اچھی طرح ٹٹول کر محسوس کرتے ہو جو بجائے خود وہ تمہارے مات جیسی یا ان سے ملتی جلتی خود تمہارے ذہن سے باہر بالکل نہیں پائی جاتی۔

اسی سائنسی حقیقت کا اعلان اور ایک مثال سے سر ایڈنگٹن کی زبان سے بھی سن لیجئے۔ جو شاید کہیں اوپر بھی گذر چکی ہے۔

" ہمارے ذہنی احساسات خارجی اشیا سے کوئی شمہ بھر مماثلت و مشابہت نہیں رکھتے مثلاً میز سے تعلق رکھنے والے جو پیام (MESSAGES) یا اثرات ہمارے اعصاب کے واسطہ سے سفر کرتے ہیں اور ان سے ہمارے اعصاب میں جو ہیجان یا اختلال (DISTURBANCE) رونما ہوتا ہے۔ وہ نہ (ذہن سے باہر کے) کسی خارجی چیز سے کوئی مشابہت رکھتا ہے اور نہ میز کے اس تصور سے جو ہمارے شعور یا ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔

دوسرے اجسام میز کرسی وغیرہ کو جانے دیں خود اپنے ہی جسم کی جسمانی یا مادی حقیقت پر برٹرنڈرسل ہی کی زبان سے سننے کی ہے کہ

" جس کو اب تک ہم اپنا جسم یا بدن (BODY) کہتے رہے ہیں، وہ درحقیقت بڑی دیدہ ریزی سے بنائی ہوئی صرف ایک سائنسی تشکیل (CONSTRUCTION) ہے جس کے مطابق (خارج میں)

، شک پسندی (WILL TO DOUBT) ص۸۴ شائع کردہ وزڈم لائبریری (WISDOM LIBRARY) نیویارک۔

طبعیات کے ریسرچ اسٹار سے کچھ اپنی مشکلات حل کرنا چاہ رہا تھا، اس میں کوئی خاص تو کوئی خاص مدد ملی نہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں سر جیمس جینز علم و مستند ماہر سائنس جس طرح خود سائنسی ماہروں سے ایک کلی یا کائناتی ذہن کے نتیجہ تک پہونچا ہے جب اس کا ذکر نکلا تو کہنے لگے کہ وہ تو مذہبی آدمی تھا نسیات یا رجحان کا تھا تو میں نے کہا کہ پھر اسی طرح اس نتیجہ کے منکر کو لامذہبی یا الحادی رجحان کا کیوں نہ کہا جائے؟ ماڈرن بلیف ص۸۲ (؟)

کوئی طبیعیاتی حقیقت قطعاً نہیں پائی جاتی ۔"

اسی سلسلہ بحث میں چند سطر آگے اسی رسل کو یہاں تک کہہ دینا پڑا ہے کہ

"اسی طرح مادہ بالکل ایک ایسا بھوت بن کر رہ گیا ہے جو ذہن کو ہانکنے (یا ذہن پر عمل کرنے ۔م) کا کوئی ٹھیک ڈنڈا نہیں بن سکتا ۔"

پھر بھی سچ یہ ہے کہ بھوت خود رسل کے سر سے پوری طرح اتر نہیں سکا جس کا بڑا سبب جدید ترین سائنس کی منطق نہیں بلکہ خود رسل کی "منڈ پسند" یا منکرانہ نفسیات اور اس سے بھی زیادہ بیسویں صدی کی سائنس سے پہلے مسلسل دو تین صدیوں تک جدید سائنس پر بڑی حد تک مادیت ہی مادیت کا چھایا رہنا ہے ۔

بلکہ سچ یہ ہے کہ مادہ کا یہ بھوت عوام سے زیادہ بالکلیہ خواص یا حکما و فلاسفہ کا دماغ زائیدہ یا من گھڑت ہے ورنہ عوام کی صاف سیدھی منطق تو وہی رہی ہے جس پر آج بیسویں صدی کی سائنس کو خود اپنی منطق سے پہنچنا پڑا ہے ۔ یعنی ہمارے علم کی اولین حضوری و بدیہی بنیاد خود ہمارا ذہن و شعور اسی کی دنیا اور اسی کے تجربات ہیں ۔

پھر خود اپنی ذات یا ذہن و شعور کے ان براہ راست حضوری تجربات ہی پر قیاس کرکے عام آدمی کے لئے جن کو وحشی جنگلی تک کہا جاتا ہے یہ ماننا زیادہ فطری و قرین قیاس اور قابل فہم ہوتا ہے کہ دریا، پہاڑ، ابر و باد، چاند سورج ساری موجودات فطرت کے افعال و حرکات کی تہ میں کوئی ایسا ہی ذہن و شعور والا ارادہ کارفرما ہے جیسا کہ ہمارے اندر خود ہمارے جسمانی اعضا کو کام میں لانے والا ہمارا "ذی شعور ارادہ" کام کرتا رہتا ہے ۔

سر آرتھر ایڈنگٹن ہی جیسی شخصیت کی زبانی پھر سنئے جن کے نزدیک سائنسی قوانین اور وحشیوں کے بھوتوں پریتوں یا دیوی دیوتاؤں میں کچھ زیادہ فرق نہیں ۔ نیوٹن کے غیر مرئی یا ان دیکھے قانون کشش تک کا غیر متمدن وحشیوں کے ان دیکھے بھوت پریتوں ہی کا سا کچھ معاملہ ہے ۔

"کائنات کا وہ نظریہ جو کشش جیسے ان دیکھے قانون کی کارفرمائی کو مانتا ہے کیا اس سے کچھ بھی زیادہ سائنسی ہوتا ہے جو وحشی انسان ہر اس چیز کو جس کو کچھ پراسرار پاتے ہیں ان دیکھے دیوی دیوتاؤں (DEMONS) کی طرف منسوب کر دیتے ہیں ۔"

البتہ نیوٹنی طبعیات والا کہہ سکتا ہے کہ :—

"اس کا قانون کشش والا دیوتا بندھے ہوئے قوانین علت کے مطابق عمل کرتا ہے ۔ اس لئے اس کو غیر ذمہ دار لاابالی (IRRESPONSIBLE) دیوتاؤں وغیرہ سے تشبیہ دینا درست نہیں ۔"

لیکن اب خود سائنس میں :—

Thus Matter has becom Together Too ghostly To Be used as an adequate stick with which To beat the MIND

"قطعی علیت سے ہٹنے کے بعد جب فطرت اور فوق الفطرت کا فرق ہی غائب ہو جاتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ وحشی انسان بھی اس بات کو مان لے گا کہ اس کے دیوی دیوتا بھی کسی حد تک عادت پسند (یا معمول کے مطابق ہی کام کرنے والے ہم ہوتے ہیں۔ اس لئے معقول حد تک اُن کے آئندہ عمل کے بارے میں قیاس کیا جا سکتا ہے کہ کیا ہوگا؟"

بہرحال :-

"جب ہم کو سائنسی طور پر اس نتیجہ تک پہونچنا پڑتا ہے کہ قطعی علت، معلول کا عمل کہیں بھی نہیں پایا جاتا تو ہم آپ سے آپ وحشیوں کے ان دیکھے دیوتاؤں کے لئے دروازہ کھول دیتے ہیں[1]"

دیکھے دیوتاؤں یا خداؤں تک کے لئے دروازہ کھل جانے کے بعد پھر ان دیکھے ایک خدا کا معاملہ توحید کے بجائے شرک کا صرف مغالطہ جاتا ہے، جو سب سے بڑا مغالطہ ہی مغالطہ ہے۔ ورنہ انسان اپنی عین فطرت ہی سے توحید پسند واقع ہوا ہے۔ مذہب و فلسفہ ہی نہیں سائنس بھی پرانی نئی ساری سرگرمیوں اور سرگرمیوں کا مرکز و محور توحید ہی توحید (UNIFICATION) کا تقاضا و مطالبہ رہا ہے یعنی نات کی کثرتوں کو گھٹاتے گھٹاتے کسی واحد مبدا، و ماخذ تک پہونچا دینے تک ! اور گو سائنس کی دنیا سے اب بحیثیت مادیت گیا بس ٹھوس ہری مادہ پر اس کی پوری عمارت کھڑی تھی ایک طرف اس کا انہدام ہو چکا ہے تو دوسری طرف روح یا ذہن و شعور کی اولیت کی کم از کم درجہ مسلم ہو چکی ہے کہ جس خارجی حواسی دنیا کو قائلین مادیت تمام تر مادہ ہی مادہ کا کارنامہ قرار دیتے تھے، وہ درحقیقت خود ذہن کی ساختہ ساختہ بن چکی۔ آج کی سائنسی منطق کے ان دو مقدمات کے بعد۔ عامیانہ فلسفیانہ اور سائنسی ــــ ہر ذہن کے لئے کسی نہ کسی رنگ میں ایک وکائناتی یا عالمی و جہانی ذہن شعور یا روح کا نتیجہ ہی قابلِ فہم و قبول رہ جاتا ہے۔ اس لئے کہ نہ کسی عامی و فلسفی اور سائنسداں لئے انانیہ کی طرح یہ قبول کرنا آسان ہے کہ موجود صرف میں ہی ہوں یا میرا ہی میرا ذہن ہے، میرے علاوہ نہ تو میری طرح کے دوسرے کوئی ن پائے ہی نہیں جاتے نہ یہ سمجھنا سمجھانا آسان کہ زمین سے آسمان تک کی ساری اتھاہ کائنات کی گوناگوں محسوس و مرئی بے شمار موجودات ب ہمارے تمہارے اپنے انفرادی ذہنوں کے اندر ہی اندر موجود اور بالکلیہ ان ہی کی تخلیقات و تشکیلات یا صورت گری ہیں۔

اس طرح لے دے کر ایک ہی شق رہ جاتی ہے کہ ہمارے تمہارے انفرادی اناتی ذہنوں کے ماسوا یا ماورا کوئی ایسا غیر فانی بدی ذہن پایا جاتا ہو جس میں انفرادی ذہنوں کے اندر پیدا ہونے والے احساسات و ادراکات ہمیشہ ہمیشہ سے ابدی تصورات یا سلومات کی صورت میں موجود ہوں۔ جن کو وہ ہمارے انفرادی ذہنوں میں ظل و عکس کی طرح خلق یا رونما کر دیتا ہو۔[2] ـــــــ

ـــــــ [2] خارجی موجودات کے لئے ظل و عکس وجود کی یہ تعبیر فلسفہ میں تو افلاطون سے چلی ی تھی اور ہمارے صوفیاء کے ایک محتاط مسلک نے بھی وجودیہ کے مقابل میں اسی تعبیر کو اپنے رنگ میں زیادہ قرین احتیاط پایا۔ اور ب آپ آج بیسویں صدی کے بہتیرے سائنس والوں تک اسی تعبیر میں پناہ لیتے ہیں۔ اوپر بار بار پڑھ آئے ہیں۔

اگرچہ فلسفہ و مذہب کے مابعد الطبعیاتی مسائل سائنس کا بالذات موضوع بحث بالکل نہیں۔ ادھر بھی ساٹھ ستر سال کے

---

[1] THE NATURE OF PHYSICAL WORLD ص ۲۰۹

دوران خود تازہ سے تازہ سائنسی دریافتوں اور انقلابوں نے اپنی ہی راہوں سے اور سب سے بڑھ کر خود طبعیات (فزکس) نے۔ گر نہ ستانی بہ ستم می رسد ـــــ مابعد الطبعیات سے جس طرح دوچار کر دیا ہے اس کے مختلف پہلوؤں کی کچھ تفصیلات اوپر تو بہ تکرار دہرائی جا چکی ہیں یہاں مذہب خصوصاً مذہب اسلام کے خصوصی نقطۂ نظر کو آگے پڑھنے سے پہلے پھر اجمالاً سامنے رکھ لیں ۔

مذہب کا مسلمۃ المسائل خود ہمارے ذہن اور انسان سے باہر کی بظاہر بے ذہن پائی جانے والی ساری مخلوقات کے حی قائم خالق اور اس کی ذات و صفات کا تصور ہے۔

اس کے مقابل اس سے سیدھی ٹکر لینے والا جو نظریہ و خیال موجودہ صدی سے قبل کی دو تین صدیوں کے جدید سائنسی دور میں گویا خود سائنٹفک ترقیوں کا ہی لازمہ و نتیجہ سمجھا کہا جانے لگا، وہ مادیت کا تھا یعنی حیوانی زندگی ہی نہیں بلکہ انسانی ذہن و شعور تک کے اعلیٰ مظاہر (فنافنا) دراصل کنکر پتھر جیسے مادہ نام سرے سے ایک مردہ جامد جوہر ہی کے الٹ پھیر یا انقلابات کے خود اور خود آفریدہ نتائج ہیں ۔

لیکن دور حاضر کے عین جدید ترین سائنسی انقلابات و مسلمات نے مادیت کی اس منطق کو بالکل اُلٹ دیا ہے اور انسٹائن ، ایڈنگٹن ہالڈین شروڈنگر اور ماکس پلانک جیسے بڑے سے بڑے رجال سائنس کے نزدیک ـ جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ـ کائنات کی اساسی حقیقت محض جامد و مردہ مادہ نہیں ، بلکہ ذہن و شعور ہے، اس طرح سچ یہ ہے کہ ان سب ہی نے مذہب کے خدا کو سامنے لا کھڑا کر دیا ہے باقی سے وہی کہ

" دیکھتا سب کچھ ہوں لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں "

تاہم ان ہی مشاہیر سائنس کے ہم سر کم از کم ایک سر جینس نے تو سب سے بڑے مادہ و مادیت شکن خالص فلسفی بر کلے کے لفظاً و معنیً ہم زبان ہو کر ذہن و شعور کی اس اساسی حقیقتِ کائنات کو واحد کلی و کائناتی ذہن (یونیورسل مائنڈ) ہی کا نام بالکل کھل کر دے دینا پڑا۔

بایں ہمہ وحی و نبوت والے مذاہب کے لئے اسی سلسلہ میں بہت بڑے پتہ کی گہری تنبیہ والی بات خود ایڈنگٹن جیسے بہت بڑے سائنداں کی دہرا لینے کی یہ ہے کہ الحاد کے بجائے ایمان کا راستہ دکھلانے والے جدید سے جدید سائنس کے ان سارے انقلابات کے باوجود " اہل مذہب کے لئے اطمینان کی سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ میں اُن کو کوانٹم نظریہ کی وحی کا عطا کیا ہوا خدا نہیں دے رہا ہوں "

یہ بات سب سے زیادہ گوش ہوش سے سننے اور یاد رکھنے کی ہمارے نئے پرانے تمام متکلمین کے لئے خصوصاً ہے پہلے یہ حضرات عموماً یونانی علوم و افکار سے اتنے متاثر و مرعوب رہے کہ گویا ان کو بجائے خود معیاری حقائق تصور کرتے ، وحی کے ایمانی حقائق کو اُن کی کسوٹی پر پرکھتے رہے ۔

ہمارے جدید علماء میں ایک بڑے صاحب علم و قلم ہی نہیں، ماشاء اللہ بڑے صاحب ایمان و صلاح کی تحریر کے حوالہ سے پڑھا کہ " مسائل کو ایسے دلائل کے ساتھ پیش کیا جائے جو موجودہ علوم و فنون اور تجربات و حقائق کے معیار پر بھی پورے اترتے ہوں "

جو نتیجہ ہے تمام تر حقیقی ایمانی انبیائی وحی کی حقیقت کو نہ سمجھنے یا اس پر ایمان کی کمزوری کا ۔

اس لئے انبیائی و ایمانی وحی کی حقیقت و ضرورت کو سمجھنے کے لئے پہلے ذرا ایک مشہور فلسفی سائنسداں ہی کی کتاب پر درج شہادت سے عہد جدید کی تازہ سائنس سے اور خصوصاً مذہب ہی کے معاملہ و مقابلہ میں اس بے معنی مرعوبیت کو دور فرما لیں۔

" دنیا کے دوسرے کام کاج والوں کی طرح سائنسداں بھی اب زیادہ تر ایک عملی انسان ہی بن کر رہ گیا ہے

وہ کوئی اب ایسا جادوگر نہیں رہا ہے جس کے پاس اسرارِ کائنات کی کنجی ہو۔ دوسرے انسانوں کی طرح اس کے طریقے (METHODS) بھی بارہا ناقص ہوتے ہیں۔ اور اس کا علم بھی قطعی کبھی نہیں ہوتا وہ بھی مہمل باتوں تک کا قائل ہو سکتا ہے . . . . سائنس جو کبھی پہلے نام نہاد قطعی یا یقینی علم کا عجائب خانہ —— (REPOSITORY) خیال کی جاتی تھی اب اس میں بالآخر ایسے شکوک و شبہات کی گنجائش نکل آئی ہے کہ مذہب و فلسفہ کے مسائل پر سائنس کے مقابلہ میں ابہام کا اعتراض نہیں کیا جا سکتا؟
"گذشتہ درجن بھر سالوں میں ایسی بیسیوں کتابیں اور سینکڑوں کیا شاید ہزاروں مضامین صرف اس ایک موضوع پر نکل چکے ہیں جس کو جدید ترین طبعیات کے فلسفیانہ (یا مابعد الطبعیاتی و مذہبی۔م) مضمرات و نتائج (IMPLICATIONS) کا نام دیا جا سکتا ہے[۵]"

سائنس کے اس انقلاب میں۔

غیر سائنس داں کے لئے سب سے اعجوبہ کی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ پرانے تصورات والے ٹھوس شئے (ایٹم یا۔م) مادہ کو فنا کیا جا سکتا ہے۔ اس موضوع پر لکھنے والے عام طور پر کوئی موقع اس پر زور دینے کا نہیں چھوڑتے کہ ہیروشیما کی بربادی مادہ کی بربادی (یا فنا) ہی کا نتیجہ تھی۔

اور چونکہ بہتوں کے نزدیک یہ مادہ ہی عین حقیقت تھا جیسا کہ گذشتہ صدی کے ایک نامور سائنس داں پروفیسر ٹیٹ (TEIT) نے "طبعیاتی سائنس کی بعض ترقیوں" پر لیکچر دیتے ہوئے ۱۸۷۶ء میں کہا تھا کہ "مادہ کے حقیقی ہونے یا اس کے خارجی (ECTIVE) معروضی وجود کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ انسان کے پاس کوئی طاقت ایسی نہیں جو اس کو پیدا یا فنا کر سکے۔"[۶]

مادہ کی اس نام نہاد حقیقت پر مبنی اشتراکیت کے باطنی فلسفہ کی جس نام نہاد جدلیاتی مادیت نے دنیا میں آج سب سے زیادہ اودھم مچا رکھا ہے اور اس لئے دعویٰ یہ ہے کہ یہی سائنسی مادیت دنیا کی ساری برائیوں اور مصیبتوں کا علاج ہے، اس کی حقیقت بھی سربراہ اسی مشہور سائنس داں کی زبان سے سن لینے کی ہے کہ "یہ **جدلیاتی مادیت فلسفیانہ طور پر خالص احمقانہ اور سراسر مہمل ہی مہمل ہے**[۷]"

اور گو ہم کو کوانٹم نظریہ یا سائنسی وحی کے خدا پر ایمان لانا نہیں ہے تاہم خود سائنس پر ایمان رکھنے والوں کے لئے یہ حقیقت بار بار خود دوسرے بڑے بڑے سائنس دانوں کی طرح موصوف سے بھی سن لینے ہی کی ہے کہ آج

"مادی کائنات کے زیادہ گہرے مطالعہ و فہم نے خدا پر ایمان کے لئے نئے نئے دروازے کھول دئے ہیں"[۸]

لیکن ان دروازوں کے پیچھے کیا حقیقت پنہاں ہے تو اب

"ماہر طبعیات (فزکسٹ) کا مقصد کسی طرح ظواہر کی دنیا (APPEARANCE WORLD) کے پیچھے حقیقی وجود (REAL EXISTENCE) کو معلوم کرنا سرے سے رہا ہی نہیں . . . ."

---

[۵] و [۶] دیکھو جیمس بی کوناٹ (JAMES B. CONAUT) کی کتاب (MODERN SCIENCE AND MODERN MAN) ص ۵۵ و ص ۵۷ (مطبوعہ ۱۹۵۲ء) [۷] تا [۸] بسلسلہ حوالہ بالا (ماڈرن سائنس اینڈ ماڈرن مین) ص ۹۵ و ص ۱۵۹ و ص ۱۶۰)

بلکہ ———

سائنسی نظریات کی نوعیت اب عقیدوں یا مسلکوں (CREEDS) کے بجائے پالیسیوں (POLICIES) کی ہو کر رہ گئی ہے[۱]

ایک اور سائنس داں ہی کو اپنی کتاب "جدید سائنس اور اس کے فلسفہ" میں ایک طرف یہ اعتراف ہے کہ

"حقیقت یہ ہے کہ آج مشکل ہی سے تم کوئی ایسا رسالہ یا کتاب کھولو گے جس میں ہمارے عام سائنسی خیالات سے بحث ہو اور اس طرح کے بیانات سے دوچار ہونا نہ پڑے "گلیلو کے عہد کا خاتمہ" "سائنس کی روح سے دشمنی کا خاتمہ" —— "میکانی طبعیات کی ناکامی" —— "مذہب و سائنس میں مصالحت"۔

حتیٰ کہ

برنہارڈ نے جدید طبعیات پر اپنی ایک کتاب کا نام ہی رکھ دیا "سائنس مذہب کے راستہ پر"[۲]

بے شک "سائنس مذہب کے راستہ پر" پڑ چکی ہے۔ جیسا کہ اس کے مختلف پہلوؤں پر بحثوں سے اوپر اچھی طرح واضح ہو چکا ہے۔ پھر بھی خود سائنسداں اب تک عموماً و عملاً مذہب سے سرد مہری ہی برتتے اور اس کی ایمانی و ابدی حقیقت کو پانے اور سمجھنے سے بے پرواہ بلکہ گریزاں ہی رہتے ہیں۔ بڑی وجہ ولیم جیمس جیسے ماہر نفسیات کی تشخیص کی رو سے "ارادۂ ایمان" (WILL TO BELIEVE) کا فقدان ہے۔ یعنی وہی نفسیت و ذہنیت کہ "میں نہ سمجھوں تو بھلا کیا کوئی سمجھائے مجھے"؟

سو ایک طرف نہ صرف جس مادہ پر مادیت کی بنیاد تھی وہ خود غیر مادی (IMMATERIALISTIC) ہو کر رہ گیا ہے۔ بلکہ سرے سے اس کا وجود تک چیستان بن گیا ہے۔ دوسری طرف خود سائنسی راہوں سے کم و بیش اتنا معلوم و مسلم ہو جانے کے بعد کہ زمین سے آسمان تک کی آنکھوں دیکھی جس کائنات کو مادی کہا یا سمجھا جاتا رہا ہے اس کی تعمیر و تشکیل کی تہ میں کارفرما اولی و اساسی حقیقت خود ہمارا یا ہمارا ہی جیسا کوئی باطنی ذہن و شعور ہے اور ظاہر ہے کہ خود ہمارا ذہن ہمارے لئے ایک ایسی بدیہی یا وجدانی معلوم بالذات حقیقت ہے کہ اس کے وجود اور صفات و افعال کے لئے نہ ہم کسی دلیل و حجت کے محتاج ہیں نہ خود اپنے ہی جیسے کسی اعلیٰ ذہن و شعور اور اس کے صفات و افعال والی ذات کا تصور قبول کرنا کوئی بعید از سائنس بات رہ گئی ہے۔ جیسا کہ نام نہاد مادہ جیسی ایک بالکلیہ بے ذہن و شعور ہی سے نہیں سرے سے زندگی کی حس و حرکت تک سے محروم ذات کو خالق کائنات اور اس سے بڑھ کر انسان جیسی صاحب ذہن و شعور ذات کو خالق تصور کرنا۔

یہی وہ سب سے بڑا عصر حاضر کا سائنسی انقلاب ہے جس نے سائنس کو چار و ناچار مذہب کے راستہ پر ڈال دیا ہے، جو منطقی طور پر صرف دین و نبوت کے ایمان و اعتقاد ہی کی طرف لے جا سکتا ہے۔ بڑے سے بڑے ماہرین سائنس تک کو بے ذہن و زندگی مادہ کے مقابلہ میں ذہن و شعور ہی کو کائنات کی اولی و اساسی حقیقت ماننا پڑا ہے۔ آئنسٹائن اور ماکس پلانک تک جن کو ان کے نظریۂ اضافیت اور کوانٹم نظریہ کی بنا پر سب سے عظیم انقلاب انگیز سائنسداں قرار دیا جاتا ہے ان دونوں کا اعتراف بھی اوپر گزر ہی چکے کہ کائنات کی اساسی حقیقت ذہن و شعور ہی ہے اور ماکس پلانک کے الفاظ میں تو شعور کی توجیہ مادہ اور اس کے قوانین سے ہرگز نہیں ہو سکتی بلکہ بالکل برعکس خود مادہ ہی شعور سے ماخوذ و مستفاد ہے۔

---

[۱] [۲] بہ سلسلہ حوالہ بالا (ماڈرن سائنس اینڈ ماڈرن مین) ص ۱۵۵، ص ۱۵۹، ص ۱۶۰

کہاں جدید سائنس کی دو تین صدیوں سے مدعیانہ رٹ یہ چلی آ رہی تھی کہ مادہ نہ صرف مادی کائنات کا ماخذ و مبداء ہے بلکہ ذہن جو اپنے افعال و صفات میں مادہ کی بالکل ضد معلوم ہوتا ہے اس کی توجیہ بھی مادی قوانین ہی سے ہو جاتی ہے۔ کہاں آج انیسویں صدی کی جدید ترین سائنس ہی کو اُلٹ کر یہ اقرار کرنا پڑا ہے کہ کائنات کی اساسی حقیقت ذہن و شعور ہے اور ذہن سے باہر جس کو مادی کائنات کہا جاتا ہے وہ خود ذہن کا کارنامہ یا اسی سے ماخوذ (DERIVED) ہے۔

باقی دوسرے ۔ رہے یہ "انا و لا غیری" والا انائیہ (SOLIPSISTS) کا یہ انتہا پسندانہ دعوٰی عام انسانی فہم سلیم کیا عام سائنسی و فلسفیانہ عقل کس طرح ہضم کر سکتی ہے کہ ذہن و شعور والا واحد و انفرادی ذہن صرف میرا ہی میرا ہے۔ بالفرض میں ہی میں موجود ہوں میرے انا (EGO) یا ذہن کے سوا نہ دوسرے میرے جیسے کوئی انسان اور انسانی اذہان پائے جاتے ہیں اور نہ میرے انا و ذہن سے باہر زمین سے آسمان تک پھیلی ہوئی کوئی خارجی کائنات ہے، بس سب صرف میرے ہی انفرادی ذہن و شعور کی پیداوار ہی نہیں، بلکہ اس کے ما وراء ان کا قطعاً کوئی وجود ہی ثابت نہیں۔

ورنہ بقول ایڈنگٹن ایک طرف ۔

"خارجی و طبعی دنیا کو ماننے کے لئے اپنے علاوہ دوسروں کے احساسات کا ماننا لازم ہے جس کا انائیت (SOLIPSITS) کو انکار ہے اس لئے علمائے طبعیات انائیہ کے شدید مخالف ہیں۔"[1]

دوسری طرف

"احساسات کے ایک ہی طرح کے بہت ملتے جلتے یکساں مجموعوں یا ڈھانچوں (STRUCTURES) کا مختلف شعوروں یا ذہنوں میں رونما ہونا بس طبعیاتی سائنس کا نقطۂ آغاز ہے۔"[2]

اور اس طرح

ان ڈھانچوں کا مختلف ذہنوں یا شعوروں کے لئے یکساں اور ملتا جلتا ہونا ہی بتاتا ہے کہ ان کی کوئی نہ کوئی مشترک علت انفرادی ذہنوں سے باہر پائی جانی چاہئے۔"

اتنی بات بالکل معقول ہے کہ ہمارے ان مشترک یکساں احساسات کی علت یا مبداء و منشاء بے شک کوئی نہ کوئی ہمارے انفرادی ذہنوں کے علاوہ یا ماوراء ہی ہونا چاہئے۔ باقی اس کا بجائے خود بے ذہن یا نام نہاد مادہ ہونا، پہلے بھی ایک دور از عقل بات تھی اور اب تو سائنسی طور پر خود مادہ کے سدھ طور پر غیر مادی ہو جانے کی سرے سے اس کے وجود تک مشکوک ہو جانے کے ساتھ ساتھ خود ذہن و شعور کے کائنات کی اساسی و بنیادی حقیقت ثابت ہو چکنے کی صورت میں ایک کائناتی ذہن (UNIVERSAL MIND) ہی کو ماننا اقرب الی الفہم رہ جاتا ہے۔

اس کائناتی ذہن کی امتیازی خصوصیت جیسا کہ اوپر ابتداء ہی میں تفصیل و توضیح ہو چکی ــــــ شعور غیب پر مبنی شعوری علم ہے یا آرتھر ایڈنگٹن کی تعبیر میں "انسان کے اندر جو اس کا روحانی عنصر (SPRITUALELEMENT) پایا جاتا ہے وہ علم یا جاننا ہی ہے۔ یعنی جس حقیقت و خصوصیت کو انسانی روح کہا جا سکتا ہے وہ یہی ہے جو جانتی ہے۔"

---

[1] فلاسفی آف فزیکل سائنس صفحہ ۱۹۹ [2] فلاسفی آف فزیکل سائنس صفحہ ۲۱۵

علم ہی کی بنیادی صفت کا لازمہ و مطالبہ ارادہ و قدرت ہے۔ آدمی جو کچھ جانتا ہے اسی کے تقاضوں کو پورا کرنا چاہتا ہے اپنے معلومات ہی کے مطابق و مناسب ان کے لئے راہ عمل اختیار کرتا ہے۔ اسی طرح علم و ارادہ ہی سے انسان کی خصوصی فکری و عملی ذات تشکیل و تعمیر ہوتی اور لازماً اسی خصوصیت و امتیاز کی تکمیل و تحقق انسان کی عین انسانیت کا مطلوب کمال ہو سکتا ہے کیونکہ علم ہی کی خصوصیت و صفت انسانی سرگرمیوں کو تمام دوسری مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے یہی صفت اس کی زندگی میں شعوری طور پر جانے بوجھے یا علم ارادہ پر مبنی مقاصد کو جنم دیتی، نت نئے مقاصد کو ابھارتی اور ان کو انتہا تک پہنچانے کے درپے رہتی ہے نیز اس انسانی طلب و تشنگی کی تشفی اگر سرے سے کوئی امکان ہی نہ ہو تو انسان اپنی اس محدود زندگی میں اور جو کچھ بھی حاصل کرے لیکن اپنی نامحدودیت طلب انسانیت کی تشفی، تکمیل سے محروم ہی رہے گا۔ اس محدود زندگی کے بظاہر بڑے سے بڑے کامیاب انسان سے مرتے وقت پوچھ دیکھو تو جواب یہی ہوگا کہ "بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے"

غرض انسانی ذہنوں سے ملتا جلتا جس کو کائناتی ذہن کہا گیا ہے اس کو جوہری و اساسی صفت و خصوصیت بھی علم اور اس کے لوازم مشیت یا ارادہ اور قدرت ہی کو ہونا چاہئے۔ البتہ کامل و ناقص کے فرق کے ساتھ۔ یعنی انسانی ناقص ذہنوں کے محدود و ناقص علم و قدرت کے مقابلہ میں کائناتی ذہن کا علم اور لازماً اس کے تقاضوں کو پورا کرنے والی مشیت و قدرت بھی کامل یا نامحدود ہی ہوگی۔

خدا کی سائنسی دریافت

اس طرح بے ذہن کیا سرے سے بے زندگی مادہ سے کائنات اور اس میں انسان جیسے ذہن والی مخلوق کی آفرینش خود سائنس کی رو سے رد ہو کر خود ذہن کی بلکہ خود ہمارے انسانی یا انسانی ہی جیسے کسی برتر و اعلیٰ کائناتی ذہن کی طرف سائنسی رہنمائی کو مذہب کے خدا کی سائنسی یافت و دریافت (ڈسکوری) کے سوا اتمام حجت کے سوا کیا کہا جائے۔ باقی شپرہ چشمی تو دن دوپہر کا آفتاب دیکھنے سے بھی اندھی ہی رہتی ہے . . . .

"انما سکرت ابصارنا بل نحن مسحورون (؟)" کی سی باتیں جاہلیت اولیٰ کی طرح جاہلیت جدیدہ والوں کو بنانے کون روک سکتا ہے۔

مزید برآں اگر خدا سے برتر کائناتی ذہن کے بجائے اس کائنات کا خالق مبدا ایجاد و آفرینش مادہ جیسی کوئی بے ذہن و شعور یا بے علم و ارادہ کیا سرے سے کنکر پتھر کی سی بے جان زندگی اندھی بہری ذات فرض کی جائے تو ظاہر ہے کہ پھر اس کائنات کی ساری جاندار و بے جان باشعور و بے شعور موجودات کی معلوم مراد یعنی دانستہ ارادہ پر مبنی کسی غرض و غایت کے شعوری مقصد و مدعا کا سوال ہی نہیں رہتا۔ ارض و سما کا سارا اتحاد کارخانہ وجود و نمود لایعنی و بے مقصد بن کر رہ جاتا ہے۔ حتیٰ کہ شعوری علم و ارادہ رکھنے والا خود انسان جو کچھ چاہئے خود ایک قدم بھی زندگی کا بامقصد و مدعا نہیں اٹھا سکتا۔ بلکہ خود اپنے پورے ہنگامہ حیات سمیت بالکلیہ بے معنیٰ و عبث کام بن کر رہ جاتا ہے۔

سوچنے کی بات ہے کہ ایک طرف تو یہ دنیا کی ساری موجودات کو اپنا خادم بنا لینا چاہتا ہے جس کا نظارہ آج کی خود جدید سائنس قدم قدم پر کرتی رہتی ہے۔ دوسری طرف ایسا مخدوم کائنات خود اپنا سرے سے کوئی مصرف و مدعا نہیں بتا سکتا کہ سب کچھ تو اس کی خدمت و مصرف کے لئے مگر خود اس کا کوئی مصرف ہے! کروڑوں اربوں مکھی مچھروں اور جراثیم کی جان تو اپنی جان بچانے کے لئے لینا اپنا پیدائشی حق جانتا ہے لیکن خود اپنی جان و زندگی کا کوئی ایسا مقصد و فن جنگل کے سوا نہیں بتا سکتا جو اس کے مخدوم کائنات ہونے کو حق بجانب بتائے۔

عیاں نہ شد کہ چرا آمدم کجا بودم	دریغ و درد کہ غافل ز کار خویشتنم

بخلاف اس کے جیسا کہ انسان خود اپنے آپ کو صاحب علم و ارادہ پاتا اور اپنے افعال و اعمال کو اپنے جانے بوجھے مقصد و مدعا کے تابع رکھتا

،، اسی طرح خود اس کی ذہن و شعور والی ذات اور کائنات جس کو یہ بظاہر اپنے ذہن سے باہر موجود پاتا ہے اگر کسی اس سے اعلیٰ و اکمل ذہن و
ر یا علم و قدرت یا سائنسی زبان میں کائناتی ذہن کا کارنامہ ہے تو پھر آپ سے آپ اس کی کوئی نہ کوئی معلوم و مقصود غرض و غایت بھی ہوگی
ں کے بعد یہ لاانتہا عالم سماوات وارض کسی بڑی معنویت و اہمیت والے مقصد سے ہماری محض بچوں کے کھیل کود کا گھروندہ بن کر رہ جاتا
، بلکہ " ماخلقنا السموات وما بینھما لاعبین " کی آگاہی کی بدولت چمنستان دہر کا ایک ایک برگ وبار . . . .
. . . " دفتریست معرفتِ کردگار " بن جاتا ہے ۔

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انسان جو ہمہ وقت اپنی زندگی کی ساری سرگرمیوں کا کوئی نہ کوئی مقصد و مدعا بنائے رہتا ہے خود اس کا وجود بے
مدد بے معنیٰ یا عبث ہی عبث نہیں بن جاتا ۔ اور افحسبتم انما خلقناکم عبثاً و انکم الینا لاترجعون " کے عبثی وجود کے بجائے
کا ایک ابدی مرجع و مصرف عیاناً سامنے آجاتا ہے ۔

عجب تضاد و تماشہ ہے کہ خود دنیا کی ہر شے کو اپنے کام میں لانے اور اس کی مخفی سے مخفی طاقتوں کو مسخر کرنے میں اس طرح لگا رہتا ہے
یا زمین آسمان کی پوری کائنات صرف اسی کی غلامی و بندگی کے لئے وجود میں آتی ہیں ۔ لیکن خود یہ کسی کے لئے نہیں ! وہی کہ ہر موجود کا مقصد
ما تو انسان ہے لیکن خود انسان کا وجود بے مقصد و بے معنیٰ ہے ۔

لیکن اگر انسان سے بھی اعلیٰ و اکمل ذہن و شعور یا علم و مشیت والی کسی ذات نے اپنے علم و ارادہ سے اس دنیا اور اس میں انسان کو
ا کیا ہے تو لازماً وہی انسان اور دنیا و آفرینش کے مقصد کو ٹھیک ٹھیک بتا سکتی ہے ، بالکل اسی طرح جیسے ہم اپنے شعور کی علم و ارادہ کی مصنوعا
تخلیقات کی غرض و غایت ہم ہی بہتر جانتے اور دوسروں کو بتا سکتے ہیں ۔ خصوصاً ہم سے کم درجہ کے ذہن و شعور والوں کے لئے ہمارے کاموں
منصوبوں یا اسکیموں کا سمجھنا تو ناممکن ہی ہے ۔ کیا خود زیادہ بلند عقل و فہم والے انسانوں کے کارناموں یا تخلیقات کی غرض و غایت پوری طرح
درجہ عقل و فہم والے انسانوں کا سمجھنا بلا خود اس کے سمجھائے دشوار ہی ہوگا ۔ تو پھر کسی بلند ترین کائناتی ذہن کی خلاقانہ حکمتوں اور مصلحتوں کا
ہ کے مقابلہ میں ہمارے ادنیٰ ترین ذہنوں کی فہم و گرفت میں آنے کی تو اس کے کوئی صورت ہی نہیں کہ وہ خود ہی ہمارے ذہن و ضرورت کے مناسب
ا صورت و ذریعہ اختیار کر کے کائنات اور اس میں ہماری آفرینش ہی کے مقصد و مطلب سے آگاہ اور اس کی طلب و تکمیل کی راہ بتائے بلکہ بتانا
چاہیے ورنہ کیا وہ خود اپنی خلق کی ہوئی چیزوں کا مقصد ہی فوت کرے گی ۔ علیٰ ہذا خود اس اعلیٰ و اکمل ذہن کی ذات و صفات اور اس کے
لیق خلق و ایجاد کا قابل اعتماد و علم بھی صرف وہی اور اتنا ہی ہوگا جو اور جتنا وہ عطا کرے ۔ بلکہ اس عطا کی عبارت و بیان سے تجاوز
کے اس کی ذات و صفات کی انتہائی کنہ تک اپنی محدود و ناقص عقل و علم کی راہ سے رسائی کی سعی انتہائی بے عقلی و جہل کے سوا کیا ہوگی ۔ پوری
نات کے خالق اعلیٰ ذہن کیا معنیٰ خود اس کائنات کی کسی دوسرے سیارہ میں اگر کچھ ہم سے مختلف ذہن کی کوئی دوسری مخلوق پائی جاتی ہو تو اس تک
ذات و صفات و احوال و اعمال کے بارے میں خود اس کی طرف سے کسی ذریعہ سے کوئی اطلاع ملے بغیر نرے قیاسی گھوڑے دوڑاتے رہنا قیاس مع الفارق
بصرف نرے مغالطوں یا حماقتوں کے انبار کے سوا کیا ہوگا ۔

خلاصہ یہ کہ اس کائنات کا مبدا و وجود اندھے بہرے علم و ارادہ مادہ یا ہمارے جزئی و انفرادی ناقص و فانی ذہن کے بجائے خود سائنس
غائی میں اعلیٰ و ابدی کلی ذہن یا مذہب کی زبان میں خدا کو تسلیم کرنے کے بعد لازماً اس کی ذات و صفات اور اس کی پیدا کی ہوئی اس کائنات
اس میں انسان کے مقصد و مقام کے غیبوں کا قابلِ اعتماد علم وہی اور اتنا ہی ہوگا جو اور جتنا خود وہ کسی ذریعہ سے دے اسی ذریعہ و واسطہ کا نام مذہب
زبان میں وحی و نبوت ہے ۔

سینے
پرونے
کی مشکل
آسان
ہوگئی

(یکے از مصنوعات فیروز سلطان)

ریشم کی طرح نرم اور چمکیلا
موٹائی میں یکساں
کھردرے پن سے پاک۔ درزیوں اور
گرہستنوں کا محبوب
جو پنجاب کی بہترین لمبے ریشے والی
روئی سے جدید ترین ولایتی
خودکار مشینوں پر
تیار کیا جاتا ہے!

معززل دستیاب۔ تشریف لائیے دیکھئے

فیروز الدین سلطان احمد

سرائے روڈ۔ کراچی۔ فون: ۳۲۰۳۰۰ - ۲۳۰۴۰۰
تار کا پتہ: اسکیل کراچی

فضل الرحمٰن
(لیکچرار شعبۂ سنّی دینیات
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

رُوح انتخاب

اسلامی اور مغربی تہذیب، نظام اقدار اور نظریۂ حیات کے تصادم کے نتیجے میں جو مسائل وجود میں آئے ان میں ایک اہم مسئلہ یہ بھی رہا ہے کہ معاشی زندگی کی تنظیم کے اصول اور اس کی بنیادیں کیا ہوں۔ مغرب نے جس نظام معیشت کو پیش کیا اور جو مسلمان ممالک میں مغرب کے سیاسی تسلط کے نتیجے میں رائج ہوا۔ اس کا بنیادی پتھر سود ہے۔ یہ نظام معیشت اس زور وقوت کے ساتھ رائج رہا اور رہا کہ معاشی زندگی کے رگ وریشہ میں سود پیوست ہو گیا اور قومی اور بین الاقوامی تجارتی اداروں اور عالمی تجارت سے اس طرح اس کا دامن بندھ گیا کہ سود کے بغیر کسی نظام معیشت کا تصور ممکن نہیں رہا۔ اسلام نے سود کو بدترین محرمات میں شمار کیا ہے اور اپنے سارے نظام اقدار اور نظریۂ زندگی کے لئے اسے خطرہ قرار دیا ہے اس دوگونہ صورت حال نے نوپیدا شدہ مسائل پر غور کرنے والوں کے لئے سخت ابتلا کا سامان مہیا کر دیا۔ ادھر سیاسی اور معاشی تسلط اور تہذیبی اور ذہنی مرعوبیت نے خود مسلمانوں کے درمیان ایسا طبقہ پیدا کر دیا جو اپنے فروتر علمی معیار، غیر تخلیقی ذہانت، کم سوادی اور پست ہمتی کی بنا پر اپنے نظریۂ زندگی، قدروں اور علمی وتہذیبی ورثے کے بارے میں احساس کمتری کا شکار ہے اور ہر مسئلے کو مغربی اقدار وتہذیب کی میزان پر تولتا ہے اور جس کے علم وتحقیق اور جدت پسندی کا منتہائے کمال یہ ہوتا ہے کہ مغرب کے رائج الوقت نظریات اور سکہ بند خیالات کی تائید اسلام کی زبان سے کرادی جائے۔ سود کے بارے میں یہی رویہ اس طرح کے لوگوں کا رہا ہے۔ غیر سودی نظام معیشت کے خاکے کی تشکیل اور اس کا برپا کرنا تو بس کا روگ نہ تھا، کم ہمتی نے یہ راہ البتہ سجھائی کہ ایک ایسی چیز کو جو بدترین محرمات میں سے ہے تاویل وتعبیر کے ذریعے جائز قرار دے لیا جائے۔ اس طرح کی کوششیں انیسویں صدی عیسوی میں شروع ہو گئی تھیں۔ یہ دراصل اعتراف شکست تھا اور اس بات کا اعلان کہ اسلام جدید دنیا کی ضرورتوں کی تکمیل سے قاصر ہے اور صدائے بازگشت تھی شکست کے اس اعتراف واعلان کی جو عیسائیت کے بڑے بڑے مصلحین مثلاً لوتھر، کالون، زونگلی، اور رومی پاپائے اعظم نے سود کو سند جواز عطا کر کے کیا تھا اور جس کے نتیجے میں آہستہ آہستہ پوری معاشی زندگی عیسائیت کی گرفت سے آزاد ہو گئی اور لوگ وہی بولی بولنے لگے جو کبھی حضرت شعیب علیہ السلام کے منکرین نے بولی تھی۔ "یاشعیب اصلوٰتک تامرک ان نترک ما یعبد آباؤنا اوان نفعل فی اموالنا ما نشاءُ انک لانت الحلیم الرشید[1]" (ہود)

مسلم معاشرے کے اس طبقے نے عیسائیت سے پیداواری اور غیر پیداواری قرضوں اور تجارتی اور صرفی سود کے فرق وامتیاز

---

[1] اے شعیب تمہاری عبادت کیا تمہیں یہی تعلیم دیتی ہے کہ ہم انہیں چھوڑ دیں جنہیں ہمارے باپ دادا پوجتے آئے ہیں اور مال واملاک میں حسب منشا تصرف کرنا ترک کردیں کیا کہنے تمہارے، تمہاری معقولیت اور سلامت روی میں کیا شک ہے۔

کو ستعار ہے کہ مخبر صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ان پیش گوئیوں کو سچ کر دکھایا جن میں آپ نے مستقبل میں امت کے مزاج کے ف
ولرحیت اور سرچشمے کو متعین فرمایا تھا۔ کہ آپ کی امت میں ایسے لوگ بھی ہوں گے جو حرام کردہ چیزوں کے دوسرے نام رکھ کر انہیں
قرار دے لیں گے[1] اور یہ کہ آپ کی امت کے لوگ بگاڑ کی ٹھیک اسی راہ پر چل پڑیں گے جس پر یہودی اور عیسائی اور دوسری پچھلی قو
چکی ہیں[2]۔ لیکن اب جبکہ مسلمانوں کو زمین کے بہت سے خطوں میں اتنا اقتدار حاصل ہے کہ وہ اپنے مذہب کی فراہم کردہ بنیادوں پر از
اپنی معاشی زندگی کی تعمیر و تنظیم کر سکیں تو اس ذہنی غلامی اور تہذیبی مرعوبیت سے آزاد ہو کر یہ سوچنے کی ضرورت ہے کہ اس تنظیم کی غیر سودی
ہو سکتی ہے اور موجود نظام کے اداروں کا کیا اسلامی بدل فراہم کیا جا سکتا ہے جس کے ذریعہ دور جدید کی ضروریات پوری ہو سکیں
جو ہمارے دین سے بھی متصادم نہ ہو اور اس کے ساتھ عبوری دور کے لئے کیا تدابیر پیش کی جا سکتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ کام ا
نہیں بہت مشکل ہے اور فکر و عمل کی تمام تر توانائیوں کا طالب، لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ ذوق نغمہ کی کم یابی اور محمل کی گر
کا احساس حُدی کی لے کو تیز تر اور نوا کو تلخ تر کرنے کے بجائے اب بھی بہت سے حضرات کو اس پہ آمادہ کرتا ہے کہ کم ترین مزاحمت
کی آسان اور قریبی مگر غلط راہ کو اختیار کرتے ہوئے وہ سود کو سند جواز عطا کرنے کی اسی پامال سی روش پر چل پڑیں جسے فکر و عمل
تہی دستی نے کبھی سجایا تھا۔ لیکن جسے مسلم معاشرے کی چشم بر اہی نے غلط انداز نگاہ سے بھی دیکھنا کبھی گوارا نہیں کیا۔ زیر نظر کتاب کا
اسی قسم کی کوششوں کا جائزہ لینا اور اس سلسلے کی فکری غلطیوں کا پردہ فاش کرنا ہے۔

---

[1] بخاری، کتاب الاشربۃ، باب ما جاء فیمن یستحل الخمر و یسمیہ بغیر اسمہ [2] بخاری، کتاب الاعتصام، باب قول النبی لتتبعن سنن من کان ق
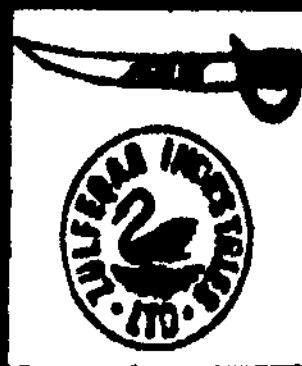
ہماری نظر میں

سیرت طیبہ از :- مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی ، ضخامت ۴۴۴ صفحات (مجلد رنگین سرورق) قیمت چار روپے
ملنے کا پتہ :- مکتبہ علمیہ قاضی واڑہ میرٹھ (یو۔ پی - انڈیا)

جناب مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی ، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں شعبہ اسلامیات اور تاریخ اسلامیات کے پروفیسر اور متعدد کتابوں کے مصنف و مولف ہیں ، مولانا موصوف نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ عام فہم اور دل نشین انداز میں مرتب کی ہے۔ اپنی استطاعت کی حد تک اس کا اہتمام بھی کیا ہے کہ ضعیف اور مشتبہ روایتیں کتاب میں نہ آنے پائیں ، تاریخ وسیر کی مستند کتابیں "سیرت طیبہ" کا ماخذ ہیں ، محبت رسولؐ جو ہر مسلمان کا سرمایہ سعادت ہے ، اس کتاب کی ایک ایک سطر سے نمایاں ہے -

● ـــــ "انار ، سیب ، آلوچہ ، خوبانی ، سنترہ ، لیموں ، خربزہ اور تربوز کے درخت بھی پائے جاتے ہیں (صـ۱۱) خربزہ اور تربوز کے بیل ہوتے ہیں ، ہاں ! "بیل" ہوتی ہے! ـــــ "وحی کی تمہید کے طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سچی خوابیں دکھنی شروع ہوئیں ؟" "خواب" مونث نہیں مذکر ہے ، ـــــ اس تسامح کے علاوہ جملہ کی ترکیب بھی زبان کے اعتبار سے درست نہیں ، لکھا یوں جانا چاہئے ...... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سچے خواب دیکھنے لگے یا حضورؐ کو سچے خواب نظر آنے لگے " ـــــ "عرب کی چلچلاتی ہوئی دھوپ" (صـ۹۶) "عرب کی چلچلاتی ہوئی دھوپ" لکھنا تھا " "جھلنی" دھوپ کی نہیں نگاہ کی صفت ہے ـــــ "دھوپ سے جھاڑیاں جھلستی ہوتیں " (صـ۹۹) "جھلستی" کا محل تھا ـــــ "ابوالبختری غصیلا آدمی تھا " (صـ۱۳۱) "غصہ ور" یا "غصیلا" ہونا چاہئے تھا -

" واپس تشریف لائے تو بستر اگرم تھا" (صـ۱۵۰) "بسترا" تو دیہات کی زبان ہے "بستر" میں "الف" لگانے کی کیا ضرورت ـــــ " مہاجرین کو انصار کے ساتھ بھائی بندی کے رشتہ میں جکڑ دیا" (صـ۱۹۶) "جکڑ دیا" میں جبر کا پہلو پایا جاتا ہے " مہاجرین کو انصار کے ساتھ بھائی بندی کے رشتہ میں منسلک کر دیا " جیسا کوئی جملہ ہونا چاہئے تھا ـــــ " انگوٹھوں کے بل اُسک کر کھڑے ہو (صـ۲۳۳) " "اُسکنا" یہ میرٹھ یا نواح میرٹھ کا مقامی محاورہ معلوم ہوتا ہے ، اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے صحیح لفظ "اچکنا" ہے ، یوں ہے ـــــ " وہ پیروں کو اُچکا کر کھڑا ہو گیا "

یا

ہمارا خیال ہے اور خدا کرے یہ خیال صحیح ہو کہ جس طرح جماعت اہل حدیث کراچی احناف کو غیر مسلم اور مشرک سمجھتی ہے، جمہور اہل حدیث کا یہ مسلک نہ ہوگا! اہل حدیث کے ثقہ علماء پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ جماعت اہل حدیث کراچی کے متشدد جہلا کو سمجھائیں کہ احناف نہ مشرک ہیں اور نہ غیر مسلم ہیں! ہاں! اہل حدیث اپنی تحقیق کی بنا پر یوں کہہ سکتے ہیں کہ اہل حدیث کا مسلک، تمام فقہی مذاہب کے مقابلے میں زیادہ صحیح ہے اور وہ مقلدین کے بعض مسائل سے تسامح، غلطی، لغزش بلکہ گمراہی بھی منسوب کر سکتے ہیں ـــــ لیکن احناف کو غیر مسلم اور مشرک کہنا، کتاب و سنت سے بے خبری اور دین سے جہالت کی دلیل ہے۔ اس ظلم کی قیامت کے دن ان متشدد غیر مقلدین سے شدید بازپرس ہوگی: مسلمان کو "غیر مسلم" کہنے کا وبال اگر کہنے والے پر پڑ گیا، تو کیا ہوگا! کیسے نادان لوگ ہیں، جو اپنی جہالت کو کمال علم و آگہی سمجھے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو فہم صحیح اور ہدایت عطا فرمائے۔

مشرقِ تاباں

از:- محمود اکبرآبادی، ضخامت ۸۰ صفحات، قیمت ایک روپیہ ۵۰ پیسے۔ ملنے کا پتہ:- ماس مسعود ایجوکیشن اینڈ کلچر سوسائٹی آف پاکستان بی ۵ / ۸۵، بلاک بی، نارتھ ناظم آباد، کراچی ۳۳

جناب محمود اکبرآبادی (ایم اے) فانی بدایونی، نیاز فتحپوری اور ل، احمد کے ہم نشینوں میں ہیں، پاکستان میں آکر وہ گمنام سے ہو گئے ہیں، تقسیم ہند کے قبل وہ معروف تھے! محمود صاحب شاعر بھی ہیں، نثر نگار بھی ہیں اور صاحب تحقیق لغت داں بھی!

اس کتاب میں محمود صاحب کی پانچ نظمیں ـــــ مشرقی بنگال کا ملاح ـــــ بوڑھی گنگا کے کنارے ـــــ مہاجر کا ترانہ ـــــ مشکیں دوشیزہ کا نغمہ ـــــ کاسنی چھریری بنگالن ـــــ شامل ہیں، جناب جلیل قدوائی (ایم۔ اے) نے "مشرق تاباں" پر مختصر سا مقدمہ لکھا ہے اور محمود کے فن کو سراہا ہے۔

ان نظموں میں شاعر کا جمالیاتی ذوق اپنے شباب پر نظر آتا ہے، شاعر کا مشاہدہ بھی خاصہ رنگین ہے اور جذبات کی گرمی کا تو پوچھنا ہی کیا جیسے شعروں میں شعلے سموئے ہوئے ہیں۔

"مشرقی بنگال کا ملاح" ـــــ اس نظم کے یہ اشعار کتنے اچھے ہیں۔

قرب ہو، یا بعد ہو، نصرت ترے ہمراہ ہے	اپنے راسخ عزم کی قوت سے تو آگاہ ہے
موڑ پر طوفاں بپا کرتا ہے دریا کا بہاؤ	تو جدھر کو حکم دیتا ہے اُدھر چلتی ہے ناؤ
بطنِ سیلابِ رواں میں ہے یہ تیرا احترام	اٹھ کے کرتی ہیں تجھے بپھری ہوئی موجیں سلام
تجھ پہ کچھ مشکل نہیں جس وقت تو مشکل میں ہے	ہاتھ میں پتوار ہے، قرآں تیرے دل میں ہے

دوسرا رخ:ـــــ

تیرے استقلال میں لیکن خلل آتا نہیں — اللہ اللہ رے! سکوں، ابرو پہ بل آتا نہیں (ص ۱۰)

مصرعہ ثانی میں "رے" کھٹکتا ہے، اس کی جگہ "یہ" لا سکتے تھے۔ یہ مصرعہ یوں ہوتا۔

؎ کوئی عالم ہو مگر ابرو پہ بل آتا نہیں

قلب ہیبت میں دریا کہ تجھ کو آتا ہے قرار — ہم نے سنگم پر تجھے بشاش دیکھا بار بار (ص ۱۲)۔

"قلب ہیبت" کی ترکیب بھلی نہیں لگتی، اس سے بہتر سامنے کی ترکیب "قلب طوفاں" تھی!

دل کو گویا پر لگا دیتا ہے اوج بادباں　　وجد میں آ آ کے چھو لیتا ہوں سقفِ آسماں (ص ۱۱)

پہلے مصرعہ میں تکلف پایا جاتا ہے ——— اور مصرعہ ثانی میں مبالغہ !

شاد ہو اے فیضِ نیرنگِ ازل کے ہم زباں　　روحِ قدرت نے بنایا تجھ کو اپنا رازداں (ص ۱۳)

"فیضِ نیرنگِ ازل" کا "ہم زباں" ہونا —— یہ کیا بات ہوئی ؟ اس طرح کون بولتا اور لکھتا ہے کہ فلاں شخص "فیضِ ساقی" یا "فیضِ فطرت" کا ہم زباں ہے۔

رہ گزر پرپیچ، شوخ سالکوں کے درمیاں　　الاماں اے سالکِ راہِ صعوبت الاماں (ص ۱۴)

مصرعہ ثانی میں شعریت کا دور دور پتہ نہیں ! اس نظم کے بند میں تصوف کے مضامین اور تلازمے بھی نہیں آئے، جو "رہرو" کی بجائے "سالک" نظم کیا گیا ہے۔

تجھ کو غربت میں جو لذت ہے وہ راحت میں نہیں　　تیرے محکم تجربے ثروت کی جنت میں نہیں (ص ۱۵)

"ثروت کی جنت" نے شعر میں تکلف پیدا کر دیا۔

خوف پر ہنستا رہا ہے تو یہ ایماں ہے ترا　　جس سے دل ڈرتا ہے تیرا وہ نگہباں ہے ترا (ص ۱۸)

مصرعہ اولیٰ نومشقوں کے کہنے کا ہے !

"بوڑھی گنگا" کے کنارے شفق کا ایک منظر" ——— جس نظم کا عنوان ہے" اُس کے بعض مصرعے خاصے اچھے ہیں۔ ——— مثلاً ———

؎ لادس و ژولیدہ رنگ، ملکی رنگ و نک میں رنگ

؎ ابر کی کروٹوں میں رنگ، رنگ کی سلوٹوں میں رنگ　(بہت خوب)

؎ احمر و زعفرانی و زرد و کبود و شربتی

مگر ان مصرعوں کے ساتھ دوسرے مصرعے ان کے جوڑ کے نہیں ہیں —

احمر و زعفرانی و زرد و کبود و شربتی
موئے بہ موئے آگہی نقش بہ نقش بت گری

جس شعر میں رنگوں کا بیان ہو، اُس میں "آگہی" لانے کی کیا تُک تھی ——— پھر "مو بہ مو" کی بجائے "موئے بہ موئے" نظم کیا ہے جو فارسی زبان کی قواعد کے لحاظ سے محلِ نظر بھی ہے اور اس میں نغمگی کی بھی کمی پائی جاتی ہے۔

کس کے لہو کا جوش ہے رنگ کی آب و تاب میں　　کس نے گلال جھونک دی جوئے شراب ناب میں (ص ۲۰)

"گلال" مونث نہیں مذکر ہے ! "جھونک دی" کی بجائے "گھول دی" ہوتا تو بہتر تھا، مگر ہاں یہ ضرور ہے کہ "جھونک دی" کا جو لہجہ ہے اُس میں شدت پائی جاتی ہے !

سوتی ہوئی ترادشِ چنگ و رباب الاماں　　دل کی دھڑک یہ پیکرِ موجِ شراب الاماں (ص ۲۱)

"ترادشِ چنگ و رباب" سے غالباً "ترادشِ نغمہ" مراد ہے مگر "ترادشِ ساز" یا "ترادشِ چنگ و رباب" جیسی ترکیبیں وجدان میں کھٹک پیدا کرتی ہیں۔ مصرعہ ثانی کمزور بھی ہے اور مبہم بھی ہے، موجِ شراب کے پیکر میں دل کی دھڑک ——— آخر یہ بات کیا ہوئی۔

یہ وہ لمحہ ہے کہ آؤ علم کا پرچار کریں   زندگانی کے نئے عنوان کی پوجا کریں   (ص ۴۳)

"وقت" یا "زمانہ" کی جگہ "لمحہ" استعمال کیا گیا ہے۔ مصرعہ ثانی سست اور کمزور ہے۔ "عنوان" کی پوجا کون کیا کرتا ہے!
کوئی شک نہیں اس نظم (مہاجر کی فریاد) میں بڑا تاثر پایا جاتا ہے —— مگر جس اندیشہ کا اظہار شاعر نے اس نظم میں کیا ہے مشرقی پاکستان میں وہ اندیشہ قوی تر ہوتا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ علاقائی عصبیت سے مسلمانوں کو محفوظ رکھے۔
"مشکیں دوشیزہ کا نغمہ" اس کا ایک بند ہے ——

یہ لوہٹ من بناؤ اس سے شہزادی کا پیراہن
نہیں محتاجِ آرائش ازل سے حسن کا تن من
مری تزئین کو کافی ہے، میرا مدھ بھرا جوبن
چھریرا تن، کمر پتلی، تنی پنڈلی، نظر پُرفن   (ص ۱۳۱)

"من" کا تزکیہ تو ہو سکتا ہے مگر تن کی طرح اُس کی آرائش عجیب سی لگتی ہے۔

مجھے دیکھو مجھے دیکھو میں ایمانِ فلاکت ہوں   مری ثروت یہ کیا کم ہے کہ میں محرومِ ثروت ہوں

"ایمانِ فلاکت" مہمل ترکیب ہے!

مری سنگیں جوانی تند ہے، شبرنگ ہے نم ہے
خطوطِ جسم کا جادو ہے، نوید ورامش و رَم ہے
لبوں کی نرم جنبش ارغنونِ فطرت کی سرگم ہے
میں جس دم گنگناتی ہوں حیاتِ دل وہی دم ہے

تین مصرعوں میں خاصہ لطف پایا جاتا ہے۔ تیسرے مصرعہ میں "سرگم" کھٹکا، ہم نے تو "سرگم" کو مذکر سنا ہے —— چوتھے مصرعہ میں "حیاتِ دل وہی دم ہے" —— اس بچکانہ ٹکڑے نے اس شگفتہ بند کا لطف کم کر دیا۔

وہ جو سامنے آکے چپ چپ کھڑی ہے   رسیلی سیہ موتیوں کی لڑی ہے

"رسیلی" نہ تو موتیوں کی کوئی صفت ہے اور نہ "لڑی" کی!

جو محرم نہ تھے اُن کے ہاروں دماموں   تو بے شبہ رکھتے ہی تھے بخت واژوں

یہ شعر کس قدر کمزور ہے، اس نظم کے مندرجہ ذیل اشعار خاصے مترنم، شگفتہ اور بامحاورہ ہیں۔

جو بکھرے تو شعلے کی سی تھرتھراہٹ   جو روئے تو برسات کی جھجھاہٹ
یہ رنگیں ادائی، یہ شہلا نگاہی   یہ فطرت کی اک آبنوسی جماہی
کہاں کے اوامر، کہاں کے نواہی   یہ عالم جو دیکھے ٹھٹھک جائے ماہی
لٹیں ریشمیں اور لٹوں کی لگاوٹ   سیہ چوٹیوں کی ڈھیری گند ھاوٹ

اس نظم کا آخری بند ہے ——

نفیری کا من اور مشرب گدائی　　　خوش آتی نہیں عقل کی خود ستائی

"نفیری کا من" نے شعر کا سارا لطف ہی غارت کردیا۔

نہ کام آئی، کچھ بھی لگائی بجھائی　　　بالآخر مسافر کے دل میں سمائی

"لگائی بجھائی" ـــــ یہ محاورہ اس بند میں آخر کس مفہوم کی ترجمانی کے لیئے استعمال ہوا ہے۔

جناب محمود اکبرآبادی کی ان نظموں میں ذوق جمال، لطف نظارگی، کیف دلنغمگی اور خاص طور سے جنسی جذبات کی شدت پائی جاتی ہے ـ مگر قریب قریب ہر صفحہ پر اچھے مصرعوں کے ساتھ بھرتی کے مصرعے بھی ملتے ہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے نغمہ گوئی کی مشق انہوں نے چھوڑ دی ہو اور پھر برسوں کے بعد جذبات میں جوش پیدا ہوا اور چند نظمیں موزوں ہوگئیں۔

رُوسی انقلاب کی کامیابیاں

مصنف۔ جان کیپ۔ مترجم:۔ گوپال متل، ضخامت ۴۶ صفحات، قیمت ۵۰ پیسے
ملنے کا پتہ:۔ نیشنل اکاڈمی ۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، دہلی ۶

اس کتابچہ میں "روسی انقلاب" کا بڑی دیدہ ریزی کے ساتھ تجزیہ کیا گیا ہے، فاضل مصنف نے لکھا ہے:ـــ

"تاریخی تجربہ شاہد ہے کہ جہاں تک رفتار زمانہ کا تعلق ہے، اس سے مغربی طاقتوں سے کہیں زیادہ کمیونسٹ ممالک کو ڈرنا چاہیئے۔

. . . جیسے جیسے کمیونزم اپنی آخری منزل کے قریب پہونچتا ہے اس کے تصورات فرسودہ اور بعید از وقت نظر آنے لگتے ہیں۔"

"اوپر سے انقلاب لانے کے سلسلہ میں اسٹالن نے سرکاری طور پر جو بے رحمیاں کیں، انہیں احاطہ الفاظ میں لانا ممکن نہیں، اس نے جو زخم لگائے وہ آج تک مندمل نہ ہو سکے"

"بہرحال بیشتر لوگوں کے نزدیک کمیونزم نے جو قیمت وصول کی ہے وہ بہت ہی زیادہ ہے ترقی بہت سے دوسرے ملکوں نے بھی کی ہے، لیکن اس کے لئے نہ تو انہیں اتنی انسانی جانوں کو بھینٹ چڑھانا پڑا نہ بنیادی انسانی حقوق اور آزادیوں کو اس طرح سلب کرنا پڑا نہ بین الاقوامی امن کو اس حد تک برہم کرنا پڑا ـــــ"

پوری کتاب کا یہی رنگ ہے، کمیونزم کو سنجیدہ اور متوازن دلائل و شواہد کے ساتھ اس انداز میں کم لوگوں نے بے نقاب کیا ہے۔

بڑھتے قدم

از:۔ رگھبیر سرن دواکر راہی، پبلشر۔ جلیل نعمانی۔ ضخامت ۱۴۶ صفحات (مجلد) قیمت ایک روپیہ
ملنے کا پتہ:۔ نعمانی پبلشنگ ہاؤس، نعمانی اسٹریٹ رام پور

جناب رگھبیر سرن دواکر راہی ہندی زبان کے ادیب اور صحافی ہیں۔ اصل وطن امروہہ ہے، یوپی میں ڈسٹرکٹ انفارمیشن آفیسر کے عہدے پر فائز رہے ہیں۔ اب کئی سال سے رام پور میں مقیم ہیں، اس سرزمین کو اپنا وطن بنا لیا ہے اور ملازمت سے مستعفی ہو کر رام پور میں وکالت کر رہے ہیں وہاں کے مسلمان ادیب اور شاعروں سے راہی صاحب کے مخلصانہ مراسم ہیں۔

جناب راہی کی غزلوں کے منتخب اشعار کتابی صورت میں شائع کئے گئے ہیں جس پر مولانا امتیاز علی خاں عرشی، محشر عنایتی،

عروج زیدی بدایونی، جلیل نعمانی اور شوق نعمانی نے پیش لفظ اور دیباچے لکھے ہیں۔

مولانا امتیاز علی عرشی جیسے بلند پایہ ادیب، عالم اور استاد شاعر نے راہی کے کلام پر یہ رائے دی ہے۔

"راہی صاحب کے یہاں تمام باتیں موجود ہیں جو اُردو شاعری کو حسین بناتی ہیں۔"

منتخب اشعار:—

شمعِ منقوش سے اور کام چلتا ہے بہاروں سے — بشر پھر پوچھتا ہے حالِ مستقبل ستاروں سے

اسے وہ دوریٔ منزل سے کیوں حیران ہوتا ہے — اگر ہے عزم محکم ہر سفر آسان ہوتا ہے

شیخ و رند میں ہے فرق مگر تھوڑا سا — مصلحت بیں یہ عقیدہ، وہ ذرا آزادہ

شیخ سمجھے ہے اگر آئیں تو سر آنکھوں پر — شرط یہ ہے کہ نہ آئیں وہ کبھی شام کے بعد

بات حق ہے تو پھر قبول کرو — یہ نہ دیکھو کہ کون کہتا ہے

تعمیرِ نشیمن ہو جہاں خونِ جگر سے — گرتی ہے وہیں برقِ تپاں اور زیادہ

وفورِ شوق میں ہم اتنا بڑھ گئے آگے — کہ پیچھے رہ گئی منزل جہاں پہ پہنچنا تھا

ظلمتِ شب میں شیخِ حرم کیا نہ تھے — دن نکلتے ہی وہ پارسا ہو گئے

سوال یہ ہے کہ ہے کون صاحبِ کردار — اسیرِ رسم و روایت کو پارسا نہ کہو

جیسے دیتی ہوں چٹکتی ہوئی کلیاں آواز — یوں قدم اُن کے قریب آتے ہیں گاہے گاہے

ہم نے آنکھوں سے لگائے ہیں ترے نقشِ قدم — اب ہمیں سجدہ کریں دیر و کلیسا و حرم

مری نظر میں یہ تقلید کور بینی ہے — بجھے چراغ کو جلتا ہوا دیا نہ کہو

چاہتے یہ تھے کہ پی جائیں نگاہِ مست سے — جام مے مانگا تھا ساقی سے بہانے کیلئے

ممکن نہیں کہ شکوۂ بیداد کر سکیں — انداز دیکھیے نگہِ شرمسار کے

دوسرا رُخ:—

بات اتنی ہے کہ جرأت کی کمی ہے ورنہ — کون احساس کی حد تک یہاں منصور نہیں (ص ۲۷)

"یہاں" پڑھنے میں جو جھٹکا سا لگتا ہے اس پہ وجدان کسمسا کر رہ جاتا ہے۔

حجاب حدِ حیا تک بجا ہے ماہ جبیں — نظر جھکا کے اٹھا دو نقاب تھوڑی سی (ص ۲۹)

"ماہ جبیں" سے اس شعر میں مخاطب، ذوقِ شاعرانہ کو بُری طرح کھٹکتا ہے

مذہبی جامے میں ملبوس سیاسی نعرے — آگ دے دیں گے گلی کو نہ بجھا پائیں گے (ص ۴۲)

مصرعِ ثانی کی روانی میں بڑا تکلف پایا جاتا ہے۔

نام پر میرے کیوں بگڑ گئے ہو — یوں بھی اخفا سے راز ہوتا ہے

یعنی ــــــ ؟ ــــــ !؟ [1]

(حاشیہ صفحہ ۵۹ پر)

اس قسم کی کمزوریاں اس مجموعے میں کہیں کہیں ملتی ہیں ـــــ مگر مجموعی طور پر "بڑھتے قدم" شاعر کے کلام کا اچھا تعارف ہے راہی صاحب کے شعروں میں خلوص اور محبت پائی جاتی ہے انہوں نے رواداری ملنساری انسانوں کے بھائی چارے کی اپنے شعروں میں تلقین بھی کی ہے راہی کی غزل کا مطلع ہے ـــــ

بہ نام خاص جب گردش میں کوئی جام آتا ہے
تری ساقی گری پہ ساقیا! الزام آتا ہے

اس شعر میں کس قدر کیف اور لطف پایا جاتا ہے ان کی شاعری کا جب یہ رنگ ہو جائے گا تو پھر راہی صاحب کا شمار بڑے شاعروں میں ہونے لگے گا موصوف کا شاعرانہ مستقبل تابناک و درخشاں نظر آتا ہے۔

علامہ اقبال بھوپال میں

از:- عبدالقوی دسنوی، ضخامت ۸۰ صفحات، قیمت ایک روپیہ ۲۵ پیسے۔
ملنے کا پتہ:- شعبہ اردو سیفیہ کالج بھوپال (ایم - پی - انڈیا)

اس کتاب میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ علامہ اقبال کتنی بار بھوپال گئے، کہاں ٹھہرے، نواب حمیداللہ خاں مرحوم فرمانروائے بھوپال سے کس طرح تعارف ہوا؟ ان کے پانسو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر ہونے کے کیا محرکات تھے، سر راس مسعود سے علامہ اقبال کے کس قدر مخلصانہ تعلقات تھے؟ کتاب خاصی دلچسپ اور معلومات آفریں ہے۔ اور اقبالیات میں خوشگوار اضافہ ہے۔

چنگاریاں

از:- آذر لقا راغبی، ضخامت ۱۲۸ صفحات، قیمت دو روپے، ۵۰ پیسے
ملنے کا پتہ:- گلڈ اکمن کتاب گھر، وکٹوریہ روڈ، لاہور

جناب آذر لقا جواں سال شاعر ہیں اور حضرت راغب مرادآبادی کے تربیت یافتہ اور "نظر کردۂ صاحب نظراں" ہیں! اُن کے کلام کا مجموعہ سفینہ اکیڈیمی نے شائع کیا ہے جس پر جناب رئیس امروہوی نے دلچسپ مقدمہ تحریر فرمایا ہے۔ رئیس صاحب نے راغب صاحب کو اپنا "رفیق روحانی" لکھا ہے، ظاہر ہے کہ یہ دونوں حضرات کسی سلسلۂ طریقت سے وابستہ نہیں ہیں، یہ روحانی رفاقت جمالیاتی ذوق کا پرتو معلوم ہوتی ہے۔

آذر لقا کی شاعری حسین نشو و نما کا مرقع ہے اُن کی اُٹھان اُن کے روشن مستقبل کا پتہ دیتی ہے، اُن کے اُستاد کا رنگ بھی جگہ جگہ شعروں میں جھلکتا ہے ـــــ منتخب اشعار:-

زندگی میں سکوں کم پایا　　ہر خوشی کا مآل غم پایا
ہم سے بھی تھی رسم و راہ اُن کی　　شاید انہیں یاد بھی نہیں ہے
اے چشم ناز! فرصتِ یک لمحہ کم نہیں　　کوئی نیا پیامِ غزل کہہ رہا ہوں میں
ہر ایک پھول ہے جانِ بہار و نازِ چمن　　کسے نگاہ میں رکھیں کسے نظر سے گرائیں
زندگی ہے کہ دردِ سر یارو　　اور کتنا ہے یہ سفر یارو
آہِ مظلوم، پھر آہِ مظلوم ہے　　آہِ مظلوم کیا بے اثر جائے گی

رعشہ کا حاشیہ) صفحہ ۵۸ پر "تلاطم" کو "طلاطم" پڑھا جائے۔

اپنے احساس کا اک ردعمل ہے ورنہ — بوئے گل کچھ بھی نہیں بادِ صبا کچھ بھی نہیں
آسماں پر جب نظر جاتی ہے ہوتا ہے گماں — کہکشاں میرا ہی جیسے فرش پا انداز ہے
زندگی صرف اشک و آہ نہیں — تو مگر صاحب نگاہ نہیں
میرا سرمایۂ حیات ہو تم — اب مری زندگی تباہ نہیں
انگشت نما ہے کیوں زمانہ — میں اپنی روش پہ چل رہا ہوں
ہم اسیرِ قفس ہیں کیا جانیں — کب خزاں کب بہار آتی ہے

دوسرا رخ :—

کون ہے جس کو غم نہیں ہوتے — ایک سے بیش و کم نہیں ہوتے (ص ۱۸)

مصرعۂ ثانی میں شدید تسم کا ابہام پایا جاتا ہے۔

دل نشیں آپ کے پیکاں ہوئے جاتے ہیں — آپ بے وجہ پشیماں ہوئے جاتے ہیں (ص ۲۰)

اگر محبوب کے تیر دلنشین نہ بھی ہوتے تو اس میں پشیمانی کی کیا بات تھی! ہاں! کبھی قدر انداز کا نشانہ خطا ہو جائے تو پشیمانی کا محل ہے۔

آپ کی وعدہ خلافی کے سب اجزائے جمیل — آپ خوش ہوں مرا ایماں ہوئے جاتے ہیں

"وعدہ خلافی کے اجزائے جمیل" کیا ہوتے ہیں؟

نشاطِ روح اُسی کا خیال ہوتا ہے — کہ جس کا قرب اک امتحان ہوتا ہے (ص ۲۲)

مصرعۂ ثانی نے غزل کے مطلع کو سپاٹ بنا دیا۔

چیونٹی کو بھی دکھ دینا — مسلک میں ہے میرے حرام

یہ شعر تو بچوں کی کسی کتاب کے لئے موزوں تھا۔

ٹھنڈی ہوا سے درد جو چمکا تو دفعتہً — پھر یاد کوئی بانیٔ بیداد آ گیا (ص ۲۶)

جوش ملیح آبادی کا مشہور شعر ہے۔

دل کی چوٹوں نے کبھی چین سے رہنے نہ دیا
جب چلی سرد ہوا میں نے تجھے یاد کیا

بقا صاحب کی غزل کا مطلع ہے :—

رو میں جذبات کے جو بہتے ہیں — دل کے ہاتھوں وہ رنج سہتے ہیں (ص ۳۴)

اس میں کوئی لطف نہیں صرف لفظوں کو جوڑ دیا گیا ہے۔

حضور دوست بھی لب پہ ہنسی نہیں آتی — روش جو عام ہے دل کو کبھی نہیں آتی (ص ۳۶)

اس مطلع کی بے رنگی کا بھی یہی عالم ہے۔

بھڑکی کچھ اور موجِ تبسم سے دل کی آگ — وہ یہ سمجھ رہے ہیں مری پیاس مر گئی (ص ۵۰)

مصرعہ ثانی وجدان کے لئے تکلیف دہ ہے!

اچھا نہیں شروع سفر میں یہ دغدغہ منزل بھی ہے قریب قدم تو اٹھا کے دیکھ (ص ۹۹)

"دغدغہ" نے شعر کو بری طرح بوجھل بنا دیا۔

مٹا دیا دلِ ویراں کو راہ میں تیری خوش نصیب کہ ہم نے بھی کوئی کام کیا (ص ۹۲)

"ویراں" کھٹکتا ہے، یہ لفظ زائد بھی ہے، جب دل پہلے ہی سے ویران تھا، تو اس کو مٹا دینے پر فخر و ناز کیا؟

ہوا ہی چاہتا ہے آفتابِ سرخوشی طالع طبیعت آج کل اندوہگیں معلوم ہوتی ہے (ص ۱۰۳)

بے مزہ شعر! "طالع" نے شعریت ہی باقی نہیں رہنے دی۔

آذر بقا کے کلام کے اس پہلے مجموعے سے اس کی توقع کی جاسکتی ہے کہ مشق و مطالعہ کے ساتھ ساتھ اُن کی شاعری ترقی کرتی چلی جائے گی یہاں تک کہ وہ شعراء میں قابل ذکر مقام حاصل کرلیں گے۔

روئیت ہلال

از:- مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی، ضخامت ۴۵ صفحات، قیمت:- ایک روپیہ ۵۰ پیسے
ملنے کا پتہ:- ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ۔ لاہور

مولانا محمد جعفر شاہ ندوی پھلواروی ایک مفکر اور وسیع المطالعہ عالم ہیں، علم و فضل تو انہیں میراث میں ملے ہیں مگر ان کے ساتھ یہ بدقسمتی پیش آئی کہ پاکستان کے ایسے علمی ادارے سے اُن کے روزگار کا بندوبست ہوا جو دین میں "تجدد" کی طرف میلان رکھتا ہے — مولانا موصوف کو بھی یہی رنگ اختیار کرنا پڑا۔

"روئیت ہلال" پر اُن کا یہ مقالہ کوئی شک نہیں فکر انگیز ہے، ان چند صفحوں کے لئے انہوں نے عربی کی دسیوں کتابوں کا مطالعہ کیا ہے۔ اس کتابچے کے اہم نکات یہ ہیں۔

۱۔ "فلکیاتی حساب سے طلوع و غروب کا علم ویسا ہی قابل اعتماد ہے جیسا آنکھوں سے دیکھ کر معلوم کرنا۔"

مگر شریعت کا "روئیت ہلال" میں جو نقطۂ نگاہ ہے، اس کے اعتبار سے "حسابی روئیت" نہیں، "عینی روئیت" لازمی ہے، ملت اسلامیہ کو دین سے جو لگاؤ پایا جاتا ہے، ہلال کی "عینی روئیت" کی سنت سے اُس تعلق کو غذا ملتی ہے۔ شمسی جنتریوں کے انداز پر ماہ رمضان کے آغاز اور اختتام کا پہلے سے تعین دینی نقطۂ نگاہ سے درست نہیں۔ ہاں! روئیت ہلال میں سائنس کے ایجاد شدہ آلات کو کام میں لایا جاسکتا ہے اس بارے علماء کرام کو اپنے موقف پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔

۲۔ "ایک ہی اسلامی ملک میں دو قمری تاریخوں کا وجود اسلامی اسپرٹ اور وحدت امت کے منافی ہے" — اصل مسئلہ "عید الفطر" سے متعلق۔ اس سلسلے میں عرض ہے کہ کسی اسلامی ملک میں ماہ صیام کا ایک دن آگے پیچھے آغاز یا دو عیدوں کا ہونا، کوئی معیوب بات نہیں ہے، یہ وہ اختلاف ہے کہ اُمت نے کبھی وحدت امت کے لئے مضرت رساں نہیں سمجھا۔

۳۔ "ہر اسلامی ملک میں اعلانِ ہلال کا فریضہ مسلمان حاکم کے ہی سپرد رہا ہے" — مگر وہ مسلمان حاکم خود نماز روزے کے بھی عام طور پابند تھے، اور "قیام صلوٰۃ" کی ضرورت سے واقف تھے، جو حکومت "قیام صلوٰۃ" کے فریضہ کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتی اور جہاں کسی کے لئے ترک صلوٰۃ "کوئی" DISQUALIFICATION "نہیں ہے اُسے اگر "روئیت ہلال" کا نظام اپنے ہاتھ میں

یہ اتنا اصرار کیوں ہے؟ اس مسئلہ میں اصل جذبہ جو کام کر رہا ہے وہ "احتیاط" کا مسئلہ ہے۔ حکومت کو چاہئے کہ دینی مسائل میں عوام مسلمانوں کا پہلے اعتماد حاصل کرے، پھر اس قسم کے اعلانات کو کسی جبر و اکراہ کے بغیر لوگ قبول کریں گے۔

دین آباء النبیؐ

از:- سید حشمت حسین جعفری ضخامت ۲۱۴ صفحات۔
ملنے کا پتہ:- مصنف سے، گاڑی کھانہ، حیدرآباد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین (حضرت عبداللہ اور حضرت آمنہ) حضورؐ کے چچا حضرت ابوطالب اور دادا جناب عبدالمطلب کافر تھے یا مسلمان؟ــــ اس موضوع پر اس کتاب میں بحث کی گئی ہے۔

فاضل مصنف ان بزرگوں کو موحد اور مومن سمجھتے ہیں۔ اور اس مسلک کی تائید میں انہوں نے عقلی و نقلی دلیلیں پیش کی ہیں اور بڑی تحقیق سے کام لیا ہے۔

"ہم نے اوپر تحریر کیا ہے کہ گو کعب الاحبار اور وہب ابن منبہ نے اسلام قبول کر لیا مگر اسلام دشمنی کا عنصر ان کی ذہنیت میں باقی رہا" (ص ۴)

ان دونوں بزرگوں سے "اسلام دشمنی" کی نسبت درست نہیں ہے ہاں! یہ ضرور ہے اسرائیلی روایتیں ان کے ذریعہ سے آئی ہیں مگر ان کے اس فعل پر "اسلام دشمنی" کی طنز نامناسب ہے۔

مندرجہ بالا بزرگوں کے کفر و ایمان کے بارے میں اکابر علماء دو رائیں رکھتے ہیں ــــ جن کسی کا ان کے صاحب ایمان اور موحد ہونے پر ایمان ہے۔ اس کا موقف پسندیدہ ہے! جن کی رائے دوسری ہے، وہ بھی بے دلیل نہیں ہے اور اسے ان بزرگوں کی دشمنی پر محمول نہیں کرنا چاہئے! بہرحال تمام امت ان بزرگوں کو قابل احترام سمجھتی ہے اور سمجھنا چاہئے۔

جناب سید حشمت حسین نے کوئی شک نہیں اس مسئلہ پر بڑی تحقیق کی ہے، ان کی کتاب اہل نظر کو دعوت غور و فکر دیتی ہے۔

ماہنامہ "مریخ"

سرپرست:- ڈاکٹر اختر اورینوی، مدیر:- عبدالمغنی، ادارہ تحریر:- قمر اعظم ہاشمی، سید نداامام، محمد یونس جوہری، احمد یوسف۔ بدل اشتراک سالانہ دس روپے، فی پرچہ ایک روپیہ۔
ملنے کا پتہ:- لال باغ، پٹنہ ۳ (بہار۔ انڈیا)

یہ مجلہ "بہار ریاستی انجمن ترقی اردو" کے حلقہ ادب کا ترجمان ہے، جو بڑی آب و تاب کے ساتھ منظر عام پر آرہا ہے اب تک اس کے تین شمارے آچکے ہیں اور ہر شمارہ پہلے شمارے سے بہتر ہے! مضامین میں تنوع اور رنگا رنگی کے ساتھ افادیت، سنجیدگی اور بلندی بھی پائی جاتی ہے، پاکیزہ تعمیری ادب کی طرف اس رسالہ کے مرتبین کا رجحان ہے۔ نام نہاد ترقی پسندوں نے شعر و ادب کی فضا کو غبار آلود بلکہ مسموم بنا دیا ہے، ماہنامہ "مریخ" سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ علم و ادب کی فضا کو صحت بخش اور تابناک بنائے گا۔

جناب عبدالمغنی صاحب جو بلند پایہ نقاد ہیں ان کا ذوق، تجربہ اور ذہانت "مریخ" کی کامیابی کی ضامن ہے۔ وہ اور ان کے رفقا تبریک و تحسین کے مستحق ہیں۔

باوانی وائلن ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ
منگھا پیر روڈ کراچی
ہر قسم کا سوتی اور اونی کپڑا (دو) دھلا لٹھا (دو) ہر قسم کا
دھاگہ تیار ہوتا ہے
باوانی وائلن ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ کا
تیار شدہ کپڑا ہر اعتبار سے قابل اعتماد ہے
پاکستان کی صنعت کی قدر اور حوصلہ افزائی
ایک
قومی فریضہ ہے

آدم جی کے پارچہ جات
دیرپا ہوتے ہیں
ACM
آدم جی کاٹن ملز۔ لانڈھی کراچی
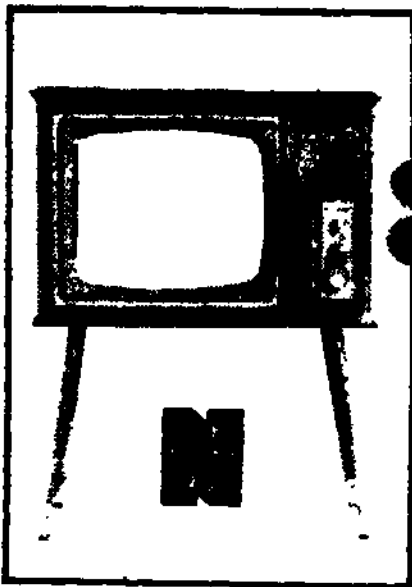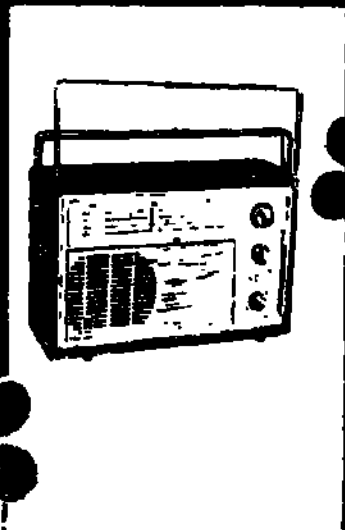
نیشنل اور الفرڈ
ILFORD
ILFORD
ILFORD
HP3
ROLL FILM
ہمہ وقت
آپ کی
مسرتوں
کے ساتھی!
N
رضوی برادرز لمیٹڈ
کراچی ——— لاہور ——— ڈھاکہ
ORIENT

بے مثل کی مثال
دیں تو کیسے؟
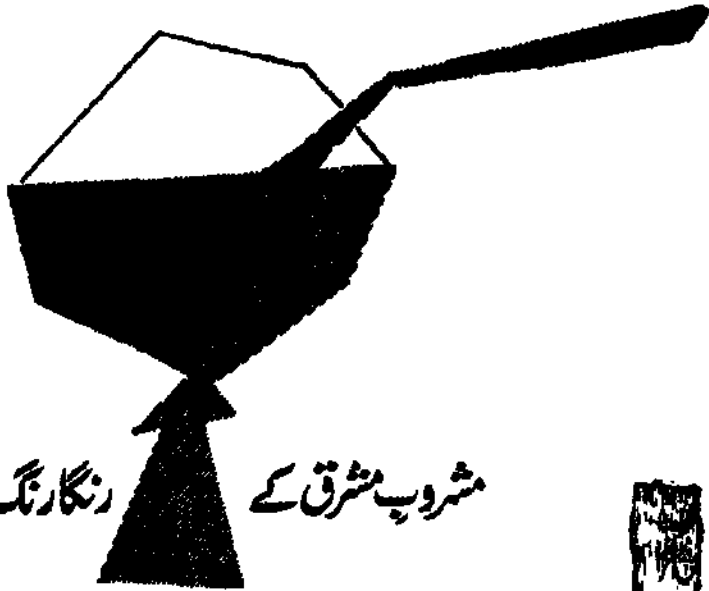
مشروبِ مشرق کے رنگارنگ استعمال!

رُوح افزا عموماً شربت کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے لیکن آپ اسے اور بھی کئی دلپسند چیزوں میں شامل کر کے ایک نیا لطف اور ایک نیا ذائقہ حاصل کر سکتے ہیں۔

رُوح افزا مشروبِ مشرق

رُوح افزا آئس کریم، ملک شیک، سوڈا، لسی اور قلفی وغیرہ

آج کل ہر جگہ مقبولیت حاصل کر رہے ہیں

ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان
کراچی - لاہور - ڈھاکہ - چٹاگانگ

ماہنامہ
فاران
کراچی
مئی سنہ ۱۹۶۸ء
جلد :- ۲۰
شمارہ :- ۲
ایڈیٹر :- ماہر القادری

ترتیب

قیمت فی پرچہ :- ۶۲ پیسے | پبلشر :- ماہر القادری | چندہ سالانہ :- ۷ روپے

مقامِ اشاعت :- دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

باہتمام مستفیض احمد صدیقی پبلشر ماہر القادری نے انٹرنیشنل پریس کراچی میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

نقشِ اوّل

کسی جماعت یا فرد سے اختلاف کیا جاسکتا ہے اور کیا جاتا رہا ہے۔ ساری دنیا ہم عقیدہ اور ہم خیال نہیں ہوسکتی۔ ایک ہی گھرانے کے چند آدمیوں میں بھی کسی نہ کسی بات پر نزاع اور اختلاف ہو جاتا ہے! مگر اختلاف و نزاع کے بھی کچھ اخلاقی حدود ہیں۔ قرآنِ کریم دشمنی اور نزاع میں بھی عدل و انصاف کے تقاضے ملحوظ رکھنے کی ہدایت کرتا ہے، کسی کی دشمنی میں حد سے گزر جانا، یہ اپنی جگہ خود ظلم ہے۔

کسی فرد یا جماعت سے بہ تقاضائے بشریت غلطی بھی سرزد ہو جاتی ہے تو اس غلطی کی سزا اُسی غلطی کے بقدر اُس فرد یا جماعت کو ملنی چاہیے، یہ نہیں ہونا چاہیے کہ جس غلطی کی سزا سوئی کی چبھن ہوسکتی ہے وہاں سوئی کی جگہ نشتر رگ و پے میں اتار دئے جائیں! شرعی مسائل میں بھی علماء سے غلطیاں ہو جاتی ہیں، جس غلطی کی تاویل ہوسکتی ہے اُس غلطی کو بھیانک انداز میں نمایاں کرنا یہ بھی ایک طرح کی زیادتی ہے! یا کسی عالم دین پر کسی مسئلہ میں ذہول طاری ہو جائے، اُس "ذہول" کو اسلام کی تباہی اور دین فروشی سے تعبیر کرنا یہ وہ احتساب ہے جو عدل و انصاف کے معروف تقاضوں کے صریحاً منافی ہے!

ہم نے فاران میں مسلسل مضامین لکھے ہیں جن میں جماعت اسلامی کے ناقدین کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ جماعت کا کوئی عقیدہ، فکر، نظریہ — یا عمل دین و شریعت کے خلاف ہو تو اس کی نشاندہی کی جائے! جماعت اسلامی کوئی ایسا کام نہیں کر رہی ہے جس سے ملک میں دینی قدروں کی نفی ہوتی ہو، جماعتِ اسلامی سے جو لوگ قریب ہوگئے ہیں، اُن کے اندر ذہنی انقلاب پیدا ہوا ہے۔ ایسا نہیں ہوا کہ جماعت اسلامی سے متاثر ہو کر دیندار لوگ دین کے معاملات میں متساہل یا بے پروا ہوگئے ہوں اور رزق و روزگار میں حلال و حرام کی تمیز اُن میں باقی نہ رہی ہو یا اس معاملہ میں انہوں نے رخصتوں پر عمل کر کے ڈھیل چھوڑ دی ہو، ہمارے علم میں ایسی کوئی مثال نہیں ہے، اور ہو گی تو اُس کا درجہ "النادر کالمعدوم" کا ہوگا۔

ہمارے سامنے تو ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ جماعت کی وابستگی نے مسلمانوں میں خوفِ خدا اور محاسبۂ آخرت کا احساس پیدا کیا ہے حقوق اللہ اور حقوق العباد میں یہ حضرات امکانی حد تک فرض شناس ہوگئے ہیں اور بعض نے تو روزگار کے مشتبہ ذرائع تک سے دست کشی اختیار کرلی ہے! ہم نے تمام حالات کا جائزہ لے کر اس احساسِ ذمہ داری کے ساتھ کہ ہمیں اپنے قول و فعل کا اللہ تعالیٰ کے یہاں ایک دن جواب دینا ہے، یہ بات ظاہر کی تھی کہ جماعت اسلامی فرشتوں کی نہیں، انسانوں کی جماعت ہے اور انسانوں سے غلطیاں بھی سرزد ہو جاتی ہیں —— تو جماعت اسلامی اپنی بشری کوتاہیوں کے باوجود ایک خیر پسند جماعت ہے اُس کے وجود سے ملک اور دین و ملت کو فائدہ ہی پہنچ رہا

ہے، جماعت پر اللہ تعالیٰ کے فضل سے خیر ہی کا غلبہ ہے۔

ہمارے یہ مضامین ان حضرات کی نگاہ سے بھی گزریں گے، جو جماعت اسلامی سے وابستہ نہیں ہیں اور اس سے تعلق قطع کر چکے ہیں، ان میں بعض صاحبوں نے جماعت اسلامی سے علیحدگی کے بعد سکوت اختیار کر لیا نہ تائید نہ تردید، کچھ لوگ جماعت سے نکلنے کے بعد اپنے روزی کے دھندے اور دنیوی کاروبار میں منہمک ہو گئے! ان میں ایک دو حضرات ایسے بھی ہیں جنہوں نے کئی سال تک جماعت کی مخالفت کی مگر پھر غالباً یہ محسوس فرما کر کہ جماعت کی مخالفت سے دینی محاذ کمزور ہو رہا ہے، مخالفت بند کر دی ــــ مگر ان میں چند حضرات اس مزاج و کردار کے بھی ہیں کہ جماعت کی دشمنی جن کے دلوں میں جڑ پکڑ چکی ہے اور جماعت کی مخالفت کو کارِ خیر اور عمل ثواب سمجھے ہوئے ہیں، جماعت اسلامی اُن کے نزدیک دین کے لئے بہت بڑا فتنہ ہے، اس لئے تمام دوسرے فتنوں سے قطع نظر کر کے، اس "فتنۂ عظیم" (؟) کی بیخ کنی میں اُن کی پوری توانائیاں صرف ہو رہی ہیں!

مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہٗ ۔ صاحب "تدبر قرآن" کو جماعت کے معاندین کا "سرخیل" کہا جائے تو یہ کوئی بے جا مبالغہ نہ ہوگا "میثاق" کے صفحات اس کے شاہد ہیں کہ مولانا موصوف نے جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کو کیا کچھ نہیں کہا، یہاں تک کہ ایک احراری مولوی کی کتاب پر مقدمہ تحریر فرماتے ہوئے جماعت پر یہودیوں کے ایجنٹ ہونے کی تہمت لگا دی، حضرت مولانا کے مزاج کی افتاد ہی یہ ہے کہ اپنے مخالف کے بارے میں جب وہ لکھتے اور بولتے ہیں تو زبان و قلم قابو میں نہیں رہتے، اس جھنجلاہٹ میں اب جو کچھ بھی ان کے قلم و زبان سے نکل جائے، یہ روایتیں ہم تک پہنچی ہیں کہ اپنی پرائیویٹ محفلوں میں مولانا مودودی کا نام آتے ہی اُن کی راجپوتی رگ پھول جاتی ہے اور "دین فروش" کی طنز اُن کے منہ سے نکل جاتی ہے۔

جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کی تردید و تکذیب اور تنقیص و اہانت کا کام مولانا اصلاحی صاحب نے، ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو تفویض فرما دیا ہے، وہ ان کی نمائندگی اور جانشینی کا پورا پورا حق ادا کر رہے ہیں۔ مولانا موصوف مجلہ "میثاق" کے سرپرست اور بانی ہیں اس لئے ان مضامین سے اُن کی ذات غیر متعلق نہیں سمجھی جا سکتی، جماعت کی دشمنی میں جو کچھ ہو رہا ہے آسے مولانا اصلاحی صاحب کی سرپرستی اور تائید حاصل ہے۔

تازہ "میثاق" (اپریل ۱۹۸۴ء) ہمارے سامنے ہے، اس کے اداریہ میں ڈاکٹر صاحب موصوف تحریر فرماتے ہیں:-

> "جماعت اسلامی کی موجودہ پالیسی سے ہمیں شدید اختلاف ہے اور اُس کے قائد کے بعض علمی مواقف کو ہم انتہائی فتنہ انگیز سمجھتے ہیں لیکن صرف ان کی مخالفت ہمارے نزدیک کوئی مفید کام نہیں ۔۔۔ اور اس پر تنقید کے باب میں ہم اس کم از کم (MINIMUM) سے ہرگز متجاوز نہ کریں گے جو اپنے مثبت کام کے لئے ہمارے لئے ناگزیر ہے۔"

ــــ مگر ــــ

اس اعتراف و اعلان اور وعدے کے بعد ہی اس مضمون کے بعد کا پیراگراف پڑھئے اور عبرت حاصل کیجئے کہ اس دنیا میں اس قسم کے "دیندار" "خدا ترس" اور اپنے وعدے کا پاس کرنے والے بھی پائے جاتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے:-...

"بلکہ سچ پوچھئے تو ہمارا ذاتی احساس تو یہ ہے کہ پاکستان کی جماعت اسلامی بطور جماعت کبھی کی ملت اسلامیہ

قدِ خلافت کے حکم میں داخل ہو چکی، اب تو لے دے کے ایک مولانا مودودی اور دوسرے آن ہی
کی شخصیت کا کچھ داخلی اور کچھ خارجی تانا بانا ہے ۔ تو اس کی اہمیت کیا؟ اور کب تک؟"

"بلکہ سچ پوچھئے"؟ سچ کس سے پوچھنے کے لئے جائیں، جب کہ آپ جو سچائی کے دعویدار ہیں، اتنا بڑا جھوٹ اس صفائی کے ساتھ بول
ہیں کہ لوگوں کی نگاہ میں جماعتِ اسلامی کو حقیر و ذلیل کرنے کے لئے جماعت کے وجود کو "قصہ پارینہ" ٹھیرا رہے ہیں اور پاکستان کی
ب سے بڑی فعال تنظیم کے بارے میں یہ تاثر دے رہے ہیں کہ یہ تو گھاس پھونس سے بھی زیادہ کمتر ہے! مولانا مودودی کی شخصیت کا وزن اور
کی اہمیت سب کے نزدیک مسلم ہے، مگر ڈاکٹر صاحب نے :-

"............ تو اُس کی اہمیت کیا؟"

اس عظیم شخصیت کو بھی اپنی دانست میں "بے وزن" ٹھیرا دیا، اُن کی ذہنیت کا یہ "شتر مرغانہ رنگ" اُن کے کردار کے "ایک" باب جدید کے آغاز کا پتہ
ا ہے ——————— !

جماعت اسلامی کا اگر کوئی وجود ہے تو پھر اُس کی حیثیت ایک "فتنہ" کی ہے اور ہر فتنہ اس کی قابل ہے کہ جس طرح ممکن ہو صفحہ ہستی
سے اُس کا نام و نشان مٹا دیا جائے! اس تصویر کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ یہ جماعت بس کاغذی تنظیم اور دکھاوے کی پارٹی بن کر رہ گئی ہے
جس کی نہ کوئی اہمیت ہے اور نہ کوئی وزن ہے! نہ اُس کے قائد (امیر) (مولانا مودودی) کی شخصیت قابلِ ذکر ہے ——— مجلہ "میثاق"
کے مدیر مسئول یہی تاثرات عوام و خواص کو دینا چاہتے ہیں! یہ صاحب اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اپنے قلم کے زور سے وہ جس فرد یا جماعت کو
چاہیں اہم اور وزنی بنا دیں، اور جس کو چاہیں گھٹیا بنا کر رکھ دیں ——— وہ یہ نہیں سوچتے کہ ایسی ہلکی باتیں کر کے وہ خود اپنی ہوا خیزی کے
اسباب مہیا کر رہے ہیں!

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب تلوّن مزاج ہیں اور ایسی ہنگامہ کو پسند کرتے ہیں جس کا رُخ تخریب کی جانب ہوتا ہے! طالب علمی کے زمانہ میں
جب وہ اسلامی جمعیتہ طلبہ میں شامل تھے، تو اُن کے وجود نے جمعیتہ میں اضطراب و انتشار کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ وہ کچھ دن اور رہ جاتے تو
جمعیتہ کو خدا معلوم کس نقصان اور خطرے سے دوچار ہونا پڑتا!

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جماعت اسلامی سے نکلنے کے بعد آن کا ضمیر چٹکیاں لیتا رہتا ہے کہ تم نے یہ کیا کیا؟ اس لئے وہ اپنے دل کو
بہلانے اور ضمیر کو مطمئن کرنے کے لئے یا تو جماعت کو فتنہ ٹھیراتے ہیں یا پھر اپنے قلب و ضمیر کو یہ فریب دیتے ہیں کہ جماعت اسلامی! توبہ کیجئے
جماعت تو مر چکی، اور زندہ بھی ہے تو لب گور ہو گئی!

آخر کسی فرد اور جماعت کی دشمنی کی بھی کوئی حد و نہایت ہوتی ہے، ڈاکٹر اسرار احمد صاحب جماعت اور مولانا مودودی کی مخالفت میں
ایک ضخیم کتاب لکھ کر چھپوا چکے ہیں، اُس میں جماعت کو بے آبرو اور بہ زعم خود "ننگا کرنے" میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، اس سعی تذلیل کے
بعد بھی آن کا کلیجہ ٹھنڈا نہیں ہوا، جماعت کے خلاف وہ نیش زنی کئے جا رہے ہیں۔

اہلِ علم میں بعض مباحث و موضوعات پر اختلافات بھی ہو جایا کرتے ہیں، مگر اہلِ علم اور خیر پسند اصحاب کی یہ روش نہیں ہوتی
کہ جس سے اختلاف ہو، ہاتھ دھو کر اُس کے پیچھے پڑ جائیں، اُس اپنے مخالف کی تذلیل، تحقیق اور بے آبروئی کو اپنا مشن بنا لیں اور اُس کے
معائب کو اُچھالتے رہیں اور محاسن کو یکسر نظر انداز کر دیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ کو علامہ عبداللہ بن عمر البیضاوی

ماحب تفسیر انوار التنزیل واسرار التاویل) سے تفسیر کے بعض مباحث میں اختلاف تھا، اس اختلاف کا شیخ نے اپنی کتاب "نکات الحق" میں اظہار فرمایا ہے:-

"بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ در تفسیر قرآن وشرح احادیث ازیں باب فیا حتہا لبسیار کردہ
تجاوز اللہ عنہ واگر آں مواضع را بشمارم سخن دراز گردد"

شیخ محدث دہلوی قدس سرہ کا یہ اختلاف حدود اخلاق سے متجاوز نہیں ہونے پایا، وہ علامہ بیضاوی کی بہت سی تفسیری خامیوں کے باوجود "رحمۃ اللہ علیہ" اُن کے نام کے ساتھ لکھتے ہیں اور انہوں نے ملت اسلامیہ کو یہ تاثر نہیں دیا کہ علامہ بیضاوی کی ذات دین کے لئے فتنہ بن گئی تھی اور ان چند خامیوں نے اُن کی تمام خوبیوں پر پانی پھیر دیا۔

مولانا مودودی کے مواقف علمی سے ڈاکٹر صاحب کو اختلاف ہو سکتا ہے، اختلاف اپنی جگہ کوئی معیوب بات نہیں ہے وہ مولانا کے مواقف علمی کو "انتہائی فتنہ انگیز" بھی کہنے اور سمجھنے کا حق رکھتے ہیں، لیکن مولانا مودودی کے اُن بہ کثرت علمی مواقف کو وہ کس طرح نظر انداز کر دیتے ہیں، جو حق اور خیر کے ترجمان ہیں اور جن سے مسلمانوں کو اخلاقی فائدہ پہونچا ہے۔ ڈاکٹر صاحب خود اپنے نظریات وخیالات اور کردار وعمل کا جائزہ لے کر انصاف سے بتائیں کہ مولانا مودودی کی کتابیں پڑھ کر وہ دین سے دور ہوئے ہیں یا دین سے قریب آئے ہیں؟ مودودی صاحب کے جن علمی مواقف کو ڈاکٹر صاحب "انتہائی فتنہ انگیز" کہتے ہیں۔ انہوں نے کس حلال کو حرام اور حرام کو حلال ٹھیرایا ہے، اور ان سے اسلام کے کس مسلمہ عقیدے کی نفی ہوتی ہے! پھر ملت اسلامیہ میں کچھ ایسے اہل علم بھی پائے جاتے ہیں جو مولانا مودودی کے ان "علمی مواقف" کی توجیہہ، تاویل بلکہ تعدیل کرتے ہیں، مودودی صاحب اور جماعت اسلامی کی دشمنی اور عناد سے ذہن کو تھوڑی دیر کے لئے فارغ کر کے ڈاکٹر صاحب ان مضامین کا اگر مطالعہ فرمائیں گے، تو اس موقف تک تو اُن کو آہی جانا چاہئیے کہ "انتہائی فتنہ انگیز" میں سے "انتہائی" نکال کر صرف "فتنہ انگیزی" تاریخ اور ذہول کی سطح تک آجائے!

مولانا مودودی کا کوئی حقیقت شناس اگر اس غلو عقیدت میں مبتلا ہے کہ مولانا موصوف کے قلم سے جو بات نکلی ہے وہ سو فیصد حق ہے، اُن سے سہو وتسامح سرزد ہی نہیں ہوا، تو ایسے شخص کو توبہ کرنی چاہئیے۔ کہ اس قسم کی "معصومیت" نبیوں کو سزاوار ہے! جماعت اسلامی کے زیر اہتمام "غلاف کعبہ" کی جو نمائش ہوئی تھی، جماعت کے بعض عقیدت مندوں نے بھی اس کی تحسین نہیں کی، راقم الحروف "غلاف کعبہ" کی میٹنگ میں اتفاق سے شریک تھا اور مجھ پر خود ذہول طاری ہو گیا تھا، کہ اس نمائش کا دھندلا پہلو نظر نہیں آیا، مولانا مودودی نے اس سلسلہ میں جو مضامین لکھے اُن میں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کو پیش فرمایا، جس میں بدعت (حسنہ اور سیئہ) کی تقسیم کی گئی ہے!" فاران" میں اس پر نکیر کی گئی کہ بدعت کی کوئی قسم نہیں ہے، "بدعت" سیئہ ہی ہوتی ہے اور اس باب میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا قول صحیح ہے کہ "بدعت میں حسن نہیں ہوتا"!

اس تسامح سے یہ نتیجہ نکالنا عدل وانصاف کے منافی ہے کہ جماعت کتاب وسنت کی راہ سے ہٹ کر "بدعات" میں مبتلا ہو گئی ہے جماعت اسلامی کے ارکان اللہ تعالیٰ کے فضل سے "بدعات" کے سبب سے بھی بچتے ہیں اور مولانا مودودی کی تحریریں "توحید خالص" کی آئینہ دار ہیں، اُن کی کتابیں پڑھ کر ذہن وفکر مشرکانہ رسوم وبدعات سے نفرت کرنے لگتے ہیں اور توحید کے تقاضے اُبھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ وہ بدعات جو مشہور ومقبول ہیں اور جن کا مسلمانوں میں آج کل چلن ہے، جماعت اسلامی کے کسی رکن کو اُن کی ہوا بھی نہیں لگی۔ "بدعت" بلکہ

نیہ بدعت" سے بھی اُن کے مجتنب رہنے کا یہ عالم ہے کہ اہل حدیث اور علماء دیوبند تک کے یہاں "ختم بخاری" ہوتا ہے مگر جماعت
امی کا کوئی رکن اس قسم کے "معمولات" سے شغف نہیں رکھتا۔

مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کا کوئی علمی وعملی موقف، فکر وعقیدہ نظریہ یا معمول ایسا نہیں ہے جسے دین وملت کے لئے
فتنہ" قرار دیا جاسکے، اور اگر اُن کے کسی غیر معمولی حساس، شدید، نکتہ شناس اور دقیق النظر ناقد کی نظر میں مودودی صاحب کا
ی موقف" فتنہ" بھی ہے، تو اُس کے مقابلے میں اُن کے بہ کثرت علمی ودینی مواقف دین وملت کے لئے سراپا خیر بھی تو ہیں! امام غزالی، حضرت
امام ابن تیمیہ یا شاہ ولی اللہ (رحمہم اللہ تعالیٰ) ان اکابر کے یہاں بھی فکر ونظر کے تسامحات پائے جاتے ہیں، مگر ان تسامحات
کے سبب ان بزرگوں کے دینی اور علمی کارناموں کی قدر وتحسین کی گئی ہے، انہیں فتنہ نہیں ٹھیرایا گیا، جو کوئی ان سے "فتنہ" کو منسوب کرتا
ہے، وہ خود فتنہ ساز ہے!

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتابیں اس کی گواہ ہیں کہ انہوں نے تو دین کے ہر فتنہ کے خلاف قلمی جہاد کیا ہے، وہ نہ تو خود بت
پرست ہیں بلکہ بت شکن ہیں، انہوں نے حق گوئی کے التزام میں قید وبند کی صعوبتیں بھی برداشت کی ہیں، ایسا شخص طعن وملامت کا
نہیں قدر وتحسین کا مستحق ہے، مگر ہو یہ رہا ہے کہ جس پر تحسین وستائش کے پھول برسنے چاہئے تھے، اُس پر کچھ لوگ دشنام وملامت
کے پتھر برسائے جارہے ہیں! اُس پر طرح طرح کی تہمتیں جوڑی جارہی ہیں اور اُس کو بدنام کرنے کے لئے ہر بڑے سے بڑا جھوٹ
تصنیف کیا جارہا ہے۔

یہ خط!؟ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ نے "میثاق" کے اس اداریہ میں بڑے معصومانہ انداز میں جماعت اسلامی سے اختلاف کو "ہمدردانہ" رنگ دینے کی بھی کوشش ہے۔ حالانکہ اس اداریہ میں جماعت اسلامی سے اُن کی دشمنی اور بغض وعداوت جھلکی پڑ رہی ہے! انہوں نے کراچی کے کسی صاحب کا خط چھاپا ہے جس کے ایک ایک جملہ پر ہم گفتگو
کرنا چاہتے ہیں!

کوئی شک نہیں رسالوں اور اخباروں میں بعض ایسے خطوط اور مراسلے بھی شائع ہوتے رہتے ہیں اور ہوسکتے ہیں جن میں کسی مصلحت
کے سبب خط لکھنے والے کا نام ظاہر نہیں کیا جاتا۔ مگر یہ خط ایسی نوعیت کا ہے جس میں کاتب اور مراسلہ نگار کا نام ہرگز چھپنا نہ چاہئے تھا۔
اگر صاحب مکتوب کا نام اور پتہ درج کردیا جاتا، تو راقم الحروف ان صاحب سے ملاقات کرتا اور ان سے ان غلط باتوں کو منسوب کرنے کے
بارے میں پوچھتا۔ عجیب ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو کوئی ایسا مراسلہ مل جاتا ہے جسے پڑھ کر وہ اس نتیجہ پر پہونچتے کہ ان کی "تشخیص" کے کہیں نا کہنے
کے قابل نہیں ہیں۔

لیجئے خط شروع ہوتا ہے:۔

"...... اخبارات میں پڑھ کر بے انتہا مسرت ہوئی کہ جماعت اسلامی کے تابوت میں آخری کیل
ٹھونکنے کے لئے آپ کی جماعت میدان عمل میں آگئی ہے"

مکتوب نگار نے ڈاکٹر صاحب کو یہ خوشخبری سنائی ہے کہ جماعت اسلامی کبھی کی مرچکی، اُس کا جنازہ بہت دنوں سے
جس تابوت میں رکھا تھا اس میں آخری کیل ٹھونکنے کے لئے (خاک بدہن حسّاد) اے ذمہ دار مدیر میثاق! آپ کی جماعت میدان عمل میں آ

گئی ہے ــــــ جزاک اللہ!

پورا خط نقل کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب "میثاق" کے اداریہ میں رقمطراز ہیں :ــ

"ان متضاد اثرات کے پیش نظر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم بعض وضاحتیں پیش کردیں تاکہ اس کے بعد اگر کوئی اس قبیل کی خبروں سے اپنا من مانا مفہوم اخذ کرنا چاہے تو اس کی پوری ذمہ داری اس پر ہو۔

"جہاں تک تنظیم اسلامی کے قیام اور اس میں جماعت اسلامی کے بعض سابق اہم کارکنوں اور رہنماؤں کی شرکت کا تعلق ہے یہ بفضلہ تعالیٰ وبحمدہ ایک مسرت بخش حقیقت ہے لیکن اس کے بارے میں یہ خیال جس کا بھی ہو غلط ہے، کہ یہ جماعت اسلامی کی مخالفت یا اس کی قیادت کو ننگا کرنے کے لیے قائم کی گئی ہے۔ قارئین میثاق تنظیم اسلامی کے قیام کے پورے پس منظر سے بخوبی آگاہ ہیں، اجتماع رحیم یار خان، جس میں اس کے قیام کے فیصلے کو آخری صورت دی گئی تھی اس کی پوری روداد میثاق میں شائع ہو چکی ہے اس کی اساسی قرارداد اور اس کی توضیحات ابتداً جس صورت میں تھیں، ان میں سے بھی بعد میں وہ تمام مقامات حتی الامکان حذف کردیے گئے، جن میں کوئی اشارہ جماعت اسلامی یا اس کے نظریات کی جانب نکلتا تھا۔"

وہ جو ایک انگریزی کہاوت ــــــ کی تحقیق سے باہر آگئی ــــــ ہے، اس "تنظیم اسلامی" کا جس کا آرگن ماہنامہ "میثاق" ہے۔ اور جس کے سرپرستوں میں مولانا امین احسن اصلاحی [illegible] یہی حال ہے! مولانا [illegible] "نئی دینی تنظیم" کے سلسلہ میں [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

پھر [illegible]

"اس کی اساسی قرارداد اور اس کی توضیحات ابتداً جس صورت میں تھیں، ان میں سے بھی بعد میں وہ تمام مقامات حتی الامکان حذف کردیے گئے، جن میں کوئی اشارہ جماعت اسلامی یا اس کے نظریات کی جانب نکلتا تھا۔"

اس عبارت میں "حتی الامکان" قابل غور ہے، یعنی "تنظیم اسلامی" کی اساسی قرارداد اور توضیحات سے "حتی الامکان وہ تمام مقامات حذف کردیے گئے" ــــــ! مگر اب بھی کچھ مقامات، جملات سے یا بعض ابہام و رموز باقی رہ گئے ہوں تو اس "نئی دینی تنظیم" کے بانی اور رفقاء کیا کریں، یہ چیز ان کے امکان سے باہر تھی! ــــــ کاغذ سے تو آپ نے اس قسم کے مقامات مٹا دیے مگر اپنے دلوں کو کیا کریں گے، جو جماعت اسلامی کے بغض و عناد سے بھرے ہوتے ہیں! اللہ اللہ! کس قدر ٹھوس اور پائدار و مستقیم "تنظیم اسلامی" ہے جس کی بنیاد ہی میں خرابی کی صورت مضمر ہے، کہ پہلے قدم ہی پر اساسی قرارداد میں حذف و ترمیم کی ضرورت محسوس ہوئی!

کیا ان حقائق سے یہ ثابت نہیں ہوا کہ یہ "تنظیم اسلامی" حقیقت میں "جماعت اسلامی" کے توڑ پہ اور اس کی مخالفت و عداوت کو
ن میں رکھ کر بنائی گئی ہے اور اس کے ہوا خواہ خوشی کے مارے بغلیں بجا رہے ہیں کہ اس "تنظیم" کا میدان عمل میں آجانا جماعت اسلامی
لیئے پیغام مرگ ہے۔ ان حقائق اور شواہد کی موجودگی میں ڈاکٹر صاحب کا یہ ارشاد:-

"ان تمام امور سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جماعت اسلامی کی مخالفت یا اس کے قائد کی شخصیت کی
پردہ دری تنظیم اسلامی کے بنیادی تو کیا فروعی و ثانوی مقاصد میں بھی شامل نہیں ہے۔"

ا مضحکہ خیز ہے! "تدبر قرآن" اور "تزکیہ نفس" کے مدعی ایسی توجیہیں اور تاویلیں کر کے، دنیا کو، اپنے نفس کو اور اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینا چاہتے
یا ——— جس "دینی تنظیم" کی اساسی قرارداد میں جماعت اسلامی کو ہدف بنایا گیا ہو، اس کے بارے میں یہ کہنا کہ جماعت اسلامی کی مخالفت
یم اسلامی کے بنیادی تو کیا فروعی و ثانوی مقاصد میں بھی شامل نہیں ہے، ——— کتنا سفید جھوٹ ہے!

ڈاکٹر اسرار صاحب نے "جماعت اسلامی کے قائد کی شخصیت کی پردہ دری" لکھ کر اپنے نفس کی شرارت اور خبث باطن کا ثبوت دیا
ہے، مولانا مودودی کی زندگی ہمیشہ سے "کھلی کتاب" رہی ہے، اس میں کوئی "راز" نہیں "پردہ" نہیں! کچھ لوگ اُن پہ تہمتیں جوڑ کر اس کا نام
پردہ دری" رکھ لیں، تو ایسے آبرو باختہ لوگوں سے اللہ تعالیٰ ہی انتقام لے سکتا ہے۔

اس خط کی عبارت:

"میں عرصے سے اسی فکر میں تھا کہ جماعت اسلامی جن محترم ہستیوں کی بدولت بام عروج تک پہونچی وہ
ایک ایک کر کے اس سے علیحدہ ہو گئے اب جماعت میں رہا کیا ہے ......"

جماعتوں، اداروں اور پارٹیوں سے ارکان وابستہ اور علیحدہ ہوتے ہی رہتے ہیں، تقسیم ہند سے قبل ہندوستان کی جمعیۃ علماء کے
ارکان میں اس قدر اختلاف پیدا ہوا کہ دوسری "جمعیۃ علماء" وجود میں آگئی، ندوہ (لکھنؤ) کے اکابر کی نزاع و اختلاف بھی سب کو معلوم
ہے، دارالعلوم دیوبند کے بعض اکابر انتظامی امور پہ ناراض ہو کر ڈابھیل چلے گئے اور وہاں انہوں نے دینی درسگاہ قائم کر دی، مگر دارالعلوم
اُسی شان سے قائم رہا اور اب تک قائم ہے! جماعت اسلامی بھی متعدد ارکان کے اختلاف سے دوچار ہوئی، اور اُن کی علیحدگی کے بعد بھی
وہ زندہ و پائندہ رہی اور آج وہ پہلے سے زیادہ فعال ہے، عوام اس پر اعتماد کرتے ہیں، اُس کے ہر شعبہ میں ترقی ہوئی ہے اور منظم مخالفتوں
کے باوجود اُس کی ساکھ قائم ہے بلکہ پہلے کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے کچھ اضافہ ہی ہو گیا ہے ـــ فرض شناسی، ایثار، خدا ترسی
دین سے شغف، اور اس کی اشاعت اور اقامت کے لئے جدوجہد، یہ تمام صفات جماعت کے موجودہ ارکان میں موجود ہیں، جو حضرات جماعت
سے علیحدہ ہوئے ہیں وہ جماعت میں باقی رہنے والے ارکان سے اُن کی صفات اور خوبیاں چھین کر نہیں لے گئے!

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے:-

"اگر آپ حضرات اس سے قبل میدان میں آجاتے، تو جماعت اسلامی والے کبھی کا میدان چھوڑ کر
بھاگ جاتے"

اس خط کے شروع میں مکتوب نگار نے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو یہ خوشخبری سنائی تھی کہ جماعت اسلامی مر چکی، اُس کے تابوت میں
بس آخری کیل ٹھونکنی باقی رہ گئی ہے، سو اس کارنامہ کو انجام دینے کے لئے آپ حضرات (تنظیم اسلامی والے) میدان عمل میں آگئے ———

مندرجہ بالا فقرہ اُن کے اس مشاہدے کی تردید کرتا ہے: جماعت اسلامی والے تو اب تک میدان عمل میں کام کر رہے تھے، بس اب چند مہینے قبل جب سے یہ "تنظیم" وجود میں آئی ہے، جماعت اسلامی میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئی! ـــــ کیا کوئی شخص جو اپنے دل میں ذرا سا بھی خوفِ خدا رکھتا ہے، اتنی بے سر و پا بات کہہ سکتا ہے اور ایسی بے پر کی اُڑا سکتا ہے! اس مزاج و ذہنیت کے لوگوں کو بندوں کی بھی شرم نہیں ہے کہ اس قسم کے کھلے ہوئے جھوٹ کو پڑھ کر دنیا کیا کہے گی! "تنظیم اسلامی" کب میدان میں آئی؟ اُس نے کیا کارنامہ انجام دیا؟ جماعتِ اسلامی والوں نے ان "مذہبی پہلوانوں" کے خوف سے کب راہِ فرار اختیار کی! اس جھوٹ سے خدا کی پناہ!

"کیونکہ جماعت اب تک سسک رہی ہے، اندرونی طور پر سخت انتشار برپا ہے۔ دیگر سیاسی پارٹیوں کا سہارا لے کر تنِ مردہ میں نئی جان ڈالنے کی ناکام کوشش ہو رہی ہے۔"

جماعت اسلامی میں نہیں یہ "انتشار" مکتوب نگار کے ذہن و فکر میں برپا ہے اور یہ تو سیاسی پارٹیوں کے اکابر سے جا کر پوچھئے کہ کس کو کون سہارا دے رہا ہے؟ رہا جماعت کے سسکنے کی بات، تو یہ مکتوب نگار کے مریض ذہن اور مردہ ضمیر کا "خواب پریشاں" ہے، جماعت اسلامی کی تازہ ترین رپورٹ ہمارے سامنے ہے، اُس سے واضح ہوتا ہے کہ مغربی پاکستان میں ایک سو ایک اور مشرقی پاکستان میں ترسیٹھ ارکان کا اضافہ ہوا ہے ـــــ جماعت کے تین سو بیالیس دار المطالعے، ۴۲۶ مراکز اجرائے کتب، (۱۰۱) مکتبے ہیں، ملاقاتوں کے ذریعہ تقریباً دو لاکھ افراد کو کتابیں مطالعہ کے لئے دی گئی ہیں، مجموعی ملاقاتوں کی تعداد ـــــ تین لاکھ تینتالیس ہزار چھ سو تہتر، تبلیغی وفود تین ہزار ساٹھ ـــــ جارحیت زدہ عربوں کے لئے جماعتِ اسلامی نے جو امداد (نقد رقوم اور سامان) دی ہے۔ وہ ساڑھے چار لاکھ روپیہ سے بھی زیادہ ہے ـــــ جماعت اسلامی کے گشتی شفاخانوں کی تعداد (۱۷) ہے، جس سے سات لاکھ سے زیادہ مریضوں نے ایک سال کی مدت میں استفادہ کیا ہے ـــــ مغربی پاکستان میں اعانت مستحقین کی مد سے یتیم بچوں، بیواؤں، نادار طلبہ اور مستحق دینی اداروں کو ایک لاکھ چار ہزار چھ سو تین روپیہ دیا گیا ہے ـــــ اور صرف کراچی میں "مٹھی آٹا اسکیم" کے تحت سات سو چالیس من آٹا جمع کر کے غریب خاندانوں میں تقسیم ہوا ہے، کراچی میں ایک "میت گاڑی" بھی کام کر رہی ہے، جس کے ذریعہ ۸۶۵ میتیں پہونچائی گئیں (رپورٹ کارکردگی سالانہ جماعت اسلامی پاکستان از یکم اکتوبر ۱۹۶۶ء تا ۳۰ ستمبر ۱۹۶۷ء)!

جہاں تک جماعت کے لٹریچر کا تعلق ہے عربی، انگریزی، ترکی، فارسی، فرانسیسی، انڈونیشی، جاپانی، جرمنی اور سواحلی زبانوں میں دینی کتابیں ترجمہ ہوئی ہیں، دعوتِ اسلامی کے مختلف کاموں کے سلسلہ میں درجنوں ممالک سے مراسلت ہوتی رہی ہے!

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، امیر جماعت اسلامی پاکستان اپنی مسلسل علالت کے باوجود جماعت کے کاموں کی نگرانی فرما کر محنت شاق برداشت کرتے رہے ہیں، ان کی شخصیت اور شہرت "بین الاقوامی" حیثیت اختیار کر چکی ہے، باہر سے آئے ہوئے اسلامی وفود اور مندوبین مولانا موصوف سے ملتے ہیں اور یورپ اعظم بھی اُن کو گشتی مراسلہ بھیجتا ہے ـــــ جس جماعت کی کارگزاری، فعالیت اور سرگرمیوں کا یہ عالم، کیا کوئی شخص بہ صحتِ ہوش و حواس اُس جماعت کے بارے میں ایسی جھوٹی باتیں کہہ سکتا ہے کہ جماعت مر چکی بس اس کے تابوت میں کیل ٹھونکنا باقی رہ گیا ہے ـــــ جماعت اسلامی والے میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے ـــــ جماعت سسک رہی ہے ـــــ اس کے ہر حلقہ میں سخت انتشار برپا ہے!

اور سنئے :ـــ

"۔۔۔۔۔ تمام معیارات کو بالائے طاق رکھ کر ارکان کی بھرتی کا دفتر کھول دیا گیا ہے"

جب جماعت مرچکی، تو ارکان کی بھرتی کا دفتر کس نے کھولا ؟ اور کب کھولا ؟ اور ایسی جماعت جو سیلاب چھوڑ کر راہ فرار اختیار کر چکی، اُس میں کوئی صاحب عقل و ہوش کیوں بھرتی ہونے لگا ؟" ارکان کی اس بھرتی" کی حقیقت بھی سن لیجئے، مولانا امین احسن اصلاحی ۱۹۵۷ء میں جماعت اسلامی سے علیحدہ ہوئے ہیں جس کو گیارہ سال ہوتے ہیں، چار سال مارشل لاء رہا، اس سات سال کی مدت میں جماعت اسلامی کے ارکان کی تعداد میں تقریباً سات سو کا اضافہ ہوا ہے یعنی ایک سال میں ایک سو[1] ارکان کے اضافہ کا تناسب! کیا اس تناسب پر "بھرتی کھول دینے" کی طنز کسی عنوان بھی موزوں اور مناسب ہے، یہ اضافہ اور تناسب خود اس کا شاہد ہے کہ جماعت کی رکنیت کا معیار علیٰ حالہٖ باقی ہے، اس کو گرنے نہیں دیا گیا ـــــ

"۔۔۔۔۔ ہر حلقے میں سخت کشمکش اور انتشار رہا ہے، کارکنان تو کارکنان ارکان تک میں سخت بددلی پھیلی ہوئی اور۔۔۔۔۔ دم توڑ رہے ہیں۔۔۔۔۔ خسارے میں چل رہا ہے۔۔۔۔۔ صاحب خسارے کے سبب متعدد بار استعفیٰ دے چکے ہیں"

یہ نقطے (۔۔۔۔۔) ہمارے نہیں، ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے لگائے ہوئے ہیں، انہوں نے اس مکتوب کے بعض الفاظ نہ جانے کیوں حذف کر دئے ہیں! حالانکہ اور۔۔۔۔۔ دم توڑ رہے ہیں، اس جملہ کو مبہم بنانے کی کیا ضرورت تھی، ان منتظموں کا نام آنا چاہئے تھا۔ جو مراسلہ نگار کے قول کے مطابق "دم توڑ رہے ہیں" ـــــ خسارے میں کیا چل رہا ہے ؟ اس نام کو چھپانے کی بھی ضرورت نہ تھی اور جن صاحب کے "استعفے" کا ذکر کیا گیا ہے اُن کا نام تو ضرور ہی آنا چاہئے تھا ـــــ کیا جماعت اسلامی نے کوئی فیکٹری قائم کی تھی! جو خسارے میں چل رہی ہے! جماعت اسلامی کیا کوئی تجارتی ادارہ ہے جس کے نفع و نقصان سے اُس کی کارگزاری کا اندازہ کیا جائے ـــــ جس جماعت کی کارگزاری کے اعداد و شمار ہم نے اوپر پیش کئے ہیں کیا انتشار کی حالت میں، اس صورت میں کہ کارکنوں میں سخت بددلی پھیلی ہوئی ہے اور جماعت سسک رہی ہے ـــــ ان کارگزاریوں اور سرگرمیوں کا ظہور ہو سکتا ہے ؟ جو جماعت سخت انتشار اور اپنے ارکان کی شدید بددلی کی حالت میں اس قدر فعالیت کا ثبوت دے سکتی ہے وہ قابل مبارکباد ہے اور اس صورت میں لغت میں "انتشار" اور "بددلی" کے معنیٰ اور مفہوم میں تبدیلی ہونی چاہئے!

یہ خط ان جملوں پر ختم ہوتا ہے :۔

"یہ انتہائی مناسب موقع ہے اگر آپ لوگوں نے ہمت اور محنت سے کام کیا تو پاکستان کے لوگ جلد اس مقدس معیت سے چھٹکارا حاصل کر لیں گے۔۔۔۔۔"

مکتوب نگار، مجلہ "میثاق" کے فاضل مدیر کو یہ بات سمجھا رہے ہیں کہ جماعت اسلامی سسک رہی ہے اُس کے اندر انتشار رہا ہے دیکھنا! اس موقعہ کو ہاتھ سے نہ جانے دینا، جماعت پر بھرپور وار کرنے کا یہی مناسب وقت ہے!

ایسا خط جس میں خط لکھنے والے نے واہی تباہی باتیں بکی ہیں اور بازاری انداز بیان اختیار کیا ہے کیا ذرہ برابر اہمیت دینے کا مستحق

---

[1] اس رپورٹ میں جماعت کے ارکان کی کل تعداد دو ہزار ایک سو پچیس بتائی گئی ہے۔

تھا ؟ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا ضمیر کیا اس پر مطمئن ہے کہ اس خط میں کوئی ایک بات بھی صحیح بیان کی گئی ہے۔ کیا یہ کذب خامہ اور جھوٹ پتر" مجلہ "میثاق" میں اشاعت کے قابل تھا ؟ ڈاکٹر صاحب اور ان کے رفقا سوچیں کہ جماعت اسلامی کی دشمنی نے اُن کی علمی اور اخلاقی سطح کو کس قدر پست کر دیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اس اداریہ میں "تنظیم اسلامی" کی پوزیشن صاف کرنے کی اس انداز میں کوشش کی ہے :-

"آئندہ کے لئے ہم یہ بات پہلے بھی واضح کر چکے ہیں اور اب پھر کئے دیتے ہیں کہ جماعت اسلامی سمیت کسی بھی جماعت کی مخالفت ہمارے مقاصد میں شامل نہیں ہے، تنظیم اسلامی بالکل مثبت مقاصد کے لئے قائم ہوئی ہے"

"تنظیم" کی اساسی قرارداد میں "جماعت اسلامی" کی دشمنی سموئی ہوئی ہو، جس "تنظیم" کی روداد پڑھ کر، اُس کے ہر اخواہوں اور ہم خیال حضرات کا ذہن فوراً "جماعت اسلامی" پر جا کر ٹھیرے کہ یہ تنظیم تو جماعت اسلامی کو میدان سے بھگانے اور جماعت کے تابوت میں کیل ٹھونکنے کے لئے وجود میں آئی ہے (فہم المراد) ـــــ اس "تنظیم" کے بارے میں یہ لیپا پوتی کہ :-

"کسی بھی جماعت کی مخالفت ہمارے مقاصد میں شامل نہیں ہے تنظیم اسلامی مثبت مقاصد کے لئے قائم ہوئی ہے"

کسی ہوشمند انسان کے لئے بھی قابل قبول ہو سکتی ہے ؟ کیا ایسی تصنع کی باتوں سے دل کا بغض چھپ سکتا ہے ؟ اس سفاکی کی بھلا کوئی انتہا ہے کہ چھپ کر اور کھل کر وار بھی کئے جاتے ہیں، مگر لوگوں کو یہ تاثر دینے کی کوشش فرمائی جاتی ہے کہ ہم نے تو کچھ بھی نہیں کیا ؟ ہم تو بڑے خیر پسند بھولے اور مرنجاں ومرنج ہیں !

اور سنئے : ان "کوتہ آستینوں" کی دراز دستی کا ایک اور شاہکار :-

"ہوا یہ کہ جھنگ کی اسلامی جمعیتہ طلبہ سے منسلک بعض طلبہ بعض اسباب کی بنا پر (جن میں سب سے زیادہ اہمیت خلافت وملوکیت کو حاصل ہے) جمعیت اور جماعت دونوں سے باغی ہو گئے اور انہوں نے اپنی ایک علیحدہ تنظیم "تنظیم فلاح طلبہ پاکستان" کے نام سے قائم کر لی، ساتھ ہی انہوں نے بعض امور میں مشورہ طلب کرنے کی غرض سے پہلے مولانا امین احسن اصلاحی اور پھر راقم الحروف سے ربط قائم کیا اور اس کے لئے ان کے ناظم صاحب نے لاہور کا سفر بھی کیا، راقم نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ تنظیم کے بکھیڑوں میں نہ پڑیں اور اپنے تعلیمی مشاغل سے جتنا وقت بھی فارغ کر سکیں، اسے عربی زبان کی تحصیل اور قرآن حکیم کے مطالعے میں صرف کریں، ساتھ ہی یہ بھی عرض کیا کہ اگر وہ اس طرز پر کام کرنے کو تیار ہوں تو راقم الحروف ان کے ساتھ تعاون پر آمادہ ہے ـــــ انہوں نے اس سے کامل اتفاق کا اظہار کیا چنانچہ فروری میں راقم الحروف نے جھنگ کا سفر کیا اور وہاں ایک باقاعدہ حلقۂ مطالعہ قرآن کی بنیاد بھی رکھ دی اور ایک معروف عالم دین سے وعدہ بھی لے لیا کہ وہ انہیں عربی پڑھانے کے لئے وقت بھی دیں گے، اتفاق سے اُسی دن گورنمنٹ کالج جھنگ کی مجلس علوم اسلامی کی سالانہ تقریب بھی تھی جس میں راقم کو تقریر

کی دعوت دی گئی، چنانچہ وہاں مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق کے موضوع پر تقریر بھی کی گئی — !

جھنگ میں ڈیڑھ روز قیام کے دوران بھی ان نوجوان طلبہ سے بار بار یہی کہا گیا اور پھر خطوط میں بھی انہیں اس کی تاکید کی گئی کہ **جمعیت یا جماعت کی مخالفت ہی کو اپنا مقصد نہ بنالیں۔** بلکہ ساری توجہ مثبت تعمیری کاموں پر صرف کریں۔

لیکن جو خبر جھنگ سے نشر ہوئی اس میں بالکل برعکس بات کہی گئی، اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کی ذمہ داری کس پر ہے، بہرحال یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ تنظیم اسلامی کے پیش نظر ہرگز طلبہ کی کسی نئی تنظیم یا جماعت کا قیام نہیں ہے، تنظیم کے پیش نظر کوئی سیاسی کھیل کھیلنا نہیں ہے کہ اسے طلبہ کی کسی علیحدہ تنظیم کے قیام کا کھکھیڑ مول لینا پڑے —— تنظیم جو تعمیری کام کرنا چاہتی ہے وہ طلبہ اور غیر طلبہ کے لئے عام ہیں اور تنظیم اسلامی کے دروازے طلبہ اور غیر طلبہ سب کے لئے یکساں کھلے ہیں" (میثاق - اپریل ۶۸ء)

یہاں یہ سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ کوئی کانگریسی مولوی جماعت اسلامی کی مخالفت میں کوئی کتاب لکھتا ہے، تو اس پر مقدمہ لکھوانے کے لئے اس کی نگاہ حضرت مولانا امین احسن اصلاحی ہی پر کیوں پڑتی ہے ؟ اور مولانا موصوف جماعت کی مخالفت میں اپنے قلم کا پیمانہ صرف غم اکر جماعت اسلامی پر حکومت اسرائیل کے ایجنٹ ہونے تک کی تہمت جوڑ دیتے ہیں —— کسی درسگاہ کے طلبہ (ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے بقول) جمعیت یا جماعت سے بغاوت کرتے ہیں تو وہ بھی مولانا امین احسن اصلاحی اور ڈاکٹر صاحب کی طرف رجوع کرتے ہیں —— آخر آپ حضرات نے اپنے چہروں پر "جماعت اسلامی کے دشمن" کیوں لکھ رکھا ہے کہ جماعت کے مخالفین کی نگاہ آپ ہی کی طرف جاتی ہے —— اور جماعت سے اختلاف کرنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ اس اختلاف و نزاع اور عداوت و عناد میں آپ حضرات اُن کی سرپرستی، رہنمائی اور قیادت فرمائیں گے !

ڈاکٹر صاحب برسوں اسلامی جمعیۃ طلبہ سے وابستہ رہے ہیں، انہیں خود اس کا تجربہ ہے کہ جمعیۃ طلبہ پاکستان کے تعلیمی اداروں میں اسلامی ماحول پیدا کرنے کی مخلصانہ جدوجہد کر رہی ہے اور اپنے آغاز قیام سے اب تک اللہ تعالیٰ کے فضل سے اسی جدوجہد میں مصروف ہے ! جمعیۃ والے نماز روزے کے پابند ہیں درسگاہوں میں اُن کی کوششوں کے سبب دین کا چرچا ہے، دوسرے طلبہ کے مقابلے میں اُن کا اخلاق بدرجہا بلند ہے ! مخلوط تعلیمی اداروں کی طالبات جمعیۃ کے کارکنوں کے اخلاق و تقویٰ کی شہادت دیں گی کہ یہ نوجوان تاک جھانک، چھیڑ چھاڑ اور رومانس کے داعیات و محرکات سے کس قدر اجتناب کرتے ہیں !

راقم الحروف جمعیۃ طلبہ کے بعض اجتماعات میں شریک ہوا ہے، نزدیک و دور سے جمعیۃ سے وابستہ طلبہ کی دینی سرگرمیوں کو بھی دیکھا ہے، جو طلبہ جمعیۃ میں شامل نہیں ہیں اُن سے بھی جمعیۃ کے بارے میں اُن کی رائے دریافت کی ہے، اللہ تعالیٰ دلوں کا بہتر جانتا ہے۔ اس گناہگار نے ان طلبہ کی صالح جوانی کو دیکھ کر ہمیشہ ندامت محسوس کی ہے ! جمعیۃ طلبہ کا وجود پاکستان کے لئے اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اسلامی اخلاق کی زندہ حجت ہے - طلبہ کی یہ دینی تنظیم تو مولانا اصلاحی، ڈاکٹر اسرار احمد اور اُن کے دوسرے رفقاء کی تائید و اعانت کی مستحق تھی !

—— مگر ——

ان حضرات کا رول یہ ہے کہ اسلامی جمعیتہ طلباء سے اول تو غیر متعلق ہیں اور اُس کو تقویت دینے کا خیال ہی اُن کے ذہن میں نہیں آتا جیسے یہ ناپسندیدہ نوجوانوں کا کوئی گروہ ہے جو کسی لایعنی فعل میں مبتلا ہے ۔۔۔۔۔ پھر جمعیت سے بغاوت کے آثار نمایاں ہونے میں وہاں یہ شیر بن کر پہونچ جاتے ہیں، اور جمعیتہ کے اس انتشار و اضطراب کو دبانے اور بغاوت کو فرو کرنے کی بجائے اس قسم کے مشورے دیتے ہیں کہ جن میں " وصل " کا کوئی اشارہ تک نہیں فصل و بیزاری کے جذبہ کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے ۔

مولانا اصلاحی صاحب، ڈاکٹر صاحب اور اُن کے دوسرے رفقاء کو جماعتِ اسلامی کی دشمنی نے اس سطح پر پہونچا دیا ہے، انہیں شبہ ہو جائے کہ کوئی نیک کام جماعت اسلامی کے ایما سے ہو رہا ہے تو وہ بھی ان کی آنکھوں میں کھٹکتا ہے ! " تعاونوا علی البر والتقویٰ " کی بجائے " تعاونوا علی التخریب الجماعت " ان بزرگوں کا مشن ہے ۔

جھنگ کی اسلامی جمعیتہ طلبہ سے منسلک بعض طلبہ کی بیزاری کا بڑا سبب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے قول کے مطابق " خلافت و ملوکیت " کا وجود تھا، تو یہ حضرات اپنی شدتِ مزاج کے تحت ان کو یہ مشورہ دے سکتے تھے کہ اس کتاب کو تم دریا برد کر دو، مگر جمعیتہ سے تعلق قطع نہ کرو اور وقتی جذبہ کے زیر اثر تم نے بہ عجلت یہ " تنظیم فلاح طلبہ پاکستان " جو بنا ڈالی ہے، اسے توڑ دو، یہ تنظیم جمعیتہ کے توڑ پر تم نے قائم کی ہے اس کا رول جمعیتہ کی مخالفت کے علاوہ اور کچھ نہ ہوگا ان طرح طلباء میں دین کا جو کام ہو رہا ہے اُس میں کھنڈت پیدا ہوگی ۔

—— مگر ——

ڈاکٹر صاحب نے اُنہیں مشورہ کیا دیا ۔

" جھنگ میں ڈیڑھ روزہ قیام کے دوران بھی ان نوجوان طلبہ سے بار بار یہی کہا گیا ، اور پھر خطوط میں بھی انہیں اس کی تاکید کی گئی کہ **جمعیت یا جماعت کی مخالفت ہی کو اپنا مقصد نہ بنالیں**، بلکہ ساری توجہ مثبت کاموں پر صرف کریں "

اس میں " **ہی** " غور طلب ہے، یعنی جمعیت اور جماعت کی مخالفت کرتے رہیں، مخالفت کا یہ سلسلہ بہرحال جاری رہنا چاہئے ! اس مخالفت کے ساتھ مثبت تعمیری کام بھی ہوتے رہیں !

ملت اسلامیہ کی بدنصیبی کی کوئی حد و انتہا ہے کہ اُس نے بعض اکابر اور اہل فکر و رائے کا تقویٰ و دینداری اور " تدبر قرآن " اب یہ رول ادا کر رہا ہے !

ماہر القادری
۲۵ اپریل ۶۸ء

فلسطین ـ القدس ـ قبلہ اول

کیلئے آپ کیا کر رہے ہیں

اکابر و اصاغر، حاکم و محکوم، عوام اور خواص سب سوچیں اور اپنے ذہن و فکر اور زندگیوں کا جائزہ لیں کہ یہودیوں کے ناپاک تسلط سے فلسطین کی ارض مقدس کو پاک اور آزاد کرانے کیلئے کیا سعی کی جارہی ہے ۔ دلوں کے زخموں کا کیا حال ہے اُن میں کتنی چبھن، ٹیس اور درد پایا جاتا ہے۔

مسلمانوں کی تاریخ کی یہ اتنی بڑی ٹریجڈی ہے کہ جس کے بعد ہونٹوں کی مسکراہٹ، دلوں کا چین اور آنکھوں کی نیند چلی جانی چاہیے تھی!

اے ننگِ عاشقی تری غیرت کو کیا ہوا!

اُٹھئے اور فوراً اُٹھئے، اور ارض مقدس کی آزادی کیلئے اپنا سب کچھ قربان کر دیجئے۔ مسلمانوں کی محفلوں میں اس چرچے کو عام کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی مغضوب قوم (یہود) کو ارض مقدس سے نکال دینا ہماری زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہے۔

شہادت ـ جہاد ـ قربانی

مولانا عبداللہ گھوسہ

اقامتِ دین

دوسرے مذہبوں میں مذہبی زندگی کا جو بھی تصور ہو۔ اسلام کے نزدیک اس کا تصور اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ انسان جو اپنی اصل حیثیت کے اعتبار سے اللہ کی ایک مخلوق اور اس کا بندہ ہے اپنے ارادے اور عمل سے بھی اپنی پوری زندگی میں اسی کا بندہ بن جائے اسی لئے ایسے انسان کو مسلم کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ جس نے اطاعت قبول کر لی۔

انسانی زندگی بہت سے شعبوں میں بٹی ہوئی ہے اسلام ان تمام شعبوں میں صرف اللہ کی اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے۔ یہ بات اسی وقت ممکن ہے جب زندگی کے تمام معاملات پر ایسے لوگ قابض ہوں جو اللہ کی ہدایت کو آخری سند مانتے ہوں اور اللہ کی مرضی کے مطابق کام کرنا چاہتے ہوں!

اسلام اس تفریق کو درست نہیں سمجھتا کہ زندگی کے کچھ نجی اور شخصی معاملات تو خدا کے حوالے کر دئے جائیں اور باقی اجتماعی اور ملکی معاملات میں لوگ خود اپنی مرضی کے مطابق دوسروں کے کام کرنے کے لئے آزاد ہوں!

جو لوگ اسلام کو ایک مکمل نظام زندگی کی حیثیت سے سمجھ لیتے ہیں اور اسی حیثیت کے مطابق وہ اسلام سے اپنا تعلق قائم کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں ان کی زندگی کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ انسان کی پوری زندگی کو اسلام کی اطاعت میں دے دیں۔ اس مقصد کے لئے وہ جو کوششیں کرتے ہیں۔ اسی کا نام اقامتِ دین ہے، اس کو اسلامی نظام کا قائم کرنا کہا جاتا ہے، یہ کوششیں اپنی ذاتی اصلاح سے شروع ہوتی ہیں اور دعوت و تبلیغ کی تمام منزلوں سے گذر کر جدوجہد کی آخری منزلوں تک پہونچتی ہیں۔

اقامت دین کی اس جدوجہد میں ایک منزل آتی ہے کہ حکومت کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں سونپی جائے جو اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار ہوں اور جن کا مقصد کتاب و سنت کی بنیاد پر حکومت اور معاشرے کا قیام ہو۔

اقامت دین کی کوششوں کا مقصد کسی منزل میں بھی کوئی مادی فائدہ نہیں ہوتا۔ اقامتِ دین کے کام کرنے والوں کے سامنے ایک ہی مقصد ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ان کا خدا ان سے خوش ہو جائے اور جس مالک نے ان کے ذمہ یہ فریضہ کیا ہے وہ ان کو ان کوششوں کا بہترین بدلہ دے اور ان کی وہ زندگی جو موت کے بعد آنے والی ہے اور جو ہمیشہ رہنے والی ہے کامیاب ہو جائے!

یہ اہم مقصد جسے اقامتِ دین یا نظام اسلام کا قائم کرنا کہا جاتا ہے اس کی اہمیت کم لوگ سمجھتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اسے غیر مسلم لوگ کیا سمجھیں گے خود بہت سے مسلمان بھی اچھی طرح نہیں سمجھتے! اکثر مسلمان تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بھی کوئی نجی یا سیاسی کام ہے! اور جس طرح

مری قومیں اپنے سیاسی غلبے کے لئے جدوجہد کرتی رہتی ہیں، اسی طرح مسلمانوں کے شخصی یا سیاسی غلبے کے لئے جو کام کیا جاتا ہے اسی
م اقامتِ دین رکھ دیا گیا ہے اور اس کو اسلامی نظام کا قیام کہا جاتا ہے۔ حالانکہ اقامتِ دین اللہ تعالیٰ کے حکم کو بلند و غالب کرنے
نام ہے۔ ہاں! اس کے طفیل میں ملتِ اسلامیہ کو بھی شوکت و غلبہ حاصل ہوتا ہے۔

اقامتِ دین سے مراد یہ بھی نہیں کہ دین کی محض تبلیغ کی جائے بلکہ اس پر کما حقہٗ عملدرآمد کرنا اُسے رواج دینا اور اُسے عملاً نافذ
نا ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں یہ کہا گیا کہ نماز قائم کرو۔ تو اس سے ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اس کی محض دعوت و تبلیغ کی جائے! بلکہ مقصد
ہے کہ نماز کو اس کی تمام شرائط کے ساتھ نہ صرف خود ادا کرو بلکہ ایسا انتظام کرو کہ وہ اہلِ ایمان میں باقاعدگی کے ساتھ قائم اور رائج
ہو جائے۔ مسجدیں ہوں، جمعہ و جماعت کا اہتمام ہو، وقت کی پابندی کے ساتھ اذانیں دی جائیں، امام اور خطیب مقرر ہوں، اس طرح
لوگوں کو وقت پر مسجدوں میں آنے اور باقاعدگی سے نماز ادا کرنے کی عادت پڑ جائے گی! انبیاء علیہم السلام کو جب اس دین کے قائم
کرنے اور قائم رکھنے کا حکم دیا گیا تو اس سے مراد صرف اتنی بات نہ تھی کہ وہ لوگوں میں اس کی تبلیغ کریں تاکہ لوگ اس کا برحق ہونا تسلیم کرلیں
بلکہ یہ بھی تھی کہ جب لوگ اسے تسلیم کرلیں تو اس سے آگے قدم بڑھا کر پورے کا پورا دین ان میں عملاً رائج اور نافذ کیا جائے! تاکہ اس
کے مطابق عمل درآمد ہونے لگے اور ہوتا رہے اس امر میں شک نہیں کہ دعوت و تبلیغ اس کا لازمی ابتدائی مرحلہ ہے جس کے بغیر دوسرا
مرحلہ پیش نہیں آسکتا، لیکن ہر صاحبِ عقل آدمی خود دیکھ سکتا ہے۔ کہ اس حکم میں دعوت و تبلیغ کو مقصود کی حیثیت نہیں دی گئی ہے،
بلکہ دین قائم کرنے اور دین قائم رکھنے کو مقصود قرار دیا گیا ہے۔ دعوت و تبلیغ اس مقصد کے حصول کا ذریعہ ضرور ہے مگر بجائے خود
مقصد نہیں ہے۔

اقامتِ دین کا سب سے ضروری اور پہلا مرحلہ یہ بھی ہے کہ معاشرے اور ماحول کا جائزہ لینے کے بعد اس معاشرے کے حالات
و کوائف کے مطابق تطہیرِ افکار و تعمیرِ افکار کا سلسلہ بتدریج شروع کیا جائے۔

پوری دنیا میں مختلف ملکوں کے درمیان آمدورفت کی آسانیوں اور ڈاک، تار اور ریڈیو کے ذریعے حالات سے باخبر رہنے کی سہولتوں
کی وجہ سے ایک ایسی فضا بن گئی ہے کہ تقریباً تمام دنیا کے لوگ مختلف مقامات کے خیالات اور افکار سے برابر متاثر ہوتے رہتے ہیں۔ اس کا
مطلب یہ ہے کہ ہم جب کسی ملک کے حالات کے بارے میں کوئی فیصلہ کریں تو اپنی نظر کو صرف اسی ملک کی حد تک محدود نہ رکھیں۔ آج
یہ صورت حال نہیں ہے، کہ اگر کوئی تحریک ہمارے ملک میں اُٹھے تو اس کا اثر ہمارے ملک کے علاوہ کسی دوسرے ملک پر نہ پڑے ہم
دیکھ رہے ہیں کہ مختلف قسم کے خیالات و افکار اور نظریات دنیا کے مختلف ملکوں میں پیدا ہو رہے ہیں اور ان کا اثر خود ہمارے ملک
پر پڑ رہا ہے۔ آخر یہ کمیونزم کوئی پاکستانی فلسفہ تو نہیں ہے لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے ملک کے بعض لوگ اس سے کس درجہ
متاثر ہو چکے ہیں اور کہاں تک اس کا اثر قبول کر تے جا رہے ہیں، پھر کوئی وجہ نہیں کہ اگر آج دنیا کے کسی گوشے میں اسلامی نظام
اپنی اصل اور صحیح صورت میں قائم ہو جائے تو اس کے اثرات دنیا کے مختلف ملکوں پر نہ پڑیں یا خود ہمارا ملک اس سے متاثر نہ ہو۔
در اصل آج اسلامی نظام کے قیام کا مسئلہ کسی ایک ملک کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ پوری دنیا کا مسئلہ ہے۔

اگر کسی ایک چھوٹے سے چھوٹے ملک میں بھی کوئی نظام قائم ہو جاتا ہے جو خدا کے یقین، آخرت کی جواب دہی، اور خدا کی ہدایت
کی پیروی کی بنیاد پر زندگی کے مسائل کا کوئی قابلِ عمل اور کارآمد حل پیش کر دیتا ہے تو پھر آپ دیکھیں گے کہ وہ ذہنی انقلاب جو آج

نہیں جو تے شیر لانے سے زیادہ مشکل دکھائی دے رہا ہے کس تیزی اور کس آسانی سے ممکن ہو جائے گا۔

بندے کو اقامتِ دین کے لئے خلوصِ دل سے صرف جدوجہد کرنا ہے اس سے یہ بازپرس ہرگز نہ ہوگی کہ اس نے دین قائم کیوں نہ کرکے دکھایا۔

جب بندہ اس سلسلے میں ایک مرحلہ طے کر لیتا ہے تو دوسرے مرحلے کے لئے اللہ تعالیٰ بطور خود اُسے طاقت اور صلاحیت عطا کرتا ہے اس سفر کی ایک منزل کو طے کر لینے کے بعد دوسری منزل کے لئے رختِ سفر از خود مہیا ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ جو لوگ ہماری راہ میں قدم بڑھاتے ہیں ہم انہیں اپنی راہوں پر سفر کرنے کے لئے خود راستے دکھا دیتے ہیں۔

آپ کی جس قدر صلاحیتیں اور توانائیاں ہیں آپ ان سب کو سب سے پہلے خدا کے دین کی اقامت پر صرف کریں۔

اگر یہ معاشرہ اسی طرح بگڑتا اور آگے بڑھتا رہا اور غیر اسلامی تحریکیں روز بروز آگے بڑھتی رہیں تو ایمان و اسلام کی بچی کھچی نشانیاں جو ابھی تک باقی ہیں ان کا باقی رہنا مشکل ہو جائے گا۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے کسی ایسے کام کرنے کا مطالبہ نہیں کرتا جو اُن کے امکان میں نہ ہو! "اقامتِ دین" کا فریضہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان پر اُن کی طاقت کے پیشِ نظر ہی عائد کیا ہے، یہ منزل دشوار ضرور ہے اس راہ میں ہر طرح کی قربانیاں دینی پڑتی ہیں، یہ فریضہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت بڑی آزمائش ہے، اس آزمائش میں کھرے اور کھوٹے کا امتیاز ہوتا ہے! اہلِ ایمان دشواریوں سے گھبرایا نہیں کرتے، حالات کتنے ہی ناسازگار اور فضا کیسی ہی مخالف کیوں نہ ہو اہلِ ایمان کو کام یہی کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین کو قائم کرنے کے لئے اپنا سب کچھ لگا دیں! کامیابی اور ناکامیابی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے قیامت کے دن ہم سے اس کا سوال نہیں ہوگا کہ تم ——— کامیاب کیوں نہیں ہوئے؟ بازپرس اس کی ہوگی کہ تم نے اس مقصد کے لئے کیا جدوجہد کی؟ کیا قربانی پیش کی؟ کس ایثار کا مظاہرہ کیا؟

آؤ! ہم سب مل کر "حبل اللہ" کو مضبوطی کے ساتھ تھام لیں اور اقامتِ دین کی راہ پر چل پڑیں اور اس منزل میں جو کام کریں اللہ کی رضا کے لئے کریں، بس پھر ہم کامیاب ہیں (ان شاء اللہ العزیز)

زیرادارت معروف شیرازی ایم ۔ اے ۔ایل ۔ایل ۔ بی

انشاءاللہ یکم مئی ۱۹۶۸ء کو دوبارہ اشاعت پذیر ہورہا ہے بنیادی مقاصد۔ نئے عزائم اور خطوط کار کی ایک جھلک درج ذیل عنوانات میں دیکھی جاسکتی ہے۔

۱۔ پیغام حالات حاضرہ اور تحریک اسلامی کے موجودہ مرحلے میں ہمارے فرائض، اسلامی تحریکات، فکری رجحانات اور پاکستان میں اسلامی نظام حیات کے نفاذ کی تدابیر اور مسلمانوں کو دعوت عمل دینا۔

۲۔ قرآن کے سایہ میں شہید اسلام سید قطب کی مشہور تفسیر "فی ظلال القرآن" کا ترجمہ اور تلخیص حتی الوسع یہ عنوان جاری رہیگا

۳۔ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم مشکوٰۃ المصابیح کی احادیث کا آسان ترجمہ اور تشریح ۔

۴۔ عالم استشراق مستشرقین کے حالات اور اسلام کے خلاف ان کی ریشہ دوانیوں کا پورا جائزہ ۔ فی الحال اس عنوان کے تحت مشہور مستشرق گولڈ زیہر کی کتاب "العقیدہ والشریعۃ فی الاسلام" کا جائزہ لیا جائے گا۔

۵۔ اسلامی نظام زندگی اس عنوان کے تحت اسلامی نظام زندگی کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقی مواد پیش ہوگا۔ مثلاً اسلام کا نظام معیشت، اسلامی اخلاقیات اسلامی عقائد بالخصوص عربی اور انگریزی سے بہترین مقالوں کا ترجمہ ۔

۶۔ فقہ و قانون اس میں اصول فقہ اور قانون کے مختلف پہلوؤں پر اسلامی قانون کے ماہرین کے افکار پیش ہوں گے، اس کے علاوہ :

تعارف کتب اور نقد و نظر وغیرہ

- سابقہ خریدار حضرات میں سے جو حضرات پتے کی تبدیلی چاہتے ہیں وہ جلد اطلاع دیں
- نمونے کا پرچہ منگوانے کے لئے ۶۰ پیسے کے ٹکٹ ارسال فرمائیں ۔

سالانہ چندہ ۱/ ـــ ۷ روپے ـــــــــــ قیمت فی پرچہ ۶۰ پیسے

ہر قسم کی خط و کتابت کے لئے پتہ :-

مینیجر ماہنامہ "اُسوہ" ۳ ایچ ۱۰/۲۵ ناظم آباد کراچی

ملّا واحدی

پاک ہے اللہ اُس چیز سے کہ بیان کرتے ہیں سُبحان اللہ عمّا یصفون (سورہ ۲۳۔ آیت ۹۱) عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ ایک تو خود ہے اور ایک اس کا بیٹا ہے، الیسوع مسیح۔ وہ بھی خدا ہے۔ باپ اور بیٹے کا جوہر واحد ہے۔ ہماری نجات کی خاطر یسوع مسیح انسان ظاہر ہوا تھا اور منکروں کے ہاتھ سے تکلیفیں پاکر واپس چلا گیا۔ اور ایک بار پھر آئے گا۔

یہودیوں کا خدا بقول ایک مغربی مصنف کے بڑا ظالم اور خونخوار ہے نہ گنہگار کو دیکھتا ہے نہ بے گناہ کو۔ اُسے سزائیں دینے کام ہے، خون سے ہولی کھیلتا ہے۔ ڈھٹائی سے جھوٹ بولتا ہے۔ (نعوذ باللہ)

ہندوؤں کے خدا لاتعداد ہیں۔ لیکن اہم اعلیٰ خدا تین ہیں شیوجی، برہما، وشنو۔ تینوں نے انسانی روپ لیا تھا اب اُن کے بت ہیں۔ خداؤں میں اور انسانوں میں فرق یہ ہے کہ خداؤں کے بعض اعضا زیادہ ہیں اور خداؤں کی طاقت کا انسان مقابلہ نہیں کرسکتے ایک خدا (شیوجی) کے بیٹے (گنیش) کا جسم انسانی ہے مگر سر ہاتھی کا سا ہے۔

شیوجی اہم اور اعلیٰ خداؤں میں اہم تر اور اعلیٰ تر ہیں۔ شیوجی نمبر دو کے خدا (برہما) کے خالق ہیں اور برہما نے تیسرے خدا کو جنم دیا تھا۔ اس طرح کہ پانی کا چلّو بھر کر پانی پہ مارا۔ اُس سے بلبلا اُٹھا اور بلبلے میں سے وشنو نکلا، وشنو نے نکلتے ہی برہما کو بیٹا کہہ دیا۔ برہما بولا۔ ہیں؟ اُلٹی بات! میں تیرا بیٹا ہوں یا تو میرا بیٹا ہے۔ دونوں کی بحث بڑھی تو شیوجی نے اپنا لنگ آسمان کی طرف کر دیا۔ وشنو اور برہما سناٹے میں رہ گئے اور کہنے لگے جو اس لنگ کی ابتدا اور انتہا معلوم کرے وہ باپ ہے اور جو معلوم نہ کرسکے وہ بیٹا ہے، وشنو مچھ بن کر پانی میں اُترا اور برہما ہنس بن کر اوپر اُڑا۔ دونوں دو ہزار برس اُترتے اور چڑھتے رہے، لیکن لنگ کی ابتدا اور انتہا نہ ملی۔ برہما نے اس سلسلے میں کچھ چالاکی برتی تھی، لہٰذا اس کی پوجا نہیں کی جاتی ہندوؤں کے خداؤں کا سارا حال نقل کرنا دشوار ہے، کہنا در اصل اتنا ہے کہ مسلمانوں کی کتاب نے ان باتوں کی تردید کی ہے اور بتایا ہے کہ اللہ ان (عجیب و غریب) اوصاف سے مبرا و منزا ہے جو عیسائیت اور یہودیت کو بدنام کرنے والوں اور مشرکین نے اپنی عقل سے گھڑے ہیں۔ سبحان اللہ عما یصفون۔

اللہ کیسا ہے؟ اسے تم کیوں کر سمجھ سکتے ہو۔ اللہ کی مثل کوئی دوسرا ہو تو رکھا دیا جائے کہ اللہ ایسا ہے، قرآن مجید کا ارشاد ہے لیس کمثلہٖ شیءٌ (سورہ ۴۲ آیت ۱۱) اُس سے مشابہ کوئی شے ہے ہی نہیں، تو مشابہت کس شے سے دی جائے۔ لا تدرکہ الابصار (سورہ ۶ آیت ۱۰۳) ہماری موجودہ آنکھیں اُسے نہیں دیکھ سکتیں۔ اُن آنکھوں کا انتظار کرو جو مرنے کے بعد ملیں گی۔ فی الحال ذات الٰہ اللہ کی ماہیت کو سمجھنے کے چکر میں مت پڑو۔ اُس کی صفات کو سمجھو اور وہ صفات اپنے اندر پیدا کرو جہاں تک ممکن ہے

اُمراء و رؤسا تو بادشاہوں اور حاکموں سے ملا ہی کرتے ہیں لیکن علماء اور مشائخ ہمیشہ بادشاہوں اور حاکموں سے دُور
۔ تھے، سوائے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے جنہوں نے شہنشاہ اکبر کے دینِ الٰہی کو رد کرنے کی غرض سے عمائد سلطنت
ں آنا جانا اختیار کیا تھا، کوئی بزرگ ایسا نہیں ہے جس نے دنیاوی وجاہت و اقتدار والے طبقے سے میل جول بڑھایا ہو اور
بی ہر دلعزیز رہا ہو۔ جو اس طبقے سے میل جول بڑھاتے تھے وہ علماءِ سُو کہلاتے تھے۔

میں نے خود دیکھا ہے کہ علماء اور مشائخ انگریزی حکام کی کسی تقریب میں جاتے تھے تو ان کے ساتھ مسلمان پیروں کا برتاؤ بگڑ
تھا۔ مرید سمجھتے تھے کہ انہوں نے انگریزی دعوت میں شرکت کرکے اسلام کی توہین کی ہے۔

ایک سجادہ نشین صاحب لال قلعہ کی سالانہ سرکاری ٹی پارٹی میں پہلی مرتبہ شریک ہوئے ہزاروں آدمیوں کا مجمع تھا۔ کھانے کی چیزیں
یں پر چن دی گئی تھیں اور پینے کی چیزیں بیرے لئے لئے پھر رہے تھے۔ سجادہ نشین صاحب نے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا، البتہ جب پانی
گلاس آئے تو مسلمان بیرے سے پوچھا، بھائی گلاس پاک ہیں؟ بیرا برجستہ بولا، شاہ صاحب! یہاں ایسی باتیں نہیں پوچھنا چاہئیں۔

یہ گھٹیا سی مثال تھی میرے زمانے کے غریب مسلمانوں کی اسلام دوستی کی۔ اونچی مثال سنئے۔ ذرا پیچھے چلنا ہوگا۔ سو برس قبل کا
دہ ہے کوئی فرنگی جامع مسجد دلّی دیکھنے آیا۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بھک منگے بیٹھے رہتے ہیں۔ ایک بھک منگے نے اُس فرنگی کے
ہاتھ پھیلایا اور فرنگی نے جیب سے بٹوا نکال کر اُسے کچھ دیا۔ بٹوا جیب میں واپس جانے کی بجائے نیچے گر پڑا اور بھک منگے نے اُٹھا
۔ تین چار دن بعد وہی فرنگی صاحب پھر تشریف لائے۔ بھک منگے نے اُنہیں پہچانا اور کہا اُس دن آپ کا بٹوا گر گیا تھا۔ لیجئے
یجیے۔ فرنگی نے سوال کیا، اُس میں اتنی اشرفیاں تھیں، تمہاری نیت نہیں بگڑی۔ بھک منگے نے جواب دیا۔ بگڑی تو تھی، مگر خیال ہوا کہ
رت عیسیٰ علیہ السلام کے آگے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی گردن جھک جائے گی کہ اُن کے اُمتی نے عیسائی کی اشرفیاں ہتھیالیں۔
فرنگی نے فوراً دو اشرفیاں بطور انعام پیش کیں۔ بھک منگے نے اُنہیں بھی قبول نہیں کیا۔ کہا اس سلسلے میں انعام قبول کرنا بھی
رے پیشوا کو سبک کردے گا۔

اور پیچھے چلئے۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کا زمانہ ہے ایک بہروپیا بار بار شہنشاہ کے دربار میں پہنچ جاتا ہے اور شہنشاہ ہر بار
خت کرلیتا ہے کہ بہروپیا ہے بالآخر بہروپیے نے درویشی لباس پہنا اور جمنا کے کنارے جھونپڑی ڈال لی اور اس قدر شہرت کرائی کہ شہنشاہ
، کی خدمت میں حاضر ہوا اور کثیر رقم نذر کی۔ بہروپیے نے وہ رقم کثیر جمنا میں پھینک دی۔ جب شہنشاہ کو خوب گرویدہ بنا لیا اور شہنشاہ
خت نہیں کرسکے تو بہروپیے نے سلام کرکے عرض کیا۔ حضور! میں بہروپیا ہوں۔

اب شہنشاہ نے اسے انعام دیا اور پوچھا کہ تم نے اتنی بڑی رقم جمنا میں کیوں ڈال دی وہ تو انعام کی رقم سے بہت زیادہ تھی۔
روپیے نے کہا، رقم جمنا میں نہ پھینکتا تو درویشی کی نقل کیسے مکمل ہوتی۔ مجھے تو درویشی کا پورا پارٹ ادا کرنا تھا۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ میعادی بخار اترنے کے بعد جو لوگ احتیاط سے کام نہیں لیتے، بدپرہیزی کر بیٹھتے ہیں، اُنہیں دوبارہ بخار
نے لگتا ہے پھر ایک میعاد کے لئے بخار عود کر آتا ہے اور دوسری دفعہ کا بخار پہلی دفعہ کے بخار سے زیادہ خطرناک بن جاتا ہے۔ اِسے
نگریزی میں RELAPSE کہتے ہیں۔ اردو میں ابتر پلٹنا۔

اسی طرح کسی نے گناہوں سے توبہ کر رکھی ہو اور وہ صالح زندگی بسر کرنے لگا ہو، اُس کے اعمال، خیالات اور جذبات میں تبدیلی پیدا ہو گئی ہو۔ اُس کی روح روبہ ترقی ہو اور اُس پر نیکی کی کیفیات طاری ہوں، اب اگر وہ کوئی چھوٹی موٹی لغزش بھی کر بیٹھے گا تو اُسے شدید نقصان پہونچے گا۔ روح ترقی کی منازل طے کرتے کرتے نہ رُک جائے گی بلکہ پیچھے ہٹے گی۔ SET BACK ہوگا۔ اعمال، خیالات اور جذبات میں زلزلہ آ جائے گا اور گنہگارانہ زندگی پلٹ پڑے گی، اور دوسری دفعہ توبہ کرنا پہلی دفعہ کی نسبت دشوار تر ہو جائے گا۔

چھوٹی موٹی لغزش کو معمولی شے نہیں سمجھنا چاہئیے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کھیت کی مینڈ نہیں ہوتی تو جانور کھیت کے اندر گھس آتے ہیں اور کھیت کا ناس کر ڈالتے ہیں۔ علیٰ ہذا چھوٹی موٹی لغزشوں کو اہمیت نہیں دی جاتی تو کبیرہ گناہوں کو راستہ مل جاتا ہے اور انسان کا ستیاناس ہو جاتا ہے۔ صغیرہ گناہ کبیرہ گناہوں کی الف۔ بے۔ تے ہیں۔ الف۔ بے۔ تے پڑھے بغیر علم و فضل کی طرف نہیں بڑھنے پاتا۔ صغیرہ گناہ اور مبادیات گناہ سے بچنا بے حد ضروری ہے۔

مُردے سنتے ہیں یا نہیں سُنتے۔ یہ اُسی قسم کی بحث ہے جیسی میرے بچپن میں ایک دفعہ بحثیں چلی تھیں کہ اللہ جھوٹ بول سکتا ہے یا نہیں اور اللہ حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کا مثل پیدا کر سکتا ہے یا نہیں، وغیرہ وغیرہ۔

اس قسم کی بحثیں ہمارے علماء کیا کرتے ہیں۔ میں علماء کی بحثوں میں کیا دخل دُوں۔ لیکن میرا جی ایسی بحثوں سے ضرور گھبراتا ہے ان بحثوں کا دنیا میں کوئی اچھا پھل ملنا ممکن ہے تو میں اس اچھے پھل سے محروم ہوں اور ان بحثوں پر نجاتِ اُخروی منحصر ہے تو اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے اور راہِ راست دکھائے۔

"مردے سنتے ہیں یا نہیں سُنتے" کی بحث خاص میرے شہر میں چھڑی تھی۔ جامع مسجد (دلّی) سے جو سڑک مٹیا محل کی طرف جاتی ہے اُس سڑک کے اِدھر اُدھر تقریباً آمنے سامنے دینی علوم کے دو بڑے مدرسے ہیں ایک کا نام حسین بخش کا مدرسہ ہے، دوسرے کا نام مولوی محمد حسین کا مدرسہ۔ مدرسہ حسین بخش میں جمعہ کے جمعہ مولوی کرامت اللہ صاحب وعظ فرمایا کرتے تھے، اور مدرسہ مولوی محمد حسین میں مولانا محمد ابراہیم صاحب۔ میں مولوی کرامت اللہ کے وعظ میں پابندی کے ساتھ جاتا تھا۔ یکایک مولوی کرامت اللہ نے "مردے سنتے ہیں" کے عنوان پر بولنا شروع کر دیا۔ معلوم ہوا کہ مدرسہ مولوی محمد حسین میں "مُردے نہیں سنتے" کے عنوان پر مولانا محمد ابراہیم گوہر افشانی کر رہے ہیں۔ ہم لوائی اور غیر ہم لوائی کی تو عمر اور قابلیت نہیں تھی، وعظوں میں شرکت کا شوق بجھ گیا۔

اس وقت ایک خط پیش نظر ہے۔ راقم خط نے مجھ سے دریافت کیا ہے کہ مرنے کے بعد انسان کا دنیا والوں سے تعلق باقی رہتا ہے یا نہیں۔ فلاں صاحب کہتے ہیں کہ فلاں فلاں آیات سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ تعلق نہیں رہتا۔ میں نے جواب دے دیا کہ ان آیات کا تو میرے نزدیک یہ مفہوم نہیں ہے۔ لیکن قرآن مجید میں کسی جگہ بھی لکھا ہو کہ تعلق باقی نہیں رہتا تو بس ٹھیک ہے اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟ البتہ پریشانی اور فکر کی بات یہ ہو سکتی ہے کہ پس ماندہ عزیز اور دوست جب وہاں پہونچیں گے تو تعلقات کی تجدید کی جائے گی۔ یا نہیں۔ دیکھیں وہاں جا کر ہی نہیں۔ یہاں رہ کر بھی اللہ سے تعلق بڑھانا چاہیے، اور غیر اللہ سے صرف اتنا تعلق رکھنا چاہئیے کہ جتنے تعلق کا اللہ نے حکم دیا ہے۔

حکم دیا ہے ۔"

اس سے زیادہ میں ان صاحب کو نہیں لکھ سکا، کیونکہ یہ مضمون بھی ویسا ہی ہے جس پر غور کرنا میرے بس کا نہیں ہے۔ مضمون پر غور کرتے کرتے سوچنے لگتا ہوں کہ اس پر غور کرنے سے فائدہ کیا ہے؟ وہ فائدہ کم علمی کی وجہ سے یا بدقسمتی سے مجھے سجھائی نہیں دیتا ۔

خیال پڑتا ہے، حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ صحابہ کو تقدیر پر بحث کرنے سے روکا تھا مگر میں نے راقم خط کو حدیث نہیں دی، کیونکہ انہوں نے ہدایت کر دی تھی کہ جواب قرآن مجید کے حوالے سے دیا جائے، احادیث رسول کے حوالے سے نہ دیا جائے۔

کام دل سے کیا جائے تو اپنا دل بھی لطف محسوس کرتا ہے اور کام لینے والا بھی خوش ہوتا ہے۔ کام لینے والا غیر اللہ ہو یا اللہ، مومن پیشِ نظر ... تو ہر کام میں اللہ رہتا ہے اور مومن جانتا ہے کہ اللہ کی خوشنودی سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں ہے۔ و رضوان من اللہ اکبر۔ (سورہ ۹- آیت ۷۲)۔

دوسرے کو خوش کرنے کا رجحان اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں رکھا ہے اور یہ اس پر چھوڑ دیا ہے کہ دیکھیں تو ہماری خوشی کس درجے سے چاہتا ہے۔

کام بے دلی سے انجام دیا جائے تو انسان اپنے لطف اور دوسروں کی اور اللہ کی خوشنودی، سب سے محروم ہو جاتا ہے۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ نماز اس طرح پڑھا کرو گویا تم اُسے دیکھ رہے ہو جس کے قدموں میں تم سر رکھ رہے ہو یا کم از کم اتنا تصور تو جاؤ کہ وہ تمہارے رکوع و سجود دیکھ رہا ہے ۔ (مفہوم حدیث) نماز کے ایسے کیف کا نام حضورؐ نے "احسان" بتایا ہے۔ اسی "احسان" کو عرفِ عام میں "تصوف" کہتے ہیں۔ اسلامی تصوف اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ہم شریعت کی تعمیل دل سے اور پورے اخلاص سے کرنے لگیں۔ تصوف ہمیں راہِ عمل نہیں سکھاتا۔ ہمارے اندر صرف جذبۂ عمل اور ولولۂ عمل ابھارتا ہے، یا ہم میں خود شناسی اور خدا شناسی کو ابھارتا ہے ۔
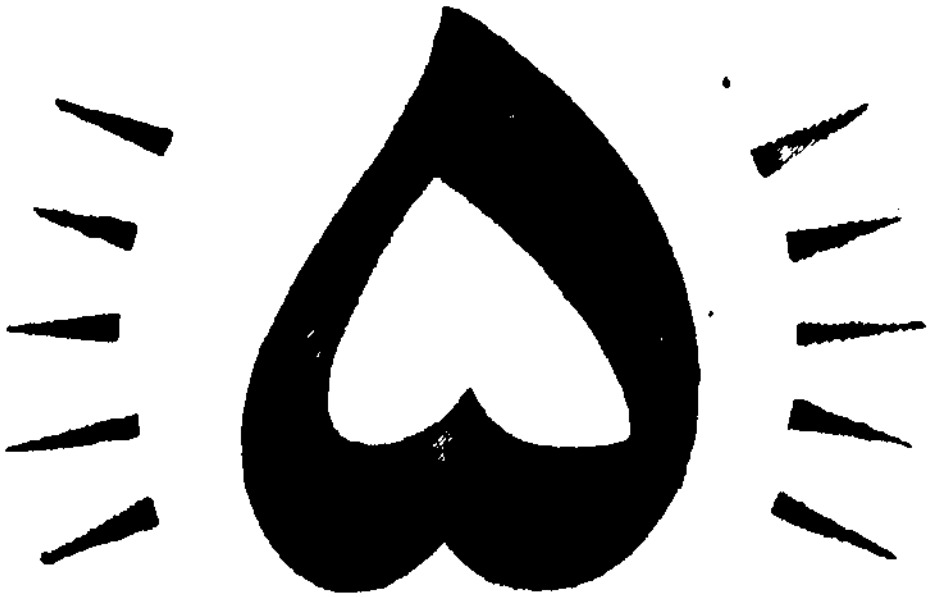
۵
آزمودہ دواؤں کا مرکب
انالجین
سر درد۔ کمر کا درد۔ دانت کا درد
ایام۔ انفلوئنزا اور ہر قسم کے دوسرے درد کے لئے
یقینی زود اثر اور بے ضرر علاج ہے
Spocin

محمد حفیظ اللہ پھلواری

شہاب الدین محمد غوری کا علمی ذوق

غزنیوں کے خاتمہ کے بعد غور خاندان کا عروج ہوا۔ غوری خاندان کا مشہور بادشاہ معز الدین سام تھا۔ جو تاریخ میں شہاب الدین محمد کے نام سے مشہور ہوا۔ وہ اپنے بھائی غیاث الدین (شمس الدین) کے نائب سلطنت کی حیثیت سے تیس سال ۵۶۹ھ/۱۱۷۳ء سے ۵۹۹ھ/۳ تک سلطنت کا کام انجام دیتا رہا اور تین سال ۵۹۹ھ/۱۲۰۳ء سے ۶۰۲ھ/۱۲۰۶ء تک مستقل بادشاہ رہا۔

مورخین بڑی تعریف کرتے ہیں کہ دونوں بھائیوں میں بڑا اتفاق تھا اور سیاسی اور ذاتی تعلقات ہمیشہ اچھے رہے۔ غیاث الدین کو شہاب الدین پر پورا اعتماد تھا۔

برصغیر پاکستان و ہندوستان کی تاریخ میں محمد غوری کو ایک ممتاز حیثیت حاصل ہے کہ اسے اس برصغیر میں اسلامی سلطنت قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا اور اس مقصد میں اسے کامیابی ہوئی۔ ہند و پاکستان میں اسلامی سلطنت کا حقیقی بانی محمد غوری ہی تھا۔ محمد غوری نے برصغیر پاک و ہندوستان پر نو حملے کئے اور رجب ۱۲۰۵ھ میں آخری بار واپس جا رہا تھا تو ایک باطنی فدائی کے ہاتھ سے شہادت پائی۔ اس وقت اسلامی سلطنت پشاور سے بنگال کے طول و عرض میں قائم ہو چکی تھی۔

نریندر ناتھ لا کا بیان ہے کہ محمد غوری جو غوری خاندان کی عظمت و شان کا اصل بانی ہے اپنی فتوحات کے لئے جو محمود کی فتوحات سے بڑھ کر تھیں، بہ نسبت اپنے تعلیمی کارناموں کے زیادہ مشہور ہے۔ درمیانی پچاس سال سے زائد کا عرصہ مستقل جنگ اور ہنگاموں میں گزرا ملک میں بے چینی اور بد امنی پھیلی ہوئی تھی، جہاں تک علمی امور کا تعلق ہے اس دور کو بہت زیادہ تاریک کہا جائے گا لیکن جیسے ہی یہ ہنگامے رفتہ ختم ہوئے محمد غوری نے اپنی مملکت کی تعلیمی ترقی کی طرف توجہ مبذول کی لیکن اس چیز کو نہیں بھولنا چاہیے کہ اس کی تمام کوششیں مذہبی تھیں، اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ فتوحات اور مذہبی تبلیغ کے شوق اور جنگی ہنگاموں اور ان سے پیدا ہونے والی ذہنی بے چینی کے باوجود تعلیمی ترقی و ترویج کے امن پسندانہ کام کو نہیں بھولا۔"

الفنسٹن اپنی کتاب میں رقمطراز ہے :-

"محمد غوری کی فتوحات بمقابلہ محمود کہیں زیادہ تھیں۔ انہوں نے اجمیر کے راجہ کو شکست دی اور یہی ہندوستان کا پہلا حقیقی فاتح ہے۔ اس کی فتوحات نے جو ہندوؤں پر اس نے حاصل کیں اسے سلطان غازی کا لقب دلایا۔"

سلطان شہاب الدین متقی، شجاع، اور عدل پرور تھا، رعایا کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتا اور ان کے معاملات کا منصفانہ فیصلہ کرتا تھا۔ غزنین کا قاضی ہر ہفتہ شنبہ سے سہ شنبہ تک چار دن اس کی موجودگی میں امیر حاجب و امیر داد کے مشترکہ اجلاس میں مقدمات و معاملات کی سماعت کرتا تھا۔ اور اگر کوئی صاحب معاملہ براہ راست توجہ سلطان کو منعطف کرنا چاہتا تو اس کی سماعت خود کرتا تھا۔ قوانین احکام شریعت کے مطابق نافذ کئے جاتے تھے۔ وہ خود صاحب علم تھا۔ فقہا و علمار اس کی مجلس میں پابندی سے شریک رہتے اور فقہ اور دیگر علوم دین کے مسائل زیر بحث رہتے تھے (عہد اسلامی کا ہندوستان)

فرشتہ کے بیان کے مطابق شہاب الدین خداترس اور عادل حکمراں تھا۔ باوجود ایک مقتدر فرماں روا ہونے کے یہ بادشاہ ہمیشہ علمار اور اولیار کی صحبت میں بیٹھتا اور ان کی عزت اور خدمت کرتا اور دین کی بھلائی خیال کرتا تھا۔

غزنین کے دربار میں علمار، فضلا، اور شعرار کثرت سے موجود تھے، جن میں بعض اہل علم محمد غوری کی معیت میں ہندو پاکستان تشریف لائے اور علم و عرفان کی خدمت کے لئے یہیں رہ گئے۔

سید کمال الدین ترمذی متوفی ۶۰۰ھ اپنے عہد کے مشہور اکابر سے تھے۔ ۵۸۸ھ میں شہاب الدین غوری کے ہمراہ ہندوستان آئے اور کیتھل میں مقیم ہو گئے (نزہت الخواطر) اور علم کی خدمت میں مصروف رہے۔

محمد بن عثمان جوز جانی جو جملہ علوم دینیہ میں دستگاہ رکھتے تھے، خصوصاً فقہ و اصول فقہ میں فرد یگانہ تھے، سلطان شہاب الدین غوری نے ۵۸۳ھ میں انہیں لاہور چھاؤنی کا قاضی مقرر کیا۔

شیخ خطیر الدین محمد بن عبد الملک جرجانی اس عہد کے ممتاز اہل علم و ارباب صلاح میں سے تھے، عوفی کے بیان کے مطابق علم و فضل اور زہد و تقویٰ میں ان کے زمانہ میں ان کا کوئی نظیر نہ تھا۔ اسی عہد میں سعد الدین ہندو پاکستان میں آئے تو بدایوں میں قیام کیا اور درس حدیث جاری کیا۔ حضرت نور الدین المبارک (م ۶۳۲ھ/۱۲۳۴ء) سے سلطان شہاب الدین غوری نے ہندو پاکستان کی جنگوں میں برکت حاصل کی: "شیخ الاسلام" کا خطاب دیا اور امیر کے لقب سے ملقب کیا۔ (نزہت الخواطر)

طبقات ناصری کے ایک حوالہ سے خیال ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ اجمیریؒ بھی سلطان معز الدین غوری کی لشکر کشی کے زمانے میں سلطان محمد غوری کے ساتھ ہندوستان آئے تھے (آب کوثر)

بدایونی کی منتخب التواریخ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے :-

"حضرت خواجہ معین الدین چشتی سرہ العزیز . . . . دریں نوبت با سلطان ہمراہ بود و ایں فتح بموجب ماندن نفس مبارک رحمانی آں قطب ربانی او کردہ"

طبقات ناصری کے مؤلف مولانا منہاج السراج نے لکھا ہے کہ میں نے ۶۲۴ھ میں ہندوستان کا عزم کیا اور دریائی سفر کرتا ہوا جب اُچ پہونچا تو اس وقت اُچ کا حاکم ناصر الدین قباچہ تھا۔ علم کا عام چرچا تھا۔ شاہی دار العلوم کے علاوہ اور بھی بڑے بڑے مدرسے

، تھے ۔ منہاج السراج نے اس دارالعلوم کے مہتمم کی حیثیت سے درس وتدریس میں حصہ لیا۔
سلاطین میں سب سے پہلے سلطان شہاب الدین غوری نے اس دارالعلوم کی سرپرستی قبول کی ۔ سلطان محمد غوری نے عہد حکومت میں
دانشمندوں کی ایک کثیر تعداد نے شہرت پائی تھی ۔ ان میں سے ایک صاحب تفسیر کبیر امام فخر الدین رازی تھے ۔
امام صاحب سلطان محمد غوری کی خدمت میں آئے تو امام صاحب کے ساتھ نہایت عزت واحترام سے پیش آیا اور ہرات میں جامع مسجد کے
ان کے لئے مدرسہ بنوایا جس میں مختلف شہروں سے طلباء آکر داخل ہونے لگے ۔
ابن خلکان کا بیان ہے کہ ایک بار امام صاحب نے سلطان شہاب الدین غوری کو بطور قرض کچھ روپے دئے اور پھر اس قرض کو واپس
لے لئے اس کی خدمت میں حاضر ہوتے تو اس نے امام صاحب کی نہایت تعظیم وتکریم کی اور امام صاحب کو بہت سامال دیا (ابن خلکان ج ۱)
(بحوالہ امام رازی از مولانا عبدالسلام)
مولانا سید مناظر احسن گیلانی اپنی کتاب " ہزار سال پہلے " میں تحریر فرماتے ہیں کہ اگر یہ صحیح ہے کہ غوری نے امام رازی سے روپیہ قرض لے کر
ستان پر چڑھائی کا سامان کیا تھا ، تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ایک عامی مسلمان ہی کے طفیل میں ہندوستان فتح ہوا ۔ . . . . غوری نے امام
ب سے یہی روپیہ ہندوستان پر غالباً آخری دفعہ چڑھائی کے وقت لیا تھا جس میں اسے کامیابی نصیب ہوئی ۔
امام فخر الدین رازی کو سلطان محمد غوری سے تقرب حاصل تھا ۔ سلطان عقیدت مندی کے ساتھ آپ سے پیش آتا اور آپ کی مجلس وعظ
حاضر ہوتا ۔ آپ کا بیان سن کر روتے روتے محمد غوری کی ہچکی بندھ جاتی ۔ ایک روز جب امام فخر الدین رازیؒ منبر پر کھڑے ہوئے تو
لطان محمد غوری کو مخاطب کر کے انہوں نے فرمایا :-

" اے سلطان معز الدین ! کچھ عرصہ کے بعد نہ یہ تیری عظمت وشوکت باقی رہے گی اور نہ رازی کا یہ تملق اور نفاق !
لا سلطانیک ولا تلبیس الرازی (اے بادشاہ ! تیری سلطانی اور میری تلبیس دونوں کو دوام نہیں)

اگر دشمن نہ سازد با تو اے دوست
ترا باید کہ با دشمن بسازی ـــــ
وگرنہ چند روزے صبر فرما ـــــ
نہ او ماند نہ ماند فخر رازی

ں پر سلطان زار زار رویا ـــــــ
سلطانؒ محمد غوری کے دربار میں علماء تشریف لاتے تو ان سے فقہی مسائل پر گفتگو کرتا ۔ (نزہت الخواطر / منتخب التواریخ)
۵۸۸ھ / ۱۱۹۲ء میں اجمیر کی فتح کے بعد سلطان محمد غوری نے مساجد اور مدارس تعمیر کرائے جہاں اسے اشاعت اسلام کے ساتھ تعلیم
کی اشاعت کا بھی خیال تھا ۔ اس طرح اجمیر علم وتمدن کا گہوارہ بن گیا ـــــ مصنف تاج المآثر (حسن نظامی نیشاپوری) کے بیان سے
معلوم ہوتا ہے کہ شہاب الدین غوری نے اجمیر میں متعدد مدرسے قائم کئے ان مدارس کی تاریخ بنا صحیح طور پر معین نہیں لیکن سن مذکور (۵۸۷ھ)
کے بعد قریب ہی قریب ہوگا ۔ اس بنا پر یہ مدرسے ہندوستان کے قدیم ترین اسلامی مدارس میں ۔
(ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں) ۔

حسن نظامی نے اپنی تاریخ " تاج المآثر کو شہاب الدین محمد غوری کے نام سے منسوب کیا۔

ہیمر پرگسٹال (HAMMER PURGSTALL) جس کے طفیل اس تاریخ کا علم یورپ کو ہوا۔ کی یہ تحقیق کہ قطب الدین ایبک تک کے بارہ سال بعد تاج المآثر مرتب ہوئی غلط ہے اس نے اس کتاب کو محمد بن سام بن حسین سے منسوب کیا ہے، لیکن مسٹر ہیمر نے اس سام کو فرما لروائے لاہور خیال کیا۔ حالانکہ مصنف کا مقصود اس سے " شہاب الدین محمد غوری " ہے۔ یہ تاریخ ۵۸۶ھ/۱۱۹۱ء سے شروع ہے۔ جب محمد غوری اپنی شکست تھانیسر کا انتقام لینے کے لئے حملہ ہندوستان کی تیاریاں کر رہا تھا۔ (نگار۔ پاکستان نمبر ۱۹۶۸ء)

پنڈت بشیر الدین " تاریخ قرون وسطیٰ " میں لکھتے ہیں کہ محمد غوری نے ہندو شعراء کی بھی سرپرستی کی۔ کہتے ہیں کہ کیدار کوی درباری شاعر تھا فرشتہ کا بیان ہے کہ محمد غوری کے یہاں کوئی بیٹا نہ تھا۔ وہ اپنی تمام تر شفقت پدرانہ اپنے ترک غلاموں پر صرف کرتا تھا۔ ان غلاموں میں ــــ الدین ایبک، تاج الدین یلدوز اور نصیر الدین قباچہ بھی تھے۔ جن کو محمد غوری نے نہ صرف علوم زمانہ کی بلکہ فنون حکمت کی بھی تعلیم دلوائی اور اس قابل بنا دیا کہ وسیع مملکتوں پر کامیابی سے حملہ کر سکیں۔

منہاج سراج لکھتا ہے کہ محمد غوری کی وفات کے وقت ان میں سے تین وسیع مملکتوں پر قابض تھے۔ قطب الدین ہندوستان میں، یلدوز ... میں اور ناصر الدین قباچہ ملتان اور سندھ پر۔ سلطان محمد غوری کی وفات سے اسلامی ہندوستان کو جو نقصان پہونچا وہ محتاج بیان نہیں اس ملک میں سلطان کا کام ایک حد تک مکمل ہو چکا تھا۔ جب سلطان شہید ہوا، اس وقت قریب قریب سارے شمالی ہندوستان پر اسلامی پرچم تھا اور قطب الدین، محمد بن بختیار خلجی، التمش، ناصر الدین قباچہ اور دوسرے افسروں کا سلطان ایسا منتخب گروہ چھوڑ گیا تھا جو اس کا نام ... رکھ سکتے تھے۔ (آب کوثر)

مسلمانوں کی فتوحات کا سلسلہ جیسے جیسے بڑھتا گیا مدرسوں اور کتب خانوں کا نظام وسیع اور جامع ہوتا گیا۔ محمد غوری کو ہندوستان زیادہ عرصہ رہنے کا موقعہ نہ ملا اور دہلی میں قطب الدین ایبک کو اپنا قائم مقام کر کے غزنیں چلا گیا، اس کے باوجود اس نے اجمیر میں متعدد ... قائم کئے اور کتب خانوں کے نشو ونما کے لئے راہیں کھولدیں۔ سلطان تعلیم کے معاملہ میں نہایت وسیع النظر تھا اس نے اپنے غلاموں کو تعلیم و تربیت دی تھی کہ وہ آفتاب بن چکے تھے۔ (اسلامی کتب خانے)

مرتبہ: حکیم حاجی آل حسن مسرور (علیگ)

اخلاق کے موتی حکمت کے پھول

اقوال سید عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ

- ہماری غیبت کرنے والے ہم کو خراج دیتے ہیں اور اپنے اعمال صالحہ ہمارے اعمال نامہ میں منتقل کر دیتے ہیں۔
- جب کوئی تم سے کوئی بات تمہاری بے آبروئی کی یا رنج دینے والی کسی شخص کی طرف سے نقل کرے تو اس کو جھڑک دو کہ تو اس سے بھی بدتر ہے کہ اس نے تو ہماری پس پشت یہ بات کہی ہے اور تو ہمارے منہ پر کہتا ہے۔ اس نے ہم کو سنائی نہیں تھی لیکن تو نے سنا دی۔
- تیرے سب سے بڑے دشمن تیرے بُرے ہمنشیں ہیں۔
- تمام خوبیوں کا مجموعہ علم سیکھ کر عمل کرنا پھر اوروں کو سکھانا ہے۔
- وعظ خالصاً للہ کر ورنہ تیرا گونگا پن ہی بہتر ہے۔
- وہ رزق کی فراخی جس پر شکر نہ ہو اور وہ معاش کی تنگی جس پر صبر نہ ہو فتنہ بن جاتی ہے۔
- اوروں پر ہر دم نیک گمان رکھ اور اپنے نفس پر بدظن رہ۔
- تیرا کلام بتا دے گا کہ تیرے دل میں کیا ہے؟
- ظالم مظلوم کی دنیا بگاڑتا ہے اور اپنی آخرت۔
- شروع کرنا تیرا کام ہے اور تکمیل کرنا خدا کا۔
- عاقل پہلے دل سے پوچھتا ہے پھر زبان سے بولتا ہے۔
- تنہا محفوظ ہے اور ہر گناہ کی تکمیل دو سے ہوتی ہے۔
- بجز اپنی اور اپنے بال بچوں کی ضروریات کے گھر سے باہر مت نکل۔
- کوشش کر کہ گفتگو کی ابتدا تیری طرف سے نہ ہوا کرے اور تیرا کلام جواب بنا کرے۔
- جسے کوئی ایذا نہ پہنچے اس میں کوئی خوبی نہیں ہے۔
- مومن کے لئے دنیا ریاضت کا گھر اور آخرت راحت کا گھر ہے۔
- اللہ والے اطاعت کرتے ہیں اور اس پر بھی ان کے دل خوفزدہ رہتے ہیں۔ تم گناہ کرتے ہو اور پھر بھی بے خوف ہو۔
- بے ادب خالق و مخلوق دونوں کا معتوب و مغضوب ہے۔
- مستحق سائل خدا کا ہدیہ ہے جو بندے کی طرف بھیجا جاتا ہے۔
- مساکین کو ناخوش رکھ کر خدا کی خوشنودی ناممکن ہے جو مصیبت تم پر آئے اس کا علاج مساکین کی خوشنودی حاصل کرنا ہے۔
- تو نفس کی تمنا پوری کرنے میں مصروف ہے اور وہ تجھ کو برباد کرنے میں
- خالق کا مقرب وہی ہے جو مخلوق پر شفقت کرتا ہے۔
- تیری جوانی تجھ کو دھوکہ نہ دے۔ یہ عنقریب تجھ سے لے لی جائیگی۔
- ہر متقی شخص محمدؐ کی آل ہے۔

● جس کا انجام موت ہے اُس کے لئے کون سی خوشی ہے۔

● موت کو یاد رکھنا نفس کی تمام بیماریوں کی دوا ہے۔

● اللہ اپنے بندوں سے قرض طلب کرتا ہے اور اس کے قاصد سائل لوگ ہیں۔

● اہل اللہ کے نزدیک مخلوق بمنزلہ اولاد کے ہے۔

● نامحرم عورتوں اور لڑکوں کے پاس بیٹھنا اور پھر یوں کہنا کہ مجھے ان کی طرف مطلق توجہ نہیں ہوتی جھوٹ ہے۔

● جب کہ فرشتے تصویر والے گھر میں داخل نہیں ہوتے تو خدا تعالیٰ تیرے قلب کے اندر کیوں کر داخل ہوگا جبکہ اس میں سینکڑوں ہی مورتیں اور بت جمع کر رکھے ہیں۔

● خدا کے سوا ہر چیز جو دل میں جاگزیں ہے تصویر اور بت ہے۔

● صالح کی زیارت ہی اس کی حالت کی اطلاع دے دیتی ہے۔

● اللہ کی اطاعت قلب سے ہوتی ہے۔ نہ کہ قالب سے۔

● مکانوں کے بنانے میں اپنی عمر ختم کر رہا ہے۔ بسیں گے دوسرے حساب دے گا تو۔

● اے ابنِ آدمؑ! خدا سے اتنا تو شرما جس قدر تو اپنے دیندار پڑوسی سے شرماتا ہے۔

● جب کوئی بندہ گناہ کرنے کے وقت مخلوق سے چھپ جاتا ہے اور خلوت میں خالق کی نافرمانی کرتا ہے تو حق تعالیٰ فرماتا ہے اے ابنِ آدم! تو نے اپنی طرف دیکھنے والوں میں سب سے زیادہ مجھ کو ہی کمتر سمجھا ہے کہ سب سے پردہ کرنا ضروری سمجھا ہے اور مجھ سے مخلوق کے برابر بھی شرم نہیں کرتا۔

● مخلوق کی طرف منہ کرنا بعینہٖ حق تعالیٰ کی طرف پشت کرنا ہے۔

● رضائے خالق کے خواہشمند مخلوق کی اذیتوں پر صبر اختیار کر۔

● بلا کے سبب حق تعالیٰ کی طرف سے روگرداں مت ہو کہ وہ اس میں تیری آزمائش فرماتا ہے۔

● میانہ روی نصف روزی ہے اور حُسنِ اخلاق نصف دین ہے۔

● لوگوں کے سامنے معزز بنا رہ ورنہ افلاس کے ظاہر کرنے سے لوگوں کی نظروں سے گر جائے گا۔

● مخلوق کی محبت اُن کی خیر خواہی کرنا ہے۔

● بہترین عمل دوسروں کو دینا ہے نہ کہ دوسروں سے لینا۔

● جو خلق کے ساتھ خُلق میں فراخ تر ہو وہ خالق سے نزدیک تر ہے۔

● اگر تو نے اللہ بھی با آواز بلند کہا ہے تو اس کی بھی تجھ سے باز پُرس ہوگی کہ خالصاً کہا ہے یا ریا سے۔

● جب ذکر قلب میں جگہ پکڑ جاتا ہے تو بندے کا اللہ کو یاد رکھنا دائمی بن جاتا ہے اگرچہ زبان بند ہے۔

● مصیبتوں کو چھپا قربِ حق نصیب ہوگا۔

● مومن اپنے اہل و عیال کو اللہ پر چھوڑتا ہے اور منافق اپنے درہم و دینار پر۔

● مخلوق تین طرح کی ہوتی ہے ۱۔ فرشتہ ۲۔ شیطان ۳۔ انسان فرشتہ تو سرتا پا خیر ہے اور شیطان سرتا پا شر۔ لیکن انسان مخلوط کہ خیر بھی رکھتا ہے اور شر بھی۔ جس پر خیر غالب ہو وہ فرشتوں سے ملحق ہو جاتا ہے اور جس پر شر غالب ہو وہ شیطان ہے۔

● ہنسنے والوں کے ساتھ ہنسا مت کر بلکہ رونے والوں کے ساتھ تو رویا کر۔

● اگر تو خالق کے ساتھ ہے تو تو اس کا بندہ ہے اور اگر مخلوق کے ساتھ ہے تو مخلوق کا بندہ۔

● حیات کے دروازے کو جب تک کھلا ہے غنیمت جانو وہ جلدی ہی تم سے بند کر دیا جائے گا اور نیکی کے کاموں کو جب تک تجھے وقت ہے غنیمت جانو۔

● خالق کے ساتھ ادب کا دعویٰ غلط ہے جب تک تو مخلوق کے ادب کا خیال نہ رکھے۔

● جو شخص اپنے نفس کا اچھی طرح سے معلم نہیں ہو سکتا وہ دوسرے کا کس طرح ہوگا۔

• مومن جس قدر بوڑھا ہوتا ہے اس کا ایمان طاقت ور ہوتا ہے۔

• کیا تجھے شرم نہیں آتی کہ تو اُسے حکم کرتا ہے کہ وہ تیری قسمت کو بدل ڈالے کیا تو اس سے زیادہ حاکم اور زیادہ عادل اور اس سے زیادہ رحیم ہے؟ تو اور ساری خلقت اس کے بندے ہیں وہ تیرا بھی اور ان کا بھی منتظم ہے اگر تو دنیا اور آخرت میں اس کی محبت کا خواہش مند ہے تو سکون، خاموشی اور گونگا ہونا لازم پکڑ۔

• ایک شخص رسول کریم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا میں آپ سے محبت رکھتا ہوں، آپ نے فرمایا کہ بلا کے لئے چادر بنا۔ اللہ اور رسولؐ کی محبت فقر وفاقہ اور بلا سے ملی جلی ہوتی ہے۔

• آپ نے فرمایا تم مشغول ہو ایسی چیز کے جمع کرنے میں جس کو تم نہ کھا سکو گے

• آرزو رکھتے ہو ایسی چیزوں کی جن کو تم نہ پا سکو گے۔ اور تعمیر کرتے ہو ایسے مکان جن میں تم بس نہ سکو گے یہ ساری چیزیں تم کو تمہارے رب کے مقام سے محجوب کرتی ہیں۔

• خوش رہو اللہ کے تغیر و تبدل سے جو کچھ وہ تمہارے حق میں پسند کرے

• صبر اختیار کر کیونکہ دنیا تمام تر ہی آفات ومصائب کا مجموعہ ہے۔

• تکبر اور نخوت اور اترانے کو چھوڑ۔ اپنی خوشی کو کم کر اور حزن کو بڑھا کہ تو دار الحزن یعنی دنیا میں قید ہے۔ ہمارے نبی کریم ہمیشہ غمگین رہتے خوش کم ہوتے اور ہنستے کبھی نہیں تھے۔

• کیا عجب ہے کہ کل کا دن ایسی حالت میں آئے کہ تو سطح زمین سے گم اور قبر کے اندر موجود ہو یا اگلی ساعت میں ایسا ہو جائے۔

• جو حکم کی تعمیل نہ کرے لازمی ہے کہ وہ خوشنودی آقا سے محروم رہے

• اگر محبت دنیا کے سوا ہمارا کوئی بھی گناہ نہ ہو تب بھی ہم مستحق دوزخ ہیں۔

• جناب حضرت عبدالقادر جیلانی فرماتے ہیں کہ اہل وعیال کے خرچ میں قصور کرکے اور قرض ادا کئے بغیر جو بچ کو نکلا وہ ظالم، گنہگار اور مغضوب خدا ہے۔

اقوال حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ

• دنیا کاشت کاری اور تخم ریزی کا مقام ہے نہ کہ کھانے اور سو رہنے کا

• اہل خانہ تمہاری رعیت ہیں اور تم اُس کی نسبت سوال کئے جاؤ گے

• اعمال صالحہ ایمان کو زیادہ نہیں کرتے بلکہ روشن کر دیتے ہیں۔ اور

• اعمال مذمومہ ایمان کو کم نہیں کرتے بلکہ مکدر کر دیتے ہیں۔

• جمعیت خاطر سے حق تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہ اور متعلقین کا غم حق تعالیٰ کے حوالے کر۔

• اس دشمن کا دفعیہ سخت مشکل ہے جو اطاعت کی راہ سے آئے۔

• دنیا کی مصیبتیں بظاہر زحمتیں ہیں مگر درحقیقت ترقیوں کا موجب ہیں۔

• حادثات دنیا کی تلخی کڑوی دوا کے مثل ہے۔

• گناہ کے بعد ندامت بھی توبہ کی شاخ ہے۔

• خدا کے دشمنوں سے الفت کرنا خدا کے ساتھ دشمنی ہے۔

• ناقص پیشوا آخرت کی کھیتی کا ناقص تخم ہے۔

• عجب یہ ہے کہ اپنے اعمال صالحہ اپنی نظر میں پسندیدہ دکھائی دیں۔

• دل آنکھ کی تابع ہے۔ آنکھ کے بگڑنے کے بعد دل کی حفاظت مشکل ہے اور دل کے بگڑ جانے کے بعد شرمگاہ کی حفاظت مشکل تر ہے۔

• عورت کا نامحرم مرد سے ملائم گفتگو کرنا بھی داخل بدکاری ہے اور اس کا باریک کپڑے پہننا ننگی ہونے کے حکم میں ہے۔

• علمائے باعمل پارس پتھر کی مثل ہیں جو اور دل کو تو سونا بنا تا ہے مگر خود پتھر کا پتھر رہتا ہے۔

• کفر کے بعد سب سے بڑا گناہ دلآزاری ہے خواہ مومن کا ہو یا کافر کا۔

• دولت مند پیغمبر کو جھٹلاتے رہے اور مسکین غریب ہی ان کی تصدیق کرتے رہے ہیں۔

• دولت مند کو سے زیادہ کوئی چیز ایمان میں خلل انداز نہیں ہے۔

• اہل وعیال کے ساتھ حد سے زیادہ محبت مت کر کہ ضروری کام میں فتور آئے۔

● خلق کے ساتھ ضرورت سے زیادہ اختلاط مت رکھ کیونکہ زیادہ اختلاط زیادہ مضرتوں کا سبب ہوتا ہے۔
● جس شخص میں محبت غالب ہوگی اس میں درد و حزن زیادہ تر ہوگا۔
● ہمارا طریق صحبت ہے کیونکہ خلوت میں شہرت ہے اور شہرت میں آفت
● گوشہ نشینی اختیار کرنے میں چاہئے کہ مسلمانوں کے حقوق ضائع نہ ہوں اور خود خدمتِ خلق سے محروم نہ رہے۔
● کمزور پر حملہ کرنا بزدلی ہے اور ہم پلہ پر بدخلقی اور زبردست پر شوخ چشمی ہے۔
● جس کے پاس بیوی، گھر، نوکر اور سواری ہو وہ بادشاہ ہے۔
● اہل اللہ کو تجارت اور خرید و فروخت ذکر اللہ سے غافل نہیں کرتی۔
● خدا کو جاننا یہ ہے کہ شرک نہ کرے اور رسولؐ کو رسولؐ سمجھنا یہ ہے کہ اس کے سوا کسی کا پیروی نہ کرے۔
● نفس پر شریعت کی پابندی سے زیادہ کوئی چیز دشوار نہیں ہے
● سماع و رقص کو پسند کرنا درکنار ہم ذکر جہر کی طرف بھی توجہ نہیں کرتے
● موذن منادی کرنے والا رحمٰن کا ہے گویا منادی کرنے والا شیطان کا۔
● سرود و نغمہ ایک زہر ہے جو شہد میں ملا ہوا ہے اور گانا بجانا زنا کا منتر ہے۔
● ذکر جہر سے اس قدر پرہیز چاہئے کہ کھانا شروع کرتے وقت بسم اللہ بھی دل میں پڑھے۔
● خدا کے کرم پر مغرور ہونا اور عفو کی امید پر گناہ کرنا شیطان کا کھلا فریب ہے۔
● دولت مندوں کی صحبت زہر قاتل اور ان کے چرب لقمے دل کو سیاہ کرنے والے ہیں۔
● شیر و دنیا دی موت کا موجب ہے اور محبت اُمرا آخرت کی موت کا۔
● آخرت کا کام آج کر، دنیا کا کام کل پر چھوڑ دے۔
● ہر عمل جو موافق شریعت ہے ذکر میں داخل ہے اگرچہ خرید و فروخت ہی ہو
● اس اجتماع سے الگ رہ جو تفرقہ کا باعث ہو۔

● جو ضرورت گناہ پر مجبور کرے شرعاً مرد وہ ہے عورت اور بے ریش لڑکا ایک حکم رکھتے ہیں۔
● بلا استطاعت سفر حج تضیع اوقات ہے۔
● دوسری نظر تیرے لئے وبال ہے۔ نظر اول وہ ہے جو بلا قصد ہو اور نظر دوسری وہ ہے جو قصداً ڈالی جائے۔
● ناراض ہونے کے خیال سے حق بات دوست کو نہ بتلانا حقِ دوستی نہیں
● احسان سب جگہ بہتر ہے لیکن ہمسایہ کے ساتھ بہترین ہے۔
● دوپہر کا سونا جو بہ نیت سنت ہو آں کروڑ شب بیداریوں سے بہتر ہے جو اتباع سنت کی نیت سے نہ ہوں۔
● زندگی کی فرصت بہت کم ہے اور ہمیشہ کا عذاب یا راحت اسی پر مرتب ہے۔
● معرفتِ الٰہی اس پر حرام ہے جس کے باطن میں دنیا کی محبت رائی کے ذرے جتنی بھی ہو۔
● نرم خو اور متواضع کے لئے جہنم حرام ہے۔
● جس کو نرمی عطا ہوئی اس کو دنیا و آخرت عطا ہوئی۔
● دنیا ایک نجاست ہے جو سونے کے اندر چھپائی گئی ہے۔
● نفس کی کمال مخالفت اتباع شریعت میں ہے۔
● شر نفس شیطان کے شر سے زیادہ ہے۔
● اظہار عجز عبادت ہے۔
● زکوٰۃ کا ایک پیسہ نفلی طور پر سونے کا پہاڑ صدقہ کرنے سے بہتر ہے۔
● ضروری حاجتیں دنیا طلبی میں داخل نہیں ہیں۔
● خلفائے راشدین ترتیب خلافت کے مطابق ہیں
● اہل کرم وہ ہے جو غیر کی حاجت کو اپنی حاجت پر مقدم رکھے۔
● نیک بات دوستوں کو پہونچا دے اور مخالفوں سے بحث مت کر۔
● مومن دریافت کرنے والا ہے اور منافق فوراً گرفت کرنے والا۔
● بھائی کا حق اس جگہ معاف کرالے ورنہ وہاں نیکیاں دینی پڑیں گی
● اعلیٰ نصیحت یہ ہے کہ پیروی نبیؐ اختیار کرلو۔

● جس گناہ کے بعد ندامت نہ ہو اندیشہ ہے کہ اسلام سے باہر کردے
● کوئی جاہل ولی نہیں ہوا اور نہ ہوگا۔
● علم الہام کیا جاتا ہے نیکوں کو اور بدبخت اس سے محروم رکھے جاتے ہیں

اقوال حضرت امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ

● اپنے آپ کو بڑا جاننا برا ہے۔ حقیقت میں یہ خدائے پاک کے ساتھ خصومت اور دشمنی ہے کیونکہ دراصل بڑائی اسی کو سزاوار ہے۔
● فسق و فجور سے بچنا تا وقتیکہ نفس کی حفاظت نہ کی جائے دشوار ہے۔
● تمسخر اکثر قطع دوستی، دل شکنی اور دشمنی کا باعث ہوتا ہے۔ اس سے دل میں حسد پیدا ہوتا ہے۔
● بعض لوگ توکل کے معنی یہ لیتے ہیں کہ حصولِ معاش کی کوشش اور تدبیر نہ کریں۔ یہ خیال جاہلوں کا ہے کیونکہ یہ شریعت میں سراسر حرام ہے۔
● برے کاموں سے بچنے کے لئے صفائی دل ضروری ہے اور صفائی دل کے لئے باطنی تقویٰ ضروری ہے۔ اگر دل پاک ہے تو تمام جسم پاک ہے اگر دل صاف نہیں تو تمام جسم میں فساد ہوگا۔
● تین چیزیں خباثت قلب کو ظاہر کرتی ہیں (۱) حسد (۲) ریا (۳) عجب۔ عاقلوں کو ان سے بچنا چاہئے۔
● اپنے آپ کو عظمت اور دوسروں کو حقارت کی نظر سے دیکھنے کا نام عجب ہے۔
● نیک نصیحت کے ماننے کی طرف مائل نہ ہونا اور اپنی باتوں کی تردید سے رنجیدہ ہونا کبر ہے۔ عجب و کبر اور فخر نہایت مہلک بیماریاں ہیں۔
● حاسد مثل اس شخص کے ہے جو اپنے دشمن کو مارنے کے لئے پتھر پھینکے لیکن وہ پتھر دشمن کے لگنے کے بجائے خود اسی کو مجروح کردے اور دشمن یعنی مخالف اس کو دیکھ دیکھ کر ہنسیں۔
● جو دوست تمہارے آڑے وقت میں کام نہ آئے وہ تمہارا سب سے بڑا دشمن ہے۔

● اقرار باللسان پوست ہے ایمان کا اور تصدیق بالقلب مغز ہے ایمان کا۔
● علم دین وہ ہے جو خدا تعالیٰ کا خوف زیادہ کرے۔ ذاتی برائیوں سے واقف کرے خدا کی عبادت کا شوق دل میں پیدا کرے اور دنیا کی طرف سے ہٹائے اور دین کی طرف رکھے اور برے افعال سے مجتنب رہے۔
● لوگوں کی نیکیوں کو ظاہر کرنا چاہئے اور برائیوں سے چشم پوشی لازم ہے۔
● غیبت اسے کہتے ہیں کہ کسی شخص کا ذکر اس کی پیٹھ پیچھے اس طرح پر کیا جائے کہ اگر وہ سنے تو اسے رنج ہو۔
● بلند آواز سے رونا بے صبری ہے اور قہقہہ مار کر ہنسنا ذلالت کی دلیل ہے۔
● اپنے آپ کو سب سے بہتر سمجھ لینا جہالت ہے بلکہ ہر شخص کو اپنے سے بہتر سمجھنا چاہئے۔
● عالم کو بردبار، حلیم الطبع اور صاحب وقار ہونا چاہئے تمسخر اور مزاح سے بچنا چاہئے۔ جو بات معلوم نہ ہو اس کے اظہار میں شرم نہ چاہئے۔ اور باعمل ہونا چاہئے۔ کیونکہ بلا عمل کے دوسروں پر خاطر خواہ اثر نہیں پڑ سکتا۔
● صبح سویرے اٹھنا اور سب سے پہلا لفظ جو زبان سے نکلے وہ خدائے پاک کا ذکر ہونا چاہئے۔
● زبان سے اگر گفتار نرم ہے تو وہ زبان ہے ورنہ زیان۔
● خاموشی عبادت ہے بغیر محنت کے۔ ہیبت ہے بغیر سلطنت کے۔ قلعہ ہے بغیر دیوار کے فتحیابی ہے بغیر ہتھیار کے۔ آرام ہے کراماً کاتبین کا۔ قلعہ ہے مومنین کا شیوہ ہے عاجزوں کا۔ دبدبہ ہے حاکموں کا مخزن ہے حکمتوں کا اور جواب ہے جاہلوں کا۔
● طالب دنیا سمندر کا پانی پینے والے کی مثل ہے کہ جس قدر پیتا ہے پیاس زیادہ لگتی ہے۔
● گری ہوئی چیز کا بغیر اطلاع قبضے میں کر لینا لوٹنے کی مانند ہے۔
● نقد کی نسبت ادھار زیادہ قیمت پر فروخت کرنا درست ہے۔

خواہش پر غالب آنا فرشتوں کی صفت ہے اور خواہش سے مغلوب ہونا چوپایوں کی ۔

جو شخص عذابِ قبر سے آزاد رہنا چاہتا ہے وہ دنیا سے صرف اتنا تعلق رکھے جتنا بیت الخلا سے رفعِ حاجت کے وقت رکھتا ہے

بالغ نجاستِ باطنی کی دلیل ہے ۔

اکثر تاخیرِ نکاح بھی سبب زنا بن جاتا ہے اور وبالِ والدین ہوتا ہے ۔

نماز میں حضورِ قلب کی تدبیر یہ ہے کہ الفاظ کے معانی پر خیال رکھے ۔

زکوٰۃ نعمتِ مال کا شکر ہے اور نماز ، روزہ ، اور حج ، بدن کی نعمتوں کا ۔

فقیر کو صدقہ دے کر احسان نہ جتانا بلکہ اس کے قبول کرنے کا اس کا احسان مند ہو ۔

جو کام نبی کے حکم کے خلاف ہو اگرچہ بشکل عبادت ہو گناہ ہے ۔

جس احتیاط اور پرہیز سے مسلمان کو رنج پہونچے اس کو چھوڑ دے

اصلاح بچوں کی مکتب میں ہے اور عورت کی گھر میں ۔

مسجد میں گھر والے کو سونا یا لیٹنا منع ہے اور وہاں سے بیٹھ کر سیر تماشہ دیکھنا مسجد کی بے حرمتی ہے ۔

● تو اس دنیا میں دار آخرت کی طرف چلنے والا ایک مسافر ہے تیرے سفر کی ابتدا مہد اور انتہا لحد ہے ۔ تیری عمر کا ہر برس منزل ہے ہر مہینہ فرسنگ ، ہر دن میل اور ہر سانس قدم ہے ۔

● حوادث و آفاتِ زمانہ کو برا کہنا خدا کو گالی دینا ہے ۔

● عبادت میں تشدد سے بچو اور میانہ روی اختیار کرو کیونکہ اس میں منفعت کی نسبت مضرت زیادہ ہے اور تمام اخلاقِ ذمیمہ یعنی ریا ، کینہ ، حسد تکبر اور تفاخر کا منبع ہے ۔

● وعظ گوئی سے پرہیز کرو جب تک تم خود پرے عاقل نہ بن جاؤ ۔

● ان امیروں سے میل جول نہ رکھو جو دین سے نفور اور شریعت سے دور ہیں ۔ بلکہ ان کو دیکھو بھی نہیں ۔

● مسئلہ تقدیر مشکل مسئلہ ہے اس میں بحث سے ممانعت آئی ہے

● مخلوق سے ایسا معاملہ کرو جو اُن سے اپنے حق میں پسند کرتے ہو ۔

● خالق سے ایسا معاملہ کرو جیسا کہ تم اپنے غلام سے اپنے لیے کرانا چاہتے ہو

● علم کا مطالعہ کیا کرو اور وہ علم اپنے دل کے حالات جاننے کا ہے

● اپنے عیال کے لئے ایک سال کا سامان کیا کرو کہ سنت رسولؐ ہے ۔

● بھوک سے کم کھاؤ تاکہ قوت عبادت اور صحت میسر آئے زیادہ کھاؤ گے تو خواہش نفس کے لئے ہوگا کیونکہ عبادت سے غافل ہوگا اور یہی نفس کی خواہش ہے ۔

● مہمان کے ساتھ تکلف نہ کرو ورنہ مہمان رکھنے کو دشمن رکھو گے ۔

● تکلف کی زیادتی محبت کی کمی کا سبب بن جاتی ہے ۔

● کھانے میں عیب نہ نکالو پسند نہ ہو تو مت کھاؤ ۔

● وہ شخص بڑا گنہگار ہے جو ماحضر کو روبرو لانا حقیر سمجھے یا جس کے روبرو لائیں وہ حقیر جانے ۔

● مجلس میں تکیہ لگا کر بیٹھنا مکروہ ہے اور شانِ تکبر مگر بہ عذر ۔

● بھوک سے پہلے کھانا مکروہ بھی ہے اور مذموم بھی ۔

● غریب مہمان آ جائے تو قرض لے کر بھی تکلف کر ۔

● جو مہمان خود آ جائے اس کے لئے تکلف نہ کر اور جس کو تو بلائے اس کے لئے تکلف میں کچھ اٹھا نہ رکھو ۔

● فی نفسہٖ شعر گوئی یا شعر خوانی منع نہیں لیکن اس کا استعمال بے جا اور کثرت شغل شیطانی فعل ہے کہ جس سے احکام و فرائض فوت ہوں

● اگر کوئی شخص قرض لے اور دینے کی نیت نہ ہو تو وہ چور ہے ۔

● دعوت قبول کرنے میں امیر و غریب کا فرق نہ کر اور روزہ ہونے کی وجہ سے دعوت رد نہ کر ۔

● مہمان کے روبرو تھوڑا کھانا بے مروتی ہے اور حد سے زیادہ رکھنا تکبر ہے ۔

● جس مجلس میں جا کر خلافِ شرع امور معلوم ہوں اور منع نہ کر سکتا ہو تو وہاں سے چلا آنا واجب ہے ۔

س کے اندر بیٹھ کر قریبی لوگوں کی مزاج پرسی کرو۔ میزبان کو انتظار نہ ڈالو۔ وقت مقررہ پر جلدی پہونچا کرو۔

س طعام میں اگر بہت لوگ حاضر ہیں اور ایک دو کا انتظار ہے تو رین کی رعایت اولیٰ ہے لیکن اگر وہ شخص جس کا انتظار کیا جائے یا مسکین ہے تو انتظار اولیٰ ہے۔

میافت کے کھانے میں اسراف نہیں ہے لا اسراف فی الخیر۔

مان کے آگے کھانا رکھنے سے پہلے اہل و عیال کا حصہ نکال لے۔

لاح دین کا حصار ہے اور شہوت شیطان کا ہتھیار۔ نکاح اس کے سے بچانے والا ہے۔

سب سے بڑی دولت زبانِ ذاکر دل شاکر اور دین فرمانبردار ہے۔

یک عورت اور دنیا سے نہیں بلکہ اسباب آخرت سے ہے۔

ورت کی بداخلاقی پر صبر کرنا اس کی ضروریات مہیا کرنا اور اداء شریع س کو قائم رکھنا بہترین عبادت ہے۔

جس بیوی سے تیرے والدین ناراض ہوں اس کو طلاق دے دینا خدمت لدین میں داخل ہے۔

مال باپ کا بیٹے کے مال میں جبراً تصرف کرنا ظلم نہیں۔

اذان و قرآن کا الحان سے زیادہ بڑھانا اور راگ کے طور پر پڑھنا ح ہے۔

، جو کسب حلال نہ کر سکے اس کا نکاح نہ کرنا بہتر ہے کیونکہ کسب حرام ایسا گناہ ہے کہ کوئی نیکی اس کا تدارک نہیں کر سکتی۔

، عورتوں میں ایک قسم کا ضعف ہے اور تحمل اس کا علاج ہے۔

، اہل و عیال کے لئے کسب حلال کرنا ابدالوں کا کام ہے۔ ان کو ادب سکھانا جہاد سے افضل ہے۔

● عورت کے ساتھ نیک ہو رہنا چاہئے اس کو رنج نہ دے بلکہ اس کا رنج سہے

● عورت کی بدخلقی پر صبر کرنے والا حضرت ایوب علیہ السلام کے صبر کے برابر ثواب پائے گا۔

● عورت اگر محافظ عصمت ہے تو اس کی معمولی فروگذاشتوں سے درگذر کرو

● کبھی غصہ کے وقت طلاق کا لفظ زبان پر مت لاؤ کہ اللہ کو یہ امر سخت ناپسند اور عورت کی دل شکنی کا موجب ہے۔

● نکاح نہ کرنے والا گو شرمگاہ کو بچالے مگر نظر اور دل کا بچانا اس کو محال ہے۔

● تنگدست قرضدار کو مہلت دینا رحمت الٰہی کو جوش میں لاتا ہے۔

● قرض ادا کرنے کا مقدور ہوتے ہوئے ایک ساعت دیر کرنا بھی ظلم میں داخل ہے مگر با جازت قرضخواہ۔

● قرض بغیر تقاضا کے ادا کر دینا قرضدار کی طرف سے احسان ہے۔

● قرض ادا کرنے کے لئے زر نقد کا پاس ہونا ہی ضروری نہیں اگر مال رکھتا ہو تو اس کو فروخت کر کے ادا کرنا واجب ہے۔

● جو شخص مال کافی رکھتا ہو اس کے لئے کسب کرنے سے عبادت بہتر ہے

● جو کسب مقدار ضرورت سے زیادہ طلبی کے لئے ہو وہ کسب سب گناہوں کا سردار ہے۔

● جس کا لباس ہلکا اور باریک ہوگا اس کا دین بھی ضعیف ہوگا۔

● ظالم کے مرنے سے ملول ہونا ظلم میں شامل ہوتا ہے۔

● مال حرام سے صدقہ دینے والا ناپاک کپڑا پیشاب سے دھونے والے کی مثل ہے۔

● جو شخص حرام کھاتا ہے اس کے تمام اعضاء گناہ میں پڑ جاتے ہیں۔

● اگر مستجاب الدعوات ہونا چاہو تو لقمۂ حلال کے سوا پیٹ میں کچھ نہ ڈالو۔

● اگر تو اس قدر نماز پڑھے کہ پشت خم ہو جائے اور اس قدر روزے رکھے کہ بدن ہلال بن جائے ہرگز فائدہ نہ پائے گا تاوقتیکہ مال حرام سے پرہیز نہ کرے گا۔

● محتاجوں سے مہنگا مال خریدنا احسان میں ہے اور صدقہ سے بہتر ہے۔

● برکت کے معنی یہ ہیں کہ تھوڑے مال میں بہرہ مندی زیادہ ہو اور اس سے بہتوں کو فائدہ پہونچے۔ اعمال صالح کی توفیق ہو۔

اقوال حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ

● جب حق تعالیٰ بندے کو اپنا دوست بناتا ہے تو اس کو بہت سی

بیف دیتا ہے اور جب اپنا دشمن بناتا ہے تو دنیا اُس پر فراخ
بنا ہے ۔
شد تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ مقبول وہ شخص ہے جو خلق کا بار
ماتے یعنی خدمت کرے ۔
ی نے دریافت کیا کہ کس طرح حق کو پہنچنا چاہئے ۔ فرمایا کہ اندھا،
ا اور لنگڑا بن کر ۔
سی نے دریافت کیا کہ آپ بھوک کی اس قدر تعریف کیوں کرتے ہیں
یا کہ اگر فرعون بھوکا ہوتا تو انا ربکم الاعلیٰ (یعنی میں خدا تعالیٰ
ل) ہرگز نہ کہتا ۔
خوش خلقی اور خاموشی ہلکی ہیں بیٹھ پر اور بھاری ہیں میزان پر ۔
جب اللہ تعالیٰ کا نام دل میں بیٹھ جائے اور جم جائے تو پھر کسی اور
، یاد نہیں رہتی ۔
، جو نیکی فی الفور کسی نور یا علم کا پھل نہ دے اس کو نیکی نہ گن اور جس
ناہ کے بعد فوراً اللہ کا خوف اور توبہ میسر آجائے اُس کو گناہ نہ گن ۔
، نزع کے وقت آپ نے یہ کلمات ارشاد کئے "میں نے تجھے یاد نہیں
یا مگر غفلت سے اور تیری خدمت نہیں کی مگر سستی سے ۔"
، اپنے آپ کو اتنا ہی ظاہر کر جتنا کہ تو ہے یا ویسا ہو جا جیسا اپنے آپ
و تو ظاہر کرے ۔
، اگر کل میدانِ قیامت میں یہ کہیں کہ "تو نے ایسا کیوں نہ کیا" تو میں
اس سے پسند کرتا ہوں کہ یہ کہیں کہ "تو نے ایسا کیوں کیا"
، جس کو خدا مقبول کرتا ہے اُس پر ظالم کو مسلط کرتا ہے جو اس کو
رنج و بلا میں مبتلا رکھتا ہے ۔
● توکل یہ ہے کہ تو زندگانی کو ایک دن کے لئے جانے اور کل کی فکر نہ کرے
● ایک شخص نے آپ سے کہا کہ میری عیال زیادہ ہے اور معاش کم ۔ فرمایا
گھر میں جا جس کو تو دیکھے کہ اس کا رزق مجھ پر ہے اس کو نکال دے اور
جس کو تو دیکھے کہ اُس کا رزق اللہ پر ہے اس کو گھر میں رہنے دے ۔
● جو گن کر گھر کا کام کرتا ہے اُس کا اجر بھی گن کر ملتا ہے (مراد بیع ہے)

● نیک بخت وہ ہے کہ نیکی کرے اور ڈرے اور بد بخت وہ ہے
کہ بدی کرے اور مقبولیت کی اُمید رکھے ۔
● بہشت کو بغیر عمل کے طلب کرنا بجائے خود ایک گناہ ہے ۔

اقوال حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ

● بغیر ادائے سنت کے امید شفاعت محض غرور اور دھوکا اور بغیر
فرمانبرداری امیدوار رحمت ہونا محض جہالت اور حماقت ہے ۔
● دولت کے بھوکے کو کبھی حقیقی راحت نصیب نہیں ہو سکتی ۔
● ایسی بات میں گفتگو کرنا جس میں کسی کا فائدہ نہ ہو علامت ضلالت و
گمراہی ہے ۔
● جس طرح برائی سننے کو ناپسند کرتا ہے اُسی طرح اپنے آپ کو مدح سرائی
سے بچا ۔
● اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کی بھلائی چاہتا ہے تو حسنِ عمل کا اُس پر
دروازہ کھول دیتا ہے ۔
● آنکھ سب کی طرف سے بند کرلے خصوصاً بری نگاہ سے کبھی نہ دیکھ
● محبت ایک ایسی چیز ہے جو سیکھنے اور کسی کے بتانے کی نہیں ہے ۔
● حب دنیا کو ترک کردو کیوں کہ دنیا کی ذرا سی چیز بھی تمہارے دل میں
ہوگی تو سجدہ کرنے میں بھی تم اس کو فراموش نہ کر سکو گے ۔
● دنیا کا لفظ دنائت سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں خواری ذلت اور
کمینگی اس سے اندازہ لگاؤ کہ دنیا کیا چیز ہے ؟
● آپ چونکہ ہمیشہ باوضو رہتے تھے ۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ آپ کا وضو
ٹوٹ گیا دریائے دجلہ چند قدم پر ہی تھا لیکن آپ نے وہیں تیمم
کر لیا ۔ ارادتمندوں نے کہا حضرت دجلہ چند قدم پر ہے تیمم
کی کیا حاجت تھی ؟ فرمایا ۔ زندگی کا کیا بھروسہ، آدمی پانی کا
بلبلہ ہے ابھی اُٹھا اور ابھی بیٹھ گیا نہ شاید پانی تک پہونچنے میں
سانس روانہ کرتا اور بے وضو ہی چلا جاتا ۔ غرضکہ بعد تیمم آپ دریا
پر گئے اور وہاں جاکر از سر نو وضو کیا ۔

● وہ تلخی کہ جس کا آخر شیریں ہو صبر ہے ؎

صبر تلخ است ولیکن برِ شیریں دارد

بیشرک ظاہر بتوں کی پرستش اور شرک باطن مخلوق پر بھروسہ رکھنا ہے۔

● تواضع یہ ہے کہ جس کسی سے تو ملے اپنے سے بہتر جانے خواہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ عالم ہو یا جاہل۔ مومن ہو یا کافر۔

● شیطان کو سب سے زیادہ پیارا بخیل مسلمان۔ اور اس کو ناپسند گنہگار سخی ہے۔

● پوچھا گیا کہ مصائب دنیا کی کیا دوا ہے؟ فرمایا خلق سے دور اور حق سے نزدیک رہنا۔

● فرمایا کہ درویشی یہ ہے کہ کسی چیز پر طمع نہ کرے جب بے طلب کوئی کچھ لائے تو منع کرے اور جب لے لے تو جمع نہ کرے۔

● اگر صاحب بدعت کو دیکھو کہ ہوا پر چلتا ہے تو بھی اس کو قبول نہ کرو

● گناہ کرنے والے سے میل جول رکھنا گناہ پر راضی ہونا ہے اور گناہ سے راضی ہونا گناہ کے برابر ہے۔

● اعتقاد سالم نہ ہو تو عبادت بھی بے کار ہے۔

● بلا اور فقر میں ثابت قدم رہنا خدا اور رسولؐ کی سچی محبت کی علامت ہے۔

کشکول اقوال از دیگر بزرگان رحمۃ اللہ علیہم اجمعین

حسن بصریؒ نے فرمایا ● خالی پیٹ شیطان کا قید خانہ ہے اور بھرا ہوا پیٹ اس کا اکھاڑہ ہے۔

نیز آپ کا قول ہے ● اگر تو خدا سے ڈرتا ہے تو اس کے تصرفات میں کلام مت کر۔

● ابراہیم ادھمؒ ۔ جو عمل آج تم پر زیادہ شاق ہے وہ آخرت میں میزان میں زیادہ وزنی ہوگا۔

● شیخ موصلیؒ ۔ خلق کی صحبت سے بچو۔ کم کھاؤ اور کم بولو۔

● شیخ گنج بخش لاہوریؒ ۔ صوفی وہ ہے کہ جس کا کردار موافق گفتار کے ہو

● علی بن فضیلؒ :- آپ اپنی اشیائے ضروریات اپنے محلہ کے بقال سے خریدا کرتے تھے اور جس نرخ پر بھی وہ ان کو دیتا بے تامل خرید لیا کرتے۔ کسی نے ان سے کہا کہ آپ کیوں بڑے بازار سے نہیں خریدتے کہ وہاں پر تمام اشیاء ارزاں نرخ دستیاب ہوتی ہیں۔ فرمایا کہ ان بقالوں نے اس واسطے اس محلہ میں دکانیں کھولی ہیں کہ ہم سے فائدہ اٹھائیں (نیز یہ ان کے ہمسائے بھی تھے۔ اس کے علاوہ بازار دور تھا جبکہ بقال قریب ہی تھے)

● جو اپنے آپ کو دوسروں پر فضیلت دیتا ہے وہ متکبر ہے۔ (سفیان ثوریؒ)

● نیز سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں :- کہ محبت اور عورت کی محبت کا چھوڑنا صبر سے زیادہ کڑوا ہے۔

● نیز فرمایا :- کہ قضائے حاجت اور دفع مصیبت کے لئے مخلوق سے رجوع کرنے سے قبل اللہ پاک کی طرف رجوع کرے جو بندہ اس کی طرف رجوع ہوتا ہے خدا اس کی مشکل آسان کر دیتا ہے۔

● حضرت سفیان ثوریؒ جب غفلت سے زیادہ کھا لیتے تو تمام رات کو قیام کرتے اور کہتے جب گدھے کو چارہ زیادہ دیا جاتا ہے تو کام بھی زیادہ لیا جاتا ہے۔

● حضرت مالکؒ فرماتے ہیں :- کہ جس دل میں غم نہ ہو وہ بگڑ جاتا ہے جیسا کہ گھر۔ اگر اس میں رہائش نہ ہو تو بگڑ جاتا ہے۔

● دین کو حصول دنیا کا ذریعہ بنانا انتہائی دناءت ہے۔

● حضرت یونسؒ بن عبید فرماتے ہیں :- ایک لغو کلمے کو چھوڑنا نفس کے لئے ایک دن کے روزے سے مشکل ہے کیونکہ انسان بہ اوقات سخت گرمی میں روزہ رکھ لیتا ہے لیکن لغو کلمے سے نہیں رک سکتا۔

● حضرت بصریؒ فرماتے ہیں :- انسان پر تعجب ہے کہ کراماً کاتبین اس کے پاس ہیں۔ اس کی زبان اس کا قلم ہے اور اس کا لعاب دہن ان کی سیاہی ہے پھر وہ بیہودہ باتیں کرتا ہے۔

حضرت زہریؒ سے غیبت کی نسبت سوال ہوا۔ آپ نے فرمایا
ں بات سے تو اپنے دوست کو روبرو خطاب کرنا پسند کرے وہ
بت ہے۔

اگر تم لوگوں سے دولت میں نہیں بڑھ سکتے تو خندہ پیشانی و حسن خلق
میں بڑھ جاؤ۔

حضرت سلمان فارسیؒ فرماتے ہیں۔ اس شخص کی مثال جو نوافل بکثرت
ہے اور فرائض پورے ادا نہ کرے اس تاجر کی سی ہے جو راس المال
و ضائع کرکے نفع کا خواستگار ہو۔

● ایک بزرگ فرماتے ہیں۔ میں نے شب بیداری میں غور کیا تو دیکھا
کہ چوکیدار تمام رات چند پیسوں کے بدلے نگہبانی اور شب بیداری
کرتے ہیں تو کیا تم ایک رات کی عبادت کے بدلے جنت چاہتے ہو اور
ایسی عبادت کے ساتھ جو چند پیسوں کے برابر نہیں ہے اور اکثر اللہ تعالیٰ
پر احسان بھی رکھتے ہو۔

● ایک بزرگ بیمار کو کم کھانے کی نصیحت کرتے اور فرماتے کہ اللہ تعالیٰ
نے بیمار اور تندرست کے لئے نہ کھانے سے بڑھ کر کوئی دوا پیدا نہیں کی
کیونکہ بیماری کھانے ہی کی وجہ سے ہوتی ہے۔

● ایک بزرگ فرماتے ہیں جب درہم و دینار پر مہر لگائی جاتی ہے تو
شیطان اس کو بوسہ دیتا ہے۔ اور کہتا ہے جو تجھ سے محبت کرے
وہ میرا سچا غلام ہے۔

● یحییٰ ابن معاذؒ فرماتے ہیں کہ درہم و دینار بچھو اور سانپ ہیں جو
ان پر منتر اچھی طرح نہ پڑھے گا اس کو ان کا زہر ہلاک کر ڈالے گا
لوگوں نے پوچھا ان کا منتر کیا ہے۔ فرمایا ان کو حلال طریقہ سے
حاصل کرے اور برمحل خرچ کرے۔

● حضرت شقیق بلخی فرماتے ہیں جو بڑے آدمی پر رحم نہیں کرتا وہ اس
سے بھی بڑا ہے۔

● حضرت ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں جس شخص نے گناہ کئے ہوں اس کو یہ نہیں
پہنچتا کہ عذاب کے آنے کو خلاف قاعدہ سمجھے بلکہ میرا خیال ہے کہ
جس مصیبت میں وہ گرفتار ہے وہ اسی کے گناہ کی نحوست ہے۔

● حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں جب تیرا کوئی دوست ہو تو اس
کی محبت کا اندازہ اس سے نہ پوچھ بلکہ اپنے دل سے پوچھ کیونکہ
جو تیرے دل میں ہوگا ویسا ہی اس کے دل میں ہوگا ؎

دل را بہ دل رہیست دریں گنبد سپہر
از سوئے کینہ کینہ و از سوئے مہر مہر

● حضرت مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ جس میں ادب نہیں اس میں سب
برائیاں ہی برائیاں ہیں۔

مولانا محمد نعیم ندوی صدیقی
رفیق دار المصنفین اعظم گڈھ

ایک معیاری اسلامی حکومت اور اس کا مثالی حکمران

راقم الحروف نے اپنے گذشتہ مضمون کے آخر میں عرض کیا تھا کہ عصر حاضر کے سیاستدانوں کا یہ خیال صریحاً غلط ہے کہ اسلام کا پیغام زمان و مکان کے ساتھ مقید ہے اور ہر وقت کے ساتھ زمانہ میں جو تغیرات و انقلابات پیش آتے رہتے ہیں اسلام ان کا ساتھ دینے کی صلاحیت نہیں رکھتا ـــــ کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم۔ درآنحالیکہ خود کتاب الٰہی شاہد عدل ہے کہ اسلام اپنے ساتھ جو عالمگیر پیغام لے کر دنیا میں نمودار ہوا ہے وہ ابدی اور دائمی ہے، زمانہ میں کتنے ہی انقلابات کیوں نہ رونما ہو جائیں، اور انسان اپنی نوع بنوع اختراعات اور اکتشافات میں کتنی ہی نمایاں ترقیاں کیوں نہ کرلے، لیکن ـــــ اسلام ہر عہد و قرن میں اپنی مشعل ہدایت لئے کھڑا نظر آتا رہے گا، کیونکہ اس کی ہمہ گیری تمام نظامہائے معیشت اور معاشرت کو حاوی ہے، ـــــ ضرورت صرف اپنی فہم و دانش کے صحیح استعمال کی ہے،

اس سلسلہ میں راقم نے کہ بنو امیہ کے مسلم حکمراں کی شالیں دی تھیں اسی تیرہ و تاریک عہد میں خلیفہ عمر بن عبد العزیز اسلام کی شمع فروزاں لے کر اورنگ خلافت پر جلوہ افروز ہوئے تھے، اور انہوں نے اپنے مثالی طرز حکومت سے اُس عہد زریں کی یاد تازہ کر دی تھی جسے خلافت راشدہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، ذیل میں اسی معیاری اسلامی حکومت کی اجمالی جھلکیاں پیش خدمت کی جاتی ہیں۔

خلافت بنی اُمیہ

صورت حال یہ تھی کہ خلافت راشدہ کے عہد زریں کے خاتمہ کے ساتھ ہی اسلامی جمہوری حکومت کا بھی اختتام ہو گیا اور شخصی ملوکیت اس کی وارث ٹھہری۔

یہ صحیح ہے کہ مروانیوں نے اپنے قوت بازو سے حدود سلطنت میں غیر معمولی وسعت پیدا کی تھی، لیکن اسلام کے نزدیک جہانبانی کا مقصود سلطنت و حکومت میں صرف وسعت ہی پیدا کرنا نہ تھا بلکہ خدا کی زمین میں اس کے اصول و آئین کا نفاذ اور صحیح اسلامی جمہوریت و مساوات کا عموم کرنا ہے، علامہ ابن خلدون خلافت کے اسلامی نظریہ کو ان الفاظ میں واضح فرماتے ہیں۔

"خلافت اس سے عبارت ہے کہ سب کو شرعی نقطہ نظر کے مطابق زندگی گذارنے پر آمادہ کیا جائے

جس سے آخرت کی سعادت بھی نصیب ہو اور دنیا کی وہ مصلحتیں بھی بہم پہونچیں جو سعادت اُخروی میں معین و مددگار ہیں، کیونکہ شریعت کی رو سے دنیا کے تمام حالات اسی لحاظ سے قابل اعتنا ہیں کہ ان سے اصلاح زندگی آخرت ہو، تو گویا خلافت اور زیادہ کھلے الفاظ میں اس سے عبارت ہوئی کہ دین کی حفاظت دیکھ بھال اور دنیا کی سیاست رانی میں شارع علیہ السلام کی صحیح نیابت اور جانشینی اختیار کی جائے[1]۔

حضرت عمر بن عبد العزیز

خلیفہ عمر بن عبد العزیز خاندان شاہی کے ایک ذی ثروت و وجاہت فرد تھے، ان کے والد بھی ایک ممتاز اور صاحب اثر شخصیت کے مالک تھے، وہ عرصہ دراز تک مصر کی گورنری پر فائز رہے، عمر بن عبد العزیز بھی متعدد ممتاز عہدوں پر فائز ہوئے، ابتدا ہی سے تعلیم و تربیت خالص اسلامی طرز پر ہوئی تھی، اور لائق اساتذہ تربیت میں رہ کر علم و فضل میں درجہ کمال کو پہونچے، جس کا اعتراف ان کے ہم عصر اکابر علما و فضلاء کو بھی تھا۔ حافظ ابن حجر نے میمون بن مہران کا قول نقل کیا ہے کہ " ما کانت العلماء عند عمر الا تلامذة[2] "

حقیقت تو یہ ہے کہ خلیفہ عمر بن عبد العزیز کا فضل و کمال اس کا مقتضی تھا کہ مسند درس کو زینت دے کر سینکڑوں تشنگان علم کو سیراب کرتے، لیکن قدرت نے ازل سے آپ کی صلاحیتوں کے بروئے کار آنے کا میدان حکومت و سلطنت کی گدی متعین کر رکھا تھا۔

سلیمان کا عہد گذشتہ خلفاء کے مقابل نسبتہً معتدل اور بہتر قرار دیا جاتا ہے، اس کا سہرا تمام تر خلیفہ عمر بن عبد العزیز کے سر ہے ن کے عہد وزارت میں سلیمان نے شاندار طریقے سے حکمرانی کی، حتی کہ وہ عمر سے اس حد تک متاثر ہوا کہ آخر وقت میں بلا استحقاق کے انہی و خلیفہ نامزد کیا تھا۔ مسعودی نے لکھا ہے کہ عمر بلا استحقاق خلیفہ ہوئے لیکن خلیفہ ہونے کے بعد عدل و انصاف کی بنا پر اس کے مستحق ہو گئے[4]۔

حضرت عمر بن عبد العزیز اپنے عہد خلافت میں زمین و ملک میں کوئی قابل ذکر وسعت پیدا نہ کر سکے، لیکن زمین کو عدل و انصاف سے اس طرح معمور کر دیا کہ زمانہ پلٹ کر عہد صحابہ سے مل گیا تھا اور چشم فلک نے ایک مرتبہ اسلام کے معجزہ کا نظارہ کر لیا۔ ایک مسلم فرمانروا کا یہی سب سے بڑا حقیقی کارنامہ ہے۔

مسند خلافت پر جلوہ افروز ہونے سے قبل انتہائی عیش و عشرت اور شان و شوکت کی زندگی بسر کرتے تھے، اس وقت روئے زمین پر کم لوگ ان کی برابر خوش پوشاک ہوں گے چنانچہ ان کے تمول اور ترفہ کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مورخین کے بیان کے مطابق جب مدینہ کی گورنری پر ان کا تقرر ہوا تھا تو ان کا ذاتی اثاثہ تیس اونٹوں پر بار ہو کر منتقل ہوا تھا[5]۔

لیکن —— خلافت ملتے ہی اس طرز معیشت میں ایک عظیم انقلاب رونما ہو گیا اور انہوں نے خود کو ابوذرؓ و ابوہریرہؓ کے قالب میں ڈھال لیا تھا۔

سلیمان بن عبد الملک کی تجہیز و تکفین کے بعد جب دولت کدہ پر واپس ہونے لگے تو دستور کے مطابق شاہی سواریاں پیش کی گئیں۔

---

[1] ترجمہ مقدمہ ابن خلدون مطبوعہ کراچی ص ۲۱۹ [2] تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۴۷۷ [3] آگے جہاں بھی مطلق "عمر" آئے اس سے مراد خلیفہ عمر بن عبد العزیز ہی ہیں۔ [4] مروج الذہب بحوالہ سیرت عمر بن عبد العزیز ص ۸ [5] یعقوبی ج ۲ ص ۳۶۹

تو آپ نے یہ کہہ کر انہیں واپس کر دیا کہ "میرا خچر میرے لئے کافی ہے"[1]۔ پھر جب رباڑی گارڈ نے چلنا چاہا تو منع کرتے ہوئے فرمایا کہ "میں بھی تمہاری طرح مسلمان ہوں"[1]۔

چونکہ آپ کا انتخاب غیر معروف طریقے سے عمل میں آیا تھا اور بلطائف الحیل امام رجاء بن حیوۃ نے بیعت لی تھی اس لئے یہ چیز آپ کے ذہن و طبیعت پر بہت گراں گذر رہی تھی، چنانچہ سب سے پہلے مسجد میں تشریف لاکر عام الناس کو جمع کیا اور یوں گہر بار ہوئے:۔

"لوگو! مجھ پر خلافت کا بار بغیر اس کے کہ مجھ سے اجازت لی جاتی یا میں اس کا خواستگار ہوتا یا عام مسلمانوں سے مشورہ لیا جاتا ڈال دیا گیا ہے، میری بیعت کا جو قلادہ گردنوں میں ہے اس کو خود نکال لیتا ہوں اب جس کو پسند کرو نیا خلیفہ منتخب کر لو"[1]۔

جب چاروں طرف سے یہی صدائیں بلند ہونے لگیں کہ ہم نے آپ کو اپنا خلیفہ منتخب کیا اور آپ کی خلافت پر راضی ہوئے تو آپ کے مضطرب و بے چین دل کو قرار نصیب ہوا۔

جس وقت سلیمان کی وفات ہوئی تھی تو عبد العزیز بن ولید موجود نہ تھا اور نہ اسے یہ علم ہی تھا کہ عمر خلیفہ نامزد کئے جا چکے ہیں چنانچہ اس نے اس خیال کے پیش نظر کہ مبادا خلیفہ کی وفات سے ملکی امن و امان میں خلل واقع ہو اپنے ہمراہیوں سے بیعت لے کر دمشق کا رخ کیا، یہاں پہونچ کر اس کو علم ہوا کہ سلیمان نے عمر کو خلیفہ نامزد کیا ہے، اب وہ خلیفہ کے حضور میں آیا تو ان کے استفسار پر بلا کم و کاست حقیقت واقعہ بیان کر دی، خلیفہ نے فرمایا۔

"اگر تم خلافت کی ذمہ داریاں سنبھال لیتے تو میں تم سے بالکل منازعت اور اختلاف نہ کرتا ـــــــــ"

اس پر ابن ولید نے کہا "بخدا میں خلافت کا مستحق آپ سے زیادہ کسی کو نہیں سمجھتا"[2]۔

غرض ہر طرح سے عوام کا اعتماد حاصل کر لینے کے بعد امور خلافت کی طرف متوجہ ہوئے اور حکومت کے تمام شعبوں میں اصلاحات کا سلسلہ شروع کر دیا یوں تو ان کا مختصر دور حکومت پورا کا پورا مصلحانہ و مجددانہ کارناموں سے مملو ہے لیکن اس جگہ ہم مشتے از خروارے کے طور پر اس عہد زریں کی چند جھلکیاں دکھانے پر اکتفا کرتے ہیں۔

غصب کردہ اموال کی واپسی

خلیفہ عمر بن عبد العزیز نے سریر آرائے خلافت ہونے کے بعد سب سے پہلے جس اہم کام کی طرف توجہ مبذول کی وہ ان تمام اموال اور جاگیروں کو ان کے حقیقی مالکوں کو واپس دلانا تھا جن پر بنو مروان نے ناجائز طور پر قبضہ کر رکھا تھا اگرچہ یہ اتنا دشوار اور خطرناک اقدام تھا کہ جس پر پورے خاندان کے برہم ہو جانے کا قوی اندیشہ موجود تھا لیکن اس پیکر عزم و استقلال نے اس کی قطعی پروا نہ کی اور عمال کو اس سلسلہ میں سخت فرامین ارسال کئے اور مال و جاگیر کو واپس کرنے میں لیت و لعل اور لیس و پیش کرنے والوں سے سختی سے نمٹنے کی ہدایت کی۔

خلیفہ موصوف چونکہ خود بھی خاندان بنی امیہ کے ایک فرد تھے اس لئے جائداد کی واپسی اپنی ذات سے شروع کی اور

---

[1] تاریخ الخلفاء للسیوطی ص ۲۳۱ [2] سیرت عمر بن عبد العزیز ص ۲۱ [3] مختصر کتاب صفوۃ الصفوۃ لابن جوزی ص ۱۶۱

[2] تاریخ ابن خلدون ج ۳ ص ۷۱

اپنے غلام مزاحم کو بلاکر تمام اسناد پڑھنے کا حکم دیا، وہ پڑھتا جاتا تھا اور آپ قینچی سے اس کو کاٹتے جاتے تھے یہاں تک کہ ایک ایک کرکے تمام جاگیریں ان کے حقیقی مالکوں کو واپس کردیں[1]۔ بعض خیر اندیشوں اور بہی خواہوں نے عرض کیا اگر سب جائدادیں واپس کردیں گے تو اہل وعیال کی کفالت کا کیا انتظام ہوگا۔ فرمایا کہ انہیں خدا کے سپرد کرتا ہوں[2]

اس کے بعد بنو مروان کو جمع کرکے بہت درشت لب ولہجہ میں اس ظلم وناانصافی کے خلاف سرزنش کی جس پر وہ برہم بھی ہوئے مگر آپ نے ان کی تمام اشتعال انگیزی کے باوجود بہت ہی عرافت کے ساتھ فرمایا :-

"اگر تم اس حق میں میرا تعاون نہ کروگے تو میں تم سب کو انتہائی رسوا اور ذلیل کرکے چھوڑوں گا"[3]

آپ کی بیوی فاطمہ مشہور اموی فرمانروا عبدالملک کی صاحبزادی اور نازونعم کی پروردہ خاتون تھیں لیکن خلیفہ عمر کی ہم نشینی کے عکس جمیل سے ان کا دل منور تھا، اس لئے جب خلیفہ نے اس بیش قیمت ہار کو بیت المال میں واپس کردینے کا حکم دیا جو عبدالملک نے انہیں دیا تھا اور اس کے متعلق یقین کے ساتھ نہیں معلوم تھا کہ وہ ناجائز ہی ہوگا تو پاک طینت خاتون نے بے چون وچرا حکم کی تعمیل کی[4]، بلکہ پھر بعد میں جب یزید برسر اقتدار ہوا تو اس نے یہ ہار فاطمہ کو دوبارہ واپس دینا چاہا تو آپ نے صاف انکار کردیا۔ کہ جب "ان" کی زندگی میں میں نے اسے پہننا پسند نہ کیا تو اب کیسے لے لوں، چنانچہ اس ہار کو یزید نے اپنے گھر بھیج دیا[5]

اس سلسلہ کا سب سے اہم واقعہ باغ فدک کا تھا، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خالصہ تھا اور اس کی آمدنی آپؐ کی ذات اور بنو ہاشم کے مصارف میں کام آتی تھی، چہیتی بیٹی حضرت فاطمہ زہراؓ کے مانگنے پر آپؐ نے صاف انکار کردیا تھا، باغ فدک کے وہی مصارف خلفائے راشدین نے بھی قائم رکھے لیکن ـــــــ بنو مروان نے دیگر جائدادوں پر قبضہ کے ساتھ اسے بھی اپنی ذاتی ملکیت میں کرلیا تھا۔

جب خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے زمام اقتدار سنبھالی تو وقت کے متدین اور اکابر علماء سے صلاح ومشورہ کے بعد اس باغ کو بنو مروان سے لے کر دوبارہ حکومت کے زیر انتظام کرلیا، اور اس کی آمدنی کو قدیم مصارف میں استعمال کرنے لگے۔ ابن سعد نے لکھا ہے کہ خلیفہ اور ان کے اہل وعیال کی معاش کا تمام تر مدار باغ فدک کی آمدنی پر تھا[6] لیکن خلیفہ عمر نے اس کی مطلق پروا کئے بغیر آل مروان کو جمع کرکے فرمایا کہ :-

"باغ فدک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خالصہ تھا تمہارا اس کو اپنی جاگیر بنا لینا سراسر ظلم وناانصافی تھا اب میں اپنی حکومت میں دوبارہ اس کے صحیح مقام پر پہونچاتا ہوں"[7]

خاندان بنی امیہ ایک طویل عرصہ تک عیش وراحت اور تفوق وامتیاز کی زندگی گذارنے کی بناپر خود فراموش ہوگیا تھا۔ جب انہوں نے اپنے کو اس طرح تہی دست ہوتے دیکھا تو انہیں اپنی ذلت محسوس کی۔ چنانچہ مختلف طریقوں سے انہوں نے خلیفہ کو اس ارادہ سے باز رکھنے کی کوشش کی، عمر بن عبدالزبید نے اس سلسلہ میں خلیفہ کو ایک سخت خط لکھا، خلیفہ عمر بن عبدالعزیز گو سراپا حلم تھے، لیکن ـــــــ حق کے معاملہ میں یہی منبع حلم آتش غیظ وغضب بن کر بھڑک اٹھتا تھا، اس لئے آپ نے اس خط کا بہت سخت جواب دیا اور آخر میں لکھا :-

---

[1] ابن جوزی کی عربی سیرت عمر ص ۱۴۰ [2] ایضاً ص ۱۰۱ [3] ایضاً ص ۱۱۵ [4] تاریخ الخلفاء للسیوطی ص ۲۳۳ [5] طبقات ابن سعد بحوالہ تدوین اسلام ج ۲ ص ۱۱۱ [6] تاریخ الخلفاء للسیوطی ص ۲۳۲ [7] ایضاً ص ۲۳۳

"اگر مجھے فرصت ہوتی تو میں تجھ کو اور تیرے خاندان کو روشن راستے پر لاتا۔ ہم نے مدتوں حق کو چھوڑ دیا اگر تم فروخت کئے جاؤ اور تمہاری قیمت یتیموں، مسکینوں، بیواؤں پر تقسیم کی جائے تو کافی نہ ہوگی کیونکہ تم میں سب کا حق ہے۔"[۱]

خلیفہ نے چونکہ اپنی حکومت کی بنیاد عدل و انصاف پر رکھی تھی اس لئے عمال کے بارے میں اگر ذرا بھی ظلم و جور کی اطلاع ملتی تو ضرور ان کو معزول کردیتے اور برابر ان کا محاسبہ لیتے رہتے،

مذہبی رواداری علامہ شبلی نعمانی علیہ الرحمتہ لکھتے ہیں کہ آج کل مذہبی جوش اور مذہبی عصبیت کی یہ علامت خیال کی جاتی ہے کہ غیر مذہب کے لوگوں سے نفرت ظاہر کی جائے اور جہاں تک ممکن ہو ان کی تحقیر و تذلیل کی جائے۔ لیکن لوگوں کو یہ معلوم ہو کر حیرت ہوگی کہ عمر بن عبدالعزیز جو ہمہ تن مذہب تھے ان کا طرز عمل اس کے خلاف تھا[۲]،

محدث ابن جوزی نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ مسلمہ بن عبدالملک جو خاندان بنی امیہ کا دست و بازو تھا اس نے گرجا کے متولیوں کے خلاف دعویٰ دائر کیا، فریق مقدمہ جو عیسائی تھے، اجلاس میں کھڑے ہو کر گفتگو کر رہے تھے لیکن مسلمہ خاندانی زعم کی بنا پر بیٹھا تھا خلیفہ نے کہا :-

"چونکہ تمہارا فریق مخالف کھڑے ہو کر گفتگو کر رہا ہے اس لئے تم کو بیٹھنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی"[۳]

اور اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مقدمہ کا فیصلہ بھی مسلمہ کے خلاف کیا اور زمین گرجا کے متولیوں کو دلادی[۴]

غیر مسلموں کے حقوق میں ان کی مذہبی عمارتوں کی حفاظت، جزیہ کی وصولی میں سہولت اور ان کی جان و مال کی حفاظت کا فریضہ حسن و خوبی کے ساتھ عمر بن عبدالعزیز نے انجام دیا اس کی نظیر سوائے خلافت راشدہ کے کہیں نہیں مل سکتی، اس سلسلہ کے بہت سے واقعات قابل ذکر ہیں صرف ایک کے نقل پر اکتفا کیا جاتا ہے،

جب خلیفہ نے اموال منصوبہ کی واپسی شروع کی تو ایک ضعیف العمر آدمی نے کھڑے ہو کر کہا — "اے امیرالمومنین! عباس بن ولید نے میری زمین پر غاصبانہ قبضہ کرلیا ہے" عباس وہیں مجلس میں موجود تھا خلیفہ نے اس سے جواب طلب کیا، اس نے کہا کہ "اس کو ولید نے مجھے جاگیر میں دیا ہے اور میرے پاس اس کی سند موجود ہے" یہ جواب سن کر خلیفہ ذمی کی طرف مخاطب ہوئے تو اس نے کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کا مطالبہ کیا۔ عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا — "خدا کی کتاب ولید کی سند پر مقدم ہے، عباس تم اس کی زمین چھوڑ دو[۵] —"

اس مشاورت کا یہ اثر تھا کہ غیر مذہب کے لوگ بھی اپنے تنازعات میں آپ کو حکم بنانے کے لئے بخوشی راضی رہتے اور کتاب اللہ کی روشنی میں فیصلہ کے طالب ہوتے۔

بنوامیہ کے دور میں بیت المال کی حیثیت ذاتی خزانہ کی سی ہو کر رہ گئی تھی، خلیفہ عمر نے اس کی بھی اصلاح کرکے تمام ناجائز مصارف بند کردیئے۔

---

[۱] خط اور اس کے جواب کو بہ تمام و کمال ابن جوزی کی عربی "سیرت عمر" اور اس کا خلاصہ مولانا عبدالسلام ندوی کی اردو سیرت عمر بن عبدالعزیز میں دیکھا جاسکتا ہے
[۲] مقالات شبلی جلد ۱ ص ۴ [۳] مقالات شبلی ص ۴ جلد ۱ [۴] ایضاً [۵] سیرت عمر لابن جوزی ص ۱۰۲

حجاج نے صرف بیت المال کی آمدنی میں اضافہ کی خاطر نومسلموں پر بھی جزیہ عائد کر رکھا تھا، آپ نے اسے یکسر موقوف کر دیا جس سے بیت المال کی آمدنی بہت گھٹ گئی، متعلقہ حاکم نے اس سلسلہ میں آپ کو توجہ دلائی تو آپ نے اسے جواب دیتے ہوئے تحریر فرمایا کہ

"کچھ بھی ہو جو شخص اسلام قبول کرلے اس سے جزیہ وصول نہ کیا جائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہادی تھے محصل نہیں تھے[۱]"

اور یہ صرف خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کی برکت ہی تھی کہ باوجود اس کے کہ آمدنیوں کے تمام ذرائع مسدود ہوگئے اور خزانے خالی ہوگئے رعایا روز بروز خوش حال ہوتی جارہی تھی، اس کی ظاہری وجہ یہ ہوگی کہ خلیفہ نے زکوٰۃ کی وصولی کا ایک مضبوط نظام قائم کر رکھا تھا۔

چنانچہ ایک مؤرخ کا بیان ہے کہ

"ناجائز آمدنیوں کے سدباب، مظالم کے انسداد اور عام داد و دہش کے خاتمہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کے زمانہ میں رعایا بڑی خوش حال ہوگئی، ملک کے طول و عرض سے افلاس و غربت کا نام ونشان مٹ گیا اور کچھ دنوں میں صدقہ لینے والے نہ ملتے تھے ․ ․ ․ ․ ․ ․ ․ ․ مہاجر بن زید کا بیان ہے کہ ایک ہی سال میں یہ حال ہوگیا کہ اس سے پہلے جو لوگ صدقہ لیتے تھے وہ دوسروں کو صدقہ دینے کے قابل ہوگئے[۲]"

علامہ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے کہ بعض لوگ اسی زمانہ میں فقراء اور مساکین میں روپیہ تقسیم کرنے، جستجو میں پہنچے تو وہاں کوئی شخص خود خلیفہ سے زیادہ مفلس نہ ملا[۳]۔

احیائے شریعت

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنی خلافت وحکومت کے لئے عمر فاروقؓ کو اسوہ ونمونہ بنایا تھا اور آپ کی تمام تر جدوجہد شب وروز اسی میں صرف ہوتی تھی ان کی حکومت کامل طور پر اسوۂ فاروقی کے سانچے میں ڈھل جائے، اس لئے آپ نے حکومت کے رقبہ میں مزید وسعت پیدا کرنے کے بجائے اسلام کی توسیع واشاعت ہی کو اپنا حقیقی نصب العین بنایا اور اس کے لئے تمام ضروری ذرائع ووسائل استعمال کئے، چنانچہ ــــــــ اسی مبارک جدوجہد کا ثمرہ تھا کہ صرف والی خراسان کے ہاتھوں چار ہزار نفوس شرف اسلام سے بہرہ ور ہوئے[۴] علاوہ ازیں اسماعیل بن عبداللہ کی تبلیغ سے سارے شمالی افریقہ میں اسلام کی روشنی پھیل گئی[۵]

علامہ سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز پہلی صدی کے مجدد تھے[۶] جنہوں نے اسلام کے تمام شعبوں میں عظیم اصلاحات کا نفاذ کیا، دیگر مجددین کے کارنامے صرف مذہب تک محدود رہے، لیکن خلیفہ عمر ابن عبدالعزیز مذہب، سیاست، اخلاق، تمدن غرض نظام اسلام کے کل اجزاء کے زنگ کو صاف کرکے ان کو جلا دی، اور ایک نئے آب ورنگ کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیا[۷]

مورخ طبری کا بیان ہے کہ عمر بن عبدالعزیز کے عہد حکومت میں مذہب، عبادت اور اس کی تفصیلات ہی پر مجلس کا موضوع سخن

۱؎ خطط مقریزی ج ۲ ص ۱۲۵، وتاریخ اسلام ص ۲۱۵/ج ۲ ۲؎ عمر بن عبدالعزیز ص ۸۵ ۳؎ تہذیب التہذیب لابن حجر ص ۴۷۱/ج ۷ ۴؎ ابن سعد ص ۲۸۸/ج ۵ بحوالہ تاریخ اسلام ص ۲۱۹/ج ۲ ۵؎ فتوح البلدان بلاذری ص ۴۵۶ ۶؎ حسن المحاضرہ للسیوطی ص ۱۵۳/ج ۱ ۷؎ سیرت عمر بن عبدالعزیز ص ۱۰۰

فیں، جس طرح ان سے پہلے اموی حکمرانوں کے دور میں وہی باتیں گفتگو کا محور ہوتی تھیں جن سے خلفاء کو دلچسپی ہوتی تھی۔

خلیفہ عمر کے عدل و انصاف کے متعلق حافظ سیوطی نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ جب عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے تو چرواہے کہتے ، کہ یہ کون صالح شخص خلیفہ ہوا ہے جس کے عدل کی بنا پر بھیڑیئے ہماری بکریوں سے دور دور رہتے ہیں [۱]

اور بلاشبہ انہی تمام خصوصیات کی بنا پر مورخین انہیں منصب تجدید و امامت سے بڑھا کر پانچواں خلیفہ راشد تک لکھتے ہیں۔ چنانچہ ن ثوریؒ کا قول ہے کہ خلفائے راشدین کی تعداد پانچ ہے۔ ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ اور عمر بن عبدالعزیزؒ، اسی قسم کا ایک اور علامہ ذہبی نے امام شافعی کا بھی نقل کیا ہے،

عطا کہتے ہیں کہ عمر روزانہ شب میں فقہاء کو جمع کر کے موت و قیامت کا مذاکرہ کرتے پھر سب لوگ اس طرح روتے جیسے سامنے جنازہ رکھا ہ ـــــ

انس بن مالکؓ صحابی کا قول ہے کہ میں نے عمر بن عبدالعزیز سے زیادہ کسی کی نماز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشابہ نہیں دیکھا۔ [۴]

عمرو بن مہاجر کہتے ہیں عمر بن عبدالعزیز کا یومیہ خرچ صرف دو درہم تھا۔ جن میں سے ایک درہم عام مسلمانوں کے لنگر خانہ میں بھیج دیا ہتے اور وہیں جا کر کھانا تناول فرما لیتے [۵]

تواضع و فروتنی کا یہ عالم تھا کہ کبھی دوسرے سے کام نہ لیتے تھے، ایک شب چراغ میں تیل ڈالنے کے لئے نہ تو خادم کو جگایا اور نہ ابن حیوۃ کو جو کہ ان سے ملنے آئے تھے ، کام کرنے دیا بلکہ خود ہی اٹھے اور یہ کام انجام دیا اور فرمایا کہ میں جب اٹھا تھا جب بھی عمر بن عبدالعزیز تھا اور اب بیٹھا تب بھی عمر بن عبدالعزیز ہوں۔

حضرت عمر ابن عبدالعزیز نے اپنے پیش رووں کے برخلاف ہر شخص کو عام آزادی اور نقد و احتساب کی اجازت دے دی جس سے عام ں کو جرأت ہو گئی تھی کہ وہ نہایت آزادی کے ساتھ حکومت کے اقوال و افعال پر نکتہ چینی کر سکتے تھے [۶]

عارف نوازی

یہ صحیح ہے کہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے حکومت کے تمام بے جا مصارف کا دروازہ بند کر دیا تھا۔ لیکن بایں ہمہ اسلامی علوم و فنون کی ترویج و اشاعت کے لئے انہوں نے خزانوں کے منہ کھول دیئے تھے، ، و فقہا اور طالبان علوم نبوت کی کفالت اور ان کی معاشی بے فکری کی طرف وہ خصوصی توجہ مبذول فرماتے تھے، اہل علم کی قدر دانی کا خاص شیوہ تھا۔ چنانچہ عدی ابن ارطاۃ نے جب تمام امور و مسائل شرعیہ میں ان سے مشورہ لینا شروع کیا تو فرمایا کہ حسن بصری شورہ لینا کافی ہے اسی طرح جب خود کوئی فیصلہ صادر کرتے تو لازمی طور پر سعید بن مسیبؒ سے مشورہ لیتے تھے۔

ابن سعد نے اپنے طبقات میں اس سلسلہ کا ایک واقعہ نقل کرتے ہوئے لکھا ہے، خلیفہ عمر نے ایک بار ایک آدمی کو سعید بن مسیبؒ پاس کوئی مسئلہ دریافت کرنے کے لئے بھیجا، وہ شخص جا کر خود بزرگ موصوف کو ہی بلا لایا، خلیفہ نے انہیں بہ نفس نفیس دیکھ کر انتہائی ت، خفت اور معذرت کا اظہار کیا اور فرمایا کہ "قاصد نے غلطی سے آپ کو تکلیف دی میں نے تو صرف یہ کہا تھا کہ آپ سے مسئلہ

---

[۱] تاریخ اسلام ص ۲۲۶ ج ۳ [۲] تاریخ الخلفاء للسیوطی ص ۲۳۴ [۳] تاریخ الخلفاء للسیوطی ص ۲۳۴
[۴] تہذیب التہذیب لابن حجر ص ۴۷۷ ج ۷ [۵] تاریخ الخلفاء ص ۲۳۷
[۶] مقالات شبلی ص ۱ ج ۵

پوچھ کر چلا آئے ۔ لہ

اکثر علماء وقت سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے، اور جب کوئی عالم ان کے پاس آتا تو اس سے نہایت گرم جوشی سے ملتے اور دیر تک اس کی صحبت سے مستفید ہوتے، ایک بار آپ کے ایک دوست عالم تشریف لائے تو ان کو خلوت میں لے جا کر بڑے اکرام سے بٹھایا اور کافی دیر تک ان سے محو گفتگو رہے ۔

خلیفہ موصوف نے طلباء کے وظائف بھی مقرر کر رکھے تھے، چنانچہ قاسم بن مخیمرہ ایک محدث تھے، جو نہایت عسرت کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے، وہ آئے تو ان کی جانب سے ستر دینار قرض ادا کیا، سواری دی اور پچاس دینار وظیفہ مقرر کر دیا۔

علمی خدمات

اور عرض کیا جا چکا ہے کہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز رہ نہ صرف سیاست دانی کے شہسوار تھے بلکہ درحقیقت ان کی طبیعت کا اصلی جولانگاہ مختلف اسلامی علوم و فنون تھے، اسی لئے " الناس علی دین ملوکہم " کے اصول کے مصداق ان کے زمانہ کی عام طبیعتیں مسائل شرعیہ کی تحقیق و تفتیش میں منہمک رہتی تھیں ۔

علمی خدمات کے سلسلہ میں آپ کا سب سے عظیم کارنامہ احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تدوین ہے، بقول ایک تذکرہ نگار اگر خلیفہ موصوف نے تدوین حدیث کی طرف توجہ مبذول نہ کی ہوتی تو علم حدیث کا یہ ذخیرہ جسے آج ہم بخاری، مسلم اور موطاء وغیرہ کے نام سے جانتے ہیں، وجود میں نہ آتا، چنانچہ آپ نے مدینہ کے گورنر قاضی ابن حزم کو لکھا کہ

انظر ما کان من حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاکتبہ فانی خفت دروس العلم وذھاب العلماء ولا یقبل الا حدیث النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔	احادیث نبویہ کی تلاش کر کے ان کو لکھ لو کیوں کہ مجھے علم کے مٹنے اور علماء کے فنا ہونے کا خوف معلوم ہوتا ہے اور صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث قبول کی جائے ۔

(بخاری)

اور یہی حکم آپ نے تمام صوبوں کے گورنروں کے نام ارسال کیا اور اس کی تعمیل میں احادیث کے مجموعے مرتب و مدون کر کے تمام ممالک محروسہ میں بھیجے ۔

یہاں اس امر کا ذکر بھی غالباً بے محل نہ ہوگا کہ تدوین حدیث کے سلسلہ میں پہلی صدی کے نامور محدث علامہ ابن شہاب زہری اور ابن حزم کو فوقیت حاصل ہے ۔ جنہوں نے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے اس مبارک کام کا آغاز کیا تھا۔ اور حدیث میں مبسوط کتابیں تصنیف کیں ۔

امیرالمومنین کو حدیث کے ساتھ اتنا شغف اور اعتنا تھا کہ انہوں نے نہ صرف اس کو مدون کرایا بلکہ اس کی ترویج و اشاعت میں بھی پوری جدوجہد کی، اسی لئے محدثین نے آپ کو بجا طور پر حفاظ حدیث میں شامل کیا ہے ،

حدیث میں آپ کی مرویات بہ کثرت ہیں، علاوہ صحاح ستہ کے سنن و مسانید و معاجم بھی آپ کی مرویات سے خالی

لہ طبقات ابن سعد صفحہ ۹ ج ۵

نہیں! محدث باغندیؒ نے مستقل طور پر آپ کے مرویات جمع کئے ہیں، مزید برآں ایک مختصر مگر جامع مجموعہ بھی "مسند عمر بن عبدالعزیزؒ" کے نام سے موجود و مشہور ہے، جو ۱۸۲۵ء میں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (ASIATIC SOCIETY OF BENGAL) نے ایڈیٹ کر کے شائع کیا ہے اس کا ایک نسخہ ہمارے یہاں دار المصنفین کے کتب خانہ میں بھی موجود ہے۔

حکیمانہ و بصیرت افروز اقوال

خلیفہ عمر بن عبدالعزیز باایں ہمہ شوکت و سطوت ہمہ وقت خشیت الٰہی اور خوف آخرت سے لرزاں و ترساں رہتے تھے، اٹھتے بیٹھتے انہیں یہ خیال گھن کی طرح کھائے جاتا کہ نہ جانے رعایا کے حقوق پورے طور پر انجام پا رہے ہیں یا نہیں اور ـــــــ جو عظیم ذمہ داری خدائے عز و جل نے کاندھوں پر ڈال دی ہے اس سے عہدہ برآ ہو بھی رہا ہوں یا نہیں، صرف یہی فکر اور خیال ان کے دل کی دنیا میں ہلچل اور طوفان برپا کئے رہتا، جس کی وجہ سے ان کے شب و روز کا راحت و آرام تلخ ہو کر رہ گیا تھا، ذیل میں چند گہر آبدار پیش کئے جاتے ہیں جن سے خلیفہ اموی کے خوف و خشیت اور انابت و مناجات کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔

● ایک بار اپنے ایک فوجی افسر کو لکھا کہ

> "خدا کی عظمت و خشیت کا سب سے زیادہ مستحق وہ بندہ ہے جو اس مصیبت میں مبتلا ہو جس میں کہ میں ہوں، خدا کے نزدیک مجھ سے زیادہ سخت حساب دینے والا اور مجھ سے زیادہ ذلیل اگر وہ خدا کی نافرمانی کرے) کوئی نہیں ہے میں اس حالت میں سخت دل گرفتہ ہوں اور مجھے خوف ہے کہ یہ میری ہلاکت کا سبب نہ بن جائے۔" (سیرت عمر صفحہ ۹۳)

● خلیفہ موت کے خوف سے رات بھر جاگا کرتے تھے، ایک بار انہوں نے اپنے ایک ہمنشیں سے کہا کہ میں رات بھر جاگتا رہا اس نے دریافت کیا کہ کس چیز سے متعلق غور و فکر کرتے تھے، فرمایا۔

> "قبر اور اہل قبر کے متعلق، تم اگر مردے کو قبر میں تین دن کے بعد دیکھو تو باوجود اس کی موانست کے اس کے پاس جانے سے وحشت زدہ ہو گے اور ایک ایسا گھر دیکھو گے جس میں کیڑے رینگ رہے ہوں گے پیپ بہ رہی ہو گی اور کیڑے اس میں تیر رہے ہوں گے ـــــــ"

یہ کہنے کے بعد ہچکیاں بندھ گئیں اور بے ہوش ہو کر گر پڑے ہوش آنے کے بعد بھی یہ حالت عود کرتی رہی۔ (ایضاً صفحہ ۹۶)

● "اے لوگو! جو شخص ہمارے ساتھ ہو اس پر لازم ہے کہ پانچ باتوں میں ہمارے ساتھ شریک ہو، غیر مستطیع کی حاجت ہم پر پیش کرے، اپنی کوشش سے بھلائی پر ہماری مدد کرے اور ہم کو نیکی کا راستہ بتلائے کہ ہم ہدایت یاب ہوں۔ اور کسی کی چغلی نہ کرے اور غیر مفید اعتراض نہ کرے"

● "یاد رکھو کہ ہر سفر کا ایک توشہ ضرور ہوتا ہے، لہٰذا تم اس دنیا سے آخرت کے سفر میں پرہیزگاری کا توشہ اپنے ساتھ لو، اور اس شخص کی طرح ہو کر رہو جس نے اللہ کے ثواب اور عذاب کا مشاہدہ کر لیا ہو رغبت رکھو اور ڈرتے رہو اور تمہاری آرزوئیں دراز نہ ہو جائیں کہ پھر تم سخت دل ہو جاؤ گے ـــــــ"

● "اے لوگو! اللہ سے ڈرو، اور اس سے طلب میں خوش اسلوبی اختیار کرو اس لئے کہ اگر تمہارا رزق

پہاڑ کی چوٹی یا زمین کی تہ میں بھی ہو گا تو تم کو پہونچ جائے گا۔ یاد رکھو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ کا طریقہ ہی صحیح دین ہے اور وہی ہمارے لئے لائق تقلید و حجت ہے اس کے ماسوا تمام طریقے باطل ہیں ——"

خاتمہ کلام وفات کے وقت آپ کے قبضہ میں صرف چودہ دینار تھے جن میں سے تجہیز و تکفین کے مصارف ادا کر کے "بقیہ" رقم ورثا میں تقسیم کر دی گئی۔ مدت خلافت کی صرف ڈھائی سال رہی، لیکن —— اس مختصر عرصہ میں آپ نے جو شاندار مجددانہ و مصلحانہ خدمات انجام دیں اس کی بنا پر آپ کو عمر ثانی کا خطاب دیا جانا حق بحقدار رسید کا مصداق ہے۔

علامہ شبلی علیہ الرحمۃ نے بہت صحیح لکھا ہے کہ خلیفہ عمر ثانی کے دور کی عظمت یوں اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ ان تمام اصلاحات و انقلابات نے تمام مدارج بہت ہی مختصر عہد خلافت یعنی صرف ڈھائی سال میں طے کئے اور اگر —— کہیں ان کو پندرہ بیس کی مہلت نصیب ہوتی تو خدا جانے دنیا کو عرفانیت کی کس منزل پر پہونچا دیتے۔

فرحمہ اللہ وشبب علیہ شآبیب رحمتہ

ولانا شاہ معین الدین احمد ندوی

ہم کو ادارۂ تحقیقات اسلامی پاکستان سے بڑی توقعات تھیں کہ وہ حکومت کی امداد و سرپرستی میں دینی علوم

ائع کی مفید خدمت انجام دیگا۔ مذہب اسلام اور اسلامی تاریخ و تہذیب پر محققانہ کتابیں شائع کرے گا۔ اس کو بیرونی آمیزش

پاک کر کے اصلی شکل میں پیش کرے گا۔ اس کے معترضین کا محققانہ جواب دے گا۔ کتاب و سنت کی روشنی میں نئے مسائل

ل نکالے گا۔ فقہ جدید کی بنیاد ڈالے گا۔ مگر اس کی تحقیقات کے جو نمونے اب تک نظر آئے ہیں ان کا بڑا حصہ مستشرقین کی صدائے

شت اور ان مقصد اسلامی احکام و قوانین کو مغربی قالب میں ڈھالنا ہے۔ اس ادارے کے ڈائرکٹر ڈاکٹر فضل الرحمٰن کا قدم اس بیں

بے آگے ہے، ان کا اندازِ فکر سراسر مغربی ہے ان کے اجتہادات محض فقہی مسائل تک محدود نہیں بلکہ انہوں نے اس سے بھی آگے بڑھ کر

ام کی اساس کتاب و سنت اور وحی والہام پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا ہے۔ جس کے نمونے اُن کے مضامین اور تصانیف

نظر آتے ہیں، ادارہ کے رسالے فکر و نظر میں بعض اچھے مضامین بھی نکلتے ہیں۔ مگر اس کا اصلی مقصد ایک ایسے اسلام کی

لیس ہے جس کا نام تو اسلام ہو مگر اس کے سارے خدوخال مغرب کا چربہ ہوں اور حیرت یہ ہے کہ یہ خدمتِ اسلام"

ب اسلامی حکومت کی سرپرستی میں انجام پا رہی ہے۔

(معارف۔ اعظم گڑھ)

سوز و ساز

شفقت کاظمی

ترا خیال ہے جو بار بار آتا ہے　　یہ اور بات کہ بیگانہ وار آتا ہے
خبر بھی ہے کہ غمِ بے کسی سے گھبرا کر　　کہاں کہاں تجھے کوئی پکار آتا ہے
وفائے دوست سے کیا کام ان غریبوں کو　　جفائے دوست پہ بھی جن کو پیار آتا ہے
خزاں کے جور اٹھاتی ہے جو کلی شفقت　　بہار میں بھی اسی پہ نکھار آتا ہے

راشد اللہ خاں جوہر

یہ امتحانِ وفا ہے اے دل گلہ نہ کر اُن کی بے رخی کا　　تڑپ سے مطلب؟ فغاں سے حاصل؟ وقار کھو دے گا عاشقی کا
گلہ کریں بھی تو کیا کریں ہم کسی سے دو دن کی زندگی کا　　گزارنی ہے گزار دیں گے کہ ہے یہ سودا ہنسی خوشی کا
وہ عہدِ رفتہ وہ دورِ ماضی کبھی جو آتا ہے یاد جوہر　　تو سوچتا ہوں وہ زندگی تھی کہ خواب تھا کوئی زندگی کا

قمر سنبھلی

وہ پہلا سا سماں اگلی سی وہ باتیں کہاں ساقی　　زمیں ہم سے خفا بدلا ہوا ہے آسماں ساقی
ہمیں کیا گردشِ دوراں مٹائے گا زمانے سے　　ہمارا تذکرہ ہے داستاں در داستاں ساقی
نشانِ راہِ منزل رہ گیا چھپ کر بگولوں میں　　زمیں سے تا فلک اڑتی ہے گردِ کارواں ساقی

رئیس نعمانی

اجڑا اجڑا سا ہے اب شہرِ طرب کیا کہیئے　　اور ہی صورتِ حالات ہے اب کیا کہیئے
ہے بجا گردشِ دوراں کی شکایت لیکن　　ایک عالم کا یہی حال ہو تب کیا کہیئے
روشنی سہمی ہوئی پھرتی ہے ویرانوں میں　　اور کشیدہ ہے یہاں دامنِ شب کیا کہیئے

ہوش ترمذی

ایک دیوار ہے زندگی　　کوئی شوریدہ سر چاہیئے
فرصتِ ماتمِ آرزو　　کم سے کم عمر بھر چاہیئے

تازہ ترین

ماہر القادری

درد پہلے جگر میں رکھا ہے　　پھر تماشا نظر میں رکھا ہے
خاک چھانی ہے خاک چھانیں گے　　اور کیا رہگزر میں رکھا ہے
اُس ستمگر نے اپنی محفل میں　　ہر نظر کو نظر میں رکھا ہے
ہم نے اک لمحۂ سکوں کے لئے　　زندگی کو سفر میں رکھا ہے

وہ نظر ہائے! وہ نظر ماہر
جیسے نشتر جگر میں رکھا ہے

دیکھ کر اُن کے مسکرانے کو　　طول دیتے رہے فسانے کو
روشنی دوسروں کی قسمت ہے　　رہ گئے ہم دیئے جلانے کو
ہم خود اپنی ہنسی اُڑاتے ہیں　　مسکراتے ہیں غم چھپانے کو
اُن کے لطف و کرم ہیں اوروں پر　　ہم تو ہیں تہمتیں اٹھانے کو
آرہے ہیں وہ حضرتِ ناصح　　اور کچھ اُلجھنیں بڑھانے کو
جب کبھی اُن کی یاد آئی ہے　　بے وفا کہہ لیا زمانے کو

دیکھتے ہی چشمِ ساقی کے بدل جانے کو ہم
روک لیتے ہیں لبوں تک لا کے پیمانے کو ہم
پارسائی میں وہی آوارگی کا رنگ ہے
سہل سمجھے تھے مزاجِ دل بدل جانے کو ہم

پاکستان ناگزیر تھا

از: سید حسن ریاض، ضخامت ۵۸۸، خوشنما ٹائپ پر، قیمت: پندرہ روپے
ملنے کا پتہ: شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، کراچی یونیورسٹی، کراچی
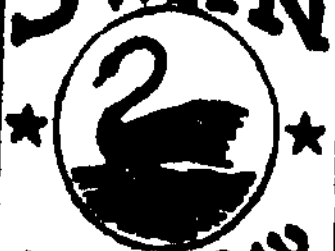
جناب سید حسن ریاض کی صحافتی زندگی کا آغاز ۱۹۲۲ء میں ہوا، جب وہ جوان تھے صغیر احمد صاحب عباسی اُن کے رفیق عمل تھے، عباسی صاحب کچھ دنوں کے بعد نواب سر احمد سعید خاں صاحب رئیس چھتاری (سابق گورنر یو۔ پی) کے پرائیویٹ سکریٹری ہو گئے اور تقریباً چالیس سال نواب صاحب سے وابستہ رہے، سید حسن ریاض اُس زمانہ سے آج تک صحافت سے متعلق ہیں، سید صاحب موصوف بلند شہر، بجنور، لکھنؤ، اور دلی میں مختلف اخباروں کے ایڈیٹر رہے ہیں، سید جالب دہلوی مرحوم جن کو "بابائے صحافت" کہا جاتے تو کوئی مبالغہ کی بات نہ ہوگی، حسن ریاض صاحب نے روزنامہ ہمت (لکھنؤ) میں ان کے رفیق ونائب کی حیثیت سے کام کیا ہے۔

پاکستان بننے سے قبل حسن ریاض صاحب آل انڈیا مسلم لیگ کے اُردو آرگن روزنامہ "منشور" کے مدیر اعلیٰ تھے، مسلم لیگ کی بعض اہم کمیٹیوں کے وہ رکن اور بعض دوسرے عہدوں پر بھی فائز رہے ہیں، قائداعظم اور نوابزادہ لیاقت علی خاں مرحوم کی بارگاہوں میں اُن کو تقرب حاصل تھا، وہ بعض اہم سیاسی معاملات میں ان بزرگوں کو جرأت اور آزادی رائے کے ساتھ مشورے بھی دیا کرتے تھے۔

افسوس ہے پاکستان بننے کے بعد سید حسن ریاض صاحب کے صحافتی تجربہ وقابلیت سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا، صاحب موصوف یہاں کسی اُردو روزنامہ کے ایڈیٹر ہوتے، تو صحافت کے معیار کو بلند کر دیتے، یہ بھی بہت غنیمت ہے کہ کئی سال سے وہ کراچی یونیورسٹی کے شعبہ صحافت میں درس دے رہے ہیں اور ان کی تربیت جرنلزم کے لئے نوجوان اہل قلم تیار کر رہی ہے۔

جناب سید حسن ریاض مخلص مذہبی آدمی ہیں، وضعداری اور شرافت وخودداری نے اُن کے مزاج میں تندی وتیزی بھی پیدا کردی ہے پاکستان میں انہوں نے بڑی عسرت کے دن گزارے ہیں، مگر ان کی خودداری میں کوئی فرق نہیں آیا، سیاست میں صاحب موصوف مسلم لیگی مزاج رکھتے ہیں۔ اس کتاب کو وہ کئی سال ہوئے مرتب فرما چکے تھے اور اس کی اشاعت کے لئے فکرمند تھے، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے کہ انہوں نے اس کتاب کی قدر واہمیت کو پہچانا اور اُن کی توجہ اور عنایت سے یہ شائع ہوگئی، اس کتاب پر فاضل مصنف کو پانچ ہزار روپیہ کا "آدم جی پرائز" بھی ملا ہے یہ دوسری قدرشناسی ہے جو مادی صورت میں اُن کے کام آئی!

اس کتاب کا آغاز ہندوستان میں مسلمانوں کے ورود اور اقتدار وتنزل سے ہوتا ہے، بارہ سو سال کے تاریخی واقعات فاضل مصنف

نے ۹۲ صفحوں میں جس حسنِ ایجاز اور خوبیٔ اختصار کے ساتھ بیان کئے ہیں، بس وہ انہی کا حصہ ہے!

اس کے بعد کے بعض اہم ابواب :—

ہندوستان میں آئینی طرزِ حکومت کا آغاز —— منٹو مارلے اصلاحات —— تحریک خلافت و عدمِ تعاون —— نہرو رپورٹ —— مسلم لیگ میدانِ عمل میں —— سر اسٹیفرڈ کرپس کی تجاویز —— قائد اعظم اور مسٹر گاندھی کے درمیان طویل گفتگو —— لارڈ ویول کا منصوبہ اور شملہ کانفرنس —— عام انتخابات — وزارتی وفد کا منصوبہ —— یوم ڈائرکٹ ایکشن اور عبوری حکومت کا اعلان —— عبوری حکومت میں مسلم لیگ کی شرکت —— تقسیم کا فیصلہ —— پاکستان قائم ہوا —— ہنگامہ فساد و قتل اور کشمیر کا خطرناک تنازعہ —— بعض اعتراضات اور ان کے جوابات!

کانگریس کا ہندوستانی سیاست میں کیا رول رہا؟ مسلم لیگ اور کانگریس کی کشمکش اور پاکستان کے حصول کی جدوجہد پر اتنی مفصل، مستند اور مدلل کتاب ہمارے خیال میں آج تک نہیں لکھی گئی! نقل و عقل اور درایت و روایت کے تمام تقاضے کمال حسن و خوبی کے ساتھ پورے کئے گئے ہیں، جس مسئلہ کو چھیڑا ہے اُسے تشنہ نہیں رہنے دیا، لکھنے والے کی فکر سلجھی ہوئی ہے اور جو بات کہی ہے وہ واضح طور پر کہی ہے مسلم لیگ کی مدافعت اور اس کے برسرِ حق ہونے کے اثبات و جواز کا حق ادا کر دیا ہے!

اس کتاب میں فاضل مصنف کو بڑی محنت اور ریاضت کرنی پڑی ہے اُردو اور انگریزی کی دسیوں کتابوں سے انہوں نے اس ایک کتاب کے لئے استفادہ کیا ہے اور سینکڑوں تحریری حوالے، تاریخی دستاویز کی حیثیت سے جگہ جگہ نقل کئے ہیں! یہ کتاب اس کی شہادت دیتی ہے کہ سید حسن ریاض صاحب سیاسیات میں بڑی بصیرت رکھتے ہیں، انہوں نے بعض مقامات پر سیاسی انداز میں جو ایراد و احتساب اور دفاع کیا ہے، اس سے اُن کی سیاسی بصیرت و فراست کا اظہار ہوتا ہے۔ مسلم لیگ اور کانگریس کی کشمکش کی پوری تاریخ تمثیلی کی مانند اُن کے سامنے ہے ہر گوشہ کو وہ یقین و اطمینان کے ساتھ منظر عام پر لاتے چلے گئے ہیں! کتاب کی زبان اور اندازِ بیان فاضل مصنف کی مشاقی اور سادگی و پرکاری کی شہادت دیتا ہے، بعض مقامات پر نازک باتیں بیان کی ہیں۔ مگر تحریر کی سادگی نے اظہار میں ذرا سی بھی تلخی پیدا نہیں ہونے دی۔

چند اقتباسات :—

- "خلافت کے رضاکار، خلافت کے کارکن، خلافت کے لیڈر دکھاوے کے نہیں تھے، خود غرض نہیں تھے ذاتی مفاد اور اغراض کے بندے نہیں تھے، جوش، کوشش اور جدوجہد اور اعتقاد و عقائد کے اعتبار سے بالکل مجاہد تھے، اگر اس وقت انہیں کوئی میدانِ جنگ میں لے جاتا تو یہ مسلمانوں کی قدیم مجاہدانہ روایات زندہ کر دیتے ——"
- "وہ جنگیں جو اناطولیہ اور تھریس میں ہو رہی تھیں، مسلمانانِ ہند کو اپنے گھروں کے صحن میں محسوس ہوتی تھیں، اور اُن کے اچھے بُرے نتائج سے وہ جذباتی طور پر اُتنے ہی متاثر ہوتے تھے، جتنے خود ترک ہوں گے۔"
- "مولانا محمد علی نہایت جذباتی، اشتعال پذیر، اشتعال انگیز زندگی اور موت سے لاپروا، ہر اس بنیاد کو

اکھاڑ پھینکنے کے لئے تیار، جس میں فساد ہو، ہر اُس طاقت سے تصادم کے لئے بے قرار جو اسلام اور مسلمانوں
کے مفادات کے خلاف ہو۔ جگر دار، دلاور، نڈر، طوفانوں اور طغیانی عناصر کی ہر صورت کا آمیز
ایک پیکر انسانی ہیں ـــــ مسٹر محمد علی جناح سخت معقولی اور ہر معاملے کو عقل و دلیل کے معیار پر پرکھنے
والے، تعمیر کے لئے بنے تھے اور تعمیری مزاج رکھتے تھے"

یہ کتاب پاکستان کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے، آنے والے مورخ اس سے استفادہ کریں گے اور مصنف کو
بہ تحسین سے یاد کیا جائے گا :

"۱۱۹۲ء میں ان پر قبضہ کر لیا اور بجائے کہرام کے دہلی کو اپنا مستقر بنا لیا" (صفحہ ۱)
کمپوزیشن کی غلطی معلوم ہوتی ہے، غالباً "سہسرام" ہوگا! جسے کمپوزیٹر نے "کہرام" بنا دیا۔

"ملک میں اختلال اور حکومت میں غیر مسلموں کا غلبہ ..." (صفحہ ۱۹) فاضل مصنف نے جگہ جگہ "اختلال" استعمال کیا ہے جو بعض
ان مقامات پر خاصی کھٹکتی ہے، "اختلال" کی بجائے انتشار اور اضطراب بھی استعمال فرما سکتے تھے ـــــ "یونان اور ترکیہ کے درمیان مبادلہ
دی ہوگا" (صفحہ ۱۲۵) عربی گرامر کے اعتبار سے "مبادلہ" ہی صحیح ہے مگر اردو روزمرہ "تبادلہ" ہے ـــــ "دنیا کی سنی آبادی خلیفہ کی
محفوظ اور غیر یقینی حیثیت پر بہت مضطر ہے" (صفحہ ۱۳۲) اردو شاعری میں "قلب مضطر" ہے "قلب بے قرار و مضطرب" بھی عام طور پر مروج ہے
۔ مگر جو اہل قلم "تبادلہ" کی جگہ "مبادلہ" لکھتا ہے اسے "مضطر" کی بجائے "مضطرب" لکھنا تھا۔ فاضل مصنف نے غالباً ہر مقام
مضطر کو "مضطرب" کے معنی میں استعمال کیا ہے ـــــ مثلاً۔ مسٹر جناح ہندو مسلم اتحاد کے لئے ایسے "مضطر" تھے (صفحہ ۱۵۶)
مسلم لیگ اور کانگریس کی روشیں معلوم ہونے کے بعد" (صفحہ ۲۱۴) "روش" کی جمع کون بولتا ہے ـــ

"مسلم لیگ کی طاقت اس درجے تک پہونچ سکی کہ حکومت برطانیہ کو وہ محسوس ہوئی (صفحہ ۵۵) یہ بڑا ہی کمزور انداز بیان ہے جس
پڑھنے سے مسلم لیگ کی طاقت کے بارے میں کمزور تصور قائم ہوتا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے زندگی کے آخر دور میں بھارت کی مسلم کش جابر حکومت کے ساتھ محکمہ تعلیم کے وزیر کی حیثیت سے جس نیاز مندانہ
ون کا مظاہرہ کیا وہ ان کی سیرت کا تاریک باب ہے ـــــ مگر فاضل مصنف کو اُن کے نام کے ساتھ "مولانا" کا لقب بالقصد ترک
یں کرنا چاہئے تھا، مخالفین سے انتقام لینے کا یہ طریقہ پسندیدہ نہیں ہے! سید حسن ریاض صاحب نے "تحریک خلافت" کے جس دور جہاد
تعریف و توصیف کی ہے، اس کو ابھارنے میں مولانا ابوالکلام آزاد کی معرکہ آرا تقریروں اور تحریروں کا بہت کچھ ہاتھ ہے! اس دور کے
نے علماء اور مسلمان لیڈر ہیں، جن میں مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریروں نے حق گوئی کی جرأت اور آزادی کا جذبہ پیدا کیا۔ مولانا آزاد کا
الہلال" اپنی جگہ ایک تحریک تھا!

مہاتما گاندھی کا ذکر اس کتاب میں اس انداز سے کیا گیا ہے جیسے ان کی پوری سیاسی زندگی "فریب کارانہ" زندگی تھی، کوئی شک
یں گاندھی جی ہندو قوم کے فرد تھے، اس لئے وہ ہندوؤں کے مفاد کو مقدم رکھتے تھے، اور ہندوستان میں ہندو قوم کا سیاسی غلبہ چاہتے
تھے! مگر اُن کی ذہنیت مسٹر پٹیل جیسی نہ تھی، پٹیل کی پالیسی کے تحت ہندوستان میں مسلمانوں کے خون سے آج تک جس طرح ہولی کھیلی جا
رہی ہے اور انہیں ہر طرح سے ذلیل، بے حوصلہ اور تباہ و برباد کیا جا رہا ہے، گاندھی جی اس ظلم و ستم کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ تو

ہجوم میں گولی کا نشانہ بنائے گئے کہ مہاسبھائی ہندو انہیں مسلمانوں کا ہمدرد اور محافظ سمجھتے تھے،

اس زمانے میں جب کانگریس میں مسلمان، ہندو اور سکھ شامل تھے اور دوش بدوش انگریز سے آزادی کے لئے آئینی جنگ لڑ رہے تھے، تو مہاتما گاندھی ——— ہندوستان کے سب سے بڑے لیڈر تھے، اور ان کی سیاسی فراست، تحمل اور خلوص سب کے نزدیک مسلّم تھا، مسلم لیگ کا جب زور ہوا تو مسلمانوں کی اکثریت کانگریس سے بے تعلق ہوگئی، مگر پھر بھی ہر صوبہ میں کانگریس کے ساتھ مسلمانوں کی ایک کسی تعداد میں وابستگی ضرور رہی اس پورے دور میں گاندھی جی کانگریس کے سرپرست رہے اور ان کی ذات انگریز کے ہندوستان سے رخصت ہونے تک متحدہ (غیر منقسم) ہندوستان کی سیاست کا محور اور مرکز تھی، " QUIT INDIA " کا ریزولیوشن گاندھی جی کے ذہن رسا کی ایجاد تھا، جس کے بعد انگریز کو ہندوستان چھوڑ دینے کا فیصلہ کرنا پڑا، ہندوستان کی آزادی میں گاندھی جی کا سب سے زیادہ حصہ ہے، جس کا انصاف پسند مسلمان (اہل قلم) کو اعتراف کرنا چاہئے۔

ہندوستان کا سب سے بڑا لیڈر ہونے کے باوجود انہوں نے سنت سادھوؤں جیسی مذہبی اور سادہ زندگی اختیار کرلی تھی، وہ مسلمان نہیں تھے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل سے احترام کرتے تھے، اپنی پرارتھنا میں انہوں نے قرآن کریم کی تلاوت کو بھی شامل کیا تھا۔ انہوں نے بعض اچھی باتیں اسلام سے لی تھیں، جب صوبوں میں کانگریس کی وزارتیں اول اول بنی ہیں تو گاندھی جی کا دھیان اشوک، ہرش، بکرماجیت اور راجہ رام چندر کی طرف نہیں گیا، انہوں نے کانگریسی وزیروں کو نصیحت کی کہ وہ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق کی پیروی کریں۔

اس کتاب میں بعض ایسے مقامات بھی ہیں جہاں گاندھی جی کی "ڈپلومیسی" بھی لکھا جاسکتا تھا مگر فاضل مصنف نے ڈپلومیسی کی بجائے "فریب" لکھا ہے، گاندھی جی کی شخصیت کی ان صفات کی اس کتاب میں کہیں جھلک آجاتی تو یہ کتاب اور زیادہ وقیع ہوجاتی اور مسلم لیگ کی وکالت میں ضرورت سے زیادہ شدت اور گاندھی جی جیسی نمایاں شخصیت کی واقعی صفات و خدمات کو نظر انداز کردینے کا مصنف پر الزام عائد نہ ہوتا ——— اس کا ہمیں بھی اعتراف ہے کہ بعض موقعوں پر گاندھی جی جو بھگت تھے "بگلا بھگت" نظر آتے ہیں!

"پاکستان ناگزیر تھا" اس کے مطالعہ نے ذہن و فکر کو ابھارا کہ ہم اپنے تاثرات اس موقع پر پیش کردیں، اور دل کی بات قرطاس و قلم تک لے آئیں!

ہندوستان تقسیم ہوچکا، پاکستان بن چکا، اب اگر کوئی اس طرز پہ سوچتا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کا فیڈریشن بن جائے دونوں ملک پھر سے ایک ہوجائیں۔ پاک و ہند کی فوج کو ایک ہائی کمان کے تحت کردیا جائے ——— تو ایسا شخص پاکستان کا دشمن ہے اور مسلمانوں کا بدخواہ ہے، اسلام کی نسبت سے پاکستان کی سرزمین ہمارے نزدیک مسجد کا درجہ رکھتی ہے جس کا ایک ایک ذرہ مقدس ہے، پاکستان ہندوستان سے الگ ایک مستقل ملک اور خود مختار حکومت ہے، پاکستان کی سالمیت وحدت، استقلال، اور خود مختاری کی حفاظت ہمارا ایمان ہے، جس کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتے ہیں اور دینی چاہیئے!

مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان جن دنوں کشمکش برپا تھی، راقم الحروف نے نواب بہادر یار جنگ مرحوم کی صدارت میں سیاستی مسلم لیگ کے بعض جلسوں میں اور جبل پور اور ناگپور وغیرہ مقامات پر جو مسلم لیگ کی عظیم الشان کانفرنسیں ہوئی ہیں ان میں نظمیں پڑھی ہیں، ہمارے گاؤں میں مسلم لیگ کے نیشنل گارڈ کا سالار میرا چھوٹا بھائی تھا، پاکستان کے مطالبہ سے ہماری دلچسپی کا سبب یہ

تھا کہ مسلم لیگی لیڈروں کے وعدوں کے مطابق یہاں اسلامی حکومت قائم ہوگی ـــــ ان مقدمات کو ذہن میں رکھ کر میری گزارشوں کو غور سے پڑھئے ۔

تقسیم بنگال کی منسوخی ہے دیوناگری کو اُردو کی جگہ مسلط کرنے کی کوشش ہے ـــ اس سے ہی اندازہ ہوگیا تھا کہ ہندوؤں کی بام سیاست کی ہوا کا رخ کیا ہے، پھر آرہ کٹارپور کے فسادات میں ہندوؤں نے جس سفاکی اور بے رحمی کا مظاہرہ کیا اس نے خاصی تلخی پیدا کردی، کانگریس اور خلافت کے دور میں اتحاد کی صورت پیدا ہوئی مگر نہرو رپورٹ نے اس اتحاد میں رخنہ ڈال دیا ، اس کے بعد جب صوبوں میں کانگریس کی وزارتیں بنی ہیں، تو کانگریسی وزارتوں نے مسلمانوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا ان باتوں نے "تقسیم ہند اور قیام پاکستان" کے نظریہ اور مطالبہ کو تقویت دی اور سید حسن ریاض صاحب کے بقول "پاکستان کا بننا ناگزیر ہوگیا ۔

مسلم لیگ اس دعوے کو لیکر اٹھی تھی کہ پاکستان میں اسلامی حکومت قائم ہوگی ، وہاں مسلمان اپنے دین وایمان اور اسلامی مطالبات کے مطابق زندگی بسر کریں گے ـــ مسلمان اسلام کے نشہ سے سرشار ہوکر مسلم لیگ کے حامی ہوگئے ! ہندوستان میں مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی وہ واحد جماعت تھی جو کانگریس کے مقابل صف آرا تھی ۔

ہندو ، پاکستان کے نام سے چڑتا تھا ، "پاکستان" ہندو کے لئے سب سے بڑی گالی تھی ، ہندو "پاکستان" سے جس قدر وحشت اور نفرت کرتا تھا اسی قدر مسلمان پاکستان کے مطالبہ میں شدید ہوتے جاتے تھے ! اور ـــ

"لے رہیں گے پاکستان"

مسلمانوں کا قومی نعرہ بن گیا تھا ۔

مسلم لیگ کے عروج سے پہلے مسلمانوں کے لیڈر مذہبی افراد ہوتے تھے ، خدام کعبہ ، خلافت اور کانگریس کے زمانے کے تمام مسلمان لیڈر دینی مزاج اور دینی معاشرت رکھتے تھے ، یہاں تک کہ بہت سوں کے چہروں پر ڈاڑھیاں تھیں ! مگر مسلم لیگ میں شامل ہوکر مسلمانوں کی قیادت کا معیار ہی بدل گیا ۔ یہ تبدیلی مسلمانوں کے دینی رجحان و فکر پر اثر انداز ہوئی ۔

مسلم لیگ میں مسٹر محمد علی جناح ، نوابزادہ لیاقت علی خاں ، نواب محمد اسمٰعیل خاں ، عبدالرؤف شاہ ، راجہ صاحب محمود آباد ، اور مولانا حسرت موہانی جیسے اکابر رہنما بھی تھے ، جنہوں نے مسلم لیگ سے کوئی منفعت حاصل نہیں کی بلکہ ان میں سے بعض نے تو مالی قربانیاں بھی دیں ، مگر مسلم لیگ کے کارکنوں کا عام مزاج یہ تھا کہ وہ ایثار و قربانی کی بجائے "حصول منفعت" کو ترجیح دیتے تھے ، اور یہ منفعت روپیہ پیسہ سے کر شہرت اور نام و نمود تک کو محیط تھی ، مسلم لیگ کے عہدوں اور مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کی رکنیت کے لئے کنویسنگ ! کانفرنسوں میں اسٹیج پر نمایاں جگہ حاصل کرنے کے لئے تگ و دو ! نواب چھتاری ، نواب سر محمد یوسف اور خضر حیات خاں جیسے بڑے لوگوں نے اپنے مفاد کی خاطر مسلم لیگ کے حکم کو پس پشت ڈال دیا ، مولوی فضل الحق مرحوم کئی بار مسلم لیگ میں آئے اور علیحدہ ہوئے ! بعض مسلم لیگی مولویوں کا یہ عالم تھا کہ وہ سیرت النبی کے جلسوں میں بھی نذرانہ کے نام پر منظور قبول کرتے تھے اور مسلم لیگ سے بھی سفر خرچ وصول فرماتے تھے ، حصول جاہ اور حصول منفعت کی عادت پاکستان بننے کے بعد ایکا ایکی کس طرح ایثار و خلوص سے بدل جاتی ، مسلم لیگی ورکر اصول وعقیدہ کو نظر انداز کرکے جاہ و دولت کا ساتھ دیا ، مثلاً سہروردی صاحب کا دور حکومت آیا تو مسلم لیگ کے خازن جیسے بڑے عہدہ عوامی لیگ میں شامل ہوگئے اور زمانہ کی ہوا کے ساتھ اپنی عقیدتوں کا رخ بدلتے رہے آج کتنے قدیم مسلم لیگی ہیں جن کے ضمیروں کی دھڑکنے

خرید و فروخت ہوتی رہی ہے اور کتنوں کی زندگی اسی سیاسی سوداگری کے سہارے بسر ہو رہی ہے۔

قائداعظم کوئی شک نہیں مسلمان قوم کے مخلص ہی خواہ تھے، اُن کی سیاسی بصیرت کا بھی عوام و خواص لوہا مانتے تھے، انگریز اور ہندو دو بڑی طاقتوں سے سیاست کے میدان میں انہوں نے معرکہ آرائی کی اور شدید کشمکش کے بعد بالآخر ہندوستان کو تقسیم کرا کے چھوڑا اور پاکستان کی مملکت وجود میں آگئی، مگر وہ مذہبی آدمی نہ تھے، اسلام کے تقاضوں سے زیادہ مسلمان قوم کا سیاسی فائدہ اور مادی منفعت و خوشحالی اور خود مختاری و آزادی اُن کے پیش نظر تھی پاکستان حاصل کرنے کے لئے وہ بہت زیادہ بے چین و مضطرب تھے! ۱۱ر جون ۱۹۴۷ء کو دہلی کے امپیریل ہوٹل میں مسلم لیگ کی تنظیمی کمیٹی کا جو اجلاس ہوا تھا اس میں مسٹر فاری نے کہا تھا کہ اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کے تحفظ کا انتظام کئے بغیر پاکستان قبول کرنے میں عجلت نہ کی جائے، اور پورا پنجاب اور پورا بنگال پاکستان میں شامل ہونا چاہیے، مگر رائے شماری میں صرف سات ارکان نے اس گروپ کا ساتھ دیا۔ تقسیم ہند کی عجلت نے مسلمانوں کے لئے بڑی مشکلات اور مصیبتیں پیدا کر دیں۔

متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں کی اکثریت ذہول میں مبتلا ہو گئی اور اس طرز پر بہت کم لوگوں نے سوچا کہ وہ مسلم لیگ جس کی رکنیت کے لئے نماز روزے کی اولین شرطیں بھی ضروری نہیں ہیں، پاکستان بننے کے بعد حکومت کی زمام اسی کے ہاتھ میں آئے گی تو وہ دینی حکومت کس طرح قائم کر دے گی؟ جن رہنماؤں کے گھروں میں پردہ نہیں ہے اور نامحرم مرد و زن کے ملنے جلنے میں جو کوئی عیب محسوس نہیں کرتے ان کے ہاتھوں پاکستان میں وہ معاشرہ کا ہے کو قائم ہونے لگا، جس کی بنیاد اسلامی اخلاق و تقویٰ، جلباب و خمار کی احتیاط، غض بصر، نامحرم مرد و زن کے درمیان دوری و حد بندی اور عدم اختلاط اور تبرج جاہلیت کی مخالفت پر ہے۔ جنہوں نے استطاعت بلکہ امارت و ثروت کے باوجود حج نہیں کیا، نماز روزے کی پابندی جن کا شعار نہیں رہا جو اپنے مال سے زکوٰۃ نہیں دیتے تھے، ان سے ایک نیشنلسٹ مسلم حکومت قائم کرنے کی توقع تو کی جا سکتی تھی مگر دینی نظام کا قیام اُن کے بس کا کام نہ تھا کیونکہ وہ مسلمان قوم کے ترفہ ہی کو اسلام کی سربلندی کا سبب سمجھتے تھے۔

ہندوستان کے جو علماء کانگریس کے ساتھ تھے ان پر ہم بھی طنز کیا کرتے تھے ۔۔۔ مگر اب تجربہ کے بعد اُن کا یہ قول یاد آتا ہے کہ "ہمیں یقین ہو جائے کہ پاکستان تو بڑی چیز ہے اگر ضلع گوڑ گانواں میں اسلامی حکومت قائم ہونے والی ہے تو ہم کانگریس کا ساتھ چھوڑنے کے لئے تیار ہیں۔ مگر . . . . !"

مسلم لیگ نے جس پاکستان کا مطالبہ کیا تھا، اُس میں پانچ چھ کروڑ کی آبادی کے رقبہ کی کمی مسلم لیگ کے اکابر نے گوارا کر لی، حالانکہ یہی وقت مطالبہ پر جمے رہنے اور قربانی دینے کا تھا ۔۔۔ اس موقعہ پر یہ کہا گیا کہ ہمیں تو پاکستان چاہیے، چاہے وہ لولا لنگڑا ہی کیوں نہ ہو۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی تلخیاں جتنی تند و تیز ہوتی گئی ہیں اُسی قدر پاکستان کے مطالبہ میں قوت پیدا ہوئی ہے، نفرت اور تلخی کا یہ عالم تھا کہ مرکز میں کانگریسی حکومت جو قائم ہوئی اور اس میں سر شفاعت احمد خاں نے وزارت قبول کر لی، اس پر ایک مسلم لیگی نے شملہ میں اُن کے چھرا گھونپ دیا، اس عالم میں قوم کی کشتی کے جو ناخدا اور مسلم لیگ کے اکابر و قائدین تھے ان کو یہ سوچنا تھا کہ ہندو جو پاکستان کے نام سے چڑتا ہے اور پاکستان کے مطالبہ نے اُس کی مسلم دشمنی میں اور شدت پیدا کر دی ہے، وہ ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کا قیام خاموشی کے ساتھ کس طرح گوارا کر لے گا، لہٰذا مسلمانوں کے جان و مال اور عصمت و آبرو کے تحفظ کے لئے مناسب تدبیریں اختیار کر لی جانی چاہئیں تھیں۔ یہ تدبیریں کیا ہو سکتی تھیں اس کی ذمہ داری مسلم لیگ کے رہنماؤں پر عائد ہوتی تھی۔

پاکستان بننے کے دوران مسلمانوں کا جو مالی نقصان، پردہ نشینوں کی عصمت دری اور بے آبروئی اور خون خرابہ ہوا ہے اُس کے تصور سے بیس سال کی مدت کے بعد بھی روح لرز جاتی ہے! اس تباہی کے بعد بھی پاکستان میں اسلام قائم نہیں ہوا، حالات روز بروز بگڑتے ہی چلے گئے! یہاں تک کہ لسانی اور صوبائی تعصبات جن کا پاکستان بننے سے قبل کہیں وجود تک نہ تھا حشرات الارض کی طرح اُبھر آئے! ناچنا ناطوائفوں کا پیشہ تھا جن کو سوسائٹی میں ذلیل سمجھا جاتا تھا مگر پاکستان کی درسگاہوں میں مسلمان لڑکیوں کے لئے رقص و سرود "آرٹ" سمجھا جانے لگا، انگریزی دور کے کسی "منکر" پر کوئی پابندی نہیں لگائی گئی ۱۹۴۷ء سے پہلے کیا کوئی مسلمان یہ کفریہ کلمات بکنے کی جرأت کرسکتا تھا کہ قرآن کے احکام میں زمانہ کے مطابق تبدیلی کی جاسکتی ہے۔ (استغفر اللہ)

اُردو زبان جو مسلم لیگ کے مطالبہ میں شامل تھی نہ اُس کو یہاں اُس کا جائز مقام دیا گیا، نہ اسلام قائم ہوا۔ دوسری طرف ہندوستان کے مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جارہے ہیں، اُن بے چاروں کی مظلومیت کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے مگر ہم ان کے لئے کچھ نہیں کرسکتے! لاگبہ سے لے کر ریواڑی تک "اللہ اکبر" کی صدا بلند نہیں ہوتی، سینکڑوں مسجدیں گھوڑوں کے اصطبل اور مویشیوں کے باڑے بنی ہوئی ہیں، ساٹھ ہزار کے قریب مسلمان عورتیں ہندوؤں اور سکھوں کے قبضہ میں ہیں اور سینکڑوں مسلمان شدت حالات کی تاب نہ لاکر مرتد ہوچکے ہیں۔

یہ بات اُس وقت بیشک سوچنے کی تھی، جب انگریز ہندوستان سے رخصت ہونے کی تیاری کررہا تھا۔ کہ مرکز میں مسلمانوں کو چالیس فی صد یا اس کے لگ بھگ حصہ دے دیا جاتے، مسلمانوں کی اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کی وزارتیں رہیں اور فوج، پولیس میں مسلمان رہیں، تو...... ! مگر اب اس طرز پر سوچنا بیکار ہے، پاکستان بن چکا، اس کی حفاظت ہمارا قومی اور دینی فرض ہے، اس کی سالمیت پر ہم کسی طرح آنچ نہ آنے دیں گے ——— !

سید حسن ریاض ہوں، جناب ظفر احمد انصاری یا مفتی مولانا محمد شفیع ہوں ان جیسے بزرگوں کے اخلاص میں شبہ نہیں کیا جاسکتا، اس مزاج و کردار کے حضرات نے پاکستان بننے کے بعد کوئی مادی فائدہ بھی حاصل نہیں کیا، انہوں نے پاکستان میں اسلامی حکومت قائم کرنے کی اُمید میں مسلم لیگ کا ساتھ دیا، جس کا اجر انہیں ملے گا کہ نیت بخیر تھی، مگر یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ سید حسن ریاض صاحب نے اپنی کتاب میں اس "ذہول" کی طرف کہیں اشارہ تک نہیں کیا، جس میں نہ صرف وہ بلکہ کروڑوں مسلمان مبتلا ہوگئے تھے! پاکستان بننے کے بعد اب تک کیا نتائج سامنے آئے ہیں، اس غم کا اظہار بھی اُنہیں کرنا تھا۔ تحریک پاکستان کے سلسلہ میں جو کچھ ہوا اس میں فخر و تاسف کا کیا تناسب ہونا چاہئے، اس کا فیصلہ ہم ان دانشوروں کے ضمیر پر چھوڑتے ہیں ـ

خاتون پاکستان کا نزول قرآن نمبر

مدیر:- شفیق بریلوی، ضخامت ۱۸۴ صفحات

(سرورق دیدہ زیب) ہدیہ دو روپے ۵۰ پیسے

ملنے کا پتہ:-

۵- گارڈن، کراچی

دین و اخلاق پر ماہنامہ "خاتون پاکستان" کے متعدد "خاص شمارے" شائع ہوکر مقبول ہوچکے ہیں۔ یہ شمارہ "نزول قرآن نمبر" اپنے موضوع پر قابل قدر علمی و دینی پیشکش ہے

آٹھویں اور نویں صدی ہجری میں "قرآن مجید" خط بہار" میں لکھا جاتا تھا، اُن کے ایک صفحہ کا عکس اس شمارہ کی خاص زینت ہے۔

جناب شفیق بریلوی نے بڑے سلیقہ سے اس شمارے کو مرتب کیا ہے اُن کا اداریہ بھی دینی نقطہ نگاہ سے فکر انگیز ہے! زیادہ تر مضامین مشاہیر علماء کی کتابوں سے منتخب کئے گئے ہیں۔ بعض مقالے نئے بھی ہیں، عنصر نظم بھی بلند ہے، اسلاف نے قرآن کریم کو جس طرح سمجھا ہے اُس کی جھلکیاں "نزولِ قرآن نمبر" میں نظر آتی ہیں! اللہ تعالیٰ "خاتون پاکستان" کے ادارہ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

نیشنل اور الفرڈ
ILFORD
ILFORD
HP3
ROLL FILM
ہر وقت
آپ کی
مسرتوں
کے ساتھی!
N
رضوی برادرز لمیٹڈ
کراچی — لاہور — ڈھاکہ

بے مثل کی مثال
دیں تو کیسے ؟

گرمیوں میں
بہار
کا لطف!
گرمی کی زحمت اور سختی سے بچنے کے لئے
روح افزا کی تازگی بخش تاثیر سے فائدہ اٹھایئے اور
اس موسم میں اس کا مسلسل استعمال رکھئے۔ یہ خوش ذائقہ
فرحت بخش مشروب ہر شخص کو بھاتا اور گرمی میں
بہار کا سماں پیدا کرتا ہے۔
کوئی اور مشروب اس کا مقابل نہیں۔
روح افزا
مشروب مشرق
ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان
کراچی - لاہور - ڈھاکہ - چٹاگانگ

ترتیب

فی پرچہ :- ۶۲ پیسے / پبلشر :- ماہر القادری / چندہ سالانہ :- ۷ روپے

مقامِ اشاعت :- دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی

باہتمام شفیع احمد صدیقی پبلشر ماہر القادری نے فاضل ٹریڈنگ پریس کراچی سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

برطانوی سامراج کی شکست اور ہندوستان کی آزادی مسلمانوں اور ہندوؤں کے اتحاد کا ثمرہ ہے، ان دونوں قوموں نے انگریز سے
بہ بشانہ آہنی جنگ لڑی ہے، مسلمان اگرچہ اقلیت میں تھے مگر جنگ آزادی میں ان کے کارنامے "اکثریت" (ہندو قوم) سے بڑھ چڑھ کر
مسلمانوں کی شرکت سے پہلے کانگریس ایک چھکڑا تھا جسے مسلمانوں نے برق رفتار بنا یا" حصولِ آزادی کی جدوجہد میں مسلمانوں کے خلوص
عالم تھا کہ سوامی شردھانند کو انہوں نے جامع مسجد کے منبر پر تقریر کرنے کے لئے بٹھا دیا، مسلمانوں کے اس جذبہ اتحاد اور خلوص و
ت کا انہیں یہ صلہ ملا کہ انہی شردھانند جی نے نومسلم راجپوت ملکانوں میں شدھی کی تحریک شروع کردی، اس دور میں جب کہ مسلمان اور
و شیر و شکر تھے اور برصغیر ہند میں چاروں طرف اتحاد کا دور دورہ اور بھائی چارے کا چلن تھا، لالہ لاجپت رائے اور پنڈت مدن موہن
یہ جیسے نیتا ہندوؤں میں موجود تھے، جن کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف بغض و تعصب پایا جاتا تھا، ہندو مسلم اتحاد میں اُن کی شرکت
ناخواستہ تھی اور وہ طوعاً و کرہاً اُس دور کے حالات کو نباہ رہے تھے۔

اس کے بعد ہندو مہا سبھا، شدھی اور سنگٹھن کی تحریکوں نے مسلمانوں کے خلاف کھل کر بغض و نفاق کا مظاہرہ کیا، ڈاکٹر مونجے اور
ت دیگر ان تنظیموں کے سرپرست تھے! جب صوبوں میں کانگریس کی وزارتیں قائم ہوئی ہیں تو یو۔پی کے پنڈت گوبند بلبھ پنت اور صوبہ
سط کے مسٹر شکلا جیسے کانگریسی لیڈروں کی ذہنیتیں بے نقاب ہوگئیں کہ یہ تو ہندو مسلم اتحاد کی مصنوعی کھالیں اوڑھے ہوئے تھے، ان کا اصل
ے تو مسلم دشمنی تھا! کانگریس کے صفِ اول کے رہنماؤں میں سردار پٹیل مہا سبھائی ذہن رکھتے تھے، تقسیمِ ہند کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں
ی و غارت گری، آگ اور لہو کی جن منزلوں سے گزرنا پڑا، یہ سب کچھ سردار پٹیل کی عین منشا کے مطابق ہوا!

گاندھی جی اور پنڈت نہرو ہندوؤں کا سیاسی غلبہ تو چاہتے تھے، مگر خون خرابے کو وہ ناپسند کرتے تھے، گاندھی [illegible] مسلمانوں کی
مدد کے جرم میں گولی کا نشانہ بننا پڑا۔ اُس وقت بھارت میں یہ "ذہن" بن چکا تھا کہ گاندھی جی کے قاتل گوڈسے کو جن سنگھیوں نے
رد قوم کا ہیرو قرار دیا اور گاندھی جی کے قتل پر خوشی کی مٹھائیاں بانٹی گئیں۔

ظاہر ہے کہ جس قوم نے اپنے سب سے بڑے نیتا اور محسن و مربی کو اس جرم میں قتل کر دیا ہو کہ وہ مسلمانوں کے قتل و غارتگری کو ناپسند
یا کرتے تھے، ایسی قوم کا مسلمانوں کی دشمنی میں راکشس بن جانا توقع کے خلاف نہیں ہے!

پنڈت نہرو نے جن سنگھیوں کی اس خون آشام ذہنیت کی مذمت کی مگر یہ مذمت اور ملامت صرف لفظوں تک محدود تھی، عملی طور پر وہ اس خونریز فتنہ کی روک تھام نہ کر سکے! کیوں نہ کر سکے! اس کے بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں ــــ یہ کہ وہ مسلمانوں کی ہمدردی میں اپنے اقتدار کو خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتے تھے ــــ حکومت کے عمال کے دلوں میں مسلم دشمنی رچ گئی تھی، اُن کا مزاج جن سنگھی بن چکا تھا، اس طرح حکومت کی مشینری پر پنڈت نہرو کا کنٹرول نہیں رہا تھا ــــ جن سنگھیوں کے معاملے میں نہرو جی کی پالیسی ڈھیل اور درگذر کی پالیسی تھی وہ جو شیخ سعدی کی منظور رہا ہے کہ :-

سرچشمہ باید گرفتن بہ میل

اس نصیحت پر کانگریسی اربابِ اقتدار نے عمل نہیں کیا، وہ حکومت کی طاقت سے کام لیتے تو اس فتنہ کا سدباب ممکن تھا، انہوں نے دانستہ یا اپنی غفلت و تساہل کے سبب اس فتنہ کو ڈھیل دی، فسادات ہوتے رہے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جاتی رہی، مگر ان نیتاؤں کے اندر مظلوموں کے بچاؤ اور اُن کی دادرسی کا کوئی جذبہ بیدار نہیں ہوا، ان خونریز فسادات کی تحقیقات کے لئے صوبوں کے مرکزوں سے کوئی ذمہ دار عہدیدار تک نہیں بھیجا گیا، صوبائی اسمبلیوں میں کانگریسی وزیروں نے ایک حرف بھی ان فسادات کی مذمت میں نہیں کہا اور جب پارلیمانی قانون و آداب نے انہیں مجبور کر دیا تو ان مہاپرشوں نے واقعات کی شدت کو معمولی، ہلکا اور غیر اہم ثابت کرنے اور دکھانے کی کوشش کی! حکومت کی اس پالیسی نے مفسدوں، قاتلوں اور لٹیروں کی ہمت بڑھائی اور حوصلہ افزائی کی۔

صوبائی حکومتوں کو بار بار بتایا گیا، ثبوت پیش کیا گیا کہ فلاں فلاں فساد میں سرکاری عہدیداروں نے فسادیوں اور لوٹ مار کرنے والوں کا ساتھ دیا ہے، اُن سے تو ہر بار پرسش ہونی چاہئے ــــ مگر حکومتوں نے ان مجرم عہدیداروں کا تبادلہ تک نہیں کیا۔

یہ صدہا فسادات یک طرفہ تھے، ہندوؤں نے مسلمانوں پر حملہ کیا تھا، اُنہیں مارا، کاٹا، لوٹا اور جلایا تھا، بہت سے مقامات پر مسلمان عورتوں کی عصمت دری بھی کی گئی۔ پولیس بعض مقامات پر تو تماشائی بن کر سب کچھ دیکھتی رہی لیکن اکثر فسادات میں اُس نے فساد کرنے والوں کا ساتھ دیا، اُنہیں اُکسایا، اُن کی پشت پناہی کی، اُنہیں کمک پہونچائی! پھر ستم بالائے ستم یہ کہ ظالموں سے پوچھ گچھ تک نہیں کی گئی مسلمان ہی اُلٹے پکڑے گئے! ہندو جو کھلے ہوئے قاتل اور لٹیرے تھے، وہ جہاں کہیں گرفتار ہوئے بھی تو انہیں معمولی سی تفتیش کے بعد چھوڑ دیا گیا، جن کو ماتحت عدالتوں سے سزا ہوئی وہ عدالت بالا میں جا کر بری ہو گئے!

تقسیم ہند کے بعد کئی سال تک جن سنگھی اور مہاسبھائی یہ فساد انگیز شوشہ چھوڑتے رہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو بھارت سے اپنی وفا کا ثبوت دینا چاہئے، اُن کی وفاداری مشکوک اور مشتبہ ہے، کانگریسی لیڈروں اور اربابِ حکومت نے بھی جن سنگھیوں کے اس نعرے کی لے میں لے ملا دی! اس چیز نے صورتِ حال کو خاصہ سنگین بنا دیا! اس قسم کی باتوں اور حرکتوں نے مفسدوں کو بڑھاوے دئے، اُن کے حوصلے بلند کئے اور مظلوم مسلمانوں کو گھبرا دیا۔

جن سنگھیوں اور مہاسبھائیوں نے اس بیس سال کی مدت میں تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ اسلام، پاکستان اور ہندوستانی ... مسلمانوں کے خلاف مسلسل پروپیگنڈہ کیا ہے! بھارت کو "اکھنڈ" بنانے، پاکستان کو دخاک بدہن گستاخ) تہس نہس کرنے اور ہندو میں شامل کرنے کی تحریک ہمیشہ رواں دواں رہی ہے! محمد بن قاسم اور محمود غزنوی سے لیکر اورنگ زیب تک مسلمان فرمانرواؤں کے خلاف زہر اُگلا گیا اور اُن کے ہر فعل اور حرکت کی ذمہ داری ہندوستانی مسلمانوں کے سر ڈالی گئی کہ یہ ان ہندوکش بادشاہوں کے وارث، جانشین

ـدشناس اور عصبیت سند میں یہ لغو بیانی خبث نفس کی اس سطح تک پہونچ گئی کہ خاتمِ رسالت مآب (صلی اللہ علیہ وسلم) تک کی متعدد بار
ہین کی گئی ، ہندو جنتا کو تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ اشتعال دلایا گیا ، اور مسلمانوں کی تباہی اور قتل و غارتگری پر اُنہیں کھلے
زانے اور ڈنکے کی چوٹ اُبھارا گیا ، ہندو پریس نے ملک کی فضا کو مسلمانوں کے خلاف بگاڑنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی ، اس قسم کی تحریریں
اور تقریریں اس قابل تھیں کہ اُن کا نوٹس لیا جاتا ، اُن پر احتساب کیا جاتا ، مگر نہیں کیا گیا ۔ قانونِ امنِ عامہ کی یہ خلاف ورزی ہوتی
رہی اور مذہبی تعصب کا یہ زہر بھارت کی آب و ہوا میں گھلتا اور سرایت کرتا رہا ۔ حکومت پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ امنِ عامہ کے تحفظ کے
لئے ہندو تعصب کے علاوہ اپنی طاقت کو بھی کام میں لائے ، بھارت میں حکومت اپنی طاقت کو کام میں لانا یا تو بھول گئی یا پھر مفسدوں کی
شرانگیزیوں سے دانستہ تغافل برتا گیا ۔ اس پالیسی کا یہ نتیجہ ہوا کہ حکومت کے کارپردازہ جن سنگھی فکر سے متاثر ہوتے چلے گئے اور آج ہندوستانی
حکومت کے کارکنوں کی اکثریت جن سنگھی مزاج رکھتی ہے اور مسلمانوں کی تباہی اور غارت گری انہیں دل سے پسند ہے ؛ جب کسی ملک کی
عدلیہ اور انتظامیہ دونوں کی دونوں متعصب اور ایک فرقہ کی دشمن ہو جائیں تو پھر اُس ملک میں انصاف سے مایوس ہو جانا چاہئے !

بھارت کے محکمہ تعلیم نے اسکولوں اور کالجوں میں ایسا نصاب مرتب کیا ، جن میں مسلمانوں کے عقائد اور تاریخ کو جان کر مسخ کیا
گیا ، جس کے مطالعہ سے ہندوؤں کی نئی نسل میں مسلمانوں کے خلاف نفرت و عداوت بلکہ انتقام کے جذبات پیدا ہوئے !

اُردو کے ساتھ اس تصور کے پیشِ نظر دشمنی اختیار کی گئی کہ یہ مسلمانوں کی زبان ہے ، ہٹ دھرمی اور دھاندلی کی حد ہو گئی کہ یو۔ پی
میں اُردو زبان کو کوئی حیثیت نہیں دی گئی —— حکومت کی اس روش نے مذہبی تعصب اور فرقہ وارانہ منافرت کو غذا پہونچائی !

سرکاری محکموں میں مسلمانوں کی ملازمتوں کا تناسب رفتہ رفتہ کم ہوتا چلا گیا ، یہاں تک کہ بعض دفتروں اور سرکاری اداروں خاص
طور سے پولس اور فوج میں یہ تناسب صفر کی حد تک پہونچ گیا ، ملازمتوں کے علاوہ تجارت و معیشت کی راہیں بھی مسلمانوں پر تنگ کی گئیں
ہندو اکثریت کا وہ رویہ کہ مسلمانوں کے ایمان ، جان و مال اور عزت و آبرو کی دشمن بلکہ قاتل ، دوسری طرف حکومت کی یہ پالیسی کہ مسلمانوں
کو ہر طرح سے ذلیل ، بے حوصلہ اور نادار و محتاج بنا دیا جائے تاکہ وہ کسی بڑے سے بڑے ظلم پر فریاد کرنے کے قابل بھی نہ رہیں اور اپنی
پریشانی ، بدحالی اور آذوقہ جات کی محتاجی کے سبب ہندو سماج میں جذب ہوتے چلے جائیں اور خود اپنی انفرادیت اور شخصیت کا شعور و
احساس ہی اُن کے اندر باقی نہ رہے ۔

اگر بھارت کی حکومت گاندھی جی کی پالیسی پر عمل کرتی تو وہ "سیکولرزم" کے تقاضوں کو پورا کر سکتی تھی ; مگر اُس نے گاندھی جی کی
پالیسی کو پس پشت ڈال کر سردار پٹیل کی حکمتِ عملی کو اپنایا ، جس نے مذہبی تعصب کو ہوا دی اور مسلمانوں کی تباہی اور بربادی کو ہندو جنتا
(اکثریت) کا عقیدہ بنا دیا ۔

جن سنگھیوں نے مسلمانوں کے خلاف قتل و غارتگری کا جو محاذ قائم کیا ہے ، اُس نے بھارت کے طول و عرض میں لاقانونیت پیدا کر دی
ہے ، بعض شہروں میں صوبائی وزراء بلکہ مرکز کی وزیراعظم کے خلاف کالی جھنڈیاں ہی نہیں لہرائی گئیں بلکہ پتھراؤ تک ہوا ہے ، بھارت کی
لوک سبھا میں جو شرمناک مناظر سامنے آتے رہے ہیں ، انہوں نے جمہوریت کو ذلیل کیا ہے ، عوامی حکومت کے نام کو بٹہ لگایا ہے ۔ اور سیکولرزم کی
مٹی پلید کی ہے ، آزادی کوئی تنگ نہیں اپنی تمام وسعت کے باوجود شرافت و اخلاق کے کچھ ضابطے اور حدود بھی رکھتی ہے ، مسلمانوں کی دشمنی میں
ہندو اکثریت نے ان ضابطوں کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں اور ان حدود کو ملیامیٹ کر دیا ، انہوں نے شہریت اور ہمسائیگی کے معروف حقوق

کو بھی بے دردی کے ساتھ پامال کیا، یہاں تک کہ دستور و قانون اور حدود اخلاق کے مقابلے میں بغاوت و سرکشی اُن کی عادت بن گئی، اور جب اس فسادخوردہ ذہنیت اور باغیانہ روش کی زد، بھارت کے ارباب کار کے وقار و اقتدار پر پڑنے لگی۔ تو وہ چونکے مگر اُس وقت چونکہ جب پانی سر سے گذر گیا۔ اور حالات کا قابو میں رکھنا شاید اُن کے بس میں بھی نہیں رہا، تقریباً ایک سال سے یہ دیکھنے میں آرہا ہے کہ بعض وزیروں نے ان خونریز فسادات پر اظہار ملامت بھی کیا ہے، مسلمانوں کے خون خرابے کے لئے تحقیقاتی کمیشن بھی مقرر ہوئے ہیں۔ ایک دفعہ پر ہندوستان کی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی بھی پہونچی ہیں، مگر اس کو کیا کیجئے حکومت کے کارندے اور عمال ذہنی طور پر جن سنگھی بن گئے ہیں اُن کے دلوں میں یہ بٹھا دیا گیا ہے کہ مسلمان ملیچھ ہیں اور ان ملیچھوں کو ہر طرح سے نقصان پہونچانا اور تباہ و برباد کرنا بہت بڑے پن کا کام اور ہندوؤں کے دھرم کا تقاضا ہے! صورت حال یہ ہے کہ ان معاملات میں مرکزی حکومت کے فرمان کی صوبائی حکومتیں پروا نہیں کرتیں اور صوبائی حکومتوں کے احکام کو ضلع اور تحصیل کے عہدیدار ردی کی ٹوکری میں ڈال دیتے ہیں، جن سنگھ کے لیڈر جو لائن ان کے لئے تجویز کرتے ہیں اُس پر عملدرآمد کیا جاتا ہے۔ اس وقت بھارت کی اصل طاقت جن سنگھی ہیں۔ انہی کے چشم و ابرو کی جنبش و ایماء پر ہندوستان کی انتظامیہ گردش کرتی ہے۔ مسلمانوں کے ہر قتل کے بعد جن سنگھی اپنی طاقت کو بڑھتا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے خون سے جب بھی ہولی کھیلا جاتی ہے۔ جن سنگھیوں کی ہر دلعزیزی میں اضافہ ہو جاتا ہے، خود کانگریسیوں کی اکثریت ہندو مہاسبھا راشٹریہ سیوک سنگھ اور جن سنگھ کا رنگ اختیار کر چکی ہے، راجگوپال اچاریہ، جے پرکاش نرائن، پنڈت سندرلال اور مسٹر سنہا جیسے پرکھی نیتا اور انسانیت دوست لوگ اب بھارت میں کم ہی پائے جاتے ہیں، مسلمانوں کی ہمدردی اور مدافعت کے معاملے میں، ان لیڈروں کی بھی کچھ نہیں چلتی، غالباً اسی لئے ان میں سے بعض بیچن پرشوں نے چپ سادھ لی ہے جیسے انہوں نے مونابرت رکھ لیا ہو —— بھارت اگر "گاندھی ازم" کو اپناتا تو دنیا میں اُس کا بڑا نام ہوتا مگر اس راہ کو چھوڑ کر بھارت کی اکثریت نے وہ راستہ اختیار کیا ہے جو دہشت گردوں، ظالموں، قاتلوں اور لٹیروں کا راستہ ہے!

یہ سفاکی اور بے دردی؟

ایک مسلمان لب طلی اپنا سامان لے کر کسی دوسرے گاؤں میں پھیری کے لئے گیا اور پھر واپس نہیں آیا کسی میدان میں مسلمان کی لاش پڑی ہوئی ملی۔ مسلمان نوخیز دانے کو ہندو طالب علموں نے لوٹ لیا، دیہات میں مسلمانوں کی کھڑی ہوئی فصلیں کاٹ لی گئیں یا اُن میں ہندوؤں نے اپنے جانور چرنے کے لئے چھوڑ دیئے اس قسم کے واقعات اور حادثات کی کوئی گنتی اور حد شمار ہی نہیں ہے، خاصے بڑے فسادات جن کی تعداد کا ذکر ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں بھی آچکا ہے، دس بیس نہیں چار سو (۴۰۰) کے قریب ہیں، جن میں انتہائی محتاط اندازے کے مطابق کم از کم دو لاکھ مسلمان قتل کئے گئے ہیں! کروڑوں روپیہ کا مالی نقصان مسلمانوں کو اٹھانا پڑا ہے، بنگال کے علاقہ میں خاص طور سے چھانٹ چھانٹ کر مسلمانوں کے کارخانوں کو تباہ کیا گیا ہے، اُن کی دکانوں اور گوداموں کو آگ لگائی گئی ہے۔

پچھلے تین سال میں یعنی معاہدۂ تاشقند کے بعد ہندوستان میں ان یکطرفہ فسادات اور مسلمانوں کے قتل و غارتگری کے واقعات نے گزشتہ ریکارڈ کو توڑ دیا ہے، فسادات اور مسلسل فسادات، جو کسی طرح رکنے کا نام ہی نہیں لیتے، جنوبی ہند کا علاقہ جن سنگھیوں کی شرارتوں اور سفاکیوں سے بڑی حد تک محفوظ تھا مگر اب اس علاقے کو بھی تعصب اور ظلم و شقاوت کی آگ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ان تین برس میں بھارت کے مسلمانوں پر قیامتیں گزر گئیں، اب تک پولیس ہی کا رونا تھا کہ وہ قاتلوں اور لٹیروں کی پشت پناہی کرتی ہے مگر اب کی بار فوج نے بھی پولیس کے نقش قدم پر چل کر، تاریخ میں انتہائی شرمناک مثال قائم کردی۔

گزشتہ تین برس کے فسادات میں ظلم و غارت اور درندگی کے جو مظاہرے ہوتے ہیں وہ اس نوعیت کے ہیں کہ ریچھ اور بھیڑیئے بھی انہیں دیکھ کر دانتوں میں انگلیاں دبانے لگیں۔ پولیس نے مسلمان طلباء کو حفاظت کے نام پر انہیں سرکاری لاری میں بٹھایا اور پھر اس گاڑی کی سواریوں کا پتہ ہی نہیں چلا کہ ان بدنصیبوں کو زمین کھا گئی یا آسمان نے اُچک لیا۔

میڈیکل کالج کے طلباء عوام کے مقابلہ میں زیادہ مہذب، فرض شناس اور انسانیت دوست ہوتے ہیں مگر آگرہ میں میڈیکل کالج کے ہندو طلباء نے اپنے ساتھی مسلمان طلباء کو بے دردی کے ساتھ ذبح کیا ہے۔ کرفیو کے اوقات میں ہندوؤں کو چھٹی ملی ہوئی ہے، جس مسلمان کے گھر میں چاہا گھس گئے اور قتل و غارت گری سے لے کر پردہ نشینان حرم کی بے آبروئی تک ہر شرمناک اور سفاکانہ فعل کا ارتکاب! کسی مسلمان نے گھبرا کر گھر سے باہر قدم نکالا تو اسے گرفتار کر لیا گیا۔ جس شہر میں مسلمانوں نے قاتلوں اور لٹیروں کا پامردی کے ساتھ مقابلہ کیا انہیں اس غیرت و خودداری اور مدافعت کے جرم میں پولیس نے طرح طرح کی اذیتیں دیں اور بے چاروں کی زندگی عذاب بنا دی۔

الٰہ آباد کے ہسپتال میں ایسے زخمی مسلمان بھی دیکھے گئے کہ یہ مظلوم بُری طرح کراہ رہے ہیں، زخموں کی شدت کے سبب اُن کا ہلنا جلنا مشکل ہے مگر اُن کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگی ہوئی ہیں، حالانکہ ڈاکوؤں کے سرغنے، قاتل، چور اور بڑے سے بڑے جرم کے مرتکب بھی زخمی ہو کر ہسپتالوں میں آتے ہیں تو اُن کے ہتھکڑیاں نہیں لگائی جاتیں! ذمہ دار عہدیداروں سے مسلمانوں کے نمائندوں نے اس ظلم کی وجہ پوچھی تو انہیں بتایا گیا اس احتیاط کے پیش نظر کہ ان مسلمان زخمیوں کو کوئی اغوا کر کے نہ لے جائے، ان کو ہتھکڑیاں پہنائی گئی ہیں۔ ظالم جب اپنے ظلم کی ایسی مضحکہ خیز اور وحشیانہ تاویل پر اُتر آئیں تو پھر کوئی کہے بھی تو کیا کہے! ایسے ہی موقعوں پر ظالموں کے لئے دل سے بد دعائیں نکلتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی شانِ انتقام کی دُہائی دی جاتی ہے۔ اس سنگدلی کی کوئی انتہا ہے، وہ کہ جن کے نزدیک گائے، بچھڑے اور بندر محترم ہیں، جو بیل، کنکھجوروں، سوروں اور چیونٹوں تک کے لئے جذبۂ رحم رکھتے ہیں انسانوں کے حق میں وہ اتنے سفاک اور خونخوار بن جاتے ہیں۔

مسلمانوں کے خلاف تعصب و نفرت کی یہ آگ باقاعدہ منظم پلان کے تحت بھڑکائی گئی ہے۔ جہاں مسلم کشی کے معاملے میں اب تک سرد مہری پائی جاتی تھی وہاں بھی اس آگ کی لپیٹ محسوس کی جا رہی ہے۔ ہندو مہا سبھا، راشٹریہ سیوک سنگھ اور جن سنگھ کے وہ چوٹی کے لیڈر جو اس قتل و غارتگری اور فتنہ و فساد کے بانی مبانی ہیں انہیں پکڑنے کی حکومت میں ہمت نہیں ہے! مسلمانوں کے اس قتل و ہلاکت اور تباہی کی پشت پناہی اور قاتلوں اور لٹیروں کی کمک کے لئے مرکزی حکومت میں مسٹر چاون موجود ہیں۔ جو آنجہانی سردار پٹیل کی پالیسی کے علمبردار ہیں، یہ وہ مہاپرش ہیں جنہوں نے پانی پت کے میدان میں پہنچ کر وہاں کی خاک کو اپنے ماتھے سے لگا کر قسم کھائی تھی کہ مسلمانوں سے پانی پت کی جنگ کا بدلہ لیا جائے گا! اور یہ بدلہ بھارت کے امن پسند شہری مسلمانوں سے لیا جا رہا ہے!

یہ خوفناک اعلان

شروع شروع میں جب پاکستان بنا ہے تو بھارت کے متعصب ہندو وہاں کے مسلمانوں سے وفاداری کا مطالبہ کرتے رہے، پھر یہ کہا گیا کہ بھارتی مسلمانوں کو ہندو کلچر اختیار کرنا چاہیے، مکہ، مدینہ اور بیت المقدس غیر ملکوں کے شہر ہیں اُن سے مسلمانوں کی عقیدت بھارت ماتا کے سپوتوں کو کھٹکتی ہے، مسلمانوں کو شکست دینے کی یہ لے بڑھتی گئی اور ارباب دل کی بات استعاروں تک محدود نہیں رہی، جن سنگھیوں نے اکولہ (برار) کے جلسہ عام میں ۱۷ اپریل ۱۹۶۸ء کو اس کا اعلان کر دیا۔

(۱) تمام مسلمانوں کو شدھی کے ذریعہ ہندو دھرم اختیار کر لینا چاہیے۔

(۲) پبلک تجارت مرہٹہ قوم کو سنبھال لینی چاہیے۔
(۳) مسلمان عورتیں ہندو مذہب اختیار کرکے ہندوؤں سے شادی کریں، اس سلسلہ میں بھارت کے ریاست میں خاص طور سے منظم جدوجہد
کی جانی چاہئے۔
(۴) پوری کی پوری تجارت کے اجارہ دار ہندو ہونے چاہئیں۔
(۵) مسلمانوں کو مندروں میں آنے کے لئے مجبور کیا جائے۔
(۶) مسلمانوں کو ملازمتوں میں بھرتی نہ کیا جائے۔
(۷) "اکھاڑوں" کے ذریعہ ہندوؤں کو اپنی طاقت میں اضافہ کرنا چاہیے۔ اور مسلمانوں کو جبراً ان اکھاڑوں میں شامل اور جذب کیا جائے۔
(۸) گوشت کی فروخت کا کاروبار مسلمانوں سے لے لیا جائے اور صرف "جھٹکے" کی قانونی طور پر اجازت دی جائے۔
(۹) کپڑے کی تجارت مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھین لی جائے! ہندو صرف ہندوؤں کے ساتھ تجارت کریں۔

یہ تجاویز، قراردادیں، منصوبے اور ارادے کس قدر جابرانہ اور سفاکانہ ہیں، ان میں ایک لفظ بھی اس قسم کا نہیں ہے کہ مسلمانوں کو تالیف قلب کے ذریعہ ہندو تہذیب کی طرف مائل کیا جائے۔ یا ان کو ہندو مت کی تبلیغ کے ذریعہ متاثر کیا جائے ـــــ ہر منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے "طاقت" استعمال کرنے کی تلقین کی گئی ہے! اور بیس سال کا کھلا ہوا تجربہ یہ ہے کہ بھارت کے ہندوؤں نے مسلمانوں کے مقابلے میں "طاقت" کا مظاہرہ بندوقوں، پستولوں، بموں، چھروں، اور کلہاڑیوں کے ذریعہ کیا ہے، اُن کے مکانوں میں آگ لگائی ہے اور یہ آگ بعض مقامات پر مسلمانوں کی چتا بن کر رہ گئی ہے۔

مسلمانوں کے خلاف ان خونریز منصوبوں کے بعد ایک معمولی فہم کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ بھارت میں تقسیم ہند کے بعد مسلمانوں کا ماضی جتنا تاریک افسردہ اور غم انگیز رہا ہے اُس سے زیادہ اُن کا حال خراب و تباہ ہے، اور ماضی و حال سے بڑھ کر اُن کا مستقبل ماتم خیز ہوگا (خدانخواستہ ایسا نہ ہو) بھارت کے حالات مسلمانوں کے لئے زیادہ سے زیادہ ناسازگار ہوتے جا رہے ہیں، اُنہوں نے پیٹ کی مار، روزی کی تنگی اور قتل و غارت گری تک کو برداشت کیا، مگر مسلمانوں کو اُن کے دین سے پھیر دینے کا جو منصوبہ پیش نظر ہے، اسے وہ کسی قیمت پر گوارا نہیں کرسکتے، ان بے چاروں کے لئے بڑی سخت آزمائش اور شدید آتشیں امتحان درپیش ہے، اللہ تعالیٰ کی نصرت اور غیبی تائید، اُس کے بعد مسلمانوں کی ایمانی قوت ہی انہیں اس فتنہ ارتداد سے بچاسکتی ہے (انشاء اللہ العزیز) ورنہ ہندوؤں کے ارادے تو ظاہر ہیں وہ تو مسلمانوں کو مٹانے، برباد کرنے اور اُنہیں مرتد کافر بنانے کا تہیہ کرچکے ہیں۔ غیب کا حال اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی اور نہیں جانتا، کون کہہ سکتا ہے کہ آئندہ کیا پیش آنے والا ہے، اور واقعات کیا رُخ اختیار کرتے ہیں گے۔ اس آتشیں امتحان میں جو اہل ایمان ثابت قدم رہیں گے ان کو بے حد و بے حساب اجر ملے گا، ان غازیوں، مجاہدوں اور شہیدوں کا عالم ملت اسلامیہ کو سرفروشی کا ایک نیا ولولہ دے گا، اور کیا عجب ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی استقامت، جرأت اور عزیمت واقعات کے دھارے کا رُخ موڑ دے!

اظہار حقیقت

پہلی بات تو ہمیں یہ عرض کرنی ہے کہ ہم نے اوپر جو کچھ لکھا ہے اُس میں ذرہ برابر مبالغہ نہیں کیا، اپنی طرف سے نمک مرچ لگا کر کسی حادثہ یا واقعہ کو تیز یا شدید نہیں بنایا ہمارا دین ہمیں دشمن کے ساتھ بھی عدل و انصاف کی تلقین کرتا ہے کسی پر تہمت جوڑنا یا اُسے بدنام کرنا یہ ہمارا شیوہ نہیں ہے، یہ تمام واقعات جو اوپر بیان کئے گئے ہیں، ہندوستان کے اخبارات میں آچکے ہیں بھارت

میلوں میں ان کی صدائے بازگشت سنی گئی ہے۔ بعض انصاف پسند ہندو لیڈروں نے اپنے مضامین اور بیانات میں ان کا ذکر کیا ہے! ہم نے جمالاً بعض باتوں کی طرف اشارہ کر دیا ہے ورنہ یہ تفصیل بڑی دردناک ہے!

ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ بعض فسادات میں شریف ہندوؤں نے اپنی جان پر کھیل کر مسلمانوں کی حفاظت اور مدافعت کی ہے۔ ہندوستان میں ایسے ہندو پائے جاتے ہیں جو مسلمانوں کی تباہی اور غارتگری کو پسند نہیں کرتے اور اس قسم کے واقعات سے انہیں دکھ ہوتا ہے خود ہمارے معتقد ہندو دوست ایسے ہیں جو مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور مسلمانوں کے اس احسان کو مانتے ہیں کہ انہوں نے ہندوستان کو متمدن و مہذب بنایا! اردو کے بہت سے ہندو شعراء اور اہل قلم ہیں جو جن سنگھیوں کے ان ظالمانہ منصوبوں اور خونریز اسکیموں کو پسند نہیں کرتے اور بھارت کے طول و عرض میں بھائی چارے اور امن و آشتی کی فضا پیدا کرنا چاہتے ہیں — ان کے زبان و قلم امن اور آشتی کا پیغام دیتے ہیں۔

مگر

اس کو کیا کیجئے کہ بھارت کی اکثریت جن سنگھی مزاج اختیار کرتی جا رہی ہے اور یہ مزاج مسلمان کے ساتھ کسی قسم کی رواداری برتنا نہیں چاہتا! مسلمانوں کو ستانا، مٹانا اور برباد کرنا ان ظالموں کا نصب العین اور مقصد حیات بن کر رہ گیا ہے! ان سنگدلوں پر کوئی پند و نصیحت اثر نہیں کرتی، ان کے دلوں میں سوز و گداز کی کوئی رمق ہی باقی نہیں رہی، مسلمانوں کے حق میں وہ کٹھور ہو گئے ہیں۔ غضب خدا کی بعض شہروں میں ہندو نوجوانوں کو "چھرے بازی" کی تربیت دی جاتی ہے!

ہمارا فرض کیا ہے؟

ان حالات میں ہم پاکستانی مسلمانوں کا کیا فرض ہے؟ کیا ہم یونہی تماشائی بن کر اپنے بھائی بندوں کی تباہی اور بے آبروئی دیکھتے رہیں۔ ہماری دینی غیرت اور اسلامی اخوت کا کیا تقاضا ہے؟ کیا قیامت کے دن ہماری بے تعلقی اور بے حسی پر بازپرس نہیں کی جائے گی؟ کیا سات کروڑ مسلمانوں کا ارتداد گوارا کیا جا سکتا ہے! ہم نے انگریز کی غلامی کے دور میں ترک مسلمانوں کی مدد کی ہے، طبی وفود بھیجے ہیں، ان کے لئے فنڈ قائم کئے ہیں اور روپیہ پیسہ سے اپنے ترک بھائیوں کی معاونت کی ہے، ہندوستان میں ہمارا حال تھا کہ سمرنا میں کسی مسلمان کے پیر میں کانٹا چبھا ہے اور اس کی چبھن ہم نے یہاں محسوس کی ہے۔

ہندوستان کے مسلمان اسی جرم میں ستائے جا رہے ہیں کہ دین اسلام کے وہ پیرو ہیں اور انہوں نے پاکستان بنوایا ہے، اس جرم کی سزا کی کوئی میعاد اور اس عقوبت کی کوئی حد نہیں۔ پاکستان بننے کے بعد کیا ہم کمزور ہو گئے ہیں یا قوی بن گئے ہیں! پاکستان کی حکومت نے ہماری طاقت میں اضافہ کیا ہے یا کمی پیدا کر دی ہے! غلامی کے دور میں جب ہم کمزور تھے، ہماری دینی حمیت کا یہ حال کہ عربوں اور ترکوں کے لئے خون پسینہ ایک کر دیا، ہمارے طوفانی احتجاج نے حکومت برطانیہ تک کو گھبرا دیا، ہم "خلافت" کے لئے لندن وفود لے کر گئے ہیں — مگر ہندوستان کے مسلمان جن سے ہمارا سب سے پہلا رشتہ دین کا رشتہ ہے، پھر گوشت پوست کا تعلق اور ہمسائیگی کا رابطہ ہے، وہ تباہ و برباد ہو رہے ہیں اور ہمارے اندر ان کے لئے بے چینی پیدا نہیں ہوتی، اگر بے چینی پیدا ہوتی ہے تو اس کا اظہار کہیں دکھائی نہیں دیتا!

میرے منہ میں خاک، اگر ہندوستان کے سات کروڑ مسلمان تباہ و برباد اور بے دین ہو گئے، تو پاکستان کی بھی خیر نہیں، ہمیں اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہئے کہ ہم تو ساحل پر ہیں اور اطمینان سے ہیں! جو طوفان اور منجدھار میں ہیں وہ بلا سے ڈوب جائیں! سوچنے کی بات ہے کہ جو طوفان سات کروڑ مسلمانوں کو تہس نہس کر سکتا ہے کیا وہ ہم ساحل کے تماشائیوں کو کب چھوڑ سکتا ہے؟ مسلم دشمنی کی اس آگ سے ہم پاکستانی

کس طرح محفوظ رہ سکتے ہیں۔

پاکستان کے ارباب اقتدار کی خدمت میں ہماری گذارش ہے کہ پچھلی حکومتیں اقلیتوں کے تحفظ کے جن معاہدوں کی بنا پر احتجاج کیا کرتی تھیں، وہ معاہدے آخر کیا ہوئے؟ کیا قیامت کے دن ان سے نہیں پوچھا جائے گا کہ ہندوستان کے مظلوم مسلمانوں کو قتل و غارت اور ایذا دہی سے بچانے کے لیے تم نے کس اثر، رسوخ اور طاقت کو استعمال کیا، سیاسی سطح پر احتجاج ہے اس کے بعد بین الاقوامی اداروں توجہ دلانے کا مرحلہ ہے، جب قلم و زبان اور قرطاس کا احتجاج اور سیاسی وارننگ بھی کارگر ثابت نہ ہو، تو تیغ و سناں کا معرکہ ہے ــــ ہماری حکومت کیا سوچ رہی ہے کس صورتِ حال کا اُسے انتظار ہے! یہ سکوت اور احتیاط کس لئے؟ اور کب تک؟

پاکستان کے عوام ہوں یا خواص حاکم ہوں یا محکوم، چھوٹے ہوں یا بڑے اچھی طرح سوچ لیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے یہاں انہیں جواب دہی کرنی ہوگی! اپنے ہمسایہ مظلوم دینی بھائیوں کی طرف سے اگر ہم غافل رہے تو اس غفلت، کوتاہی، فرض ناشناسی اور دینی بے غیرتی کی ہمیں آخرت میں سزا ملے گی! کاش! ہم ہر طرح کی طاقت، قوت اور ذرائع رکھتے ہوئے "اشداء علی الکفار" اور "رحماء بینہم" کے تقاضوں کو پہچانیں اور اُن کا عملاً حق ادا کریں۔

ماہر القادری
۲۳ مئی ۶۸ء

اسعد گیلانی

پاکستانی ادب اور اس کی نظریاتی بنیاد

بعض لوگ اب تک پاکستانی ادب کی نظریاتی بنیاد کے بارے میں بڑے فلسفیانہ انداز میں مختلف تھیوریاں بنا بنا کر پیش کرتے ہیں ۔ کبھی
لپسندی کے نام پر ابنِ آدم کو دو طبقات میں تقسیم کر کے باہمی تصادم اور نزاع کو ہی انسانی ارتقا کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے اور اسی تصور کو
ستانی ادب کے لئے بھی نظریاتی بنیاد کے طور پر پیش کیا جاتا ہے ۔ کبھی دھرتی ماتا کو انسانی افکار کا منبع قرار دے کر معاشرے کے مختلف علاقائی
اہر کی ادب کی حقیقی فکری بنیادیں بنا کر پیش کیا جاتا ہے اور کبھی علاقائی قومیت پاکستانی ادب کی روح شمار کی جاتی ہے لیکن یہ سب نظریات
ار رفتہ بوسیدہ ، شکست خوردہ اور پاکستانی معاشرے کے لئے زہرِ قاتل کا درجہ رکھتے ہیں ۔ ایک اسلامی نظریاتی قوم کے اجتماعی معاشرے
ایسے نظریات بے دھڑک پیش کرنے پر یہی کہا جا سکتا ہے کہ

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

یادی حقیقت کبھی جھٹلائی نہیں جا سکتی کہ ہر معاشرہ جن بنیادی تصورات کے گرد اپنی اجتماعیت کی تشکیل کرتا ہے وہی اس معاشرے کے ادب
لئے کھاد کا کام کرتے ہیں اور اس کے ادب کی کونپلیں انہیں نظریات کے بیجوں سے پھوٹتی رہتی ہیں ۔ اور حقیقتاً اس معاشرے کی زندگی ان
ریات سے اس طرح وابستہ ہوتی ہے جس طرح کہانیوں کے دیو کی زندگی پنجرے کے طوطے یا مینا سے وابستہ ہوتی تھی وہ نظریات پرورش پائیں تو معاشرہ
پلتا پھولتا ، ترقی کرتا اور اپنے زور سے بزمِ جہاں میں معزز مقام حاصل کرتا ہے اور اگر وہی نظریات اس کے اندر کمزور ہوتے چلے جائیں تو
اشرہ بھی اسی تناسب سے انتشارِ فکری اور ذہنی اضمحلال کا شکار ہوتا چلا جاتا ہے ۔ جس طرح کسی درخت کی جڑ سوکھنے سے اس کی شاخیں اور پتیاں
مدریج سوکھتی چلی جاتی ہیں ۔ البتہ جب کبھی وہی معاشرہ زندگی اور موت کی کشمکش سے دوچار ہو جائے تو اگر وہ بالکل ہی مسخ نہیں ہو گیا
ہ تو بالکل فطری طور پر اپنی اصلیت کی طرف رجوع کرتا ہے جس طرح بچہ ماں کی گود کی طرف لپکتا ہے ۔ زندگی اور موت کی کشمکش اس کی
لیت کو پورے طور پر کھول کر رکھ دیتی ہے ، اگر بگاڑ نے اُسے کلیتاً بدل کے رکھ دیا ہے تو پھر وہ اس کشمکش کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے اور اگر
ی اس کی اجتماعیت کے بنیادی تصورات میں جان باقی ہے تو پورا معاشرہ ان تصورات کو لپک کر پکڑ لیتا ہے ۔ چونکہ اس کے لئے انہیں
ورات میں پوشیدہ قوت ، ولولہ ، جذبہ اور زندگی کا سرچشمہ ہوتا ہے اور اس کے زور سے وہ اس کشمکش میں فتح یاب ہوتا ہے اب اس امر سے
ن انکار کر سکتا ہے کہ پاکستانی معاشرے کی بنیاد اسلامی اجتماعیت کے تصورات پر ہی قائم ہے ۔

بلاشبہ پاکستانی معاشرے کو اس کے بنیادی اسلامی نظریات سے کھسکانے کی مہم گذشتہ برسوں سے مسلسل زور پکڑتی رہی ہے اس کی ثقافت
مذہب ، لباس ، زبان اور نظریات تک کو مسخ کیا جاتا رہا ہے اور اس کے زرشتہ تقدیر کا قلم مدت سے اس کے نظریاتی مخالفین کے ہاتھوں میں چلا

ا ہے اس کے اخباروں نے ہمیشہ اُسے اجاگر کرنے کی ۔ اور ارباب کار نے اشتباہ کی راہ اختیار کی ہے ۔ ———————

——————— لیکن ۱۵ راگست تو چھوڑ دیجئے جب اس معاشرے کی علیحدہ ہستی
تخص ہوئی تھی اس لئے کہ وہ تو بات پرانی ہو گئی اور اس کی کثرت تعبیر نے اس خواب کو پریشان کر کے رکھ دیا ہے، آپ صرف ۶ رستمبر ۶۵ء کی جنگ
ہی دیکھ لیجئے جب سالوں رات اس قوم کی قلب ماہیت ہوئی ۔

جی ہاں میں عرض کرتا ہوں کہ ۶ رستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ نے اس قوم کا کیا کردار نمایاں کر کے ساری دنیا کے سامنے اور خود اس کے رہنماؤں
کے سامنے رکھا ہے ۔ یہ اسلامی کردار ہے یہ اسلامی نظریات کی پکار ہے انہی نظریات کے مضبوط لنگر کے ساتھ اس قوم کی فکری کشتی بندھی ہوئی ہے
. کی اس دھارے کا رخ موڑنے کی ہزار کوشش کرتا ہے اس کے بازو ٹوٹ جائیں گے لیکن یہ دھارا رُخ نہ بدلے گا ۔ یہ دھارا قوم کی سرشت
کے اندر سے پھوٹتا ہے اور اس کا رُخ بیت الحرام کی جانب ہے ۔ رضائے الٰہی کا حصول اس قوم کی مرکزی فکر ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی
محبت اس قوم کا سب سے مضبوط لنگر ہے آپ جب کبھی اس قوم کو بولنے کا موقع دیں گے اور جب کبھی اس نڈھال قوم کو پکاریں گے تو وہ اپنی اس
نظریاتی حیثیت کو جدا کرنے پر کبھی تیار نہ ہوگی ۔

یہی تو وہ چیز ہے جس کے سبب اس قوم سے کوئی شخص فائدہ نہیں اٹھا سکتا جب تک وہ اس کے نظریات کا موذن کر سامنے نہ آئے ———
فرض کر جو شخص سامنے آئے گا وہ لازماً اس قوم سے شکست کھائے گا اس لئے اس قوم کو خطرہ کبھی کافروں سے نہیں رہا ———
محرفین سے ہی رہا ہے اور اس قوم کی کتاب مقدس میں سب سے زیادہ مذمت اسی ذہنیت کی کی گئی ہے ———

——————— ۲۰ سال تک اس عالم میں رہنے کے بعد ———
جب ۶ رستمبر کو اسے پکارا گیا تو خدا اور اس کے رسول کی بولی کے سوا دوسری کوئی بولی کام نہ آئی اس لئے کہ یہ قوم کوئی دوسری بولی سمجھنے ،
متاثر ہونے اور جذبہ انگیز ایثار و قربانی کا مظاہرہ کرنے سے ہمیشہ قاصر رہی ہے اور وہ وقت تجربہ کا نہیں بلکہ زندگی و موت کی کشمکش کا
وقت تھا اس لئے انحراف پسند بھی جانتے تھے کہ اب قوم کو کس بولی میں پکارا جا سکتا ہے اور اپنے مقام بلند کی حفاظت کے لئے قوم کو کس طرح
ہمنوا بنایا جا سکتا ہے ۔

۶ ستمبر ۱۹۶۵ء سے ریڈیو ۔ اخبارات ، قیادت سیاسی و معاشرتی تمام اجتماعی ادارت یک رنگ ہو گئے ۔ آقا و بندہ میں سارے
حجابات اُٹھ گئے افسر عوام سے اس طرح مل گئے جس طرح اسلامی معاشرہ میں انہیں گھل مل کر رہنا چاہئے ۔ قوم نے اس فضا میں اپنا فریضہ جہاد
ادا کیا اور اپنے وجود کو اپنے سے پانچ گنا جابر کے مقابلے میں عزت و حرمت کے ساتھ محفوظ رکھا اور اپنے حقیقی نظریات کے عین مطابق اس فتح
کو اپنے مالک کا کرم ہی شمار کیا ۔ یہ اسلامی ادب کی ایک زندہ دا لہر تھی جس میں انحراف پسندوں کے ساتھ اشتراکی ادیب بھی آ گئے اس دھارے کے
سامنے ٹھہرنے کی کسی میں ہمت نہ تھی نہ طبقات کے علمبرداروں میں اور نہ دھرتی کے پجاریوں میں ——— یہ تو امن کے دور سلامتی میں ہوتا ہے جب
نظریہ ساز لوگ دور دور کی کوڑیاں لاتے ہیں ۔ غرض ۶ رستمبر کو جارحانہ حملہ نے پاکستان میں ادب کی نوعیت کا ایک بار پھر فیصلہ کر دیا ۔ وہ فیصلہ
تاریخ کے سینہ پر خون کی لکیروں کو درج ہو گیا ہے اب اسے مٹایا نہیں جا سکتا ۔ جدید و قدیم کا نام لے کر اس کی مختلف تعبیریں کرنے کا اب کسی
کو کوئی حق نہیں ہے ۔ وہی تعبیر معتبر ہے جو قوم کے اجتماعی ضمیر کے نزدیک معتبر ہے اور قوم کو اپنے نظریات کے بارے میں اپنی مقدس کتاب کے

سوا اور کسی پہ اعتبار نہیں ہے

اب پاکستان کا قومی ادب اسلامی ادب ہے اور اسلامی ادب کے سوا اور کوئی ادب قومی ادب نہیں بن سکتا۔ جو قلمکار اس کے سوا پاکستان میں کوئی دوسرا ادبی نظریہ رائج کرنے کی جدوجہد کرتا ہے وہ معاشرے کو اس کی بنیادوں سے کھسکانے کی واضح سعی کرتا ہے۔ اس چیز کا اُسے حق ہے یا نہیں اس کا جواب خود معاشرہ اور اس کے اجتماعی ادارے ہی دے سکتے ہیں لیکن زندہ معاشروں میں ایسی مساعی کو ہمیشہ نظریاتی انحراف شمار کیا جاتا ہے۔ اور اسے سخت ناپسند کیا جاتا ہے۔

(حلقۂ فکر و ادب سے سرگودھا کے اجلاس میں پڑھا گیا)

ماہر القادری

اقبال کا پیام "اسلام" ہے

علامہ اقبال بھی اپنی شاعری میں ساقی، جام اور بادہ و صراحی کے استعارے لاتے ہیں مگر یہ استعارے اس قدر لطیف اور پاکیزہ ہیں کہ انہیں پڑھ کر ذہن اس چیز کی طرف نہیں جاتا جسے حافظ شیرازی نے صوفی کی زبان میں "ام الخبائث" کہا ہے اور مرزا غالب نے "مرد افگن"! اقبال کی شراب کا یہ رنگ ہے :-

مٹا دیا مرے ساقی نے عالم من و تو
پلا کے مجھ کو مئے لاالٰہ الا ھو

اقبال توحید اور اسلام کی اسی شراب سے سرشار ہیں یہی مقدس نشہ ان کے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے اور اسی مستی کو وہ عام کرنا چاہتے ہیں اقبال کی یہ مے "بے پردہ سوز" بھی ہے۔

پلا دے مجھے وہ مے پردہ سوز — کہ آتی نہیں فصل گل روز روز
وہ مے جس سے روشن ضمیر حیات — وہ مے جس سے ہے مستی کائنات

یہ شراب جس سے ضمیر حیات روشن ہے اور تمام کائنات کو جس نے مست کر رکھا ہے اسلام کے میخانے میں ملتی ہے اس میخانے میں جس کے ساقی حضرت سیدنا محمد عربی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) ہیں جو اس "مے خانہ ساز" سے محروم رہا وہ ذوق لطیف سے محروم رہا۔

اقبال کا پیام واضح ہے اس میں کسی قسم کا کوئی الجھاؤ اور ابہام نہیں وہ اپنی شاعری کے ذریعہ دنیا کو "اسلام" کا پیغام دیتے ہیں۔ کہ اسلام ہی وہ دین ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ہے (ان الدین عند اللہ الاسلام) یہی دین زندگی کا مقدس ترین منشور اور بہترین نظام ہے یہی وہ نسخۂ شفا ہے جس کے بغیر انسانیت کی صحت برقرار نہیں رہ سکتی۔

خودی کا سر نہاں لا الٰہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الٰہ الا اللہ
یہ نغمہ فصل گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللہ

اقبال اسلام کے اسی جامع کلمہ کی طرف دنیا کو بلاتے ہیں کہ یہ کلمہ زندگی کی اساس ہے یہ کلمہ تمام جھوٹے خداؤں کی خدائی کی نفی کرتا اور غیر اللہ کی بندگی سے روکتا ہے۔

وہ فلسفہ، شاعری اور ادب جس سے شک، تذبذب اور بے یقینی پیدا ہوتی ہے دراصل قلب ونظر کی موت ہے اور یہ وہ چیز ہے جو غلامی سے بھی بدتر ہے۔

یقین مثل خلیل آتش نشینی یقین اللہ مستی خود گزینی
سن اے تہذیب حاضر کے گرفتار غلامی سے بتر ہے بے یقینی

تہذیب حاضر میں اسلامی اخلاق نہیں، دینی تقدیس نہیں، عصمت فکرونظر نہیں اس لئے یہ تہذیب انسانیت کے لئے وبال ہے۔ لوگ مغربی علوم کے دوچار جام پی کر ہی بہک جاتے ہیں۔ علامہ اقبال مغربی علوم کے سمندر پی کر بھی ہوش میں رہتے ہیں اور مغربی تہذیب پر بھرپور طنز کرتے ہیں۔

تہی وحدت سے ہے اندیشۂ غرب
کہ تہذیب فرنگی بے حرم ہے

اقبال کو اللہ تعالیٰ کی ذات پر یقین ہے اعتماد اور توکل ہے اس سے ان میں اس قدر شان بے نیازی پیدا ہوگئی ہے۔

میرا نشیمن نہیں درگہ میر و وزیر
میرا نشیمن بھی تو، شاخ نشیمن بھی تو

"مرد مومن" — اقبال کا وہ مثالی انسان ہے جس کی تلاش میں وہ تہذیب فرنگی — فلسفہ المانوی — عمر بھر سرگرداں رہا۔

عالم ہے فقط مومن جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے

قرآن پاک میں بھی اللہ تعالیٰ کی زمین کا وارث "صالحین" کو قرار دیا گیا ہے اسی مرد مومن کی یہ شان بھی ہے۔

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

علامہ اقبال دل سے نگاہ تک مسلمان تھے، اس لئے مغربی تمدن وتہذیب کی روشنی ان کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا نہ کرسکی فرماتے ہیں۔

خیرہ نہ کرسکا مجھے، جلوۂ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ ونجف

قرآن کریم میں اہل ایمان کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ وہ دشمنوں پر سخت ہوتے ہیں (اشداء علی الکفار) اور آپس میں رحمدل (رحماء بینھم) اس قرآنی آیت کو اقبال نے شاعرانہ زبان میں کس خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق وباطل ہو تو فولاد ہے مومن

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے اس لئے یہ زندگی کے لئے آخری منشور بھی ہے جس کے ایک حرف کو بھی ادھر سے ادھر نہیں کیا

جا سکتا۔ دنیا میں صرف تنہا یہی وہ کتاب ہے جو لفظی تحریف سے محفوظ ہے جس کے ایک شوشہ کو بھی کوئی نہیں بدل سکا اقبال اسی کتاب کی طرف مسلمانوں کو دعوت دیتے ہیں۔

نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

قرآنی اخلاق و ہدایات کی تعمیل کے بغیر مسلمان کی وہ زندگی جسے دینی زندگی کہتے ہیں برقرار نہیں رہ سکتی۔ مسلمان دراصل قرآن کے سہارے ہی زندہ رہ سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کو انسانوں کیلئے "نمونہ" بنایا ہے حضور ہی کی مقدس زندگی انسانیت کیلئے آخری اور قطعی "معیار" ہے جس کسی کی زندگی اس معیار سے ہٹی ہوئی ہے وہ دین و دنیا میں خسارے کی زندگی ہے اقبال نے کس خلوص و عقیدت کے ساتھ سچی بات کہی ہے۔

بہ مصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

دین دراصل اطاعت رسول ہی کا نام ہے، جس زندگی میں رسول کی اطاعت نہیں وہاں بوذری کی جگہ بولہبی پائی جاتی ہے۔

خرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اقبال کا یہ شعر قرآن کی اس آیت ـــ اللہ کے دین میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ ـــ کی تفسیر ہے۔ دل سے نگاہ تک اور زبان سے لے کر عمل تک" اسلام ہی اسلام" فکر و نظر بھی مسلمان اور دل و دماغ بھی مسلمان ! اور اس صورت میں پھر مسلمان کی یہ صفت اور یہ کردار ہوتا ہے :

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

جو لوگ اپنی جہالت اور فکر و نظر کی کوتاہی کے سبب اللہ تعالیٰ کے بارے میں شک اور تذبذب میں مبتلا ہیں، جن کو یقین و ایمان کی روشنی میسر نہیں ہے سطحی دلیلوں میں جن کا ذہن الجھا ہوا ہے، ان کو علامہ چیلنج دیتے ہیں۔

سمجھ میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے

سید قطب شاہ

ترجمہ: سید معروف شاہ شیرازی

اسلامی نظام حیات اور اس کے احیاء کا طریق کار

قرآن کریم کا جو حصہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوا اس کے نزول کی مدت تیرہ سال ہے، اس پورے عرصے میں وحی کا محور اور مرکزی مضمون ایک ہی رہا اور
ی وقت بھی اس میں تبدیلی نہ ہوئی۔ البتہ اسلوب بیان میں تبدیلی برابر ہوتی رہی، مضامین کو بار بار دہرایا گیا لیکن ہر مرتبہ نئے اسلوب سے بات کی
نئی اور سامعین کو یوں محسوس ہوا کہ گویا یہ بات آج ہی پہلی مرتبہ بیان ہو رہی ہے۔

یہ وہ دور تھا جب قرآن کریم ایک نہایت ہی اہم اور اساسی مسئلے کو حل کر رہا تھا۔ اس مسئلے پر اس نئے دین کی بنیاد اٹھنے والی تھی۔
دراس کا اظہار اس کے اساسی نظریات میں ہونے والا تھا۔ یعنی "حقیقت الوہیت، حقیقت نبوت اور ان کا باہمی تعلق" اس قضیہ کا حل بھی خالص
سانی نقطۂ نظر سے مطلوب تھا یہ کوئی وقتی حل نہ تھا بلکہ اس وقت کے عرب اور آج کے عرب یا اس وقت کے انسان اور آج کے انسان سب کے
سب اس کی رو سے ایک ہی حقیقت اور حیثیت کے حامل ہیں چونکہ اس بحث کا محور یہ اساسی سوالات تھے، کہ اس کائنات میں وجود انسانی کی کیا
حقیقت ہے، اس کائنات کی کیا اصلیت ہے اور انسان اور کائنات اور انسان اور موجودات کے درمیان روابط کی کیا نوعیت ہے اور پھر ان
دونوں یعنی انسان اور موجودات اور ان کے خالق کے درمیان کیا تعلق ہے، اس لئے نہ تو یہ مسائل وقتی نوعیت کے حامل تھے، اور نہ ان کا یہ حل وقتی
نوعیت کا حامل ہو سکتا تھا بلکہ یہ خالص انسانی مسائل تھے۔ اور یہ ان کا دائمی حل تھا۔

نزول قرآن کے مکی دور میں جن سوالات کو چھیڑا گیا ان کا تعلق انسان اور اس کے اردگرد پھیلی ہوئی پوری کائنات سے تھا یہ تفصیلات کہ
وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا؟ کیوں آیا ہے؟ آخر کار اسے کہاں جانا ہے؟ کون ہے جو اسے ایک نامعلوم عدم سے لایا؟ کون ہے جو اسے یہاں سے
لے جائے گا؟ پھر اس کا انجام کیا ہوگا؟۔ اس دور میں قرآن نے انسان کو اس طرف متوجہ کیا کہ وہ اس کائنات کی حقیقت پر غور کرے جسے وہ دیکھ
رہا ہے اور محسوس کر رہا ہے۔ اس کے سامنے ایک مستور غیب ہے، وہ کائنات کو دیکھ بھی رہا ہے لیکن وہ اس کی کوئی معقول تعبیر نہیں کر سکتا کہ اس
پراسرار کائنات کا خالق کون ہے؟ کون اس حیرت انگیز نظام کو چلا رہا ہے؟ اس کا مدبر کون ہے؟ اور اس میں جو تغیرات رونما ہوتے رہتے ہیں ان

کے پیچھے کس طاقت کا ہاتھ کام کر رہا ہے؟ مکہ مکرمہ میں قرآنی تعلیمات نے انسان کو بالتفصیل بتایا کہ اس کا تعلق اپنے رب سے کیا ہے؟ اس کا تعلق اس مخلوق سے کیا ہے؟ اور انسان کے باہمی تعلقات کا مدار کس اصول پر رکھنا ہے یہ مسئلہ چونکہ نہایت اہم اور اساسی اور انسان کی پوری تاریخ اور پیدائش سے لے کر موت تک پوری زندگی سے تعلق رکھتا ہے اس لئے اس کی وضاحت اور بیان و تشریح میں قرآن کریم نے پورے تیرہ سال صرف کئے، کیونکہ یہ ایک ایسا اہم قضیہ تھا کہ جس کے حل ہونے کے بعد انسانی زندگی میں کوئی ایسا مسئلہ ہی نہیں رہتا جو حل طلب ہو۔

اس تیرہ سالہ دور میں قرآن نے کبھی بھی ان بنیادی مسائل کو چھوڑ کر اسلامی نظام حیات کی تفصیلات بیان نہیں کیں، جب یہ بالکل واضح ہو گیا کہ تحریک اسلامی کے کارکنوں کے دل و دماغ میں اسلامی نظام کے اساسی تصورات اچھی طرح جاگزیں ہو گئے ہیں تو اس کے بعد تفصیلی تعلیمات شروع ہوئیں اور اس سے قبل، اس پورے عرصے میں اس ممتاز گروہ یعنی صحابہ کرام کی تربیت ہوتی رہی جسے اقامت دین کا کام سنبھالنا تھا۔

اقامت دین کا طریق کار ۔ ہمارے اس دور میں جو لوگ اسلامی نظام حیات کے قیام اور احیاء کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں میں ان کی توجہ قرآن کریم کے اس خاص اسلوب کی طرف مبذول کراؤں گا۔ انہیں غور کرنا چاہئے کہ قرآن کریم نے پورے تیرہ سال تک کیوں صرف عقائد و نظریات اور دین کے صرف اساسی مسائل سے بحث کی اور اس پورے عرصے میں اسلامی نظام حیات کو نہیں چھیڑا گیا۔ نہ وہ احکام اور قوانین بیان کئے گئے جنہیں آگے جا کر اسلامی معاشرہ میں نافذ ہونا تھا۔ اس طریق کار کی تہ میں یہ حکمت کارفرما تھی کہ اللہ تعالیٰ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مخالفین کے درمیان سب سے پہلے نظریاتی جنگ کا فیصلہ کرانا چاہتا تھا۔ چنانچہ حضورؐ نے اپنی دعوت کا آغاز "لا الہ الا اللہ" سے کیا جس کے مفہوم کو عرب اچھی طرح جانتے تھے اور اس کا اعلان ہوتے ہی ایک نظریاتی جنگ چھڑ گئی اور حضورؐ نے لوگوں کے سامنے یہ دعوت پیش کرنا شروع کر دی کہ وہ تمام الٰہوں، ارباب اور دیوتاؤں کو چھوڑ کر صرف ایک ہی رب کی عبادت کریں۔

عرب اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کی زبان میں "الٰہ" کے کیا معنی ہوتے ہیں؟ اور لا الہ الا اللہ کے کیا معنی ہوتے ہیں، وہ یہ بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ الٰہ تو وہ ہوتا ہے جو انسان کی تکوینی زندگی پر بھی حاکم ہو اور تشریعی زندگی بھی اس کے زیر نگین ہو اور اگر ہم اس کا اقرار کر لیتے ہیں تو اس کا اولین اثر یہ ہوگا کہ ہمارے ہاتھ سے امارتیں اور سیادتیں سب چلی جائیں گی اور اس کے بعد قلب و ضمیر، دل و دماغ احساس و شعور، عدالت و امارت، تجارت و معیشت اور روح و بدن سب پر صرف ایک خدا اور حاکم مطلق کی فرماں روائی ہوگی۔ چنانچہ کلمہ طیبہ کے سنتے ہی وہ تاڑ گئے کہ یہ کلمہ نہ صرف یہ کہ ان کے اختیارات حاکمیت کے خلاف اعلان جنگ ہے بلکہ وہ مستقبل قریب میں ان کی عادات و اطوار اور رسوم و تقالید کو بھی یکسر بدل کر رکھ دے گا۔ بہرحال اہل عرب تھے اور اہل لسان ہونے کی حیثیت سے یہ اچھی طرح محسوس کر رہے تھے کہ لا الہ الا اللہ ان کے لئے کیا کیا مشکلات پیدا کرنے والا ہے۔ انہوں نے اس کلمہ کو سنتے ہی اس کا سخت نوٹس لیا۔ جس سے تاریخ کا ہر طالب علم خوب واقف ہے۔ اس لئے یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ کفر و اسلام کی اس جنگ کا آغاز اس قدر پیچیدہ نظریاتی جنگ سے کیوں کیا گیا جبکہ بظاہر یہ ممکن بھی نہ تھا کہ یہ نظریات عربوں کو اپیل کریں گے۔

قومی تحریک کا راستہ

بظاہر یہ سوال اور بھی قابل توجہ ہو جاتا ہے جب ہم غور کریں کہ دعوت اسلامی کے آغاز کے وقت جزیرۃ العرب کے مخصوص سیاسی حالات کیا تھے؟ جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت اسلامی کا آغاز کیا تو سرزمین عرب کے سب سے آباد اور شاداب علاقے عربوں کے بجائے دوسری اقوام کے قبضہ میں تھے، شمال میں شام سے متصل علاقوں پر رومیوں کا قبضہ تھا، دوسری جانب ان پر عرب حکمران حکومت کرتے تھے جو

یمن پر ایرانیوں کی حکومت تھی اور عربوں کے پاس صرف حجاز، تہامہ اور نجد کے علاقے تھے۔ ان کے علاوہ ان کے پاس فقط صحرائے عرب کی
چند متفرق سرسبز پٹیاں تھیں۔

ان حالات کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسے مقبول اور قابل اعتماد شخص کے لئے مناسب یہ تھا کہ وہ
ان حالات میں عربی قومیت کا نعرہ بلند کرتے۔ عرب کے منتشر قبائل کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرتے ان کی خانہ جنگیاں ختم کراتے، جنہوں نے انہیں
ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا تھا۔ اس طرح آپ کے لئے بسہولت یہ ممکن تھا کہ آپ شمال کی جانب رومی اور جنوب کی طرف سے ایرانی استعمار
کے خلاف صف آرا ہو جاتے۔ عرب کے خونی رشتوں سے اساس کرتے اور پھر جزیرۃ العرب کو ایک قومی وحدت میں جمع کر دیتے۔ یہ کام حضورؐ کے لئے
اس وجہ سے بھی آسان تھا کہ قریش جیسے معزز قبیلے کے چشم و چراغ تھے آپ کو پورے قبیلے نے حجر اسود کے جھگڑے میں فیصل بھی مقرر کر دیا
تھا اور پندرہ سال تک آپ کو حَکَم بھی مان چکے تھے۔

۳۔ اگر آپ اپنی تحریک کا آغاز اس طرح کرتے تو تمام عرب فی الفور آپ کی دعوت پر لبیک کہہ دیتے اور اس طرح آپ کو پورے تیرہ سال
تک خود غرض حکمرانوں اور شیوخ و امراء کا مقابلہ کرنا پڑتا۔ اور جس وقت پورا جزیرۃ العرب آپ کے زیر نگین جمع ہو جاتا اور اقتدار اعلیٰ آپ
کے ہاتھوں میں آ جاتا تو آپ اپنی پوری طاقت سے لوگوں کو وہ تعلیم دینا شروع کر دیتے جس کے ساتھ باری تعالیٰ نے آپ کو انسانوں کی ہدایت کے لئے
بھیجا تھا اور آپ بہ سہولت لوگوں کو بتا سکتے کہ لوگو! انسانوں کی اطاعت اور بندگی کے بجائے صرف اللہ تعالیٰ کی بندگی کرو اور شرک سے باز آ جاؤ۔

لیکن اللہ تعالیٰ علیم و خبیر تھا، اس کا منصوبہ کچھ اور ہی تھا، اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ آپ "لا الٰہ الا اللہ" کا اعلان
کریں، اسلامی تاریخ ہمارے سامنے ہے کہ حضورؐ اور آپ کے ساتھیوں نے کس طرح باطل کے خلاف واضح نظریاتی جنگ کا اعلان کیا اور اس
کے نتیجے میں بے حد و بے حساب مظالم برداشت کئے۔ اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب نہ تھا کہ خواہ مخواہ حضورؐ اور آپ کے مٹھی بھر ساتھیوں کو مصیبت میں
مبتلا کر دیا جائے بلکہ یہی ایک صحیح اسکیم اور متعین طریق کار تھا جسے اپنانا ضروری تھا نیز اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب نہ تھا کہ انسانیت کو رومی طاغوت
یا فارسی طاغوت کے چنگل سے چھڑا کر عربی طاغوت کے زیر نگین کر دیا جاتے، طاغوت خواہ جس قوم و نسل سے بھی تعلق رکھتا ہو وہ بہرحال
طاغوت ہے۔ بلکہ مقصود یہ تھا کہ کائنات کا مالک صرف اللہ ہے اور اس پر اسی کی حکمرانی ہونی چاہئے اور اس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہونا
چاہئے اور یہ کام صرف اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب اس سرزمین پر صرف لا الٰہ الا اللہ کا علم بلند کیا جائے اور خداوند کریم کی بادشاہت
کے مقابل میں قائم ہونے والی تمام ایرانی، رومی اور عربی بادشاہتوں کو ختم کر دیا جائے اس کلمہ کی بنیاد پر جو اجتماعیت اور قومیت وجود میں
آتی ہے وہ ایک نظریاتی قومیت ہوتی ہے اور اسے عربی، رومی اور ایرانی سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا، یہ تھا وہ راز جس کی وجہ سے حضور
صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی قومیت کا نعرہ بلند کرنے کے بجائے نظریاتی کشمکش کے طریق کار کو اختیار کرنے کا حکم ہوا۔۔۔ آج بھی
ہمارے لئے بہترین طریق کار یہی ہے۔

معاشی مساوات کا راستہ۔

جس دور میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے، اس وقت معاشی لحاظ سے دنیا کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ دولت کی مساوی تقسیم
اور عدل انصاف کا نام و نشان تک نہ تھا۔ دولت اور تجارت پر ایک چھوٹی سی اقلیت نے قبضہ کر رکھا تھا اور اقلیت اپنا پورا کاروبار
سودی نظام کے مطابق چلا رہی تھی، اس لئے اس کی دولت میں بڑی تیز رفتاری سے اضافہ ہو رہا تھا اور ایک عظیم اکثریت تھی جو فقر و فاقہ

اورغربت وافلاس کا شکار تھی۔ جو لوگ دولت وثروت پر قبضہ جمائے ہوتے تھے، وہی سوسائٹی میں اونچے مناصب پر بھی براجمان تھے اور عام لوگوں کی حالت یہ تھی کہ نہ مایہ اور نہ سرمایہ!

ان حالات کے پیش نظر یہ ممکن تھا کہ حضورؐ معاشی مساوات کا نعرہ بلند فرماتے، مزدور اور سرمایہ دار کے درمیان طبقاتی کشمکش قائم ہو جاتی اور اس طرح ایک عوامی تحریک اٹھ کھڑی ہوتی۔ سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا جاتا اور لوگ موجودہ معاشی ناہمواریوں کو حل کرنے کے لئے، آپ کے ساتھ ہو جاتے تاکہ امراء کی دولت فقراء میں بانٹ دی جائے اور یہ راستہ دوسرے راستوں سے نسبتاً سہل بھی ہوتا کیونکہ اس نعرے سے پورا معاشرہ فی الفور دو گروہوں میں بٹ جاتا ایک طرف دولت، ثروت اور اقتدار کی دست درازیوں سے بیزار ایک عظیم اکثریت ہوتی اور دوسری جانب ان برائیوں کی حامل ایک حقیر سی اقلیت اور وہ صورت حال پیش نہ آتی جو غلط یا تی اعلان جنگ کی صورت میں پیش آئی کہ "لاالٰہ" کا اقرار کرنے والی ایک کمتر اقلیت کے مقابلے میں پورا معاشرہ صف آرا ہو گیا نیز یہ معاشی انقلاب برپا کرنے کے بعد جب اقتدار اعلیٰ آپ کے ہاتھ آ جاتا اور آپ اکثریت کے بل بوتے پر حکمران ہو جاتے تو آپ اقتدار اور اکثریت کے زور سے پوری آبادی سے اپنے وہ عقائد منوا لیتے جو بحیثیت رسول خدا کی بندگی میں داخل ہو جاتے۔

لیکن آپ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو انقلاب کے لئے یہ راہ اختیار کرنے کی ہدایت نہیں کی کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تحریک اسلامی کے انقلابی کام کا طریق کار یہ نہ تھا اور اللہ تعالیٰ کو اس بات کا خوب علم تھا کہ صحیح معاشی نظام وہی ہوتا ہے جس کی کونپلیں صحیح نظریات سے پھوٹتی ہیں اور صحیح نظریہ حیات صرف یہی ہے کہ ہر قسم کی حاکمیت کو صرف اللہ کے لئے مخصوص کر دیا جائے اس نظریہ کے مطابق ایک معاشرہ وجود میں آئے اور اس کا ہر رکن رضاکارانہ اور مطیعانہ طور پر اللہ جل شانہ کے ان احکام کی پابندی کرے جو اس نے اجتماعی انصاف، معاشی کفالت اور دولت کی منصفانہ تقسیم کے بارے میں دئے ہیں، اور اس معاشرے میں کاروبار کرنے والے دونوں فریق یہ خیال کرتے ہوں کہ اس لین دین میں وہ اللہ کے احکامات نافذ کر رہے ہیں اور پھر یہ کہ ان احکامات کی اطاعت کرکے وہ دنیا و آخرت کی سرخروئی حاصل کر رہے ہیں یہی ایک صورت ہے جس میں کوئی بھی حرص و آز کا شکار نہ ہو سکے گا نہ کسی کے دل میں کسی کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات پیدا ہوں گے ایسے معاشرے میں ہر کام کے لئے قوت اور طاقت استعمال کرنے کی ضرورت نہ ہو گی اور لوگ اس معاشرہ میں وہ گھٹن محسوس نہ کریں گے جو ہر اس معاشرے میں پائی جاتی ہے جس کی اساس لا الٰہ الا اللہ پر نہ رکھی گئی ہو۔

اخلاقی اصلاح کا راستہ۔

جب حضور اکرم تشریف لائے، تو عرب سوسائٹی اخلاقی لحاظ سے قعر مذلت میں گری ہوئی تھی، چند بدویانہ فضائل اخلاق کو چھوڑ کر، وہ کسی ضابطے کے پابند نہ تھے۔ زہیر بن ابی سلمیٰ اخلاقی صورت حال کی عکاسی یوں کرتے ہیں۔

ومن لم یذد عن حوضه بسلاحه

یهدم ومن لا یظلم الناس یظلم

دا اور جو اپنے حوض کی حفاظت، اپنے ہتھیاروں کے ذریعے نہیں کرے گا اس کے حوض کو منہدم کر دیا جائے گا

اور جو لوگوں پر ظلم نہیں کرے گا، مظلوم بنے گا)

جاہلیت کا یہ متعارف قول تھا کہ " اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ ظالم ہو یا مظلوم ہو "[1] اور یہ اس معاشرے کی اخلاقی صورت حال کی
یح تعبیر تھا شراب نوشی اور قمار بازی ان کی زندگی کا لازمہ تھیں اور یہ لوگ ان باتوں پر فخر کیا کرتے تھے، جاہلیت کی پوری شاعری عربوں
ے اخلاق کی عکاسی کرتی ہے، فسق و فجور، اپنی مختلف شکلوں کے ساتھ اس معاشرے میں وبا کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ عرب کیا بلکہ ہر قدیم و
یدجاہلی معاشرے کی یہ امتیازی خصوصیت ہوتی ہے کہ اخلاقی لحاظ سے وہ ایک فاجر اور فاسد معاشرہ ہوتا ہے، اس کا اندازہ۔۔ اس روایت
ے ہوتا ہے (جس میں جاہلیت کی عائلی زندگی کی تفصیل ملتی ہے) ۔۔۔ " جاہلیت میں نکاح چار قسم کا ہوا کرتا تھا۔ (۱) ایک تو وہ نکاح
آج ہمارے اندر رائج ہے۔ ایک آدمی کسی بیٹی یا اس کی زیر دست کو پیغام دیتا تھا۔ اس کا مہر دے کر وہ اسی سے نکاح کر لیتا تھا
(۲) دوسرا یہ کہ مرد اپنی بیوی سے جب وہ ایام ماہواری سے پاک ہو جاتی کہتا کہ تو فلاں کے پاس چلی جا اور اس سے ہمبستری کر!
ر عورت سے علیحدہ رہتا تھا اور اسے چھوتا تک نہ تھا یہاں تک کہ اس مرد سے اس کو حمل ٹھہر جاتا جب حمل واضح ہو جاتا تو پھر یہ
ں کے پاس جب چاہتا جاتا۔ اور یہ حرکت اس لئے کی جاتی تھی کہ نجیب الغیب اولاد حاصل کی جائے اسی نکاح کو نکاح " استبضاع "
ہتے تھے۔ (۳) اس کے علاوہ ایک تیسرا نکاح بھی ہوتا تھا۔ دس آدمیوں سے کم آدمی جمع ہو جاتے تھے اور وہ سب ایک ہی عورت کے
س جاتے سب کے سب اس سے ہم بستر ہوتے جب اس کو حمل ٹھہرتا اور وہ بچہ جن دیتی تو چند دن گذرنے کے بعد وہ سب کو بلوا بھیجتی۔ قانون
ے مطابق یہ ایک کو حاضر ہونا پڑتا، جب سب آجاتے تو وہ اُن سے کہتی " تم جانتے ہو میرے ساتھ جو تمہارا معاملہ تھا اب چونکہ میں نے
بچہ جن دیا ہے لہٰذا اے فلاں یہ تیرا بیٹا ہے " تو یہ عورت جس کا چاہتی نام لے دیتی اور وہ بچہ اُسی مرد کی نسل سے سمجھا جاتا، کوئی اس کا مجاز
مختار نہ تھا کہ اس کے بارے میں لب کشائی کر سکے، (۴) چوتھا نکاح ایسا ہوتا کہ بے شمار لوگ جمع ہوتے وہ سب ایک ہی عورت کے پاس جاتے
. . . . . یہ فاحشہ عورتیں ہوا کرتی تھیں، اپنے دروازوں پر خاص قسم کے جھنڈے نصب کر دیتی تھیں جو ان کی خاص علامت ہوتے
تھے، جو چاہتا وہاں جاتا جب ان میں سے کوئی حاملہ ہو جاتی تو سب لوگ جمع ہوتے اور قیافہ دان کو بلایا جاتا۔ قیافہ دان بچہ کو جس سے
مشابہ بتا دیتا وہ اُس کو اُٹھا لیتا اور اُسے اپنا بیٹا پکارتا "

عربوں کی اس اخلاقی صورتِ حال کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اگر اپنی دعوت کا آغاز
صلاحِ معاشرہ اور تزکیہ نفس سے کرتے تو زیادہ مناسب تھا اس صورت میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد بسہولت آپ کی تحریک میں شامل ہو جاتی
ر معاشرہ میں ایسے لوگوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہوتی ہے جو اپنے اردگرد پھیلی ہوئی برائیوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور جو بھی ان
ے خلاف آواز اُٹھاتا ہے اُسے اپنی تائید میں ایسے لوگوں کی ایک کثیر تعداد مل جاتی ہے۔ اس طریق کار کا اثر یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کی ایک

لہ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عربوں کی زندگی میں جو انقلاب برپا کیا وہ اخلاق و عادات اور قواعد و قوانین تک ہی محدود نہ تھا
بلکہ آپ نے عربوں کے ادب کی اصلاح بھی فرمائی۔ اس جملے کا مفہوم آپ نے یوں بدل دیا کہ مظلوم کی حمایت کرنا تو واضح ہے ۔۔۔ لیکن ظالم
بھائی کی مدد یوں ہو سکتی کہ اسے ظلم سے باز رکھا جائے چنانچہ اسی قول کو اس معنوی ترمیم کے ساتھ حضورؐ نے ادا فرمایا جو مجموعہ
حادیث کا جزء بن گیا۔

اد، حضور کے ساتھ ہو جاتی، ان کے اخلاق درست ہو جانے ان کی روحیں پاکیزہ ہو جاتیں اور وہ اس قابل ہو جاتے کہ یہ سہولت
یدہ اپنا لیں اور یہ صورت حال پیش نہ آتی جو ابتدا ہی سے لا الٰہ الا اللہ کی نظریاتی جنگ چھیڑ دینے کی صورت میں پیش آئی۔
الم عرب کلمۂ حق کے سامنے سینہ سپر ہو گیا۔

لیکن میں یہی کہوں گا۔ کہ اللہ تعالیٰ ہی زیادہ جاننے والا تھا کہ انقلابی عمل کا صحیح راستہ کون سا ہے یہ بات اللہ تعالیٰ کے علم
صحیح اخلاقی اور ٹھوس کردار کی تعمیر صرف عقیدہ اور نظریہ ہی کی اساس پر ہو سکتی ہے یہ نظریہ ہی ہوتا ہے جو انسانوں کے لئے اخلاقی
ضبط کرتا ہے۔ عقیدہ ہی انسان کو اس ذات سے متعارف کراتا ہے جو اخلاقی قدروں اور اخلاقی اصول کا ماخذ و مصدر ہوتی ہے
ی رو سے جزا و سزا کا تعین بھی ہوتا ہے جو ان اصولوں کی نافرمانی کی صورت میں دی جائے گی۔ اگر اس عقیدے کا تعین نہ ہو اور نظریات
ول تو اس صورت میں جو اصلاحی کام بھی ہو گا، جو اخلاق بھی تعمیر ہوں گے وہ خام ہوں گے ان کا کوئی ضابطہ نہ ہو گا، کوئی قوت
ہو گی اور نہ خلاف ورزی کی صورت میں جزا و سزا کا کوئی معقول انتظام ہو گا۔

لیکن اس کے برعکس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو طریق کار اختیار کیا وہ کس قدر کامیاب ثابت ہوا؟ اس کا اندازہ تحریک اسلامی کی
بخوبی ہو سکتا ہے آپ نے نظریات کا اعلان فرمایا۔ ان کے لئے انتھک جدوجہد کی، لوگوں کے دل و دماغ میں اسلامی نظریات
ہو گئے، ان نظریات کے خطوط پر ایک ریاست تشکیل پائی اور اس کا اقتدار مضبوط ہو گیا، لوگوں نے اپنے رب کو پہچان لیا اور صرف اسی
کرنے لگے، انسان انسان کی بندگی سے آزاد ہو گیا اور ہر طرف لا الٰہ الا اللہ کی حکمرانی شروع ہو گئی اور اس نظریہ کے ماننے والوں
کی تربیت ہو گئی جو اللہ کو مطلوب تھی تو اس طریق کار کے عظیم الشان نتائج سامنے آ گئے، اس زمین کو رومیوں اور اہل فارس کے ناپاک
سے پاک کر دیا گیا اور یہ کام اس لئے نہیں کیا گیا تھا کہ وہاں رومیوں اور فارسیوں کی جگہ عربوں کی سلطنت قائم ہو جائے بلکہ صرف اس لئے
کہ ارض پر صرف اللہ تعالیٰ کی حکمرانی ہو اور اس ان تمام طاغوتوں سے، پاک کر دیا جائے خواہ یہ رومی ہوں، فارسی ہوں یا عربی ہوں۔

اس طریق کار کے مطابق جو انقلاب رونما ہوا اس کے اثرات یہ ہوئے کہ معاشرے کو ہر قسم کے ظلم و ستم سے پاک کر دیا گیا۔ ایک خالص
ی نظام زندگی قائم ہوا جس کی اساس عدل و انصاف اور مساوات پر تھی، اس میں تمام انسانوں کے ساتھ یکساں سلوک ہونے لگا۔
انصاف کا جھنڈا صرف خدائے واحد و برتر کے نام کا بلند ہوا اور اس میں اس کے ساتھ کوئی دوسرا اعزہ شریک نہ تھا۔ اسلامی
کے علم پر صرف لا الٰہ الا اللہ لکھا ہوا ہوتا تھا۔

لوگوں کے اخلاق درست ہو گئے، نفوس پاک ہو گئے، ان کے دل اور روح آئینہ بن گئے وہ اس طرح پاک ہوئے کہ اللہ تعالیٰ کی مقرر
حدود و تعزیرات کے نفاذ کی زیادہ ضرورت بھی پیش نہ آئی کیونکہ خود ہر فرد کے دل میں ایک چوکیدار بیٹھ گیا تھا۔ اللہ کی رحمت کی
اری، اس کی رضا جوئی اور عذاب آخرت کا ڈر ہی دراصل محافظ تھے جو ہر وقت ہر انسان کے ساتھ لگے رہتے تھے۔ اسلامی نظام
رف عرب اور مسلم معاشرے تک ہی محدود نہ رہا بلکہ اس سے پوری انسانیت کو فائدہ پہونچا اس کی تنظیم اور اجتماعی نظم و نسق کو
سبب ہوئی اور اس نے وہ کمال حاصل کیا جو اس سے پہلے اس نے کبھی حاصل نہ کیا تھا۔

یہ انقلاب اس خوش اسلوبی سے محض اس لئے وقوع پذیر ہوا جن لوگوں نے اسلامی نظام حیات کو ایک ریاست، ایک نظام
الون اور ایک حکومت کی شکل میں قائم کرنے سے قبل اسے خود اپنی زندگیوں میں نافذ کر دیا، یہ دین ان کی زندگیوں میں رچ بس گیا تھا

یہی ان کا عقیدہ تھا، یہی ان کا اخلاق تھا۔ یہی ان کی عبادت اور عام طرز عمل تھا۔

پھر ان لوگوں نے یہ کام کسی دنیاوی غرض کے لئے نہ کیا تھا بلکہ ان کے پیش نظر صرف فلاح اُخروی اور جنت الماویٰ تھی، یہ تک مطلوب نہ تھا کہ انہیں یہاں غلبہ نصیب ہو یا انہی کے ہاتھوں سے نظام اسلامی کا قیام عمل میں آ جائے بلکہ ان تمام کوششوں، ان تمام ناقابل برداشت ابتلاؤں اور حق و باطل اور اسلام و جاہلیت کی اس طویل کشمکش کے صلے میں ان کے لئے صرف ایک تمنا تھی۔۔ یعنی رضائے الٰہی اور فلاح اُخروی: لا الٰہ الا اللہ کا نعرہ جو ان کی تمام کوششوں کا عنوان تھا اس نعرہ کو ہمیشہ خطرناک قرار دیا گیا، خصوصاً ان لوگوں کی طرف سے اس نعرۂ حق کی سب سے زیادہ مخالفت ہوئی جو صاحب اقتدار و اختیار تھے۔

اقتدار کب ملتا ہے۔

قرن اول کے ان لوگوں کو جب اللہ نے آزمایا اور وہ اس آزمائش میں پورے اُترے، ان کے نفوس ہر قسم کی نفسانی آلائشوں سے پاک ہو گئے اور جب اللہ نے دیکھ لیا کہ وہ اس دنیائے دنی کے کسی ذلیل و حقیر مقصد کے لئے نہیں لڑ رہے، یہاں تک کہ وہ یہ بھی نہیں چاہتے کہ صرف انہی کے ہاتھوں اس دعوت کو کامیابی حاصل ہو اور اسلامی نظام حیات کا قیام عمل میں آ جائے نیز ان کے دل قومیت اور وطنیت اور نسل پرستی، فتنہ و فساد اور قبائلی عصبیت جیسے پست جذبات سے پاک ہو گئے اور انہیں ان باتوں سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہ رہا اور ان میں وہ تمام مطلوب خوبیاں اور کمالات پیدا ہو گئے جو اللہ کو مطلوب تھے تو پھر خود اللہ کا فیصلہ صادر ہوا کہ یہ لوگ اب اس امانت کے سنبھالنے کے قابل ہو گئے ہیں اور یہ اس عقیدے اور نظریہ حیات کے امین ہو سکتے ہیں جس میں حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کا ہو، کیونکہ یہ عقیدہ ان کے دل و جان میں جاگزیں ہو چکا ہے ان کے شعور و عمل کا جزو بن چکا ہے، اور وہ ان کے جان و مال پر غالب و مسلط ہے اس لئے وہ اس قابل ہیں کہ اقتدار اعلیٰ ان کے سپرد کر دیا جائے، جس کے ذریعہ وہ اللہ کی شریعت کو اس دنیا میں چلائیں اور خالص خدائی عدل و انصاف جاری کریں، جو کچھ کریں وہ رضائے الٰہی کے لئے کریں کیونکہ اسی نے یہ امانت ان کے سپرد کی ہے اور ان کے پیش نظر اپنی ذات اپنا خاندان اور اپنی قوم یا اپنا قبیلہ ہرگز نہیں ہے۔

غرض اسلامی نظام حیات کا قیام اور اس کی سربلندی صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ اس کے قیام کے لئے وہی طریق کار اختیار کریں جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی رہنمائی میں، اختیار فرمایا یعنی لا الٰہ اللہ کا علم بلند کرنا اور اس کلمے کے ساتھ کسی اور کلمے، نعرے، اور نظریئے کو شریک نہ کرنا اگرچہ بظاہر یہ طریق کار نہایت مشکل اور پرخطر تھا لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں یہی طریقہ پسندیدہ تھا اس لئے اس کو اختیار کیا گیا۔

اگر دعوت اسلامی کو ایک قومی تحریک، وطنی تحریک، مقدس اجتماعی تحریک یا اخلاقی اور اصلاح معاشرہ کی تحریک کی شکل میں (جیسا کہ ہم سے) اٹھایا جاتا تو اس کے نتیجے میں برپا ہونے والا نظام حیات خالص خدائی نظام حیات نہ ہوتا۔ اور اس تحریک کا علم وہ نہ ہوتا جو تحریک اسلامی کا تھا یعنی لا الٰہ الا اللہ۔

یہ طریق کار کیوں۔

پورے مکی دور میں قرآن کریم نے اسلام کی نظریاتی اساس لا الٰہ الا اللہ کو دل و دماغ میں بٹھانے کی کوشش کی اور اس کے لئے وہ بہترین طریق کار اختیار کیا گیا جس کا اوپر ذکر آ چکا ہے اور کسی وقت بھی اسے چھوڑ کر کوئی دوسرا طریق کار اختیار نہیں کیا گیا بلکہ ہمیشہ

اسی پر اصرار کیا گیا نیز قرآن مجید نے دعوت کے آغاز اور مکی دور میں صرف عقائد و نظریات ہی پر زور دیا اور نظام اسلامی کی فقہی اور شرعی کو نہیں چھیڑا، یہ طریق کار محض اتفاقی طور پر نہیں اختیار کیا گیا بلکہ اس میں گہری حکمت کارفرما تھی اور دعوت اسلامی کے ہر کارکن کا ہے کہ وہ سوچ بچار کر کے معلوم کرے کہ وہ حکمت کیا تھی ؟

حقیقت یہ ہے کہ اس نظام حیات کے مزاج کا تقاضا یہی تھا کیونکہ پورے نظام کی تشکیل اور تمام تر فقہی اور ضوابط کی تعمیر و تدوین صرف اسی ایک اساس پر ہوتی تھی یعنی عقیدہ توحید اور اسلامی نظام حیات کا اساسی نظریہ! یوں سمجھئے کہ یہ ایک تناور درخت ہے جو دُور تک پھیلا ہوا ہے جس کی شاخیں لمبی اور گھنی ہیں ۔ اور وہ دور تک فضا میں بلند ہو گیا ہے لیکن اس کے وجو اس کے لئے ضروری ہے کہ اس تناوری اور طول و عرض اور بلندی و ضخامت کے لحاظ سے زمین کے اندر دُور تک اس کی جڑیں گہری ہوا تک پھیلی ہوئی ہوں اور یہی مثال اسلامی نظام حیات کی بھی ہے وہ زندگی کا جو نظم پیش کرتا ہے وہ جامع ہے ۔ زندگی کے ہر پہلو ہے، ہر چھوٹے اور بڑے اس کے بارے میں فیصلے کرتا ہے، یہ زندگی کے صرف دنیاوی دائرے تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ فلاح اُخروی ضامن ہے، صرف دنیائے چشم و گوش ہی سے سروکار نہیں رکھتا بلکہ پردہ ہائے غیب کے اندر مستور" ایک بڑے جہان" سے بھی گہری دلچ ہے یہ اسے انسان کے صرف ظاہری اور مادی معاملات ہی سے دلچسپی نہیں بلکہ وہ اس کا تعلق انسانی ضمیر کی گہرائیوں سے بھی ہے اور کے" راز ہائے سینہ" اور" اندرونی عالم نہاں" سے بھی گہرا ربط رکھتا ہے، ہاں! تو جب وہ ایک عظیم درخت ہے جس کی شاخیں حیا انسانی کے ایک وسیع تر خطے میں پھیلی ہوئی ہیں تو یہ امر نہایت ضروری ہو جاتا ہے کہ اس وسعت اس ضخامت اور اس عمق اور پھیلاؤ کا اس کی جڑیں بھی کشت زار دل و دماغ میں نہایت ہی گہری ہوں ۔ "اصلها ثابت فی الارض وفرعها فی السما"

اسلامی نظام حیات کے مزاج اور اس کی تعمیری باریکیوں کا یہ ایک خاص پہلو ہے کہ وہ اپنی تعمیر اور پھیلاؤ میں ایک خاص طرا اختیار کرتا ہے اور وہ اس بات کو حد درجہ اہمیت دیتا ہے کہ اس کی نشو و نما اور تعمیر جن عقائد و نظریات پر ہو رہی ہے وہ دل و دماغ درجہ متمکن ہو جائیں، نفس انسانی اور انسانی فکر و عمل کو پورے طور پر اپنے رنگ میں رنگ دیں اس کی جڑوں اور تناور شاخوں کے درمیا خاص تناسب ہو اور جڑیں اس قدر مضبوط اور طاقت ور ہوں کہ فضا میں پھیلی ہوئی بلند شاخوں اور بھاری تنہ کا بوجھ بسہولت سہار سکیں

اس طریق کار کے مطابق جب کسی فرد اور گروہ کے دل و دماغ کی گہرائیوں تک لا الٰہ الا اللہ اُتر جاتا ہے، تو اس کی زندگی نظام حیات کی بنیاد پڑ جاتی ہے جیسے ایک کلمہ پر تعمیر ہوتا ہوتا ہے اور اس کی جھلک اس میں نظر آتی ہے ۔ جوں جوں اس تفصیلات سامنے آتی ہیں لوگ برضا و رغبت انہیں اپناتے جاتے ہیں کیونکہ ان کی جڑیں پہلے سے ان کے دل میں ہوتی ہیں یہی معاملہ کرام کا تھا کہ مکی دور کی اس فکری تطہیر اور صالح عقائد کی وجہ سے ان کے ذہن نہ صرف یہ کہ اسلامی احکام کے لئے آمادہ تھے بلکہ اتر اور آرزو مند تھے حالانکہ احکام کی تفصیلات ابھی تک پردۂ اخفا میں تھیں ۔ دور مدنی میں ہمیں جو معجزانہ تسلیم و انقیاد نظر آتا ہے وہ فقط را راسخ اور صالح نظریات کی تشکیل کا رہین منت ہے۔ اس ایمانی کیفیت کے بعد حالت یہ ہو گئی تھی کہ شرعی احکامات آ رہے ہیں، نظم و بارے میں ہدایات نازل ہو رہی ہیں اور ان پر بے چون و چرا اور کامل تسلیم و رضا کے ساتھ عمل ہو رہا ہے۔ یہاں تک کہ صحابہ کرام ا تک کے موجود احکام و ہدایات پر عمل پیرا ہو کر مزید احکام ہدایات کے منتظر رہتے ہیں اور جو حکم آ جاتا ہے اس کی تعمیل کی دیر نہیں کرتے یہی وجوہات تھیں جن کی وجہ سے شراب نوشی ختم ہوئی، سودی کاروبار کا نام و نشان تک نہ رہا ۔ قمار بازی کا وجود

اور تمام جاہلی عادات اور اوضاع و اطوار اس طرح مٹے کہ گویا کبھی تھے ہی نہیں۔ اور سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ان احکام کے سننے کی بس دیر تھی ان کی تعمیل میں دیر نہیں لگی۔

اس کے برعکس ان نظاموں کا حال دیکھ لیجئے جن کی تعمیر اس طریق کار کے برعکس متعارف دنیاوی طریقوں کے مطابق ہوتی ہے۔ آج کل اگر کوئی حکومت ان منکرات کو بند کرنا چاہتی ہے تو وہ مقننہ، انتظامیہ اور پولیس اور فوج کی تمام طاقت کے ساتھ نشر و اشاعت کے تمام ذریعے کام میں لاتی ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ پھر بھی اُسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور وہ چند ظاہری اور خلاف قانون چیزوں پر ہی کنٹرول کر سکتی ہے جبکہ معاشرہ کی اندرونی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ منہیات اور منکرات سے اٹی پڑی ہوتی ہے۔

نظریہ اور تحریک ساتھ ساتھ۔

اس مضبوط طریق کار کو سمجھ لینے ہی سے، اس دین کے مزاج اور خصوصیات کا ایک اور پہلو بھی روشن ہو کر سامنے آجاتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ دین درحقیقت ایک بہترین علمی اور متحرک پروگرام ہے اور یہ آیا ہی اس لئے ہے کہ زندگی کے تمام واقعات و حقائق پر نافذ و حکمراں ہو، یہ زندگی کے حقائق کا سامنا اس حیثیت سے کرتا ہے کہ ان پر اپنے اوامر نافذ کرے انہیں برقرار رکھے، یا بدل دے، یا سرے سے منسوخ کر دے یہی وجہ ہے کہ اس دین میں قانون سازی صرف انہی امور کے متعلق ہوتی ہے جو عملاً واقع ہو چکے ہوں اور یہ بھی ایک ایسے معاشرے میں جس نے آغاز ہی میں صرف اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا اقرار کر لیا ہو۔

یہ دین کوئی ایسا "نظریہ" نہیں ہے جو محض مفروضات سے دلچسپی رکھتا ہو بلکہ یہ ایک ایسا نصب العین اور پروگرام ہے جس کا معاملہ تمام تر واقعات حیات سے ہے۔ لہٰذا اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ پہلے ایک معاشرہ موجود ہو جو لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کرے یعنی یہ کہ حاکمیت اللہ کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہے اور اس کے ساتھ اللہ کے سوا تمام دوسرے لوگوں کی حاکمیت کا انکار کرے اور ایسے تمام طور طریقوں کو ترک کر دے جو اس قاعدے کے خلاف ہوں اور نہ اُنہیں جائز سمجھے، جب ایسے معاشرے کا قیام عملاً و فعلاً ہو جائے تو اس وقت محض ایک خیالی معاشرہ کے بجائے وہ ایک حقیقی اور زندہ معاشرہ ہو گا جسے تنظیم اور قانون سازی کی ضرورت پڑے گی ایسے حالات میں پھر یہ دین اس معاشرہ کی اجتماعی زندگی کی تنظیم شروع کر دیتا ہے اور قانون سازی کا کام شروع ہو جاتا ہے اور یہ قانون سازی اس قوم کے لئے ہوتی ہے جو دل و جان سے نظم و قانون کی مطیع ہو چکی ہے اور جس نے تمام غیر دینی نظاموں اور قوانین کو سرے سے ترک کر دیا ہوتا ہے۔

اس صورت حال کے پیش نظر ضروری ہو جاتا ہے کہ جو لوگ ایسے نظریات و عقائد کے حامل ہوں انہیں خود اپنے آپ اور اپنے معاشرے پر خود مختاری حاصل ہو، جو اس معاشرے میں اس نظام حیات کے نافذ کرنے کی ضامن ہو تاکہ لوگوں کے دل میں اس نظام کا احترام ہو۔ لوگوں کو معلوم ہو کہ یہ شریعت ایک حقیقت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ معاشرہ میں ایسے حالات بھی موجود ہوں جو فوری نظم و نسق اور قانون سازی کے متقاضی ہوں۔

۱۔ تحریم شراب کے سلسلہ میں ملاحظہ ہو میری تفسیر ظلال القرآن جلد ۵ از ص ۷۸ تا ۸۰ ایڈیشن۔ نیز ملاحظہ ہو الاستاذ المودودی کتاب "تحقیقات" بحوالہ ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین، از ابوالحسن علی الندوی

اقامت دین کے لئے حکومت کی ضرورت ۔

جب مسلمان مکہ میں تھے تو انہیں اپنے آپ پر خود مختاری حاصل نہ تھی ۔ نہ معاشرہ پر انہیں کوئی اختیار حاصل تھا نہ ان کی زندگی کسی طرح مستقل اور آزاد تھی کہ وہ خود ہی اسے اللہ کی شریعت کے مطابق چلا سکتے ہوں ۔ اس لئے زندگی کے اس دور میں اللہ تعالیٰ نے نظم ونسق اور قانون سازی کے متعلق احکامات نازل نہیں فرمائے اس دور میں عقائد نازل ہوئے عقائد کی مضبوطی اور پختگی کے بعد ایسے اخلاقی احکامات آئے جو ان عقائد پر مبنی ہوتے تھے ۔ لیکن جس وقت مدینہ طیبہ میں انہوں نے اپنی ایک مستقل حکومت قائم کر لی جس میں وہ بالکل خود مختار تھے تو اس وقت اسلامی قوانین کا نزول شروع ہوا ، مسلم معاشرہ کے لئے ایک ایسا نظام متعین ہوا جو اس کی تمام حقیقی ضروریات کا کفیل تھا یہ ایسا نظام تھا جس کی پشت پر ایک حکومت اور ایک قوت نافذہ بھی تھی ۔

اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ نہ تھی کہ مکہ مکرمہ ہی میں قوانین اتار دے تاکہ وہ خزانہ قوانین میں تیار رکھے ہوں اور مدینہ طیبہ میں حکومت بنتے ہی نافذ کر دئے جائیں ۔ یہ طریق کار اس دین کے مزاج کے خلاف ہے یہ دین ایک نہایت ہی حقیقت پسندانہ اور واقعیت جویانہ دین ہے وہ از خود مشکلات فرض کر کے ان کے لئے حل تلاش کرنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ وہ صرف ان امور کی طرف متوجہ ہوتا ہے جو حقائق ہوں ایسے حقیقی مسلم معاشرے کی طرف متوجہ ہوتا ہے جس نے اللہ کی شریعت کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا ہو اور اس کے سوا تمام دینوں سے منہ پھیر لیا ہو اس کا سلوک بعینہ اس معاشرے کی وسعت اس کی نوعیت اور اس کے وقت واحوال کے مطابق ہوتا ہے ۔ تاکہ قوانین ، معاشرہ کی وسعت اور حالات و ضروریات کے مطابق ہوں ۔

جو لوگ اس وقت اسلام سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ مجوزہ نظام حیات کے طور طریقے اور شکلیں متعین کرے اور زندگی کے لئے مفصل قوانین وضع کرے جبکہ صورت حال یہ ہے کہ اس وقت کرۂ ارض پر کوئی ایسا معاشرہ موجود نہیں ہے جس نے عملاً اس بات کا اقرار کر لیا ہو کہ اس میں صرف خدا کی شریعت کی حکمرانی ہوگی اور اس نے تمام غیر اسلامی شرائع و قوانین کو ترک کر دیا ہو اور اس کے پاس اسلامی قوانین کے نفاذ کے لئے قوت نافذہ بھی ہو ۔ جو لوگ اسلام سے ایسی توقعات رکھتے ہیں انہوں نے درحقیقت اس دین کے مزاج ہی کو نہیں پایا ، بدقسمتی سے وہ نہیں جانتے کہ یہ دین اللہ کے پسندیدہ طریق کار کے مطابق کس طرح عملی شکل اختیار کیا کرتا ہے ۔

اس انداز پر سوچنے والے لوگوں کا اصل منشا درحقیقت یہ ہوتا ہے کہ وہ دین کے مزاج ، اس کے طریق کار اور اس کی تاریخ کو بھول جائیں وہ انسانی نظریات اور انسانی طریق ہائے حیات کے مطابق ہو جائے وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ یہ دین اپنے طریقہ کار اور اقدامات کو چھوڑ کر ان کی وقتی خواہشات اور نفسانی تقاضوں کو پورا کر دے اور یہ ایسی خواہشات ہیں جو انسان کے وضع کردہ چھوٹے بڑے نظامہائے حیات کے مقابلے میں ان کی انسانی اور اندرونی شکست خوردگی کی آئینہ دار ہیں ، یہ لوگ چاہتے ہیں کہ یہ دین اپنے آپ کو نظریات اور مفروضات کی شکل میں ڈھالنے اور مستقبل کی طرف متوجہ ہو جو سرے سے موجود ہی نہیں رہے ۔ لیکن اللہ نے اس دین کے لئے وہی طریق کار پسند فرمایا ہے جو اسے پسند ہے یعنی یہ کہ وہ ایک عقیدہ ہو جو دل و دماغ پر چھا جائے ۔ انسانی ضمیر پر اس کی حکومت ہو ، اس عقیدے کا لازمی تقاضا یہ ہو کہ اس کا ماننے والا اللہ کے سوا کسی کے آگے نہ جھکے اور یہی عقیدہ قانون و شریعت کا ماخذ بھی ہو اور اس کے سوا کوئی دوسرا ماخذ نہ ہو جب اس عقیدے کے حاملین موجود ہوں اور انہیں اپنے معاشرے پر اقتدار بھی حاصل ہو تو پھر ان کی واقعی ضروریات کے لئے قانون سازی کا کام شروع ہو اور واقعی زندگی کی تنظیم وتشکیل کا آغاز ہو ۔

یہ ہے وہ طریق کار جسے اللہ نے اس دین کی اقامت کے لئے منتخب فرمایا ہے۔ آپ یقین کریں کہ وہی ہوتا ہے جو منشائے خدا ہوتا ہے۔ رہیں لوگوں کی نفسیاتی خواہشات تو جو ہوتی رہیں ہوا کریں۔

دعوت اسلامی کے حامیوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس طریق کار کے مطابق جب بھی وہ لوگوں کو دین کی طرف بلائیں، انہیں سب سے پہلے اسلامی نظریہ حیات سے روشناس کرائیں یہ بات صرف غیر مسلموں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ لوگ اپنے آپ کو مسلم کہلاتے ہیں اور مردم شماری کا ریکارڈ بھی گواہ ہے کہ وہ مسلمان ہیں ان کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ لا الٰہ الا اللہ کا نئے سرے سے اقرار کریں، اس کے مفہوم اور مراد کو سمجھیں، حاکمیت کو خاصہ خدا سمجھیں اور اس میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور یہ بھی زندگی کے ایک محدود دائرے میں نہیں بلکہ پوری زندگی میں، اس کے ساتھ ساتھ وہ ان لوگوں کی حاکمیت کا بھی صاف صاف انکار کر دیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس حق حاکمیت کو اپنے لئے مخصوص کر لیا ہے اور یہ اقرار بھی دل کی گہرائیوں سے پورے شعور کے ساتھ ہو اور اس کا اظہار انسانی زندگی کے علمی و عملی طور طریقوں میں اور معاملات میں بھی ہوتا ہو۔

پہلے فکری اصلاح اور پھر قانونی اصلاح۔

لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دینے کی اساس ہی نظریاتی اقرار ہونا چاہیے۔ یہی اقرار اول روز سے دعوت اسلامی کی بنیاد رہا ہے، مکہ مکرمہ میں پورے تیرہ سال تک قرآن مجید اسی کی طرف بلاتا رہا جب لا الٰہ الا اللہ کا یہ مفہوم سامنے رکھتے ہوئے ایک اچھی خاصی جمعیت دین اسلام میں داخل ہو گئی تو اس گروہ پر اسلامی معاشرہ کا اطلاق ہونے لگا۔ یعنی وہ معاشرہ جس میں اسلامی نظام حیات، انسانوں کی اجتماعی زندگی ہو سکتا ہو کیونکہ اپنے عقیدے اور اقرار کی رو سے اس معاشرے نے فیصلہ کر لیا ہوتا ہے کہ آئندہ اس کی پوری زندگی کا ارتقاء اس عقیدے کی بنیاد پر ہو گا اور یہ کہ وہ اپنی پوری زندگی میں صرف اللہ تعالیٰ ہی کو حکمران تسلیم کرے گا جب اسلامی نظام حیات کی اساس مستحکم ہو جاتی ہے۔ تو اس کے بعد اسلامی نظام کے تفصیلی منصوبے کا نفاذ شروع ہو جاتا ہے۔ معاشرے کی فعال طاقتیں خود بخود ایسے اسلامی قوانین کا اجراء شروع کر دیتی ہیں، جن کا تعلق معاشرتی زندگی کی حقیقی ضروریات سے ہوتا ہے۔ نظریاتی اساس کی پختگی کے بعد جو تفصیلی قوانین وضع ہوتے ہیں وہ اسلامی نظام کے نظریاتی اصولوں کی روشنی میں ہوتے ہیں، غرض اسلامی نظام کے نفاذ اور قیام کا یہی صحیح اور متوازن طریق کار ہے اس کے علاوہ کسی دوسرے طریق کار کے ذریعہ ان زریں علمی اور واقعیت پسندانہ اصولوں کا نفاذ ممکن نہیں ہے۔ تحریک اسلامی کے بعض مخلص لیکن جلد باز کارکنوں کا خیال یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے نظام اسلامی کے بنیادی نقوش ہی نہیں بلکہ تفصیلی تشریحات تک کو پیش کر دینا نہایت ضروری ہے اس سے ایک طرف تو لوگ دین اسلام میں دلچسپی لیں گے اور دوسری جانب یہ فائدہ بھی ہوگا کہ دعوت دین کا کام بہت آسان ہو جائے گا۔ اس طرز پر سوچنے والے لوگوں نے دراصل اس دین کی حقیقت و مزاج پر غور نہیں کیا اور نہ رب العٰلمین کے مضبوط "منہاج کار" کو سامنے رکھا ہے، جو اس ذات علیم و حکیم کی حکمت خاص پر مبنی ہے، وہی انسانی طبائع اور زندگی کی حقیقی ضروریات کو صحیح معنوں میں جانتا ہے۔

یہ خیال دراصل جذبات سے پیدا ہوتا ہے اور اس کی مثال اس طرح ہے جیسے کہ کوئی یہ کہے کہ سہولت کار کی خاطر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعوت کو ایک قومی نصب العین کے عنوان سے یا کسی اجتماعی نصب العین کے رنگ میں یا کسی اخلاقی اصلاح کے نام سے شروع کرتے اس صورت میں آپ کو وہ مشکلات پیش نہ آتیں جو آئیں۔ لیکن یہ انداز فکر مستقیم نہیں ہے سب سے پہلے ہمیں چاہیے کہ ہم اللہ کی طرف یکسو ہو جائیں اس کی مکمل اطاعت کا اعلان کر دیں، اس کی شریعت کو غیر مشروط طور پر تسلیم کر لیں اور اس کے علاوہ تمام دوسرے شرائع کا انکار کر دیں یہ وہ کام ہے جو سب سے پہلے ہونا ضروری ہے اور اسے نظام اسلامی کی تفصیلات پیش کرنے سے پہلے سرانجام پا جانا چاہیے۔ اور اس کے بعد

ہ نظام کی تفصیلات پیش کی جائیں جو ان لوگوں کے لئے افادیت رکھتی ہیں اور مرغوب ہیں تاکہ شریعت کی جانب میلان اور سرِ رغبت کی اساس
س اطاعت الٰہی ہو اور شریعت پر عمل کرنے والوں کے پیش نظر یہ ہو کہ وہ غیر اللہ کی غلامی سے آزاد ہو کر صرف اللہ کی غلامی چاہتے ہیں۔
پیش نظر صرف یہ جذبہ ہونا چاہئے کہ اسلامی نظام حیات کو وہ اس لئے قبول کر رہے ہیں کہ وہ اپنی تفصیلات کے لحاظ سے دوسرے نظاموں سے
بہے۔ اس میں شک نہیں کہ نظام اسلامی اپنی جگہ ایک بہترین اور افضل ترین نظام ہے کیونکہ وہ اللہ کے تجویز کردہ قانون کی شکل میں آیا ہے اور
ہے کہ کوئی انسانی قانون کبھی الٰہی قانون کا ہمسر نہیں ہو سکتا لیکن یہ چیز اصول دعوت میں سے نہیں ہے۔ دعوت دین کا اصل الاصول یہ ہے کہ
کی تشریع کو قبول کیا جائے خواہ وہ جیسی بھی معلوم ہو اور غیر اللہ کی شریعت کو رد کیا جائے خواہ وہ خوش نما کیوں نہ ہو۔ یہی ہے حقیقت اسلام۔ اس کے
سلام کا کوئی اور مفہوم نہیں ہے۔ جو شخص ابتدائی طور پر اسلام کی طرف مائل ہو گیا اسی بنا پر گویا قضیہ کا فیصلہ کر دیا۔ اب اسے اس نظام کی خوبصورتی
افضلیت سمجھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے ایمان کی بدیہیات میں شمار کیا جا سکتا ہے[1]

نظریاتی اصلاح کا انداز۔

اس موقع پر ہمارے سامنے قدرتی طور پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ قرآن مجید نے پورے تیرہ سالہ مکی دور میں عقائد کے مسئلہ کو کس طرح حل کیا؟
صل قرآن مجید نے عقائد کو نہ تو محض نظریہ کے طور پر پیش کیا ہے اور نہ مسائل کو "لاہوت" کی شکل میں بیان کیا ہے نیز اس نے علم کلام کے
مادل اصطلاحات کا وہ انداز بھی اختیار نہ کیا، جو "علم التوحید" کے عنوان سے کلامی کتابوں میں موجود ہیں۔

بلکہ قرآن مجید نے براہ راست فطرت انسانی سے خطاب کیا، جو اس کے وجود کے اندر ودیعت تھی۔ نیز اس نے استدلال کا بنیادی سادہ
طریقہ اختیار کرتے ہوئے انہی فطری دلائل و شواہد سے استدلال کیا جنہیں ہر انسان اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی کائنات میں دیکھ رہا تھا۔ اسلام کا
انسانیت پر یہ عظیم احسان ہے کہ اس نے فطرت انسانی کو جاہلیت کی دبیز تہوں کے نیچے سے نکالا، اور اس کے دل و دماغ کو اوہام کے زنگ سے
صاف کیا جس نے اسے سوچنے سمجھنے اور قبولیت حق کی استعداد سے محروم کر دیا تھا۔ قرآن نے ان کے دل و دماغ کے دروازے قبول حق کے لئے
وا کر دئے اور انسان اس قابل ہو گئے کہ صالح افکار و خیالات کو اخذ کر سکیں۔

---

[1] مصنف یہاں تسلیم و رضا کے اعلیٰ مدارج بیان کر رہا ہے جس کے بعد کسی کو شریعت محمدیہ کی فضیلت بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی
لیکن ظروف و احوال کی تبدیلی سے دعوت دین کے طریق کار میں تبدیلی ضرور ہوتی ہے ایک وہ وقت تھا کہ پوری انسانیت نظام اسلامی
و اسلامی تہذیب کو افضل ترین تہذیب کی حیثیت سے مانتی تھی۔ مسلمان دنیا میں مہذب ترین مخلوق تھے۔ لیکن اس وقت صورت
حال یہ ہے کہ نہ صرف غیر مسلم بلکہ اکثر مسلمان بھی اسلام کی افضلیت کے قائل نہیں بلکہ وہ اسے قابل عمل ہی نہیں سمجھتے۔ اس لئے ان
حالات میں ہمیں نہ صرف یہ کہ اسلام کی افضلیت کو اجاگر کرنا ہے بلکہ دنیا پر یہ ثابت کرنا ہے کہ اسلام قابل عمل بھی ہے۔ یہی وجہ ہے
شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس میدان میں گرانقدر تصانیف پیش کیں۔ آپ سے پہلے امام غزالی نے بھی اس موضوع پر
قلم اٹھایا خود قرآن اور حدیث سے یہ ثابت ہے کہ خدا اور رسول نے اسلام کی افضلیت اور افادیت کو بطور ترغیب پیش فرمایا ایک موقع پر حضور نے
قریش کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ میں تمہیں اپنے کلمے کی طرف دعوت دیتا ہوں کہ اگر تم اسے تسلیم کر لو تو عرب و عجم تمہارے زیر نگیں
ہو جائیں گے۔ (مترجم)

یہ کام قرآن کریم نے عمومی انداز میں کیا، لیکن اس کے لئے قرآن کریم کے حاملین کو ایک زبردست نظریاتی جنگ بھی لڑنا پڑی۔ کیونکہ اُن اول
رت مسلمہ تعطل کا شکار تھی اور غیر صالح افکار کے تہ بہ تہ پردوں میں مستور تھی۔ اسے اس حالت سے نکالنے کے لئے اسلام کو زبردست جدو
نی پڑی، جب ہم قرآن کے قرون اولیٰ کے اسلامی نظریاتی انقلاب اور زمانہ حال کے نظریات کا مقابلہ کرتے ہیں تو ان میں زمین و آسمان کا فرق
تا ہے۔ اسلام محض نظریہ ہی نہ تھا بلکہ ایک تحریک بھی تھی اور اس تحریک کو اپنے راستے سے رکاوٹیں، بندشوں اور مشکلات کو دور کرنے کے لئے
معرکوں سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ نظریاتی انقلاب محض ذہنی اور جدلی معرکہ نہ تھا جس کی بنیاد منطق پر ہو اور جس کے نتیجے میں کوئی علم الکلام مدون
ئے داگرچہ یہ چیزیں بھی اپنی جگہ ایک اہمیت رکھتی ہیں) [illegible] ن نظریاتی اقدام کا مقابلہ ایک زندہ معاشرے سے تھا جو اپنے طور پر ہر قسم کے
اروں سے مسلح تھا چنانچہ قرآن نے اس صورت حال سے نمٹنے اور اس معاشرے کو توڑنے کے لئے پوری انسانیت سے اپیل کی۔ اسلام کے نظریات
ے لاہوتی شکل بھی مناسب نہ تھی۔ کیونکہ اسلامی نظریہ حیات اگرچہ درحقیقت ایک عقیدہ ہے لیکن عقیدے کے ساتھ خود وہ ایک مکمل نظام
بھی پیش کرتا ہے اور اسے عملاً نافذ کرنے کا بھی مطالبہ کرتا ہے اس لئے وہ اپنے آپ کو لاہوتی کی طرح ایک محدود دائرے کے اندر محدود نہیں کرتا۔

رونی اور بیرونی کشمکش۔

قرآن نے جماعت مسلمہ کے دل و دماغ میں پاک اور صالح عقائد و نظریات بٹھانے کے ساتھ ساتھ یہ کام بھی کیا کہ اس جماعت کو لے کر اپنے
پھیلی ہوئی جاہلیت کے ساتھ جنگ کا اعلان کر دیا اور یہ جنگ اس قدر ہمہ گیر و ہمہ پہلو ہو گئی کہ اس بیرونی جنگ کے ساتھ ساتھ جماعت مسلمہ
ضمیر، اپنے اخلاق اور اپنے معاشرے کے اندر جمے ہوئے جاہلی اثرات کے خلاف بھی لڑنا پڑتا تھا۔ یہ تھے وہ خاص حالات جن کی وجہ سے
نظریہ حیات کی نشوونما ایک خالص نظریہ کی شکل میں یا لاہوت کی شکل میں یا علم کلام کے لاحاصل جدلیات کی شکل میں نہیں ہوئی بلکہ یہ
نما ایک مجسم اور زندہ اجتماعیت کی شکل میں ہوئی، ایک ایسی تنظیم کی شکل میں ہوئی جس کا عملی زندگی سے گہرا تعلق تھا، یہ اجتماعیت اور یہ
جماعت مسلمہ کی اجتماعی زندگی میں عملاً موجود تھی اور کام کر رہی تھی اس تصور حیات کے مطابق امت مسلمہ کے اعتقادی تصورات اور عقائد کے
ان کی زندگی کی تعمیر ہوتی رہی اور جاہلیت کے ساتھ عملی تصادم کی وجہ سے ایک منظم محارب قوت کی حیثیت سے، اس کی عملی تربیت بھی
رہی۔ جماعت کی یہ خارجی نشوونما ہی درحقیقت اس کی نظریاتی تعمیر و ترقی کی آئینہ دار تھی اور یہ عملی جدوجہد جماعت کے عقائد کی زندہ
مانی تھی۔

تحریک اسلامی کے ہر داعی کا یہ فرض ہے کہ وہ اس دین کے مزاج اور تحریک اسلامی میں اس کے پروگرام کو انہی خطوط پر سمجھنے کی کوشش
جن پر ہم نے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ اس پروگرام کے مطابق تعمیر کا یہ طویل ترین مکی دور عملی تعمیر سے خالی
۔ بلکہ اس میں مسلسل تحریک اسلامی کی عملی تشکیل و تعمیر ہوتی رہی اور کارکنوں کی ایک ٹھوس جماعت میدان میں آگئی یہ مرحلہ محض علمی اور نظریاتی
تدریس کا نہ تھا۔ بلکہ اس مرحلہ میں تحریک اسلامی کی بنیادیں تعمیر ہو رہی تھیں۔ یہ بنیادیں انکا مدعقائد اور تحریک اور جماعت کے عملی
پر مشتمل تھیں اور سب کی تعمیر ساتھ ساتھ ہو رہی تھی۔ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے جہاں اور جب بھی کام شروع کیا جائے اسے انہی
طرز پر کیا جانا چاہیے۔[1]

صنف نے بڑی خوبی سے اسلام کی تحریک کو واضح کیا ہے اگر اسے غور سے پڑھا جائے اور حضور اکرم کی سیرت طیبہ سامنے ہو تو اس کے
(باقی صفحہ پر)

تعمیر افکار کا طویل دور اسی طریق کار کے مطابق ہونا چاہئے اور یہ تعمیر بتدریج، عمیق اور مضبوط بنیادوں پر ہونی چاہئے نیز تعمیر عقائد کی فلسفیانہ تدریس تک ہی محدود نہ ہو بلکہ اس فکری تعمیر کے مرحلے کو ان کے عقائد کا زندہ ترجمان بھی ہونا چاہئے اور حالت یہ ہو کہ عقائد زندہ شکل میں چلتا پھرتا نظر آئے اس کا کیف و سرور انسانوں کے دلوں میں جاگزیں ہو اور وہ ایک اجتماعی اور متحرک معاشرہ میں متشکل نظر آئے جس معاشرہ کی تعمیر و ترقی اندرونی طور پر بھی اور بیرونی لحاظ سے بھی ای عقیدے کی تعمیر و ترقی کی زندہ تعبیر ہو نیز اس کے ساتھ وہ معاشرہ زندگی کے میدان میں بھی اور خارجی زندگی کے عملی میدان میں بھی جاہلیت سے برسرپیکار ہو، وہ ایک زندہ عقیدے کا مظہر ہو، اور معرکہ حق و باطل کے طوفانوں میں اس کی نشو و نما ہو رہی ہو۔ اسلامی نقطۂ نظر سے یہ خیال حد درجہ غلط ہے، کہ عقیدے کو محض نظریہ یا محض علمی درس یا محض ادب و ثقافت کے طور پر پڑھا جائے یہ طریق فکر نہایت خطرناک ہے۔

قرآن مجید نے عقائد و نظریات کی تعمیر و تطہیر میں تیرہ سال اس طرح نہیں گزار دئے کہ اس نے کچھ عقائد بیان کر دئے لوگوں کے سامنے عقائد بیان کرنے کے بعد انہیں حال پر چھوڑ دیا ہو، تاریخ اس کے خلاف شہادت دیتی ہے، اگر ایسا ہوتا تو اللہ تعالیٰ پورا قرآن مجید ہی کو ایک دفعہ نازل فرما دیتا اور مسلمان تیرہ سال تک اسے پڑھتے پڑھاتے رہتے یہاں تک کہ وہ پورے نظریہ اسلامی سے واقف ہو جاتے۔

لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ تحریک اسلامی کے لئے ایک خاص اور منفرد طریق کار مطلوب تھا، عقیدہ، تحریک اور جماعت کی تعمیر و تشکیل بیک وقت مطلوب تھی۔ تاکہ عقیدہ ایک فعال و متحرک جماعت کا اوڑھنا بچھونا بن جائے اور اس کی تعبیر جماعت اور تحریک کی شکل میں ہو، ایک فعال جماعت اور ایک منظم تحریک اس عقیدے کا ظاہری قالب ہو اور اس ذات علیم و خبیر کو خوب معلوم تھا نفس کی اصلاح اور کسی جماعت کی تشکیل دنوں اور ہفتوں کا کام نہیں ہے، تربیت اخلاق اور تنظیم جماعت کے لئے جس قدر وقت درکار ہے اتنا ہی وقت تطہیر افکار اور عقائد کی پختگی کے لئے بھی ضرور ہوتا ہے اس طریق کے مطابق جب عقائد راسخ اور کردار پختہ ہو گیا تو امت مسلمہ اسلام کا مظہر بن گئی۔

یہ ہے اس دین کی اہم خصوصیت اور اس کا مزاج، مکی دور کی روشنی میں اس خصوصیت کو سمجھنا نہایت ضروری ہے، ہمارے

(حاشیہ صفحہ ۲۹) ہیں۔ وہ تمام اختلافات از خود ختم ہو جاتے ہیں جو احیائے اسلام کی مختلف تحریکوں کے پروگراموں میں موجود ہیں بعض لوگ وقت اسی کوشش میں ہیں کہ مسلمانوں کے دلوں میں ایمان بٹھا دیا جائے عملی خرابیاں خود بخود ختم ہو جائیں گی۔ جاہلیت کے ساتھ الجھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے جاہلیت کیونکہ حکومت و اقتدار سے کوئی واسطہ نہیں ہے اور یہ کہ حضورؐ نے مکی دور میں محض ایمان و عقائد کی تبلیغ کی ہے سیدھا سادہ مقصد یہ ہے کہ مکی دور میں عقائد کی تعمیر اس طرز پر ہوئی تھی کہ اصلاح حکومت اور جاہلیت سے عملی ٹکراؤ اس کا لازمی نتیجہ تھا ان عقائد کی ذہن نشینی کا لازمی تقاضا اور پہلا نتیجہ عملی تحریک کی شکل میں ظاہر ہوتا تھا اور جس حد تک ممکن تھا اندرونی اور بیرونی جاہلیت سے تصادم کا سلسلہ اول روز سے جاری تھا اگر ایسا نہ تھا تو بیت ارقم میں خفیہ کام کی ضرورت کیا تھی۔ مخالفین کے ساتھ ٹکراؤ اور نام لے لے کر ان کے بتوں سے بیزاری کی کیا ضرورت تھی۔ غیر متحرک اور جامد ایمان کی تبلیغ درحقیقت جاہلیت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے سے گریز ہے۔ حضور لوگوں کو صرف یہ تبلیغ نہیں فرماتے تھے کہ لوگو بتوں کی پوجا چھوڑ دو۔ بلکہ حضورؐ بتوں کی مذمت بھی کرتے تھے، اور جاہلیت کو مٹانے کا اعلان بھی فرماتے تھے۔ لہذا صرف یہ دعوت اور طریقہ کا

ت مشکل ہے کہ ہم زمانہ حاضر کے نظریات سے متاثر ہو کر یا اپنی مخصوص خواہشات کی خاطر اس دین کو بدلنے کی کوشش کریں، اس دین نے اپنی
ی خصوصیات اور اسی مزاج کی وجہ سے تاریخ انسانی میں امت مسلمہ جیسی عظیم امت کو جنم دیا تھا اور آئندہ بھی احیاء امت کی کوئی کوشش
ی کامیاب ہو سکتی ہے تو وہ اسی طریق کار کے مطابق ہو سکتی ہے جس کے مطابق پہلی بار اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو برپا کیا تھا۔

اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ مختلف حلقوں کی طرف سے اسلام کے ان زندہ، متحرک اور واقعیت پسندانہ افکار و نظریات
محض ایک ثقافتی اور تدریسی نظریہ بنانے کی جو کوشش ہو رہی ہیں انہیں بھینٹ اور کامیاب نہ ہونے دیں کیونکہ اسلام درحقیقت ایک فعال
ر زندہ معاشرے میں منعکس ہونا چاہتا ہے اور اس تصور کے مطابق اگر کام کیا گیا تو وہ اپنی اس خصوصیت اور اس مزاج کو کھو دے گا اور
، اسلامی نظریہ حیات کو لیکر دوسرے نظریات کا مقابلہ نہ کر سکیں گے۔

تحریک احیائے اسلام میں اس بات کو بے حد اہمیت حاصل ہے کہ اسلامی نظریہ حیات کا ظہور انسان کی عملی زندگی میں ہو، ایک حقیقی
ظیم کی شکل میں ایک زندہ و فعال معاشرہ کی صورت میں اور ایک ایسی تحریک کے کردار میں جو ہر جانب سے جاہلیت کے ساتھ نبرد آزما ہو۔ یہ
ایک مسلسل کوشش کر رہی ہو کہ خود اپنے اندر سے بھی جاہلی افکار و خیالات اور اطوار و عادات ختم ہو جائیں کیونکہ تحریک میں جو لوگ آتے
ے بہرحال وہ جاہلیت کے صفوف میں سے چھٹ کر آتے ہیں اور اسلامی نظریہ حیات کو قبول کرنے سے پہلے وہ جاہلی افکار کے حامل ہوا
تے ہیں، جب اسلامی نظریہ حیات جاہلی طبقات میں سے انسانوں کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے تو وہ جاہلی افکار سے مکمل طور پر پاک نہ
ف نہیں ہو جاتے کیونکہ جاہلیت انسان کے دل و دماغ، اس کی ذہنیت، بلکہ اس کی عملی زندگی کے اتنے وسیع حصے پر حاوی ہوتی
ے جو محض نظریہ کے محدود دائرہ اثر تک محدود نہیں ہوتا بلکہ اس سے باہر بھی ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جاہلیت نظریات اور نظریات
عناصر ترکیبی پر بھی اثر انداز ہوتی ہے تاہم اس کا دائرہ اثر نظریہ محض سے کہیں وسیع تر ہوتا ہے۔

کائنات کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر

الوہیت وجود کائنات، زندگی اور انسان کے بارے میں اسلام ایک کامل اور وسیع نظریہ رکھتا ہے لیکن ایک نظریہ ہونے کے ساتھ
، واقعیت پسند اور مثبت فکر بھی ہے۔ اسلامی نظریہ حیات اپنے مزاج کے اعتبار سے اس بات سے ابا کرتا ہے کہ وہ محض ایک تصور یا ذہنی فلسفہ
مدرسی نظریہ ہو کیونکہ یہ اس کے طبعی مزاج اور اس کی اصل غرض و غایت ہی کے خلاف ہے اس کا مزاج یہ ہے کہ وہ کچھ لوگوں کی زندگیوں میں ایک
ندہ تنظیم کی شکل میں اور ایک ٹھوس تحریک کی شکل میں ظاہر ہو اور اس کا طریق کار یہ ہے کہ وہ کچھ لوگوں کی زندگیوں میں سے پھوٹ کر نکلے اسے
ت تنظیم ملے اور اس کے پیچھے ایک ٹھوس تحریک ہو اور اس کی تعمیر نظریاتی طور پر ہی نہیں بلکہ عملی طور پر بیک وقت مکمل ہو یہاں نظریت اور
ملیت میں دوئی اور فرق نہیں ہے بلکہ اسلامی نظریہ حیات ایک جیتا جاگتا نظریہ ہوتا ہے اور ایک خیال اور تحریک ہوتا ہے۔ رہی اسلام
ایسی نظریاتی تعبیر جس کے پیچھے کوئی تحریک نہ ہو اور اس کے ساتھ ساتھ کسی قسم کی عملی حرکت نہ ہو، تو یہ ایک نہایت ہی خطرناک تعبیر
ے اور ایک غلط رجحان ہے اور یہ اسلامی نظریہ حیات کی فطرت اس کی غرض و غایت اور ایک فرد کے تزکیۂ نفس کے بلند تر مقصد

ص ۲ کا بقیہ) مقابلہ کافی نہیں ہے کہ اسلامی قانون جاری کیجئے بلکہ اس کے ساتھ یہ اعلان بھی ضروری ہے کہ ہم غیر اسلامی قوانین کو ختم کر کے
م لیں گے۔　　　(مترجم)

سراسر خلاف ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو متفرق طور پر نازل فرمایا۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں و قرآناً فرقناہ لتقرأہ علی الناس علی مکث و نزلناہ تنزیلاً "اور قرآن جسے ہم نے بنایا تاکہ آپ سے لوگوں تک وقفہ وقفہ کے بعد پہونچا ئیں اور ہم نے اسے بتدریج نازل کیا ہے" (اسراء ۱۰۶) یعنی قرآن کریم کو نجماً نجماً اور وقفوں کے مد نازل کیا گیا اور مطلوب تھا کہ اسلامی نظریہ حیات کی بنا اور تعمیر ایک زندہ تنظیم کی شکل میں ہو محض "نظریہ" (THEORY) کی صورت میں نہیں۔

نیز ہمیں اس بات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ جس طرح یہ دین اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ رسول نازل کیا گیا اسی طرح اس کا طریق بھی اللہ تعالیٰ نے سنت رسول کے ذریعہ مقرر فرما دیا اور یہ طریق کار اس دین کے مزاج کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے اور اس دین کو اس کے فطری طریق کار کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہمارے پیش نظر رہے کہ جس طرح دین نظریاتی اصلاح کے ذریعہ انسان کے کردار میں اصلاح اور تبدیلی چاہتا ہے اسی طرح وہ اس طریق کار کو بھی بدل دینا چاہتا ہے جس کے مطابق فکری اور نظریاتی اصلاح درکار ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ محض نظری تعلیم یا فلسفیانہ طور پر نہیں چاہتا بلکہ وہ فکری اصلاح اور رہنمائی کے ساتھ ساتھ ایک تحریک بھی بپا کرنا چاہتا ہے تاکہ ایک ایسی امت کی تشکیل ہو جس کے طرز فکر میں اعتقادی تصورات اور ایک زندہ و فعال معاشرے کا وجود ساتھ ساتھ موجود ہیں۔ غرض اسلامی نظریہ حیات کی رو سے اس کے طرز فکر اور اس فکر کے مطابق اسلامی تصورات اور ان تصورات کے مطابق وجود میں آنے والے معاشرے کے درمیان ایسی کوئی حد فاصل نہیں ہے کہ جب ایک یہ کام ہو رہا ہو تو دوسرے کو ہاتھ نہ لگایا جائے احیائے دین کے اسلامی طریق کار کے مطابق سب پر بیک وقت کام ہوگا۔

اس طریق کار کی اہمیت۔

احیائے دین کے اس طریق کار کو سمجھ لینے کے بعد ہمیں اس بات کو اپنے ذہن میں رکھنا چاہیے کہ یہ طریقہ نہایت اہم اور بنیادی ہے۔ یہ کسی خاص مرحلے کسی خاص خاندان اور کسی خاص معاشرے کے ساتھ مخصوص نہیں ہے اور نہ یہ طریق پہلی تحریک اسلامی کے ظروف و احوال کے ساتھ مخصوص تھا، یہ ایسا طریق کار ہے جس کے سوا احیائے دین کا کام کسی جگہ اور کسی زمانے میں بھی نہیں ہو سکتا۔

اسلام کے پیش نظر صرف یہ نہ تھا کہ لوگوں کے کچھ عقائد میں تبدیلی کرکے اور معاشرتی حالات میں کچھ اصلاحات کرکے بیٹھ جائے بلکہ وہ لوگوں کے فکر و نظر میں ہمہ گیر تبدیلی چاہتا تھا اور یہی وہ اہم تحریک تھی جس کا بیڑا اس نے اٹھایا، انہیں نظریہ بھی دیا اور واقعیت بھی دی اور اس کے لئے ایک خاص طریق کار بھی رہا چونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ طریق کار ہے اس لئے وہ اپنے مزاج کے اعتبار ہی سے انسانوں کے وضع کردہ ناقص طریق ہائے کار سے سراسر مختلف ہے۔

اسلامی تصور حیات اور اسلامی نظام زندگی کا حصول اس وقت تک ناممکن ہے جب تک ہم اپنے اندر اسلامی طرز فکر پیدا نہ کریں اللہ تعالیٰ نے اس طرز فکر پر لوگوں کے افکار و تصورات کی تعمیر کی اور ان کے تمام عقائد درست ہو گئے اور ان کی عملی زندگی کی تشکیل اور تعمیر بھی صحیح خطوط پر ہوئی۔

جدید افکار سے متاثر ہو کر جب یہ اسلامی نظریہ حیات کو محض تعلیمی اور تدریسی نظریہ بنا دیں گے تو وہ اپنا مخصوص مزاج کھو دے گا اور ہم اس ذہنی شکست کا شکار ہوں گے کہ کیا اسلامی طریق کار اس کا نقطہ نظر ان نظریات اور زندگیوں سے دور تر ہے یا یہ کہ وہ ان سے ناقص ہے اور ہم یہ تبدیلی کر کے اس کے نقص کو دور کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ اسلامی طریق کے معیار کے مطابق ہو جائے ـــــ یہ ایک عظیم شکست ہو گی اور تباہ کن بھی۔

اسلامی نظام حیات کی خصوصیت یہ ہو کہ وہ تحریک اسلامی کے کارکنوں کو ایک خاص طرز فکر عطا کرے اور انہیں جاہلی طرز فکر کے بندھنوں سے آزاد کرے جو اس وقت ہر طرف جال کی طرح بچھے ہوئے ہیں اور جن سے ہماری تنظیمیں اور ہماری لوری ثقافت متاثر ہے لیکن اگر ہم اسلامی نظام حیات کو اسی نقطہ نظر سے دیکھیں جو کسی دنیاوی جاہلی نظام کے بارے میں رکھا جاتا ہے تو یہ اسلامی نظام حیات کے مزاج کے سراسر خلاف ہو گا اور اس سے دین کا وہ اصلی مقصد ہی فوت ہو جائے گا جو مقصد وہ فلاح انسانیت کے سلسلہ میں پیش نظر رکھتا ہے۔ اور اس نقطہ نظر کو اختیار کرنے کے بعد ہمارے لئے یہ بے حد مشکل ہو گا کہ ہم جاہلی نظام حیات سے نجات پا سکیں۔ جبکہ یہ نظام اس وقت ہر طرف سے غلبہ پا رہا ہے اس طرح ہم ایک زریں موقع کھو دیں گے اور ہماری اجتماعی زندگی جاہلی نظریات اور افکار کے نیچے دب جائے گی اور اس کے نتائج دور رس اور تباہ کن ہوں گے۔

نقطۂ نظر کا توازن

تحریک احیائے اسلام میں طرز فکر اور طریق کار تصور حیات اور نظام حیات کے درمیان اہمیت کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے طرز فکر اور طریق کار کسی وقت بھی منفصل نظام حیات اور تصور حیات سے منفصل نہیں ہو سکتے اور اس تصور حیات اور نظام حیات کو اگر محض تعبیری شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی تو اس کے نتیجے میں قطعاً کوئی تحریک وجود میں نہ آئے گی اور اسلامی نظریہ حیات محض ذہنی نظریہ بن کر رہ جائیگا اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اگر ہم اسلام کے تصور حیات کو پیش کرنے کے لئے محض تعبیری طریق کار کو اختیار بھی کر لیں تو پھر بھی اس سے وہی لوگ مستفید ہو سکیں گے جو عملاً اس تحریک کو اپنائے ہوئے ہوں اور یہ بھی اس صورت میں کہ جس منزل پر یہ کارکن ہوں اس میں وہ اسلامی نظام حیات کے احکامات پر پوری طرح عمل پیرا ہوں، یعنی اس نظریہ حیات سے فائدہ مقدار عمل کے مطابق اٹھایا جا سکتا ہے ـــــــ مقدار علم کے مطابق نہیں۔ غرض میری ان معروضات کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی تصور حیات فی الفور ایک تحریک کی شکل میں ظاہر ہونا چاہئے اور یہ تحریک اس تصور حیات کی صحیح تمثیل ہو۔ یہی اسلامی نظام حیات کے قیام کا فطری طریق کار ہے اور عام دوسرے طریقوں سے زیادہ علمی، ارفع اور ٹھوس بھی ہے، انسانی فطرت کے ساتھ زیادہ مطابق ہے اور اس میں زیادہ تحریکیت اور معنویت پائی جاتی ہے۔ بعض جامد شکل میں ایک مستقل اور مکمل نظریہ حیات پیش کر دینے سے یہ طریق کار زیادہ مفید ہے کیونکہ اس میں فعال اور متحرک لوگوں کے سامنے لائحہ عمل پیش ہوتا ہے اور غیر متحرک لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے جبکہ لوگ ذہنی تصورات اور نظریہ حیات کی جیتی جاگتی تصویر ہوتے ہیں۔

تحریک اسلامی اور عملی تحقیقات۔

اگر میری یہ رائے اصل اسلامی نظریہ حیات کے بارے میں درست ہے تو اسے اسلامی نظریہ حیات کے اساسی تصورات کے بارے میں بھی درست ہونا چاہئے۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ہمارے اردگرد جاہلیت کا گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے اور وہ تحریک اسلامی کے کارکنوں پر اثر انداز ہو رہی ہے

وہ احیائے دین کے لئے اسلامی نظام حیات کے مقرر طریق کار کے مطابق قدم آگے بڑھاتے ہیں وہ ان سے بڑے معصوم لہجے میں سوال کرتی ہے کہ جس نظام حیات کی طرف تم لوگوں کو بلا رہے ہو اس کی تفصیلات کیا ہیں اس کے نفاذ کے لئے تم نے کیا کیا علمی تحقیقات کی ہیں اس کی علمی اور فطری بنیادیں کہاں تک تیار ہو چکی ہیں اور جدید خطوط پر اسلامی فقہ کی تدوین کہاں تک ہو گئی ہے! ان معصومانہ سوالات کو سن کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ کیا اسلامی نظام حیات کے نفاذ کی راہ میں اب صرف یہی رکاوٹیں حائل ہیں کہ صرف فقہی احکامات کی تدوین اور بعض فقہی موضوعات پر تحقیق کی محنت ہو جائے، رہی جاہلیت تو وہ اللہ کی حاکمیت کے سامنے سرِ تسلیم خم کئے ہوئے ہے اور تمام لوگ اس کے لئے آمادہ ہو چکے ہیں کہ اسلامی قوانین کو نافذ کیا جائے، مشکل صرف یہ درپیش ہے کہ کوئی ایسا فقیہ، مجتہد اور مقنن نہیں مل رہا جو جدید قانونی خطوط پر اسلامی شریعت کو مدون کر سکے۔ یہ دراصل ایک گہری سازش اور کھلا مذاق ہے جو شریعت اسلامیہ کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔

جاہلیت کے پیروکار، ایسے سوالات اٹھا کر، دراصل شریعت اسلامی کے نفاذ سے پہلو تہی کرنا چاہتے ہیں اور ان کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ سماج کو بدستور غیر اسلامی اور انسانی قوانین کا تابع رکھا جائے، دوسرا مقصد یہ ہے کہ تحریک اسلامی کو اقامت دین کے اسلامی طریق کار سے ہٹا دیا جائے اور تعمیر افکار کے اور احیائے تحریک کے ضروری مرحلے کو نظر انداز کر دیا جائے حالانکہ اقامت دین کا صحیح طریق کار یہ ہے کہ سب سے پہلے اسلامی نظام حیات تحریک اسلامی کے فعال شکل میں ظہور پذیر ہو اور اقامت دین کا جو مرحلہ درپیش ہو، اس کی حقیقی ضرورت کے مطابق ہی تفصیلی قوانین کو سامنے لایا جائے اور تدوین قانون اس وقت ہو جب اس کی ضرورت درپیش ہو۔

تحریک اسلامی کے کارکنوں کا یہ فرض اولین ہے کہ وہ اسی طریق کار کو پیش نظر رکھیں۔ سازشوں اور فوجی انقلابات کے طریق کار سے باز رہیں اور اس اسلامی طریق کار کے مقابلے میں اپنی طرف سے کوئی طریق کار املا نہ کرائیں اور جو لوگ سرے سے خدا اور رسول پر یقین ہی نہیں رکھتے ان کی باتوں پر توجہ نہ دیں۔ یہ لوگ دراصل ہمارے تحریک اسلامی کے کارکنوں کو گمراہ کرکے جلد باز بنانا چاہتے ہیں ان کے مقابلہ میں ہمیں بے حد سنجیدہ ہونا چاہیے۔

اسلام پسند عناصر میں مختلف طریقوں سے جو تنگ دلی پیدا کی جا رہی ہے اس کا مقابلہ بے حد ضروری ہے ہمیں چاہیے کہ ہم اس سازش کو بھی ناکام بنائیں اور اس پست ذہنیت کو نظر انداز کر دیں جو "فقہ اسلامی کے ارتقاء" کے نام سے ایک ایسے ملک سے پھیلائی جا رہی ہے جو سرے سے شریعت کی اطاعت اور نفاذ کا قائل ہی نہیں ہے، ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم اس بے فائدہ مزاج کو نظر انداز کرتے ہوئے صحیح اسلامی طریق کار کے مطابق اپنے نصب العین کی طرف متوجہ ہو جائیں ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ خالی ہوا میں تخم ریزی کا فائدہ کچھ نہ ہوگا، اسلامی تحقیقات اور فقہی ارتقاء کا یہ خوش آیند کھیل دراصل ایک گہری سازش ہے اور ہمارا فرض یہ ہے کہ اس کے مقابلے میں احیاء دین کے صحیح اور فطری طریق کار ہی پر ڈٹ جائیں اسی میں اس دین کی قوت کا راز مضمر ہے اور وہی ہمارے کارکنوں کی معنوی قوت کا مصدر ہے[1]

---

[1] اس وقت مصر میں بھی پاکستان کے ادارہ ثقافت اسلامیہ، اور مرکزی ادارہ تحقیقات اسلامی کی طرز پر کئی ادارے اسلام پر تحقیقات کر رہے ہیں یہ تحقیقات ایسی ہی ہیں جیسے کوئی مشتاق فن ریگستانوں میں اثری اکتشافات میں مصروف ہوتا ہے۔ سید قطب کا مقصد یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو اسلام کے احیاء سے نہ کوئی سروکار ہے، نہ وہ لوگ جو ان اداروں میں کام کرتے ہیں اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہوتے ہیں نہ ان کے سرپرستوں کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ ان تحقیقات کو نافذ کیا جائے بلکہ محض علمی اور محض ذہنی عیاشی کے طور پر یہ کام کیا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ ایسی کوئی تدبیر اسلام کو مطلوب نہیں ہے۔ (بقیہ صفحہ ۴۵ پر)

احیائے دین کا اسلامی طریق کار اور خود اسلامی نظامِ حیات آپس میں مربوط ہیں ان کے درمیان کوئی فرق اور جدائی نہیں ہے اس طریق کار کے اکرئی دوسرا طریق کار اسلامی نظام حیات کو جنم نہیں دے سکتا اس کے نتیجے میں کوئی انسانی اور جاہلی نظام حیات ہی جنم لے سکتا ہے اور لامی نظام حیات کا احیاء اس کے مطابق ہرگز نہیں ہو سکتا غرض اس پوری بحث کا نچوڑ یہ ہے کہ احیائے دین کی ہر تحریک اور اس کوشش احیاء دین کے اسلامی طریق کار کا التزام اس قدر ضروری ہے جس طرح اسلام نظریہ حیات اور خود اسلامی حیات کا التزام ضروری ہے۔

کا بقیہ حاشیہ) البتہ یہ بات اپنی جگہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اسلام کے ہر موضوع پر جدید پیدا ہونے والے سوالات اور جدید حالات روشنی میں تحقیقات کی اس قدر ضرورت ہے۔ خصوصاً دفاعی تحقیقات نیز یہ بھی پیش نظر ہے کہ عربوں کے سامنے اسلامی نظام پہلی مرتبہ پیش ہوا ساتھ ساتھ بتدریج اس پر عمل بھی ہوتا رہا ہے لہٰذا قدرتی طور پر تعمیر افکار اور تحریک اسلامی اور تشکیل نظام حیات کے کام ساتھ ساتھ ہی ہوتے ہے! لیکن اب جس صورت حال سے ہم دوچار ہیں اس کے دو پہلو ہیں ایک طرف عوام الناس ہیں جو اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے آمادہ ہیں یا کم از کم اس کے لف نہیں ہیں اور دوسری طرف ایک محدود اقلیت ہے جو اسلامی نظام کے نفاذ کی قائل نہیں اور یہ اقلیت محض طاقت کے بل بوتے پر اسلامی نظام ات کے راستے میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے لہٰذا اس صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے بعینہ وہ طریق کار جس میں تمام لوگوں کو غیر مسلم فرض کرکے اختیار کیا تا ہے نہیں اپنایا جا سکتا۔ ایک دوسرا فرق یہ بھی ہے کہ دور اول میں اسلامی قوانین کی تفصیلات پردۂ غیب میں مستور تھیں اور جاہلیت کے حامل صرف ، قوانین اور احکامات پر اعتراض کر سکتے تھے جو نازل ہو جاتے تھے۔ لیکن اس وقت صورت حال یہ ہے کہ اسلامی نظام حیات مفصل طور پر قرآن سنت میں موجود ہے اور اسلامی تاریخ مدون ہے اور جاہلیت کو یہ موقع مل رہا ہے کہ وہ اسلامی ثقافت کے بارے میں قسم قسم کے اعتراضات اٹھائے لہٰذا لامی نظام حیات کے احیاء کے ابتدائی طریق کار کے ہر مرحلے میں یہ ضروری ہوگا کہ جاہلیت کے اعتراضات کا دفعیہ کیا جائے اور اسلامی قوانین کے ملف گوشوں کی وضاحت کی جائے۔

نیز اس وقت ساری دنیا کو زندگی کے اساسی مسائل کا سامنا ہے اور مختلف نظام ہائے حیات کی باہمی آویزش میں صرف وہی نظام حیات کامیاب سکتا ہے جو عالمی مسائل کا بہترین حل پیش کرتا ہو لہٰذا یہ ضروری ہے کہ تحریک اسلامی اس میدان میں بھی اسلامی نظام حیات کی برتری کو ذہن نشین کرائے ، طرح صحیح خطوط پر اسلامی تحقیقات کا کام اشد ضروری ہو جاتا ہے ان حقائق کے پیش نظر سید قطب کا یہ فرمان کہ اسلامی قانون کی تفصیلات کو مرے سے بڑا ہی نہ جائے ، ایک تو مبالغہ سے خالی نہیں ہے دوسرے حالات کے تقاضوں سے اس خیال کی پوری طرح مطابقت نہیں ہوتی۔ (مترجم)

۵
آزمودہ دواؤں کا مرکب
انالجین
سر درد - کمر کا درد - دانت کا درد
ایام - انفلوئنزا اور ہر قسم کے دوسرے درد کے لئے
یقینی زود اثر اور بے ضرر علاج ہے
Opal
Sparin

مُلّا واحدی

تاثرات

عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کے دن چند گھنٹوں کے لئے فضا کیسی بدل جاتی ہے چاروں طرف خوشی ہی خوشی نظر آتی ہے اہل دول اور اہل اقتدار کا اس فضا سے زیادہ تعلق نہیں ہے۔ عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کے دن خوشی کی لہر خاص طور سے غربا اور عوام کے اندر دوڑتی ہے۔ فضا کی تبدیلی کا باعث غُربا اور عوام ہوتے ہیں۔

غُربا اور عوام کو اگر تین سو پینسٹھ دن خوش رکھنے کے سامان فراہم کئے جاسکیں تو تین سو پینسٹھ دن عید۔ بقرعید جیسی فضا رہ سکتی ہے۔ اتنے آدمیوں کے ساتھ ساتھ خوش ہونے میں برقی قوت ہے۔ اہل دول اور اہل اقتدار اوّل تو غربا اور عوام کی طرح اتنی دل اور یک دلی سے خوش نہیں ہوا کرتے، دوسرے معدودے چند آدمیوں کا خوش ہونا بے شمار آدمیوں کے برابر بجلی کی رو کیسے پیدا کرسکتا ہے، فضا جیسی ہی اس برقی رو کا نام جس کی ڈوری غربا اور عوام کے دلوں سے جڑی ہوئی ہو۔ بے شمار آدمیوں کا اطمینان جنت ہے اور معدودے چند آدمیوں کا عیش دوزخ۔

۱۳۸۷ھ کی عید قرباں بھی گذر گئی۔ عید رمضان اور عید قرباں کے درمیان دو مہینے کا وقفہ ہوتا ہے، لیکن عید قرباں اور عید رمضان کے درمیان دس مہینے کا وقفہ ہے، اعتبار تو دو مہینوں کا کیا پلک جھپکنے کا بھی نہیں کیا جا سکتا، تاہم دس مہینے کا زمانہ بہت طویل زمانہ ہے خصوصاً اُس کے لئے جس نے قریباً ایک سو چونسٹھ عیدیں دیکھ لی ہوں۔ اس دفعہ نہیں تو اگلی دفعہ سہی، اور اگلی دفعہ نہیں تو اور ذرا آگے سہی، کوئی نہ کوئی عید ایسی ضرور مقدر ہے جو میری اور ہر شخص کی آخری عید ہوگی۔

آج جتنے انسان چل پھر رہے ہیں پچیس برس کے اندر اندر ان کا بڑا حصہ دنیا میں نہیں ہوگا۔ پچاس برس میں دس پندرہ فی صدرہ جائیں گے اور سو برس میں بالکل نئے لوگ آ بیٹھیں گے۔ پچھلے پچاس ساٹھ برس کا تجربہ بتاتا ہے کہ ہم سب گوشت پوست کی بنی ہوئی چلتی پھرتی قبریں ہیں، کھانا، پینا، ہنسنا، بولنا، باجے گاجے، عیش اور عشرت ایک ایک کر کے ختم ہونے والے ہیں۔ کل من علیھا فان و یبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام

شہروں کی چہل پہل اور رونق سے دور، بہت دور، جنگل اور ویرانوں میں، شام کے وقت، جب سورج ڈوبتا ہے اور دل پر اُداسی چھا جاتی ہے تو وہ اُداسی اور سناٹا اللہ کو ضرور یاد دلاتا ہے۔ مگر میں اس وقت بھی دل کی کھڑکی بند کر لیتے پر اپنے آپ کو تیار پاتا ہوں۔

سمندروں کے تلاطم، دریاؤں کی روانی، پہاڑوں کی بلندی اور کھڈوں کی گہرائی سب کے اندر خدا کی خدائی نمایاں نظر آتی ہے مگر میں نے خدا

کی گود میں بیٹھ کر گناہ کرنے کا نام خوش ذوقی رکھ چھوڑا ہے۔

کلیوں کا کھلنا، پھولوں کا مرجھانا، درختوں کا سرسبز لباس پہننا اور پھولوں اور پھلوں سے لدنا اور پھر پات جھاڑ کا ٹھنڈ رہ جانا مجھ جیسے عامی کو بھی خدا کا پتہ دیتا ہے، لیکن کہیں سے آواز آنے لگتی ہے کہ باغ تو تفریح کے لئے بنائے جاتے ہیں۔

یتیموں کی بے کسی، بیواؤں کی لاچاری، بیماروں کی ناتوانی اور فاقہ زدوں کی نیم جانی میں بھی اللہ ملتا ہے، مگر میں بے کسی و لاچاری ناتوانی و نیم جانی کو دوسروں کا حصہ سمجھتا ہوں، اپنے عیش و آرام کو ان تاثرات سے مکدر نہیں کرتا۔

اللہ انسان کے اپنے دُکھ میں پوشیدہ ہے، فقط اپنے دُکھ میں۔

زبان سے کہنے کے لئے اللہ بے شک ہر جگہ موجود ہے اور حقیقتاً بھی موجود ہے۔ لیکن انسان جب تک خود دکھ درد میں مبتلا نہیں ہوتا اُسے وہ اللہ نہیں ملتا جسے دل اور دماغ اللہ پکار اُٹھیں۔ کم از کم مجھے تو اپنے اور صرف اپنے دکھ میں اللہ ملا ہے، خود دکھ کا مزا چکھنے سے پہلے میں بے کسی، لاچاری، ناتوانی اور نیم جانی وغیرہ الفاظ جانتا تھا مگر ان کے معنی نہیں جانتا تھا۔ دُکھ اللہ کی بڑی نعمت ہے بشرطیکہ انسان اُسے عارضی سمجھ سکے اور اُسے صبر کے ساتھ برداشت کر سکے۔

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اپنے دشمنوں کے بھی دشمن نہیں تھے، حضور دشمنیاں کرنے کے لئے نہیں بھیجے گئے تھے، حضورؐ رحمۃ للعالمین تھے۔ حضور اپنے دشمنوں کی بھی بھلائی اور بہتری چاہتے تھے۔ اور مسلمانوں میں جو شخص بُری عادتیں نہیں چھوڑتا تھا اُس کی بابت حضورؐ نے سخت سے سخت الفاظ بس "لیس منی" فرمائے ہیں۔ مثلاً کوئی مسلمان کھانے پینے کی چیزوں میں خلق اللہ کی صحت کو تباہ کرنے والی چیزوں کی ملاوٹ کرتا ہے یا خلق اللہ کے ساتھ دوسری دھوکہ بازیاں کئے جاتا ہے تو وہ "لیس منی" کا مصداق ہے۔

"لیس منی" کے معنی ہیں "اسے مجھ سے (اور میری اتباع سے) تعلق نہیں ہے"۔ مگر ایسے شخص کی بابت جو کسی سے اُجرت پر کام کرائے اور اُجرت نہ دے حضورؐ کا ارشاد ہے کہ "میں قیامت کے دن اُس کا دشمن ہوں گا" العظمۃ للہ۔ لرزا دینے والا جملہ ہے۔ اُجرت پر کام عارضی طور سے بھی کرایا جاتا ہے۔ اور مستقل طور سے بھی، عارضی طور سے کام لینے والے کو حکم ہے کہ مزدور کی مزدوری مزدور کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کرو، مستقل طور سے کام لینے والوں کے واسطے بھی یہ حکم را بنما ہے۔

کام اتنا لیا جائے کہ مزدور یا ملازم اُسے خوشی خوشی انجام دے سکے، اُسے بوجھ اور مشقت نہ سمجھے۔ حضرت شعیب علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کام پر لگاتے وقت کہتے ہیں:- وما ارید ان اشق علیک ط ستجدنی ان شاء اللہ من الصلحین۔ میں تمہیں مشقت پر نہیں ڈالوں گا۔ انشاء اللہ تم مجھے صالح انسان پاؤ گے۔ (مفہوم سورہ ۲۸ - آیت ۲۷) فرمولا یہ بنا کہ طاقت سے زیادہ مشقت کرانا از روئے قرآن غیر صالح لوگوں کا طریقہ ہے، کام آنکھیں کھول کر لینا اور معاوضہ دل کھول کر دینا مطابق اسلام ہے۔

ایک حدیث ہے:- تمہارے خدمت گزار تمہارے بھائی ہی تو ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں تمہارا ماتحت کر دیا ہے سو جس کا بھائی اُس کا ماتحت ہو اُسے زیبا ہے کہ جو خود کھائے وہ بھائی کو کھلائے اور جو خود پہنے وہ بھائی کو پہنائے اور بھائی سے ایسی محنت نہ لے کہ بھائی برداشت نہ کر سکے۔ زیادہ محنت کا کام ہو تو تم اُس میں اُن کا ہاتھ بٹاؤ۔ مطلب یہ ہوا کہ مزدور کو مزدوری اور ملازم کو تنخواہ اتنی دی جائے کہ وہ اپنا اور متعلقین کا انسانوں کی طرح پیٹ بھر سکیں اور تن ڈھک سکیں۔

دوسری طرف مزدوروں اور ملازموں سے بھی کہا گیا ہے کہ طے شدہ کام اور وقت کے پابند رہو۔ اوفوا بالعقود (معاہدے نبھاؤ) کی ہدایت آجر اور اجیر دونوں کے لئے ہے۔ مقررہ وقت سے کم وقت دینا اور مقررہ کام سے کم کام کرنا معصیت ہے۔

مدرسہ دیوبند کی بنیاد رکھنے سے قبل مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ مطبع مجتبائی کے شائع کردہ قرآن مجید کے پروف اور کاپیاں دیکھا کرتے تھے۔ اور اُن کی غلطیاں دُور کیا کرتے تھے۔ مولانا کا معمول تھا کہ نماز پڑھنے مسجد جاتے تو جانے اور واپس آنے کا وقت لکھ لیتے تھے اور کبھی مالک کو چند منٹ دیتے تھے تو وہ بھی نوٹ کر لیتے تھے۔ اور ان اوقات کا معاوضہ کٹوا دیتے تھے، مطبع مجتبائی ہندوستان کے مشہور خطاط منشی ممتاز علی نے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن چھاپنے کی نیت سے قائم کیا تھا۔ اور تصحیح مولانا محمد قاسم جیسے ذی علم اور متقی بزرگ کے سپرد کی تھی۔ پھر دونوں آجر اور اجیر مکہ معظمہ چلے گئے۔ منشی ممتاز علی تا دم رحلت وہیں رہے مولانا محمد قاسم اپنے پیر و مرشد حاجی امداد اللہ صاحب کا ایما پا کر مدرسہ دیوبند جاری کرنے آگئے۔ ان دونوں حضرات کی برکت تھی کہ مطبع مجتبائی خان بہادر مولوی عبدالاحد صاحب کے زمانے میں صرف دینی کتابیں چھاپتا رہا۔ (اس شذرے کے لکھنے میں مفتی محمد شفیع صاحب کے ایک مقالے سے کسی قدر مدد لی گئی ہے۔ وہ مقالہ اس شذرے کے لکھنے کا محرک ہوا۔ واحدی)

ہمارے ایمان ہیں یا کچے تاگے؟ ذرا ذرا سی بات پر ٹوٹے جاتے ہیں۔ بتہ کھڑکا، بندہ بھڑکا۔ اُدھر انگلستان اور امریکہ نے یہودیوں کی حکومت کرائی، ادھر ہمارے ایمان ایک غلط فہمی کی بنا پر ہلنے اور سر کنے لگے۔ اب یہودیوں کو کچھ غلبہ ملا ہے تو ایک صاحب فرماتے ہیں:- جناب! یہ کیا ہو رہا ہے؟ ہم سے وعدہ کیا گیا تھا کہ یہودی اور نصرانی عرب سے نکال دئے جائیں گے۔ وہ تو اُلٹے گھسے چلے آتے ہیں؟

میں انہیں کیونکر سمجھاؤں کہ وعدہ نہیں تھا، حکم تھا کہ یہودیوں کو جزیرہ حجاز سے (تمام عربی زبان بولنے والے ملکوں سے نہیں جزیرہ حجاز سے) نکال دو۔ اس حکم پر انتم الاعلون ان کنتم مومنین کے مصداق مسلمانوں نے فوراً عمل کیا جس کا اثر چودہ سو سال سے آج تک باقی ہے۔ البتہ ہمانے اور آپ نے حکم کی تعمیل میں حصہ نہیں لیا۔ آج اگر آپ اللہ اور رسولؐ سے جواب طلب کرتے ہیں۔ جناب والا! جواب طلب نہ کیجئے۔ موت قریب ہے جواب دہی کے لئے تیار ہو جائیے۔

حضرت حالی نے ہندوستان کی بابت کہا تھا:-

لازم ہے یہاں غلبۂ آئین مسیحی
دو ایک برس میں ہو کہ دس بیس برس میں

مجھے مشرق وسطیٰ اور حجاز اور تمام عربی زبان بولنے والی مسلمان مملکتیں ہندوستان سے بھی پہلے اس شعر کی مصداق بنتی دکھائی دیتی ہیں۔ یہودیوں اور یہودیوں کے سرپرستوں کا زور شور تو چند روزہ ہے، مسلمان مملکتیں اگر جلدی اسلامی مملکتیں نہ بنیں تو کمیونسٹ حکومتیں بنیں گی۔ دروغ برگردن راوی، حاجی صاحبان سناتے ہیں کہ مکہ معظمہ کے اُمرا کی خواتین سر کے بال کٹروانے ہوائی جہازوں میں بیروت جاتی ہیں اور مکہ معظمہ کے غربا پھینکے ہوئے تربوزوں کے چھلکے اُٹھا اُٹھا کر کھاتے ہیں۔

مگر، ار اپریل کے نوائے وقت میں بڑی عجیب اطلاع شائع ہوئی ہے کہ شام کی حکومت نے کمیونزم کا فقط ایک جزو اپنایا ہے جس سے روس اور چین کی دلچسپی تو شاید بڑھ جائے شامی رعایا کو اُس سے فائدہ نہیں پہنچے گا۔

شامی حکومت کی طرف سے تین سوالوں کے جواب مانگے گئے ہیں:-

اوّل اللہ موجود ہے یا غیر موجود؟ دوم موجود ہے تو کہاں ہے؟ سوم (موجود ہے تو) کیا کرتا ہے؟

ان سوالوں کی تشریح حکومت شام کے ترجمان نے یوں فرمائی ہے کہ "اللہ جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کا خالق ہے لہذا اسرائیل سے نمٹیں گے بعد کو۔ پہلے اللہ سے نمٹنے کی ضرورت ہے۔" (ملاحظہ ہو "الشذرہ" دمشق، ۲۷ر فروری اور ۱۲ر مارچ ۱۹۶۸ء) نعوذ باللہ۔ اطلاع میں جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کو ختم کرنے اور اشتراکی نظام کو اختیار کرنے کا مطلق ذکر نہیں ہے بلکہ سرکاری ملازموں کے اظہار ناراضگی اور برطرفی کا ذکر ہے اور بتایا گیا ہے کہ شام کے سرکاری مفتی شیخ احمد کفتارو کے خلاف پورے شام میں نفرت پھیل گئی ہے کہ یہ پاکستان جا کر اسلام اور مسلمانوں کے متعلق باتیں بناتے ہیں گھر کی خبر نہیں لیتے۔

خدا کرے حاجی صاحبان کی بیان کردہ روایت صحیح نہ ہو اور شام کی روایت سے تو دل بیٹھا جاتا ہے اور دل دعا کر رہا ہے کہ یہ بھی غلط ہو تاہم اب میں اُن صاحب سے جنہوں نے اللہ اور رسولؐ سے جواب طلب کیا ہے، پوچھتا ہوں کہ جناب! یہ کیا ہو رہا ہے کیا جینے کی یہی باتیں

مولانا محمد مصطفےٰ

ملہ بیا کہ قصر امل سخت سست بُنیاد است ‏ ‏ بیار بادہ کہ بنیادِ عمر بر باد است

گویا کوئی غفلت کا مارا اپنے سینے میں ہزاروں امیدیں لئے ہوتے چلا جا رہا ہے، خواجہ کی نباض نگاہ اس پر پڑتی ہے تو از راہ ارشاد فرماتے ہیں کہ یہاں آ، یہ قلعہ امیدوں کا جو تو نے بنا رکھا ہے، نہایت ہی کمزور ہے، باد اجل کا ایک جھونکا آیا اور یہ گرا، اس وقت سوائے حسرت کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا، پس اے عذیاں کار، اگر دولت دائمی چاہتا ہے تو محبت الٰہی حاصل کر (والعصر ان الانسان لفی خسر) سے بچنا ہے تو (الا الذین آمنوا وعملوا الصالحات) میں داخل ہو جا، کیونکہ ـــ

زندگی انساں کی دم کے سوا کچھ بھی نہیں ‏ ‏ دم ہوا کی موج ہے، دم کے سوا کچھ بھی نہیں

"بادہ" استعارہ ہے عشق و محبت سے باعتبار سکر و سرور و تشجیع کے ـــ

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو ‏ ‏ بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

"بیا" میں اشارہ ہے اس طرف کہ ذکر و فکر جو اسباب محبت سے ہیں اختیاری ہیں -

شعر میں علاج ہے اس روحانی مرض کا جس کو شارع "طول امل" کہتے ہیں اور علاج اس کا "قصر امل" ہے کیونکہ علاج کل شیٔ بالضد دراس اصطلاح میں قصر نقیض ہے طول کا، یہ وہ قصر نہیں جس کا شعر بالا میں ذکر ہے کیونکہ وہاں قصر بمعنی محل ہے،

خواجہ نے طول امل کے علاج کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ انسان دنیا کی بے ثباتی اور عمر کی ناپائیداری پر غور کرے تو مبدا و معاد کی یاد پیدا ہو اور جو ذات باقی و سرمدی ہے اس سے دل لگے،

خواجۂ دو عالم حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (کن فی الدنیا کانک غریب) دنیا میں اس طرح رہو گویا کہ تم پردیسی ہو اور حضرت انسؓ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے روایت کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا یھرم ابن آدم و یبقی معہ اثنان الحرص والامل (بخاری) اور مسلم کی ایک

میں ہے ویشیب معہ اثنان الحرص علی المال والحرص علی العمر آدمی بڑھاپے کی انتہا کو پہونچ جاتا ہے اور پھر بھی دو چیزیں اس کے ساتھ رہتی ہیں حرص اور امید اور مسلم کی روایت میں یہ الفاظ ہیں اور پھر بھی دو چیزیں اس کے ساتھ جوان ہوتی ہیں مال کی حرص اور عمر کی حرص، اور صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے قلب الشیخ شابٌ علی حب اثنتین طول الحیاۃ وحب المال بوڑھے آدمی کا دل جوان ہے دو چیزوں کی محبت میں درازی حیات کی اور مال کی۔

چونکہ طول امل کے اسباب دو ہیں (۱) جہل اور حب دنیا (جیسا کہ احیاء العلوم میں ہے) اور جہل سے مراد ہے یہ سمجھنا کہ شباب میں موت کا آنا بعید ہے سلہ کی تدبیر تو خواجہ حافظ نے دوسرے مصرعہ میں بیان فرمادی، حب دنیا تو وہ ایک سخت بیماری ہے جس نے حسب تصریح امام غزالیؒ اگلے پچھلوں کو عاجز کر دیا ہے، اس لئے کہ نفس کے لئے علائق دنیوی کا ترک بہت شاق ہے پس عارف شیراز اس شخص کی تعریف کرتے ہیں جو ان قیود تعلقات سے آزاد ہے ان الفاظ میں۔

۲　　غلام ہمت آنم کہ زیر چرخ کبود　　　ز ہرچہ رنگ تعلق پذیرد آزاد است

میں اس شخص کی ہمت کا غلام ہوں جو اس فلک نیلگوں کے نیچے (رہتے ہوئے) ہر اس بات سے آزاد ہے جو تعلق کا رنگ قبول کر لیتی ہو۔ شعر مذکور کے ساتھ ذرا یہ بھی پڑھ لیجئے اور صاحبانِ رضا و تسلیم کے ذوق کی داد دیجئے ؎

غلام اس کی میں ہمت کا ہوں کہ جو اپنے　　　جگر کے خوں کو خوانِ تونگری جانے

چونکہ یہ ہمت مردانہ پیدا ہوتی ہے ایمان بالیوم الآخر سے اور اس یقین سے کہ دنیا فانی اور حقیر ہے اور آخرت باقی اور خطیر ہے [illegible] ارشاد فرماتے ہیں اور اپنا مکاشفہ اس کی تقویت و تائید میں پیش کرتے ہیں۔

۳　　چگویمت کہ بہ مے خانہ دوش مست و خراب　　　سروش عالم غیبم چہ مژدہا داد است

۴　　کہ اے بلند نظر شاہباز سدرہ نشیں　　　نشیمن تو نہ این کنج محنت آباد است

۵　　ترا ز کنگرۂ عرش می زنند صفیر　　　ندانمت کہ دریں دامگہ چہ افتاد است

کل رات ہی کی تو بات ہے جب میں عشق الٰہی میں مستغرق تھا تو فرشتہ غیب نے مجھے کیسے کیسے مژدے دیئے کہ اے مرد عالی ہمت تیرا مقام تو سدرۃ المنتہیٰ ہے نہ کہ یہ دار المحن (دنیا) تجھے تو عرش سے آواز دی جاتی ہے۔ واللہ یدعوا الی دار السلام پھر نہ معلوم اس بھول بھلیاں میں کیوں مبتلا ہے۔

اشعار بالا میں دعوت ربانی کا ذکر تھا تاکہ انسان اس غرق میں ففروا الی اللہ پر عمل کرے اب مزید فائدہ کے لئے مرشد کامل کی نصیحت بھی نقل فرماتے ہیں تاکہ انسان کا دل اس دنیا سے بیزار ہو جائے۔

۶　　نصیحتے کنمت یاد گیر و در عمل آر　　　کہ ایں حدیث ز پیر طریقتم یاد است

۷　　مجو درستی عہد از جہان سست نہاد　　　کہ ایں عجوزہ عروس ہزار داماد است

۸　　فریب دختر رز حسن از جہاں پیر مخور　　　کہ ہر کہ کرد بوئے اختلاط ناشاد است

ناکسوں نے اس دنیائے بے ثبات کے عہد و پیماں کو درست نہ سمجھا، اس بڑھیا نے تو طرح طرح سے بن سنور کے ہزاروں شوہر کئے اور پھر انہیں چھوڑا

سلہ اس کے سبب اول کے ازالہ کی تدبیر الخ　سلہ ففروا الی اللہ (قرآن) غیر خدا سے خدا کی طرف تیزی سے جاؤ۔

دیا) پس اس کے نظر فریب حسن کے دھوکے میں نہ آنا کیونکہ جو اس سے ملا وہ غمگین رہا۔ حضور سرورِ کائنات کا ارشاد ہے حب الدنیا راس کل خطیئۃ (دنیا کی محبت تمام گناہوں کی سردار ہے) اور ابن ماجہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے الا ان الدنیا ملعونۃ ملعونٌ ما فیہا الا ذکر اللہ وما والاہ وعالم ومتعلم یاد رکھو دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے ملعون ہے، بجز ذکر خدا کے اور ذکر مردانِ خدا اور دین کے عالم اور متعلم کے یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ حکایات الصالحین جند من جنود اللہ تعالیٰ اللہ کے نیک بندوں کی باتیں ایک لشکر ہے جس سے دنیا و ما فیہا اور نفس و شیطان کے مقابلہ میں فتح حاصل ہوتی ہے۔

جب ظاہر ہو گیا کہ دنیا کی نہ صورت قابل التفات ہے کیونکہ وہ بڑھیا ہے اور نہ سیرت لائق نظر ہے کیونکہ وہ مکار اور بے وفا ہے اور تو۔

۹ غم جہاں مخور و پند من مبر از یاد — کہ ایں لطیفۂ عشقم ز رہروے یاد است

دنیا کا غم نہ کر، یہ میری نصیحت یاد رکھنا، میں نے تو یہ بات ایک سالک باخبر سے یاد رکھی ہے اور وہ کوئی سی بات ہے جس کو خواجہ نے لطیفۂ عشق سے تعبیر کیا ہے، شعر مابعد میں اس کا بیان ہے۔

۱۰ رضا بدادہ بدہ وز جبیں گرہ بکشا — کہ بر من و تو در اختیار نکشادہ است

اب تک طول امل اور حب دنیا کی مذمت تھی، اب عشق الٰہی کی تلقین ہے کہ اپنی قسمت پر راضی رہو اور اسرار تکوینی میں اپنے رب پر اعتراض و شکایت نہ کرو کیونکہ سب کچھ اختیار تو اسی کا ہے ہمارا تمہارا کیا ہے؟ رضیت باللہ ربّاً وبالاسلام دیناً ومحمد نبیاً صلی اللہ علیہ وسلم راضی ہو گیا میں اللہ کی ربوبیت سے اور محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت سے،

مشائخ نے فرمایا ہے الرضا بالقضا باب اللہ الاعظم

شعر بالا میں رضا بالقضا کی کہ لازمۂ عشق الٰہی ہے تعلیم تھی، لیکن چونکہ یہ مکار دنیا رنگ رنگ کی بہار دکھا کر اپنی طرف مائل کرتی ہے اس لئے مزید تاکید کے لئے ارشاد ہے

۱۱ نشانِ عہد و وفا نیست در تبسم گل — بنال بلبل بیدل کہ جائے فریاد است

اس دنیا کی بہار عین خزاں ہے اس کا تبسم عین زہر خند ہے کیونکہ اس کے رنگ میں بوئے وفا نہیں، پس اے طالب دنیا تو اس کی محبت پر مسرور و مغرور نہ ہو بلکہ اس کی بے وفائی کا خیال کرکے رو کہ کس بے وفا کے دام الفت میں تو گرفتار ہو گیا، کیا عجب کہ توفیق الٰہی تیری امداد فرمائے اور وما متاع الحیاۃ الدنیا الا متاع الغرور کے معنی تجھ پر منکشف ہو جائیں۔

چونکہ زہد ریائی کو عشق الٰہی سے بیر ہے اس لئے زاہد مرائی عاشق کے اقوال و احوال پر اکثر طعن و تشنیع کرتا ہے اس لئے اس کو سمجھاتے ہیں۔

۱۲ برو ملامت رندی کشاں مکن زاہد — کہ رزق قسم تو و رزق ما ہمیں دادہ است

اے زاہد چلا جا، شراب عشق پینے والوں کو برا نہ کہہ، کیونکہ قسام ازل نے تجھے وہ دیا اور ہمیں یہ اپنی اپنی قسمت!

جس طرح زاہد خشک مردانِ خدا سے کد و خصومت رکھتا ہے اسی طرح ناقصین بھی شعرائے باکمال پر حسد کرتے ہیں کیونکہ ان کا کلام ہر دلعزیز نہیں ہوتا اس لئے ارشاد ہوتا ہے۔

۱۳ حسد چہ می بری اے سست نظم بر حافظ — قبول خاطر و لطف سخن خدا داد است

اے شخص تو حافظ کے کلام پر کیوں حسد کرتا ہے یہ خوبیٔ کلام کسبی نہیں بلکہ وہبی ہے محض علوم معانی و بیان پڑھنے سے نہیں آتی، تا نہ بخشد خدائے بخشندہ، تیری نظم کی بندش تک چست نہیں حافظ کی گرمیٔ بیان کا کیا مقابلہ کر سکتا ہے ہاں مکتب عشق الٰہی میں زانوئے ادب تہ کر عجب نہیں کہ تیرا کلام بھی باثر ہو جائے کیونکہ شاعری کا اصلی معلم عشق ہے اور وہ بھی اگر حقیقی ہے تو کیا کہنا اس کا متعلم تو "تلامیذ الرحمٰن" میں سے ہے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

روحِ انتخاب

اشتراکیت

میرے نزدیک اشتراکیت کوئی مستقل بالذات تہذیب نہیں ہے بلکہ اسی مغربی تہذیب کا شاخسانہ ہے جو یورپ میں کلیسا سے بغاوت کے بعد خدا اور رسالت سے آزاد ہو کر زندگی کے مسائل حل کرنے کے لئے اٹھی تھی۔ یہ تہذیب پچھلی صدیوں کے دوران میں لادینیت کی بنیاد پر بہت سے مسلکوں کو جنم دے چکی ہے جن میں بظاہر بڑا اختلاف پایا جاتا ہے اور بارہا ان مسلکوں کے درمیان ایسے سخت تصادم ہوئے ہیں کہ سطحی نظر رکھنے والے ان سے یہ نتیجہ اخذ کر بیٹھتے ہیں کہ فی الواقع ان کے اندر کچھ بڑے بنیادی اختلافات ہیں لیکن درحقیقت سرمایہ داری، فسطائیت، اشتراکیت، وغیرہ کے تمام اختلافات فروعی نوعیت کے ہیں۔ اصل تہذیبی نظریہ ان سب کے درمیان مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا ہو یا نہ ہو بہرحال انسان نہ اس کی اطاعت (ارادی و شعوری اطاعت) کا مکلف ہے نہ اسی کی طرف سے کسی رہنمائی کا محتاج ہے نہ اس کے سامنے اپنے اعمال کے لئے جواب دہ ہے اور نہ موجودہ زندگی کے بعد کوئی زندگی ہے جس میں انسان کے دنیوی اعمال کا کوئی نتیجہ نکلنے والا ہو۔ انسان قطعی خود مختار ہے اپنی زندگی کا راستہ اسے خود اپنے علم، تجربات اور مصالح کی روشنی میں تجویز کرتا ہے اور زندگی کا مقصود اسی حیات دنیا کی خوشحالی ہے۔

یہی وہ اصل چیلنج ہے جو اسلام کی قدیم جاہلیت کی طرح جدید جاہلیت بھی صدیوں سے دے رہی ہے اور اس کے مقابلے کا طریقہ بعینہ وہی ہے جو قدیم جاہلیت کے مقابلے میں قرآن اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری کامیابی کے ساتھ استعمال کر کے ہمیں دکھایا ہے، ہم جب تک اس تہذیب کی جڑ پر حملہ نہ کریں گے اس کو شکست نہ دے سکیں گے اس کی فکری بنیادوں کی حقیقی غلطی و گمراہی کو نظرانداز کر کے اس کے شاخوں میں سے کسی ایک شاخسانے کے تجویز کردہ نظام حیات کو مستقلاً زیر بحث لانا اور پھر اس کے بھی صرف ظاہری پروگرام پر گفتگو کر کے اس کے حسن و قبح کا فیصلہ کرنا ہمیں کبھی کسی صحیح نتیجے پر نہیں پہنچا سکتا بلکہ اس طرز بحث میں ہر وقت اس کا امکان ہے کہ اس کی بنیادی ضلالت سے غافل ہو کر ہم اس کے بعض اجزا کو ترک اور بعض اجزا کو قبول کرنے کی غلطی میں مبتلا ہو جائیں اور یہاں تک کہ گذریں کہ "خدا بخش اشتراکیت" سادی اسلام " مغربی تہذیب کا پیدا کردہ ہر نظام درحقیقت خدا سے کفر اور بغاوت ہے۔ اس کا کوئی جز قابل بحث نہیں ہے بلکہ کل کا کل غلط ہے انسان سرے سے خود مختار ہے ہی نہیں کہ اسے اپنے لئے زندگی کا راستہ خود تجویز کر لینے کا حق ہو اور خدا کی رہنمائی (یعنی بذریعہ رسالت اور بہ شکل شریعت) رہنمائی کے سوا انسان کے لئے کوئی راہ ہدایت کی راہ نہیں ہے کہ اس کے یا اس کے جزو کے صحیح ہونے کا کوئی سوال پیدا ہوتا ہو۔ زندگی کا صحیح راستہ صرف ایک ہی ہے اور وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بتایا ہوا راستہ ہے۔ ہم خواہ بیسویں صدی میں ہوں یا چالیسویں صدی میں جس وقت بھی ہم کو زندگی کے جو مسائل و معاملات درپیش ہوں گے ان کو حل کرنے کے لئے ہم کتاب اللہ و سنت رسول اللہ سے ہدایت اخذ کریں گے نہ کہ

امریکہ یا روس یا چین یا کسی اور سے۔ کتاب و سنت سے اخذ کردہ ہدایت کی بنا پر جو نظام اور پروگرام بنے گا اس کا کوئی جز اگر اپنی ظاہری شکل میں ان باغیانہ نظاموں میں سے کسی کے کسی جزو کے ساتھ مماثلت بھی رکھتا ہو تو دونوں کے مزاج اور ان کی روح اور ان سے پیدا ہونے والے نتائج اور اثرات میں کوئی مماثلت نہ ہوگی۔ کیونکہ کسی مجموعی نظام کے ہر جزو کا مزاج وہی ہوتا ہے جو مجموعہ کا مزاج ہوتا ہے لیکن ہم نے اگر اس کے لئے کتاب و سنت کی طرف رجوع کرنے کے بجائے ان انسانوں کے اپنے گھڑے ہوئے نظاموں میں سے کسی کی طرف رجوع کیا اور اس کی ایسی چیز ہتھیا لی جس کی ظاہری شکل کے خلاف کتاب و سنت سے کوئی دلیل بھی نہ لائی جا سکتی ہو پھر بھی چونکہ اس جزو کا اخذ تقلید جاہلیت کی بنا پر ہوگا۔ اس لئے اس کا مزاج قطعی طور پر اسلام کے مزاج سے مغائر ہوگا اور یہ بے جوڑ پیوند کبھی اسلامی زندگی میں نہ بیٹھ سکے گا۔

سوز و ساز

مولانا نازکی کیفی :-

کان سنتے تو ہیں اک نغمۂ بے ساز کبھی
ہیں جسے کہ نہ سکوں آپ کی آواز کبھی

حسن وہ ایک حقیقت جو نہاں ہے اب تک
عشق وہ راز جو رہتا ہی نہیں راز کبھی

آج افسانۂ بے بال و پری بھی سن لو
پھر سنائیں گے تمہیں قصۂ پرواز کبھی

ایک عالم ہے کہ دیوانہ بنا پھرتا ہے
اُٹھ گئی تھی وہ نگاہِ غلط انداز کبھی

پاؤں رکتے ہی نہیں اہل وفا کے لیکن
ختم ہوتی ہی نہیں منزلِ آغاز کبھی

تنگ آ جائے گی خود اپنے چلن سے دنیا
تجھ سے سیکھے گا زمانہ ترے انداز کبھی

پاؤں رک جاتے ہیں خود پاسِ ادب سے کیفی
ہم نے دیکھی ہی نہیں انجمنِ ناز کبھی

منظر اکبرآبادی :-

سکوں نظر کو نہیں کیف گلستاں میں نہیں
دلِ خراب کی تسکیں کہیں جہاں میں نہیں

تمہارا یہ ہے تجھے شکوہ ہے داستاں سے مری
مزہ یہ ہے کہ ترا ذکر داستاں میں نہیں

چمن میں خاک سی اُڑنے لگی ہمارے بعد
کہ ہم نہیں تو بہاریں بھی گلستاں میں نہیں

کہو یہ حسن سے کوئی رجز سنائے نئی
کہ زندگی کے اب آثار کارواں میں نہیں

نشانِ سجدہ کی کرتا ہوں تلاش نادم ہوں
سرِ نیاز کا پیوند آستاں میں نہیں

کہاں کا جادہ، کہاں کا جرس، کہاں کی درا
کسی کو ہوش محبت کے کارواں میں نہیں

فضول شرحِ وفا کر رہے ہو تم منظر
یہ ایک لفظ ہے جو حسن کی زباں میں نہیں

ڈاکٹر اختر :-

کون رکھ سکتا ہے الزامِ گدائی مجھ پہ
میری نظریں کسی دامن پہ جھکیں بھی تو نہیں

شب کو کیوں دیکھئے آ کر مہ و انجم کا جمال
آسماں والوں سے کم اہلِ زمیں بھی تو نہیں

جن نگاہوں نے مرا صبر و سکوں لوٹ لیا
چند لمحے مری جانب وہ رہیں بھی تو نہیں
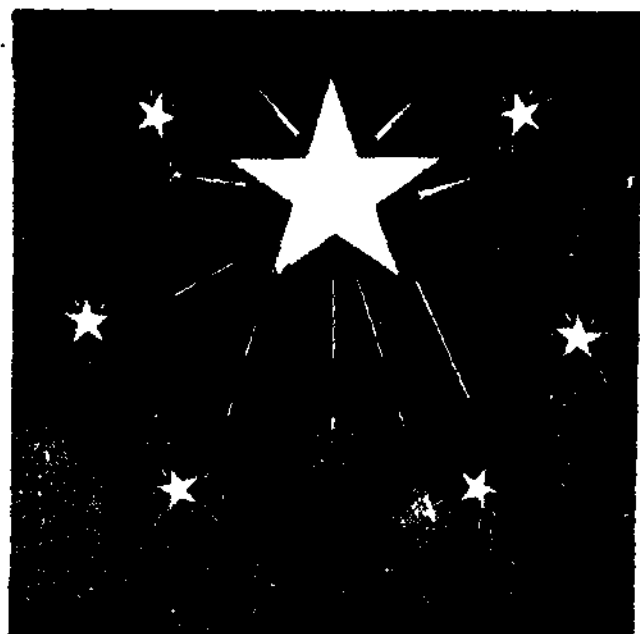
ہماری نظر میں

تدبر القرآن مرتبہ :- عمر دراز خاں غوری (پوسٹ ماسٹر جنرل ریٹائرڈ) ضخامت ۵۱۶ صفحات (مجلد، رنگین گردپوش) قیمت نو روپے، ملنے کا پتہ :- سلطان حسین اینڈ سنز ناشران و تاجران کتب۔ برنس روڈ، کراچی

جناب عمر دراز خاں غوری قرآن کریم سے خاص شغف رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تمام مسلمان قرآن کریم کو سمجھ کر پڑھیں اور اپنی زندگیوں میں قرآنی مذاق کی جھلک پیدا کریں۔ صاحب موصوف نے ڈپٹی نذیر احمد اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم کے "قرآنی تراجم" کو سامنے رکھ کر:-

"اس کا التزام کیا ہے کہ قرآن پاک میں جس قدر یکساں احکام اور ایک ہی جیسے مسائل کا جہاں جہاں ذکر آیا ہے ایسی تمام آیات کو یک جا کر دیا جائے" (دیباچہ)

مثلاً :- وجود باری تعالیٰ —— آخرت پر ایمان —— نماز سے کیا مراد ہے —— اللہ کے بندوں کے عام حقوق —— آداب مجلس —— ایثار و کرم اور قرض حسنہ —— ہجرت —— دوزخی اور جنتی کی پہچان —— ایمان کی کسوٹی اور عمل و اخلاق —— اس قسم کے دوسرے مانند عنوانات ہیں جن کے تحت آیات قرآنی کا ترجمہ درج کیا گیا ہے۔

فاضل مرتب نے قرآنی تراجم جوں کے توں رکھ دئے ہیں۔ مثلاً :-

"بدبخت دوزخ میں ہوں گے وہاں اُن کو چلانا اور دھاڑنا لگا ہوگا (یعنی سخت تکلیف میں مبتلا ہوں گے) (ص ۱۸۲)

"دھاڑنا" شیر کے لئے مخصوص ہے انسانوں کی آواز کے لئے "دھاڑیں" جب بولتے ہیں، تو اس میں "کرب و تکلیف" کا مفہوم شامل نہیں ہوتا۔

"جب کہ اُن میں بعض کے دل ڈگمگا اُٹھے تھے" (ص ۳۹۰)

"ڈگمگانے" کے ساتھ "اُٹھنا" زبان و روزمرہ کے اعتبار سے درست نہیں —— ترجمہ میں اس قسم کے مقامات اصلاح و درستی کے محتاج تھے۔

"جنات و انسانوں" (ص ۱۶۵) "چھپے و ظاہر" متعدد مقامات پر مولف نے "اور" کی جگہ "واو" استعمال کیا ہے، جو درست نہیں، واو عطوف" فارسی اور عربی الفاظ کے درمیان آتا ہے۔

صفحہ ۲۲۸ پر "غلامی" کے سلسلہ میں جس خیال کا اظہار فاضل مرتب نے کیا ہے وہ پوری طرح صحیح نہیں ہے، کافروں سے جہاد کے سلسلہ میں غلامی کے احکام ہمیشہ باقی رہیں گے۔ اس کا تعلق ضرورت اور حالات سے ہے۔

صفحہ ۳۰۴ پر موصوف نے "ابوجہل" کو حیرت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا لکھ دیا، حضور کا چچا ابوجہل نہیں ابولہب تھا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے گھوڑوں کا جس آیت میں ذکر ہے اور حضرت سلیمان کی آزمائش کا بیان ہے ـــــ اس سلسلہ میں اگر صاحب موصوف مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی "تفہیم القرآن" سے استفادہ کرتے تو وہ ان آیتوں کا یہ ترجمہ اور تفسیر نقل نہ فرماتے جو بحث محلِ نظر ہے ۔

جناب عمر دراز خاں صاحب نے خلوص و نیک نیتی کے ساتھ ترتیبِ تراجم کی جو مشقت برداشت کی ہے اس کا اجر انہیں اللہ تعالیٰ عطا فرمائے، اردو داں طبقہ "تدبر القرآن" سے فائدہ اٹھا سکتا ہے ۔

جہنم سے فرار از :- مقبول جہانگیر، ضخامت ۲۱۲ صفحات (مجلد، رنگین و مصور سرورق) قیمت ۵ روپے
ملنے کا پتہ :- مکتبۂ اردو ڈائجسٹ، سمن آباد لاہور ۔

جناب مقبول جہانگیر پاکستان اور ہندوستان کے سب سے زیادہ کثیر الاشاعت ماہنامہ "اردو ڈائجسٹ" کے ادارے سے وابستہ ہیں، اُن کے افسانے اور ترجمے نہ صرف پسند کئے جاتے ہیں بلکہ وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں ۔

اس کتاب میں بارہ افسانے شامل ہیں، جن کے بارے میں مقبول جہانگیر صاحب نے دیباچہ میں لکھا ہے ۔

"اس کتاب میں اس قسم کے واقعات پیش کئے گئے ہیں، جنہیں پڑھ کر آپ کو اندازہ ہوگا کہ انسانی عزم اور حوصلہ کیسے کیسے محیر العقول کارنامے انجام دیتا ہے ۔"

یہ افسانے جتنے زیادہ دلچسپ ہیں اس سے زیادہ ہولناک اور حیرت انگیز ہیں، کتاب ایک بار اٹھا کر پھر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا، کوہستان، برفانی میدان، دشت و صحرا، سمندر، ان میں پہنچ کر دلیر اور مہم پسند لوگوں نے کیا کارنامے انجام دئے ہیں، کیسے کیسے خوفناک حالات کا سامنا کیا ہے، موت سے کہاں کہاں اُن کی مڈبھیڑ ہوتے ہوتے رہ گئی ہے ـــــ یہ تفصیلات ان افسانوں میں ملتی ہیں، بعض مقامات پر افسانوں کے بیان میں یکسانی بھی پیدا ہو گئی ہے، خاص کر وہ مقامات جہاں پیٹ بھرنے کے لئے اضطرار کی حالت میں خون پیا اور کچا گوشت کھانا پڑا ہے ۔

افسانوں کی زبان منجھی ہوئی ہے، اندازِ بیان دلنشین ہے، افسانوں کے خاکے مربوط ہیں، فاضل مصنف کی مشاقی اور فن کا صرف ایک نمونہ :-

"رات بھر وہ وہاں پڑا رہا، اسے نیند کا بھی احساس نہیں ہوا، البتہ سورج کی کرن جزیرے پر جونہی نمودار ہوئی، وہ گھسٹتا ہوا غار کے کنارے تک آیا اور اپنی دھنسی ہوئی آنکھوں سے باہر کا منظر دیکھنے لگا جزیرے کے ساحل پر اونچی اونچی طوفانی موجیں چٹانوں سے سر ٹکرا رہی تھیں اور سفید سفید جھاگ فضا میں دور تک پھیل رہے تھے، وہ سوچنے لگا کہ سمندر کے اس حصے میں مچھلیوں کا زندہ رہنا ممکن نہیں ۔ اس لئے یہاں سے خوراک حاصل نہیں کی جا سکتی، بس مجھے چپ چاپ اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دینا چاہیے!

"اسے پہلی بار ان عجیب حالات میں اپنے اوپر ہنسی آئی، خدا کے کام بھی نرالے ہیں، بھلا اس ویران جزیرے پر مجھے بھیجنے اور موت کے فرشتے کو تکلیف دینے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا میری روح کسی اور جگہ قبض نہیں کی جا سکتی تھی؟"

دوسرا رخ :-

"معصوم لڑکیوں کی عصمتوں کو تار تار کیا ہو" (ص ۹۹) "دامنِ عصمت" لاتے تو "تار تار کرنا" موزوں ہوتا ــــ "کسی عورت نے مجھے
پکڑ لیا" (ص ۷۷) اس سے تو ایسا مترشح ہوتا ہے جیسے عورت نے اپنے بازو سے اس شخص کو پکڑ لیا ہو' ایسے موقعوں پر یوں بولتے ہیں ــــ "کسی
نے میرا بازو پکڑ لیا" ــــ "میں نے اس کے ساتھ جانے کی "حامی" بھرلی" (ص ۸۶) صحیح املا "ہامی" نہیں "ہامی" ہے ــ "میرے دائیں ٹخنے
کا درد ہونے لگا ہے" (ص ۸۸) "پڑ" کی جگہ "میں" ہونا چاہیے ـ

"چاق و چوبند کھڑے کارروائی کے منتظر تھے" (ص ۱۴۶) چاق چوبند، رنگ روپ' مار دھاڑ' وغیرہ الفاظ "بغیر واؤ" کے
لکھے جاتے ہیں ــــ "نامعلوم" اسے کس نے ہلاک کر کے سمندر میں پھینک دیا" (ص ۲۰۶) کی جگہ "نہ معلوم" کی جگہ "نامعلوم" املا کیا
ہے ــــ صفحہ ۱۹۳ پر "جاں کنی" کے "ک" پر کاتب صاحب نے پیش لگا دیا ہے اور صفحہ ۲۱۸ پہ "چشم زدن" کے "م" پر زیر!

ان تسامحات کی صورت ایسی ہے جیسے چاند کے منہ پر جھائیاں! افسانے ہر اعتبار سے بلند پایہ اور دلچسپ ہیں! جناب معقول جہانگیر اردو
طرف سے تبریک و تحسین کے مستحق ہیں ـ

تلاش از سیفی پریمی، ضخامت ۱۴۰ صفحات (مجلد، رنگین گرد پوش) قیمت دو روپے
ملنے کا پتہ :ـ ظفر منزل جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵ ـ

جناب سیفی پریمی نے نامساعد حالات میں اپنی ذاتی جدوجہد سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے اور شعر و ادب کی دنیا میں متعارف ہوئے ہیں ان کی
کا یہ مجموعہ ہمارے سامنے ہے۔ سیفی صاحب خوش گو شاعر ہیں' اظہارِ خیالات و جذبات پر قدرت رکھتے ہیں اور بات سلیقہ سے کہتے ہیں ـ

منتخب اشعار :ــ

سونے کے واسطے تو اک زندگی پڑی ہے　　اک رات کاٹ ہی دو دل فرقت میں آ نہ ہو کر
ہر صبحِ نو کے رخ پہ ظلمت کی جھائیاں ہیں　　اے گردشِ زمانہ! ہے داغ اک سحر کر
حریمِ ناز میں جلووں پہ پابندی بہت کچھ تھی　　مگر ہم بھی دلِ ناداں کو بہلانے کہاں جاتے
نظر کی لغزشوں سے بات دل کی کھل گئی سیفی　　ہم اس محفل میں اپنی جستجو پہچانے کہاں جاتے
اب نہ ہونٹوں پہ دھواں ہے نہ پلک پہ شبنم　　غم زدہ کوچۂ دلدار تک آ پہونچے ہیں
پارساؤں کی جبینِ عرق آلودہ سی ہیں　　بزم میں ہم سے گنہ گار تک آ پہونچے ہیں
کہیں عارضوں پہ شبنم، کہیں نیلگوں تبسم　　تری یادِ جام و مینا، تری یادِ ماہ و انجم
یہ برق و باد تو کچھ بھی نہیں کہ دیکھا ہے　　جلال و غمزۂ رخسارِ آتشیں میں نے
اپنی طرف بھی معترضِ خود پسند دیکھ　　ہم پہ تو خیر سایۂ عصیاں ہے آج کل
عشق کا غم کبھی ملتا نہیں نااہلوں کو　　یہ خوشی ہے کہ ترے درد کے شایاں ہوں میں
تمہاری بزم میں ڈھلتے رہے ہیں افسانے　　خطا معاف اگر ہم بھی ایک بات کہیں
رہی ہے حسن کی جانب سے احتیاط بہت　　وہ کیا کریں اگر آنچل ہی خود الٹ جاتے
پہونچ رہا ہے دلوں تک یقینِ نورِ سحر　　گمانِ شب سے کہو سامنے سے ہٹ جائے

اس طرف چشمکیں اس طرف شوخیاں ہر قدم ہر نظر، ہر نظر بے حدیں
شہر خوباں میں شاید بہار آگئی، کوئی آوارہ کوچے یار آگیا

فضائے حسن اک رنگیں تقاضا ہی سہی لیکن ۔ بھری محفل میں پھر بھی پیار کی باتیں نہیں اچھی

جاگ اٹھے بام و در چراغ جلے		کون آیا ادھر چراغ جلے

حسن کی شانِ عنایت دیکھنا		ایک جلوہ سو تقاضوں کا جواب

آؤ غمِ دنیا کو اندازِ طرب دیدیں		بھیگے ہوئے موسم میں بوتل ہی کھنک جائے

دوسرا رُخ :—

اکثر نظر کو یوں بھی دنیا نظر پڑی ہے
جیسے کوئی سہاگن بیٹھی ہو بن سنور کر	(ص ۱۰)

شعر میں خاصہ ابہام بلکہ اہمال پایا جاتا ہے "نذر" جو دکھائی جاتی ہے اُس کا املا "نظر" غلط ہے اور "نذر" کی "ذ" "نظر" کی "ظ" کی مانند متحرّک نہیں ساکن ہے۔

کسے خبر کہ محبت یہ کیا گزر جائے		تری نظر نہ بڑھائے جو روشنی دل کی	(ص ۱۱)

دل کی روشنی کیا محبت کے حادثات کو روک سکتی ہے؟

ہوئے ہیں آج تو مانوس بازوئے رنگیں		کہیں غرور میں بہکے نہ آگہی دل کی (ص ۱۶)

اس شعر میں اہمال کے سوا اور کیا رکھا ہے؟

راتوں کی دل گدازیاں اب یاد ہیں کسے		کھوئے ہوئے ہیں جلوۂ صبحِ وطن میں ہم (ص ۱۷)

"گداز" کی سمجھ نہیں آتی — "راتوں کی دل گدازیاں" کیا؟ اور پھر "اُن کا یاد آنا" اس پر مستزاد!

دنیا کے پاس اب کوئی تازہ ستم بھی ہے		رکھتے تو ہیں یقین سحر کی کرن میں ہم (ص ۱۸)

دو لخت مصرعے!

اب تو کچھ فیض کا امکان نظر آتا ہے		آج وہ تلخیِ گفتار تک آپہونچے ہیں (ص ۲۱)

فیض سے زیادہ موزوں لفظ تو "لطف" ہو سکتا تھا۔ شاعر کا مفہوم شعر میں ٹھیک طرح ادا نہیں ہوا۔

وہاں گردشیں رُکی ہیں، وہاں زندگی ملی ہے		جہاں جھک گئیں نگاہیں، جہاں مسکرائے ہیں ہم (ص ۲۴)

وہاں — اور جہاں — میں "الف" اس بری طرح دب رہا ہے کہ وجدان تلملانے لگتا ہے۔

وہ نگاہ و دل کی جنت، وہ دماغ کی طہارت		وہ تمام رنگ و نکہت وہ تمام تر ترنم

"طہارت" لانے کی کیا تُک تھی؟

نظر نہیں تو فقط بانکپن سے کیا ہوگا		وطن میں آج پرانے چلن سے کیا ہوگا (ص ۲۶)
یہ بات کیا ہوئی؟ مصرعہ ثانی سست و کمزور۔

آج تو یوں کوئی آنچل کے سہارے سے گزرا عشق بھی بول اُٹھا عالم امکاں ہوں میں (ص ۴۰)

آنچل کی اوٹ سے کے گزرا" کہتے تو ایک بات تھی۔ "آنچل" کیا کوئی عصا یا چھڑی ہے جس کا سہارا لیا جاسکتا ہے! مصرعہ ثانی نرا مہمل!
عشق کا عالم امکاں ہونا" یہ آخر بات کیا ہوئی ؟

وہی نگاہ سرور آگیں، وہی ہیں جلوے وہی تبسم
کسی کے اظہار پر بھی ہے بہار ارماں اُداس کیوں ہو (ص ۲۱)

بہار ارماں" کیا چیز ہوتی ہے، جو "اُداس" بھی ہوسکتی ہے۔

مرے چمن میں ضیائے سحر گئی ہوگی گلوں پہ زینتِ شبنم اُبھر گئی ہوگی (ص ۳۲)

زینتِ شبنم" پھر اس کا اُبھرنا —— یہ کیا انداز بیان ہے!

کبھی کبھی تو غمِ روزگار ہٹ جائے مرے خیال کا دامن کوئی اُلٹ جائے (ص ۴۰)

مفہوم ہی اچھا اور نہ اظہار میں کوئی خوبی، بلکہ . . . . ؟ —!

سامنے جانِ انجمن ہے آج عشق کا پھر رہی چلن ہے آج (ص ۴۲)

زندانِ نو جمسلہ در دہانند" کے قبیل کا مطلع!

حلقۂ وعظ میں سیفی کی زباں ہے شمشیر اور بتِ شہر کی رفتار سے جی ڈرتا ہے (ص ۴۴)

مصرعہ ثانی نے پورے شعر کو دولخت بلکہ مہمل بنا دیا۔

ترے پاس درد نہاں چھوڑ آئے محبت کا ہم ترجماں چھوڑ آئے (ص ۵۴)

ل کا مطلع اور اس قدر بے لطف اور خام و ناپختہ!

بے وجہ ہو تم بے صدا بے زلیت بہک جائے تخئیل بھی سو جائے احساس بھی تھک جائے (ص ۹۲)

مصرعہ اولیٰ بے معنیٰ اور مہمل ہے۔

سیفی صاحب میں شاعرانہ صلاحیتیں پائی جاتی ہیں، اُن کا جمالیاتی ذوق بھی خاصہ نکھرا ہوا ہے! اُردو زبان و ادب اُن سے اچھی
توقع رکھتے ہیں! سیفی پریمی کی شاعری کا مستقبل شاندار ہے۔

گلزارِ تبسم
مرتبہ:۔ فضل الٰہی عارف، ضخامت ۲۷۱ صفحات، قیمت دو روپے ۷۳ پیسے۔
ملنے کا پتہ:۔ ادارۂ بتول، اچھرہ لاہور۔

اس کتاب میں فضل الٰہی عارف صاحب نے بڑے ہی دلچسپ عبرت خیز، سبق آموز اور ساتھ ہی ہنسا دینے والے لطائف و ظرائف
جمع کر دیے ہیں، اُردو میں زیادہ تر ملا دوپیازے اور بیربل کے لطیفے بیان کیے جاتے ہیں اور انہیں تحریری صورت میں بھی یکجا کیا گیا ہے "گلزارِ تبسم"
میں ایسے ہی لطیفے جن میں متعدد علمی لطیفے بھی ہیں آسان اور عام فہم زبان میں مرتب کیے گئے ہیں!

لطیفوں کا یہ رنگ ہے:—

— ایک شخص نے کچھ مرغیاں پال رکھی تھیں، راشن کے افسر نے اُس سے پوچھا، ان مرغیوں کو کیا کھلاتے ہو؟

اُس نے کہا گندم، افسر نے کہا گندم کا آٹا لوگوں کو مشکل سے میسر آتا ہے، جو تم مرغیوں کو کھلاتے ہو
پھر اپنے ملازم سے کہا ــــ کرو چالان اس کا!
ایک دوسرے مرغیوں والے سے افسر نے دریافت کیا تم مرغیوں کو کیا کھلاتے ہو؟ اس نے کہا میں تو
روٹی کے بچے ہوئے ٹکڑے کھلا دیتا ہوں، افسر نے کہا اس گھر میں اتنا آٹا تو پکتا ہے کہ مرغیوں کے لئے
بھی بچ رہتا ہے، اس کا بھی چالان کرو۔
ایک میراثی کی بھی شامت آگئی اس سے بھی پوچھا گیا کہ تم اپنی مرغیوں کو کیا کھلاتے ہو، وہ پہلے
دو آدمیوں کے جواب کا حشر دیکھ چکا تھا وہ جھٹ کہنے لگا جناب میں تو مرغیوں کو کچھ نہیں کھلاتا
انہیں نقد رقم دے دیتا ہوں۔"

ــــ "ایک عورت کے پاس دو شخصوں نے اپنی کچھ امانت رکھی اور کہا کہ جب تک ہم دونوں آدمی نہ
آئیں کسی کو امانت واپس نہ دینا، کچھ مدت بعد ایک شخص آیا، اس نے امانت طلب کی اور کہا میرا ساتھی مر
گیا ہے، عورت نے امانت دے دی۔
چند روز کے بعد دوسرا آدمی آنکلا عورت نے کہا میں تو امانت دے چکی ہوں، ــــ یہ جھگڑا حضرت علیؓ
کے پاس لے جایا گیا، آپ نے امانت والے سے کہا کیا شرط یہ نہ ہوئی تھی کہ جب تک دوسرا آدمی بھی نہ آئے ایک
کو امانت نہ دی جائے، امانت ہمارے پاس محفوظ ہے، جاؤ اپنے ساتھی کو بلا لاؤ اور امانت لے لو۔"

ــــ "ایک دفعہ بی۔اے کے امتحان میں مرزا غالب کے مشہور شاگردوں کے بارے میں سوال کیا گیا، ایک
طالب علم نے شاگردوں کی فہرست میں "ریختہ صاحب" کا نام بھی شامل کر دیا اور لکھا ریختہ صاحب مرزا
غالب کے علاوہ میر تقی میر کے بھی شاگرد تھے، گویا ان کے دو استاد تھے، دُور کیوں جائیے خود مرزا
غالب نے کہا ہے :-

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

یہ کتاب شروع سے کر آخر تک دلچسپ ہے، جو بھی اس کا مطالعہ کرے گا وہ خندہ و تبسم کا لطف اُٹھائے گا!

رنگ و بو
از :- خرد عرفت پوری، ضخامت ۱۲۸ صفحات (مجلد) قیمت دو روپے پچاس پیسے
ملنے کا پتہ :- مکتبہ گلستانِ ادب ۱/۱۰ کاشی پور روڈ، کلکتہ ۲

جناب خرد عرفت پوری اُردو دنیا میں متعارف نہیں ہوئے مگر ان کی غزلوں کا مجموعہ منظرِ عام پر آگیا۔ اُن کے اندر شعر گوئی کی قوت اور
صلاحیت پائی جاتی ہے، مگر ابھی اُنہیں خاصی مشق و مطالعہ اور تجربہ و مشاہدہ کی ضرورت ہے، اپنا مجموعہ کلام چھپوانے میں انہوں نے عجلت
کام لیا، اس لئے ان کے کلام میں بہت سے اس قسم کے اشعار ہو گئے ہیں جن سے اُن کی شاعری کا اچھا تعارف نہیں ہوتا۔
منتخب اشعار :-

صبح کا ذکر کرنے سے ہمدم　　　شام کی تیرگی کم نہ ہوگی

خیالوں پر بھی بندش ہے، زبانوں پر بھی تالے ہیں
مگر اہلِ جنوں کب سختیوں سے دبنے والے ہیں

یہ اہلِ دل بھی عجب امتحاں سے گزرے ہیں　　　غمِ حیات لئے دو جہاں سے گزرے ہیں
رسن سے، دار سے، آتشکدے سے، زنداں سے　　　گزرنے والے ہر اک امتحاں سے گزرے ہیں

دوستو! دہر میں جینے کا شعور　　　موج میں پاؤ گے، ساحل میں نہیں
موت کو زیست جاننے والے　　　موت کے نام سے نہیں ڈرتے
مجھے ان کا سہارا مل گیا ہے　　　سفینہ کو کنارا مل گیا ہے

دوسرا رُخ:—

نالہ باروں سے کچھ بھی نہ ہوگا　　　ان شراروں سے کچھ بھی نہ ہوگا　　　(ص ۴۱)

"نالہ باروں" نے غزل کے مطلع کو سپاٹ اور بے لطف بنا دیا۔

ہم اٹھائیں گے قصرِ محبت　　　تاجداروں سے کچھ بھی نہ ہوگا

"قصر والیان" کو نہ تاجدار اُٹھا سکتے ہیں اور نہ عوام! شاعر غالباً یہ کہنا چاہتا ہے کہ ہم عوام قصرِ محبت کی بنا ڈالیں گے اور اس کی دیواریں اٹھائیں گے

ذرا جانا سمجھ کر تم ہماری چشمِ گریاں پہ　　　کئی طوفان آکر رک گئے ہیں نوکِ مژگاں پہ　　　(ص ۴۷)

جب چشم گریاں ہے یعنی آنسو بہ رہا ہے تو پھر نوکِ مژگاں پر طوفان کا رُکنا کیا معنی رکھتا ہے۔

ہر ستم کو کرم سے جانچیں گے[1]　　　ہم خوشی کو بھی غم سے جانچیں گے
اور الجھا کے زندگی کو خود　　　وقت کے پیچ و خم سے جانچیں گے

یہ قطعہ بھلا کسی مجموعہ کلام میں آنے کے قابل تھا!

تو ہے ایٹم سے کس لئے مرعوب　　　دل کی طاقت عجیب طاقت ہے　　　(ص ۵۰)

ایسے شعروں سے غزل کی لطافت اور اس کا مزاج پناہ مانگتا ہے۔

اے کاش! ہر اک دل میں یہ وصف اُبھر آئے　　　پھولوں سے محبت ہو کانٹوں کو بھی اپنائے　　　(ص ۵۸)

مصرعہ ثانی خوب ہے مگر مصرعہ اولیٰ میں خاصہ تکلف پایا جاتا ہے!

میں ڈروں موت سے یہ دل میں نہیں　　　جرأتِ قتل ہی قاتل میں نہیں　　　(ص ۶۰)

ایسی آڑی ترچھی لکیروں کو جو مبتدی بنایا کرتے ہیں، شعر نہیں کہہ سکتے۔

سلوکِ اہلِ گلشن رقص کرتا ہے نگاہوں میں　　　بیاباں میں بھی مجھ کو دلکشی معلوم ہوتی ہے　　　(ص ۶۲)

اہلِ گلشن کا سلوک پھر اس کا رقص کرنا ـــــ اس خیال کو دوسرے موزوں لفظوں میں ادا کرنا تھا۔

اب دشمنوں سے کوئی شکایت نہیں رہی　　　ہم دوست یوں ملے ہیں ترے اعتبار میں　　　(ص ۷۱)

---

[1] کتاب میں "جاچیں گے" لکھا ہے۔

مصرعہ ثانی کا انداز بیان اور زبان دونوں ہی ترے اعتبار میں) دونوں ناقص !

مرنے کو ہم مرجائیں گے   گیسو تیرے بکھر جائیں گے   (ص ۸۷)

یہ کیا شاعری ہے ؟

دشواریوں میں ہمت مردانہ چاہئے   راحت بدوش ہوتی ہے مشکل اڑی ہوئی   (ص ۹۲)

دوسرا مصرعہ، شاعری کے لئے دھبہ عار و ننگ ہے !

ہم تیرے دہر فانی جو دو سخا نہیں   ہم کو سکونِ قلب بھی حاصل ہوا نہیں   (ص ۹۸)

ایسے جوڑے ہوئے لفظوں کو شعر کون کہہ سکتا ہے !

وہاں اب آگئی ہے یاد تیری   جہاں خود کو بھلاتا جا رہا ہوں

دل پہ طاری جب غم جاناں ہوا   سختیوں کا جھیلنا آسان ہوا

"دل جس کا گوہر عرفاں کا مخزن ہوگیا   اس پہ کنز سرِ نہاں صاف روشن ہوگیا

حق پہ ہستی کو جو مٹاتے ہیں   بن کے تارے وہ جگمگاتے ہیں

اس قسم کے کمزور اور بے مزہ شعروں کی " رنگ و بو " میں خاصی تعداد پائی جاتی ہے۔

ہم قدم کانفرنس نمبر

ناشر :- ظہیر احمد، ضخامت ۸۸ صفحات، قیمت سفید کاغذ پر ۶۰ پیسے اخباری کاغذ پر ۵۰ پیسے

ملنے کا پتہ :- اسلامی جمعیۃ طلبہ پاکستان ۲۳- اسٹریچن روڈ، کراچی

اسلامی جمعیۃ طلبہ پاکستان کے اسلام پسند طلباء کی معروف تنظیم ہے، جو طلباء میں اسلامی شعور اور دینی کردار پیدا کرنے کے لئے پر خلوص جدوجہد کر رہی ہے۔ یہ تنظیم پاکستان میں دینی امنگوں کی حامل اور علمبردار اور ملک وملت اور اسلام کے لئے "بشارت" ہے۔ مشرقی پاکستان میں اس کا بنگلہ نام "اسلامی چھاترو سنگھو" ہے، وہاں بھی اللہ تعالیٰ کے فضل سے دیندار طلباء حق کی مشعل روشن کئے ہوئے ہیں جس کی روشنی برابر پھیلتی اور بڑھتی چلی جا رہی ہے۔

اسلامی جمعیۃ طلباء کے آرگن "ہم قدم" نے "کانفرنس نمبر" شائع کیا ہے، جس کے اہم عنوانات حسب ذیل ہیں -

جلسہ عام طلبہ کی موجودہ بے چینی کے اسباب — مذاکرہ — نظریہ اور تعلیم — آنکھوں دیکھی کانوں سنا — تحریک احیاء اسلام میں طلبہ کا کردار — الاخوان المسلمون — ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر !

تمام مضامین اور رپورتاژ دلچسپ اور ایمان افروز ہیں، خاص طور سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تقریر جو انہوں نے جمعیۃ کے کھلے اجلاس میں فرمائی تھی، اس "خصوصی شمارے" کی جان ہے۔

اس کانفرنس کے موقعہ پر اکابر و مشاہیر نے جو پیغامات بھیجے تھے، وہ بھی اس مجلہ میں شامل ہیں سب سے پہلا پیغام اردن کے شاہ حسین کا ہے جناب عزیز احمد یاسین ایڈیٹر ہفت روزہ "ینگ پاکستان (YOUNG PAKISTAN) نے اپنے پیغام میں کتنی سچی بات کہی ہے :-

" اسلامی جمعیۃ پاکستان، طلبہ کی دیگر تنظیموں میں واحد تنظیم ہے جس پر پاکستان کے روشن اور تابناک

مستقبل کا انحصار ہے ____؟

ہم قدم کے "کانفرنس نمبر" کی طلبہ میں زیادہ سے زیادہ اشاعت ہونی چاہئے۔ اس کے مطالعہ سے دینی جذبات اور اسلامی
ت کو تقویت ملتی ہے۔

ماہنامہ "جاں نثار" امرتسر کا سالنامہ ۱۹۶۸ء

مدیر اعلیٰ - (اعزازی) بیلا رام وفا — مدیر: - رام لال بھنڈاری مدیر (اعزازی)
ہندر پال - ضخامت ۲۰۴ صفحات (شعراء اور اہلِ قلم کی متعدد تصاویر کے ساتھ)
قیمت تین روپے - ملنے کا پتہ: - ۶۸ سبھاش نگر، کٹڑہ شیر سنگھ امرتسر (پنجاب، بھارت)

جن سنگھیوں کی اردو دشمنی اور حکومت کی سرد مہری کے باوجود اردو زبان ہندوستان میں زندہ اور پائندہ ہے۔ ہندوؤں اور سکھوں
ں کے بے شمار چاہنے والے پائے جاتے ہیں، جو اردو کو کسی قیمت پر چھوڑنا نہیں چاہتے، بلکہ اسے سینوں سے لگائے ہوئے ہیں۔
امرتسر کا ماہنامہ "جاں نثار" اردو دوستی کا آئینہ مظہر ہے، اس کا سالنامہ بڑے آب و تاب کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ سالنامہ کے آغاز
کنور اکرسین صاحب صدر جمہوریہ ہند کا پیام ہے۔ سالنامہ کے ادبی و تنقیدی مضامین، افسانے، غزلیں اور نظمیں خوب سے خوب تر ہیں؟
ن میں ذرا زیادہ سختی کے ساتھ انتخاب کیا جاتا تو لالہ و گل کے ساتھ کہیں کہیں خار و خس نہ رہ جاتے۔
ماہنامہ "جاں نثار" کے سالنامہ کی کامیاب اشاعت پر اس کے کارکنوں کی خدمت میں ہم مبارکباد پیش کرتے ہیں!

پیام مشرقی

مرتبہ: - میر ولایت علی - ضخامت ۲۸۰ صفحات (مجلد) قیمت دو روپے
ملنے کا پتہ: - ادارۂ علامیہ ۲۲۱ جدید ملک پیٹھ حیدرآباد ۳۶ (اے - پی، بھارت)

جناب میر ولایت علی ایک مخلص اور دردمند مسلمان ہیں جو ملت اسلامیہ اور مسلمانوں کی دینی اور دنیوی اصلاح و بہبود کے لئے کچھ نہ کچھ جدوجہد
کرتے رہتے ہیں! علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی مرحوم سے وہ بہت زیادہ متاثر ہیں اور اکثر دینی مسائل میں اُن کے نقطۂ نگاہ کے پیرو ہیں! اس کتاب میں
اب موصوف نے علامہ مشرقی کی تصانیف کے منتخب اقتباسات درج کئے ہیں اور علامہ کے حالات زندگی کو مختصر مگر جامع انداز میں پیش فرمایا ہے۔
ان مضامین کا انتخاب علامہ مرحوم کی مشہور کتاب "تذکرہ" کے علاوہ خریطہ، خطاب، ارشادات، نصف تکمیل، قول فیصل، خطبۂ لاہور اور
مشرقی سے کیا گیا ہے، اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ علامہ مشرقی کا انداز نگارش بڑا ہی انقلابی اور طوفانی ہے اور عالیہ کا بلند نمونہ! اُن کی تحریروں
مانوں کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ ایک زمانے میں وہ اسلام اور ملت کی خدمت خلق اور دینی جدوجہد کے نشان سمجھے جاتے تھے، علامہ مشرقی نے خود اپنی ذات
ی جفاکشی اور ایثار کا ثبوت دیا۔ ان تمام خوبیوں کے ساتھ علامہ کی دینی فکر میں ژولیدگی پائی جاتی ہے۔ ان کی آزادیٔ فکر بعض اوقات احتیاط و
کے پہلوؤں کو نظر انداز کر دیتی تھی۔ انہوں نے اکثر نقطوں پر جو بحثیں کی ہیں، جن کو اہل علم نے پسند نہیں کیا۔
غالباً سنہ ۱۹۴۲ء کا ذکر ہے۔ راقم الحروف جبل پور سے "کل ہند سنت عرے" میں شریک ہونے کے لئے جا رہا تھا، اٹارسی جنکشن پر خاکساروں کے سالار گئے
ان دنوں خاکسار تحریک کا مرکز تھا۔ خاکساروں کے سالار نے اپنی تحریک کے بارے میں میری رائے دریافت کی میں نے عرض کیا۔
"اگر آپ کے قائد (علامہ مشرقی) نے اپنے قلم اور زبان پر کنٹرول نہ رکھا تو یہ تحریک مسلمانوں میں نامقبول ہو کر کیا عجب
ہے کہ مٹ جائے"
کوئی شک نہیں اس تحریک میں بڑے مخلص لوگ شامل ہیں مگر اس کا یہ حشر ہوا کہ تقسیم ہند کے قریب جب "مجاہد خاکساروں" کی مسلمانوں کی حفاظت

کے لئے بہت ضرورت تھی، خود بانی تحریک نے دلی کی جامع مسجد میں، تحریک کے ختم کرنے کا اعلان فرما دیا، عجیب و غریب المیہ کہ جو تحریک کا بانی تھا اسی نے اس تحریک کو دفنا بھی دیا۔ اس فیصلہ سے علامہ کی دماغی سطح کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

نواب بہادر یار جنگ مرحوم اس تحریک میں شامل تھے انہوں نے اپنی خاندانی امارت اور ذاتی شہرت و وجاہت کے باوجود دھواں دھار بارش میں بلدہ حیدرآباد کی سڑکوں پر کاندھے پر بیلچہ رکھ کر پریڈ کی ہے، علامہ جب حیدرآباد تشریف لے گئے ہیں تو نواب صاحب مرحوم ہی کے مہمان رہے پھر نواب صاحب اس تحریک سے علیحدہ ہو گئے، اس علیحدگی کا قصہ خود انہوں نے مجھے سنایا۔

قائد ملت نواب بہادر یار جنگ نے فرمایا کہ ــــ "میں نے قائد اعظم محمد علی جناح سے علامہ مشرقی کو بڑی کوشش کر کے ملایا، ان کے درمیان طویل گفتگو رہی، اس مذاکرے کے بعد چند باتیں دونوں رہنماؤں کے درمیان طے ہو گئیں، اس میل ملاپ سے مجھے دلی مسرت ہوئی۔ مگر دوسرے دن "ہندوستان ٹائمز" اٹھا کر دیکھا تو میری حیرت اور غم و افسوس کی کوئی انتہا نہ رہی کہ جن امور پر گزشتہ شب اتفاق ہوا تھا ان کے خلاف علامہ مشرقی نے پریس کو بیان دے ڈالا۔ بس اس دن کے بعد میرا خاکسار تحریک سے کوئی تعلق باقی نہ رہا۔"

دفعتاً ۱۹۴۳ء میں جب گوبند بلبھ پنتھ یو۔ پی میں وزیر اعظم تھے تو علامہ مشرقی سے بعض امور پر سمجھوتا ہوا، مسلمانوں کے اخبارات نے اس سمجھوتے پر لے دے کی تو علامہ مشرقی نے اپنی مدافعت میں اخباروں کو ایک بیان دیا، اس پر یو۔ پی کی کانگریسی وزارت نے اصل سمجھوتے کا متن اخبارات میں چھپوا دیا۔ جو علامہ مشرقی کے بیان سے قطعاً مختلف تھا، علامہ کے لئے یہ بڑی سبکی بات تھی مگر انہوں نے اپنی اس کمزوری اور غلط بیانی کو ــــ "صلح حدیبیہ" سے تشبیہ دی۔

میر ولایت علی صاحب علامہ کے حالات میں رقمطراز ہیں ــــ

"آپ نے ہجرت، خلافت اور کانگریس کے ایجی ٹیشنوں کا انجام دیکھ کر شہرہ آفاق کتاب تذکرہ کے ذریعہ دنیائے اسلام کو موت و حیات کا آخری پیام دیا۔" (ص ۱۵)

"آخری پیام" یہ مبالغہ آمیز مدح و توصیف ہے، مرتے وقت یا کہیں سے رخصت ہوتے ہوئے کوئی پیغام دیا جائے تو اسے "آخری پیغام" کہہ سکتے ہیں "آخری پیام" یہ صرف قرآن اور حضور خاتم النبیینؐ کے اقوال کی صفت ہے۔

"جس نباتی یا حیوانی نوع کا استخلاف زمین کے کسی حصہ پر قائم ہے وہ صالح ہے، جس کا تمکن فی الارض مٹتا جاتا ہے وہ غیر صالح ہے" (ص ۶۷)

علامہ مشرقی کا یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ زمین کے استخلاف و تمکن کی صورتیں مختلف ہوتی ہیں کبھی امتحان و آزمائش کے لئے کبھی ظالموں کو ڈھیل دینے کی خاطر کبھی اہل ایمان کو ان کے اعمال کی پاداش میں! علامہ کے نظریہ کے مطابق حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور حضرت سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں نمرود اور فرعون صالح تھے، کہ ان کو زمین پر تمکن حاصل تھا۔ (معاذ اللہ) علامہ کی نگاہ سے یہ نکتہ اوجھل ہو گیا کہ ہر "تمکن" صالح نہیں ہوتا۔ غیر مسلم اور کفار و مشرکین، دہریئے اور ظالم اللہ کی زمینوں پر قابض اور متمکن ہو جاتے ہیں وہ دراصل غاصب ہیں۔

"جب کامل دو سو برس کی مہلت کے بعد رسول پاک کی صحبت کا عہد کہن تازہ کرنے کے وہم سے احادیث نبوی کی تدوین شروع کی، صدیوں کی بھولی بسری باتیں معرض وجود میں آتے ہی جزو ایمان بن گئیں، کل کی کہی ہوئی بات کو صحیح طور پر دہرا نہ سکنے والا انسان خطا و نسیان سے یکسر بری ہو کر رسول پاک کی ڈیڑھ سو برس پہلے

کہی ہوئی اور سنی ہوئی باتوں کو اپنے جیسے ضعیف الخلق انسانوں کی روایت پر نہایت وثوق سے ماننے لگا۔" (ص ۱۲۵)

احادیث کے بارے میں علامہ کی یہ تحقیق ناقص ہے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس عہد میں بعض صحابہ نے احادیث کو تحریر میں لانا شروع کر دیا تھا، حضرت وہب ابن منبہ کی کتاب احادیث شاید علامہ کے علم میں نہ تھی، کیا امام مالک کی موطا حضور کے دو سو برس بعد مدون کی گئی ہے ۔۔۔ ! علامہ مشرقی کی اس قسم کی تحریروں سے "منکرین سنت" کے سلک ضلال کو تقویت ملتی ہے ۔

"خاکسار تحریک نے تیرہ سو پچاس برس کے بعد پہلی دفعہ مسلمان کو بتایا ہے کہ اسوۂ رسول، دینِ اسلام، سچا مذہب صرف سپاہیانہ زندگی ہے۔" (ص ۱۳۰)

خاکسار تحریک کے بارے میں مشرقی صاحب نے بڑے مبالغے سے کام لیا ہے، اس صورت میں تو مسلمانوں کے "جہاد" کی پوری تاریخ پر پانی پھر جاتا ہے، ایسی باتیں عالی ظرف اور حقیقت پسند لوگوں کو زیب نہیں دیتیں ۔

"خاکسار تحریک پچھلی تمام تحریکوں کی غلطیوں کو پیش نظر رکھ کر قائم کی گئی ہے، خاکسار کا مقصد قوم اور ملک کی ہر گتھی کو مذہب سمجھ کر سلجھانا ہے، اور قوم و ملک کے لئے تیار اور مطیع فوج بن کر رہنا ہے،

ہم اس تحریک کے اندر کم از کم دس لاکھ سپاہیوں کی ایک پرامن پابندِ قانون، قواعد دان، مطیع خدا اور سنگر ماسوا، بے غرض، حکم ماننے والی **خادمِ خلق، ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی عیسائی، اچھوت سب پر مشتمل ایک جماعت تیار کرنا چاہتے ہیں ۔** جو محبت کا عالمگیر جذبہ رکھتی ہو، جن کا منتہا خدا کے وجود کا عملاً اقرار ہو، جس کو روزِ قیامت کے واقع ہونے پر منطقی یقین ہو، جب ہندو نے مسلمان کو اور مسلمان نے ہندو کو خدا اور آخرت کو ماننے والا اپنا بھائی تصور کر لیا اور سب نیک عمل پر متفق ہو گئے تو بیڑا پار ہے۔" (ص ۱۴۷)

"خاکسار تحریک نے قوم اور ملک کی کسی ایک گتھی کو بھی نہیں سلجھایا ۔۔۔ پھر علامہ مشرقی نے اس تحریر میں "وحدتِ ادیان" کا جو تصور پیش کیا ہے ۔ وہ اسلام کی اصولی تعلیم کے خلاف ہے۔

انہی گمراہ کن خیالات کو انہوں نے جگہ جگہ دہرایا ہے —

"ہندو کا دھرم رب نے پرانا دھرم ہے اس لئے انسان کی پہلی زندگی کے لئے خوب مناسب تھا مسلمانوں کا مذہب رب نے نیا ہے اس لئے انسان کی موجودہ زندگی کے لئے خوب مناسب ہے، تم اپنے اپنے مذہبوں کی روح پر خوب جمے رہو ۔ کیونکہ اسٹیٹر صرف ایک ہے، ایک دھرم قدیم ایڈیشن ہے اور دوسرا مذہب اسی قانون کا جدید ایڈیشن ہے، دونوں قوموں کا فخر بجا ہے۔" (ص ۱۶۶)

حالانکہ قرآن بتاتا ہے کہ پہلا انسان "مومن" تھا، اور ہر نبی اور پیغمبر "اسلام" ہی کا مبلغ و مناد تھا، اور اللہ تعالیٰ نے اسلام ہی کو انسانیت کے لئے پسند فرمایا ہے —

اور سنئے ! —

"اب آخری بات مان لو، وہ یہ کہ مذہب کی طرف، قرآن کی طرف، گیتا کی طرف پھر آ جاؤ، اور رب کے

سب خاکسار تحریک میں نہایت ولولے اور جوش سے شامل ہو جاؤ " (ص ۱۶۷)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی وحی کی بنا پر اسلام اور کفر کے درمیان واضح حد قائم کر دی، رسول اللہ صلی اللہ کی نبوت اور قرآن پر ایمان لائے بغیر صرف خدا کا اقرار اور آخرت کے عقیدے کا اقرار کافی نہیں! حیرت ہے کہ مسلمانوں میں بھی ایک " رائے " پیدا ہو گیا۔ خدا کرے علامہ مشرقی نے ان عقائد سے رجوع کر لیا ہو، یہ عقائد کسی مسلمان کے نزدیک قابل قبول نہیں ہو سکتے اور نہ چاہئیں۔

علامہ مشرقی نے "تذکرہ" کے مقدمہ میں شاعری کی مذمت میں بیسیوں صفحے لکھے ہیں، مگر پھر خود اپنی شاعری کو بھی پیش فرما دیا ہے:
شدید شتر گربگی: اس کتاب کے سرنامے پر علامہ کی رباعی کے دو مصرعے درج ہیں۔

دنیا چو مطیع کن طلسمی است حلال   وز بہر نہ او شدی حرام است حرام

اس شعر میں "مطیع" کا "ع" تقطیع سے ساقط ہو رہا ہے، غالباً وہ عروض سے واقف نہیں تھے!

میر ولایت علی صاحب نے علامہ مشرقی کی جن تحریروں کا انتخاب کیا ہے ان میں بعض تحریریں مفید بھی ہیں۔ مگر جن گمراہ کن عقائد کا ہم نے ابھی ابھی اشارہ کیا ہے ان کی اشاعت کر کے میر صاحب نے ایک وبال اپنے سر لیا ہے۔

القرآۃ الراشدہ
الجزء الاول

از:- ابوالحسن علی الندوی
ضخامت ۸۰ صفحات، قیمت ایک روپیہ بارہ پیسے
ملنے کا پتہ:- مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ نے مدارس اسلامیہ کے لئے عربی زبان و ادب کا نصاب مرتب فرمایا ہے جس کی پہلی کڑی ہمارے سامنے ہے، اس کتاب میں بندروں اور سوروں کے قصوں اور تصویروں کی بجائے دین، اخلاق کی حکایتیں سلیس عربی میں بیان ہیں، جن کے مطالعہ سے مسلمان بچوں میں دینی فکر بیدار ہوتی ہے، عربی زبان رواں، شستہ اور بامحاورہ ہے! مضامین کے تنوع نے کتاب دلچسپ بھی بنا دیا ہے۔

فاضل مصنف نے باتوں باتوں میں کھانے پینے، سیر کرنے اور اٹھنے بیٹھنے کے اسلامی آداب بھی بتا دیئے ہیں، عربی مدارس میں اس کا پڑھایا جانا ہر اعتبار سے نتیجہ خیز اور مفید رہے گا۔

تجارتی سود
تاریخی اور فقہی نقطۂ نظر سے

جناب فضل الرحمٰن لیکچرار شعبہ سنی دینیات۔
ضخامت ۱۷۵ صفحات۔
ملنے کا پتہ:- یونیورسٹی پبلیکیشنز، ظہور ہارڈ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

کئی سال ہوئے ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور نے ——— "کمرشل انٹرسٹ کی فقہی حیثیت" ——— نام کی ایک کتاب کی تھی، جو مولانا محمد جعفر شاہ صاحب پھلواروی نے مرتب کی تھی، اس کتاب میں خود ان کا بھی ایک مقالہ اور چند دوسرے مضامین تھے۔ کتاب بالا میں یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی، کہ صرفی و ذاتی حوائج کے لئے جو قرض لیا جائے اس پر اضافہ کو قرآن و سنت میں "ربا" کہا گیا ہے جو مگر تجارت، صنعت اور زراعت وغیرہ امور کے لئے جو قرض لیا جاتا ہے اور اس پر جو سود دیا جاتا ہے وہ "کمرشل انٹرسٹ" ہے اس کی حرمت قرآ

ثابت نہیں ہے۔

جناب فضل الرحمٰن کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے کہ صاحب موصوف نے اس گمراہ کن نظریہ کو غلط اور خلاف قرآن و سنت ثابت کرنے کے لئے بڑی تحقیق و تدقیق کے ساتھ کتاب لکھی ہے، انہوں نے "کمرشل انٹرسٹ" کو جائز ٹھیرانے والوں کے دلائل کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی ہیں صاحب موصوف لکھتے ہیں:۔

"ربا کا ترجمہ یوژوری (USURY) کرنا اور انٹرسٹ سے اُسے تمیز کرنا قرآن میں تحریف معنوی کی بدترین مثال ہے جس کی تائید نہ عربی زبان سے ہوتی ہے نہ قرآن و سنت سے"

فاضل مصنف نے تاریخی واقعات کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ "بنک کاری" کے اداروں کا وجود، جن کا اصل کاروبار قرضے کا لین دین رہا ہے، یونان، مصر، روما اور بابل وغیرہ ملکوں کی قدیم تاریخ میں ملتا ہے، منوسمرتی میں "بندھو" کا لفظ پایا جاتا ہے جو "بنک" کے مترادف ہے ——— اور ———

"عرب زمانہ قدیم سے تجارتی اور پیداآور قرضوں سے نہ صرف واقف تھے بلکہ یہ قرضے اور ان پر مشروط اضافوں کا مطالبہ اور ادائیگی ان کے نظم معیشت کا ایک بنیادی پتھر تھی"

لائق و محقق مصنف نے قطعیت کے ساتھ اس ایمان افروز حقیقت کا اعلان کیا ہے۔

"قرآن کریم کے حرام قرار دئے ہوئے "ربا" اور آج کل کے "کمرشل انٹرسٹ" میں اپنی حقیقت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں اگر ہے تو صرف نام کا، ورنہ معنی دونوں کا ایک ہے"

یہ کتاب علمی، دینی اور تاریخی تحقیق کے اعتبار سے اس دور کی شاہکار تصنیف ہے، اسلوب تنقید سنجیدہ اور باوقار ہے، تاریخ، وحدیث اور خود "علم معیشت و اقتصاد" کے نکات کا جو تجزیہ کیا گیا ہے اور جن دلائل سے "متجددین" کے نظریات کو باطل قرار دیا گیا ہے وہ عظیم علمی کارنامہ ہے!

مولانا جعفر شاہ پھلواروی نے قرآن کی آیات اور احادیث کو پیش کر کے جو مغالطے دئے ہیں، غلط قسم کے ادھورے ترجمے کئے اپنی بات کی پچ کے لئے جو "علم کلام" استعمال فرمایا ہے اُسے فضل الرحمٰن صاحب نے علمی و دینی دلائل سے ناکارہ اور گمراہ کن ثابت کیا۔

فاضل مصنف نے مسائل کے تجزیہ و تنقید کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے، اُن کی پیش کی ہوئی دلیلوں کو دل ودماغ قبول کرتے چلے جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے کہ صاحب موصوف نے کتاب و سنت کی صحیح ترجمانی اور مدافعت فرما کر مسلمانوں کو اُس گمراہی سے آگاہ کر دیا ہے جس میں مبتلا ہو کر مسلمان خدا اور رسول کو جنگ کی دعوت دیتا ہے (معاذ اللہ)

"سود منہ" کے ایڈیٹر مولوی طفیل احمد منگلوری مرحوم کے بارے میں غالباً یہ روایت لائق مصنف تک نہیں پہونچی کہ "جواز سود" کے سلسلہ میں مولوی صاحب نے آخر وقت میں توبہ کر لی تھی۔

اس بلند پایہ کتاب پہ جناب فضل الرحمٰن کی جتنی بھی تحسین کی جائے کم ہے، علم و تحقیق کے ساتھ اُن کی ایمانی قوت نے بھی اس کتاب کو گراں مایہ اور وزنی بنا دیا ہے، اس کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ دور حاضر کے سب دین ——— مغربی ملا اور مذہبی سکالر ——— کس قدر اُتھلی معلومات رکھتے ہیں، اُن کے افکار کتنے سطحی ہیں اور ان کا مبلغ علم کیا ناقص ہے!

کتاب معرفۃ المذاہب

تصحیح :- ڈاکٹر عبد العلیم، ضخامت ۱۴ صفحات (دیدہ زیب عربی ٹائپ)
ملنے کا پتہ :- معہد الدراسات الاسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

یہ عربی رسالہ کو ڈاکٹر عبد العلیم صاحب نے تصحیح کے بعد شائع کیا ہے، اس کے مقدمہ میں ڈاکٹر صاحب موصوف لکھتے ہیں۔

" اس رسالے میں مذکور ہے یہ امام ابو حنیفہؒ کی تصنیف ہے "سراج الہدایہ" میں بھی یہی کہا گیا ہے، لیکن داخلی اور خارجی شہادت کی بنا پر بہ یقینی طور سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ رسالہ امام ابو حنیفہ کی تصنیف نہیں ہے"

اس کتاب میں مسلمانوں کے فرقوں کے نام اور اُن کے عقائد اختصار کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ مثلاً خارجیوں کے فرقوں کے حسب ذیل نام دئے گئے ہیں ——— ازرقیہ، ثعلبیہ، کوزیہ، کنذیہ، میمونیہ، محکمیہ، اخنسیہ، حازمیہ، معتزلیہ، شمراخیہ اور اباضیہ،

بیان عقائد کا ایک نمونہ :—

" والحازمیہ یقولون والصلوٰۃ تصلی فرادی، لیس اداءھا بالجماعۃ"

ڈاکٹر عبد العلیم صاحب نے رام پور اور کلکتہ کے نسخوں کو سامنے رکھ کر یہ رسالہ تیار کیا ہے' صاحب موصوف نے اس رسالہ کے بارے میں لکھا ہے

"...س رسالے کی اہمیت میری نظر میں یہ ہے کہ غالباً یہ پہلا رسالہ ہے، جس میں اس انداز سے فرقوں کی تقسیم کی گئی ہے اور اسی سے اخذ کر کے اس نہج کے دوسرے رسالے تیار کئے گئے ہیں"

کتاب فضائل من اسمہ احمد او محمد

تالیف :- الحافظ ابی عبد اللہ الحسین بن احمد بن بکیر البغدادی (المتوفی ۳۸۸ھ)
تحقیق :- مختار الدین احمد ضخامت ۴۴ صفحات (دیدہ زیب ٹائپ) قیمت درج نہیں،
ملنے کا پتہ :- معہد الدراسات الاسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

جناب مختار الدین احمد صاحب نے یہ رسالہ کتب خانہ جامعہ لائیڈن کے دو نسخوں کو سامنے رکھ کر مرتب فرمایا ہے اس رسالہ پر صاحب موصوف نے عالمانہ مقدمہ لکھا ہے،

رسالہ ہٰذا میں وہ حدیثیں جمع کی گئی ہیں، جو "احمد و محمد" نام رکھنے کی فضیلت و برکت کے بارے میں آئی ہیں۔ مگر اس مقدمہ میں علامہ صنعانی کی "تذکرۃ الموضوعات کی یہ عبارت بھی درج کر دی ہے کہ :—

" احمد نام رکھنے کی فضیلت سے متعلق جو احادیث روایت کی جاتی ہیں، اُن کی کوئی اصل نہیں اور وہ پایۂ ثبوت کو نہیں پہونچتیں"

خود فاضل مرتب نے اس کا اعتراف کیا ہے :—

" ابن بکیر کے رسالے میں مندرجہ احادیث کے سلسلہ اسانید پر ایک نظر ڈالنے سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ثقہ اور معتمد راویوں کے دوش بدوش واضع، متروک، مدلس، غیر معروف ہر قسم کے اصحاب جمع ہیں .... "

مثلاً یہ روایت :—

" قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من ولد لہ ثلاثۃ فلم یسم احدھم باسمی فقد جفانی"

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کے تین بیٹے پیدا ہوئے اور اُس نے کسی ایک کا نام بھی میرے نام پر نہیں رکھا اُس نے میرے ساتھ جفا کی)

روایت کے اعتبار سے درست معلوم نہیں ہوتی ۔

جن راویوں کے نام احادیث کے سلسلہ میں آئے ہیں، اُن کے مختصر حالات ذیلی حاشیہ میں ملتے ہیں جس نے اس رسالے کو فن رجال و تاریخ کے اعتبار سے اہم بنا دیا ہے ۔

مخطوطات انجمن ترقی اردو

مرتبہ :- سید سرفراز علی رضوی، ضخامت ۲۰۴ صفحات، قیمت تین روپے ۵۰ پیسے ۔
ملنے کا پتہ :- انجمن ترقی اُردو، بابائے اُردو روڈ، کراچی ۔

انجمن ترقی اردو کے کتب خانہ میں فارسی اور عربی کے جو مخطوطات محفوظ ہیں یہ کتاب اُن کی فہرست ہے۔ متعلقات قرآن، حدیث اور فلسفہ و صرف سے لے کر نال نامے خطاطی، نجوم، طباخی، نیرنجات، جنفر اور سنت تک کے موضوعات پر مخطوطات پائے جاتے ہیں ۔

کتاب کے آغاز میں آغا مرزا کی وصلی اور اس کی پشت پر بہادر شاہ ظفر کی لکھی ہوئی وصلی کا عکس دیا گیا ہے، اس کے بعد دوسرے خطاطوں کی وصلیاں اور بعض مخطوطات کے عکس ہیں ۔

تورات کا منظوم ترجمہ اور ژند و اوستا کے مخطوطات بھی فہرست میں درج ہیں جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انجمن ترقی اُردو نے مخطوطات کا خاصہ نادر ذخیرہ جمع کیا ہے ۔

قطب دوراں

از :- سید اشفاق حسین رضوی، ضخامت ۴۸ صفحات ۔
ملنے کا پتہ :- مدرسہ عالیہ، فرقانیہ چوک لکھنؤ

حضرت مولانا عین القضاۃ رحمتہ اللہ کا نام دینی حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے حضرت موصوف عالم دین بھی تھے شیخ طریقت اور عابد و زاہد بھی تھے، ان کی زندگی کا لسان العصر اکبر الٰہ آبادی کے بقول یہ عالم تھا ۔

دنیا میں ہوں دنیا کا طلب گار نہیں ہوں
بازار سے گزرا ہوں، خریدار نہیں ہوں

مولانا عین القضاۃ صاحب مشہور و معروف مدرسہ عالیہ فرقانیہ (چوک لکھنؤ) کے بانی ہیں، جہاں سینکڑوں طلبا نے فن تجوید حاصل کیا ہے، مولانا مرحوم کے بارے میں عام طور پر مشہور تھا کہ ان کو "دست غیب" حاصل ہے ہزاروں روپیہ ماہوار کا خرچ اور کسی کو بھی آمدنی کے ذرائع کا علم نہیں، ممکن ہے کہ بعض دولت مند اہل خیر لوگوں سے چھپا کر مولانا موصوف کی امداد کرتے ہوں ۔

مولانا کو جو "قطب دوراں" لکھا گیا ہے تو یہ اصطلاحیں اور دینی مناصب صدیوں بعد وضع کئے گئے ہیں، خالص توحید یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خود کائنات کو سنبھال رہا ہے، جس میں اُس کا کوئی شریک نہیں ہے، دنیا کے تکوینی امور کا سررشتہ اللہ تعالیٰ کے دست مشیت میں ہے، وہی رزاق، خالق، دستگیر، فریاد رس، حاجت روا اور مجیب الدعوات ہے تمام بندے اللہ تعالیٰ کی مشیت اور قضا و قدر کے آگے مجبور ہیں اور سب اُسی کے فضل و کرم کے محتاج ہیں ۔

نیشنل اور الفرڈ
ILFORD
ILFORD
HP3 FILM
ILFORD
HP3
ROLL FILM
ہمہ وقت
آپ کی
مسرتوں
کے ساتھی!

اگست ۱۹۶۸ء
جلد ۲۰
شمارہ ۵

ماہنامہ فاران کراچی

ایڈیٹر :- ماہر القادری

ترتیب

قیمت فی پرچہ :- ۶۲ پیسے // پبلشر :- ماہر القادری // چندہ سالانہ :- ۷ روپے

دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی

باہتمام مشفیق احمد صدیقی پبلشر ماہر القادری نے انٹرنیشنل پریس کراچی میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

دو ماہ قبل جون کے آغاز میں انجمن ترقی اردو مظفرآباد (آزاد کشمیر) کی دعوت پر وہاں جانا ہوگیا، اس سے پہلے بھی کئی ادبی
ماعات اور مشاعروں میں آزاد کشمیر جانا ہوا ہے، ایک بار ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی اور پروفیسر خورشید احمد
احب زنداں نامہ رفیق سفر تھے، صبح سویرے کراچی کے ہوائی اڈے سے جہاز روانہ ہوا اور ایک گھنٹہ چالیس منٹ میں راولپنڈی پہونچ گیا
س کی ترقی نے زمان و مکان کے فاصلوں کو کتنا مختصر اور قریب تر کر دیا ہے۔ دنیا کی ہر ترقی پر حمد و ثنا کی سزاوار اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے
س نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اسے عقل کے جوہر سے نوازا ہے، پھر انسان کائنات کی تسخیر کے جو کارنامے انجام دیتا ہے، تو یہ کائنات بھی
تعالیٰ کی بنائی ہوئی ہے! کوئی شک نہیں انسان موضوع کائنات اور دنیا کی عظیم ترین مخلوق ہے، مگر اصل کریڈٹ تو اللہ تعالیٰ کی شان خلاقی
جاتا ہے کہ اُس کی خلاقی اور ربوبیت کے طفیل میں آدمی ایجاد و اختراع کے معجزے دکھلا رہا ہے۔

بیسیوں بار ہوائی جہاز سے سفر کیا ہے مگر ہر سفر میں دل و دماغ کو فکرمند پایا ہے، اور ایرپورٹ پر جہاز کے سلامتی کے ساتھ اترنے پر اللہ تعالیٰ
ر ادا کیا ہے! یہ سچ ہے کہ وقت سے پہلے کوئی مر نہیں سکتا، اور موت کو کوئی قوت ٹال نہیں سکتی، ہر جان کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک "مدت معلوم"
ی ہے، اس مدت میں نہ تاخیر ہو سکتی ہے اور نہ تقدیم! مگر اس یقین کے باوجود انسان اپنی زندگی کے بارے میں ہر خطرے کے اندیشے سے فکرمند
ہ جاتا ہے اور ہوائی جہاز میں اس اندیشے کے امکانات ہر لمحہ پائے جاتے ہیں۔

پاکستان انٹرنیشنل ایرویز (P.I.A) کے جہاز میں سفر کرتے ہوئے یہ بات ذہن میں آئی یا یوں کہئے کہ شعر کی طرح غیب سے القا ہوئی اگر
سے پاکستانی جہازوں میں شراب ممنوع ہوتی، خاتون میزبانوں (AIR HOSTESSES) کی بجائے مرد میزبان مسافروں کی خاطرداری
یزبانی کے فرائض انجام دیتے تو پاکستانی ایرویز پاکستان اور اسلام کا دنیا کے سامنے اچھا تعارف کراتی، اور لوگ محسوس کرتے کہ اسلام کا ضابطہ
اق قابل عمل ہے اور اس سے فتنوں کا سد باب ہوتا ہے۔

راولپنڈی کے ایرپورٹ پر دو صاحبان موٹر کار لئے ہوئے موجود تھے، سامان اترنے اور شناخت کرنے میں آدھا گھنٹہ صرف ہوا، پھر ہمیں
ہاؤس لے جایا گیا، وہاں تھوڑی دیر آرام کیا، اس کوٹھی کا رقبہ ڈھائی تین ہزار گز سے کیا کم ہوگا، بڑے بڑے ہال اور طویل و کشادہ برآمدے
مگر جس رکھ رکھاؤ اور توجہ کی یہ عمارت مستحق ہے اُس کی کمی نمایاں طور پر محسوس ہوئی۔

ساڑھے دس بجے کے قریب پنڈی سے ہم روانہ ہوئے موٹر کار آرام دہ اور کشادہ تھی ــ کل تین مسافر، ڈرائیور چابکدست اور خوش
اق! دوپہر کے وقت کوہ مری کی بلندیوں سے گزرے تو خلاف توقع خنکی کی بجائے دھوپ اور گرمی نے ہمارا خیر مقدم کیا، یہاں تک چڑھائی تھی،

پھر کوہالہ تک اُترائی سے سابقہ پڑا، پہاڑی درختوں کے مناظر نے نگاہوں کو تروتازگی بخشی، پھر کوہالہ آ گیا، دریائے جہلم کا یہاں پل ہے، یہ جو پہاڑی راستے میں جگہ جگہ موڑ آتے ہیں، میری طبیعت ان موڑوں اور چکروں میں بہت زیادہ بے کیف ہو جاتی ہے، میں گاؤں کا رہنے والا ہوں، اُسی فضا میں پلا بڑھا ہوں، کھیتی باڑی کے سلسلہ میں مشقت کے کام بھی کئے ہیں! اس لئے میں دھان پان نہیں ہوں، مگر طبیعت کا یہ حال ہے کہ ۱۹۶۱ء میں جب بغداد گیا تھا، تو ان دنوں دجلہ کے متعدد پل کشتیوں کے بنے ہوئے تھے میں ایک پل کو پار کر رہا تھا کہ اتنے میں ایک لاری قریب سے گزری اس کے بوجھ سے کشتی کو خاصی جنبش ہوئی اور اس جنبش کے ساتھ ہی میرا سر چکرانے لگا! ایک ریسٹوران میں جا کر ٹھنڈا پانی پیا اور آئس کریم کھائی تب کہیں جا کر طبیعت بحال ہوئی۔

کوہ مری سے اترتے ہوئے ہی طبیعت میں بے کیفی پیدا ہو گئی۔ میں بہت کچھ ضبط کئے ہوئے بیٹھا رہا۔ مگر کوہالہ کے بعد موٹر کار رکوا(کر) نیچے اترا اور خوب زور کی آواز کے ساتھ قے کی، اس کے بعد طبیعت خاصی بحال ہو گئی، ڈاکٹر قریشی اور خورشید صاحب کو چاق چوبند پا کر اور ہنستے بولتے دیکھ کر اپنی طبیعت کی کمزوری پر ندامت سی محسوس کی! اس ندامت کو احساسِ کمتری بھی کہا جا سکتا ہے۔

دو بجے کے قریب مظفرآباد پہنچے، ریسٹ ہاؤس میں سرکاری حکام، دانشور اور معززین شہر کی ایک جماعت ہماری منتظر تھی اُن سے تعارف ہوا، پھر دوپہر کا کھانا کھایا، نماز عصر کے بعد "مسئلہ فلسطین" پر ڈاکٹر قریشی صاحب کی تقریر ہوئی، راقم الحروف نے نظم پڑھی آزاد کشمیر کے باوقار صدر جناب عبدالحمید خان صاحب بھی اس محفل میں تشریف فرما تھے۔ جناب یعقوب ہاشمی جو حکومت آزاد کشمیر کے کئی محکموں کے سکریٹری ہیں اور جن کی قوت حافظہ اور ذہانت سب کے نزدیک مسلم ہے، انہوں نے ڈاکٹر صاحب کا تعارف کرایا۔ تعارف کے سلسلہ میں خاصی دلچسپ بحث پیدا ہو گئی، ڈاکٹر قریشی صاحب نے فرمایا کہ میری تعریف میں مبالغہ کیا گیا ہے، ہاشمی صاحب نے کہا کہ میں نے ڈاکٹر صاحب کے چھپے ہوئے سوانح حالات کی روشنی میں اُن کا تعارف کرایا ہے۔

شب میں جلسہ ہوا اور اس کے بعد نعتیہ مشاعرہ! پروفیسر خورشید صاحب کی تقریر کا موضوع "سوشلزم" تھا، اُن کی تقریر ہر اعتبار سے یادگار اور مثالی تقریر تھی، اُنہوں نے معاشیات و اقتصادیات کے نقطۂ نگاہ سے سوشلزم کے نقائص کو بتایا اور ثابت کیا کہ اسلام کا معاشی نظام سوشلزم سے زیادہ بہتر ہے، اس میں فطری توازن اور اعتدال پایا جاتا ہے، اس جلسہ میں راقم الحروف نے بھی "ادب" پر اپنے خیالات پیش کئے مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ اس اجلاس کی کامیاب ترین تقریر خورشید صاحب ہی کی تقریر تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ صلاحیتیں دین کی راہ میں صرف ہو رہی ہیں، یہ سعادت صرف زورِ بازو سے حاصل نہیں ہوتی۔

؎ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ!

دوسرے دن بارش ہونے لگی، ریسٹ ہاؤس کا سبزہ، سرو اور چنار کے درخت، سامنے اونچی پہاڑیاں، بارش کا سماں بس دیکھنے کے قابل تھا، ذرا سی دیر میں موسم بڑا پُرلطف اور کیف انگیز ہو گیا!

پہلے دن کا جلسہ کھلے میدان میں ہوا، دوسرے دن بارش کے خوف سے شہر کے ایک ہال میں جلسہ کا انتظام کرنا پڑا، ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی کی عالمانہ تقریر نے سماں باندھ دیا، تجربے کام کی، پتہ کی اور سچی باتیں کہیں، ان باتوں میں زورِ خطابت بھی تھا اور خلوص و درد بھی! اس خاکسار نے اُردو کی ہمہ گیری پر اپنے خیالات پیش کئے اور بتایا کہ اردو زبان سب سے زیادہ کمسن زبان ہے مگر دنیا کی کسی بڑی سے بڑی زبان سے بھی پیچھے اور کمتر نہیں ہے اور اردو میں تمام علوم و فنون کی ترجمانی اور اظہار و ابلاغ کی پوری پوری صلاحیت موجود ہے جلسہ کے بعد مختصر سا مشاعرہ ہوا!

مظفرآباد میں ڈھائی دن کا قیام مصروفیت کے باوجود آرام دہ رہا، قیام و طعام کا معقول اور اعلیٰ انتظام ہر قسم کی مخلصانہ پذیرائی!

وہاں پہونچتے ہی یہ مژدہ فرحت اثر سن کر جی باغ باغ ہو گیا کہ حکومت آزاد کشمیر نے "اردو" کو سرکاری زبان قرار دے دیا اور ساتھ کے ساتھ اس قانون کا نفاذ بھی ہو گیا۔ جلسہ گاہ میں "اردو" کی اہمیت اور افادیت پر جگہ جگہ کتبے آویزاں تھے، جہاں استاد داغ دہلوی کا یہ شعر سب سے نمایاں مقام پر لگایا گیا۔

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

ان جلسوں میں پنجابی، سرحدی، کشمیری اور مہاجرین بھی تھے ـــ مگر اردو کے معاملے میں سب یک زبان اور ہم خیال! وحدت و اتحاد اور بھائی چارے کے ایسے مناظر پاکستان میں اب تو کم ہی نظر آتے ہیں۔ یہی رنگ اگر پورے پاکستان کا ہو جائے تو "اردو زبان" پاکستان کی سالمیت اور وحدت کو کس قدر قوی اور ناقابل شکست بنا سکتی ہے اور صوبائی عصبیتوں اور علاقائی اختلافات کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔

وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے ـــ

یک گل اگر شگفت گلستاں نمی شود

تو مظفر آباد میں بہت سے مخلص اسلام پسندوں اور اردو کے شیدائیوں کے تعاون سے یہ خوشگوار صورت پیدا ہوئی ہے، جو سب کے سب تبریک و تحسین کے مستحق ہیں، مگر ایک خاموش، مخلص اور درد مند شخصیت "انجمن ترقی اردو مظفر آباد" کی روح رواں ہے نام ہے محمد خان تخلص نشتر ـــ!
اگر سردار عبد الرب خان نشتر آج زندہ ہوتے تو ان کی خدمت میں عرض کرتا کہ آپ کی قیادت، خلوص اور خدمات سے تو دنیا واقف ہے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو خوش حال اور کوٹھی نشین بھی بنایا ہے ـــ مگر آپ کا ہم تخلص ایک خاک نشین نشتر بھی ہے جو گمنامی اور نادار ی کی حالت میں اسلام اور اردو کی خدمت کئے جا رہا ہے اور وہ نہ کسی سے ستائش کی تمنا رکھتا ہے اور نہ صلہ کی آس پر جیتا ہے اور اپنے اللہ کے سوا اور کسی سے اجر نہیں چاہتا!

حکومت آزاد کشمیر کے اس مبارک اقدام کو جس قدر سراہا جائے کم ہے وہاں کے ارباب حل و عقد اور خاص طور سے حکومت کے صدر محترم جناب عبد الحمید خان صاحب کے لئے دل سے دعائیں نکلتی ہیں کہ ان کے اشتراک و تعاون سے "اردو زبان" کو اس کا صحیح مقام اور واجبی حق ملا ہے، یہ وہ روشن مثال ہے جس کی پاکستان میں تقلید کی جانی چاہئے۔

مظفر آباد کے چند مخلص احباب کے ساتھ بالاکوٹ بھی جانا ہوا، دریائے کنہار کی تیزی کا بھی ان آنکھوں نے دیکھی اور بچل کا شور بھی سنا، کوئی مشاق سے مشاق تیراک اس دریا کو پار نہیں کر سکتا اس دریا کی تیزی کے سامنے ہاتھی کے قدم بھی نہیں ٹک سکتے! ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور پروفیسر خورشید احمد صاحب نے پہلی بار بالاکوٹ کا سفر کیا، میں اب سے دس سال پہلے وہاں ہو آیا تھا۔ جناب ہاشمی صاحب کی معیت اور ان کی طلاقت لسانی نے اس سفر کو اور زیادہ دلچسپ بنا دیا۔

یہ پورا خطہ شہیدوں کی آرام گاہ اور مجاہدوں کی جولاں گاہ ہے۔ اگر اپنے لوگ ہی غداری نہ کرتے تو ہندوستان کی تاریخ کچھ اور ہوتی مال و دولت کا لالچ بڑی بلا ہے، لالچ نے دین و ملت کی تاریخ کو ہمیشہ خطرناک موڑ دئے ہیں! اور فتح کو شکست سے بدلا ہے۔

ع اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

تحریک یہی صورت بالاکوٹ میں پیش آئی، حضرت سید احمد شہید اور حضرت علامہ شاہ اسمٰعیل شہید رحمہم اللہ تعالیٰ ہماری تاریخ کے بہت بڑے ہیرو ہیں۔ یہ بزرگ اور ان کے ساتھی تو اللہ کو پیارے ہو گئے ـــ مگر وہ ہمارے درمیان ذوق جہاد کی بجلیاں چھوڑ گئے ہیں!
حضرت شاہ اسمٰعیل شہید کی قبر تک پہونچنے میں خاصی دشواری پیش آئی، بہتے ہوئے چشموں اور اونچی نیچی پتھریلی پگڈنڈیوں سے گزرنا

پڑا، بعض مقامات پر پتھر خاصے تیز نکیلے تھے، اُن کی قبر اسلامی سادگی کا صحیح نمونہ ہے نہ گنبد نہ کوئی مجاور، نہ سجادہ نشین نہ چادریں، نہ پھولوں کے ہار، نہ عود و صندل نہ میلہ لگتا ہے، نہ اُن کے نام کی دہائی دی جاتی ہے، قبروں کی زیارت کا جو مسنون و ماثور طریقہ ہے، اُسے ادا کیا گیا۔ پھر وہاں سے واپسی میں وہ مقامات دیکھے جو مجاہدین کے تاریخی آثار ہیں، مثلاً وہ مکان جس میں حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ نے قیام فرمایا تھا، وہ مسجد جہاں اللہ تعالیٰ کے حضور آخری نماز پڑھ کر آپ نے میدان کارزار میں جاکر اپنے خون سے حق کی شہادت دی تھی۔

بنا کردند خوش رسمے بہ خاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

بالاکوٹ کے احباب و رفقاء نے ضیافت و میزبانی میں اپنے ذوق و استطاعت کی حد تک زیادہ سے زیادہ خلوص و محبت کو صرف کیا۔ فجزاہم اللہ خیر الجزاء۔

بالاکوٹ سے واپسی ایبٹ آباد ہو کر ہوئی، گڑھی حبیب اللہ کے بعد کوہستانی مناظر قابل دید ہیں، ساگوان، چیڑ اور دیودار کے شمشاد قامت اور سرو قد اونچے درختوں کی مسلسل قطاریں، کہیں کہیں جھرنے اور چشمے بھی، کوہستانی علاقے کے چھوٹے گاؤں، جن کے مکانوں کو دور سے دیکھ کر جی میں آتا ہے کہ شہروں کے مکروہات اور ہنگاموں سے دور یہیں آکر بس جائیے! ایبٹ آباد کے ریسٹوران میں جو ایک باغ میں واقع ہے، دوپہر کا کھانا کھایا، اور پھر وہاں سے جو چلے ہیں تو حویلیاں، ہری پور ہزارہ، حسن ابدال اور واہ ہوتے ہوئے پنڈی میں آکر دم لیا،

ع جہاں سے چلے تھے وہیں آگئے!

اُردو

یہ تو تمہید تھی اس "گزارش واقعی" کی جو اب آپ کے سامنے آرہی ہے —— اس حقیقت کو کوئی شریف و معقول آدمی بہ صحت ہوش و حواس نظر انداز نہیں کرسکتا کہ غیر منقسم ہندوستان میں چاہے وہ سرسید احمد خاں کا دور ہو یا مولوی عبدالحق کا زمانہ ہو، جب بھی "اُردو" پر متعصب ہندوؤں نے وار کیا ہے، تو ہندوستان کے ہر خطے کے مسلمانوں نے یک دل و یک جان ہو کر مدافعت کی ہے اُردو سے تمام مسلمان محبت کرتے تھے، اور اس انداز پر کوئی مسلمان سوچتا ہی نہ تھا کہ اُردو کے مقابلہ میں ہمیں بنگالی، گجراتی، سندھی، پنجابی، بلوچی یا پشتو زبان کو لانا ہے، اردو کی ترقی، چلن، ہمہ گیری اور ہر دلعزیزی سے متحدہ ہندوستان کے مسلمان خاص شغف رکھتے تھے اور اُردو کی ہر ترقی کو اپنی قومی ترقی سمجھتے تھے۔ اسلام کے بعد اُردو زبان ہی اُن کی وحدت و اتحاد کا سب سے بڑا سبب سمجھی جاتی تھی۔

ہندوستان کے اکناف و اطراف سے انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے لئے علی گڑھ اور دینی تعلیم کے واسطے دیوبند، سہارنپور، دہلی، رامپور، بہاولپور، لکھنؤ اور دوسرے شہروں میں مسلمان طلباء جاتے تھے، اور وہاں کے مسلمانوں کی تہذیب کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اور جب ان درسگاہوں سے اپنے گھروں کو واپس ہوتے تھے تو وہ نمایاں طور پر محسوس کرتے تھے کہ اردو زبان کی محبت کم نہیں ہوئی اس میں اور اضافہ ہوگیا ہے۔

ہوم رول سے لیکر تحریک پاکستان تک ہر آزادی کی تحریک اور تنظیم کو "اُردو زبان" نے پروان چڑھایا ہے، ہندوستان کی آزادی اُردو زبان کی رہین منت ہے، یہ دوسری بات ہے کہ لوگ نمک حرام ہو جائیں اور اُردو کے احسان کو فراموش کردیں، اُردو کی مخالفت اور اُس کو دبانے کی مسلسل کوششوں اور تدبیروں کے باوجود اُردو زبان آج بھی ہندوستان اور پاکستان میں تمام زبانوں سے زیادہ بولی اور سمجھی جاتی ہے اور اس کے "لنگوا فرینکا" ہونے کی حیثیت آج بھی سب کے نزدیک مسلّم ہے۔

پاکستان اسی توقع، اُمید، شرط، وعدے اور منصوبہ کی بنیاد پر بنا تھا کہ یہاں اسلامی نظام قائم ہوگا اور اس مملکت کی سرکاری زبان

"اُردو" ہوگی۔ پاکستان بننے کے بعد کمیونسٹ طلبہ نے زبان کے مسئلہ پر ڈھاکہ میں جو گڑبڑ کی تھی۔ اور صوبائی عصبیت کو سب سے پہلی بار ہوا دی تھی، تو قائداعظم مرحوم بروقت کراچی سے پرواز کر کے مشرقی پاکستان پہونچے اور انہوں نے دو ٹوک الفاظ میں اعلان فرمایا کہ پاکستان کی سرکاری زبان اُردو اور صرف اُردو ہوگی . . . . . !

مگر بنگال کے ہندوؤں اور کمیونسٹوں کے گٹھ جوڑ نے اُردو کی مخالفت میں صوبائی عصبیت کو اس قدر منظم طور پر اُبھارا کہ یہ عصبیت وبا اور متعدی مرض کی طرح پھیلتی چلی گئی، اس غلط مد کو حکومت روک سکتی تھی، مگر نہیں روکا گیا، اس بے تدبیری کا یہ نتیجہ نکلا کہ پاکستان کی دو زبانیں قرار دی گئیں، پاکستان کی وحدت اور سالمیت پر یہ پہلی ضرب تھی جس کے اثرات بڑھتے اور پھیلتے ہی گئے، یہاں تک کہ مشرقی پاکستان کی "علیحدگی" کے بارے میں کچھ لوگ سوچنے لگے۔

دستوری طور پر اس فیصلہ کے بعد مشرقی پاکستان میں تو بنگلہ زبان کا دفتروں، سرکاری اداروں اور درسگاہوں میں چلن شروع ہو گیا مگر مغربی پاکستان میں اُردو کو نافذ نہیں کیا گیا۔ مشرقی پاکستان میں وہاں کی حکومت کا اُردو کے ساتھ یہ سلوک ہے کہ جن علاقوں میں اُردو بولنے والوں کی اکثریت آباد ہے وہاں اردو اسکول کھولنے کی اجازت تک نہیں دی جاتی ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے "اُردو" کو دیس نکالا دیا جا رہا ہے، اخبارات میں اس "مخالف اردو" پالیسی پر احتجاجی مراسلے آرہے ہیں مگر کوئی شنوائی نہیں ہوتی ـــــ یہ "لے" اسی طرح بڑھتی گئی، تو پاکستان کی وحدت و سالمیت پر جو عالم بھی گزر جائے کم ہے۔

مغربی پاکستان میں اُردو کو نافذ کرنے کی بجائے اس کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلائی جا رہی ہیں اور عجیب و غریب شوشے چھوڑے جا رہے ہیں ـــ ان آنکھوں نے اس قسم کی تحریریں بھی اخباروں میں پڑھی ہیں کہ اُردو بولنے والے پاکستان کی دوسری زبانوں سے قریب نہیں ہوتے، اس معاملہ میں وہ بڑے تنگ نظر واقع ہوئے ہیں . . . . . ! . . . . ؟!

کیا علمی اور لسانی دنیا میں آج تک اس انداز پر کسی نے سوچا ہے اور یہ حادثہ ظہور میں آیا ہے کہ مختلف زبان والے آپس میں یہ سمجھوتہ کرلیں کہ تم ہماری زبانوں کے الفاظ قبول کرلو، ہم تمہاری زبان کے الفاظ قبول کئے لیتے ہیں، کیا ایسا ہونا ممکن ہے؟ پھر یہ تدبیر خدانخواستہ عملی صورت اختیار بھی کرلے تو اس سے سب سے زیادہ نقصان اردو کو پہونچے گا۔ اور ان بولیوں کا کچھ نہیں بگڑے گا جو "مکتوبی زبانیں" بھی نہیں ہیں صرف "بولیاں" ہیں۔

اگر اُردو بولنے والے بنگلہ یا پاکستان کی کوئی اور زبان نہیں سیکھتے تو اس میں غریب اُردو کا کیا قصور ہے؟ اُردو کے نفاذ و رواج کے لئے تقسیم ہند سے قبل دوسری زبانیں بولنے والے مسلمانوں نے یہ شرط کب لگائی تھی اور اس طرح پر کہاں سوچا تھا کہ اُردو بولنے والے جب تک ہماری زبانیں نہیں سیکھیں گے ہم اس وقت تک اُردو کی تحریک اور مطالبہ کا ساتھ نہیں دیں گے ـــ یہ چٹکلے تو اب تراشے جا رہے ہیں اور لوگوں کو ایسی باتیں جان کر سجھائی جا رہی ہیں!

یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ بعض لوگ "اُردو" کے بارے میں پاکستان میں وہ باتیں کہہ رہے ہیں جو بھارت میں جن سنگھی اور مہاسبھائی کہا کرتے ہیں ـــــ یہ کہ اُردو پاکستان کے کسی خطہ کی زبان کب ہے! ـــــــــــــــــــــــــــــــــــــ

ـــــ حیرت ہے کہ جن سنگھی ذہنیت پاکستان میں آخر کس راہ سے داخل ہو گئی؟

کراچی کے اخبارات میں ایسے مراسلے نظر سے گزرے ہیں کہ سندھ کی بعض عدالتوں اور دفتروں میں اُردو زبان میں لکھی ہوئی درخواستیں اور عرضیاں قبول نہیں کی جاتیں، اگر یہ اطلاع غلط تھی تو اس کی تردید آنی چاہئے تھی اور درست تھی تو اس صوبائی عصبیت اور دفتری نظم و نسق کی خرابی اور ناانصافی کا ازالہ اور سد باب ہونا تھا۔

پاکستان کی زبانیں تو اپنے دیس کی زبانیں ہیں، ہم تو سنسکرت، ہندی اور عبرانی سے بھی نفرت و بیزاری کو علم کی توہین سمجھتے ہیں

پاکستان کی تمام زبانیں پھولیں پھلیں اور ترقی پائیں، اس سے ہمیں کوئی ملال نہ ہوگا، کھٹک اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کسی زبان کو اُردو کے مقابلہ میں حریف کی حیثیت سے لایا جاتا ہے، وہ چاہے کوئی مشاعرہ ہو یا ادبی مذاکرہ، یا کسی شاعر کا تعارف ہو، ان چیزوں کو "اُردو" کے مقابلہ میں لانا اور اُردو کی برتری اور بین الاقوامی حیثیت کو مجروح کرنے اور اس کی اہمیت کو گھٹانے کے لئے ایسی باتیں کرنا بڑی نادانی کی باتیں ہیں ——— جو غیر علمی بھی ہیں! جو کوئی اُردو زبان سے کد رکھتا ہے وہ پاکستان کی وحدت و سالمیت کا خیر خواہ نہیں ہے۔

تقسیم ہند سے قبل ہندوستان کے متعدد شہروں اور تعلیمی درسگاہوں میں "بزم اقبال" قائم تھیں اور جگہ جگہ "یوم اقبال" منایا جاتا تھا، وحدت و اتحاد کے اُس دور میں بنگال کے مسلمانوں نے اس انداز پر سوچا تک نہیں کہ قاضی نذر الاسلام کے لئے یہ سب کچھ کیوں نہیں ہو رہا ہے اور علامہ اقبال اور نذر الاسلام کی شہرت و عقیدت کی سطح ایک جیسی ہونی چاہئے!

——— مگر ———

اب ڈاک کے ٹکٹوں سے لے کر "اکیڈیمیوں" کے قیام تک بنگلہ شاعر اور اُردو شاعر کے فرق و امتیاز کے تحت جو کوششیں ہو رہی ہیں، وہ قومی وحدت و اتحاد کے نقطۂ نگاہ سے مستحق پذیرائی نہیں ہیں اپنوں اور دوستوں کی دلدہی اور ناز برداری کے بھی کچھ اصول اور حدود ہیں ہر مطالبہ، تحریک اور منصوبہ کے محرک جذبہ کا پتہ لگانے کے بعد، اُس کے نفع و ضرر کا فیصلہ کرنا چاہئے، اگر کوئی باپ اپنے حقیقی بیٹوں میں کسی ایک بیٹے کی دلدہی میں حدود سے گزر جاتا ہے تو گھر کا نظام غیر متوازن ہو جائے گا!

مشرقی پاکستان کے مسلمان ہمارے دینی بھائی ہیں، ہم بنگال، سرحد، پنجاب، سندھ، یو۔پی، بہار، اور حیدر آباد کی جغرافیائی حدود کو ذہن میں رکھ کر کسی شخصیت، زبان و ادب یا دوسرے مسائل کے بارے میں نہیں سوچتے، ہمارا تو یہ نقطۂ نگاہ ہے کہ ہم سب مسلمان ہیں اور پاکستانی ہیں، ہمیں مشرقی پاکستان کی خاک بھی مغربی پاکستان کی سرزمین کی طرح پیاری ہے، اور مشرقی پاکستان کے ایک ملاح کی ہمارے دل میں مغربی پاکستان کے کسان سے کم عزت نہیں ہے! تحریک پاکستان کے زمانے میں جس طرح متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں میں اخوت، وحدت اور محبت پائی جاتی تھی، علاقائی اور صوبائی نقطۂ نگاہ سے وہ سوچتے ہی نہ تھے، مثلاً مسلم لیگ کا مرکز دہلی میں تھا، بنگال کے مسلمانوں نے اُس دور میں اس کا مطالبہ نہیں کیا اور یہ بات اُن کے ذہن میں نہیں آئی کہ مسلم لیگ کے مرکز کا ایک نمائندہ دفتر بنگال میں ہونا چاہئے ——— ہم خاک نشینوں کی یہی مخلصانہ گزارش ہے کہ پاکستان میں وحدت و اتحاد کی فضا پیدا ہونی چاہئے، پوری ملت ایک دیوار کی مانند ہو جائے جس کی ایک اینٹ دوسری اینٹ کو تھامے ہوئے ہوتی ہے! جو کوئی علاقائی اور صوبائی امتیاز کی بناء پر کسی پاکستانی سے نفرت کرتا ہے اور اپنے سے کمتر سمجھتا ہے وہ اسلام، ملت اور پاکستان کا بہی خواہ نہیں ہے، اسلام میں انسان کی عزت و تکریم کا معیار صرف "تقویٰ" ہے، نسل، رنگ، زبان اور وطنیت کے امتیازات کو اسلام نے اہمیت نہیں دی۔

پاکستان کی وحدت و سالمیت اسلام اور اُردو سے وابستہ ہیں، اسلام اور اُردو سے جس پاکستانی مسلمان کے دل میں کد، کھٹک اور بیگانگی پائی جاتی ہے، سمجھ لینا چاہئے کہ اُس دل میں پاکستان کی مخالفت کی بناء پڑ چکی ہے ——— وہ عوام ہوں یا خواص، حاکم ہوں یا محکوم جو اپنے ذاتی مفاد کے مقابلہ میں پاکستان کی وحدت و سالمیت کو عزیز رکھتے ہیں، اُن کا فرض ہے کہ اسلام اور اُردو کے لئے فضا سازگار بنائیں یہاں تک کہ پاکستان میں محبت، اتحاد، ملنساری، مروت، ہمدردی اور دینی اخوت عام ہو جائے!

ماہر القادری

۲۴ جنوری [illegible]ء

حبیب احمد صدیقی

کیا مولانا آزاد کی اردو ٹکسالی ہے؟

مندرجہ بالا عنوان سے میرا ایک مضمون "نیا دور" کے اکتوبر ۱۹۹۲ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کو ہندوستان اور پاکستان کے کئی رسالوں نے نقل کیا اور کچھ ارباب فکر و نظر نے مجھے تحسینی خطوط لکھے، استاذ محترم جناب پروفیسر رشید احمد صدیقی کے دو جملے نقل کرتا ہوں۔

".. مولانا آزاد کی زبان پر آپ کا مضمون لاجواب تھا۔ یہ بات اخلاقاً نہیں کہہ رہا ہوں، بلکہ یہاں کے دانشوروں نے اس پر اتفاق کیا اور اس گرفت کی تصدیق کی"

کچھ حضرات نے اس خیال کا اظہار کیا کہ شاید مولانا آزاد کی مایۂ ناز تصنیف "غبار خاطر" میں اس قسم کی غلطیاں نہ ملیں اور مجھ سے مطالبہ کیا کہ اگر "غبار خاطر" میں بھی زبان کی غلطیاں ہوں تو ان کی بھی نشاندہی کی جائے۔ "غبار خاطر" پہلی بار ۱۹۴۶ء میں چھپی تھی اور میں نے اسے چھپنے کے تھوڑے دن بعد ہی پڑھا تھا۔ بیس سال گزر جانے کے باوجود مجھے اتنا یاد تھا کہ جہاں اسلوب نگارش کی دلآویزی نے دامن دل کھینچا تھا وہیں کچھ غیر مانوس الفاظ اور محاوروں کو پڑھ کر حیرت بھی ہوئی تھی اب جو یہ سوال اٹھا کہ آیا "غبار خاطر" زبان کی غلطیوں سے پاک ہے یا نہیں تو میں نے پھر اس کتاب کی ورق گردانی کی اس بار میرے پیش نظر "غبار خاطر" کی طبع ثالث تھی جسے مکتبہ احباب نے آزاد پبلی کیشنز لمیٹڈ ۸ میکلوڈ روڈ لاہور سے شائع کیا تھا۔ جیسا میرا خیال تھا اس میں کافی غلطیاں تھیں تو تعجب ہوتا، کیونکہ "ترجمان القرآن" اور "غبار خاطر" جب ایک ہی شخص کی لکھی ہوئی ہیں تو ان کی زبان بھی ملتی جلتی ہی ہوگی۔

چند دن ہوئے کہ جناب مالک رام کی مرتب کی ہوئی یہ کتاب دستیاب ہوئی، جناب مالک رام نے جو حواشی شامل کئے ہیں وہ ایک سو چھ صفحوں پر مشتمل ہیں اور نہایت ہی مفید اور دلچسپ ہیں انہوں نے چھ سو سے زیادہ اشعار کی نشاندہی کرکے شعراء کے نام بتائے ہیں، جہاں جہاں لفظی تفاوت پایا گیا (اور یہ اشعار کی ایک بڑی تعداد میں پایا جاتا ہے) اُسے حواشی میں عیاں کر دیا۔ اس لفظی تفاوت و تغیر میں مولانا کے بدلے ہوئے الفاظ عموماً اتنے موزوں نہیں معلوم ہوتے جتنے کہ وہ تھے، جنہیں بدلا گیا، مثلاً عرفی کے اس شعر میں جو مولانا نے کئی مقام پر درج کیا ہے۔

ہم سمندر باش و ہم ماہی کہ در جیحون عشق
روئے دریا سلسبیل و قعر دریا آتش است

مولانا نے "جیحون" کو "اقلیم" سے بدل دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جہاں "روئے دریا" اور "قعر دریا" کا ذکر ہو وہاں "جیحون" ہی مناسب ہوگا

اسی طرح بیدل کے شعر۔

اگر دماغم درین خمستان خمار شرم عدم نگیرد
ز عشرت نکہت فنا جام گیرم بآن شکوہے کہ جم نگیرد

مولانا نے "خمستان" کو "شبستان" سے بدل دیا ہے مگر یہاں محل "خمستان" ہی کا ہے۔

حافظ شیرازی کا شعر ہے۔

جوہرِ جامِ جم از کانِ جہان دگر ست　　　تو تمنا ز گلِ کوزہ گراں میداری

مولانا نے دونوں مصرعوں میں تصرف کرکے اس شعر کو یوں درج کیا۔

جوہرِ طینتِ آدم ز خمیر دگر ست　　　تو توقع ز گلِ کوزہ گراں میداری

حافظ کے شعر کی لطافت باقی نہیں رہی۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ کیا واقعی کوئی کوزہ گروں سے توقع رکھ سکتا ہے کہ وہ آدمی کے ڈھانچے بنا بنا کے دیں گے۔ جام کے متعلق تو یہ توقع رکھی جاسکتی ہے۔ مولانا کے مصرعہ سے شعر مبہم ہو جاتا ہے۔

کم وبیش یہی حال دوسرے تصرفات کا بھی ہے۔ کسی بڑے شاعر کے کسی لفظ کو یا ترتیب الفاظ کو بدل دینے سے شعر ہمیشہ پست ہو جائے گا کیونکہ جو الفاظ ایک بڑا شاعر منتخب کرتا ہے وہ موزوں ترین ہوتے ہیں اور جس طرح انہیں بٹھاتا ہے وہی بہترین نشستِ الفاظ ہوتی ہے۔

مولانا نے کہیں کہیں ایک شاعر کے شعر کو کسی دوسرے شاعر سے منسوب کر دیا تھا۔ جناب مالک رام کی سعی بلیغ صحیح شاعروں کو تلاش کرنے پر کامیاب ہوئی۔ حکیم محمد سمیع ذرہ لکھنوی کی مشہور رباعی ہے۔

گرما بگزشت واین دلِ زار ہماں　　　سرما بگزشت و این دلِ زار ہماں

القصہ ہزار گرم و سرد عالم　　　بر ما بگزشت واین دلِ زار ہماں

اس کے پہلے، دوسرے اور تیسرے مصرعوں میں مولانا نے تصرف کیا ہے اور اسے سرمد کی رباعی کہا ہے اس رباعی کی شہرت کی خاص وجہ یہ ہے کہ پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعوں میں صرف ایک لفظ بدلا ہے اور باقی الفاظ میں سر مو فرق نہیں بیدل کی رباعی ہے۔

زاہد بہ نماز و روزہ ضبطے دارد　　　صوفی بہ شبانہ ربطے دارد

بیدل ہمہ را بجائے خود می بینم　　　ہر کس بخیالِ خویش خبطے دارد

مولانا نے اس کے پہلے شعر میں تصرف کرکے سرمد سے اسے منسوب کر دیا۔

زاہد بہ نماز و روزہ ضبطے دارد　　　سرمد بہ مے و پیالہ ربطے دارد

اور دوسرا شعر جس میں بیدل کا تخلص موجود تھا درج نہیں کیا۔

نواب محمد یار خاں امیر کا شعر ہے۔

شکست و فتح یہاں اتفاق ہے لیکن　　　مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

مولانا آزاد نے اس شعر میں میر کا تخلص درج کرکے اسے یوں لکھا ہے۔

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میر　　　مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

جناب مالک رام نے استاد کے حوالے دینے اور ان کی تصحیح کرنے کے علاوہ ایک اور مفید کام کیا ہے۔ مولانا کے خطوط میں تاریخِ عالم کے سینکڑوں نام آئے تھے جناب مالک رام نے ان سب پر حواشی لکھے ہیں حواشی میں اور مفید معلومات بھی ملتی ہیں مثلاً کلام پاک کی آیتوں کے حوالے یا تاریخی واقعات کا مختصر بیان۔ مختصر یہ کہ اس کتاب کو مرتب کرنے میں جو کام جناب مالک رام نے کیا وہ بہت صبر آزما تھا۔ ان کی عرق ریزی لائق صد تحسین ہے۔ یوں بھی "غبارِ خاطر" دامنِ دل کھینچنے والی کتاب تھی۔ اس کی دلکشی میں جناب مالک رام کے حواشی نے دوچند اضافہ کر دیا چنانچہ اب جو میرے ہاتھ میں یہ کتاب آئی تو شروع سے ختم تک پڑھے بغیر دل نہ مانا۔

مولانا آزاد کے بیان زبان کی غلطیوں کا معمہ جناب مالک رام کے اس بیان سے بڑی حد تک حل ہو جاتا ہے۔

"مولانا آزاد مکہ (حجاز) میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ ایک عرب خاندان کی چشم و چراغ تھیں۔ ظاہر ہے کہ گھر میں بات چیت عربی میں ہوتی ہوگی۔ جو گویا ان کی مادری زبان تھی۔ جب تک خاندان حجاز میں مقیم رہا وہاں اردو کی باقاعدہ تعلیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ البتہ گھر میں والد سے گفتگو اردو میں ہوتی تھی۔ اور جو ہندوستانی استاد ان کے پڑھانے کو مقرر کئے گئے تھے ان سے بھی۔ لیکن قدرتی طور پر ابتدا میں ان کے اردو سیکھنے کا کوئی اطمینان بخش انتظام نہ ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ان کے والد خاندان سمیت آخری مرتبہ ۱۸۹۸ء میں حجاز سے ہندوستان آئے تو اس وقت تک مولانا آزاد کو جن کی عمر کم و بیش دس سال کی تھی۔ اردو سے بہت کم واقفیت تھی۔ جو وہاں اردو کے غلط الفاظ اور غلط محاورے جو مکہ میں عرب بولتے ہیں ان کی زبان پر بھی رائج تھے، جنہیں انہوں نے بتدریج کوشش کر کے دور کیا۔ چونکہ حجاز سے واپسی پر ہندوستان میں بھی خاندان کا قیام کلکتہ میں ہوا جو اردو کا علاقہ نہیں اور اردو مرکز سے بہت دور ہے اس پر تعلیم بھی سراسر عربی اور فارسی کی رہی اس لئے اس دوران میں بھی اردو میں ترقی کرنے کے امکانات کم تھے۔ اس کے بعد اگرچہ مشق و مزاولت اور محنت سے انہیں زبان پر پوری قدرت حاصل ہو گئی لیکن ان کے تلفظ میں کہیں کہیں غرابت اور قدامت کے اثرات آخر تک قائم رہے":

جس کی مادری زبان اردو نہ ہو اور جس نے کلکتہ میں رہ کر اردو سیکھی ہو اس کے یہاں زبان کی غلطیاں ملنا کوئی تعجب کی بات نہیں مجھے جو یہاں "غبار خاطر" میں ملی ہیں ان کی نشاندہی جناب مالک رام کے مرتبہ نسخے کو سامنے رکھ کر کرتا ہوں، یہ کتاب ساہتیہ اکادمی نئی دہلی نے شائع کی ہے

ص ۸۔ " اور قلعہ احمد نگر کی تمام معمولات بھی بغیر کسی تغیر کے جاری رہیں"

'معمولات' مونث نہیں ہے مذکر ہے۔

• " قرار و سکون کی یہ جو کچھ نمائش تھی جسم و صورت کی تھی، قلب و باطن کی نہ تھی۔ جسم کو میں نے بلنے سے بچا لیا تھا"

کہنا یہ مقصود ہے کہ بیگم کے انتقال سے جو ناقابل برداشت صدمہ ہوا تھا اس کا اثر جسم و صورت پر نمایاں نہ ہونے دیا اس کو یوں کہنا کہ جسم بلنے بلنے سے بچا لیا تھا، عجیب سی اردو ہے۔

ص ۱۷۔ " مجھے یہ حال معلوم تھا مگر اپنے توبۂ اضطراب پر کبھی پشیمان نہیں ہوا"

" توبہ" مذکر نہیں ہے مونث ہے، جناب مالک رام نے یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ سب اشاعتوں میں "اپنے" چھپا ہوا تھا متن میں "اپنی" لکھ دیا وہ مصنف کے بجائے کاتب کی غلطی سمجھتے ہیں۔ حاشیہ پڑھنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مولانا نے طبع اول کے بعد متعدد جگہ تغیر و تبدل کئی جگہ کیا تھا۔ اگر یہ ان کی غلطی ہوتی تو اسے بھی یقیناً درست کر دیتے۔

ص ۱۷۔ " نہ محرومی پر ماتم ہوا تھا نہ حصول پر نشاط ہوا"

' نشاط' مونث ہے۔ مولانا نے نشاط ہوا لکھا ہے۔

ص ۲۷-۲۸۔ " راہ میں کوئی موڑ نہیں ملی۔ میں سوچنے لگا کہ مقاصد کے سفر کا بھی ایسا ہی حال ہے جب قدم اٹھایا تو پھر کوئی موڑ نہیں ملتی"

مولانا کی اس عبارت میں دو جگہ "موڑ" آیا ہے مگر دونوں جگہ مونث ہی ہے۔ حالانکہ موڑ مذکر ہے۔ جناب مالک رام نے اس عبارت کو اپنے مقدمہ میں نقل کیا ہے مگر "ملی" اور "ملتی" کو حذف کر دیا ہے۔ البتہ حاشیے میں اسے سہو قلم کہا ہے۔

قدم اٹھا دیا۔ اور قدم اٹھایا کے معنوں میں بہت فرق ہے۔ قدم اٹھا دینے کے معنی ہیں بھگانا۔ شکست دینا۔ جو یہاں مقصود نہیں مولانا نے

اسے قدم اٹھایا کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔

ص۳۵ ۔ "آباد گھر چھوڑا اور ایک ویرانہ میں جا بیٹھ رہا"

جا بیٹھ رہا صحیح نہیں۔ جا بیٹھا ہونا چاہئے۔

ص۲۶ "وہی سانچہ کام دے رہا ہے اور اب اس قدر پختہ ہو گیا ہے کہ ٹوٹ جا سکتا ہے مگر لچک نہیں کھا سکتا۔

ٹوٹ جا سکتا ہے کے بجائے ٹوٹ سکتا ہے ہونا چاہئے۔

ص۲۷ "ہم ان ہی باتوں پر قناعت نہیں کرنے سکتے"

کرنے سکتے صحیح نہیں۔ کر سکتے ہونا چاہئے۔

ص۳۳ "اور انہوں نے حیرانگی کو شک تک اور شک کو انکار تک پہنچا دیا"

حیرانگی غلط ہے۔ صحیح حیرانی ہے۔

ص۳۹ "بالآخر حیرانگیوں اور سرگشتگیوں کے جھپٹ سے مرحلے طے کرنے کے بعد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

حیرانگیوں غلط ہے۔

ص۱ "کیونکہ یہاں خود زندگی کے تقاضے ہوتے جن کا ہمیں جواب دینا ہے اور خود زندگی کے مقاصد ہوتے جن کے پیچھے والہانہ دوڑنا ہے"

مولانا کے یہاں ہوتے ہوتی، ہوتیں اور ہوا کا ایسا استعمال اکثر مقامات پر ہے ایسی اور چند مثالیں میں درج کئے دیتا ہوں۔

ص۷ "سب سے بڑا کام زندگی ہوتی یعنی زندگی کو ہنسی خوشی کاٹ دینا"

ص۹ "فطرت کی یکسانیوں اور ہم آہنگیوں کی طرح اس کی گاہ گاہ ناہمواریاں بھی ہوتیں"

ص۱۵ "مرد و عورت نسل کا رشتہ چولی دامن کا رشتہ ہوا ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کر سکتے"

تقاضے ہیں۔ مقاصد ہیں۔ زندگی ہے۔ ناہمواریاں ہیں۔ رشتہ ہے پڑھ کر دیکھئے عبارتیں صحیح ہو جائیں گی۔

ص۱۷ "طبیعت وقت کی کشاکش سے یک قلم فارغ اور دل فکر اپنی تاویل سے بکلی آسودہ ہے"

آسودہ کے معنی میں راحت پانے والا۔ آرام پانے والا۔ مطمئن بے فکر۔

مولانا کا مطلب ہے کہ انہیں فکر اپنی تاویل مطلقاً نہیں مگر الفاظ سے مطلب یہ نکلتا ہے کہ فکر اپنی تاویل دل کی آسودگی کا باعث ہے۔

میرے خیال میں یہاں آسودہ محل نظر ہے۔

ص۲۱ "ان کا معمول تھا کہ رات کی پچھلی پہر ہمیشہ بیداری میں بسر کرتے"

پہر مذکر ہے۔ البتہ جب دو یا سہ کے ساتھ مرکب ہو کر آتا ہے تو وہ مرکب لفظ مونث استعمال ہوتا ہے۔

جو معذ ہے وہ طول میں گویا ہے روز حشر	برسوں سے دوپہر نہیں ڈھلتی ہے ہجر میں	ناسخ
ایک ایک گھڑی روز قیامت سے بڑی ہے	کس طرح کٹیں چار پہر ہجر کی شب کے	امیر

بہ جناب مالک رام نے رات کی پچھلی پہر میں کی کی ذمہ داری کاتب پر ڈالی ہے۔ تو پہر پچھلی لکھنے کا ذمہ دار بھی اسے ہی ٹھہرایا جائے۔ اور صفحہ ۵۰ صفحہ ۸۵ اور صفحہ ۲۹۱ پر جو پچھلی پہر موجود ہے اسے بھی کاتب ہی کی کارگزاری کہا جائے۔ میرے خیال میں کاتب سے مستقل مزاجی کی اس حد تک توقع کرنا نا انصافی ہوگی۔

ص۵۰ "وہ بھی شاہ عبدالعزیز سے علی الصباح سبق لیا کرتے تھے اور پچھلے پہر سے اٹھ کر اس کی تیاری میں لگ جاتے تھے"
پچھلا پہر ہونا چاہئے۔

ص۶۳ "اس سے ہم چینی فلسفۂ حیات کا زاویہ نگاہ معلوم کر سکتے ہیں"
معلوم کر سکتے ہیں کے بجائے معلوم کر سکتے ہیں ہونا چاہئے۔

ص۶۷ "آج ہم اپنی خوش طبعی کے چند لطیفوں سے انہیں حل نہیں کر دے سکتے"
حل نہیں کر دے سکتے کے بجائے حل نہیں کر سکتے ہونا چاہئے

ص۷۵ "پھولوں کی صف میں پھولوں کی طرح کھل کر اپنی جگہ نکال لے سکتی ہو"
جگہ نکال لے سکتی ہو کے بجائے جگہ نکال سکتی ہو ہونا چاہئے۔

ص۸۴ "ایک مطمئن زندگی بسر کر دی جا سکتی ہے"
بسر کر دی جا سکتی ہے کے بجائے بسر کی جا سکتی ہے ہونا چاہئے۔

ص۸۶ "ایک دروازے کے بند ہونے پر اتنے دروازے کھل جا سکتے ہیں۔"
کھل جا سکتے ہیں کے بجائے کھل سکتے ہیں ہونا چاہئے

ص۹۳ "یہ موثرات اکثر صورتوں میں آشکارا ہوتے ہیں اور سطح پر سے دیکھ لئے جا سکتے ہیں"
دیکھ لئے جا سکتے ہیں کے بجائے دیکھے جا سکتے ہیں ہونا چاہئے۔

ص۹۶ "بلاشبہ اس کے بعد قدم کھلے اور ہندوستان کے باہر تک پہونچے"
قدم کھلنا کوئی محاورہ نہیں۔

ص۹۷ "کتابوں کے درس میں منحصر رہ گئی ہے"
منحصر کے ساتھ پر یا پہ آتا ہے۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید ناامیدی اُس کی دیکھا چاہئے غالب

ص۹۹ "والد مرحوم کی ایما سے چند مزید کتابیں بھی نکال لی تھیں۔"
ایما لکھنؤ اور دہلی دونوں جگہ مذکر بولا جاتا ہے۔

کچھ بھی ایسا جو آپ کا پائیں سینکڑوں روز نسبتیں آئیں قلق
واں چلے یہاں گردن پہ پھیری ہم نے تیغ بات کا ایما بھی پانا کوئی ہم سے سیکھ جائے ذوق

ص۹۹ "ابھی پندرہ برس سے زیادہ عمر نہیں ہوئی تھی کہ طبیعت کا سکون ہلنا شروع ہو گیا تھا"
طبیعت کا سکون ہلنا اہل زبان کے لئے بار خاطر ہوگا۔

ص۱۰۰ "اُسے کوئی طاقت اس طرح جکڑ بند نہیں کر دے سکتی"
جکڑ بند نہیں کر دے سکتی کے بجائے جکڑ بند نہیں کر سکتی ہونا چاہئے۔

ص۱۰۱ "تاہم وہ قدم اُٹھا دیتے ہیں کیونکہ قدم اُٹھائے بغیر نہیں رہ سکتے"
قدم اُٹھا دینے کے بارے میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔

ص۱۰۶ "پھر اُسے اچھی طرح ہلا دیا کہ روشنائی کی دھوون پوری طرح نکل آئے"

دھوون مونث نہیں بلکہ مذکر ہے۔

عمرِ خضر سے اس کی زیادہ ہے زندگی — دھوون پیے جو یار کی زلفِ دراز کا — آتش

ص۱۰۷ " اور دیکھیں اس تقاضا کا جواب ملتا ہے یا نہیں "

تقاضا کا کے بجائے تقاضے کا ہونا چاہئے۔

ص۱۱۲ " معاً اس کی ہر کج پیچ نکل جاتی ہے اور ساری چولیں اپنی اپنی جگہ ٹھیک آ کر بیٹھ جاتی ہیں"

کج پیچ صحیح ترکیب نہیں ہے کیونکہ یہاں کہنا یہ مقصود ہے کہ ہر کجی یا پیچ نکل جاتا ہے اگر کج پیچ کو صحیح مانیں تو اُس کے معنی ہونگے ٹیڑھے پیچ۔

ص۱۱۳ "اگر جسم میں روح بولتی ہے اور لفظ میں معنی اُبھرتا ہے تو ......"

اگر کوئی کہے کہ "اس لفظ کا معنی کیا ہے" یا "اس چیز کا دام کیا ہے" تو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ وہ اہلِ زبان نہیں۔

معنی اُبھرتا ہے کے بجائے معنی اُبھرتے ہیں ہونا چاہئے۔

ص۱۱۴ "ہم حقیقت تولنے کے لئے اپنے محسوسات ہی کا ترازو ہاتھ میں لئے ہوتے ہیں"

"کا ترازو" کے بجائے "کی ترازو" ہونا چاہئے۔ ترازو مونث ہے۔

نکلتے ہیں برابر اشک میری دونوں آنکھوں سے — متاعِ درد تلنے کی ترازو ہو تو ایسی ہو — نسیم

ص۱۲۳ "لیکن پھر بھی آپ ہر دم جھانک لگائے تاک رہا ہو"

" بلاشبہ تیرا پروردگار تجھے ہر دم جھانک لگائے تاک رہا ہے"

جھانک لگائے تاکنا اردو کا محاورہ نہیں۔ نہ محض جھانک لگانا کوئی محاورہ ہے۔ سورہ فجر کی جس آیت کا ترجمہ مولانا آزاد نے کیا ہے، کہ "بلاشبہ تیرا پروردگار تجھے ہر دم جھانک لگائے تاک رہا ہے" اُس کا ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود حسن نے کیا ہے کہ "بے شک تیرا رب لگا ہے گھات میں"

ص۱۲۵ "آپ سے کارخانہ قدرت کی لاانتہائیوں کے مقابلہ میں اپنی درماندگیوں کا قدم قدم پر اعتراف کرنا پڑتا ہے"

لاانتہائیوں کی ترکیب محلِ نظر ہے۔

ص۱۲۶ "جو حاصلات ([illegible]) یہاں کام کر رہی ہیں ہم ان کی توضیح ......"

حاصل اور حاصلات دونوں مذکر ہیں اس لئے کام کر رہے ہیں ہونا چاہئے۔

ص۱۲۷ "ارتقائی تقاضا کا فوقی ظہور ( ) جس طرح اُبھرتا رہتا ہے ..."

تقاضا کا کے بجائے تقاضے کا ہونا چاہئے۔

ص۱۲۸ " جو حقیقت کی کسی آخری منزل تک ہمیں پہنچا دے سکتا ہو"

پہنچا دے سکتا ہو کے بجائے پہنچا سکتا ہو ہونا چاہئے۔

ص۱۲۹ " اٹھارویں اور انیسویں صدی نے جو عقائد پیدا کئے تھے وہ اس صدی کے شروع ہوتے ہی ہلنا شروع ہوگئے"

عقائد ہلنا شروع ہوگئے عجیب سی اردو ہے۔ اسے سندِ قبول ملنا مشکل ہے۔

ص ۱۳۷ "تصوف کی متداول مصنفات تقریباً اسی صدی اور اس کے بعد کی صدی میں مدون ہوئی"

مصنفات مذکر ہے کی کے بجائے کے اور ہوئی کے بجائے ہوئے ہونا چاہئے۔

ص ۱۳۸ "ملا معین واعظ کاشفی وغیرہ کی مصنفات ایسے قصوں سے بھری ہوئی ہیں"

مصنفات مذکر ہے۔

ص ۱۴۰ "جو بعد کی مصنفات میں طرح طرح کے ناموں سے ملتی ہیں"

مصنفات مذکر ہے۔

ص ۱۴۱ "وہ جب چاہے ان کی زندگیوں کا خاتمہ کرا (دے) سکتا ہے"

جناب مالک رام نے کرا دے سکتا ہے میں سے دے نکال دیا۔ طبع ثالث کے صفحہ ۸۷ پر جہاں یہ عبارت درج ہے۔ خاتمہ کرا دے سکتا ہے لکھا ہے۔ اوپر دی ہوئی مثالوں سے یہ خوب واضح ہے ایسے موقع پر مولانا خاتمہ کرا دے سکتا ہے۔ ہی لکھتے

ص ۱۵۹ "ہندوستان اور سیلون کی سیاہ پتی ان کے ذوق چائے نوشی کا منتہائے کمال ہوا"

سیاہ پتی کے لئے ہوا کے بجائے ہوئی ہونا چاہئے۔ یعنی سیاہ پتی ان کے ذوق چائے نوشی کا منتہائے کمال ہوئی

ص ۱۶۰-۱۶۲ "اس میں ٹھنڈے دودھ کا ایک چمچہ ڈال کر کافی مقدار میں گندگی پیدا کر دی جا سکتی ہے"

پیدا کر دی جا سکتی ہے کے بجائے پیدا کی جا سکتی ہے ہونا چاہئے۔

ص ۱۶۰ "اس ملک میں بارہ مہینے ہوائے معتدل کا لطف اٹھایا جا سکتا ہے۔ خیر بارہ مہینہ کہنا تو صریح مبالغہ تھا"

بارہ مہینہ کے بجائے بارہ مہینے ہونا چاہئے۔

ص ۱۷۶ "جیسے دیکھو سردی کی بے جا ستائیوں کا شاکی ہے"

ستائی کو کسی اسم کے ساتھ مرکب کر کے استعمال کرتے ہیں جیسے دل ستائی۔ جاں ستائی، رشوت ستائی۔ لیکن خوش ستائی، ناخوش ستائی بے جا ستائی بے جا ستائی کہنا صحیح نہیں ہوگا۔ میری رائے میں بے جا ستائیوں صحیح نہیں۔

ص ۱۷۹ "غیر نمایاں طور پر تو ہر طرح کی مصنفات میں مصنف کی انانیت ابھر سکتی ہے"

مصنفات مذکر ہے اس لئے ہر طرح کے مصنفات ہونا چاہئے۔

ص ۱۸۰ "اس کی فکری انفرادیت کا ایک قدرتی سرجوش ہے جسے وہ دبا نہیں سکتا"

مولانا نے سرجوش انتہائی جوش یا ولولے کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ لغت میں سرجوش کو صفت لکھا ہے۔ اور اس کے معنی منتخب۔ عمدہ کے بتائے ہیں۔ مثال میں یہ شعر پیش کیا ہے۔

تھی بسکہ شراب عشق سرجوش　　　یہ کہتے ہی ہوگئی وہ بے ہوش　　　اختر

سرجوش کے دوسرے معنی جو لغت میں ملتے ہیں وہ ہیں" شوربا جو اول جوش کھا چکا ہو مجازاً خلاصہ" یہاں ان دونوں معنوں میں سے کوئی معنی بھی ٹھیک نہیں بیٹھتے اور اس لفظ کا استعمال صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

ص ۱۸۳ "جو مصنف اپنی انانیت کی بے ساختہ تصویر کھینچ دے سکتے ہیں وہ ....."

کھینچ دے سکتے ہیں کے بجائے کھینچ سکتے ہیں ہونا چاہئے۔

ص ۱۸۴ "ایسے افراد اپنی 'میں' کو سرجوش کی طرح نہیں دبا سکتے"

مرجوش پر اظہار خیال کیا جا چکا ہے۔

ص۱۸۱ "ایسے لوگ فکر و نظر کے عام ترازوؤں میں نہیں تولے جا سکتے"

ترازو مونث ہے کے کی جگہ کی ہونا چاہیے۔

ص۱۸۸ "اردو میں ہم 'ایگو' بجنسہ لے دے سکتے ہیں"

یہ جملہ طبع ثالث کے صفحہ ۲۴۴ پر درج ہے جہاں لے دے سکتے ہیں لکھا ہے جناب مالک رام نے متن میں ایک 'لے' حذف کر دیا انہوں نے اپنے ایڈیشن کے متن کو ۱۹۴۴ء کے طبع ثالث کے متن پر مبنی کیا ہے مگر ایک 'دے' حذف کر دینے کی کوئی وجہ ظاہر نہیں کی ایسے ایک اور حذف کی مثال پہلے گزر چکی ہے۔ مولانا کے یہاں کر دے سکتے۔ لے دے سکتے وغیرہ اس قدر استعمال ہوئے ہیں کہ ان کی کتابوں میں جگہ ملتے ہیں۔ یہاں لے دے سکتے ہیں میں دو 'دے' کاتب کی عنایت کے مرہون منت نہیں بلکہ یقین ہے کہ مصنف ہی نے دو لفظ لکھے ہوں گے اہم نکال لے سکتی ہو اور معلوم کر لے سکتے ہیں، درج کئے جا چکے ہیں، اس لحاظ سے یہاں لے دے سکتے ہیں بالکل قرین قیاس ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ ثالث کی شہادت موجود ہے۔ اگر طبع اول یا دوم میں صرف ایک 'لے' پایا گیا ہوتا تو جناب مالک رام ضرور حاشیہ میں لکھ دیتے کہ نسل متن کی صحیح کر دی گئی، مگر شاید یہ امر واقعہ نہیں ہے۔

ص۱۹۰ "گویا دانہ کی پیش کش بھی ایک جرم ہوا"

جب پیش کش مونث ہے تو پھر پیش کش ایک جرم ہوا کہنا کیونکر درست ہوگا۔

ص۱۹۱ "اپنی غٹر غوں اور چیں چیں کے شور سے کان بہرا کر دیتے ہیں"

یہاں کان بصیغہ جمع استعمال ہونا چاہیے تھا۔ بہرا کی جگہ بہرے کا محل ہے۔

ص۲۰۲ "بعض پھولوں کو یہ خارجی اعانت۔۔۔ نہیں ملتی بانجھ ہو کر بغیر بیج بنائے ختم ہو جاتے ہیں"

بیج پیدا کرنے کے مفہوم میں بیج بنانا کہنا صحیح نہیں ہے۔

ص۲۰۹ "زندگی نے بہت سی کہانیاں بنائیں۔ خود زندگی ایسی گزری جیسے ایک کہانی"

مولانا نے امیر مینائی کا جو شعر نقل کیا ہے اس میں سرگذشت کی کہانیاں بننا کہا گیا ہے اور یہ صحیح ہے زندگی کہانی بن جاتی ہے یا اس کہانیاں بن جاتی ہیں مگر زندگی نے کہانیاں بنائیں نہیں بولتے۔

ص۲۱۱ "وہ غلیل پکڑ کے اسے کپڑے کرکٹ سے اٹ دیتے"

اٹ دینا نہیں بولتے۔ کہتے ہیں کہ گرد سے کمرہ اٹ گیا۔ یہ نہیں کہیں گے کہ گرد نے کمرہ اٹ دیا۔

ص۲۱۱ "یہ بات طے کر لی گئی کہ صبح کی معمولی صفائی کے علاوہ بھی کمرے میں بار بار جھاڑو پھر جانا چاہیے"

جھاڑو پھر جانے کے معنی ہیں، گھر کا صفایا ہو جانا۔ بربادی رونما ہو جانا۔ صبا کا شعر۔

آتے ہی بادِ صبا نے ایسی جھاڑو پھیری جانے گل پتا چمن میں باغباں رکھتا نہیں

مولانا نے جھاڑو پھر جانا جن معنوں میں استعمال کیا ہے صحیح نہیں۔

ص۲۱۲ "ایک نیا جھاڑو منگوا کر الماری کی آڑ میں چھپا دیا"

"اس لئے یہ طریقہ اختیار کرنا پڑا کہ خود ہی جھاڑو اٹھا لیا اور سب لوگوں کی نظریں بچا کر جلد جلد دو چار ہاتھ مار دئے"

جھاڑو مونث ہے مولانا نے جھاڑو کے لئے نیا۔ چھپا دیا۔ اٹھا لیا لکھا ہے جو صحیح نہیں۔

ص ۲۱۷ "سلسلے کا۔ کی درازی سے اکتا کر بیباکانہ قدم اٹھادیا"

قدم اٹھادینا پر پہلے اظہار خیال کیا جاچکا ہے۔

ص ۲۳۲ "عقاب وار فضائے لامتناہی کی لاانتہائیوں کی پیمائش کررہا تھا"

لاانتہائیوں پر رائے زنی کی جاچکی ہے۔

ص ۲۳۳ "ٹھیک اسی طرح انسان کے اندر کی خودشناسی بھی جب تک سوئی رہتی ہے ....."

خودشناسی تو اندر ہی کی چیز ہے۔ اندر کی خودشناسی سننے میں عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔

ص ۲۳۹ "تاہم میں نے محسوس کیا کہ طبیعت کا ساون بل گیا ہے۔

طبیعت کا ساون بلنے پر اظہار خیال کیا جاچکا ہے۔

ص ۲۳۹ "یہاں زندگی کی جو روزانہ معمولات ٹھہرائی جاچکی ہیں ان میں فرق نہ آنے پائے۔

معمولات مذکر ہے۔

ص ۲۴۰ "چونکہ زندگی کی معمولات میں وقت کی پابندی کا منٹوں کے حساب سے عادی ہوگیا ہوں اس لئے ....."

معمولات مونث نہیں بلکہ مذکر ہے۔

ص ۲۴۴ "یکایک اس شاخ پر بیٹھے سے پاؤں ٹھکرا گیا"

پاؤں ٹھکرا گیا۔ صحیح اردو نہیں ہے۔

ص ۲۴۵ "لیکن ملک کا خزانہ دیکھئے تو اشرفیوں سے بھرپور ہورہا ہے"

بھرپور کا یہ صحیح استعمال نہیں ہے اشرفیوں سے بھرا ہوا ہے ہونا چاہئے۔ بھرپور مکمل کے معنی میں آتا ہے جیسے بھرپور شباب

ص ۲۵۸ "جب رات کی پچھلی پہر شروع ہونے کو ہوتی ہے تو چاند پردۂ شب ہٹا کر جھانکنے لگتا ہے"

"پہر" مذکر ہے اس پر اظہار خیال کیا جاچکا ہے۔

ص ۲۶۱ "رات کو پچھلی پہر میں ان کی ترنم کی نوائیں ایک سماں باندھ دیا کرتی تھیں"

پہر مذکر ہے۔

ص ۲۶۵ "جس میں اس نے اپنی تمام مصنفات کا بہ تفصیل ذکر کیا تھا"

اپنی مصنفات کے بجائے اپنے مصنفات ہونا چاہئے۔

ص ۲۶۸ "ان سے ہم مسلی لوں گے ذوق و اشتعال کے نتائج بآسانی نکال لے سکتے ہیں"

نکال لے سکتے ہیں کے بجائے نکال سکتے ہیں، ہونا چاہئے۔

ص ۲۶۹ "نہیں معلوم اس قضیئے کا غنچہ کیونکر گل کرتا ہے"

مولانا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ نہیں معلوم یہ غنچہ پھول بن کر کیا شکل اختیار کرے گا۔ غنچہ کے پھول ہونے کے معنی میں اردو میں گل کرنا نہیں بولتے۔ گل کرنا کے معنی چراغ بجھانے کے ہیں۔

گل کردیا ہوا نے جو شمع مزار کر — اشک

ص ۲۸۲ "لیکن اس سے تشریع کا حکم اصلی اپنی جگہ سے نہیں ہل جاسکتا"

مولانا کا مقصد ہے کہ شریعت کا حکم اٹل ہے وہ اپنے مقام سے ہٹایا نہیں جاسکتا۔ نہیں ہل جاسکتا صحیح نہیں، دوسری غلطی "ہے ہل جاسکتا" نہیں جانا ہے۔

۵
آزمودہ دواؤں کا مرکب
انالجین
سر درد - کمر کا درد - دانت کا درد
ایام - انفلوئنزا اور ہر قسم کے دوسرے درد کے لئے
یقینی زود اثر اور بے ضرر علاج ہے
Spectil

مدیر فاران کے نام

(راقم الحروف جو دوسروں کی زبان روزمرہ پر گرفت کرتا رہتا ہے، اس سے بھی بعض اوقات زبان کی غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں، میرے قلم سے "کواڑیں" نکل گیا تھا، ایک صاحب نے ٹیلی فون پر ٹوکا، میں نے عرض کیا کہ ابھی ابھی "نوراللغات" کو دیکھا، اس میں مذکر لکھا ہوا ہے مگر ضلع بلند شہر (یو۔ پی) کے نواح میں "کواڑ" کو مونث ہی بولتے ہیں لیکن ہماری بولی سند نہیں ہے! میں نے یہ بھی کہا "کواڑوں" پر ایک پہیلی بھی ہے —

"تو جیل میں آئی"

یعنی ایک کواڑ بھیڑ کر، دوسری کواڑ کو بھی بھیڑا جاتا ہے!

میں نے اس سلسلہ میں خاصی چھان بین کی، مگر کواڑ کے مونث ہونے کی سند نہیں ملی۔ جناب شید حسن صاحب جو زبان روزمرہ اور لغت دانی میں اجتہاد و سند کے منصب عالی پر فائز ہیں ان سے بھی میں نے دریافت کیا — صاحب موصوف کا جواب ذیل میں شائع کیا جا رہا ہے ———— ماہر القادری)

۷۰۔ جبلی ہال ۔ مال روڈ ۔ دہلی ۷

یکم جولائی ۶۸ء

کرم فرمائے بندہ! سلام مسنون

آپ کا خط مورخہ ۱۷ رمئی پیش نظر ہے، جس کے ایک گوشہ میں "ضد" بھی لکھا ہوا ہے آپ اپنے دل میں یہ سمجھے ہوں گے، کہ کس متمرد و خیرہ چشم شخص سے سابقہ پڑا ہے لیکن حضرت! آپ نے یہ بھی سوچا ہوتا کہ اس زمانے میں یونیورسٹی بند ہوتی ہے اور لوگ ادھر ادھر نکل جاتے ہیں۔ میں بھی موسم اور کثرت کار سے گھبرا کر نکل کھڑا ہوا تھا، اکثر وقت گھر پہ (شاہ جہان پور) گزارا۔ اب واپسی پر آپ کا محبت نامہ ملا۔ مجھے امید ہے کہ اس صفائی اور واقعی عذر کے تحت آپ اپنی خفگی کو اب حق بجانب نہیں قرار دیں گے۔

آپ نے کواڑ کی تانیث کا ذکر چھیڑا ہے، کتابی اور ادبی زبان میں تو یہ لفظ بالاتفاق مذکر ہے۔ بول چال میں بھی میرے کانوں نے ہمیشہ مذکر سنا ہے یہ لکھنؤ سے دہلی تک، یعنی شاہ جہان پور، بریلی، رام پور کے علاقوں میں خصوصاً مذکر ہے، یہ عین ممکن ہے کہ کسی علاقے میں یہ مونث بھی ہو آپ نے لکھا بھی ہے، تو اس کی حیثیت مقامی بول چال کی حد تک محدود رہے گی، اس سے اس کی تانیث پر استدلال نہیں کیا جائے گا۔ ایسے علاقے کی زبان کا جب کسی ناول، افسانے، ڈرامے وغیرہ میں اقتباس آئے گا یا اس علاقے کے کسی کردار کی گفتگو ہوگی تو البتہ وہی صورت صحیح سمجھی جائے گی، بول چال کی سطح پر وہاں رائج ہوگی بشرطیکہ یہ کردار بھی اسی طبقے کا ہو۔

یہ علاقائی اختلافات بے حد دلچسپ ہیں، اور مختلف وجوہ کی بنا پر یہ عالم وجود میں آئے ہیں۔ مثلاً مدھیا کھنڈ کے علاقے میں بول چال میں لفظ آواز مذکر سننے میں آئے گا۔ میری زبان پر بھی شروع میں مذکر تھا۔ اور میں لکھ بھی جایا کرتا تھا۔ ایک بار مخدومی ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے اس طرف ذرا سختی سے متوجہ کیا جب سے بہت احتیاط کرنے لگا ہوں۔ یہ دراصل اسی علاقے میں پٹھانوں کے واسطے سے پشتو اثر ہے۔ ایسی اور مثالیں بھی ملیں گی، لیکن ادبی زبان اور زبان کی معیار بندی کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے سارے اختلافات کو ایک حد خاص سے آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔

اس سلسلے میں ایک اور بات بھی ملحوظ رہنا چاہیے۔ عہد میر اور اس کے ذرا بعد تک کے زمانے میں تذکیر و تانیث کا عجیب حال تھا جن لفظوں کو آج ہم صرف مذکر یا صرف مؤنث مانتے ہیں، وہ اس کے برخلاف بھی مل جائیں گے۔ میرا خیال یہ ہے کہ یہ وہی بول چال کی زبان اور علاقائی اختلافات کا اثر تھا۔ اور چونکہ یہ لوگ کتابی زبان اور بول چال کی زبان، دونوں سے یکساں طور پر قریب تھا کرتے تھے اور بے تکلفی سے استعمال بھی کیا کرتے تھے، اس لئے یہ صورت رونما ہوئی ہے۔ چند مثالوں سے اس کی وضاحت ہوگی :

برسات :- یہ ہوا اور ابر باراں سر پہ چھایا بے طرح
یار بن برسات آنکھوں نے دکھایا بے طرح
گنا بیگم زوجۂ نواب عماد الملک — تذکرہ مسرت افزا ص ۲۲

نگیں :- نگیں کی طرح ہمیں کیا ہی خوب بھاتی ہے
کہ ایک نام کی خاطر جگر چھداتی ہے
شاہ علیم اللہ بیتاب الٰہ آبادی — " ، ص ۳۰

راہ :- ہم نے اس عشق میں جب راہ بیاباں پکڑا
آبلے پاؤں پڑے، کانٹوں نے دامن پکڑا
خواجہ امام بخش امامی — " ، " ص ۳۶

سلطنت :- کنعاں میں ماہِ مصر نے کب سلطنت کیا
ٹیک چند بہار — " ، " ص ۳۰

میر کے یہاں جان مذکر اور مزار مؤنث ملتا ہے اور ایسی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

اگر آپ غصہ تھوک چکے ہوں تو اس خط کی رسید سے مطلع فرمائیے تاکہ مجھے اطمینان ہو کہ آپ خفا نہیں ہیں۔ آپ کو ناراض کر کے گنہگار نہیں ہونا چاہتا ہوں، ورنہ نامہ نگار اور مدیر حضرات میں تو ایسی آنکھ مچولیاں ہوتی رہتی ہیں لیکن آپ کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔

خدا کرے آپ مع متعلقین بعافیت کامل ہوں۔ مجھے دعاؤں میں یاد رکھئے۔

مخلص رشید حسن

پروفیسر محمد مسعود احمد
کوئٹہ

شعر و شاعر

(۱)

بال جبرئیل (۱۹۳۵ء) سے قبل علامہ اقبال بہت کچھ لکھ چکے ہیں ـــــ اسرار خودی (۱۹۱۵ء)، رموز بیخودی (۱۹۱۸ء)، پیام مشرق (۱۹۲۲ء)، بانگ درا (۱۹۲۴ء)، زبور عجم (۱۹۲۹ء)، جاوید نامہ (۱۹۳۲ء)، مثنوی مسافر (۱۹۳۴ء) منظر عام پر آ چکی تھی۔ اور علامہ کے افکار و خیالات ارتقائی منازل طے کر کے نقطۂ عروج پر پہونچ چکے تھے، بال جبرئیل میں غزل کے مانوس پیرایہ بیان میں علامہ نے تمام حقائق و معارف تعلیمات، تلقینات، جو پچھلی تصانیف میں شرح و بسط کے ساتھ بیان کر چکے تھے، دلنشین۔ اشاریت کے ساتھ بیان فرمائیں شعر و شاعری سے متعلق بھی اس میں کے افکار و خیالات بکھرے ہوئے ہیں، یہاں ان کو یکجا کر کے منظم و مربوط شکل میں پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ خیالات چونکہ دور آخر سے تعلق رکھتے ہیں جب کہ علامہ تجربات و مشاہدات کی منزلوں سے گزر چکے تھے۔ اس لئے نہایت وقیع ہیں ؂

میں شاخ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر (۱۹۸)

(۲)

نہ ستارے میں ہے نے گردش افلاک میں ہے تیری تقدیر مرے نالۂ بیباک میں ہے (۹۴)

علامہ شاعری میں مقصدیت کے قائل ہیں، جس کے نزدیک خود حیات انسانی با مقصد ہو وہ شاعری کو بے مقصد نہیں سمجھ سکتا ؂

یہ اک بات کہ آدم ہے صاحب مقصود ہزار گونہ فروغ و ہزار گونہ فراغ (۱۵۷)

افحسبتم انما خلقناکم عبثا وانکم الینا لا ترجعون ؟

علامہ کے نزدیک دنیا کی حیات و موت مقصود نہیں بلکہ ایک مقصد عظمیٰ کے حصول کے ذرائع ہیں۔ خلق الموت والحیات لیبلوکم ایکم احسن عملا۔ خود حیات و موت کی کمزیت بتاتی ہے کہ مقصود یہ نہیں بلکہ ایک ناگفتنی "مخفی شے" ہے۔

وہ "شے" کچھ اور ہے کہتے ہیں "جان پاک" جسے یہ رنگ و نم یہ لہو، آب و ناں کی ہے بیشی (۱۷۴)

اس شے لطیف کی تعمیر و نگہبانی جس کو "جان پاک" سے تعبیر کیا گیا ہے کوئی آسان کام نہیں۔

اس پیکر خاکی میں اک شے ہے سو وہ تیری میرے لئے مشکل ہے اس شے کی نگہبانی (۲۱)

علامہ اس شئے لطیف کی تلاش میں صحرائے وجود میں سرگرداں نظر آتے ہیں ؂

ہے ذوق تجلی بھی اسی خاک میں پنہاں (۵۲)

خود تلاش کرتے ہیں اور بھٹکے ہوئے ہم سفروں کو آواز دیتے ہیں ۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی (۴۸)

(۳)

جو مفکرین مقصد زندگی کا تعین نہ کر سکیں وہ شاعری کی عدم مقصدیت پر بحث کریں تو کریں کہ جب زندگی ہی بے مقصد ہے تو شاعری میں مقصدیت کی تلاش کیا معنی ؟ ــــ شاعری تو زندگی کا آئینہ ہے ۔ لیکن علامہ کے ہاں حیات ان کی سراسر مقصد ہے، بلکہ وہ تو حیات سے بھی آگے نکل گئے ہیں ؎

حیات درت نہیں التفات کے لائق	فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود

وہ ہوش و خرد کو سرمایۂ حیات نہیں سمجھتے بلکہ "مجذوبیت" کے طلب گار ہیں ؎

حیات کیا ہے ؟ خیال و نظر کی مجذوبی

وہ شاعری کو اسی مجذوبیت کے تابع دیکھنا چاہتے ہیں، وہ افلاک کی بلندیوں پر پرواز کرتے ہوئے مضطرب ہو جاتے ہیں ۔

مدت سے ہے آوارۂ افلاک مرا فکر	کر دے اسے اب چاند کے غاروں میں نظر بند

علامہ کے سامنے قرآن حکیم کی یہ آیت تھی جس میں بڑی جامعیت کے ساتھ شاعری کی ذمہ داریوں کو بتایا گیا ہے :۔

والشعراء یتبعھم الغاون ۔ الم تر انھم فی کل وادی یھیمون وانھم یقولون مالا یفعلون الا الذین آمنوا وعملوا الصالحات ۔ الخ

ان آیات میں مندرجہ ذیل باتیں بیان کی گئی ہیں :۔

۱ ۔ شعراء کی پیروی بھٹکے ہوئے لوگ کرتے ہیں ۔

۲ ۔ وہ ہر وادئ خیال میں سرگرداں رہتے ہیں (گویا ان کو فکری مرکزیت حاصل نہیں ۔)

۳ ۔ ان کے اقوال و اعمال میں ہم آہنگی نہیں ۔

۴ ۔ نیک کردار اور ایمان دار شاعروں کی پیروی بھٹکے ہوئے لوگ نہیں کرتے کیونکہ ان کے صیقل شدہ فکر و عمل میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے ۔

مندرجہ بالا باتوں سے یہ ادبی اصول مستنبط کئے جا سکتے ہیں :۔

۱ ۔ شاعر کے خیال میں مرکزیت ہونی چاہئے، وہ منتشر الخیال نہ ہو ۔

۲ ۔ قول و عمل میں مطابقت و ہم آہنگی ہو کہ جو کچھ کہے بے اثر ہو کر نہ رہ جائے ۔

۳ ۔ دل تشکیک سے مبرا ہو اور یقین کی دولت سے معمور ہو ۔

۴ ۔ جذبۂ عمل، صالح ہو تاکہ اس کا پیغام پستیوں سے بلندیوں کی طرف لے جائے ۔

اقبال کے نزدیک اصل جوہر "یقین" ہے ۔ اسی سے خیالات میں مرکزیت، عمل میں اصلاح اور قول و عمل میں ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے ۔ اگر شاعر بے یقینی کا شکار ہو گیا تو یقیناً اس کے افکار و خیالات پریشان ہوں گے جو پوری ملت کو اضطراب و بے یقینی میں

(۴)

میری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ   کہ میں ہوں محرم راز درون میخانہ (۴۶)

لامہ صرف ذہن و دماغ کے قائل نہیں وہ ایک عظیم قوت کی طرف اشارہ فرماتے ہیں جس کا مرکز قلب انسانی ہے اس قوت
کا یہ عالم ہے کہ ع ہر قطرۂ دریا میں دریا کی ہے گہرائی ۔ جب شاعر کو اس مخفی قوت کا پورا پورا احساس و ادراک
تو اس کو ضمیر کائنات واشگاف نظر آتا ہے ؎

تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر   کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی (۱۷۷)

ضمیر کا احساس و ادراک ہر کس و ناکس کو نہیں ہوتا ع ہر سینہ نشیمن نہیں جبریل امیں کا (۲۷۴)
قدرت خود انتخاب کرتی ہے اور خود نوازتی ہے ——— جس ملت پر قدرت کی یہ نوازش و کرم ہو۔ وہ خوش نصیب
روم ہو وہ بدبخت و بدنصیب ہے ؎

وہ قوم کہ فیضان سماوی سے ہے محروم   حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات (۱۴۶)

ب "فیضان سماوی" سے نوازا جاتا ہے تو دل کی گہرائیوں سے خود بخود اشعار پھوٹنے لگتے ہیں ع
مجھے فطرت نوا پر پے بہ پے مجبور کرتی ہے (۸۵) اس مقام پر پہنچ کر شاعر "محرم راز درون میخانہ" ہو جاتا ہے۔ اس کی
یشاں "شاعری نہیں بلکہ الہام ربانی ہو جاتی ہے۔ وہ "راز حرم" سے "باخبر" ہو جاتا ہے اور اس کی گفتگو کے انداز محرمانہ" ہو جاتے ہیں

(۵)

تہذیب نوی کارگہ شیشہ گراں ہے   آداب جنوں شاعر مشرق کو سکھا دو

ال یقین عشق ہی کا مظہر اتم ہے۔ اسی سے سیرتیں نکھرتی ہیں اور بقائے دوام حاصل کرتی ہیں۔ اسی سے فن میں روح اور زندگی
ہے۔ اسی لئے علامہ جہاں "کار جہاں کی بے ثباتی" اور "نقش کہن" اور "نقش نو" کی "ناتمامی" کا ذکر کرتے ہیں وہیں یہ بھی فرماتے ہیں

ہے مگر اس نقش میں رنگ ثبات و دوام   جس کو کیا ہو کسی مرد خدا نے تمام
مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ   عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام (۱۲۷)

کے نزدیک اگر فنکار یا شاعر عشق آشنا نہیں تو ع

دانش و دین و علم و فن بندگی ہوس تمام (۱۴۸)

تے ہیں، علامہ صحت مند تخلیق، تنویر حیات اور تزکیہ قلب کے لئے جذبۂ عشق کو لازمی تصور کرتے ہیں:-

سینہ روشن ہو تو ہے سوز سخن عین حیات   ہو نہ روشن تو سخن مرگ دوام اے ساقی (۱۸)

لامہ کی شاعری کا بنظر تعمق مطالعہ کیا جائے تو ابتدا سے لے کر انتہا تک عشق ہی عشق محیط نظر آتا ہے:-

شوق مری لے میں ہے شوق مری نے میں ہے   نغمۂ اللہ ہو میری رگ و پے میں ہے (۱۴۰)

مشرقی شعراء کو حقیقت عشق و محبت سے ناآشنا دیکھنا نہیں چاہتے۔ وہ اس عشق کے قائل نہیں جو "ادائے محبوبیت" پر فریفتہ رہتا

ہے، وہ اس عشق کے قائل ہیں جس سے مردہ دلوں میں حرارت و بیداری پیدا ہو جاتی ہے اسی لئے وہ کہتے ہیں :-

آداب جنوں شاعر مشرق کو سکھا دو (۱۵۰)

(۶)

بڑا کریم ہے اقبال بے نوا لیکن عطائے شعلہ شرر کے سوا کچھ بھی نہیں (۷۱)

علامہ کے نزدیک حقیقی شاعر وہ ہے جس کے کلام میں بلا کی آتش خیزی ہو، جو مردہ دلوں میں قیامت کی حرارت پیدا کر دے، اگر شاعر کے کلام سے تپش حیات میسر آگئی تو سب کچھ مل گیا، اس سے بڑھ کر شاعری کا اور کیا صلہ ہو سکتا ہے؟

تیرے نفس سے ہوئی آتش گل تیز تر مرغ چمن، ہے یہی تیری نوا کا صلہ (۱۰۵)

اقبال کے نزدیک اقوام کی زندگی کا دارا مدار حرارت پر ہے۔ ملت اسلامیہ کی ترقی کا راز بھی اسی میں مضمر تھا، جب یہ حرارت ختم ہو گئی، ملت بے اثر ہو کر رہ گئی۔ اس کی تلاش و جستجو ملت کی حیات اجتماعیہ کے لئے لازمی ہے۔ شاعر قوم کی عظیم ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اس حرارت کو ختم نہ ہونے دے، ختم ہو جائے تو پھر سے پیدا کرے۔ علامہ خود شدید بدلہ احساس زیاں کے ساتھ متاع رفتہ کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں

میری تمام سرگذشت کھوئے ہوؤں کی جستجو (۱۴۳) ہیں کہ مری غزل میں ہے آتش رفتہ کا سراغ

زندہ ملت کے ہر ہر فرد کو اس کھوئی ہوئی شے کی "جستجو" کی بار بار تلقین فرماتے ہیں۔

(۷)

پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

علامہ کے نزدیک سچے شاعر کی ایک صفت خاص یہ ہے کہ وہ اپنے افکار تازہ سے اقوام میں انقلاب پیدا کرتا ہے۔ اور وہ انقلاب کیا ہے؟ ــــ "ندرت فکر و عمل" کا پیدا ہو جانا، یہی وہ جوہر ہے جس سے "ملت کا ثبات" وابستہ ہے۔ علامہ کے نزدیک وہ زندگی موت کے مترادف ہے جس میں انقلاب نہ ہو گا

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی (۱۲۶) ــــ اور انقلاب کا داعی شاعر قوم ہے۔ اسی لئے جہاں اپنی شاعری کے جوہر مخفی کا ذکر کرتے ہیں۔ وہاں اس صفت خاص کا یوں ذکر فرماتے ہیں :-

مرے گلو میں ہے اک نغمۂ جبرئیل آشوب سنبھال کر جسے رکھا ہے لامکاں کے لئے (۱۴۷)

اس "نغمۂ جبرئیل آشوب" کے لئے لامکاں کی لامحدود فضائیں ہی مناسب ہیں، مکاں کی محدود فضائیں اس کی متحمل نہیں ہو سکتیں سے

پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب (۱۳۶)

انقلاب انگیز طبیعت کے لئے ایک آزاد فضا کی ضرورت ہے، علامہ کو ہندوستان کے غلامانہ ماحول میں ایک گھٹن سی محسوس ہوتی تھی، وہ اپنے افکار و خیالات کو بیان تو کرتے تھے، مگر سب کچھ کہہ جانے کے بعد پھر بھی کچھ کمی سی محسوس فرماتے تھے۔

لذت نغمہ کہاں مرغ خوش الحان کے لئے آہ اس باغ میں کرتا ہے نفس کوتاہی (۱۰۸)

(۸)

مرا فقر بہتر ہے اسکندری سے یہ آدم گری ہے وہ آئینہ سازی (۱۴۷)

علامہ انقلاب برائے انقلاب کے قائل نہیں ، ایسے انقلابات کی کوئی حد نہیں سوائے مسلسل شکست و ریخت اس کا کوئی اور مقصد نہیں
ہوتا ہے ، یہ رجحان بیمار ذہنیت کا آئینہ دار ہے ۔ علامہ کسی مقصد عظیم کے لئے انقلاب لانا چاہتے ہیں ، وہ چاہتے ہیں کہ شاعر تعمیر
ملت کا اہم کام انجام دے ع مری نوا سے ہوئے زندہ عارف و عامی (۱۰۵) وہ چاہتے ہیں کہ شاعر کیمیا گری کا فرض انجام دے
احساس کی کیمیا گری " سوز نفس " کے سوا کچھ اور نہیں ، وہ شاعر کو اس بام عروج پہ دیکھنا چاہتے ہیں جہاں اس کے پیغام میں اقوام کی تقدیر
پوشیدہ ہو ع تیری تقدیر مرے نالۂ بے باک میں ہے (۱۹۹) ــــــ غلامی کی زندگی بسر کرنے والی قوم تلاش منزل میں سرگرداں
ہے ، ماحول کی ظلمتوں نے منزل کو نظروں سے اوجھل کر دیا ۔ روشنی کی ضرورت ہے ، شاعر اس کے لئے مشعل راہ بنے ، علامہ خود منزل حریت
کی راہوں میں چراغ جلا رہے ہیں ع ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے (۱۴۶) ــــ اور یہ چراغ کیوں جلا رہا ہے!
ع کہ بھٹکے نہ پھریں ظلمت شب میں راہی (۱۰۹)

(۹)

نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر　　　نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

علامہ کے نزدیک ساز و نغمہ میں ، اس وقت تک زندگی پیدا نہیں ہو سکتی جب تک " رگ ساز " میں " صاحب ساز کا لہو " شامل نہ ہو ، یا یوں
کہئے کہ فن میں کیفیت دوام پیدا نہیں ہو سکتی جب تک صاحب فن کا خون جگر شامل نہ ہو ۔ علامہ اقبال اعجاز فن کے لئے ضروری سمجھتے ہیں کہ
فنکار اپنے شاہکار خون جگر سے سنوارے ، مصوری ہو یا سنگ تراشی ہو ، موسیقی یا شاعری ہو ، کمال فن کا دارومدار خام خیالیوں پر نہیں
بلکہ " خون دل و جگر " پر ہے ۔

رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت　　　معجزۂ فن کی ہے خون جگر سے نمود (۱۲۹)

اسی لئے اپنے کلام کے لئے کہتے ہیں ع خون دل و جگر سے ہے میری نوا کی پرورش (۱۵۱)

کیونکہ ع نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر (۱۳۶)

ہیئت شعر کے متعلق علامہ کا خیال ہے کہ خود اپنے خانہ ساز مینا ہی کو میخواروں کی ضیافت کے لئے استعمال کیا جائے اور کسی غیر کا احسان
نہ اٹھایا جائے ــــ

اٹھا نہ شیشہ گران فرنگ کے احساں　　　سفال ہند سے مینا و جام پیدا کر

شعر کے متعلق علامہ کا خیال ہے کہ وہ حیات آفریں ہونا چاہئے ۔ اگر اس میں یہ جوہر موجود ہے تو وہ " متاع امیر و سلطاں " سے بڑھ چڑھ کر
گراں قدر ہے :-

عزیز تر ہے متاع امیر و سلطاں سے　　　وہ شعر جس میں ہو بجلی کا سوز و براقی (۹۶)

حقیقت شعر پر اظہار خیال کرتے ہوئے ، علامہ اس کو " ناگفتنی " قرار دیتے ہیں ، ع
حرف تمنا جسے کہہ نہ سکیں رو برو (۱۲۵)

(۱۰)

گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا　　　جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات (۱۴۵)

ماعر کے فکر رسا کی بلند پروازیاں اس حد تک ہوں کہ وہ خود پروازِ فکر کا ساتھ نہ دے سکے۔ اس منزل پر پہونچ کر شاعر کے ذہن میں
سیا کی سی روانی پیدا ہو جاتی ہے، یہ فکر کی پختگی کی علامت ہے، یہ اسی وقت ممکن ہے جب شاعر "محرم رازِ درونِ میخانہ" ہو ۔۔۔
شعر وہی شعر ہے جس میں روانی دریا کو سمویا گیا ہو، جو بظاہر مختصر ہو مگر "ہر قطرہ کے اندر ہو دریا کی سی گہرائی"

علامہ زبان شعر پر صرف اتنا زور دیتے ہیں کہ وہ جلال و دلکشائی کی صفات کو اجاگر کر سکے۔ غلام قوم کے لئے وہ "ادائے بلبلی" کے یکسر مخالف ہیں، جس پر حالی نے بھی ماتم کیا ہے۔ وہ دل نوازی سے زیادہ دل گدازی کے قائل ہیں۔

مری نوا میں نہیں ہے ادائے محبوبی کہ بانگ صور اسرافیل دل نواز نہیں (۵۹)

وہ زبان سے زیادہ خیال پر زور دیتے ہیں، خیال ہی تعمیر ملت کا ضامن ہے۔ اس لئے وہ خیال میں دلکشائی کی جستجو کرتے ہیں اسی کو محبوب سمجھتے ہیں۔۔۔

نہ زباں کوئی غزل کی نہ زباں سے باخبر میں کوئی دلکشا صدا ہو عجمی ہو یا کہ تازی (۲۷)

ان کو اس کا پورا پورا احساس ہے کہ دنیا نے شاعر کی حیثیت سے ان کی قدر نہیں کی، شاعر تو بہت سے ہوئے ہیں، ان کی قدر و منزلت ہوئی ہے تو ان کے فکر و کردار سے ہوئی ہے۔۔

خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری وگرنہ شعر میرا کیا ہے شاعری کیا ہے (۲۲)

وہ نغمگی اور شیریں کلامی سے متنفر اور حقیقت کے متلاشی ہیں۔

کرمیں وطاؤس کی تقلید سے توبہ بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ (۱۱۰)

وہ حقیقت کیا ہے جو حرف تمنا جسے کہہ نہ سکیں روبرو۔

ماہرالقادری

علامہ اقبال سے میری پہلی اور آخری ملاقات

شاعری میری گھٹی میں پڑی ہے اور پوری زندگی اسی باغ کی سیر، اسی دشت کی سیاحی اور اسی بحر کی شناوری میں گزری ہے ——
راقم الحروف کے والد گاؤں کے سب سے پہلے شاعر تھے، "ظریف" تخلص تھا۔ مگر انہوں نے ایک شعر بھی مزاح وظرافت میں نہیں کہا، عربی زبان میں "ظریف" ہنسی دل لگی کرنے والے کو نہیں، بلکہ عقلمند اور دانا اور زیرک کو کہتے ہیں، غالباً والد مرحوم نے اپنا یہ تخلص (ظریف) عربی معنی کو ذہن میں رکھ کر ہی اختیار کیا تھا، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میری عمر بہت سے بہت تیرہ چودہ سال کی ہوگی جب علامہ اقبال کی یہ غزل

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں

میری نگاہ سے گزری، اسے پڑھ کر میرا وجدان چونک پڑا۔ جن شاعروں سے میں اس زمانے میں متاثر تھا ان کے لہجہ سے اس غزل کا آہنگ ہی مختلف تھا۔ آغازِ جوانی کے بعد اقبال کا شکوہ پڑھا، دل و دماغ پر تاثر کی کوئی حد ہی نہیں رہی، کلامِ اقبال سے عشق پیدا ہوگیا، اس عشق میں کبھی کمی نہیں آئی، یہ بڑھتا ہی چلا گیا! میں نے اپنی شاعرانہ زندگی میں امیر مینائی پر ایک نظم اور غالب پر چند اشعار کہے ہیں۔ مگر اقبال پر ایک نہیں تین نظمیں کہیں، ان نظموں سے میری عقیدت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ میری ایک نظم کے تین شعر

کارواں خواب میں تھا بانگِ درا سے پہلے — سازِ بے سوز نہ تھا تیری نوا سے پہلے
اس لئے ہے تری ایک ایک مجھے بات قبول — تیرا سرمایۂ دانش تھا فقط عشقِ رسول
طائرِ فکر کو پرواز عطا کی تو نے — لبِ خاموش کو آوازِ عطا کی تو نے

اقبال کے کلام میں "پیام" کی تقدیس اور فکر و خیال کی بلندی کے علاوہ فن کا حسن اور زبان کا رچاؤ بھی پایا جاتا ہے، اسی خوبی کے امتزاج نے اقبال کی شاعری کو "سحرِ حلال" بنا دیا ہے انہوں نے خود اپنے کلام میں مستقبل کے بارے میں پیش گوئی کی تھی جو حرف بحرف سچی ثابت ہوئی فرماتے ہیں۔

پس من شعرِ من خوانند و دریابند و می گویند — کہ عالم را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

راقم الحروف کی پہلی غزل ۱۹۲۳ء میں ضلع بلند شہر کے ڈسٹرکٹ گزٹ میں شائع ہوئی تھی، مطلع تھا۔

مارے جوشِ میں نے گلشن میں غبار دل کے — پھر زخم ہوئے تازہ ارمان بھرے دل کے

یہ میری نو مشقی کا دور تھا۔ اس دور کے دو چار شعر یاد رہ گئے ہیں، اس زمانے کی بیاضیں میں نے چاک کر دیں یہ وہ زمانہ تھا جب میری شاعری گھٹنیوں چل رہی تھی، اسے بلوغ تو برسوں کی مشق کے بعد میسر آیا۔ پھر میرا کلام دوسرے اخبارات اور رسالوں میں چھپنے لگا، لاہور میں ایک صاحب تھے سید حبیب شاہ جلال پوری۔ روزنامہ "سیاست" کے مدیر اعلیٰ ان کے اخبار میں میری غزلیں شائع ہوتی رہتیں۔ اخبار "سیاست" پنجاب میں خاصہ مقبول

نے دوپہر کا کھانا سر محمد یعقوب کے یہاں کھایا۔ میں نہ تو اس کانفرنس کا ڈیلی گیٹ تھا، اور نہ ان لوگوں کے سیاسی موقف سے متفق تھا۔ مولانا عبدالقدیر بدایونی مرحوم مجھے بدایوں سے اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ اس لئے میری حیثیت "طفیلی" کی تھی۔ بڑے آدمیوں کے "طفیلیوں" کی بھی خاص پذیرائی کی جاتی ہے۔ مولویوں اور پیروں کے بارے میں تو یہ روایت بن چکی ہے، کہ ان کے جلو میں دو چار عقیدت مند اور ہالی موالی ضرور رہتے ہیں۔ میں اقبال کے دیکھنے کے شوق میں یہاں چلا آیا تھا۔ اتفاق بلکہ حسن اتفاق تھا کہ دسترخوان پر علامہ اقبال کے سامنے مجھے جگہ ملی، میں اقبال کی نشست و برخاست، بات کرنے کے انداز اور کھانا کھانے کے طور و طریق کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا، ہم گاؤں کی دعوتوں میں کھانا ہاتھ پر رکابی رکھ کر کھایا کرتے تھے، مجھے دیکھ کر یہ بڑی خوشی ہوئی کہ علامہ اقبال نے بھی رکابی دسترخوان سے اٹھا کر اپنے ہاتھ پر رکھ لی اور کھانے میں مصروف ہو گئے۔ اس دعوت میں بس دو کھانے تھے، نمکین میں پلاؤ اور میٹھے میں زردہ! مگر دونوں کھانے انتہائی خوش ذائقہ، لذیذ، خوشبودار اور دیکھنے میں خوش رنگ بھی! اور سب سے بڑھ کر علامہ اقبال کے ساتھ ہم طعامی کی مسرت بلکہ اعزاز میسر آیا!

کبھی کبھی تو یہ موقعے نصیب ہوتے ہیں۔

ظہر کی نماز کے بعد دوسرا اجلاس شروع ہونے سے پہلے ہی ارکان میں تیز قسم کی کنویسنگ ہو رہی تھی، نمایاں طور پر محسوس ہو رہا تھا کہ صبح کے اجلاس میں جو سمندر خاموش اور پرسکون تھا، اس میں اب تلاطم پیدا ہو گیا ہے، آثار کچھ اچھے نظر نہیں آتے، صدارت کی تحریک پر ہی اختلاف کا آغاز ہوا۔ کوئی صاحب عبدالعزیز تھے، پشاور میں بیرسٹری کرتے تھے۔ وہ کرسی صدارت پر بیٹھے ہی تھے، کہ ایک صاحب نے جھپٹ کر کرسی چھین لی اور صدر صاحب اسٹیج پر گر پڑے۔ بس پھر کیا تھا جلسہ میں ہنگامہ ہو گیا۔ آپس میں تو تو میں میں ہونے لگی۔ یہاں تک کہ دو چار نے تو کرسیاں ہاتھوں میں اٹھا لیں۔۔۔۔۔ مولانا عبدالقدیر بدایونی نے مجمع کو خاموش کرنے کی غرض سے قرآن کریم کی تلاوت شروع کر دی مگر شور کچھ یوں ہی سا کم ہوا۔ بیرسٹر صاحب بھی عجیب ضد کے بنے ہوئے تھے، فرش سے اٹھ کر کرسی پر بیٹھنے کی پھر کوشش کی مگر مخالفین نے ان کی اس کوشش کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔۔۔ میرٹھ کے ایک مشہور رئیس بھیا جی تھے، میں ان کے قریب ہی بیٹھا تھا، ان پر کرسی سمیت صوبہ بہار کا ایک نمائندہ گر پڑا، وہ بے چارے اپنی دونوں ٹانگیں پکڑ کر بیٹھ گئے۔ سر محمد یعقوب نے کہا کہ آپ لوگ بہت برا مظاہرہ کر رہے ہیں، ہندو پریس اس واقعہ کو اخباروں میں خوب اچھالے گا، گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کی شدید کشمکش کے بعد جیسے تیسے ہنگامہ فرو ہوا اور ڈاکٹر سر ضیاء الدین جلسہ کے صدر قرار پائے۔ اس پر یہ قانونی بحث چھڑ گئی کہ پہلے صدر نے جلسہ کو برخاست کرنے کا اعلان کب کیا تھا، اسے تو طاقت کے زور سے ہٹا دیا گیا۔ بڑی ۔۔ رد و کد کے بعد یہ اعتراض واپس لیا گیا مگر بعض ارکان آخر وقت تک غصے میں بھرے بیٹھے رہے اور سرگوشیاں کرتے رہے۔

نماز عصر کے قریب جلسہ ختم ہوا، مسلمانوں کی معاشرت کا یہ وہ دور تھا کہ سیاسی جلسہ ہو یا شعر و ادب کی کوئی نشست، نماز کے وقت اسے ملتوی کر دیا جاتا تھا، مسلمانوں کی غیرت اس کو برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ مؤذن تو "حی علی الصلوٰۃ اور حی علی الفلاح" پکار رہا ہو اور مسلمان شعر خوانی اور تقریر بازی میں مصروف رہیں، جلسہ ختم ہو چکا تو میں نے مولانا عبدالقدیر بدایونی سے عرض کیا کہ علامہ اقبال کو دیکھ تو لیا مگر ان سے ملاقات کی تمنا ہے، یہی تمنا مجھے یہاں لیکر آئی ہے۔ مولانا مرحوم نے بعض لوگوں سے دریافت کیا تو پتہ چلا کہ علامہ، مولوی محمد شفیع داؤدی کے یہاں گئے ہوئے ہیں۔ مولوی محمد شفیع داؤدی صوبہ بہار کے نامور وکیل اور مشہور لیڈر تھے، برسوں ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کے رکن رہے، کانگریس سے علیحدہ ہونے کے بعد نیشنلسٹ مسلمان اہل قلم ان پر "مخل داؤدی" کی طنز کیا کرتے تھے، آخر عمر میں وہ ہندوستان کی جماعت اسلامی کے رکن ہو گئے، ان کے مخالف بھی ان کی دینداری کے معترف تھے اللہ تعالیٰ مغفرت فرماتے اور ہر مسلمان کا خاتمہ ایمان، نیکی اور بھلائی پر ہو۔ ہم موٹر کار میں مولوی شفیع داؤدی کے یہاں پہونچے، علامہ اقبال کو وہاں دیکھ کر راقم الحروف کی سالہا سال کی تمنا بر آئی، مولانا عبدالقدیر بدایونی نے میرا تعارف کرایا اس تعارف میں حیدرآباد دکن کا بھی ذکر آیا۔۔۔ علامہ بولے "میں جب حیدرآباد گیا تھا تو وہاں آپ سے ملاقات نہیں ہوئی" میں نے عرض کیا "میں اس زمانہ تک حیدرآباد نہیں گیا تھا۔" آپ کے سفر کے بعد

پھر جاتے تھے، بچھی ہوئی میز کے چاروں طرف سات آٹھ آدمی بیٹھے تھے، ایک صاحب نے اس کانفرنس کے ہنگامہ کے بارے میں ان کی رائے
[معلوم کی]، علامہ نے جواب میں فرمایا "یہ کیا ہنگامہ تھا، ترکی کی پارلیمنٹ میں تو ریوالور جیبوں سے نکل آتے ہیں" یہ کہتے ہوئے انہوں نے چائے کا ایک گھونٹ لیا۔

علامہ اقبال ان دنوں مسلمانوں کے جلسوں میں تقریریں بھی کیا کرتے تھے، غالباً "مسلم کانفرنس" سے ان کا تعلق بھی تھا۔ فرخ آباد
[ا]یک مولوی غلام مصطفیٰ تھے، انہوں نے علامہ کو فرخ آباد آنے کی دعوت دی تھی اور اسی تاریخ کو کسی دوسرے شہر میں بھی جلسہ تھا اس کے منتظم
[و]ہاں موجود تھے، ایک ہی تاریخ میں دو مقامات پر جلسے، علامہ کے لئے بڑی دشواری پیش آئی کہ کہاں کے لئے ہامی بھریں اور کس سے انکار
[کریں]! مجمع سے ایک صاحب نے کہا کہ آپ کا دل کیا کہتا ہے؟ علامہ نے برجستہ جواب دیا "میں تو کھڑا کھیل فرخ آبادی کھیلنے کا عادی ہوں" سب
مسکرانے لگے، اور بات آخر کار فرخ آباد ہی کے لئے طے پائی۔

علامہ اقبال سے اس نیاز مند کی یہ پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ یہ وہ نقش تھا جو آج تک تازہ ہے اور زندگی کا کوئی دور اور زمانہ کا کوئی
[ا]نقلاب اس نقش کو مٹانا تو کیا دھندلا بھی نہیں کرسکا۔ پروفیسر سلیم چشتی علامہ اقبال کے فیض یافتہ ہیں۔ شاید برسوں علامہ کی خدمت میں حاضر رہے
[ع]لمی مسائل پر علامہ کے ارشادات، نوٹس (NOTES) کی شکل میں ان کے پاس محفوظ ہیں، اقبال کی شاعری کے تمام مجموعوں کی چشتی صاحب نے شرح
[لکھی] ہے اور یہ کتابیں چھپ کر مقبول ہو چکی ہیں ۱۹۶۲ء میں بمبئی میں ان سے ملاقات ہوئی اور جب میں نے ان کو اس رنگ کے اپنے اشعار سنائے۔

مرے روز و شب کی فطرت جو بدل سکو بدل دو — کہ نہیں قبول مجھ کو مہ و مہر کی غلامی

خدا حافظ ترے قلب و نظر میں — تعارف ہے اگرچہ غائبانہ

مرے دل کی دھڑکنوں سے وہ قریب آ رہے ہیں — مرے شوق کو مبارک شبِ ہجر کی درازی

نظر ہیں بلند ہوں تو زمیں بھی ہے آسماں — نئی قبول ہو تو خموشی پیام ہے

خیال و فکر کی شیشہ گری میں کچھ بھی نہیں — یقیں نہ ہو تو فقط آگہی میں کچھ بھی نہیں

قفس کی فضا میں برابر ہیں دونوں — کبوتر کی منقار، شاہیں کا ناخن
کیا کام اسے معرکہ تیغ و سناں سے — واعظ تو فقط زینتِ منبر کے لئے ہے
مرے دل نے آج آہ بر کری چیز اک سے مانگی — بہ نگاہِ مستِ خسرو، بہ سرورِ قلب جامی
گداز شمع سے واقف، نہ سوزِ غم کی خبر — الجھ رہا ہے ابھی روشنی سے پروانہ
بلبل بہ سایہ شاخِ صنوبر، نغمہ ہا برزد — کہ برگِ گل، بہ قصیدہ جنت صد خارِ آرزو
کسے مانند لو تتِ صبح بہ ہر قطرۂ شبنم — شعاعِ مہرِ عالمتاب می رقصد کہ می لرزد

[اس پر] سلیم چشتی صاحب نے فرمایا۔
"ماہر! بس اتنا کہتا ہوں، کاش! علامہ اقبال زندہ ہوتے اور تم یہ اشعار انہیں سنا دیتے!"

مولانا محمد نعیم ندوی صدیقی
رفیق دار المصنفین اعظم گڈھ

جب طلسم ٹوٹ گیا

تاریخ کے روشن اوراق ہمارے اس دعوے پر شاہد عدل ہیں کہ مسلمانوں نے اس ربع مسکون پر صدیوں تک نہایت شوکت و ہیبت کے ساتھ داد حکمرانی دی، ـــــــ وہ عرب کے ریگزار سے آندھی کی طرح اٹھے تھے اور چشم زدن میں افق عالم پر چھا گئے، لیکن ـــــ تاریخ ہی ہمیں اس عظیم المیہ کا بھی پتہ دیتی ہے کہ جب تک مسلمانوں نے اپنی اسلامی حیثیت کو مستحکم رکھا اور ان کی معیشت و معاشرت مکمل طور پر تعلیمات نبوی کی آئینہ دار رہیں، فلاح و کامرانی بڑھ بڑھ کر ان کے قدم چومتی رہی، اور نتیجہ کے طور پر ان کی حکومت معیاری حکومت اور ان کا معاشرہ صالح و صحت مند معاشرہ کہا جانے لگا تھا۔

لیکن ـــــــــــ پھر جب وہ مسلم حکمران خلافت و حکومت کے اسلامی نظریے سے منحرف اور عیش کوشی و راحت پروری میں گم ہو گئے تو ـــــ وہیں سے ان کے سیاسی زوال و انحطاط کا آغاز ہو گیا، اور رفتہ رفتہ روئے زمین سے ان کی سیادت کی بنیادیں اکھڑ گئیں ـ

تفصیل سے قطع نظر یہاں عرض یہ کرنا مقصود ہے کہ مسلمانوں کے سیاسی ادبار کے بعد زمام اقتدار یورپ کے ہاتھ آئی، اس نے مشرق پر نہ صرف سیاسی حیثیت سے تسلط حاصل کیا بلکہ اپنے اس مخصوص تمدن و تہذیب کے جس کی بنا پر وہ اخلاقی انارکی میں مبتلا تھا۔ بیج بھی اسلامیان عالم میں بکھیر دیئے۔

اور پھر ـــــــــ انیسویں صدی کے اواخر میں یورپ کی یہ تخم ریزی رنگ لا کر رہی اور شکست خوردہ اقوام مشرق کی نگاہیں یورپ کے اس درآمدشدہ تمدن کی ظاہری چمک دمک اور رنگ و روغن سے خیرہ ہو کر رہ گئیں چنانچہ اب ـــــــــ ہر عمل کے خیر و شر اور ہر رائے کے خطا و صواب ہونے کا معیار یورپ قرار پا گیا، ان کے فکر و نظر کے سانچے یورپ کے کارخانوں میں تیار ہونے لگے ـــــــــ وہ اس سراب کے پیچھے اس طرح دیوانہ وار دوڑے کہ خود بھی اسی جنسی بے راہ روی اور اخلاقی جذام کا شکار ہو کر رہ گئے جس میں یورپ پہلے سے مبتلا تھا،

اور پھر ـــــــــ تہذیب فرنگ کے دلدادوں نے انیسویں صدی کے اواخر میں "آزادی نسواں" کا نعرہ بلند کیا اور اپنی خوشنمائی کی بنا پر یہ نعرہ مقبول بھی ہوا جس کے نتیجہ میں جو کبھی "چراغ خانہ" بنے رہنے پہ نازاں تھی اب ـــــــ "شمع محفل" بننے پر فخر کرنے لگی۔

بلاشبہ ـــــــــ اسلام نے پردہ چند در چند مصالح اور گوناگوں وجوہ کی بنا پر لازمی قرار دیا ہے، وہ درحقیقت عورت کی عفت و عصمت کا امین ہے، اس تفصیل طلب موضوع پر انشاء اللہ کبھی مستقل طور پر روشنی ڈالوں گا کہ پردہ کے ترک سے معاشرہ

کن کن نقصانات سے دوچار ہوا۔ فی الوقت صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ پردہ رفتہ رفتہ ایسا ہٹا کہ نوبت نیم عریانیت سے بھی بڑھ کر عریانیت تک پہونچ گئی، جس کا تصور بھی محال تھا، تہذیب فرنگ کی اس اندھی تقلید کے جو خطرناک ترین نتائج سامنے آئے اور مشرقی تمدن سے اعراض کا جو خمیازہ ملت کو بھگتنا پڑا اس کے مظاہر آج قدم قدم پر نمایاں طور پر سامنے آتے جا رہے ہیں، حتیٰ کہ آج اقوام یورپ اپنے اس خوشنما نعرہ کی غلطی کو محسوس کر کے اس پر نظر ثانی کرنے پر مجبور ہو رہی ہیں۔

ذیل میں راقم الحروف ایک انتہائی سبق آموز اور عبرت انگیز عربی افسانہ کا ترجمہ اور تلخیص پیش کر رہا ہے جس کے مطالعہ سے یہ اندازہ لگانا کچھ دشوار نہیں کہ جو لوگ اپنے تئیں تحریک آزادئ نسواں کے علمبردار ظاہر کرتے ہیں وہ بھی ---- ———— ایک دن اپنی غلطی کا احساس کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

اس افسانہ کے مصنف عربی ادب کے صاحب طرز ادیب و انشا پرداز مصطفیٰ لطفی منفلوطی ہیں۔ موصوف نے اپنے بے نظیر اسلوب میں اخلاقی لٹریچر کا بیش بہا ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے، ذیل کا افسانہ "العبرات" سے ماخوذ ہے۔ راقم نے ترجمہ میں تلخیص کو پیش نظر رکھا ہے۔

تازیانۂ عبرت

وہ میرا ایک پرانا اور وفادار دوست تھا، اعلیٰ تعلیم کی تحصیل کے لئے وہ یورپ گیا اور چند برس کے بعد جب وہ اپنے وطن واپس آیا تو یہ دیکھ کر میرے تعجب کی انتہا نہ رہی کہ اس کی تمام اچھی خصلتیں یکسر بدل چکی تھیں، چونکہ میں اس کا ہمہ وقت کا ساتھی تھا اس لئے مجھ سے زیادہ اس کے مزاج اور عادتوں سے کون واقف ہو سکتا ہے جس وقت وہ یورپ کے سفر پر روانہ ہوا تھا وہ انتہائی باحیا، منکسر مزاج، خداشناس اور دیندار تھا، لیکن ———— واپسی کے بعد اس کے بالکل برعکس بے دین، متکبر اور خدافراموش ہو چکا تھا۔

میں نے جب اس کے انقلاب کو دیکھا تو تعجب و افسوس کے ساتھ مجھے سخت تنفر ہوا لیکن دیرینہ روابط کی بنا پر میں اسے بالکل چھوڑنا بھی نہ چاہتا تھا اس لئے کچھ عرصہ تک تو میں اس کے فساد فکر اور لغویات کو اس توقع و امید میں انگیز کرتا رہا کہ شاید وہ راہ راست پر آ جائے۔

مگر ———— ایک دن ایسا واقعہ پیش آ گیا جو ہمارے درمیان ابدی علیحدگی اور قطع تعلق کی صورت میں منتج ہوا، ہوا یوں کہ ایک روز میں اس کے یہاں گیا، کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت افسردہ خاطر اور گم سم بیٹھے ہیں۔ میں نے سلام کرنے کے بعد حال دریافت کیا، وہ بولا ———— یہ عورت مجھے شدید ترین دکھ پہونچا رہی ہے۔ میں جو کچھ چاہتا ہوں اس میں کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی،

"کس عورت کے متعلق آپ بات کر رہے ہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"ارے بھئی یہی عورت" اس نے جواب دیتے ہوئے کہا "جسے لوگ میری بیوی کہتے ہیں اور میں ———— اپنے مقاصد اور اپنی تمناؤں کی راہ تکمیل میں ایک سنگ گراں سمجھتا ہوں"

"جناب! آپ کے مقاصد اور تمنائیں کیا ہیں؟" میں نے اگلا سوال کیا۔

"زندگی میں بس میری ایک ہی تو تمنا اور آرزو ہے" وہ بہت ہی افسردہ لہجہ میں گویا ہوا "کہ جب میں اپنی آنکھیں بند کر کے کھولوں تو اس شہر میں کوئی ایسی عورت نظر نہ آئے جس کے چہرہ پر نقاب ہو ————"

"تو پھر؟" میں اس کا جواب سن کر سخت تنفر کے ساتھ بولا "یہ آپ کی ایسی آرزو ہے جو انتہائی غیر شریفانہ اور نامناسب ہے، پردہ کے بارے میں یہ صرف میرا ہی نظریہ نہیں ہے" وہ مسکراتے ہوئے بولا "بلکہ آپ کو اس شہر میں میرے بہت سے ہم نوا ملیں گے مگر ———— بھئی اس راہ میں سب سے بڑی مشکل یہ حائل ہے کہ مردوں کی مجلس میں بے نقاب کھلے منہ آنے سے عورت فطری طور پر خوف کرتی

ہے ، اور بھی ——— سچ تو یہ ہے کہ ہر نیا کام کرتے وقت خوف مشرقی لوگوں کے آڑے آتا ہے ، یہ میری دلی آرزو ہے جسے عملی روپ میں لانے کے لئے میں سب سے پہلے جدوجہد کرنا چاہتا ہوں کہ کسی طرح یہ دیوار منہدم ہو جائے ، تاکہ جس کام میں میرے ہمنوا ناکام رہے میرے ہاتھوں پایہ تکمیل کو پہنچے ، چنانچہ ——— میں نے اپنی بیوی کے سامنے صورت حال کو پیش کیا لیکن وہ پردہ ترک کرنے پر کسی طرح راضی ہی نہیں ہوتی ، اور اس کا سبب وہ شرم و حیا بتلاتی ہے ۔ حالانکہ میرے خیال میں یہ شرم نہیں بلکہ قوم کی بے حسی اور جمود ہے یہ عورتوں کی موت ہے . . . . . . لہٰذا میں اپنی بیوی کی خودسری کا علاج کروں گا نہیں تو اس کے سر کی خیر نہیں ۔

وہ کہے جا رہا تھا اور میرے دل پر غیظ و غضب اور حزن و یاس کے ملے جلے جذبات طاری تھے ، میں نے انتہائی احتجاجی اور طنزیانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور کہا

" کیا آپ کو اپنی اس بات کی اہمیت کا احساس ہے ؟ "

" ہیں " اس نے فوراً جواب دیا " بالکل حقیقت واقعہ عرض کر رہا ہوں ، اور پھر ——— یہ خواہش صرف میرے ہی دل میں نہیں ہے بلکہ آپ کے دل میں بھی کسی نہ کسی حد تک ضرور موجود ہے ، اور آج ——— قوم کے ہر فرد کی یہی آرزو ہے ؟ "

" تو پھر " میں اسی طرح رنج کے ساتھ بولا " کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ دیار یورپ میں جہاں آپ نے کافی عرصہ زندگی گذاری ہے اور جہاں پردہ کا رواج نہیں ہے آپ نے جب بھی کسی عورت سے اپنی جنسی پیاس بجھانا چاہی تو کیا اس کے شوہر کے علم کے بعد آپ کی یہ خواہش پوری ہو گئی ؟ "

" کبھی نہیں " وہ بہت ہی جوش سے بولا " لیکن آپ کو اس سے کیا مطلب ؟ "

" مجھے خدشہ ہے " میں ذرا کچھ توقف کے بعد بولا " کہ جس طرح آپ نے یورپ میں متعدد عورتوں کے آبگینۂ نسائیت کو چکنا چور کیا اسی طرح یہاں دوسرے آپ کی عصمت پر ڈاکہ نہ ڈالیں گے ——— "

" نہیں نہیں " وہ بولا " ایک شریف عورت مردوں کے مجمع میں بھی اپنی شرم و حیا اور عفت کو اس طرح محفوظ رکھ سکتی ہے کہ کوئی ہوس آلود نگاہ اس پر نہ پڑ سکے ؟ "

یہ سن کر میں فرط رنج و الم سے تقریباً نڈھال ہو گیا اور تھوڑی دیر توقف کرنے کے بعد میں اپنے حواس کو جمع کرتے ہوئے بولا ۔

" اے حضرت ! یہ شیطان نے آپ کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے اور آپ کی نگاہ عقل و خرد پر دبیز پردے ڈال دئے ہیں ، آج ——— عفت و شرم ، حیا و پاکدامنی جیسے الفاظ کا وجود صرف لغت کی کتابوں میں ملتا ہے ، لیکن عملاً یہ صفات ناپید ہیں ، ہاں ——— یہ صحیح ہے کہ سادہ لوح اور معذور لوگ ان صفات سے متصف ہیں لیکن صاحب ثروت و عزت لوگ جو اپنی شب و روز بے نقاب اور خوشنما عورتوں کے جھرمٹ میں گزارتے ہیں ، وہ عفت کو کب تک برقرار رکھ سکتے ہیں ؟ پھر خدا را بتلائیے آپ کس ماحول میں عورتوں کو بے نقاب لانا چاہتے ہیں ۔

کیا پروفیسروں کے ماحول میں ، جن کا حال یہ ہے کہ جب ایک پروفیسر سے دریافت کیا گیا کہ تم شادی کیوں نہیں کرتے ہو تو اس نے برجستہ جواب دیا تھا کہ اس شہر کی تمام عورتیں میری ہی بیویاں تو ہیں پھر مجھے شادی کی کیا ضرورت ؟

کیا طلباء کے ماحول میں آپ عورتوں کو بے نقاب لانا چاہتے ہیں ، جن کا حال یہ ہے کہ ان کی جیبیں اپنی گرل فرینڈ کی تصویروں سے بھری اور ان کی زبانیں عشق و محبت کے کارناموں سے تر رہتی ہیں ۔

میرے بھائی ذرا سوچو خود کلاہ نے تو کبھی پردہ کو قید یا ظلم نہیں سمجھا اور اس نے کبھی تم لوگوں سے اس زنجیر اور قید کے خلاف فریاد

[illegible]

آوازے کستے ہیں، اس کا راستہ روکتے ہیں، نتیجتاً وہ گھر میں محبوس ہو کر پڑی رہتی ہے تعجب ہے کہ تم خود اسے گھر میں مقید کرتے ہو اور پھر خود ہی اس کی بدبختی اور قید و بند کا رونا روتے پھرتے ہو، یہ سب کچھ نہیں، در حقیقت ——— تم لوگ یہاں بھی مغربی ماحول پیدا کرنا چاہتے ہو تاکہ تم اس میں اپنی ناجائز خواہشات کی تکمیل و تسکین کر سکو ———

وہ میری باتیں سن کر مسکراتا رہا اور میرے دل میں جذبات و خیالات کا ایک سمندر موجزن تھا چنانچہ میں فرطِ جوش میں کہتا رہا۔

"۔۔۔ ——— عورت نے ایک طویل زمانہ تک اپنے گھر کی چہار دیواری میں بڑی پرسکون زندگی بسر کی، وہ اپنے باپ کی اطاعت گذار اور اپنے شوہر کی وفادار تھی، اس کے نزدیک شوہر کی رضا جوئی ہی دنیا کا سب سے بڑا شرف تھی، لیکن ——— تم لوگوں نے اسے یہ تعلیم دی کہ تمہارے والدین اور بھائی فہم و دانش سے تم سے بہتر و برتر نہیں ہیں لہٰذا تم خود اپنے رفیقِ حیات کا انتخاب کرنے کی مجاز ہو اور اس طرح ——— تم نے اسے اپنے باپ سے متنفر اور اپنے شوہر کا سرکش بنا دیا۔ اور یہی نہیں بلکہ اس نے محبت کو ازدواج کی بنیاد سمجھ کر مردوں کے چہروں پر اپنی بھوکی نگاہیں گاڑ دیں، لیکن ——— نتیجہ کیا ہوا کہ محبت میں مشغول ہو کر وہ یا تو ازدواجی زندگی کو ہی بھول گئی، یا پھر خط بہ خط نئے نئے خاوند تلاش کرنے لگی، جو اس کے عاشق ہوں . . . .

تم نے عورت کو بتایا کہ ہم صرف اس عورت کو اپنا رفیقۂ حیات بنائیں گے جو ہمارے ذوق سے ہم آہنگ ہو، چنانچہ اس نے تمہارے ذوق کا پتہ لگانے کے لئے اچھی طرح چھان بین کی تو معلوم ہوا کہ ——— تم صرف آبرو باختہ اور فاحشہ لڑکی کے خواہاں ہو تو وہ بھی تمہاری رضا جوئی کی خاطر آبرو باختہ اور عریاں ہو کر تمہارے سامنے اس طرح آنے لگی جس طرح کوئی لونڈی غلاموں کے بازار میں فروخت ہونے کو ہو، لیکن ——— تم نے اس سے منہ پھیر کر کسی شریف زادی کی تلاش شروع کر دی۔ نتیجتاً وہ اپنے سارے تمام دامن سمیٹ کر کسی طرح بے آبرو باختہ بن گئی، اسی طرح کتنی عورتوں اور مردوں میں بیزاری پیدا ہو گئی، کتنے گھر ویران ہو گئے اور قوم میں شکوک و شبہات پھیل گئے۔

میں فرطِ جذبات سے کہے جا رہا تھا۔

"جناب من یہ ہم بھی جانتے ہیں کہ عورت کو تعلیم کے زیور سے ضرور آراستہ ہونا چاہئے لیکن سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کو تعلیم سے پہلے تہذیب سکھائی جائے۔

تم دیکھتے ہو کہ یورپ میں مرد اور عورت آزادانہ اختلاط رکھتے ہیں، لیکن خوب سمجھ لیجئے کہ وہ لوگ بیمار ہیں، انہوں نے نادم ہونے کے باوصف اپنے لئے کچھ حدود کا تعین کر لیا ہے جس سے وہ سرمو تجاوز نہیں کر سکتے، مغربی عورت یہ دم خم رکھتی ہے کہ اپنے شوہر کو کسی غیر عورت کی کمر میں بانہیں ڈال کر اس کے ساتھ ٹہلتے ہوئے حتیٰ کہ خلوت میں راز و نیاز کی باتیں کرتے دیکھ لے اور معترض ہونے کے بجائے ان کی اس حرکت کو خندہ پیشانی سے قبول کر لے، لیکن ——— اگر تم چاہو کہ یہی آزادی مشرقی عورت کو بھی دے دو تو اس کے نتائج انتہائی خطرناک ظاہر ہوں گے، ہم تم قوم کی شرافت و آبرو کے نام پر یہ امید رکھتے ہیں کہ تم قوم کی بقیہ ماندہ پردہ نشین خواتین کو اپنی ناجائز اور نامناسب خواہشات سے دور رکھو، انہیں ——— اپنے گھروں میں محفوظ رہنے دو،

یاد رکھو ——— قوم کے ہر زخم کی دوا موجود ہے لیکن شرافت کا زخم قطعی لا علاج ہے، اگر بالفرض تم ایسا کرنا ہی چاہتے ہو تو ذرا اور انتظار کر لو، حتیٰ کہ قوم کی باقی ماندہ غیرت بھی ختم ہو جائے اور پھر تم حیاتِ نو سے ہمکنار ہو جاؤ۔"

میں اتنی دیر تک مسلسل بولتے رہنے سے کچھ تھک سا گیا تھا چنانچہ یہاں تک بات کہنے کے بعد میں خاموش ہو گیا اور اپنے دوست کی جانب سے ردِ عمل کا انتظار کرنے لگا، مگر ——— آپ کو یہ سن کر انتہائی تعجب ہو گا کہ وہ بے شرم میری باتوں کے جواب میں

مسکرایا اور کمال بے غیرتی سے کہنے لگا۔

"ہم اسی قسم کی تمام حماقتوں کا دفعیہ اور علاج کرنے اٹھے ہیں اب دیکھتے جاؤ کیا ہوتا ہے، خدا خود ہی فیصلہ کر دیگا کہ میں حق پر ہوں یا تم جیسے رجعت پسند ——"

"تمہیں اپنے اور اپنے گھر والوں کے بارے میں اختیار ہے" میں نے اتمام حجت کرتے ہوئے آخری بات کہی "کہ جو چاہو کرو لیکن میں اب کبھی تمہارے گھر نہیں آسکتا۔ ——"

پھر میں فوراً اٹھ کر چلا آیا اور یہ اس سے میری آخری ملاقات تھی۔

چند ماہ اسی طرح گزر گئے ——،

ایک دن میں نے لوگوں میں چہ میگوئیاں سنیں کہ فلاں آدمی کا گھر عورتوں اور مردوں کا اڈا بن گیا ہے —— یہ سن کر میری آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔ یہ آنسو میری غیرت کے تھے، ایک دوست گم شدہ پر افسوس و ملال کے! —— خدا ہی جانے!

بہت زمانے تک میں نے اس سے ملاقات نہیں کی اس کے بارے میں تمام باتیں سنتا اور کف افسوس ملتا رہا۔ گاہے ماہے سر راہ آمنا سامنا ہو بھی جاتا تو میں اجنبی کی طرح سلام کرکے اپنی راہ چل دیتا۔

ایک دن درمیانی شب میں —— میں کسی کام سے فراغت کے بعد اپنے گھر واپس آرہا تھا، جب میں گھر سے قریب پہونچا تو اپنے سابق دوست کو گردن جھکائے ایک پولیس کے سپاہی کے ساتھ جاتے دیکھا، اس سے بیزاری کے باوجود اس حالت میں اسے دیکھ کر ہمدردی کے جذبات میرے دل میں پیدا ہوتے اور میں سراسیمہ ہو کر اس کے قریب پہونچا اور حقیقت حال دریافت کی۔

"مجھے کچھ علم نہیں" وہ بولا "میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ اس سپاہی نے میرا دروازہ کھٹکھٹا کر بتایا کہ مجھے پولیس اسٹیشن طلب کیا گیا ہے، یہ میں خود بھی نہیں جانتا کہ اس وقت بلائے جانے کا کیا سبب ہو سکتا ہے"

اتنا کہنے کے بعد اس نے ملتجیانہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور بولا "کیا آپ زحمت فرما کر میرے ساتھ چل سکیں گے؟"

"ضرور ضرور" میں نے کہا اور چل دیا، اثنائے راہ میں میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے مگر فرط ندامت حائل ہے، چنانچہ میں نے از خود گفتگو کا آغاز کیا۔

"آپ کے نزدیک اس کی اس طلبی کا کیا سبب ہو سکتا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔ تھوڑی دیر تک وہ خاموش رہا اور پھر میری طرف پریشان نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"مجھے خدشہ ہے کہ آج شب میں میری بیوی کے ساتھ کوئی ناخوشگوار حادثہ پیش آگیا ہے، وجہ یہ ہے کہ —— ابھی تک وہ گھر نہیں لوٹی جبکہ عام حالات میں وہ اس وقت تک آجایا کرتی تھی۔"

"کیا اس کے ہمراہ کوئی تھا؟" میں نے پوچھا

"نہیں نہیں، وہ تنہا ہی تھی" اس نے اسی طرح غمگین لہجہ میں جواب دیا۔

"تو کیا آپ کو اس بارے میں کوئی علم ہے کہ وہ اتنی رات گئے تک کہاں رہا کرتی تھی؟" میں نے استفسار کیا۔

"وہ ایک بے وقوف اور غیور عورت ہے" اس نے جواب دیتے ہوئے کہا "ہو سکتا ہے کسی مرد نے اس سے چھیڑ خانی کی ہو اور وہ اس پر چراغ پا ہو گئی ہو، جس کے نتیجہ میں بات بڑھ کر کسی ناخوشگوار حادثہ تک پہونچ گئی ہو۔"

باتیں کرتے کرتے ہم لوگ تھانے پہونچ گئے تھے۔ جو سپاہی ہمارے ساتھ تھا وہ مختلف دالانوں سے گزرتا ہوا ایک ہال میں لے گیا ——

تھانیدار کا دفتر تھا، اس افسر نے سپاہی کو کچھ اشارہ کیا جسے ہم سمجھ نہیں سکے، اور ——— پھر اس نے میرے دوست کو
اس بلا کر پوچھا۔

"محترم! ہمیں اس کا بڑا دکھ ہے کہ آج ایک مشکوک مقام پر ایک مرد اور عورت نامناسب حالت میں موقع پر پکڑے گئے ہیں۔
اس عورت کے بیان کے مطابق وہ آپ سے تعلق رکھتی ہے، اس لئے ہم نے آپ کو زحمت دی ہے کہ آپ حقیقت امر سے آگاہ کر سکیں اگر فی الواقع
وہ آپ کی کوئی عزیزہ ہے تو ہم آپ کی عزت و شرف کا پاس کرتے ہوئے اسے آپ کے ساتھ جانے کی اجازت دے دیں گے، ورنہ ———
فاحشہ عورت کسی طرح سزا سے بچ نہ سکے گی۔

ونعشہ ——— دوست نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ عورت اس کی بیوی تھی اور وہ مرد اس کا انتہائی جگری دوست
تھا۔ یہ منظر دیکھنے کے ساتھ ہی ——— میرے دوست کے منہ سے ایک دلدوز چیخ نکلی اور پھر وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

میں نے صورت حال کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے افسر سے دھیرے سے کہا: اس عورت کو اس کے باپ کے گھر بھیج دیا جائے
اس کے بعد اپنے بے ہوش دوست کو میں گاڑی میں ڈال کر گھر لایا اور فوراً ہی ڈاکٹر کو فون کر کے بلایا، اس نے بھی معائنہ کر کے بتایا کہ اس
نوجوان کو ناقابل برداشت ذہنی صدمہ پہنچا ہے، ڈاکٹر ساری رات اس کی حالت دیکھتا رہا اور پھر صبح آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گیا
تھا ——— اس کی تیمارداری کرتا رہا اور اس کے بارے میں خدا کے فیصلہ کا منتظر رہا۔

صبح کے وقت ——— اس نے تھوڑی سی حرکت کی اور پھر آنکھیں کھول دیں، میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ کہنے کے
لئے ہونٹ ہلانا چاہتا ہے۔ مگر نقاہت اور ضعف مانع ہے، چنانچہ میں خود اس کے قریب ہو گیا اور پوچھا کہ "جناب آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟"

"میرے پاس کوئی نہ آنے پائے" وہ انتہائی کمزور آواز میں بولا "ان شاء اللہ جیسے آپ اجازت دیں گے صرف وہی آ سکے گا" میں نے
اسے اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔

"میری بیوی کہاں ہے؟" اس نے اشک آلود آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اپنے باپ کے پاس" میں نے کہا۔ "مگر آپ کو اس سے کیا کام ہے؟"

"میں" وہ اسی طرح نحیف و نزار آواز میں گویا ہوا "اس سے .... صرف یہی کہنا ...... چاہتا ہوں کہ میں نے
.... اسے معاف کر دیا ہے، مجھ سے تعلق قائم ہونے سے قبل .... وہ خود اور اس کے گھر والے ...... شریف
اور معزز لوگ تھے .... مگر .... میں نے ان پر ایسی ذلت ڈالی کہ وہ اب کبھی بھی ...."

تھوڑی خاموشی کے بعد پھر اس نے اپنے سلسلہ کلام کی کڑیاں ملاتے ہوئے کہا۔

"آہ .... میں نے اس عورت سے شادی کرنے سے پہلے .... اس کے باپ سے یہ عہد کیا تھا ....
.... کہ میں اپنی ہی زندگی کی طرح اس کی بیٹی کی عفت و عصمت کی بھی حفاظت کروں گا، لیکن .... ہائے .... میں نے
اس پیمان وفا کو چکنا چور کر دیا اور .... آہ .... اس عورت نے میرے سینے میں جو خنجر گھونپا ہے .... وہ خنجر
.... میں نے خود ہی اس کے ہاتھ میں دیا تھا اس لئے .... اصل گنہگار تو میں ہوں، کوئی شخص اس عورت سے ....
باز پرس نہ کرے۔"

پھر اس نے تھوڑی دیر توقف کیا اور ایک جھرجھری لی، مجھے محسوس ہونے لگا کہ اس کے دل کے پردے پھٹنے لگے اور جو طلسم اس کی
نگاہوں پر چھا گیا تھا وہ اب ٹوٹنے لگا ہے۔

پھر وہ کہنے لگا۔

"کاش میری ماں مجھے جنم نہ دیتی ...... کاش ...... میرے باپ کی کوئی اولاد نہ ہوتی"

پھر اس نے آنکھیں بند کرلیں اور دوبارہ بے ہوش ہوگیا، .... اور —— اسی حالت میں آہ و زاری کرنے لگا، جس سے تمام لوگوں کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے، ہم لوگ —— پ —— اس کے گرد بیٹھے تھے، موت اپنا ہاتھ —— —— آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھا رہی تھی۔

اتنے میں —— ایک عورت سیاہ لباس پہنے کمرے میں داخل ہوئی اور آہستہ روی کے ساتھ اپنے شوہر کی طرف بڑھی اور ایک جانب کو جھک کر سینہ پہ رکھا ہوا اس نوجوان کا ہاتھ اٹھایا اور چوم لیا اور پھر بولی۔

"اے سراج! اپنے اس معصوم بچے کے بارے میں دنیا سے شک و شبہ لے کر مت جانا میں اگرچہ گناہ سے بالکل قریب پہنچ گئی تھی، مگر خدا نے مجھے اس میں ملوث ہونے سے محفوظ رکھا ...... یہ بچہ تمہارا ہی ہے —"

یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مریض نے اپنی آنکھیں کھولیں اور ایک مسکراہٹ کے بعد اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی، شاید اس کا دل مطمئن ہوچکا تھا۔

QUALITY REIGNS
SUPREME WITH US

ملّا واحدی

تاثرات

(جنتی) مجرموں سے پوچھیں گے تمہیں کن باتوں نے دوزخ میں لا ڈالا، (تو وہ) جواب دیں گے ، (ایک تو) ہم اللہ کے آگے سر نہیں جھکاتے تھے اور نماز نہیں پڑھتے تھے ، اور (دوسرا قصور ہمارا یہ تھا کہ) ہم مساکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے ، اور (تیسرا قصور یہ تھا) کہ ہم کج بحثی کرنے والوں کے ساتھ مل کر (حق پرستوں سے) کج بحثی کیا کرتے تھے ۔ اور (چوتھا قصور یہ کہ) روز جزا کو جھٹلاتے تھے ، یہاں تک کہ ہمیں موت آگئی (اور موت کے بعد حقیقت حال ہم پر ظاہر ہوگئی ۔) (قرآن پاک)

اہل دول کے ہاں جانے سے کوفت کے سوا کچھ نہیں ملتا ۔ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اہل دول کی رنگ رلیاں دیکھ کر وہ پاک روزی جو اللہ نے تمہیں دے رکھی ہے بری لگنے لگتی ہے ' اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ اہل دول کی دنیاوی چمک دمک اور روشنی ایمان کی حلاوت کھو دیتی ہے ۔

بادشاہ یا حاکم کی بابت یقین ہوا ہے کہ سفارش سُن لے گا تو اہل اللہ سفارش کرنے ضرور چلے گئے ہیں ۔ مگر اہل اللہ اُن سے سم نہیں بڑھاتے تھے رسم بڑھانے میں ایمان کے ڈگمگانے کا امکان رہتا ہے ۔ بادشاہ یا حاکم طلب کرتا تھا اور نہ جانے میں خطرہ نظر آتا تھا تو جاتے تھے ورنہ از خود نہیں جاتے تھے ۔ اہل اللہ کا دل اہل دول کی طرف کھنچ ہی نہیں سکتا ۔

بادشاہ اور حاکم دیندار ہوں اور اہل اللہ کے پاس آئیں تو اُن سے اخلاق برتنے کا حکم ہے ۔ ہر بادشاہ اور حاکم آتے گا ہی نہیں ، وہی آئیگا جسے اللہ سے اور دین سے لگاؤ ہوگا ۔ ایسا بادشاہ اور حاکم عزت اور ہمت افزائی کا مستحق ہے ' بالکل اُسی طرح جس طرح ظالم بادشاہ اور حاکم اہانت اور ہمت شکنی کا مستحق ہے ۔

نذر وغیرہ تو اکثر بزرگ اچھے بادشاہوں اور حاکموں کی بھی نہیں قبول کرتے تھے ۔ حضرت حماد بن مسلمہ رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ حضرت مقاتل بن صالح رحمۃ اللہ علیہ بیان فرماتے ہیں کہ میں حضرت حماد کی خدمت میں حاضر تھا کسی نے کنڈی کھٹکھٹائی ۔ پوچھا ، کون ہے ۔ معلوم ہوا خلیفہ وقت محمد بن سلیمان ہیں ۔ اندر بلالیا ۔ خلیفہ نے چار ہزار درہم پیش کئے ۔ حضرت حماد نے لینے سے انکار کر دیا ۔ خلیفہ نے قسم کھائی کہ میری میراث حلال کے درہم ہیں ۔ حضرت حماد نے کہا ، مجھے تو ضرورت ہی نہیں ہے ۔ خلیفہ نے کہا ۔ اچھا اپنے ہاتھ سے فقرا میں بانٹ دیجئے ۔ حضرت حماد نے فرمایا میں کتنے بھی انصاف سے بانٹوں ' معترض نہیں چوکیں گے ، اور بدگمانی کرنے کے گنہگار ہوں گے ۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے کوئی گنہگار ہو ۔

حق پرست اور حق شکن ہر جماعت ، ہر قوم اور ہر زمانے میں رہے ہیں ۔ جس خاندان سے یزید تھا اُسی خاندان سے حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے ، جنہوں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی یاد تازہ کردی تھی ۔

مطلق العنان بادشاہوں میں اچھے اور درویش صفت مسلمان ملتے ہیں ۔ علماء اور مشائخ نیک خصلت بادشاہوں کا ساتھ دیتے تھے ، بدخصلت

بادشاہوں کا ساتھ نہیں دیتے تھے، بدخصلت بادشاہوں کے معاون علماء سوء اور مشائخ سوء کہلاتے ہیں۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے بدخصلت حکام اور بدخصلت اُمراء کی علامتیں بتائی ہیں اور فرمایا ہے کہ ایسے حکام اور اُمراء سے مسلمانوں کو کبھی نہ کبھی سابقہ پڑے گا جو اُن کا ساتھ دے گا وہ اُن ہی جیسا ہو جائے گا اور جو ان سے دور رہے گا وہ نجات پائے گا۔ اُن کا ساتھ دینے والا میرا ساتھی نہیں ہے۔

ایک اور حدیث ہے کہ علماء، بادشاہوں سے خلط ملط نہ ہوں تو پیغمبر کے امانت دار ہیں اور خلط ملط ہوں تو اُنہوں نے امانت میں خیانت کی۔ ایسے علماء کے قریب مت جاؤ۔

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں "آدمی بھلا چنگا دین لے کر بادشاہوں کے یہاں جاتا ہے اور بے دین ہو کر واپس آتا ہے پھر وہ بادشاہوں کی رضا جوئی کے آگے اللہ کی خوشی ناخوشی کا دھیان نہیں رکھتا۔ حضرت فضیل رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں" عالم جس قدر بادشاہ کا قرب حاصل کرتا ہے اُسی قدر اللہ سے بعید ہو جاتا ہے"۔

حضرت وہب بن منبہ کہتے ہیں "جو علماء بادشاہوں کے پاس جاتے ہیں وہ مسلمانوں کو بادشاہ کے مصاحبوں سے زیادہ نقصان پہونچاتے ہیں"۔

حضرت محمد بن سلمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں" نجاست پر بیٹھی ہوئی مکھی اُس عالم سے بہتر ہے جو بدخصلت بادشاہوں کے ہاں آمد و رفت رکھتا ہے"۔

بڑے سخت اقوال ہیں۔ اس قدر سختی کا سبب حضرت امام غزالیؒ کے نزدیک یہ ہے کہ بادشاہوں کے ہاں جانے والوں میں بادشاہ کی نازیبا حرکات کو نازیبا کہنے کی ہمت نہیں ہوتی، اُنہیں از راہِ خوشامد نازیبا کو زیبا کہنا پڑتا ہے۔ حدیث ہے کہ جو شخص تونگروں کے ساتھ محض اُن کی تونگری کے باعث عاجزی وفروتنی برتتا ہے اُس کا دین ناقص ہو جاتا ہے۔ فقط ایسے لوگوں کا ادب کرنا چاہئے جو دینی اعتبار سے مستحقِ ادب ہوں۔ ان میں عادل حکمران شامل ہیں۔ ظالم کا سلام لینے کی بھی بعض بزرگانِ سلف نے ممانعت کی ہے، تاکہ اُسے محسوس ہو کہ ظلم اُسے ذلیل کرا رہا ہے۔ ظالم کو درازیٔ عمر کی دعا نہیں دی جا سکتی، کیونکہ اُس کی عمر کی درازی دورِ ظلم کی درازی ہے اپنے مخالفوں سے تو انسان بیزاری کا اظہار کرے اور اللہ کے مخالفوں سے رغبت رکھے، اسی کو کہتے ہیں کہ دل میں نورِ اسلام نہیں رہا۔ انسان احتساب نہ کر سکے تو کم از کم اللہ کے مخالفوں کا ہم نوا تو نہ بنے۔ احتساب بے شک دشوار کام ہے لیکن دربار داری کا کیا عذر ہو سکتا ہے اس قسم کی مثالیں بہت کم ہیں کہ دربار داری یا سرکاری عہدہ قبول کرنے پر کسی کو مجبور کیا گیا ہو۔

یہ حضرات امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریروں کا خلاصہ ہے۔ ہاں ایک بات اور سن لیجئے۔ مالدار ہونا اسلام کے نزدیک جرم نہیں ہے۔ خلفائے راشدین میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بڑے مالدار تھے۔ نیز جب یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام دولت کی تقسیم کا حامی ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ سب کی مالی حالت بالکل یکساں کر دی جائے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا اور ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ جرم ہے مال کے پیچھے اللہ کو بھول جانا۔ ناجائز طریقوں سے مالدار بننا اور مال پر سانپ کی طرح بیٹھ جانا۔ اُسے کنبے، قوم اور ملک کے لئے وقف نہ رکھنا، اور اللہ کے بتائے ہوئے کاموں پر خرچ نہ کرنا، مال کو معیارِ عزت سمجھنا۔ اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے بُرے مالداروں، بُرے حاکموں اور بُرے بادشاہوں کے متعلق ہے۔ اچھے مالداروں، اچھے حاکموں اور اچھے حاکموں کے متعلق نہیں ہے۔ بادشاہت اور ملوکیت بذاتِ خود خلافِ اسلام شے ہے۔ لیکن شمس الدین التمش اور عالمگیر اورنگ زیب جیسے بادشاہ اور ملوک ہوں تو اُنہیں مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے خیر بادشاہت تو اب تقریباً ہے ہی نہیں اور ہے تو ختم ہونے والی ہے۔

مال کو معیارِ عزت سمجھنے پر ایک واقعہ یاد آیا۔ حضرت جنید بغدادیؒ کے والد مالدار آدمی تھے اور حضرت جنید کے ماموں غریب تھے ایسے غریب کہ زکوٰۃ لیں۔ حضرت جنید ابھی کم عمر تھے۔ اور پڑھ رہے تھے۔ مکتب سے گھر تشریف لاتے تو دیکھا والد کچھ اُداس ہیں۔ حضرت جنید نے سبب دریافت کیا معلوم ہوا ماموں کو زکوٰۃ بھیجی تھی۔ انہوں نے واپس کر دی۔ حضرت جنید نے کہا "آپ اداس نہ ہوں میں ماموں کے پاس جاتا ———

ہوں۔ انشاء اللہ زکوٰۃ کی رقم لے لیں گے۔

حضرت جنید نے ماموں کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ عالم نے اللہ کے حکم کی تعمیل کردی اور زکوٰۃ نکال دی۔ آپ زکوٰۃ لے لیں تو آپ بھی اللہ کے حکم اور اللہ کے منشاء کی تعمیل کریں گے۔

گویا زکوٰۃ دینا اور زکوٰۃ لینا دنیا کے ڈرامے کے دو ایکٹنگ ہیں، کسی سے اللہ یہ پارٹ ادا کرا رہا ہے۔ اور کسی سے وہ کا ملدار ہونے اور زکوٰۃ دے سکنے کی کچھ اہمیت نہیں ہے۔ چنانچہ بتائیے حضرت جنید کے والد کا کیا نام تھا، اور حضرت جنید کے غریب ماموں حضرت سری سقطی تھے۔ اُنہیں ساری دنیا جانتی ہے اور اُن کی ساری دنیا عزت کرتی ہے۔ وہی حضرت جنید کے پیر بھی تھے۔

مال معیار عزت نہیں ہے۔ مال معیار عزت ہوتا تو حضرت عثمانؓ کی عزت حضرت ابوبکرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عمرؓ سے بڑھ جاتی۔

دلی میں جہاں خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کا مزار ہے اُس کے ارد گرد کی آبادی مہر ولی کہلاتی ہے جو بگڑ کر مہرولی ہو گئی ہے۔ آگے چلئے تو اولیا مسجد ہے، شمسی تالاب ہے، جھرنا ہے اور چہل تن چہل من کے مزارات ہیں۔ خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے زمانے کی بات ہے اولیا مسجد کے قریب شمسی تالاب کے کنارے چند اشخاص بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ ان میں حسن علاء سنجریؒ بھی تھے۔ خواجہ نظام الدین اولیاؒ چہل تن چہل من کے مزارات کی طرف جاتے ہوئے ان اشخاص کے پاس سے گزرے۔ حسن علاء سنجریؒ نے آوازہ کسا کہ حضرت! آپ شراب معرفت تو پیتے ہی ہیں، آئیے ذرا اس شراب کا مزا بھی چکھیے۔ خواجہ نظام الدین اولیا مسکرائے اور آگے بڑھ چلے گئے۔ واپس لوٹے تو حسن علاء سنجری کا حال بدل چکا تھا۔ حسن علاء سنجریؒ اُٹھے اور خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے قدموں میں لوٹنے لگے۔

خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے جانشین تو خواجہ نصیر الدین چراغ دہلیؒ ہیں، جنہوں نے اسلام کی اشاعت بے حد حساب کی تھی۔ لیکن خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے دو اور مرید بھی بہت مشہور ہیں۔ ایک امیر خسروؒ، دوسرے حسن علاء سنجریؒ، دونوں بڑے بلند پایہ شاعر اور انشاء پرداز تھے دونوں نے خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے ملفوظات جمع کئے ہیں اور حسن علاء سنجریؒ کے جمع کردہ ملفوظات کی کتاب "فوائد الفواد" امیر خسروؒ کی "افضل الفوائد" سے زیادہ مقبول ہے۔ حسن علاء سنجریؒ کا یہ شعر بھی ضرب المثل بن گیا ہے ؎

اے حسن توبہ آں زماں کردی　　　کہ ترا طاقت گناہ نہ ماند

توبہ عموماً بڑھاپے میں کی جاتی ہے، جوانی دیوانی میں کون توبہ کرتا ہے لیکن جوانی کی توبہ کا بڑھاپے کی توبہ مقابلہ نہیں کر سکتی، جوانی کی توبہ ملا تیہ نہ بھی دلائے تو کم از کم ایک سرور ضرور پیدا کر دیتی ہے۔ بڑھاپے کی توبہ میرے نزدیک اس شعر کی مصداق ہے ؎

حالیؔ سرور نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب　　　آئے ہو وقت صبح رہے رات بھر کہاں[1]

تاہم مرنے سے پہلے جب بھی توبہ کی توفیق مل جائے اللہ کا کرم ہے، اللہ سب کا انجام ایمان کے ساتھ فرمائے۔

---

[1] جناب شیخ کی توبہ کو کیا کہوں ماہرؔ
میں جانتا ہوں بڑھاپے کی پارسائی ہے

آغا صادق

فریبِ نظر

چند غنچوں کو سمجھتا ہے متاعِ گلشن
چند پژمردہ سے گل ہیں ترے نزدیک چمن

قطرۂ شبنمِ بے مایہ کو سمجھا دریا
ذرۂ خاک پہ ہے تجھ کو گمانِ صحرا

جھلملاتی ہوئی مشعل تو نہیں شعلۂ طور
ایک پردے کا سرکنا نہیں جلووں کا ظہور

سنگریزوں ہی پہ کرتا ہے قیاسِ کہسار
چند چھینٹے تو نہیں ابرِ تمنا کی پھوار

کچھ ادائیں تو نہیں آئینۂ حسن و جمال
چند غمزے تو نہیں جلوہ گہِ بزمِ وصال

چند لہروں کو سمندر تو نہیں کہہ سکتے
شمع کو مہرِ منور تو نہیں کہہ سکتے

چار کلیوں کی چٹک سازِ بہاراں تو نہیں
قہقہے چند، جوابِ غمِ دوراں تو نہیں

چار تنکوں کو نشیمن تو نہیں کہتے ہیں
دھجیوں کو سرِ دامن تو نہیں کہہ سکتے

ایک ہی نقش سے تصویر نہیں بن سکتی
ایک ہی نقطے سے تحریر نہیں بن سکتی

رنگِ افسانہ ہے کچھ اور حقیقت ہے کچھ اور
سنگِ بنیاد ہے کچھ اور عمارت ہے کچھ اور

سوئے پستی تری محدود نظر جاتی ہے
تیرے معراجِ تخیل پہ ہنسی آتی ہے

غزلیں

اتقی احمد ڈھولیوی (پروفیسر ایم جے کالج جلگاؤں)

بفیضِ چشمِ ساقی عام تھا گو اذنِ میخواری
بہ قدرِ ظرف پی لیتے نہ تھی اتنی بھی ہشیاری

ہجومِ شوق میں ایسی تھی دل پر بیخودی طاری
کہ ہوش شرمندگی تھا نہ احساسِ زیاں کاری

کہیں ایسا نہ ہو دل لذتِ آزار کھو بیٹھے
الٰہی ہو نہ جائیں وہ پشیمانِ جفا کاری

فغان و آہ و گریہ فخرؔ سب بے سود ہوتے ہیں
بجھاتے سے کبھی بجھتی نہیں الفت کی چنگاری

○

اختر سکندری

دلِ ناشاد کے بہلانے سے کیا ہوتا ہے
روح تشنہ ہو تو پیمانے سے کیا ہوتا ہے

منحصر قربت و دوری پہ نہیں ہے الفت
تم بچھڑ جاؤ تو بچھڑ جانے سے کیا ہوتا ہے

حسن پھر حسن ہے افسردہ ہو یا پژمردہ
پھول پھر پھول ہے مرجھانے سے کیا ہوتا ہے

جاں کی تشویش اگر ہے تو کنارہ ڈھونڈو
صرف طوفاں میں گھبرانے سے کیا ہوتا ہے

زخم کھلتے ہیں کبھی داغ چمک جاتے ہیں
کیا بتائیں کہ بہار آنے سے کیا ہوتا ہے

کوئی مقصد بھی تو پہچانئے اہلِ جنوں!
بے سبب دار پہ چڑھ جانے سے کیا ہوتا ہے

میرے ناداں کو مغموم بنانے والے
اب تری زلف بکھر جانے سے کیا ہوتا ہے

مشورہ ترکِ محبت کا نہ دیجئے دل کو
ایسے ناداں کو سمجھانے سے کیا ہوتا ہے

کام کچھ کر کے دکھاؤ تو بنے بات اخترؔ
نام زندہ ہو تو مر جانے سے کیا ہوتا ہے

...ح زیدی:—

زینتِ عالمِ امکاں ہے ہمارے دم سے　　یہ چمن جانِ بہاراں ہے ہمارے دم سے
شکوہ سنجِ غم بے نام نہیں ہیں ہم لوگ　　شہرتِ گردشِ دوراں ہے ہمارے دم سے
صرف ہم ہی نہیں حالاتِ پریشاں کا شکار　　زلفِ گیتی بھی پریشاں ہے ہمارے دم سے
دیکھنے روز ہمیں اہلِ چمن آتے ہیں　　آج بھی رونقِ زنداں ہے ہمارے دم سے
ہم سے ہے یکرنگی و عدل و ایثار　　جنسِ کمیاب بھی ارزاں ہے ہمارے دم سے

واقعہ ہے کہ فسانہ یہی سنتے ہیں عروج
گرمیِ محفل یاراں ہے ہمارے دم سے

...ید احسن:—

آؤ کہ ہمیں بادِ صبا ہو کے چلے ہیں　　کلیوں کے چٹکنے کی صدا ہو کے چلے ہیں
اے داورِ حشر! اُن کی بھی حسرت کی ملے داد　　جو لوگ زمانہ سے خفا ہو کے چلے ہیں
اک تم کہ رہے وقت کی آواز کے تابع　　اک ہم کہ انا الحق کی صدا ہو کے چلے ہیں

...لم شیرازی:—

راہبرں کو رہنما کہ دوں مرے بس میں نہیں　　بادِ صرصر کو صبا کہ دوں مرے بس میں نہیں
پھونک ڈالیں باغباں اپنا چمن خود اور میں　　اس کو قسمت کی رضا کہ دوں مرے بس میں نہیں
دیکھ کر کشتی بھنور میں جو کنارے پہ ہنسیں　　اُن کو اپنا ناخدا کہ دوں مرے بس میں نہیں
رہزنوں کے قافلوں کی گھنٹیاں بجتی ہوں جب　　میں اسے بانگِ درا کہ دوں مرے بس میں نہیں

...لم ادیب:—

دہر جز خرمنِ اُمید نہیں ہے اے دوست　　شبنم آئینہ خورشید نہیں ہے اے دوست
حسنِ کردار ہے خود اپنی جگہ رنگینی　　زہد جذبات کی تردید نہیں ہے اے دوست
اس کی بنیاد فقط ایک نفس، ایک نفس　　زندگی محکم و جاوید نہیں ہے اے دوست
منصبِ کامل کو کہاں فرصتِ برہان و دلیل　　عشق محتاجِ اسانید نہیں ہے اے دوست
علم محروم یقیں ہو تو نہ دنیا ہے نہ دیں　　مشورہ ہے مرا تہدید نہیں ہے اے دوست

...ہر القادری:

یوسفی گر نہیں ممکن تو زلیخائی کر　　اُن سے پیدا کوئی تقریبِ شناسائی کر
پہلے ہر غم کی محبت میں پذیرائی کر　　چاک پھر دامنِ تمکین و شکیبائی کر
روبرو اُن کے مرا حال سنانے والے　　اپنی جانب سے بھی کچھ حاشیہ آرائی کر
نہ تمنا نہ تری یاد، نہ غم ہو نہ خوشی　　کبھی ایسا بھی عطا عالمِ تنہائی کر
میری قسمت میں ہیں پتھر تری قسمت میں ہیں پھول　　اپنی شہرت سے نہ اندازۂ رسوائی کر

سب مرے حالِ پریشاں کا اُڑاتے ہیں مذاق
اے غمِ دوست! مری حوصلہ افزائی کر

ہماری نظر میں

ترجمہ قرآن مؤلفہ :- مولانا محمد آصف قاسمی ، دس کتابیں ، ایک کتاب کا ہدیہ ۵۰ پیسے ، ہدیہ مکمل سیٹ غیر مجلد پانچ روپے مجلد سات روپے ، ملنے کا پتہ :- کتب خانہ قاسمی سی ۱/- ۱۵ الطاہر منزل ، ناظم آباد کراچی (فون- ۶۱۳۹۴)

جناب مولانا محمد آصف قاسمی نے غیر عربی داں طالب علموں اور ناظرہ خوانوں کے لئے "ترجمہ قرآن" کا یہ سلسلہ بالکل نئے انداز پر مرتب فرمایا ہے ، انہوں نے لکھا ہے کہ :-

"قرآن کریم میں تقریباً اسی ہزار الفاظ ہیں۔ مگر "اصل الفاظ" کل دو ہزار ہیں جو بار بار آنے کی وجہ سے اسی ہزار کی تعداد تک پہنچتے ہیں ، ان دو ہزار الفاظ میں تقریباً پانسو الفاظ وہ ہیں ، جو اردو میں روز مرہ (تلفظاً اور رسم الخط کے معمولی فرق کے ساتھ بولے اور سمجھے جاتے ہیں) اس لئے ہم پورے یقین کے ساتھ یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ قرآن کریم ایک وہ آسان ترین مقدس کتاب ہے ، جس کو بڑی آسانی اور سہولت سے پڑھا جاسکتا ہے اور جس سے عمل کرنے کی راہیں آسان ہو سکتی ہیں ۔ ۔ ۔ "

" ۔ ۔ ۔ اگر ان دس کتابوں کو اسکول کی ابتدائی جماعتوں سے شروع کیا جائے تو چند برسوں میں بچے ترجمہ کے ساتھ قرآن کریم کو ختم کر سکتے ہیں ؟"

فاضل مولف نے آگے چل کر بتایا ہے کہ —— "ابتدا کے چند سیپاروں کے بعد بتدریج بنیادی الفاظ کم ہوتے جاتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ چند سیپاروں کے بعد بعض سیپاروں میں تو پندرہ ، بیس الفاظ ہی ایسے ہیں ، جو نئے ہیں ، باقی سب کے سب پڑھے ہوتے ہیں ۔ ۔ " مثلاً پہلے پارہ (الٓمٓ) میں ۶۵۳ نئے الفاظ ہیں مگر بیسویں پارہ (امّن خلق) میں نئے الفاظ کی تعداد انیس (۱۹) رہ جاتی ہے۔

"ترجمہ قرآن" کی پہلی کتاب میں ۷۰ قرآنی الفاظ معنی کے ساتھ درج کئے گئے ہیں ، اور یہ وہ الفاظ (مثلاً —— اولٰئک کذٰلک ، الذین ، قال ، قبلَ ، انّ ، غیر ، حتیٰ ، کنّ ، ھم ، قد ۔ ۔ ۔ وغیرہ) ہیں ، جو قرآن کریم میں بار بار آئے ہیں۔ ترجمہ کا نمونہ :-

الّا	ممّا	عمّا	عسٰی
مگر - سوائے	جو کچھ	اس سے - جو کچھ	شاید

دوسری کتابوں کے ترجمہ کا نمونہ :-

یعلمون —— وہ سکھاتے تھے - شَرَوْا —— انہوں نے بیچ دیا —— سُئل - سوال کیا گیا - قٰنتون - ادب سے جھکے ہوئے ——

ما کان لهم ۔ مناسب نہیں تھا اُن کے لئے ــــ کن فیکون ۔ ہو جا پس وہ ہو جاتا ہے ۔

کوئی شک نہیں الفاظ کے ترجمے عام فہم ہیں، اور مولانا آصف قاسمی صاحب نے بڑی محنت، دیدہ وری اور بصیرت سے کام لیا ہے مگر کہیں کہیں کھٹک بھی پیدا ہوئی ۔

چوتھی کتاب :ــــ صفحہ ۵ ۔ لِمَ تقتلون ۔ تم قتل کیوں کرتے تھے، اس میں متن یا ترجمہ میں کتابت کی غلطی رہ گئی ہے ــــ

او ننسہا ۔ جو کچھ ہم نے بھلوا دیا ہے (صفحہ ۷) "بھلوا دیا" اُردو زبان و قواعد کے اعتبار سے درست نہیں ہے، "اُٹھانے" سے "اٹھوانا" اور کہنے سے "کہلوانا" جس طرح اردو میں بولا اور اشتقاق کیا جاتا ہے، اسی طرح "بھلانے" سے "بھلوانا" نہیں بولا جاتا ۔ اس (ننسہا) کا سیدھا سادہ ترجمہ ہے ــــ بھلا دیتے ہیں !

پانچویں کتاب ۔ صفحہ ۱ ۔ " الحرمات قصاص ــــ عزت رکھنے میں برابری ہے ــــ یہ ترجمہ واضح نہیں ہے ۔ " تمام حرمتوں کا لحاظ برابری کے ساتھ " واضح تر اور عام فہم ترجمہ ہے ــــ " حلیمٌ " کا ترجمہ " برداشت کرنے والا ہے " (صفحہ ۹) کیا گیا ہے، موزوں تر ترجمہ ــــ " بردبار " ہے !

چھٹی کتاب ۔ صفحہ ۵ ۔ الخیل المسومۃ ۔ پلے ہوئے گھوڑے (صفحہ ۵) " مسومۃ " پلے ہوئے " کو نہیں " نشان زدہ " کو کہتے ہیں اور نشان پسندیدہ اور منتخب گھوڑوں پر لگائے جاتے ہیں" اس لئے " الخیل المسومۃ " کا ترجمہ " صاحب تفہیم القرآن " (مولانا مودودی) نے " چیدہ گھوڑے " کیا ہے ــــ " حصوراً " ۔ پاکباز ــــ (صفحہ ۷) عربی میں " حصور " اس شخص کو کہتے ہیں جو قدرت رکھنے کے باوجود عورت سے دور رہے " یعنی جماع سے پرہیز کرے " " پاکباز " تو اپنی بیوی سے لطف اندوز ہوتا ہے، اس لئے اس لفظ (حصوراً) کا ترجمہ " ضبط کرنے والا ہونا چاہیے ! ــــ حنیفاً مسلماً ۔ خداپرست مسلمان (صفحہ ۸) مسلمان تو خداپرست ہی ہوتا ہے، اس کا ترجمہ " تفہیم القرآن " میں " مسلم یک سو " کیا گیا ہے، یعنی وہ مسلمان جو سب سے کٹ کر اور مڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف " یکسو " ہو گیا ہو ۔

" عاشروھنّ " عورتوں کے ساتھ اچھی گزر کرو ــــ (صفحہ ۱۴ ۔ چھٹی کتاب) " اچھی گزر کرو " یہ کمزور انداز بیان و زبان ہے ــــ " اُن کے ساتھ بھلے طریق سے زندگی گزارو " (تفہیم القرآن) یہ ترجمہ اقرب الی المتن ہے ۔

ساتویں کتاب ــــ " قتر ولا ذلۃ " کدورت اور نہ ذلت ــــ (صفحہ ۱۳) " کدورت " تو دل کی کیفیت سے تعلق رکھتی ہے، یہاں " قتر " کا ترجمہ " روسیاہی " موزوں تر ہے ۔

آٹھویں کتاب ۔ " اذقان " ــــ ٹھوڑیاں ــــ (صفحہ ۱) غالباً یہ کتابت کی غلطی ہے، کہ " ٹھوڑیاں " کی بجائے " ٹھوڑیاں " چھپ گیا ۔ " ایقاضاً " (صفحہ ۵) یہ بھی کتابت کی غلطی ہے ــــ " ایقاظاً " (ض نہیں ظ کے ساتھ) صحیح املا ہے ۔ " البدن " ــــ کعبہ کی نیاز جانور (صفحہ ۱) میں " کا " رہ گیا (کعبہ کی نیاز کا جانور) ــــ " فار التنور " تنور ابل پڑے (صفحہ ۱۳) " تنور ابل پڑا " ترجمہ ہونا چاہیے، تنور کی جمع کا یہاں کوئی محل نہیں ہے ــــ صفحہ ۱۵ پر " خاضعین " کا ترجمہ چھوٹ گیا ۔

نویں کتاب ۔ تلّہ للجبین " اس کو ماتھے کے بل پچھاڑ دیا (صفحہ ۵) ڈپٹی نذیر احمد نے " پچھاڑ دیا " ہی ترجمہ کیا ہے مگر " پچھاڑنے " میں دوسری طرف سے مزاحمت " کا پہلو بھی نکلتا ہے، حضرت مولانا شاہ عبدالقادر دہلوی نے " گرا دیا " ترجمہ فرمایا ہے اور یہی درست ہے " ۔ من یعش " ۔ جو اندھا بن جائے (صفحہ ۸) اصل آیت یوں ہے : ۔ ومن یعش عن ذکر الرحمٰن (الزخرف) اس کا ترجمہ یوں کرنا چاہیے ــــ جو اللہ کے ذکر سے اعراض برتتا ہے یا جان کر کنی کاٹتا اور کتراتا ہے " " اندھے بننے " کا مفہوم یہاں

پیدا نہیں ہوتا

" لیغیظ بھم الکفار " ۔۔ تاکہ وہ اُس سے کافروں کو چلائے " (صفحہ ۹) کاتب صاحب نے " جلائے " کے " ج " پر دو نقطے لگا کر " چلائے " بنا دیا۔

دسویں کتاب ۔ " فی احسن تقویم " ۔ بہترین سانچوں میں ڈھالا ہے " (صفحہ ۷) سانچے کی بجائے جمع (سانچوں) لانے کی کیا ضرورت تھی ۔۔۔ " فی تضلیل " غلطی میں کر دیا (صفحہ ۹) یہ ترجمہ زبان و بیان اور سیاق و سباق کے اعتبار سے درست نہیں ہے " غلط کر دیا " ترجمہ ہونا چاہئے۔ الم یجعل کیدھم فی تضلیل ۔ کیا نہیں کر دیا ان کا داؤ غلط (حضرت شیخ الہند)

" کفوا احد " ۔۔ کوئی اُس کے برابر نہیں (صفحہ ۱۰) " کوئی اُس کے جوڑ کا نہیں " یہ ترجمہ بہتر ہے ۔ " شر النفثٰت " پڑھ کر پھونکنے والیوں کے شر سے " (صفحہ ۱۰) یہ کتابت کی غلطی ہے کہ " پھونکنے والیوں کو " (" پ " کے دو نقطے حذف کر کے) " بھونکنے والیوں " بنا دیا ۔۔۔ " غضب " کا ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی اُردو جاننے والے " غضب " کے معنی سمجھتے ہیں، غضب کا ترجمہ " غصہ " انسانی صفت ہے (تیسری کتاب ۔ صفحہ ۱۵)

مولانا آصف قاسمی صاحب کی محنت و عرقریزی اور اس سلسلہ ترجمہ کی افادیت اپنی جگہ مسلّم ہے، ان کتابوں کی مدد سے قرآن کریم کے معنی سمجھنے میں خاصی مدد ملے گی ۔ اللہ تعالیٰ مولف کو دارین میں اس کی جزا عطا فرمائے گا !

مولانا قاسمی صاحب نے جس بڑے پیمانے پر اس کام کا آغاز کیا ہے اور جو عظیم منصوبہ اُن کے پیش نظر ہے، اُس کے لحاظ سے ہماری تمنا اور گذارش ہے کہ قابل اعتماد علماء کا ایک بورڈ اگر ان " کتابوں " پر نظر ثانی کی ذمہ داری قبول کر لے، تو نظر ثانی کے بعد یہ " کتابیں " خوب سے خوب تر بن جائیں گی !

اسلام کا نظامِ محاصل

ترجمہ :۔ کتاب الخراج (مصنفہ قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ) مترجم :۔ نجات اللہ صدیقی، ضخامت ۴۳۲ صفحات، قیمت اعلیٰ ایڈیشن پلاسٹک کور کے ساتھ بارہ روپے پچاس پیسے سستا ایڈیشن آٹھ روپے، ملنے کا پتہ :۔ مکتبہ چراغ راہ، آرام باغ روڈ، کراچی

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فقہ حنفی کے بہت بڑے ستون ہیں اور اپنے استاد امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی مانند " مجتہد مطلق " کے منصب عالی پر فائز ہیں، اُن کے اجتہادات نے فقہ حنفی کو جلا دی ہے، امام موصوف کی تالیف " کتاب الخراج " قانون و شریعت کی دنیا میں بین الاقوامی شہرت رکھتی ہے، اس کتاب کے فرانسیسی، اطالوی، روسی اور ترکی زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں !

" کتاب الخراج " کا اردو ترجمہ جناب نجات اللہ صدیقی نے کیا ہے اور ایمان کی بات یہ ہے کہ ترجمہ کا حق ادا کر دیا ہے، زبان آسان و عام فہم اور انداز بیان شستہ اور موضوع فقہ کے شایان شان ہے ! اس کتاب پر فاضل مترجم نے جو مقدمہ لکھا ہے اور صاحب " کتاب الخراج " کے سوانح حالات جس انداز میں مرتب کئے ہیں وہ ان کے علمی تبحر، دینی بصیرت، طہارت فکر اور وسعت مطالعہ کی گواہی دے رہے ہیں !

نجات اللہ صدیقی سیرت و کردار، دینی معلومات اور عزیمت و استقامت کے اعتبار سے قابل ذکر شخصیت ہیں وہ جس ماحول میں بستے ہیں وہاں ناسازگار حالات اور طرح طرح کے خطرات کے باوجود اقامت دین اور تبلیغ حق کا فرض ادا کر رہے ہیں اور انہوں نے آندھیوں میں اللہ کے دین کے چراغ کو روشن کر رکھا ہے ۔ اللہ تعالیٰ ان کی مدد اور حفاظت فرمائے ۔

" کتاب الخراج " کی وجہ تالیف کیا ہے ؟ اس کا جواب فاضل مترجم کی زبان خامہ سے سنئے :۔

" یہ کتاب دراصل ایک طویل یادداشت ہے جو قاضی القضاۃ ابو یوسفؒ نے خلیفہ ہارون الرشید

(۱۷۰ھ ــ ۱۹۳ھ / ۷۸۶ء ــ ۸۰۹ء) کے لیے لکھی تھی، ہارون الرشید نے خلیفہ ہونے کے بعد رعایا پر نرمی کرنے اور عدل کے ساتھ شریعت کے مطابق حکمرانی کرنے کا ارادہ کیا اور اس سلسلہ میں قاضی صاحب سے رہنمائی چاہی، جیسا کہ خود اس کتاب میں متعدد مقامات پر ذکر آیا ہے، اس نے مختلف انتظامی اور مالی امور سے متعلق سوالات کئے تھے اور نظام محاصل کے بارے میں شریعت کے ضوابط دریافت کئے تھے . . . . . "

امام ابو یوسفؒ پر بعض اکابر نے تنقیدیں بھی کی ہیں مگر اُن کے مناقب و محاسن کا پلہ بھاری ہے، فاضل مترجم نے حضرت امام کے "مناقب و محاسن" کے باب کا آغاز ان لفظوں سے کیا ہے۔

"تقویٰ اور خوفِ آخرت کے آثار آپ کی پوری زندگی میں پائے جاتے تھے . . . . آپ میں وہ جرأت و بے باکی بھی موجود تھی جو ہمیشہ علماءِ حق کا شعار رہا ہے . . . . . "

لائق مترجم نے لکھا ہے :۔

"تاریخ کی کتابوں میں امام ابو یوسفؒ کی طرف بعض ایسے حیلے منسوب کئے گئے ہیں، جن کی اُن کی طرف نسبت صحیح نہیں ہے"

اس سلسلہ میں موصوف نے استاد ابو زہرہ کی تحقیق کا اقتباس نقل کیا ہے ۔

"متقدمین احناف کی طرف جن حیلوں کی نسبت صحیح ہو سکتی ہے وہ ایسے حیلے نہیں ہیں جن سے کسی ایسی چیز کا جائز کرنا مقصود ہو جو فی نفسہ حرام ہے ان حیلوں کا ذریعہ مباح طریقہ سے دفعِ ظلم یا حصولِ حق چاہا گیا ہے، اگرچہ یہ طریقے شرع میں ان مقاصد کے لئے نہیں وضع کئے گئے تھے "

زبان و روزمرہ میں محتاط رہنے کے باوجود بعض مقامات پر فاضل مترجم کا اشہبِ خامہ ادھر اُدھر ہو گیا ـــــ "ساز و سامان اور اسلحے" (صفحہ ۳۴۱) اردو میں "اسلحہ" جمع کی حالت میں بھی واحد بولا جاتا ہے، یوں :۔

"پاکستان نے بیرونی ممالک سے اسلحہ منگوایا ہے"

"اسلحے" نہ بولا جاتا ہے اور نہ لکھا جاتا ہے۔ "اُسے کوئی دفینہ ہاتھ لگے تو پورا کا پورا اُسی کا مالک ہو گا" (صفحہ ۱۵۴) یہ جملہ یوں ہونا چاہیے "اُسے کوئی دفینہ ہاتھ لگے تو پورے کا پورا اُسی کی ملک ہو گا" گمان غالب یہ ہے کہ کتابت کی غلطی کے سبب یہ جملہ اس طرح چھپ گیا ۔

"ایک سال پہلے کوفہ کی لگان دس کروڑ درہم تک ہو گئی تھی" (صفحہ ۱۶۳) "لگان" بالاتفاق مذکر ہے ـــــ "اُس پر چادریں ڈھنکی ہوئی تھیں" (صفحہ ۳۱۲) "ڈھکی ہوئی" صحیح املا ہے "ن" اس حالت میں حذف کر دیا جاتا ہے، جس طرح "بانٹنا" سے "بٹی ہوئی" بولا اور لکھا جاتا ہے ـــــ "اسلحہ جات اور اشیاء خوراک سے اس کی مدد کرتا ہے" (صفحہ ۵۶۹) "اسلحہ" کی جمع الجمع (اسلحہ جات) بنانا غلط ہے !

"کتاب الخراج" کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ابو یوسفؒ نے حضرت امام اعظمؒ سے متعدد مسئلوں میں اختلاف کیا ہے مگر افسوس ہے کہ جیسا جیسا زمانہ گزرتا گیا، "تقلید" میں شدت پیدا ہوتی چلی گئی اور آج متشدد علماء احناف اپنے ائمہ کے کسی اجتہاد و رائے سے اختلاف تو کیا ترجیح تک کو برداشت نہیں کر سکتے ۔

زمین کی ملکیت اور اُسے ذیلی مزارعین کو کاشت کرنے کے لئے اٹھانا "کتاب الخراج" سے جائز ثابت ہوتا ہے اور "مرتد" کی سزا کے لئے "قتل" کا حکم بھی یہ کتاب ثابت کرتی ہے۔

فاضل مترجم کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے، انہوں نے اس عظیم کتاب کا رواں اور شستہ ترجمہ کر کے دین و شریعت کی قابل قدر خدمت انجام دی ہے۔ مقدمہ، فہرست مضامین، حواشی اور ساتھ کس نے اس کتاب کو اور زیادہ مفید و کارآمد اور سہل الفہم بنا دیا ہے۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے کس جرأت ایمانی کے ساتھ اُس دور کے سب سے بڑے مطلق العنان فرمانروا کو مخاطب فرمایا ہے۔

"عمارت اگر تقویٰ کے سوا کسی اور چیز پہ کھڑی کی گئی تو عجب نہیں کہ اللہ اس کو بنیادوں سے اکھاڑ کر اس کے معمار اور اس کے مددگاروں کے سر پہ گرا دے! آگاہ! اللہ نے اس رعیت کے جو کام آپ کے سپرد کئے ہیں انہیں خراب نہ کریں ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ آپ کجروی اختیار نہ کریں، ورنہ آپ کی رعایا بھی راہِ راست سے ہٹ جائے گی جب آپ کے سامنے دو راہیں ہوں، جن میں سے ایک آخرت کی فلاح تک پہونچاتی ہو اور دوسری دنیا کے متاع تک تو آخرت کی راہ کو دنیا کی راہ پر ترجیح دیجئے، کیونکہ آخرت ہمیشہ باقی رہے گی اور دنیا دارِ فانی ہے ---"

کیا موجودہ دور کے مسلمان حکمران اس آئینہ میں اپنی سیرت و کردار کے خدوخال دیکھنے کی زحمت گوارا کریں گے۔ کاش ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !!

ملفوظات اشرفیہ از :- حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، ضخامت ۴۸ صفحات، سات پیسے کے ٹکٹ بھیج کر انجمن فلاح المسلمین کاغذی بازار، کراچی ۲ سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

اس کتابچہ میں حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے بعض ملفوظات کو مدون کیا گیا ہے، جن کے مطالعہ سے دینی شغف، خدا کا خوف اور تزکیۂ نفس کا احساس بیدار ہوتا ہے، صرف اس ایک اقتباس سے کتاب کی افادیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

"آج کل خود تحقیقات ہی کو مقصود بالذات بنا رکھا ہے، ان ہی تحقیقات کی تکمیل کے لئے احکام کی حکمتیں تلاش کی جاتی ہیں، بعض کی ساری عمر ان ہی زوائد میں ختم ہو جاتی ہے، عمل کرنے کی ایک حکم پر بھی نوبت نہیں آتی، حالانکہ اصل مقصود کام ہے یعنی نفس کی اصلاح اور اعمال کی خبرگیری مگر مقصود کو چھوڑ کر غیر مقصود کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں ۔ ۔ ۔"

صفحہ ۴ پر اس شعر۔

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد — مرعسس را دید و درخانہ نہ شد

کے ترجمہ کی بجائے کسی دوسرے شعر کا ترجمہ چھپ گیا۔

ایک دو جگہ ایسی مثالیں بھی نظر آئیں جو کتاب کی ثقاہت و سنجیدگی سے میل نہیں کھاتیں، مجموعی طور پر یہ کتابچہ دینی افادیت کا حامل ہے۔

FREMASONARY از :- مصباح الاسلام فاروقی، ضخامت ۴۶ صفحات اعلیٰ ایڈیشن قیمت دو روپے ۲۵ پیسے

A CRITICAL STUDY سستا ایڈیشن، ایک روپیہ ۲۵ پیسے

ملنے کا پتہ :- آئی، جی ۶/۳ پوسٹ بکس ۲۱۸۹، ناظم آباد کراچی۔

فری میسن تنظیم اب تک ایک پُراسرار تنظیم اور خفیہ ادارہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ جس کے بارے میں مختلف قسم کی متضاد باتیں مشہور ،، جناب مصباح الاسلام فاروقی کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے، انہوں نے پوری تحقیق کے بعد اس تنظیم کو بے نقاب کیا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے یح چہرہ پر پوری طرح ننگا کر دیا ہے۔

یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے جن میں بتایا گیا ہے کہ فری میسن کا مذہب کیا ہے؟ یہ تنظیم "خدا" کے بارے میں کیا تصور رکھتی ہے؟ فری میسن تنظیم کی ذمہ داریاں اور "عہد و قسم" کیا نوعیت رکھتے ہیں؟ فری میسن ادارے سیاسیات کو کس طرح متاثر کرتا ہے۔ اس کی کیا سرگرمیاں ہیں؟ فری میسن کی خیرات اور رفاہی خدمات کا مقصد صرف اپنی تنظیم کو تقویت دینا ہوتا ہے۔ فری میسن کی امات اور رسوم کیا ہیں؟ اور ان کا جھنڈا (F L A G) دراصل اسرائیلی جھنڈا ہے۔

فاضل مصنف نے جو بات بھی کہی ہے مستند کتابوں کے حوالوں کے ساتھ کہی ہے۔ انہوں نے اپنی اس کتاب میں فری میسن تنظیم کے کسی گوشہ کو ی مستور اور نقاب پوش نہیں رہنے دیا۔ ان کی اس عالمانہ تحقیق اور منصفانہ تجزیہ و تحلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ فری میسن دراصل ایک ہودی تنظیم ہے، جس کی غرض و غایت یہ ہے کہ مسلم معاشرے کو داخلی طور پر منتشر اور تباہ کر دیا جائے!

حیرت ہے کہ پاکستان کی حکومت فری میسن تنظیم کے مقاصد اور اس کی سرگرمیوں سے بے خبر ہے اور باخبر ہے تو اس تنظیم کو اس ے آزادی کس طرح دے رکھی ہے، بہر حال اس کتاب نے حکومت کے ارباب حل و عقد کو اس کا موقعہ بہم پہونچا یا ہے کہ فری میسن تنظیم خطرناکیوں کا سدباب کرنے کے لئے موثر قدم اٹھائیں اور اپنی قوت احتساب کو کام میں لائیں، پاکستان کے عوام کو چاہیے کہ وہ اس یہودی فتنہ سے خبر رہیں اور جو حضرات غلط فہمی اور ناواقفیت کی بنا پر اس فتنہ میں مبتلا ہو گئے ہیں وہ اس سے قطع تعلق کر لیں!

جناب مصباح الاسلام فاروقی کی یہ کتاب ایسے وقت پر شائع ہوئی ہے جب یہودیت اسلام اور مسلمانوں کو مٹانے اور زک پہونچانے کے لئے کھل کر میدان میں آگئی ہے، فاروقی صاحب اس علمی تحقیق پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔

مسلمان کا سفرِ آخرت

از :- مولانا حکیم محمد صادق سیالکوٹی، ضخامت ۱۰۰ صفحات،

ملنے کا پتہ :- دائرۃ التبلیغ پورہ ہیراں، سیالکوٹ شہر

مولانا حکیم محمد صادق صاحب سیالکوٹی بہت سی دینی کتابوں کے مصنف اور مؤلف ہیں، صاحب موصوف مسلمانوں کی اصلاح کا بے پاہ جذبہ اپنے اندر رکھتے ہیں اور یہی جذبہ ان کی تصانیف اور تالیفات کا محرک ہے۔

اس کتاب میں انہوں نے مریض کی عیادت، نزع، موت، ــــــ جنازہ میں شرکت وغیرہ کے آداب و مسائل بڑی شرح و بسط کے ساتھ ین کئے ہیں۔ جنہیں پڑھ کر آخرت کی یاد آتی ہے، اور دل میں خوفِ خدا پیدا ہوتا ہے، پوری کتاب میں اکبر الہ آبادی کے اس شعر کی معنویت جھلکتی ہے

طبیعت اس تصور سے بہت مایوس ہوتی ہے
کہ بے یادِ خدا بھی زندگی محسوس ہوتی ہے

قرآن، احادیث، اور آثارِ صحابہؓ ان مسائل کے ماخذ ہیں۔ زبان عام فہم اور اندازِ بیان سادہ اور دل نشین ہے۔

"اور اس نے دنیا میں گزاری ہوئی زندگی کے ایک ایک لمحہ کا حساب دینا ہے (صفحہ ۱۶)" "اس نے" کی بجائے "اسے" یا "اس کو" لکھنا چاہیے تھا۔ "اور کئی رواج اپنائے ہوئے ہیں" (صفحہ ۲۱) ایسے موقعوں پر "بعض" یا "متعدد" لکھتے ہیں۔ "دلوں کی بھید اور سینے کے خطرات" (صفحہ ۴۲) "بھید" بالاتفاق مذکر ہے۔ "جو شاعرانہ نکتہ نظر سے بڑا ہی موزوں ہے" (صفحہ ۹۰) "نکتہ نظر" غلط ہے "نقطہ نظر" کا محل تھا۔ "اللہ کے نام کے ساتھ افسوں پڑھتا ہوں" (صفحہ ۱۰۲) "ارقیک" کا ترجمہ "افسوں پڑھتا ہوں" درست نہیں۔ "افسوں" میں ذم پایا

جاتا ہے" اللہ کا نام پڑھ کر دم کرتا ہوں یا پھونکتا ہوں" لکھنا تھا۔

"انہوں نے حضرت خبیب کو سولی دے دیا" (صفحہ ۱۱۱) "سولی دے دی" صحیح زبان ہے۔ "لیکن وہ عورت دروازے پر جم رہی" (صفحہ ۱۵۰) "جم رہی" زبان و روزمرہ کے اعتبار سے محل نظر ہے ۔۔۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی بھائی ہیں" (صفحہ ۱۸) یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے کہ "رضاعی" کی جگہ "رضائی" چھپ گیا ۔۔۔ "ملک الموت انسانی صورت میں شپا شپ اندر آکر کہنے لگا" (۱۳۱) "شپا شپ" کا یہاں کیا محل تھا، اس قسم کی غلطیاں وجدان اور ذوق کے لئے ناقابل برداشت ہوتی ہیں۔

وہ مالک ہے سب اس کے آگے لاچار

نہیں کوئی اس کے گھر کا مختار (صفحہ ۱۴۴)

یہ ناموزوں اور بے تکا شعر حیرت ہے کہ فاضل مولف کے قلم سے کیسے نکل گیا۔

بعض ایسی روایتیں بھی اس کتاب میں درج کی گئی ہیں جن میں تھوڑے سے عمل خیر پر بے اندازہ اجر و ثواب کا ذکر آیا ہے ۔۔۔ نیز حدیث کے نقطۂ نگاہ سے ایسی روایتیں مقبول نہیں ہیں۔

مولانا محمد صادق سیالکوٹی اہل حدیث ہیں اس لئے جگہ جگہ شرعی مسائل میں اسی مسلک کو پیش کیا ہے ہر مسئلہ میں اُن کے اس مسلک سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا ؛

کتاب خلوص و دردمندی کے ساتھ مرتب کی گئی ہے جس کا اجر صاحب تالیف کو ملے گا۔

العقیدۃ السنیۃ

مؤلف:۔ مولانا محمد اویس الندوی، ضخامت ۸۰ صفحات (ٹائپ پر) قیمت دو روپے۔

ملنے کا پتہ :۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ (یو۔پی انڈیا)

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمتہ اللہ علیہ کی کتاب "العقیدہ الحسنہ" کی شرح حضرت مولانا محمد اویس ندوی نے عربی زبان میں کی ہے، اس شرح و بیان میں مولانا موصوف نے امام ابن تیمیہ، امام ابن القیم اور حضرت شاہ ولی اللہ کی تالیفات سے استفادہ کیا ہے ؛

اس کتاب پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ نے فاضلانہ اور عالمانہ مقدمہ اپنے خاص انداز میں لکھا ہے جو بار بار پڑھے جانے کے قابل ہے۔

"العقیدۃ السنیۃ" میں نہایت نازک و دقیق کلامی مسائل و عقائد سے بحث کی گئی ہے اور وہ مسائل جن پر ضخیم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اُن کا خلاصہ تھوڑے سے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لئے جہت، استوا، نفس، ضحک، ید وغیرہ اصطلاحات کا جہاں تک تعلق ہے امام ابن تیمیہ اور اُن کے قابل فخر شاگرد علامہ ابن القیم کا مسلک اہل تنزیہ کے نزدیک محل نظر ہے اور اُس کو جوں کا توں قبول نہیں کیا جا سکتا۔

یہ کتاب اس قابل ہے کہ اس کا اردو میں ترجمہ کیا جائے اور مولانا اویس ندوی کی "شرح" پر مزید حاشیہ لکھا جائے تاکہ اہل سنت والجماعت کا مسلکِ حق واضح طور پر عوام و خواص سب کے سامنے آجائے۔

القرآۃ الراشدہ (حصہ سوم)

تالیف :۔ مولانا سید ابوالحسن علی الحسنی الندوی، ضخامت ۸۸ صفحات، قیمت دو روپے ۶۲ پیسے

ملنے کا پتہ :۔ خلیلیہ بک ڈپو ٹونک (راجستھان۔ بھارت)

مدارس اسلامیہ کے طلباء کے لئے حضرت مولانا علی میاں مدظلہٗ نے یہ نصاب مرتب کیا ہے، مقصد یہ ہے کہ دینی فکر کے ساتھ عربی

زبان سے طلباء کو مناسبت پیدا ہوتی چلی جائے!

کتاب کا آغاز "الحیاۃ فی مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم" سے ہوتا ہے اور کتاب کے آخری باب (شعر ــ حکمتہ و ملح) کا آخری سبق "محاسن الندوہ" (نظم) ہے۔ دینی مدارس میں اس نصاب کو زیادہ سے زیادہ رائج کرنے کی ضرورت ہے۔

بارود اور ایمان

از:- نعیم صدیقی، ضخامت ۹۶ صفحات، (مجلد، دیدہ زیب سرورق) قیمت تین روپے

ملنے کا پتہ:- فرینڈز پبلیکیشنز ملتان۔

جناب نعیم صدیقی، صحافت و انشاء اور شعر و ادب کی دنیا میں متعارف ہی نہیں مقبول بھی ہیں، اُن کی متعدد کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ اُن کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی مقصدیت ہے، وہ محض دل بہلانے اور مشاعروں میں داد لینے کے لئے شعر نہیں کہتے! نعیم صاحب کا شمار اُن شاعروں میں ہوتا ہے جو متعین مقصد کے تحت کسی "پیغام" کی ترجمانی کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جو آگ اُن کے دل میں سلگ رہی ہے، اُس کی گرمی اور لپٹ دوسروں تک بھی پہونچ جائے۔

صاحب موصوف کی نظموں کا مجموعہ "بارود اور ایمان" ہمارے سامنے ہے پہلی نظم "پیشکش" ہے، فرماتے ہیں۔

نیا سخن، نیا طرزِ خطاب پیش کروں ۔۔۔ پھر انجمن کو نئی آب و تاب پیش کروں
برادرانِ عرب! ہے یہی متاعِ فقیر ۔۔۔ جو اذن ہو دل خانہ خراب پیش کروں
لہو میں غرق شدہ صبح معرکہ کے حضور ۔۔۔ میں دردو کربِ شبِ اضطراب پیش کروں
نہا چکے ہیں لہو میں جو ریت کے ذرے ۔۔۔ انہیں ہزار مہ و آفتاب پیش کروں
وہ جس کے تار میں ایمان و شامِ مصر و حجاز ۔۔۔ مغنیوں کو میں ایسا رباب پیش کروں
ہزار درسِ عزیمت حرا سے تابہ حُنین ۔۔۔ سنو تو ذکرِ رسالت مآب پیش کروں
مجھے یقین ہے کہ یہ عارضی ہزیمت ہے ۔۔۔ ابھی سے مژدۂ صد فتح یاب پیش کروں

ان شعروں میں کتنا جوش اور ولولہ پایا جاتا ہے۔

پیام رعب تھی پیوند کردہ جس کی قبا ۔۔۔ کہو تو قصۂ ابنِ خطاب پیش کروں

مصرعہ اولیٰ میں "پیام" کھٹکتا ہے، اس طرح بولنے میں کتنا تکلف پایا جاتا ہے کہ فلاں شخص کا لباس "رعب کا پیام" ہے، مصرعہ ثانی میں ضرورتِ شعری کے لئے "خطاب" میں جو "ط" ہے اُس کی تشدید حذف کردینی پڑی، یہ خیال اس انداز میں ادا کیا جاسکتا تھا۔

جلال و رعب کا مظہر قبا کا ہر پیوند ۔۔۔ عمرؓ کی زیست کا اک سادہ باب پیش کروں

اسی نظم کے دو شعر ہیں:-

کہیں یہ جوئے تمنا سکوں نہ ہو طاری ۔۔۔ نئے بھنور، نئے موج و حباب پیش کروں

دوسرے مصرعہ میں جو شان و شکوہ پایا جاتا ہے، مصرعہ اولیٰ اس سے عاری ہے!

فضائیں عشق کی کیوں اتنی خالی خالی ہیں ۔۔۔ فنِ کلام کے برق و سحاب پیش کروں

"فنِ کلام کے برق و سحاب" اس میں کس قدر تکلف اور آورد پائی جاتی ہے۔

دوسری نظم ہے ــــ "بہ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم"

ہم اپنے ہی مقام کو سمجھے نہیں بجا! ۔۔۔ کب اپنے ہی وجود کا عرفاں ہے اے حضورؐ!

احسان و عدل و امن کے نعروں کے باوجود — تہذیب ساری جنگ کا میداں ہے اے حضورؐ!
ہر گوشے میں ہیں جال ہزاروں بچھے ہوئے — یہ آپ ہی کا اپنا گلستاں ہے اے حضورؐ!
مجروح کتنی غیرتِ آدم ہے آج کل — مظلوم کتنی عظمتِ انساں ہے اے حضورؐ!
گنبد سے اپنے دیر و کلیسا کو دیکھئے — مسلم کے خوں سے آج چراغاں ہے اے حضورؐ!
افسوس فکر و حکمتِ باطل پہ ہے عمل — اور طاق میں دھرا ہوا قرآں ہے اے حضورؐ!

ان شعروں کے بعد جو ملتِ اسلامیہ کے حالات کا دردانگیز مرثیہ ہیں، شاعر پستی، مایوسی اور بے دلی کے عالم میں امید کا سندر ابھارتا ہے:

لا تقنطوا کا ذکر ہے لاتحزنوا کا ورد — مایوس ہے نہ کوئی ہراساں ہے اے حضورؐ!
جتنے بڑے فساد کا طوفاں ہے سامنے — اتنی بڑی فلاح کا امکاں ہے اے حضورؐ!
یہ آندھیاں ہیں پیش رو فصلِ نو بہار — رنگِ فروغ روح خیاباں ہے اے حضورؐ!
لاہور سے جکارتا، غزنی سے انقرہ — سارا ہجوم پیکرِ یک جاں ہے اے حضورؐ!

— اور —

اس شعر کا تو جواب ہی نہیں ہے۔

ذوقِ جہاد ہے سر و ساماں نہیں تو کیا — ذوقِ جہاد خود سر و ساماں ہے اے حضورؐ!
سوداگروں کا مال ہے سرکار کا غلام — بے چارہ جیسے طفلکِ ناداں ہے اے حضورؐ!

بات کھلی نہیں کہ شاعر آخر کیا کہنا چاہتا ہے ——— "سرکار" سے آخر کیا مراد ہے، یہ طفلکِ ناداں کون ہے؟ "سوداگروں کا مال" یا کوئی اور؟

جذبات پھڑپھڑاتے ہیں پر راستے بے بسی — یہ زندگی بھی کیا ہے اک زنداں ہے اے حضورؐ!

ایسا شعر کتاب پر نظرِ ثانی کرتے ہوئے نظم سے خارج کر دینا چاہئے تھا۔ "جذبات کا پھڑپھڑانا" یہ نام نہاد ترقی پسندوں کا انداز بیان ہے، جو مضحکہ خیز ہے، مصرعہ ثانی میں کتابت کی غلطی غالباً سہو ہوگئی ہے ورنہ موجودہ صورت میں ناموزوں ہے۔

جس سے ڈھنپے تھے اپنی سیہ کاریوں کے داغ — صد پارہ آج اپنا گریباں ہے اے حضورؐ!

"ڈھنپے" کی بجائے "ڈھکے" یا "چھپے" لانا چاہئے تھا۔ پھر سیہ کاریوں کے داغ کیا اسی حصہ پر ہوا کرتے ہیں، جس حصہ بدن کو گریباں چھپاتا ہے۔ ہر لفظ کے استعمال کا ایک قرینہ یا محل ہوتا ہے۔

شمشیر اور سناں کا شغف اب کسے رہا — طاؤس اور رباب کا دوراں ہے اے حضورؐ!

"دور" کی بجائے "دوراں" ذوقِ سلیم پر کتنا گراں گزرتا ہے۔

کس کو رہی طہارتِ قلب و نظر کی فکر — رقصاں تنِ ثقافتِ عریاں ہے اے حضورؐ!

مصرعہ اولیٰ خاصا اچھا ہے مگر دوسرا مصرعہ "آوردی آورد" ہے! پہلے تو ثقافتِ عریاں کا تن فرض کیجیے اور پھر اس کو "رقصاں" دیکھئے!

احزاب گرچہ جنگ صلیبی کو پھر اٹھے — سینوں میں اپنے جوش فراواں ہے اے حضورؐ!

اس شعر میں کوئی لطف اور ندرت نہیں۔

"بادِ رد اور ایمان" کے منتخب اشعار:—

مژہ میں اس کی ہے جنبش نہ ہونٹ میں لرزش — نہ کوئی موجِ تبسم نہ اشک کا طوفاں

دعا کو اب نہ اُٹھیں گے کبھی وہ پھول سے ہاتھ — لبوں سے اُس کے سنوں گا نہ سورۂ رحمٰن

ملے گی چھاؤں کہاں اب حیا کے آنچل کی — پناہ دے گا غمِ دل کو کس کا اب داماں

جو پا گئے ہیں شہادت، وہ پا گئے ہیں نجات — جو لوگ رہ گئے زندہ ہے اُن کی ضیق میں جاں

یہ سود خوار مہاجن خدا کی ان سے پناہ — کہ جن کے نفع میں ہے عظمتِ بشر کا زیاں

ستم کہ واعظِ اخلاق ہیں یہاں حاجب — فغاں کہ داعیٔ مذہب بنے یہاں درباں

کسی نے غسل دیا ہے اسے نہ کفنایا — کوئی نمازِ جنازہ، نہ قرأتِ قرآں

یہ ایک آن ہے تاریخِ رفتہ کا حاصل — یہ ایک آن ہے صدیوں کے دور کا عنواں

دوسرا رخ یہ ہے —

جھلس گئی وہ نگارِ وفا شعارِ عزیز — یروشلم مرے جینے کا لٹ گیا ساماں

یروشلم کو "نگارِ وفا شعار" کہنا ہی اول تو وجدان کو کھٹکتا ہے، پھر وہ نگار "جینے کا ساماں" بھی تھی! حجاز کی ارضِ مقدس کو "جینے کا ساماں" کہنا شعر و ادب کے نقطۂ نگاہ سے کوئی جاذبِ توجہ اور پرکشش اندازِ بیان نہیں ہے! بلکہ اس میں ضعف اور غرابت پائی

صراحی دار گلے پر اُٹھے ہیں تبخالے — نگوں رکھے ہیں پیالے ہے میکدہ ویراں

نور اللغات میں لکھا ہے — "تبخالہ اضافتِ مقلوب مذکر، چھالا جو تپ کی گرمی سے ہونٹوں کے آس پاس نکل آتا ہے" نواب یوسف علی ناظم والیٔ رام پور کی مسلسل غزل کا مشہور مصرعہ ہے۔

سوزِ دروں سے ہونٹ پہ تبخالہ ابھرا

مگر نعیم صاحب کی "نگارِ عزیز" کے گلے پر تب خالے ابھرے نہیں اُٹھے ہیں۔ دوسرا مصرعہ بھی بھرتی کا ہے۔

نہ اُس کی آنکھوں کی جھیلوں میں موجزن کوئی — طلوعِ ماہ رخِ شوق کا نہیں امکاں

کسی نگار یا محبوب کی آنکھوں کو "جھیلیں" کہنا بڑی بے ذوقی کی بات ہے حسین آنکھوں کو جھیل سے نہ کوئی ظاہری مناسبت ہے اور نہ مشابہت ہے! یہ بھی ترقی پسندوں کی پسندیدہ اصطلاح ہے! "طلوعِ ماہ رخِ شوق" — یہ کیا ترکیب ہے؟

نسائیت کا تقدس رہا جو زیبِ جبیں — وہ جارحیتِ تہذیب پہ ہوا قرباں

"جارحیتِ تہذیب" یہ غزل و نظم کی زبان ہی نہیں ہے!

نگاہِ خاص سے جس نے دیا شعورِ شباب — میں رو رہا ہوں اُسے مثلِ طفلکِ ناداں

یروشلم کی "نگاہ خاص" پھر اُس نگاہِ خاص نے "شعورِ شباب" عطا کیا آخر یہ بات کیا ہوئی، دوسرا مصرعہ اور زیادہ سست و کمزور

یہ شائیلاک کی اولاد کا کرشمہ ہے — قدم قدم پہ ہیں صد لحم پارۂ انساں

"صد لحم پارۂ انساں" کی ترکیب کتنی غیر شاعرانہ ہے!

ہم اہلِ خانہ کو بیرونِ در دھکیل دیا — بغیر اذن گھسے آ کے اجنبی مہماں

بالکل سطحی شعر!

ستم کہ ہے دروبستِ زمانہ پہ قابض — بشر کے نام سے دانش مآب اک حیواں

اس میں شاعرانہ لطف کی کتنی کمی ہے!

یروشلم! وہ پڑی سو رہی ہے ملبے میں   خدا کا شکر کہ اب جاگ اٹھا مرا ایماں

یروشلم کے سونے کے سبب میرا "ایمان" جاگ اٹھا! مقصد یہ کہ اس المیہ نے تازیانہ کا کام کیا، شاعر کی غیرت ایمانی بیدار ہو گئی ا
خیال کو ادا کرنے کے لئے جاندار الفاظ نہیں مل سکے!

"یروشلم - یروشلم" —— اس کا آغاز اس مصرعہ ا—

لہو اگل رہا ہے آج، میرا پُر فسوں قلم

ہوتا ہے!" پر فسوں قلم" کی ترکیب میں کوئی حسن نہیں!

یروشلم یروشلم تو اک حریم محترم
ترے ہی سنگ در پہ آج منہ کے بل گرے ہیں ہم

لم کے سنگ در پہ ہم مسلمان آخر کس طرح منہ کے بل گرے ہیں! کوئی قرینہ، کوئی اشاریت، کوئی رمز و تلمیح!

جہاں کی ساری راحتیں سپرد سیل نار کیں

فسوں" کا "سیل نار" سے آخر کیا تعلق ہے!

یہیں سے ہو کے عرش کو سواری نبی گئی   ابھی تک ان فضاؤں میں اُسی کی مہک بسی ہوئی

کی جگہ "وہ" لاتے، تو شعر زیادہ جاندار ہو جاتا، اور واقعیت کا صحیح ترجمان بھی!

اس بند کا تیسرا مصرعہ خاصہ اچھا ہے۔

یہاں کی خاک پہ ٹکے، براق نور کے قدم

اس کے بعد کا بند ہے۔

نماز بے مثال یاں وہ کی گئی ہے اک ادا
بہ اقتدائے مصطفےٰ، حبیب خاص کبریا
کھڑے تھے اک قطار میں ملا کے انبیاء قدم
—— یروشلم، یروشلم

ہوں شعروں میں سادگی کے ساتھ واقعہ کی ترجمانی کی گئی ہے پہلے شعر میں "اک" ناگوار تعقید ہے۔

بہ راہِ داستانِ دل، مہیب حادثوں کے موڑ
صدارتوں کی سازشیں، سفارتوں کے جوڑ توڑ
مثالِ زلف یار ہیں، ریاستوں کے پیچ و خم
—— یروشلم، یروشلم

"بہ راہ داستان دل" ایک مہمل ٹکڑا ہے جس کا شعر سے کوئی پیوند نظر نہیں آتا، باقی دونوں مصرعے خوب ہیں!

فریب "دین زرگراں" طلسم "مذہب شکم"

مریکہ کے نظام سرمایہ داری اور اشتراکیت پہ یہ مصرعہ بھرپور طنز ہے۔

اگر خدا نصیر ہو، اگر خودی میں خم نہیں

یعنی خودی بے لچک ہو، جو کسی جبر اور لالچ سے جھک نہ سکے ۔ مگر "خودی میں خم نہیں" کہا گیا ہے؛ جو زبان و روزمرہ کے اعتبار سے درست نہیں۔

ابھی کثیر آفتیں، ابھی ہزار حادثے

"کثیر" کی بجائے "بہت سی" نظم کرنا تھا۔

ابھی طویل فاصلے، ابھی ہزار معرکے
دیارِ کاشمیر سے بہ مسجدِ یروشلم
——— یروشلم، یروشلم

متاعِ شوق اور کیا، بس ایک نامِ مصطفیٰؐ
شعورِ حق، جنونِ دیں، دلِ غمیں، لبِ دعا
ہمارے پاس اور کیا نہ تاجِ کے، نہ جامِ جم
——— یروشلم، یروشلم

پھر ایک بار آئیں گے، یہ جاں نثار آئیں گے
اجل کے دوش پہ سوار، شہسوار آئیں گے
بہ صد وقار آئیں گے، ترے وقار کی قسم
——— یروشلم، یروشلم

ان اشعار میں جوش، ولولہ اور امید کی بجلیاں رواں دواں ہیں۔ جزاک اللہ:

"کشمیر تا یروشلم" جس نظم کا عنوان ہے وہ بڑی ولولہ انگیز نظم ہے اور شروع سے آخر تک ایک ہی آہنگ ہے۔

کشمیر کے چنار کہ سینا کے ریگ زار
- - - - - - - - -
دونوں طرف ہے رشتۂ دردِ جگر مرا
یہ بھی مرادِ یار ہے وہ بھی مرادِ یار
یاں بھی مرے رفیق ہیں واں بھی مرے عزیز
اس خاک سے بھی پیار ہے اُس خاک سے بھی پیار

نغمہ الاپتا ہوں مگر گھٹ رہی ہے سانس
چھیڑا ہے وہ ستار کہ ٹوٹے ہیں جس کے تار
موجِ نسیم ہے یہاں گلشن کی نوحہ خواں
بادِ شمال کرتی ہے واں ماتمِ بہار
مر مر کے زندہ ہونے کا آتا ہے ہم کو ڈھنگ

گر گر کے بار بار ہم اُٹھتے ہیں بار بار

اس جہدِ بے سکوں کی کوئی انتہا نہیں
اس راہِ عاشقی کے مراحل ہیں بے شمار

تاریخ اپنی ایسا سمندر ہے بے کراں
جس کا نہ اور چھور ہے کوئی نہ آر پار

ہم زیرِ دام ہو کے بھی ہوتے نہیں ہیں رام
کنجِ قفس میں بھی ہیں یہ شاہیں فلک شکار

عبرت پذیر ہو کے بدلتے ہیں طرزِ فکر
کافی ہے تازیانۂ قدرت کا ایک وار

پنہاں غمِ شکست میں ہے مژدۂ ظفر
مستور جیسے محمل لیلیٰ پسِ غبار

یہ نظم فکر و تخییل، زبان و بیان اور جوشِ اثر کے اعتبار سے قابلِ قدر ہے۔

قوت نہیں یہ جالے ہیں سب سازباز کے
اک عنکبوت خانہ میں یہ فکر کے حصار

یہ شعر بہت کمزور ہے۔

پائی ہے ہم نے یاریٔ اغیار کی سزا
ہم کو منافقت پہ رہا اندھا اعتبار

یہ اوپر والے شعر سے بھی کمزور تر شعر ہے، "اندھا" کا الف بُری طرح دب رہا ہے۔

بیگانۂ خدا و رسولِ خدا رہے
نظریہ و شعار تھے باطل سے مستعار

"نظریہ و شعار" کی بجائے "اپنے خیال و فکر" ہوتا، تو شعر میں روانی آ جاتی۔

نظم "انتباہ" خاصی طویل ہے، مگر "آمد" کا رنگ غالب ہے!

چھوڑ رقاصہ فن کار یہ اظہارِ بدن　　مرے کمزور سے ایماں کو حیا آتی ہے

شعر میں لطف نام کو نہیں نیز اور اعضاء بدن کی نمائش کو "اظہارِ بدن" کہنا کوئی اچھی اور قابلِ قبول ترکیب نہیں ہے۔

مجھ کو دیوانہ کہو، پھر بھی یہ کہنا ہے مجھے　　میرا وجدان ہے، کوئی تازہ بلا آتی ہے

یہ موزوں جملے "شعریت" سے عاری ہیں، پھر شعر میں ایسا ابہام پایا جاتا ہے جس کی حدیں "اہمال" سے جا کر مل جاتی ہیں! "میرا وجدان ہے" اس ٹکڑے نے شعر کو اور زیادہ سست، کمزور اور مبہم بنا دیا۔

عشرتِ معصیت آگیں کا عروجِ تکمیل　　خوف لاحق ہے مجھے۔ یاد خدا آتی ہے

"عشرتِ معصیت آگیں" کی ترکیب کتنی غرابت زدہ ہے پھر اس کا "عروجِ تکمیل" اور زیادہ کھٹکتا ہے مصرعہ ثانی اور زیادہ پست!

رخِ تاریخ کونت نوچنے والی یہ چڑیل — اوڑھے تہذیب کی خوش رنگ قبا آئی ہے

مصرعہ اولیٰ کو ذوقِ سلیم کسی عنوان گوارا نہیں کرسکتا۔

اک عقوبت کا اشارہ ہے یہ چشمِ مطرب — مستتر ماتم و شیون ہے یہ ہر تارِ رباب

آخر یہ بات کیا ہوئی! لفظوں کا دروبست ناقص اور انداز بیان ناقص تر!

دور بمباری سے جل بھن گئیں دوشیزائیں — پھر کے بیٹھے ہو یہاں تم بے دوشینہ کی مانند

نوشتوں کا سا اندازِ بیان!

ہائے یہ تشنگیٔ عدل کی ماری دنیا — امن کو مقتلِ تہذیب ترستی دیکھو

مصرعہ ثانی خیال و اظہار، زبان وبیان غرض ہر اعتبار سے پست اور سطحی!

دیکھو ایمان کا ضعف، اور خودی خم خوردہ — نشہ اترے تو یہ کردار کی پستی دیکھو

اس کا بھی اوپر کے شعروں کی طرح حال ہے!

جارحیت کا ہوا اہلِ عرب پہ دھاوا — جیسے چیتے کسی جنگل میں جھپٹ یہ شکار

"جھپیدہ بہ شکار" نے شعر کے لطف کو غارت کردیا۔

پورا طاغوت کا لشکر جو نگر میں اترا — کٹنیاں پھیل گئیں حورِ شمائل بن کر

شعر کا آغاز "پورا" سے ہوا ہے "پورا" میں تعقید کے علاوہ "حشو" کا عیب بھی پایا جاتا ہے۔ دوسرے مصرعہ میں "کٹنیاں" لانے کی کیا تک تھی!

انہی محلوں سے برسنے لگے اب تیرِ عناد — جن کے دروازوں پہ تم جاتے ہو سائل بن کر

شعر میں یوں بھی کچھ نہیں رکھا! "تیرِ عناد" کی نامانوس ترکیب نے شعر کو اور زیادہ سطحی بنادیا۔

جب تلک لمحۂ خمیازہ نہ آئے رندو! — ورنہ کروٹ بھی کبھی سوئے رہو سوئے رہو

"لمحۂ خمیازہ" سے کیا مراد ہے؟ سپاٹ شعر!

نظم "لہو" کے پسندیدہ اشعار:-

یہ منظرِ بہار ہے یہاں لہو وہاں لہو
بدامنِ صبا لہو، بہ صحنِ گلستاں لہو
بہ نوکِ خارِ پُرخلش، بہ برگِ غنچہ ہائے تر
("بہ نوکِ خارِ پرخلش" کی ترکیب خاصی کھٹکتی ہے)
بہ کنجِ ہر قفس لہو، بہ شاخِ آشیاں لہو
کوئی کفِ حنا زدہ، بہ نازِ تیغ زن ہوا
دلوں کے تہہ زے اڑگئے، رہا بس اک نشاں لہو
لُٹا دیارِ حسن میں وفا زدوں کا قافلہ
مزار ہیں کدھر کدھر؟ گرا کہاں کہاں لہو

خمِ شرابِ شعر میں تحاشب کو اپنا خون ناب
رگِ ربابِ کیف سے سحر کو ہے رواں لہو

"ربابِ کیف" اور "سحر اُس کی رگ" جدت مگر ناپسندیدہ جدت! بڑے شاعروں اور ادیبوں کو غالب اور اقبال کی طرح "دامانِ خیال یار" "زود پشیماں" "کم اوراقی" اور "حنابندی" جیسی ترکیبیں ایجاد کرنی چاہئیں، جو زبان و ادب کے مزاج سے ہم آہنگ ہوں۔

بہ شہرِ سامراجیاں لٹا ہے ظلم آدمی
بہ نامِ بادۂ طرب، لگا دکاں دکاں لہو

مصرعِ ثانی خوب ہے مگر مصرعِ اولیٰ انتہائی پست ہے۔

گرا ہے جس بھی خاک پر، قیامتیں اُٹھائے گا
یہ سُرخ سُرخ، گرم گرم، تازہ نوجواں لہو
لہو کے سارے شعبدے لہو کے سارے معجزے
کہیں شرر فشاں لہو، کہیں ہے گل فشاں لہو

اوپر کا یہ شعر اس نظم کا سب سے اچھا شعر ہے، ـــــ آگے چل کر فرماتے ہیں ـ

وہاں وہاں پہ دیکھ لو، گلاب و لالہ و سمن
ہمارے زخمِ سینہ سے گرا جہاں جہاں لہو
چلے ہیں جس کے گھر کو ہم وہ قاتلِ شہیر ہے
بہ خاک کوچہ سب لہو بہ سنگِ آستاں لہو

مشہور قاتل کو "قاتلِ شہیر" نظم کیا گیا ہے، جس نے شعریت کو غارت کر دیا، "بہ خاکِ کوچہ سب لہو" کی بجائے "بہ خاکِ رہگزر لہو" لاتے تو "سب" جو حشو و زاید ہے، شعر میں باقی نہ رہتا ـــ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ "قاتلِ شہیر" کے گھر کو ہم کیوں چلے ہیں؟ نظم سے اس خیال کا جوڑ نہیں ملتا ـ

فنون کا جمال بھی، ضمیر کا جلال بھی
کلم کی آبرو لہو، حرم کا پاسباں لہو

شعر خاصہ اچھا ہے مگر "جلال" ضمیر کی مخصوص صفت نہیں ہے۔ ضمیر کی صفتِ خاص سچائی اور حق شناسی ہے۔

"نفیر" کا آغاز اس بند سے ہوتا ہے :ـــ

اُمڈا ہوا ہے ظلم کا دریائے تیر جاگ
ظلمات مرحبا غیر کی موجوں کو چیر جاگ
تجھ کو پکارتے ہیں زن و طفل و پیر جاگ
اے لٹتے قافلے کے زباں کار میر جاگ

معشوقِ قومیت جسے پوجا ستا مرگیا

(ایسے کئی مصرعے شاعری کا بڑا انتقارف سمجھے جاتے ہیں)

اک نشہ تھا جو دو ہی گھڑی میں اُتر گیا
اک سانپ تھا جو ڈس کے یکایک گزر گیا
اب کیا فضول پیٹ رہا ہے لکیر جاگ !

پھولوں کی سیج پر کھلے زندہ حسین چمن
صد شمع ہائے تن شب خلوت میں شعلہ زن

وہ صد شمع ہائے تن "کیا بات ہوئی ! پھر اُن کا خلوت میں شعلہ زن ہونا اس پر مستزاد

فرعونیت اُٹھی ہے پھر اے وادیٔ کلیم
قرآن پاک طاق پہ دینِ نبیؐ یتیم
کارِ عظیم سر پہ ہے سوئے ہوئے زعیم
لمبا ہے راستہ ترا اے راہگیر جاگ

"شعلۂ غم" اثر انگیز نظم ہے، چند منتخب اشعار ۔

اک داغِ نہاں چمک رہا ہے — اک زخمِ جگر مہک رہا ہے
اک قافلۂ بہار نَردا — صحرا میں کہیں بھٹک رہا ہے
پھر آنکھ کا بھر گیا کٹورا — پھر بادہ چھلک چھلک رہا ہے
چھیڑا تھا جو نغمہ رہ گلے میں — کیا جانیے کیوں اٹک رہا ہے
پھولوں کی جہاں پہ بستیاں تھیں — کوندا سا ادھر لپک رہا ہے
اس خاکِ خراب میں بھی مقصد — موتی کی طرح دمک رہا ہے
تغییر کا منتظر مسلماں — اُمید کی راہ تک رہا ہے
اس پردۂ شب کے پیچھے دیکھو — پھر روئے سحر جھلک رہا ہے

مگر اس شعر میں ۔

میرے قلمِ ہنر کے دل میں — نشتر سا کوئی کھٹک رہا ہے

"ہنر" مصرعہ کا وزن پورا کرنے کے لئے لایا گیا ہے "قلمِ ہنر" کی ترکیب میں کوئی حسن نہیں ۔

ٹھوکرسے جو سر کے بل گرا میں — خوش ہو کے عدو تھرک رہا ہے
انبوہ وہ امن دشمنوں کا — مستی میں بہک بہک رہا ہے

یہ دونوں شعر سطحی ہیں ۔

" جارحیت " جلتی ہوئی نظم ہے جس کے بعض شعروں کو بس گوارا کیا جا سکتا ہے "خیال" (IDEA) میں بے شک ندرت پائی جاتی ہے مگر اس کا اظہار ـــــــــ !!

" موجِ درد " کے بعض شعروں میں خاصی روانی ملتی ہے ـــــ کاش پوری نظم کا یہ رنگ ہوتا ۔

اے نیم خفتگانِ سرِ مسجدِ نبیؐ — بے روح کیوں سلام ہے بے جان کیوں درود

نظم کا ایک شعر ہے۔

سودا بڑھا مفاد کا ہے خطرۂ جُذام
روگی ہوا ادارۂ اقوام کا وجود

شاعری کون کہہ سکتا ہے !"— خطرۂ جذام" نے اس شعر کو بھی روگی بنا دیا !

امریکیوں کو دورۂ وحشت نے آ لیا　　　اُن پر سوار بھوت کی مانند ہیں یہود

"دورۂ وحشت" کس بلا کا نام ہے، جس نے امریکیوں کو آ لیا ! غالباً شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ امریکیوں پر وحشت و درندگی کا
دورہ پڑ گیا۔

سجدہ تو وہ ہے جس سے زمانہ لرزاُٹھے　　　سر پھوڑنے کے شغل کا کب نام ہے سجود

دہ کرتے ہوئے اپنے سر کو کون پھوڑا کرتا ہے، یہ کیا مشاہدہ، تجربہ اور اندازِ بیان ہے، شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ "زمین پر ٹکریں مارنے کا
لوگوں نے سجدہ رکھ لیا ہے۔

نظم "مشورہ" میں "آمد" کا فقدان ہے۔

مردود ہے عصبیت انساب و لسان چھوڑ

عصبیت انساب و لسان" کتنی نامانوس ترکیب شاعر نے وضع کی ہے۔

ع سارا یہ تاریخ ہے استیز استیز

ہم تاریخ" کیا بات ہوئی ! اسی بند میں "تلاطم" کا املا "طلاطم" کیا گیا ہے۔ املا کی ان غلطیوں میں سے یہ ایک غلطی ہے، جسے "ترقی پسندوں" نے
راج دیا ہے۔ ہم نے لغت کی دو کتابوں کو دیکھا اُن میں "ستیز" تو ملا — مگر "استیز" نہیں ملا۔

ع بیدار ہو —— خوابوں کا یہ گلزار جناں چھوڑ

"خوابوں کا گلزار" پر "جناں" کے اضافہ نے اس ترکیب کو عجیب سا بنا دیا۔

"میں سوچتا ہوں" اس کتاب کی آخری نظم ہے اور اس میں جناب نعیم صدیقی کے اسلامی جذبات، ولولہ جہاد، اور فلسطین کے المیہ کے رنج و
ملال نے بڑا دردانگیز سماں پیدا کر دیا ہے۔

میں سوچتا ہوں
ملول چپ چاپ اُداس تنہا
مگر ہے کیسی یہ شامِ غمگیں
غروب سے پہلے ہی اندھیرا
رُکی رُکی سی ہے کیوں روانی
تمام پانی ہے گدلا گدلا
کنارۂ نیل پہ کھڑا ہوں
ملول چپ چاپ اور تنہا
حضور کی آنکھوں سے اشک بہتے

جگر سے گوہر کے خون ٹپکتا
میں کس سے پوچھوں کسے پکاروں
یہ کیا سماں ہے؟ یہ کیا تماشا!
تمام تاریخ میں مسلماں
کبھی نہ اس تجربہ سے گزرا
ہمیشہ کٹ کٹ مرے ہیں غازی
قدم نہ پیچھے کو کوئی اٹھا

اس کے بعد جناب نعیم صدیقی نے "مصر" کے حالات پر شاعرانہ انداز میں درد میں ڈوبا ہوا تبصرہ کیا ہے اور شیخ حسن البنا، سید قطب، علامہ عقیلہ اور طلعت رحمہم اللہ تعالیٰ شہدائے حق کی قربانیاں یاد دلائی ہیں۔ اس کے بعد شرق اردن کے شہیدوں اور مجاہدوں کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

میں تم پہ قربان اے شہیدو!
تمہی ہو سرمایۂ تمنا
تمہی نے ماضی سے لے کے روغن
کیا ہے روشن چراغ فردا
جہاں جہاں دی ہیں تم نے جانیں
حیات نو ہوگی واں سے برپا

اس کے بعد "عراق" کے حالات کا مرثیہ لکھا ہے۔

کنارِ دجلہ میں سوچتا ہوں
ذرا سا دریا ہے بپھرا بپھرا
ذرا سا پانی بہت تموج
یہ اپنی لہروں سے آپ الجھا
ہر ایک ذرہ کے اندروں سے
ہمیشہ طوفان تازہ برپا
یہاں کے غواص بھی عجب ہیں
خزف سمیٹے گہر گنوایا

- - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - -

لہو کے قطروں کی فصل بو کر
ہمیشہ لاشوں کا کھیت کاٹا

یہود کل ان سے کانپتے تھے
یہود نے آج ان کو روندا

—— اور ——

کنارِ راوی میں سوچتا ہوں
ملول چپ چاپ اداس تنہا

کبھی مرے دور کا مسلماں
حقیقت اپنی سمجھ سکے گا
دل و نظر کو بدل کے دیکھو
بدل تو سکتا ہے اب بھی نقشہ
دگر نہ قدرت کا تازیانہ
نہیں کسی پہ بھی رحم کھاتا
نفیر کا شور سن رہا ہوں
جہاد کا پھر ہوا بلاوا

("بلاوا ہونا" کی جگہ "جہاد کا آگیا بلاوا" نظم کرنا تھا)

یہ شعر سب سے اچھا ہے :—

زرہ مری صبر، عزم خنجر
خیال مرکب، نگاہ نیزہ

دوسرا رخ :—

کنارِ نیل پہ کھڑا ہوں
ہجوم کے درمیان، یکتا

یکتا۔ "یکہ و تنہا" کے معنی میں نظم کیا گیا ہے، جو غلط ہے۔

پیا لہو جس نے اہل دل کا — وہ انقلاب اب کہاں ہے دلکا

ہم صدیقی اچھے شعر کہتے کہتے، ایسے پست اور سطحی شعر بھی کہہ جاتے ہیں!

بڑھی مسلماں کی غیر بینی — یہ درد ہے، در ہے مداوا

دل کے سامنے دست سوال پھیلانا اُن پر بھروسا کرنا، ان سے مادی سامان کے ساتھ افکار و نظریات کی بھیک مانگنا اس خیال کو "غیر بینی" کہا گیا ہے
ہارے اس مفہوم کی صحیح ترجمانی نہیں ہوتی۔

چڑھائے ہر درد بھرے پیالے — فریب یاراں! فریب اعدا

مرعہ اولیٰ (چڑھائے ہر درد بھرے پیالے) ایک مشاق شاعر کے زبان و قلم سے کس طرح نکل سکتا ہے! حیرت ہے۔

زبانیں جیسے کوئی الاؤ — خیال جیسے ہو کوئی کوندا

"الاؤ" کی جگہ "شرارہ" لا سکتے تھے : نوا اور صدا کو شعلہ، شرارہ، موجِ آتش تو کہہ سکتے ہیں مگر الاؤ، آتش کدہ اور بھٹی نہیں کہتے۔ کیونکہ آواز ظرفیت نہیں رکھتی۔

مگر یہ سب حزن و یاس رہزن　　　ملال ہے میری رہ کا کانٹا

بے مزہ اور پست شعر!

خودی کے منصب کے عالموں کا　　　یہی رہا ہے ہمیشہ فتویٰ

"خودی کے منصب کے عالم" یہ علمار کی کونسی قسم ہے؟

جناب نعیم صدیقی کی نظموں میں جہاں تک خیال کا تعلق ہے تنوع اور ندرت ملتی ہے مگر ان کی قوتِ اظہار کمزور ہے! وہ بہت اونچی اڑان بھی اُڑتے ہیں لیکن پھر ایکا ایکی جھکتے نظر آتے ہیں! بعض مقامات پر تو وہ گل و لالہ اور خار و خس، الماس و زمرد اور خزف ریزوں کو ایک ہی لڑی میں پروتے چلے جاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے کلام پر نظرِ ثانی کی انہیں فرصت ہی نہیں ملتی! اُن کی نظمیں پڑھتے ہوئے ذوق و وجدان کو عشرت آسودگی کے ساتھ چرکے بھی لگتے جاتے ہیں، کاش! اُن کو سخن فہم دوست اور اہلِ ذوق مشیر میسر آ سکتے!

جناب نعیم صدیقی کے کلام میں طہارتِ فکر پائی جاتی ہے، اُن کا خلوص بھی مسلم ہے، اُن کے خیالات کی صحت و افادیت بھی ثابت ہے، اُن کے دل و دماغ پورے کے پورے مسلمان ہیں وہ اپنے سینہ میں دینی غیرت کا آتش کدہ بھی رکھتے ہیں، انہوں نے اردو شاعری کو نئے عنوانات بھی دئے ہیں، وہ رجائیت کے پیغامبر اور اُمید و آرزو کے مبلغ ہیں —— کاش! ان خوبیوں کے ساتھ وہ "ترقی پسند شاعری" کی بجائے حالی اور اقبال کے اندازِ بیان اور اسلوبِ بیان کو اپنا سکتے!

"بارود اور ایمان" کی بعض نظموں کا انگریزی میں ترجمہ بھی ہوا ہے یہ کتاب "THE WOUNDS SPEAK" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ اعلیٰ ایڈیشن کی قیمت ایک روپیہ ۵۰ پیسے اور سستے ایڈیشن کی قیمت ایک روپیہ ۲۵ پیسہ ہے، مشہور اسلام پسند انشا پرداز خاتون محترمہ مریم جمیلہ نے اس پر پیش لفظ اور جناب محمد یوسف نے "تعارف" لکھا ہے اور نعیم صاحب کی نظموں کو بہت کچھ سراہا ہے۔ یقین ہے کہ اردو اور انگریزی کے یہ دونوں مجموعے مقبول ہوں گے اور ان کے مطالعہ سے ملت کو نیا ولولہ ملے گا۔

نیشنل اور الفرڈ
ILFORD
HP3
ROLL FILM
ہمہ وقت
آپ کی
مسرتوں
کے ساتھی!
رضوی برادرز لمیٹڈ
کراچی —— لاہور —— ڈھاکہ
ORIENT

صافی

ترتیب

قیمت فی پرچہ ۶۲ پیسے — پبلشر:- ماہر القادری — چندہ سالانہ:- ۷ روپے

دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

باہتمام مستفیض احمد صدیقی پبلشر ماہر القادری نے انٹرنیشنل پریس کراچی میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لئے جن نبیوں اور رسولوں کو مبعوث فرمایا، ہم ان تمام نفوسِ قدسیہ کی تصدیق کرتے ہیں اور ان کے درمیان کسی تفریق کو روا نہیں رکھتے، تمام انبیاء کرام ہمارے سردار ہیں اور اہل ایمان کے نزدیک واجب التعظیم اور مستحقِ احترام ہیں، ہمارے دل نبیوں اور رسولوں کی محبت اور عظمت و احترام سے معمور ہونے چاہئیں! قرآن کریم ہی سے یہ بات بھی ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض رسولوں کو بعض رسولوں پر فضیلت دی ہے۔ جہاں تک نفسِ نبوت کا تعلق ہے اُس کے درمیان کوئی فرق اور امتیاز نہیں ہے۔ مگر فضیلت کے اعتبار سے انبیاء کے درجات ہیں قرآن کریم میں نبیوں اور رسولوں کا جو ذکر آیا ہے اور اُن کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں (علیہم السلام) اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام نبیوں سے افضل ہیں اور ان دونوں داعیانِ حق میں فضیلت و شرف کا بلند تر مقام حضرت سیدنا محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو حاصل ہے۔ اس تمہید کا خلاصہ یہ ہے کہ تمام نبیوں اور رسولوں میں سب سے افضل و اشرف ہمارے حضور (ارواحنا لہ الفدا) ہیں! اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے زیادہ تعریف و ثنا اور نعت و منقبت کی مستحق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے مگر حضور کی نعت اور مدحت و ستائش میں بھی ایسا انداز اختیار نہیں کرنا چاہیئے، جس سے کسی نبی کی تنقیص کا (معاذ اللہ) کوئی پہلو نکلتا ہو! برگزیدہ شخصیتوں کا ادب احترام اسلام ہی نے ہمیں سکھایا ہے۔

کوئی شک نہیں تمام انبیاء کرام عالمِ انسانیت کے لئے "رحمت" ہیں مگر "رحمۃ للعٰلمین" کا خطاب اور لقب صرف حضور کے لئے اللہ تعالیٰ نے مخصوص فرمایا ہے، حضور سراج منیر ہیں، رؤف و رحیم ہیں، قیامت کے دن شفاعت کا اذن صرف حضور ہی کو عطا فرمایا جائے گا، منصبِ شفاعت کا یہ ظہور قیامت کے دن سب کو نظر آئے گا کہ تمام انبیاء اُس روز "نفسی نفسی" کہتے ہوں گے مگر حضور کی زبانِ مبارک پر "اُمتی اُمتی" ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہم جیسے گنہگاروں کو بھی شفیع المذنبین کی شفاعت سے بہرہ مند ہونے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

اللہ تعالیٰ نے حضور کے اسوۂ حسنہ کو تا قیامِ قیامت انسانیت کے لئے "معیار" قرار دیا، جس راہ میں حضور کے نقشِ قدم نظر آتے ہیں وہی منزلِ نجات اور شاہراہِ مغفرت ہے، حضور کی اتباع کے بغیر دین و دُنیا کی کوئی سعادت اور بھلائی حاصل

نہیں ہو سکتی۔

جائیں تو کہاں جائیں کہ جو کچھ ہے یہیں ہے
باہر ترے گھر کے تو نہ دنیا ہے نہ دیں ہے

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کا شرف بھی عنایت فرمایا، شب اسریٰ حضور کو رحمت و تجلی اور قرب کے وہ آثار دکھائے گئے جو کسی دوسرے نبی اور رسول کے لئے ثابت نہیں ہیں؛ اور پھر ہیبت و جلال کے اس عالم میں حضور کے دل و نگاہ کے طبعی اعتدال میں کوئی فرق نہیں آیا۔

یہ وہ خصوصیات ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے لئے مخصوص ہیں، ان میں کوئی آپ کا شریک و سہیم نہیں؛ یہ شرف بھی حضور ہی کے لئے مخصوص ہے کہ تمام الہامی کتابوں اور ربانی صحیفوں میں حضور کا نام اور ذکر کسی نہ کسی عنوان سے آیا ہے، تمام نبیوں اور رسولوں کو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ حضور کا نام بتا دیا تھا، حضور ہی کی ذات گرامی دعائے خلیل بھی ہے اور نوید مسیح بھی!

ان تمام خاص فضائل و محامد کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے "خاتم النبیین" کے خطاب و لقب سے یاد فرمایا، اس لفظ کی دو قرأتیں ہیں، ایک "خاتِم النبیین" (ت کسرہ کے ساتھ)، اس کے معنیٰ ہیں نبیوں کی بعثت کے سلسلہ کے آخری نبی جن کی ذات پر نبوت کو ختم کر دیا گیا، دوسری قرأت "خاتَم النبیین" (ت فتح کے ساتھ) ہے،

خاتَم:- مہر، ختم کرنے والا، خواتم اور خُتم جمع، چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی تھے آپ پر نبوت ختم ہو گئی اور آپ کے بعد کوئی اور نبی نہیں آنے والا ہے اس لئے قرآن مجید نے آپ کو "**خاتَم النبیین**" (مہر سب نبیوں پر) فرمایا ہے۔ یعنی تمام نبیوں کا ختم کرنے والا، کیونکہ سب کے مُہر اخیر میں لگائی جاتی ہے"۔ (لغات القرآن)

جناب امام راغب اصفہانی کی مشہور و مستند کتاب ــــــ مفردات القرآن ــــــ میں لکھا ہے۔

"۔ ۔ ۔ آیت (۳۳-۴۰) میں آنحضرت کو خاتم النبیین فرمانے کے معنیٰ یہ ہیں کہ آنحضرت کی آمد سے سلسلۂ نبوت مکمل ہو گیا ہے اور آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا (مفردات القرآن ــ اُردو ترجمہ، ناشر المکتبۃ القاسمیہ چوک دالگراں لاہور۔ صفحہ ۲۶۴)

امام راغب اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ نے ۵۰۲ھ میں وفات پائی، اُن کی کتاب (مفردات القرآن) نوسو سال پہلے کی لکھی ہوئی ہے، امام موصوف نے ظاہر ہے کہ "خاتم النبیین" کے یہ معنیٰ کسی فرقہ یا مدعی نبوت کی ضد اور عناد میں نہیں لکھے! تفسیر کی تمام قدیم و جدید کتابوں میں "خاتم النبیین" کے یہی معنیٰ بیان کئے گئے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ نے نبوت کو ختم کر دیا اور حضور کے بعد اب کوئی نیا نبی دنیا میں نہیں آئے گا اور وحی نبوت کا باب بھی بند کر دیا گیا کہ یہ خاصہ نبوت ہے۔

اب رہا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا "رفع آسمانی" کے بعد دنیا میں دوبارہ تشریف لانا، یہ عقیدہ "ختم نبوت" کے منافی ہرگز ہرگز نہیں ہے کہ آپ کو نبوت حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے مل چکی ہے، آپ کوئی نئے نبی نہیں ہیں اور دنیا میں دوبارہ

تشریف لاکر آپ شریعت محمدی کے مطابق عمل فرمائیں گے؛ نبی ہونے کی حیثیت سے کوئی نئی شریعت پیش نہیں کریں گے۔
پوری امت نے اور ہر مسلمان فرقہ نے "خاتم النبیین" کے یہی معنیٰ مراد لئے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم کر
دی گئی! "خاتم" ایک طرح کی واقعاتی تمثیل ہے کہ جب کسی لفافہ یا شیشی پر مہر لگا دی جاتی ہے تو اس میں کوئی اور چیز داخل اور
شامل نہیں کی جاسکتی، بادشاہوں کے فرمان و منشور پر آخر میں مہر لگانے کے یہ معنیٰ ہیں کہ مہر کے بعد عبارت کا اختتام ہوگیا
اب ایک حرف بھی مہر کے بعد بڑھایا نہیں جا سکتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اس اعتبار سے "خاتم" ہے کہ نبیوں اور
رسولوں کی بعثت کے سلسلہ پر حضور کی بعثت نے مہر لگا دی کہ اب قیامت تک کوئی دوسرا (نیا) نبی نہیں آئے گا اس موقع پر اس
بعید از قیاس اور بے اصل تاویل کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ —— قلم و زبان سے "خاتم النبیین" کا اقرار ان معنیٰ
کے ساتھ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "افضل النبیین" ہیں، یہی "خاتم النبیین" کے معنیٰ ہیں اور یہ لفظ (خاتم النبیین)
نبوت کے دروازے کو بند نہیں کرتا —— یہ دراصل "ختم نبوت" کی غلط تاویل بلکہ اس منصب کا انکار ہے —— جو کوئی
"خاتم النبیین" سے "افضل النبیین" مراد لیتا ہے اور حضورؐ کے بعد نئے نبی کی بعثت کا قائل ہے، وہ دراصل "خاتم النبیین"
کی ایسی تاویل کرتا ہے جس سے "خاتم النبیین" کے قرآنی مفہوم کی نفی ہوتی ہے:
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم افضل النبیین بھی ہیں، انبیاء کرام میں حضور کی ذات گرامی اس طرح ہے جیسے انگوٹھی میں نگینہ
مگر ان تمام فضائل کے ساتھ حضور آخری نبی بھی ہیں اور کسی تشکیک اور تشابہ وابہام کے بغیر "خاتم النبیین" کے یہی معنیٰ ہیں کہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں، حضور کے بعد اب کوئی نیا نبی مبعوث نہیں ہوگا۔ حضور کی ذات پر اللہ تعالیٰ نے نبوت کے
سلسلہ کا اختتام کر دیا اور نبوت کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا اب کسی انسان پر وہ وحی نہیں آئے گی جو خاصۂ نبوت ہے۔
انبیاء اور رسول اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجے گئے ہیں، ہر نبی اور رسول اپنی جگہ مستقل نبی تھا، کسی نبی اور رسول کو
اللہ تعالیٰ نے یہ اختیار نہیں دیا کہ وہ اپنی طرف سے کسی ذیلی بروزی یا ظلی نبی کو مقرر کرے، اسلام میں نبوت کی اقسام اور
انواع نہیں پائی جاتیں! کتاب و سنت میں اس کا کہیں ذکر تو کیا اشارہ تک نہیں ملتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس
جس کو قرآن "خاتم النبیین" کہتا ہے "مہر نبوت" تھی اور اس مہر سے حضور اپنے ایسے نائب مقرر فرما سکتے تھے جو نبوت کے منصب پر
فائز ہوں گے۔ "خاتم النبیین" کی یہ تاویل امت میں کسی نے قبول نہیں کی اور نہ راسخون فی العلم کے ذہن میں اس قسم کا کوئی نکتہ
آیا! نبی کی بعثت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے، کسی نبی اور رسول کو یہ الٰہی منصب حاصل نہیں تھا کہ وہ خود اپنی مہر،
فرمان یا امر و اذن کے ذریعہ کسی کو "نبی" بنا دے! اللہ تعالیٰ نے جس کسی کو نبی بنایا ہے اس پر وحی بھی بھیجی ہے! اگر اس سو
فی صدی غلط بات کو بر سبیل تنزل محض ایک مفروضہ کے طور پر تھوڑی دیر کے لئے مان بھی لیا جائے (استغفر اللہ) کہ کسی
نبی نے بھی اپنی مہر یا اختیار سے اپنے کسی امتی کو نبی بنایا ہے، تو ایسا "نبی" صاحب وحی نہیں ہو سکتا، کیونکہ وحی تو اللہ تعالیٰ بھیجتا ہے
نبی وحی نہیں بھیجتا! اور نبوت اور وحی لازم و ملزوم ہیں۔
اس گفتگو کا خلاصہ اور لب لباب یہ ہے کہ "خاتم النبیین" کے یہی معنیٰ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات
قدسی صفات پر نبوت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دی گئی، اب کوئی نیا نبی قیامت تک پیدا نہیں ہوگا، اور جو کوئی نبوت کا دعویٰ

کرے گا۔ اُس کے دعوے کی مسلمان ہرگز ہرگز تائید نہیں کریں گے بلکہ اس قسم کے دعوے کی تردید کی جائے گی کہ یہی ایمان کا تقاضہ ہے!

ختم نبوت امتِ مسلمہ کے ان مسائل میں شامل ہے، جس پر پوری امت کا اجماع اور اتفاق ہے، اور اس بابت دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں، اس مسئلہ کا تعلق ایمان و اسلام سے ہے، یہ فقہ یا علم کلام کا کوئی فروعی مسئلہ نہیں بلکہ ایمان و اسلام کا بنیادی مسئلہ ہے جو ایک مفہوم (یعنی ختم نبوت) کے علاوہ کسی دوسری تاویل و تعبیر کو قبول نہیں کر سکتا، اس قسم کا مسئلہ بھی نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی مدعی نبوت کو غلط فہمی ہو گئی تھی یا وہ نفس مسئلہ کی فہم کی غلطی یا ذہنی معذوریت یا کسی جذب و استغراق میں مبتلا ہو گیا تھا! اس مسئلہ میں جو ایمان کا بنیادی مسئلہ ہے کسی قسم کی درگزر، چشم پوشی، صرفِ نظر اور رو رعایت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، حضرت سیدنا محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد کوئی نیا نبی آ سکتا ہے اس دعوے، پیام اور خبر و اطلاع کو مسلمان برداشت اور گوارا ہی نہیں کر سکتے۔ ایک مسلمان کے لئے اس سے زیادہ تکلیف دہ اور دکھ پہونچانے والی اور کوئی چیز ہو ہی نہیں سکتی۔

حضرت ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی قبر کو اللہ تعالیٰ ہمیشہ منور رکھے آپ نے کتنی سچی بات کہی ہے کہ مدعی نبوت سے جو کوئی مسلمان نبوت کا ثبوت اور دلیل طلب کرتا ہے تو ایسا کرنے سے اُس کا ایمان ضائع ہو جاتا ہے، کیونکہ وہ شخص مسلمان ہوتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبی کی بعثت کا قائل ہے یا اس مسئلہ (ختم نبوت) میں وہ مذبذب ہے! حالانکہ نبوت کا دعویٰ کرنے والا اگر فضائے آسمانی میں بھی اُڑتا ہوا نظر آئے اور اُس کے اشارے پر پہاڑ چلنے لگیں، تو بھی اُس کے دعویٰ نبوت کی اہل ایمان تردید ہی کریں گے۔

عقلی دلائل

قرآن کریم کے بعد جب ہم احادیث کو دیکھتے ہیں تو وہاں بھی "ختم نبوت" کا ثبوت ملتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر نبوت ختم کر دی گئی۔ دین کے اصل ماخذ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ہیں! اور یہ بات ہم اپنی طرف سے نہیں کہہ رہے ہیں: قرآن کریم میں کہا گیا ہے کہ جب تمہارے درمیان کسی (دینی) مسئلہ میں تنازعہ ہو جائے تو "فردوہ الی اللہ والرسول" اور اس آیت میں اللہ سے "کتاب اللہ" اور "الرسول" سے سنت رسول اللہ مراد ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ نے تلاوت قرآن، تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیہ نفس کی خدمات FUNCTION متعلق فرمائی تھیں، اس لئے صحابہ کرام جو امین کتاب و سنت بھی تھے حضور کے تربیت کردہ اور فیض یافتہ بھی تھے اور کتاب و سنت کے اولین مخاطب بھی تھے صحابہ کرام کا جس مسئلہ پر اجماع ہو جائے وہ اجماع دین میں حجت ہے ــــ صحابہ کرام یہی عقیدہ رکھتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں: حضور کے بعد اب کوئی نیا نبی نہیں آئے گا، صحابہ کرام کے اس عقیدہ کا سب سے بڑا ثبوت اُن کا یہ عمل ہے کہ ان نفوس قدسیہ نے مدعیانِ نبوت سے جدال و قتال کا معاملہ کیا ــــــ اگر امام الاولین والآخرین حضور خاتم النبیین (علیہ الصلوٰۃ والتسلیم) کے بعد کسی قسم کے بھی نبی کے مبعوث ہونے کا امکان ہوتا ــــــ تو صحابہ کرام کو اُن مدعیانِ نبوت کے حالات کی پہلے تحقیق کرنی چاہیئے تھی، کیونکہ نبی کے ماتھے پر تو "نبی" لکھا ہوا نہیں ہوتا، اور نہ فرشتے اُس کی نبوت کا اعلان کرتے ہوئے اُس کے ساتھ چلتے ہیں، نبی کو خدا کے کلام سے اور اُس کی اپنی سیرت و کردار سے ہمیشہ پہچانا گیا ہے، وہ کلام جو وحی خدا ہوتا ہے اور وہ سیرت جس میں پیمبرانہ ــ

خصوصیات پائی جاتی ہیں ـــــ اگر صحابہ کرام کا یہ عقیدہ ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اُمت ہی میں سے کوئی شخص طفیلی، ظلی یا بروزی نبی ہو سکتا ہے تو اُن کے لئے ضروری تھا کہ مدعیانِ نبوت کے حالات کی تحقیق فرماتے کہ ممکن ہے اُن میں سے کوئی مدعی حضور خاتم النبیین کا ظل یا بروز ہو مگر صحابہ کرام کا ذہن اس عقیدہ سے پاک و صاف تھا اس لئے تحقیق حال کی بجائے نبوت کا دعویٰ کرنے والوں سے انہوں نے جنگ کی کیونکہ جھوٹی نبوت سے سمجھوتا ممکن ہی نہیں ہے، صحابہ نے تلوار سے اس کا فیصلہ کر کے دکھا دیا ـــــ

کتاب اللہ ہے سنتِ رسول اللہ ہے، صحابہ کرام کا اجماع ہے، پھر اُس کے بعد ـــ تیرہ سو سال کی ... امت مسلمہ کا متواتر عقیدہ اور عمل ہے ... ـــــ یہ تمام وہ دلائل اور تحقیق ہیں جو "ختم نبوت" کی تائید کرتی ہیں اور ہر قسم کی جدید نبوت کے امکان کی ان سے قطعی طور پر تردید ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے علاوہ کسی کتاب کی حفاظت کا وعدہ نہیں فرمایا، اُمتیوں نے اپنے نبیوں پر نازل شدہ کتابوں میں لفظی تحریفیں کیں اور اصل عبارتیں بدل دیں! پھر انبیاء ماسبق (علیہم السلام) کی سیرت کے حالات اور اُن کے کلام (احادیث) کو محفوظ رکھنے کا کوئی اہتمام اُمتوں نے نہیں کیا؛ آسمانی کتابیں تحریف شدہ، انبیاء کی سیرتیں کمیاب بلکہ ناپید و نایاب، ایسی صورت میں اُمتیں جو گمراہ ہوتی ہیں، اُن کی اصلاح اور دینی انقلاب کے لئے انبیاء کا مبعوث ہونا ناگزیر ضرورت تھی، چنانچہ انبیاء آتے رہے یہاں تک کہ سیدنا محمد ابن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت کے سلسلہ کو ختم کر دیا گیا اور منشورِ نبوت پر گویا کہ مہر لگا دی گئی اور اسے فائنل کر دیا گیا کہ اب قیامت تک انبیاء کی فہرست میں کسی نئے نام کا اضافہ نہ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی حفاظت کا خود ذمہ لیا، اور اللہ تعالیٰ جس کی حفاظت فرمائے اُسے گردشِ روزگار اور حوادث و انقلاب چھو بھی نہیں سکتے، چنانچہ قرآن کریم کا ایک ایک حرف اُسی حالت میں پوری طرح محفوظ ہے جس طرح وہ نازل ہوا تھا ـــ قرآن کریم کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے فرمائی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل کو محفوظ رکھنے کا فرض صحابہ کرام نے ادا کیا۔ حضور کی مقدس زندگی کے ایک ایک جزئیہ کو یاد رکھا گیا اور محفوظ کیا گیا، حقوق اللہ، حقوق العباد اور معاشرت کے جتنے عنوانات انسانی زندگی کے لئے ضروری ہیں وہ پورے کے پورے سیرتِ رسول میں ملتے ہیں ـــــ

ـــــ حضور کی مقدس زندگی کے واقعات کے لئے اس قدر ضبط و حفاظت کا اہتمام کیا گیا ہے کہ جلوت تو جلوت خلوت تک کے واقعات بھی محفوظ و مدون کر لئے گئے، صحابہ کرام نے اس بات تک کو تا بعین تک پہونچایا ہے کہ حضور کی ریش مبارک میں کتنے سپید بال تھے، حضور عام طور پر کس کروٹ استراحت فرماتے تھے، آج کی مادیت پرور دنیا چاہے کچھ بھی کہے ہم تو اس پر فخر کرتے ہیں کہ استنجے کے ڈھیلوں میں اخلاق و معاشرت کے مبلغ اعظم (صلی اللہ علیہ وسلم) جفت یا طاق کس تعداد کو پسند فرماتے تھے اس کو بھی صحابہؓ نے یاد رکھا ہے۔ سیرتِ رسولؐ کے بعد ہزاروں صحابہ کرام کے حالات ہیں جو تاریخ کی کتابوں میں ملتے ہیں پھر آگے چل کر اُمت کے علماء و صلحاء اور ارباب دانش نے فنِ حدیث کو مدون کیا، حضور کے قول و عمل کو صحت کے اعتبار سے جانچنے اور پرکھنے کی یہ انتہائی کوشش تھی جو کی گئی، راویوں اور روایتوں کو نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھا گیا اور درایت و روایت کی نازک و دقیق چھلنیوں میں روایتوں کو چھانا گیا، اسماء الرجال مسلمانوں کی علمی تحقیق کا وہ عظیم الشان کارنامہ ہے جس کے آگے یورپ کے

مورخین، عقلاء اور اہل علم دم بخود ہیں۔

اللہ کی کتاب محفوظ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور سنت مرتب و مدون اور وحی الہٰی کے مخاطبین اولین اور نبی آخر کے صحابہ اور تلامذہ کے حالات موجود ——— اس لئے حضورؐ کے بعد کسی جدید نبی کے آنے کی سرے سے ضرورت ہی باقی نہیں رہتی، حضورؐ کے "خاتم النبیین" ہونے کے یہ وہ عقلی دلائل ہیں، جن کو ہم غیر مسلموں کے سامنے بھی پیش کر سکتے ہیں!

اُمت مسلمہ میں عقیدہ و عمل کی خرابیاں پیدا ہوسکتی ہیں اور ہوتی رہی ہیں، جن کا مشاہدہ ہم آج بھی کر سکتے ہیں، ان خرابیوں کو دُور کرنے کے لئے امت میں مجددین، مبلغین اور علماء ہر دور میں پیدا ہوتے رہے ہیں اور انہوں نے تبلیغ و اصلاح کا فرض انجام دیا ہے، چونکہ دین کے اصل ماخذ کتاب و سنت محفوظ ہیں اور صحابہ کرام جن کی تربیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی، اُن کے حالات و آثار پوری تفصیل کے ساتھ اُمت کے درمیان موجود ہیں لہٰذا اب وحی اور جدید نبوت کی ضرورت نہیں رہی ——
اصلاح، تبلیغ اور دعوت و تذکیر اور تجدید و احیاء دین کا کام صاحبان علم و اجتہاد سے متعلق ہے! مثلاً امت مسلمہ میں پہلے مجدد حضرت عمر ابن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ گزرے ہیں، جن کی مومنانہ عزیمت اور ایمانی فراست نے شاہان ماسبق کی چھوڑی ہوئی بدعتوں کا استیصال کیا، جبر و ظلم کے چلن کو مٹایا اور مسلمانوں کے معاشرے میں اسلامی اخلاق کی روح سمو دی یہاں تک کہ دنیا محسوس کرنے لگی کہ دورِ فاروقی لوٹ کر آگیا ہے!

یونانی فلسفہ نے مسلمانوں کے بعض بلند پایہ اہل فکر اور دانشوروں کو متاثر کر دیا تھا، "قدم عالم" اور "عقول عشرہ" جیسے غلط قسم کے فلسفیانہ مسائل مسلمانوں میں مقبول ہوتے جارہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کو فلسفہ یونانی کی بت شکنی کی توفیق عطا فرمائی! حضرت سیدنا شیخ عبد القادر جیلانی قدس سرہ نے فساد عقائد اور خرابیٔ اعمال کی اصلاح کے لئے جدوجہد فرمائی اور قرآن کریم کی تعلیم کو عام کیا، حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ کا یہ اثر ہوتا تھا کہ آپ کے وعظ کی ایک ایک نشست میں سینکڑوں فاسد العقیدہ مسلمان توبہ کرتے تھے، آپ نے بدعت و شرک کے علی الرغم توحید خالص کی طرف دعوت دی، مگر اس ستم ظریفی کو کیا کیجیے کہ آگے چل کر غلو عقیدت کے سبب خود آپ سے بعض الوہی صفات منسوب کر دی گئیں ——
امام ابن تیمیہ اور اُن کے قابل فخر شاگرد امام ابن قیمؒ نے "غلو عقیدت" کے مظاہر اور مشاہد و رسوم کے خلاف جہاد کیا، حضرت مجدد الف ثانی ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت شاہ محمد اسمٰعیل شہید (رحمہم اللہ تعالیٰ) ہیں ان بزرگوں نے تجدید و احیاء کا کارنامہ انجام دیا، غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد دین کی تجدید و احیاء اور معاشرے کی اصلاح کا کام ہوتا رہا اور امت نے کسی "نبی" کے ظہور کی ضرورت محسوس نہیں کی اور نہ کسی مسلمان کے دل میں اس قسم کا کوئی خطرہ یا وہم پیدا ہوا کہ اُمت کی اصلاح کسی "نبی" کی بعثت ہی سے ہو سکتی ہے "ختم نبوت" کا عقیدہ پوری امت کے نزدیک مسلّم ہے اس لئے اُمت مسلمہ کسی نازک سے نازک دور میں بھی کسی جدید نبی کے ظہور کی منتظر اور متمنی نہیں رہی۔

ہم جن بزرگوں کا احترام کرتے ہیں اور جن کی دینی خدمات سب کے نزدیک مسلّم ہیں، اُن سے بہ تقاضائے بشریت سہو و تسامح ہوا ہے تو دوسرے اکابر نے اس کی نشاندہی کر دی ہے، اس لئے غلطیاں واضح ہوتی چلی گئی ہیں، آج اگر کوئی کسی بنیادی اختلافی مسئلہ کی حقیقت معلوم کرنا چاہے اور اس تلاش و جستجو میں اپنا وقت صرف کرے ——— تو حقیقت کا پتہ چل سکتا ہے، کیونکہ دین کے

ماخذ ــــــ کتاب وسنت ــــــ موجود ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کو اللہ تعالیٰ نے معیارِ حق بنایا ہے اسی معیار پہ ہر مسئلہ کو جانچا اور پرکھا جاسکتا ہے، کتاب وسنت کے بعد صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے "آثار" موجود ہیں، جن سے دینی مسائل میں وہ روشنی ملتی ہے جو شرحِ صدر اور انکشافِ حق کا سبب بن سکتی ہے اور بنتی رہی ہے ــــــ تجدید واصلاح اور تبلیغ حق کی ان کوششوں کا یہ اثر رہا ہے کہ یہود ونصاریٰ کی طرح اُمتِ مسلمہ من حیث المجموع کبھی ضلالت پر جمع نہیں ہوسکی!

لطیفانہ مضامین

مسلمانوں کے لٹریچر میں ہر قسم کی باتیں پائی جاتی ہیں، مگر وہ سب کی سب باتیں دین میں قابلِ حجت نہیں ہیں، دین کا اصول یہ ہے کہ جو عقائد دین میں مسلمات کی حیثیت رکھتے ہیں ان مسلمات کو توڑنے اور مجروح کرنے والی روایتوں اور نکتوں کو قبول نہیں کیا جاسکتا، چاہے وہ کسی بھی بڑی شخصیت سے منسوب کیوں نہ ہوں! جو کوئی اس قسم کی کمزور اور بے اصل روایتوں اور شاعرانہ قسم کے نکتوں کو کسی دینی مسئلہ میں بطور دلیل پیش کرتا ہے وہ عقل وبصیرت کا مذاق اڑاتا ہے اور خود دین پر ظلم کرتا ہے ــــــ مثلاً حضرت سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام کا "ذبیح" ہونا ایک مسلمہ حقیقت اور واقعہ ہے مگر ایک دو مفسرین نے حضرت سیدنا اسحٰق علیہ السلام کو "ذبیح" قرار دیا ہے ــــــ شراب کی حرمت کے بارے میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں مگر کتابوں میں ایک ایسی واہی اور لغو روایت بھی ملتی ہے کہ دو صحابی شراب کی اباحت کے قائل تھے ــــــ تو کتابوں میں اس روایت کے نقل ہونے کی بنا پر کیا "شراب" کو مباح قرار دیا جاسکتا ہے ــــــ یہ روایت چونکہ دین کے ایک مسلمہ مسئلہ کے خلاف ہے لہٰذا اس کو رد کر دیا جائے گا! خاص طور سے تصوف کی کتابوں میں بعض ایسے نکتے اور لطائف ملتے ہیں جن کی زد دین وشریعت پر جاکر پڑتی ہے، ایسے نکتوں اور لطیفوں سے جو کوئی دینی مسائل میں سند لاتا ہے وہ دین کے ساتھ مذاق کرتا ہے۔ صحابہ کرام اور تابعین عظام نے "حقیقتِ محمدیہ" کو معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی اور نہ اس موضوع وعنوان پر گفتگو فرمائی، مگر بعض صوفیوں نے "حقیقتِ محمدیہ" کے بیان میں بڑی بے احتیاطی کا ثبوت دیا جس نے عبود اور نبی اور خدا کے تعلق اور فرق کو مشتبہ بنا دیا، جو حضرات باقاعدگی کے ساتھ "فاران" پڑھتے رہے ہیں اُن کو شاید یاد ہوگا کہ "فاران" میں ایک بہت بڑے صوفی بزرگ کے اس قول پر نکیر کی گئی تھی کہ ــــــ حضرت جبریلؑ نے حضرت سیدتنا مریم علیہا السلام کے رحم میں "حقیقتِ محمدیہ" پھونک دی، اس لئے حضرت عیسیٰ کو "ابن محمد" کہا جاسکتا ہے ــــــ قرآن کریم جسے "ابن مریم" کہتا ہے اُسے (علیہ السلام) کسی مرد کی "ابنیت" سے منسوب کرنا، قرآن کریم کی کھلی ہوئی مخالفت ہے، تصوف کے اس قسم کے لطائف ونکات کی دین میں نہ تو کوئی اصل ہے اور نہ وہ اس قابل ہیں کہ انہیں دلیل کے طور پر پیش کیا جائے، ولایت کو نبوت سے افضل سمجھنا یہ بھی اہلِ تصوف کے وہ مزلات ہیں جن پر حق پسند علماء نے ہمیشہ نکیر کی ہے اور اس قسم کی ذہنی موشگافیوں کو دین کے لئے مضرت رساں قرار دیا ہے۔

کتابوں میں بعض صوفیاء کے ایسے اقوال اور دعوے بھی ملتے ہیں جن میں الوہیت کی جھلک پائی جاتی ہے اور ذاتِ رسالتمآب سے ہمسری کا پہلو نکلتا ہے ــــــ ایسے دعوے اور اقوال ٹھکرا دینے کے قابل ہیں، اس قسم کے اقوال اور دعووں سے اگر کسی مدعی نبوت کی نبوت پر دلیل لائی جاتی ہے تو سمجھ لیجئے کہ وہ نبوت کیا ہے ایک طرح کا کھیل ہے۔ شاعری اور تصوف کسی دینی مسئلہ میں نہ حجت بن سکتے ہیں اور نہ اُن سے سند لائی جاسکتی ہے! میر تقی میرؔ کو لوگ "خدائے سخن" لکھتے ہیں ـــ تو اس شاعرانہ غلو کو کیا کسی شخص کے دعویٰ الوہیت کی دلیل میں پیش کیا جاسکتا ہے! شاعروں اور ادیبوں کو "پیغمبر شعر وادب" جیسے القاب سے نوازا گیا ہے، مولانا رومؒ کی مثنوی کو ...

ہست قرآں در زبان پہلوی

کہا گیا، علامہ اقبال کی مدح میں یہ مصرعہ بہت مشہور ہے :-

پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

ایک شاعر نے اپنی شاعری کے بارے میں اس حد تک مبالغہ کیا :- "

ایک ایک حرف میرا اترتا ہے عرش سے
میری بیاضِ شعر خدا کی کتاب ہے

شعر و ادب کے یہ مبالغے دینی مسائل میں نہ حجت ہیں، نہ سند ہیں اور نہ اُن کا ذرہ برابر کوئی وزن اور حیثیت ہے!

پھر جو صوفیا اپنے بعض دعووں میں خاصے غیر محتاط ہو گئے ہیں، اُنہوں نے "نبوت" کا کوئی انسٹی ٹیوشن قائم نہیں کیا، تصوف کے جتنے سلسلے پائے جاتے ہیں، اُن میں کوئی صاحب سلسلہ یا بانیٔ سلسلہ اس کا مدعی نہیں ہے کہ ہمارے سلسلہ سے جو باہر ہے وہ دین سے خارج ہے۔ ہر چھوٹے سے بڑے صوفی نے اسلام، قرآن اور پیغمبر اسلام کی طرف دعوت دی ہے، اپنی ذات اور سلسلہ کو کفر و اسلام کا معیار نہیں بنایا! علامہ اقبال نے بڑی ہی بات کہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی ایسی شخصیت نہیں ہو سکتی جس کے ماننے یا نہ ماننے پر کفر و اسلام کا مدار ہو، تصوف کے جتنے سلسلے پائے جاتے ہیں اُن سے جو لوگ وابستہ اور منسلک ہیں وہ ایک دوسرے کے پیچھے نمازیں پڑھتے ہیں، اُن کی آپس میں بیاہ شادیاں ہوتی ہیں، وہ ایک دوسرے کو مسلمان اور ایک ہی نبی کی اُمت سمجھتے ہیں! کسی صوفی اور صاحب سلسلہ کے نام کے ساتھ "علیہ السلام" نہیں لکھا جاتا، اور اُن کے مریدین کو "رضی اللہ عنہم" نہیں کہا جاتا، اس آسمان کے نیچے، اور اس زمین کے پردے پر اگر کوئی ایسا "سلسلہ" پایا جائے، جو مسلمانوں کے جنازے کی نماز نہ پڑھتا ہو جس کا یہ دعویٰ اور اعتقاد ہو کہ "بانیٔ سلسلہ" پر ایمان لائے بغیر نہ کسی کا ایمان معتبر ہے اور نہ کسی کی نجات ہو سکتی ہے — تو پھر ایسے "سلسلہ" کا بانی کوئی صوفی یا شیخ طریقت یا مجدد نہیں ہے بلکہ "نبوت" کے منصب کا مدعی ہے، اور یہ سلسلہ نہیں ہے "نبوت" ہے! اور مسلمان حضور خاتم النبیین کے بعد کسی جدید نبوت کو تسلیم نہیں کرتے اور مدعیٔ نبوت کو جا ہے وہ کسی دور میں پیدا ہوا ہو، سچا اور خدا کی طرف سے بھیجا ہوا نہیں مانتے کیونکہ حضور خاتم النبیین پر نبوت ختم کر دی گئی۔

نبی نہ شاعر ہوتا ہے اور نہ نثر نگار — اور....؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں "صاحب جوامع الکلم" تھے مگر شاعر نہیں تھے، قرآنِ کریم میں اس کا اعلان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو شاعری نہیں سکھائی اور شعر گوئی حضور کے شایان شان بھی نہیں ہے اس سے معلوم ہوا کہ شاعری نبوت کے لئے وجہِ عار ہے — اور اگر کوئی نبی شعر کہے — تو اس کی شاعری کو تمام شعراء کی شاعری سے بلند اور ممتاز ہونا چاہیے تھا! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی کتاب بھی تصنیف نہیں کی! اور اس میں اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی حکمت پوشیدہ تھی کہ کتابت و خواندگی اور تصنیف و تالیف کے عام ہونے سے صدیوں پہلے حضور کو مبعوث کیا گیا اور حضور کی بعثت پر نبوت کا دروازہ بند کر دیا گیا! اور شاعری اور نثر نگاری نبوت کا وصف اور نبی کا شایانِ شان قرار نہیں پائیں اور یہ بھی نبوت کی ایک شان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سیرت کے علاوہ صحت جسمانی اور حسن و جمال میں بھی اپنی آپ مثال تھے۔ یہ درست ہے کہ دین میں نسل و رنگ کو نہیں "تقویٰ" کو عظمت و تکریم کا سبب قرار دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کے نزدیک تکریم

کے قابل اہلِ تقویٰ ہیں ——— مگر جب تزکیہ و تقویٰ اپنے کمال کو پہونچ گیا ہو اور تمام دوسری صفاتِ حسنہ بھی کسی انسان میں پائی جاتی ہوں اور وہ شخص کسی معزز و شریف گھرانے میں پیدا ہوا ہو تو اس نسبی نسبت کا ذکر بھی کیا جاتا ہے، یعنی تقویٰ کی صفت پائے جانے کی حالت میں نسبی شرف بھی قابلِ ذکر ہو جاتا ہے، اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صفات و کمالات کا ذکر کرتے ہوئے اربابِ سیر اور اہلِ تاریخ یہ بھی لکھتے ہیں کہ حضور عرب کے اشرف ترین قبیلے میں پیدا ہوئے تھے۔ اور قریش ہی عرب میں سب سے ممتاز تھے اور قریش میں بھی بنو ہاشم کو عرب سب سے زیادہ معزز اور شریف مانتے ہیں:

پاکستان اور ہندوستان میں سید، شیخ، مغل، پٹھان وغیرہ "ذاتیں" مسلمانوں میں پائی جاتی ہیں بعض دوسرے ملکوں میں بھی مسلمانوں کے درمیان حسب و نسب، قبیلوں اور خاندانوں کا امتیاز پایا جاتا ہے، ہم یہ نہیں کہتے کہ دینی طور پر ان "ذاتوں" اور قبیلوں اور انساب کی کوئی بنیادی حیثیت ہے، عرض کرنا یہ ہے کہ مسلمانوں کے عرفِ عام میں وہ قبیلے نسبتاً زیادہ بلند سمجھے جاتے ہیں جو عرب سے، قریش سے اور خاندانِ نبوت سے نسبی تعلق رکھتے ہیں ——— اس لئے (نعوذ باللہ) بہ فرضِ محال دنیا میں حضور کے بعد کوئی نبی پیدا ہوتا تو اُسے اُس قبیلہ میں پیدا ہونا چاہئے تھا، جس قبیلہ کو تمام مسلمان بلند اور معزز تر سمجھتے تھے۔

جھوٹے مدعی اس دنیا میں پاگلوں، بے وقوفوں اور اخلاق باختہ لوگوں کی کمی نہیں رہی، آج کی متمدن دنیا میں عریانوں اور ننگوں کے کلب قائم ہیں، اخلاقی گراوٹ کی حد ہو گئی کہ انگلستان میں "خلاف وضع فطری" جیسے گھناونے فعل کو قانونی طور پر جائز ٹھیرایا گیا اور سب سے زیادہ شرم کی بات یہ ہے کہ یہ سانحہ ایک خاتون کے دورِ حکومت میں ظہور میں آیا! اس قسم کی برائیوں اور عقیدہ و عمل کی غلطیوں پر ہر دور میں نکیر کی گئی ہے اور کی جانی چاہئے!

راقم الحروف جن دنوں حیدرآباد دکن میں مقیم تھا کو تماپور نام کی بستی کے ایک وکیل نے جس کا نام "عبداللہ" تھا، نبوت کا دعویٰ کیا، اور کہا کہ مجھ پر یہ وحی آئی ہے ———

یا ایھا النبیؐ تماپور میں رہیو

یہ نبیِ کاذب اللہ اور رسول کو بھی مانتا تھا، نماز بھی پڑھتا تھا، قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ آخری کتاب بھی سمجھتا تھا مگر نبوت کا دعویٰ کرنے کے بعد اُس کے اس "مان لینے" کا اور ان عقائد کا کوئی وزن و اعتبار ہی نہیں رہا، ہمیں اس کا علم نہ ہو سکا کہ آخر میں اُس کے کیا حالات رہے، خدا کرے اُس نے صدقِ دل سے توبہ کر لی ہو اور اُس کا خاتمہ ایمان اور اسلام پر ہوا ہو۔

نبوت کے دعوے کے ساتھ یہ صورت بھی دیکھنے میں آتی ہے کہ مدعیِ نبوت حلول و اتحاد کی باتیں کرنے لگتا ہے یہاں تک کہ یہ سرے بڑھتے بڑھتے الوہیت کے دعوے تک پہونچ جاتی ہے، بہائی مذہب کی تعلیمات اس کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہیں

ہمارے زمانے میں ایلیجا (ELIJA MUHAMMAD) نے پیغمبر (MESSENGER OF GOD) ہونے کا دعویٰ کیا ہے، شکاگو اس مدعیِ رسالت کا مرکز ہے، یہ شخص اپنے کو مسلمان کہتا ہے، قرآن کریم کو مانتا ہے، اس کو ماننے والی عورتیں پردہ کرتی ہیں! اُس کا کہنا یہ ہے کہ محمد عربی کو اللہ تعالیٰ نے عرب میں مبعوث کیا تھا اور مجھے امریکہ میں بھیجا ہے! ایلیجا یہ بھی کہتا ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی کتاب کا انتظار ہے جب وہ نازل ہو جائے گی تو کافر اور غیر کافر کا فیصلہ بھی ہو جائے گا، اس نبیِ کاذب

نے دسمبر کا مہینہ رمضان کے لئے مقرر کیا ہے' اُس کا عام اعلان ہے کہ سفید فام نیلی آنکھوں والا شخص مسلمان نہیں ہو سکتا، لاکھ ڈیڑھ لاکھ "نیگرو" اُس کے دامِ تزویر میں گرفتار ہو کر ایلیجا[1] (ELIJAH) کی امت میں داخل ہو چکے ہیں، اُس کے امتی لاکھوں بلکہ کروڑوں ڈالر نذرانہ کے طور پر دیتے ہیں ـــــ مشہور باکسر اور عالمی چیمپین مسٹر کلے بھی اس نبیؑ کاذب کا پیرو ہے اور اسلام کا مدعی ہے' کاش! اُسے کوئی بتاتا کہ مسلمان وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں شامل ہے اور حضورؐ کو آخری نبی مانتا ہے' نبوت کا دعویٰ کرنے کے بعد ایلیجا مسلمان ہی نہیں رہا' اس صورت میں اُس کے ماننے والوں کو بھی مسلمان نہیں کہا جا سکتا یہ شخص اپنے دعوے میں جھوٹا ہے اور اُس کی نبوت خانہ ساز ہے' شیطان نے اس کے دل میں جو باتیں ڈالی ہیں، اُن کو ایلیجا نے کشف اور وحی والہام سمجھ لیا ہے! اُس کی دعوت اپنی خود ساختہ نبوت کی طرف ہے اسلام اور قرآن کی طرف نہیں ہے۔

ختم نبوت کا عقیدہ اور وحدتِ امت

اُمت کے تمام فرقوں کو جوڑنے والا "ختم نبوت" کا عقیدہ ہے کیونکہ مسلمانوں کے تمام فرقے اپنے تمام اختلافات کے باوجود اس عقیدے (ختم نبوت) پر متفق ہیں' اُس کے مقابلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد "جدید نبوت" کا عقیدہ امت کے اتحاد میں تفرقہ پیدا کرتا ہے ـــــ اس لئے "ختم نبوت" کے عقیدے کا ذکر اور اُس کی دینی اہمیت کو اُجاگر کرنا درحقیقت اُمت محمدیہ کی وحدت کو مضبوط کرنا ہے' اُمت میں اختلاف' تفرقہ' کشمکش اور نزاع تو "جدید نبوت" کے اعلان اور عقیدے سے پیدا ہوتی ہے۔

جہاں تک الزام لگانے اور تہمتیں جوڑنے کا تعلق ہے' لوگوں نے قرآن کریم کو بھی ہدف بنایا ہے کہ اس صحیفہ نے کفر واسلام اور مسلم وکافر کی تفریق پیدا کرکے انسانی وحدت کو مجروح کیا ہے (معاذ اللہ ـــــ استغفر اللہ ـــــ اس تصور سے کروڑوں بار خدا کی پناہ) ہندوستان میں جن سنگھی آج ایسی وحشیانہ اور مجنونانہ باتیں کر رہے ہیں کہ اسلامی عقائد سے بھارت کی "ایکتا" (وحدت) ٹکڑے ٹکڑے ہوتی ہے اور بھارت میں جہاں بھی مسلمانوں کی مسجد پائی جاتی ہے وہاں پاکستان موجود ہے ـــــ مگر اہل دانش اور صاحبان فہم وبصیرت ایسی باتیں نہیں کیا کرتے' وہ اس حقیقت کو جانتے ہیں کہ کسی غلط قسم کے دعوے کی تردید پر افتراق اور اختلاف کی پھبتی نہیں کسی جا سکتی! یہ کوئی معقول بات نہیں ہے کہ ہر شخص "خدا" اور "نبی" ہونے کا دعویٰ تو کر سکتا ہے' مگر اس کی تردید نہیں کرنی چاہیئے اس سے انتشار پھیلتا ہے' (توبہ!)

ہم مسلمان یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر "نبوت" کو ختم کر دیا اور حضورؐ کے بعد جو کوئی بھی نبوت کا دعویٰ کرے گا اُس کی تکذیب ہی کی جائے گی، اور قرآن کریم میں جو آیتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں نازل ہوئی ہیں، اُن کا مصداق حضورؐ کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتا ـــــ ہر مسلمان اسی عقیدے پر مرنا اور جینا چاہتا ہے!

ماہر القادری
۲۷ اگست

---

[1] اُردو اخبار ایلیجا کو جو "عالیجاہ" لکھتے ہیں تو وہ املا اور ترجمہ کی صریح غلطی کا ارتکاب کرتے ہیں!

طیب شاہین لودھی

امام طبریؒ کیا تھے؟

"خلافت و ملوکیت" پر بعض حلقوں کی طرف سے جس طرز پر لے دے ہو رہی ہے وہ بہت افسوس ناک ہے اور علماء میں سے بعض حضرات نے آئمہ کبار کو جس طرح مطعون کرنا شروع کیا ہے وہ بھی کچھ کم المناک نہیں۔ محض ایک شخص کی مخالفت میں بعض "محققین" کی علمی دیانت کے عجیب غریب کرشمے دیکھنے میں آ رہے ہیں۔

ان میں سے ایک "محقق عالم" نے امام طبریؒ کے متعلق وہ باتیں کہی ہیں جو ایک محقق کو زیب نہیں دیتیں پچھلے دنوں الشیعہ میں (شمارہ ۵۵ - جلد ۱۶ - ۱۰ ستمبر ۱۹۶۸ء) ایک خط و کتابت شائع ہوئی ہے، اس میں محمود احمد عباسی صاحب نے نورانی صاحب کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ امام ابن جریر طبری شیعہ تھے، اس طرح اپنی دانست میں انہوں نے "خلافت و ملوکیت" کے ماخذ کی وقعت کم کرنے کی کوشش کی ہے۔

امام ابن جریر طبری کے متعلق مجھ جیسا مبتدی بھی یہ معلومات رکھتا ہے کہ ان کو بہت بلند مرتبہ علماء نے خراج تحسین پیش کیا ہے اور ہمیشہ ان سے استناد کیا جاتا رہا ہے۔ عباسی صاحب نے نورانی صاحب کو لکھا ہے:۔ "طبری کے شیعہ مسلک ہونے کے ثبوت "المنجد" کی چند سطری عبارت کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہیں" آیئے ہم دیکھتے ہیں وہ کون سے "چند سطری" ثبوت ہیں جو مولانا موصوف کے ہاں قابل قبول نہیں امامت کے دیگر علماء ان "چند سطروں" سے صرف نظر نہیں کر سکتے۔

ہمارے درس نظامی کے مدارس میں جو تفسیر بیضاوی پڑھائی جاتی ہے اس کے حاشیہ کے مقدمہ میں استاذ الحدیث مولانا رشید احمد لودھیانوی۔ طبقات المفسرین کے ذیل میں امام طبری کے متعلق لکھتے ہیں۔

ثم ابن جریر الطبری وکتابہ اجل التفاسیر واعظمہا وھو محمد بن جریر بن یزید الامام الطبری الاصلی احد الاعلام وصاحب التفسیر والتاریخ والتصانیف ولد بآمل طبرستان سنہ ۲۲۴ھ ورحل لطلب العلم قراء علی کثیرین وتفقہ علیہ خلق کثیر قال الخطیب کان احد ائمۃ العلماء ویحکم بقولہ ویرجع الی رأیہ لمعرفتہ وفضلہ ۔ کان قد جمع من العلوم

پھر طبری کا نام آتا ہے۔ ان کی تفسیر تمام تفاسیر میں زیادہ مرتبہ اور عظمت والی ہے ان کا نام محمد بن جریر بن یزید امام طبری آملی ہے۔ ان کا شمار آئمہ اعلام میں ہوتا ہے۔ تفسیر تاریخ اور دیگر تصانیف کے مصنف ہیں "آمل" طبرستان کے علاقہ میں پیدا ہوئے۔ طلب علم کے لئے سفر کئے اور کثیر علماء سے علم حاصل کیا اور ان سے ایک خلق کثیر نے استفادہ کیا امام خطیب البغدادی فرماتے ہیں "وہ (ابن جریر) آئمہ اہل علم میں سے تھے۔

مالم یشارکہ احد من اھل عصرہ وکان حافظاً لکتاب اللہ وعارفاً بالقرآن بصیراً بالمعانی فقیھاً فی احکام القرآن عالماً بالسنن وطرقھا وصحیحھا وسقیمھا ناسخھا ومنسوخھا عارفاً باقوال الصحابہ والتابعین عارفاً بایام الناس واخبارھم ولہ کتاب (تھذیب الاثار) لم ار مثلہ فی معناہ لکن لم یتم ولہ فی اصول الفقہ وفروعہ کتب کثیرۃ واختار من اقاویل الفقھاء وتفرد بمسائل حفظت عنہ ۔ قال ابو محمد عبد اللہ بن احمد الفرغانی صاحب ابن جریر: ان قوماً من تلامذتہ حسبوا لہ منذ بلغ الحلم الی ان مات ثم قسموا علی تلک المدۃ اوراق مصنفاتہ فصار لکل یوم اربع عشرۃ ورقۃ ۔ و قال ابو حامد الاسفرائینی امام الشافعیۃ " لو سافر رجل الی الصین حتی یحصل تفسیر ابن جریر لم یکن کثیراً "

ان کے علم وفضل کی وجہ سے ان کے قول کے مطابق فیصلہ دیا جاتا تھا اور ان کی رائے کی طرف رجوع کیا جاتا تھا انہوں نے بہت سے علوم جمع کئے جن میں ان کے ہمعصر علماء میں سے کوئی بھی ان کا ہمسر نہ تھا ۔ وہ کتاب اللہ کے حافظ تھے قرآن کے معانی میں بصیرت رکھنے والے اور اس کے احکام میں تفقہ رکھنے والے تھے وہ سنت اور اس کے تمام طرق کے عالم تھے ۔ صحیح اور سقیم کی پرکھ رکھنے والے تھے ۔ ناسخ و منسوخ کو جانتے تھے اقوال صحابہ و تابعین کے عارف تھے ، عام لوگوں کی تاریخ اور ان کے اخبار سے واقف تھے ، ان کی کتاب تہذیب الآثار جیسی میں نے کوئی کتاب نہیں دیکھی اگرچہ وہ اسے پایہ تکمیل کو نہیں پہونچا سکے اصول و فروع میں ان کی دوسری بھی بے شمار کتابیں ہیں ۔ انہوں نے فقہا کے اقوال میں سے ہی احکام اخذ کئے ہیں اور بعض میں جو اُن سے منقول ہیں تفرّد بھی کیا ہے ، ابو محمد عبد اللہ بن احمد الفرغانی جو ابن جریر کے شاگرد ہیں کہتے ہیں ، ان کے شاگردوں نے حساب لگایا اور امام ابن جریر نے مدت بلوغ سے وفات تک جتنی کتابیں لکھی ہیں ان کے اوراق کو دنوں پر تقسیم کیا تو چودہ اوراق روزانہ بنتے ہیں ابو حامد اسفرائینی جو ائمہ شافعیہ میں شمار ہوتے ہیں لکھتے ہیں " ابن جریر کی تفسیر حاصل کرنے کے لئے اگر چین بھی جانا پڑے تو یہ فاصلہ کچھ زیادہ نہیں "

اکابر علما امام ابن جریر کا نام نہایت عزت و احترام سے لیتے ہیں ۔ ان کی علمیت اور معرفت علوم تفسیر و حدیث کے قائل ہیں اگرچہ بعض مسائل میں متفرد ہیں اس تفرد کی وجہ سے ان کی عظمت میں فرق نہیں آتا ۔ یہ تفرد ائمہ کبار تک میں کسی نہ کسی مسئلہ میں پایا جاتا ہے اور شاید اسی تفرد کی وجہ سے بعض لوگوں نے اُن سے شیعیت کو منسوب کیا ہے ۔

علامہ شبلی مرحوم اپنی مشہور کتاب سیرت النبی میں لکھتے ہیں " تاریخی سلسلہ میں سب سے جامع اور مفصل کتاب امام طبریؒ کی تاریخ کبیر ہے ، طبری اس درجہ کے شخص ہیں کہ تمام محدثین ۔۔ ان کے فضل و کمال و ثوق اور وسعت علم کے معترف ہیں ۔ ان کی تفسیر احسن التفاسیر خیال کی جاتی ہے ۔ محدث ابن خزیمہ کا قول ہے کہ دنیا میں میں کسی کو اُن سے بڑھ کر عالم نہیں جانتا "

(سیرۃ النبی جلد اوّل ص ۲۷ طبع سوم معارف اعظم گڑھ)

۔ محدث سلیمانی نے ان کی نسبت لکھا ہے کہ یہ شیعوں کے لئے حدیثیں وضع کیا کرتے تھے ، لیکن علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال

میں لکھا ہے " ھذا رجم بالظن الکاذب بل ابن جریر من کبار آئمۃ الاسلام المعتمدین " ۔ یہ جھوٹی بدگمانی ہے بلکہ واقعہ یہ ہے ابن جریر اسلام کے معتمد اماموں میں سے ایک بڑے امام ہیں ۔ علامہ ذہبی نے اس موقعہ پر لکھا ہے ۔ ان میں فی الجملہ تشیع ہے لیکن مضر نہیں ، تمام مستند تاریخیں مثلاً تاریخ کامل ابن الاثیر ۔ ابن خلدون اور ابو الفدا وغیرہ ان ہی کی کتاب سے ماخوذ ہیں اور اسی کتاب کے مختصرات ہیں " (سیرت النبی جلد اول ص۲۷)

حافظ سلیمانی (احمد بن علی السلیمانی) کو محمد بن جریر بن یزید الطبری اور محمد بن جریر بن رستم الطبری کے ناموں سے مغالطہ ہوا ہے وہ محمد بن جریر بن رستم کی جگہ امام طبری کو شیعہ سمجھ بیٹھے ہیں ۔ محمد بن جریر بن رستم واقعی شیعہ تھا ۔

(ملاحظہ ہو میزان الاعتدال علامہ ذہبی جلد سوم ص۲۵)

علامہ ذہبی اس کے ساتھ ہی لکھتے ہیں :۔

" ہمارے لئے ہرگز جائز نہیں ہے کہ ہم انہیں (ابن جریر کو) باطل اور ہوائے نفس کے الزام سے ہدف بنا دیں ۔ علماء کا قول ایک دوسرے کے معاملے میں زیادہ غور و فکر کا حاجت مند ہے اور خاص طور پر جبکہ انہوں نے کسی بڑے امام کے متعلق اظہار خیال کیا ہو "

(میزان الاعتدال جلد سوم ص۲۵)

علامہ سیوطی کی جلالت شان اور ان کی وسعت نظر میں کسی کو کلام نہیں __________ اور ان کی معرکۃ الآرا کتاب " الاتقان فی علوم القرآن " محتاج تعارف نہیں علم تفسیر میں بلند پایہ کتاب مانی گئی ہے ۔

علامہ سیوطی صاحب الاتقان میں رقمطراز ہیں ۔

وبعدھم ابن جریر الطبری وکتابہ اجل التفاسیر واعظمھا ثم ابن ابی حاتم وابن ماجہ والحاکم وابن مردویہ وابو الشیخ ابن حبان وابن المنذر، فی آخرین وکلھا مسندۃ الی الصحابۃ والتابعین واتباعھم لیس فیھا غیر ذلک الا ابن جریر فانہ یتعرض لتوجیہ الاقوال وترجیح بعضھا علی بعض والاعراب والاستنباط فھو یفوقھا۔

ان کے بعد ابن جریر ہیں ان کی تفسیر تمام تفاسیر میں زیادہ مرتبہ اور عظمت والی ہے پھر ان کے بعد ابن ابی حاتم ابن ماجہ ، حاکم ، ابن مردویہ ابن حبان اور ابن منذر کا شمار ہے ۔ ان تمام تفاسیر کی اسناد صحابہ ، تابعین اور تبع تابعین تک پہنچتی ہیں ، اور ان میں مرویات کے سوا کچھ نہیں البتہ ابن جریر اقوال کی توجیہ اور ان کو ایک دوسرے پر ترجیح دینے اور اعراب و استنباط وغیرہ سے تعرض کرتے ہیں اس لحاظ سے ابن جریر کی تفسیر کو ان تمام تفسیر پر فوقیت حاصل ہے ۔

(الاتقان فی علوم القرآن الجزء الثانی ص۱۹۰ طبع ۱۳۱۸ھ)

علامہ سیوطی اسی صفحہ پر دوسری جگہ لکھتے ہیں :۔

قلت تفسیر الامام ابی جعفر بن جریر الطبری الذی اجمع العلماء المعتبرون علی انہ لم یؤلف فی التفسیر مثلہ قال النووی فی التھذیب کتاب ابن جریر

میں کہتا ہوں امام ابو جعفر ابن جریر طبری کی تفسیر جس پر معتبر علماء کا اجماع ہے کہ اس جیسی تفسیر کسی سے نہیں لکھی جا سکی ۔ امام نووی " تہذیب " میں لکھتے ہیں علم تفسیر میں ابن جریر جیسی

فی التفسیر بہ یصنف احد مثلہ ۔ کتاب کسی نے تصنیف نہیں کی ؟

علامہ سیوطی بھی اپنی مشہور کتاب " تدریب الراوی " میں ابن کامل کا قول نقل کرتے ہیں :۔

اربعة ما رأیت احفظ منھم محمد بن خیثمة وابن جریر و محمد البربری والمعمری

(ابن کامل نے کہا ہے) ان چاروں سے زیادہ حافظ میں نے کسی کو نہیں دیکھا ۔ محمد بن خیثمہ ، ابن جریر ، محمد البربری اور معمری

(تدریب الراوی صفحہ ۵۴۶)

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ کی عبقری شخصیت محتاج تعارف نہیں اور یہ بھی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ وہ اہل بدعت کے کتنے خلاف تھے ۔ ابن جریر کے متعلق لکھتے ہیں ۔

لیس فیہ بدعة ان میں بدعت نہ تھی ۔ (بحوالہ خلافت و ملوکیت صفحہ ۳۱۳)

شیخ الاسلام کے ہاں امام ابن جریر کی تفسیر کا کیا مرتبہ ہے اس کی درج ذیل عبارت سے ظاہر ہے ۔ تفسیر کے ضمن میں وہ ثعلبی کو حاطب اللیل کا لقب دیتے ہوئے منہاج السنہ میں لکھتے ہیں :۔

واما اھل العلم الکبار اصحاب التفسیر مثل تفسیر محمد بن جریر الطبری وبقی بن مخلد وابن ابی حاتم وابی بکر بن المنذر وامثالھم فلم یذکروا فیھا مثل ھذہ الموضوعات ۔

اور رہے کبار اہل علم ۔ اصحاب تفسیر جیسے محمد بن جریر طبری بقی بن مخلد ابن ابی حاتم اور ابوبکر ابن المنذر اور ان جیسے دوسرے اہل علم تو یہ لوگ اپنی تفاسیر میں موضوعات (جیسے کہ ثعلبی کی عادت ہے) کا ہرگز ذکر نہیں کرتے ۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی مندرجہ بالا عبارت سے مترشح ہوتا ہے کہ امام طبری موضوع روایات بیان نہیں کیا کرتے تھے ۔ اور ابن جریر طبری رحمۃ اللہ کی تفسیر اساطیر موضوعات کا پلندہ نہیں ہے جیسا کہ محترم محمود عباسی صاحب کا گمان ہے ۔

امام عبدالرزاق رحمۃ اللہ کا شمار جلیل القدر محدثین میں ہوتا ہے ان میں فی الواقع تشیع تھا لیکن اس کے باوجود تمام محدثین نے ان سے روایت کو قبول کیا ہے ۔ ان کے متعلق امام یحییٰ بن معین نے فرمایا " اگر عبدالرزاق مرتد بھی ہو جائیں تو ہم ان کی روایت قبول کریں گے (سیرت النبی علامہ شبلی)

حافظ ابن کثیر دمشقی جو مشہور مورخ اور مفسر قرآن ہیں ، ان کی اصابت رائے پر امت کو اعتماد ہے ، لکھتے ہیں ۔

وکان من العبادة والزھادة والورع والقیام فی الحق لا تاخذہ لومة لائم .... وکان من کبار الصالحین ۔

عبادت زہد و ورع اور حق پرستی میں انہیں کسی کی ملامت کی پرواہ نہیں تھی ..... اور ان کا شمار کبار صالحین میں ہوتا ہے ۔

پھر فرماتے ہیں :۔

ومن الجھلة من رماہ بالالحاد وحاشاہ من ذلک کلہ بل کان احد ائمة الاسلام علماء وعملا بکتاب اللہ وسنة رسولہ

اور کچھ جہلاء نے ان پر الحاد کا الزام لگایا ہے حالانکہ وہ اس بہتان سے بالکل بری ہیں حقیقت یہ ہے کہ وہ کتاب و سنت کے علم اور عمل کے لحاظ سے ائمہ اسلام میں شمار ہوتے ہیں ۔

(البدایہ والنہایہ جلد ۱۱ صفحہ ۱۴۶)

امام موصوف کو اس مسلک سے منسوب و مشہور کرنے میں مقابلہ سب سے پیش پیش ہیں۔ امام خطیب البغدادی امام ابن خزیمہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ انہوں نے تفسیر طبری کا شروع سے لے کر آخر تک مطالعہ کیا ہے، پھر انہوں نے امام ابن خزیمہ کا قول نقل کیا ہے۔

ما اعلم علی ادیم الارض اعلم من ابن جریر ولقد ظلمته الحنابلة۔

میں روئے زمین پر ابن جریر سے زیادہ کسی عالم نہیں جانتا حنابلہ نے ان پر ظلم کیا ہے۔

(البدایہ والنہایہ جلد ۱۱ صفحہ ۱۴۶)

امام ابن جریر طبری کا تعارف امام ابن الاثیر ان الفاظ میں کراتے ہیں۔

هو الامام المتقن حقا الجامع علما وصحة اعتقاد وصدقا۔

وہ قابل اعتماد امام اور سچے تھے علم اور صحت اعتقاد کا مجموعہ اور راست گو تھے۔ (خلافت و ملوکیت ص ۳۱۲)

ابن خلدون کہتے ہیں :-

اعتمدنا للوثوق به ولسلامته من الاهواء

ہم نے ان پر ان کی ثقاہت کے سبب اور اہواء سے پاک ہونے کی وجہ سے بھروسہ کیا ہے (خلافت و ملوکیت ص ۳۱۲)

امام ابن حجر لکھتے ہیں :-

من کبار ائمة الاسلام

وہ عظیم ائمہ اسلام میں سے تھے (خلافت و ملوکیت ص ۳۱۲)

جرح و تعدیل کے اصول

راویوں کی جرح و تعدیل کے سلسلے میں ماہرین فن نے اصول وضع کئے ہوئے ہیں بس یوں ہی نہیں کہ جس راوی کے متعلق جی چاہا تو اسے کذاب ٹھہرا دیا۔ یا اہل بدعت کے زمرے میں کھڑا کر دیا۔

وتثبت عدالة الراوی باشتهاره بالخیر والثناء الجمیل علیه او بتعدیل الائمة او اثنین منهم له۔ او واحد علی الصحیح۔

صحیح بات یہ ہے کہ راوی جب بھلائی سے مشہور ہو جائے اور ہر طرف سے اس پر ثنائے جمیل ہی ہو۔ یا ائمہ حدیث میں سے ایک یا دو نے اس کی تعدیل کی ہو تو اس کی عدالت ثابت ہو جاتی ہے۔

(مختصر علوم الحدیث لابن کثیر صفحہ ۹۳ مع شرحہ الباعث الحثیث)

علامہ ابن البر نے تو اس معاملہ میں مزید توسع سے کام لیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

کل حامل علم معروف العنایة به فهو عدل محمول امره علی العدالة حتی یتبین جرحه

کوئی بھی حامل علم جو اعتنا میں معروف ہو پس وہ عادل ہے اس کا معاملہ عدل پر محمول ہوگا جب تک اس کی تجریح کا مجروح ہونا واضح نہ ہو

جرح و تعدیل پر بحث کرتے ہوئے "الباعث الحثیث" کے مصنف نے حافظ ابن حجر العسقلانی کا قول نقل کیا ہے۔

وان کان من جرح مجملا قد وثقه احد من ائمة هذا الشان لم یقبل الجرح فیه من احد کائنا من کان الا مفسرا لانه قد ثبتت له رتبة الثقة

اور اگر جرح مجمل ہو اور اس راوی کو کسی امام نے ثقہ تسلیم کیا ہو تو پھر کسی کی جرح (مجمل) قبول نہیں کی جائے گی چاہے وہ کوئی بھی ہو۔ الا یہ کہ وہ وجوہ بیان کرے۔ کیونکہ اس راوی

فلا يخرج عنها الا بامر جلي فان ائمة هذا الشان لا يوثقون الا من اعتبروا حاله في دينه ثم في حديثه ونقدوه كما ينبغي وهم ايقظ الناس

کا ثقہ ہونا ثابت ہو چکا ہے اور کسی امر جلی کے بغیر اسے اس مرتبہ سے ہٹایا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ اس شان کے ائمہ راویوں کو ویسے ہی ثقہ نہیں کہہ دیتے جب تک کہ وہ ان کی دینی حالت اور پھر حدیث میں پوری طرح غور نہیں کر لیتے اور تنقید کے تمام پہلوؤں سے اچھی طرح تول نہیں لیتے وہ احتیاط میں تمام لوگوں سے بڑھے ہوئے ہیں۔ (الباعث الحثیث شرح علوم الحدیث ص۹۵)

اور علامہ ذہبی کا تو یہ مقولہ ہے کہ ثقہ راوی کی تضعیف پر دو اماموں کی رائے ایک نہیں ہوئی اور نہ کسی ضعیف راوی کی توثیق پر دو امام متفق ہوئے ہیں اور امام نسائی کا مذہب تھا "لا یترک حدیث الرجل حتی یجتمعوا علی ترکہ" کسی شخص کی حدیث کو اس وقت تک ترک نہیں کیا جائے گا جب تک اس کے ترک کرنے پر سب متفق نہ ہوں" (الباعث الحثیث ص۹۶)

امام طبری کو تو جلیل القدر علماء ثقہ، حافظ اور ائمہ کبار میں شمار کرتے ہیں۔ ہم حافظ سلیمانی کی جرح کو ان جلیل القدر ائمہ حدیث کی توثیق پر کس طرح ترجیح دے سکتے ہیں اور وہ بھی جبکہ حافظ سلیمانی کی رائے صریح مغالطے پر مبنی ہے۔

امام طبری کے متعلق یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ان میں کسی حد تک تشیع پایا جاتا ہے تو وہ امام ذہبی کے قول کے مطابق مضر نہیں اگرچہ ان میں فی الجملہ تشیع کا پایا جانا بھی محل نظر ہے۔ قطع نظر اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ صحیحین کے راویوں تک میں ایسے راوی پائے جاتے ہیں جن کا تشیع کی طرف مائل ہونا مسلم ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے چالیس کے لگ بھگ ایسے راویوں کے نام نقل کئے ہیں جن سے شیخین نے تشیع کو ظن ہونے کے باوجود بھی روایت کی ہے (ملاحظہ ہو قواعد التحدیث ص۱۹۵)

حافظ ابن الصلاحؒ نے بھی یہی لکھا ہے۔ "غیر داعی مبتدعین سے صحیحین میں روایات موجود ہیں" (ملاحظہ ہو مختصر علوم الحدیث لابن کثیر ص۹۹) جمہور محدثین نے مبتدعین کی روایت کو قبول کیا ہے۔ علامہ عراقی "شرح مقدمہ ابن الصلاح" میں رقمطراز ہیں۔ "مبتدع داعی سے اگر جھوٹ ثابت نہ ہو تو اس کی روایت قبول کی جائے گی" پھر انہوں نے لکھا ہے کہ شیخین نے ان سے روایت قبول کی ہے۔ امام بخاریؒ نے عمران بن حطان (جو ایک مشہور خارجی تھا) سے احتجاج کیا ہے حالانکہ عمران بن حطان ابن ملجم کا بڑا مداح تھا (ملاحظہ ہو قواعد التحدیث ص۱۹۶، مختصر علوم الحدیث ص۱۰۱) شیخین نے عبدالحمید بن عبدالرحمن الحمانی (جو ارجاء کا داعی تھا) سے روایت قبول کی ہے۔

(ملاحظہ ہو قواعد التحدیث ص۱۹۴)

امام ابو داؤد السجستانی کا قول ہے کہ اہل ہوا میں سے روایت حدیث کے معاملہ میں خوارج سے زیادہ کوئی معتمد نہیں۔ علامہ ابن حجر العسقلانی نخبۃ الفکر میں لکھتے ہیں۔

والتحقيق انه لا يرد كل مكفر ببدعته لان كل طائفة تدعي ان مخالفيها مبتدعة وقد تبالغ فتكفر مخالفيها فلو اخذ ذلك على الاطلاق لاستلزم تكفير جميع الطوائف فالمعتمد ان الذي ترد روايته من انكر امرا متواترا من الشرع

اور تحقیق یہ ہے کہ ہر ایک جس کی کسی بدعت کی وجہ سے تکفیر کی گئی ہو اس کی روایت کو رد نہیں کیا جائے گا کیونکہ ہر گروہ اپنے مخالفین کو مبتدعین کے زمرے میں شمار کرتا ہے اگر اس اصول کو (یعنی رد روایۃ المبتدعۃ) علی الاطلاق سے لیا جائے تو تمام گروہوں کی تکفیر لازم آئے گی۔

ما من الدین بالنص ورة او اعتقد عکسه

بل اعتماد مسلک یہ ہے کہ صرف اس کی روایت رد کی جائے گی جو شریعت میں کسی ایسی بات کا انکار کرے جس کا امر دین ہونا تواتر
سے ثابت ہو، یا اس کے برعکس۔

اگر اسی طرح کبار اہل علم کے معاملے میں ایک دو آدمیوں کے طعن کو قبول کرتے ان کی احادیث کو رد کر دینے کا اصول علی الاطلاق
جاتے تو ائمہ اسلام میں سے شاید ہی کوئی ایسی شخصیت ملے گی جو اس اصول کے مطابق مجروح نہ ہو۔ یہی وجہ ہے اصحاب اہل علم
ابی ذئب کی رائے امام مالک کے بارے میں کبھی قبول نہیں کی، امام ثوری، امام بیہقی، امام دارقطنی کو ابو حنیفہ کے متعلق تر
نہیں سمجھا گیا، امام یحییٰ بن معین کی جرح امام شافعی کے بارے میں قبول نہیں کی گئی، امام احمد بن حنبل امام اوزاعی کے متعلق
اظہار خیال کرتے ہیں۔

"رای ضعیف، حدیث ضعیف"

اس کے علاوہ اور بھی بہت سی مثالیں ہیں، سب جانتے ہیں کہ امام ثوری، امام یحییٰ بن معین، امام بیہقی اور امام دارقطنی رحمہم اللہ
کی جلالت شان مسلّمہ ہے اور ان کی جرح و تعدیل کو وزن حاصل ہے، جرح و تعدیل میں علماء ان سے سند لیتے ہیں، ان میں امام
ی تو امام الجرح والتعدیل کے لقب سے مشہور ہیں۔

کیا حافظ سلیمانی یا بعض حنابلہ کے قول پر امام ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ سے استناد ترک کر دیا جائے گا جبکہ حنابلہ کی بہ
جلیل القدر علماء نے امام ابن جریر طبری کو علماء کبار میں شمار کیا ہے۔

اہم سوال ہم جناب محمود عباسی صاحب سے ایک سوال کرتے ہیں کہ اگر وہ امام طبری کی توثیق میں تمام علماء فحول کی تصریحات
کو "چند سطری ثبوت" قرار دیتے ہوئے ان کی تعدیل میں چند شاذ اقوال کی بنا پر کلام کرتے ہیں اور ان سے سخت
ب کرتے ہیں تو دوسرے ائمہ کبار کا جن سے احتجاج و استناد قریباً متفق علیہ ہے، کس طرح دفاع کریں گے، خاص طور پر ان
کا جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

رہا تفسیر طبری میں ضعیف روایات کا موجود ہونا تو یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے، امام موصوف نے اپنی تفسیر میں تمام روایات کے
ہونے کا دعویٰ کب کیا تھا؟ صحیحین کے علاوہ کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جس میں ضعیف روایات موجود نہ ہوں بلکہ صحیحین کی چند احادیث پر بھی
علماء نے کلام کیا ہے اور بعض نے اس کا جواب بھی دیا ہے۔ امام طبری نے تفسیر و تاریخ سے متعلق تقریباً تمام روایات کو جمع کر کے امت پر
احسان کیا ہے علماء صحیح اور سقیم کے فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے آج تک ان کی تفسیر ... [illegible] ... بھی مستفید ہوتے رہیں گے۔

(مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے "خلافت و ملوکیت" میں امام طبری کی تاریخ سے استناد کر کے اور تاریخ طبری کے حوالے
دے کر کوئی ایسی بات نہیں کی جو اہل علم کے نزدیک غیر علمی ہو۔ بنا بریں اس کے مقابل میں محمود عباسی صاحب نے امام طبری کو بے وقعت
ٹھہرانے اور مجروح کرنے کی جو کوشش فرمائی ہے وہ علم و ثقاہت کے اعتبار سے بے وزن ہے۔ —— فاران)

پاکستان کی ٹیکسٹائل انڈسٹری کا شاہکار

ایٹونیا

جو کہ صنعت پارچہ بافی میں ایک معروف نام ہے

اور لچھیوں و کونوں ہر دو صورتوں میں دستیاب ہے

یہ سوت مختلف کاؤنٹس میں کونوں اور لچھیوں دکونبڈ اور کارڈڈ) ہر دو صورتوں میں
بآسانی دستیاب ہے اور انتہائی تجربہ کار اور کوالیفائڈ ماہرین کی
زیرنگرانی دورِحاضر کی جدید ترین مشینری پر تیار کیا جاتا ہے۔

اپنی جملہ ضروریات کیلئے ایٹونیا یارن ہی کا انتخاب کیجئے

مزید معلومات کے لئے مندرجہ ذیل پتہ پر رجوع فرمائیے

فیروز سلطان انڈسٹریز لمیٹڈ

سرائے روڈ ۔ کراچی فون [illegible] ٹیلکس [illegible] تار کا پتہ اسکیل کراچی

FSI-[illegible] Crescent

شبیر احمد خاں غوری ایم اے۔ ایل ایل بی
سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش

فلسفہ اسلام کی تشکیل

فلسفہ اسلام کے مصداق کے متعلق غلط فہمی

عام طور سے "فلسفہ اسلام" کا اطلاق اُس نظام فکر پر ہوتا ہے جس کی یونانی فلسفہ نے مسلمان مفکرین کے یہاں شکل اختیار کی اور جس کے علمبردار قدماء میں کندی، فارابی اور ابو علی سینا اور متاخرین میں صدرائے شیرازی، میر باقر داماد اور ملا محمود جونپوری وغیرہم تھے۔ لیکن اگر یہ لفظ کا غلط استعمال نہیں تو اُس کا محدود معنوں میں استعمال ضرور ہے، جس کی تحدید و تخصیص کے لئے شاید ہی کوئی سند جواز پیش کی جا سکے۔ اگر فلسفہ کے معنی "محبت حکمت" یا "حکمت" یا ایک "منظم اور با قاعدہ نظام فکر" کے ہیں تو "فلسفہ اسلام" یا "اسلامی فلسفہ" کا مصداق وہ مجموعہ افکار ہونا چاہیے جو اسلام کی حقیقی تعلیمات کی روشنی میں ظہور پذیر ہوا اور "فلاسفہ اسلام" کا اطلاق صرف اُنہیں مفکرین پر ہونا چاہیے جنہوں نے اسلام کے اصول تعلیم یعنی قرآن اور حدیث کی مدد سے پیروان اسلام کے لئے ایک ہمہ گیر اور خود مکتفی نظام فکر و عمل مدون کیا۔ لیکن خدا معلوم ایسا کیوں نہیں ہوا۔ خیر "فلسفہ" تو ایک عجمی الاصل لفظ اور غیر اسلامی اصطلاح ہے اور اُس کے مصداق میں کفر و الحاد اور غیر اسلامی بنیادی نظریات (IDEALOGIES) سے وابستگی کی بو آسکتی ہے۔ لیکن "حکیم" اور "حکما" تو عربی الاصل لفظ ہیں اور "حکمت" تو خود اسلامی آئیڈیالوجی کی رُو سے انسان کے لئے سب سے بڑی نعمت اور "خیر کثیر" کا مصداق ہے کہ

"ومن یؤت الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا"!

اس لئے اسلامی مصطلحات کی غیرت ایمانی پر اس اصطلاح کو ناگوار اور نامقبول نہ ہونا چاہیے تھا۔ مگر "حکمائے اسلام" کا لقب عرصہ دراز سے یونانی انداز فکر پر سوچنے والے مسلمان مفکرین کے ساتھ مخصوص کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ امام رازی جن کا زمانہ چھٹی صدی ہجری کا آخر ساتویں صدی کا آغاز ہے "تفسیر کبیر" میں جا بجا "حکمائے اسلام" بول کر فلسفہ یونان کے مسلمان ماہرین کو مراد لیتے ہیں۔ ممکن ہے یہ

اصطلاح چھٹی صدی ہجری سے بھی زیادہ قدیم ہو۔

اس غلط اصطلاح کے جو بھی وجوہ رہے ہوں، لیکن حق تو یہ ہے کہ یہ اصطلاح بے حد درجہ گمراہ کن اور اس کا ایک تکلیف دہ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ جو لوگ اسلام کا تحقیقی مطالعہ کرنا چاہتے ہیں اور اس ناگزیر غلط فہمی کی بنا پر اسلام کا شاہکار اسی نام نہاد "فلسفہ اسلام" کو سمجھ لیتے ہیں اور مفکرین اسلام کا مصداق نام نہاد "حکماء اسلام" کی جماعت کو قرار دے لیتے ہیں تو وہ اسلام اور اسلامی فکر کی حقیقت سے یکسر اصل ناآشنا رہتے ہیں۔ اس سے تعلیم یافتہ طبقے میں اسلام کی تعلیم کے متعلق ایک گمراہ کن غلط فہمی پھیل جاتی ہے اور اسلام میں جو ORIGINALITY ہے اور اسلامی تعلیمات میں جو انفرادی خصوصیات ہیں، وہ نظر انداز ہو کر اسلامی فکر یونانی فلسفہ کا اسلامی چربہ (MUSLIM EDITION) نظر آنے لگتی ہے۔

یہ غلط فہمی صرف مابعد الطبیعیاتی و الہیاتی مسائل ہی تک محدود نہیں رہتی، بلکہ تمام تر مستشرقین تک اس کا شکار ہو جاتے ہیں، ایک جانب "جزء الذی لا یتجزی" کا ابطال، "ہیولیٰ کا اثبات"، "صورۃ و ہیولیٰ کا تلازم"، افلاک و کواکب کے نفوس ناطقہ، عناصر کی تقسیم چہارگانہ اور اس قسم کے دوسرے مسائل جن پر تعلیم یافتہ حلقوں میں ہنسی اڑائی جاتی ہے اسلام کا فکری کارنامہ سمجھے جاتے ہیں۔ اور دوسری جانب اسلامی فقہ گولڈ زیہر وغیرہ مستشرقین کی قیاس آرائیوں کے طفیل میں رومن لا (ROMAN LAW) سے ماخوذ سمجھا جاتا ہے جو جاگیردارانہ نظام کے استحکام و استواری کے نتیجے وجود میں آیا تھا۔ حالانکہ اسلام اور اسلامی فقہ کسی غیر اسلامی نظام اور انسان دشمن ادارے کی حمایت و تائید کے لئے ظہور میں نہیں آئے لیکن اسلامی فقہ کو رومی قانون کا جانشین مقرر کر کے ان "تحقیقات" علمیہ کے ٹھیکہ داروں نے اسلام پر جاگیرداری کے ظالمانہ و جابرانہ نظام کے حامی ہونے کا ٹھپہ لگا دیا۔ اور اس طرح اسلام کا مکمل نظام حیات توہمات و خرافات کا مجموعہ سمجھا جانے لگا۔

بہرکیف یہ مسئلہ خصوصیت کے ساتھ ارباب فکر و نظر کی توجہ کا محتاج ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ نام نہاد "مسلم فلسفہ" کو جو مفکرین اسلام کے ایک ذہین و طباع طبقہ کی ذہنی کاوشوں کے طفیل میں ظہور پذیر ہوا تھا، ہرچند کہ اس کی اصل یونانی فلسفہ ہے، اسلامی فکر یا "فلسفہ اسلام" کے دائرہ اطلاق سے خارج کر دیا جائے بلکہ وقت کا اہم تقاضا یہ ہے کہ اسلامی فکر کے اس اہم اور حقیقی عنصر کو جس کا ماخذ اسلام کی صحیح تعلیمات ہیں، جس کا سرچشمہ کتاب اللہ اور سنت رسول ہے اور جو اسلامی معاشرہ کے نظام فکر و عمل کا قوام ہے اور جس نے اسلامی تہذیب و ثقافت کے حدود متعین کر کے اُسے اسلامی تہذیب ثقافت کہلانے کا مستحق بنایا ہے ایسے حقیقی اور اہم عنصر کو اسلامی فکر کی تبیین و تفصیل میں اس کا صحیح اور مناسب مقام دیا جائے اس کے ساتھ ساتھ دوسرے افکار کو بھی جن کا ماخذ غیر اسلامی افکار ہیں لیکن جنہوں نے اسلامی تصورات (IDEOLOGY) سے متصادم ہو کر وقت اور ماحول کے مطابق اپنے میں تبدیلی پیدا کر کے اپنے اصل اور ماخذ [یونانی منطقی فلسفہ] کے مقابلہ میں انفرادی شان حاصل کر لی اور صحیح یا غلط طور پر اس انفرادیت کے وصف کو لفظ "اسلامی" کی صفت سے تعبیر کیا، ایسے ثانوی افکار کو بھی اسلامی فکر میں ان کے مناسب حال مقام دے کر "فلسفہ اسلام" کا ایک جامع اور ہمہ گیر نظام مرتب کیا جائے۔

اسلامی فکر کے عناصر حقیقی

حقیقی اسلامی فکر کا ماخذ قرآن و حدیث ہے ان دونوں کا سرچشمہ وحی الٰہی ہے یعنی حقائق حکمیہ کا حضرت باری عز اسمہ

جانب سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک ما فوق الحس (SUPER SENSUOUS) طریقہ پر القا۔ ان حقائق حکمیہ کی روشنی
جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ کے بعد آپ کے جانشینوں نے مسلمانوں کے واسطے ایک منظم اور ہمہ گیر نظام حیات مرتب کیا
نظام انسانیت کی تمام ذہنی وعملی، انفرادی و اجتماعی اور دینی و دنیوی ضروریات پر مشتمل تھا۔ حیات انسانی کا کوئی شعبہ نہیں جو اس
ہمہ گیری سے بچ رہا ہو۔

۱۔ اس نظام حیات کا نام اسلام کی اصطلاح میں "فقہ" تھا اور اس پر بصیرت تامہ کے ملکہ کو "تفقہ فی الدین" کے نام سے
موسوم کیا جاتا تھا، جو اسلامی سماج میں ایک بہت ہی بڑا اعزاز تھا۔ بصیرت تفہیم و تفقہ کے لئے اس نظام کے تین جزو سمجھ لیجئے اگرچہ
بالحقیقت یہ ایک ناقابل تقسیم وتجزیہ وحدت ہے۔ اور اس کے مختلف اجزاء میں واضح خط تفریق نہیں کھینچی جاسکتی۔ یہ تین اجزا
حسب ذیل ہیں:-

أ۔ عبد ومعبود کا تعلق جسے عبادات کہتے ہیں۔
ب۔ بندوں میں ایک کا دوسرے سے تعلق جسے معاملات کہتے ہیں، اور
ج۔ فرد یا افراد کا معاشرہ (من حیث الکل) سے تعلق جو عہد جدید کی سیاسات اور انتظامیات عامہ ——— (PUBLIC ADMINISTRATION) کے قریب قریب برابر ہے۔

عبادات کا مغز بلکہ پورے اسلامی نظام کا نچوڑ "بندے کا معبود کے متعلق ذہنی میلان" ہے۔ یہی توحید ہے۔ یہی دین اسلام کا
بنیادی ایمان ہے جس کے صلاح وفساد پر پورے دین کا بناؤ بگاڑ مبنی ہے۔ اسی لئے قدماء فقہاء اس کی اہمیت کے پیش نظر بقیہ فقہی مباحث
سے اسے ممتاز کرنے کے لئے اسے "فقہ اکبر" کہا کرتے تھے۔

۲۔ آغاز حال میں "فقہ اکبر" فقہ کے دوسرے مباحث سے علیحدہ مدون نہ ہوا تھا۔ لیکن بعثت اسلام کو ایک صدی بھی نہ ہونے
پائی تھی کہ عجمی افکار نے اسلامی تعلیمات پر ہجوم بول دیا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ قرآن اپنی جگہ پر جمع ہو چکا تھا اور مسلمان بڑی سختی سے اعتصام
بالقرآن وتمسک بالسنت کے اصول پر قائم رہے۔ صحابہ آغوش نبوت میں پرورش پائے ہوئے تھے۔ اور رسالت کے فیضان تاثیر نے ہدایت
کے بعد گمراہی وضلالت کے لئے ان میں کوئی جگہ نہ چھوڑی تھی۔ تربیت نبوت نے اسلام اور نا اسلام کے پرکھنے کی بصیرت ان میں علی وجہ الکمال
پیدا کر دی تھی۔ اس لئے وہ تو عجم کے نا اسلامی افکار سے متاثر نہ ہو سکے البتہ اگلی نسل میں وہ حضرات جو چند ہی دن ہوئے کہ مسلمان ہوئے
تھے لیکن جن کے اعماق ذہن کی نا اسلامی افکار سے کلیتاً اصلاح نہ پائی تھی۔ بھٹکنے لگے، ایسے لوگوں کی اصلاح عقائد کے واسطے فقہ اکبر کی علیحدہ
اور مستقل تدوین ضروری تھی بعد میں جب جبر وقدر اور تشبیہ وتعطیل کے افراط وتفریط نے اسلامی معاشرہ کو متاثر کرنا چاہا تو اس مستقل نظام فکر کو
جس کا نام فقہ اکبر تھا "علم التوحید والصفات" کا نام دیا گیا۔ بعد میں اس کی اصلی حیثیت کے پیش نظر اسے "اصول الدین" کہا جانے لگا۔

فقہ اکبر، علم التوحید والصفات اور اصول الدین ایک ہی چیز کے مختلف نام ہیں۔ یعنی کلیات دین کے متعلق ایک مسلمان کا کیا ذہنی
رجحان ہونا چاہیے۔ بالفاظ دیگر بہ ضرورت کا عقائد کا نام ہے۔ ان عقائد پر ایمان واجب ہے کیونکہ ان کا ماخذ بیشتر حالات میں قرآن
عزیز ہے۔ لہذا ان کے متعلق جحود وانکار تو ایک طرف ان کی صحت وتسلیم میں تردد وتامل بھی موجب کفر ہے۔ بعض امور حدیث مشہور سے
ثابت ہیں اور حدیث اصولی حیثیت سے قرآن ہی کی طرح واجب التسلیم ہے لیکن چونکہ بیشتر حالات میں اسناد کے ناقابل انکار صحت کی حد تک

نہ پہونچنے کی بناپر وہ قرآن کی طرح یقینی نہیں ہوتی ۔ اس لئے ان عقائد پر بھی ایمان لانا چاہیئے اور اگرچہ ان کا مجرد انکار کفر کے مترادف نہ ہو لیکن بدعت سیئہ تو ضرور ہے جو اکثر حالات میں منجر بکفر ہو سکتی ہے ۔

بہرکیف عامۃ اہل اسلام ان عقائد کے کلیات پر ایمان رکھتے ہیں ۔ ہاں اگر کوئی اختلاف ہے تو ان کی تفصیل و توجیہ میں جماعت جس نے صحابہ کرام کا شرف تلمذ حاصل کیا تھا ، یہ تفصیل و توجیہ صحابہ کے قول کے مطابق کرتی تھی یا پھر اس تفقہ فی الدین کی روشنی میں ، جس کا ملکہ اسے صحابہ کرام کے فیضان صحبت سے حاصل ہوا تھا ۔ یہ اہل السنت والجماعت تھے ۔ ان کے دو طبقے تھے ۔ پہلا وہ تھا ، جس نے براہ راست صحابہ سے کسب فیض کیا تھا وہ تابعین کہلاتے ہیں ۔ دوسرا طبقہ جس نے تابعین سے فیض حاصل کیا تھا ، تبع تابعین کہلاتا ہے ۔ صحابہ ، تابعین اور تبع تابعین کا زمانہ بہترین زمانہ گنا جاتا ہے فقہائے امت اور محدثین کرام انہیں میں پیدا ہوئے ۔

ایک دوسرا گروہ تھا جو کلیات دین کی توضیح و توجیہ میں عجمی افکار سے متاثر ہوا تھا اور "عقلیت" (RATIONALISM) کا مدعی تھا ، شیعہ ، خوارج ، مشبہ ، معطلہ ، قدریہ ، جبریہ ، مرجئہ وغیرہ ۔ ان "بہتا دو دو ملت" فرقوں اور اہل السنت والجماعت کے فکری تصادم سے علم العقائد نے ایک نئی شکل اختیار کر لی ۔ پہلے نفس عقیدہ کی تلقین ہوا کرتی تھی ، اب جبکہ ہر فرقہ اس عقیدے کے بارے میں اپنی توجیہ پر مصر تھا تو اس کی تائید و تشبیہ میں عقلی دلائل بھی پیش کرتا تھا اس طرح اب نفس عقائد کی تعلیم و تلقین پر اکتفا نہیں کیا جاتا تھا ، بلکہ دلائل و براہین سے اس کی مخصوص توجیہ کی تائید و تشبید کی جاتی تھی ۔

اس کے نتیجے میں اسلامی فکر کے اندر ایک نئے علم کی بنیاد پڑی ۔ اس کا نام "علم الکلام" رکھا گیا ۔ مگر جیسا کہ اوپر بیان ہوا ، فکری اختلافات مختلف اسلامی فرقوں ہی میں محدود تھے ، علامہ تفتازانی کے الفاظ میں یہ "متقدمین کا علم الکلام" تھا ۔

اگلی صدی میں جب عباسی حکومت کے اندر عربوں کا اثر و نفوذ کم ہوا اور اسی نسبت سے عجمیوں کا اقتدار کاروبار سلطنت میں بڑھ تو حکومت کی بے جا رواداری اور حد سے بڑھی ہوئی مذہبی آزادی کے زیر اثر غیر اسلامی مذاہب کے پیشواؤں نے اصول اسلام اور کلیات دین کو بھی ہدف اعتراض بنانا شروع کیا ۔ ظاہر ہے مخالفین و معترضین پر جو خود قرآن و حدیث کی صحت کو معرض بحث میں لا رہے تھے قرآن و حدیث کے ذریعے کس طرح حجت قائم کی جا سکتی تھی یہ تو خود کو عقلیت کا پرستار بتاتے تھے لہذا ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے دربار خلافت سے معتزلہ کی ہمت افزائی کی گئی جو عقلی استدلال کے باب میں منجھ چکے تھے ۔ بہرکیف اس طرح "اسلامی عقا (توحید ، رسالت ، معاد وغیرہا) کی تائید و تشبید کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا جو پہلے طریقے (کلام متقدمین) سے مختلف تھا ۔ کلام متقدمین میں اصول اسلام اور کلیات دین موضوع بحث نہیں تھے ، مگر نئے علم کلام میں خود اصول و کلیات بحث و تحقیق کا موضوع بن گئے پھر پہلے طریقے میں ایک بڑی حد تک قرآن اور کہیں کہیں حدیث نبوی سے استشہاد کیا جاتا تھا ، مگر نئے علم الکلام میں سارا زور عقلی استدلال پر مرکوز ہو گیا ۔ علامہ تفتازانی کہتے ہیں کہ یہ "متاخرین کا علم کلام" تھا جن کا اکثر فلاسفہ کے ساتھ مجادلہ رہتا تھا اور یہ شکل ہنوز باقی ہے ۔

اس طرح اسلامی نظام فکر کا دوسرا اہم جزء علم کلام ہے ۔ فقہ کے برخلاف جس کی اسلامی معاشرہ کے استحکام کے لئے ضرورت ناگزیر ہے ، علم کلام بذاتہ ضروری نہیں ہے اس کی ضرورت اسلامی نظام فکر پر غیر اسلامی افکار کے ہجوم نے پیدا کر دی ہے ، تاکہ اسلام کے امری نظریات (IDEALOGY) اپنی جگہ پر مستحکم رہیں ، کیونکہ اس (IDEALOGY) میں ذرا سا تزلزل بھی پورے اسلامی

امام حسن البنا شہید
(حضارۃ الاسلام ستمبر ۱۹۶۲ء)
ترجمہ :- عارفہ اقبال ایم۔ اے

جمعہ کی نماز

"یا ایہا الذین آمنوا اذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الی ذکر اللہ وذروا البیع"
(اے ایمان لانے والو! جب جمعہ کے دن نماز کے لئے پکارا جائے تو اللہ کی یاد کے لئے دوڑ پڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو)

اسلام کا جمال ایمان باللہ، عمل صالح اور انسانی اخوت سے عبارت ہے اور ان سب کا مقصد نفس کی اصلاح اور اسے بھلائی اور حق کی راہ پر قائم رکھنا ہے۔

یہی وہ اصول ہیں جو تمام ادیان اور حضرت آدمؑ سے لے کر سیدنا محمدؐ تک تمام رسولوں کی شریعتیں لے کر آئیں۔

"شرع لکم من الدین ما وصّی بہ نوحاً والذی اوحینا الیک وما وصینا ابراھیم وموسیٰ وعیسیٰ ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ"

(تمہارے لئے دین مشروع کیا وہ جس کی وصیت نوحؑ کو کی تھی اور جو ہم نے تمہاری طرف وحی بھیجی اور جس کی وصیت ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو کی تھی کہ دین قائم کرو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو)

اپنے ان مقاصد کو دلوں میں پیوست کرنے اور نفوس میں جاگزیں کرنے کے لئے اسلام نے مسلسل دعوت، واضح حجت اور روشن دلیل سے کام لیا ہے:-

"ومن احسن قولاً ممن دعا الی اللہ، وعمل صالحاً، وقال اننی من المسلمین"
(اور اس شخص سے اچھی بات کہنے والا کون ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک کام کرے اور کہے بیشک میں مسلمانوں میں سے ہوں)

"ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ"
(خدا کی راہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلاؤ)

قرآن کریم کی کئی سورتوں میں مختلف مقامات پر دعوت کا ذکر آیا ہے جو اپنے جلیل القدر اثرات اور عظیم مرتبہ پر خود دلالت کرتا ہے۔

"ومثل کلمۃ طیبۃ کشجرۃ طیبۃ اصلھا ثابت وفرعھا فی السماء تؤتی اکلھا کل حین باذن ربھا"

(کلمہ طیبہ کی مثال اس پاکیزہ درخت کی سی ہے جس کی جڑ مضبوطی سے قائم ہے اور اس کی شاخیں آسمان تک پہونچ رہی

ہیں۔ اور وہ اللہ کے حکم سے ہر وقت پھل دیتا ہے)

اسلام نے چاہا کہ لوگوں کو یہ مقصد اور اس کا وسیلہ واضح اور عملی صورت میں یاد دلاتا رہے تو اس کے لئے جمعہ کا دن منتخب کیا جو دنیا کے ایام میں یوم الآخرت ہے اور اس دن لوگوں کو خدا کے گروہ میں آنے کی تاکید دعوت دی۔

"یا ایھا الذین آمنوا اذا نودی للصلاۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الی ذکر اللہ وذروا البیع ذلکم خیر لکم ان کنتم تعلمون"

طہارت وصفائی اور خوشبو کا اہتمام کرنے کے بعد وہ مساجد میں آتے ہیں اور سکون واطمینان، خشوع وخضوع، خاموشی اور رعب اور مکمل نظم وضبط کے ساتھ مجلس میں بیٹھتے ہیں۔ مساوات کا عجیب و غریب منظر ہوتا ہے۔ اللہ کے گھر میں اللہ کے سامنے بڑے چھوٹے، امیر غریب برابر ہوتے ہیں، ایک دوسرے پر مہربان، ایک دوسرے کے خیر خواہ اور ہمدرد۔

یہ اخوت و مساوات کی کیفیت ہے جس کا خیالی نقشہ، فلاسفر اور مصلحین کتابی دنیا کے نظریات میں پیش کرتے رہے انبیاء ورسل نے عبادات واعمال کے ذریعہ اس کی تعلیم دی اپنی عملی شکل میں بہترین صورت میں، یہ عبادت کے مقامات پر اللہ رب العالمین کے سامنے، صاف نظر آتی ہے۔ لوگ ہفتہ میں ایک بار اس مجلس میں آتے رہیں تاکہ آیات قرآنی، وعظ ونصیحت ذکر و درود سنیں اور اس کے بعد نماز کی صف میں مومنین قانتین کی طرح ایک قبلہ کی طرف رخ کرکے کھڑے ہو جائیں، ان سب کی غرض ایک، یعنی پروردگار عالم کا قرب حاصل کرنا ہے۔

"بندہ سجدہ کی حالت میں اپنے رب سے سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے" اور اس طرح لوگ اپنے رب کو یاد کرتے ہیں۔ یہ ان کے ایمان کو تقویت عطا کرتا ہے اور وہ اعمال صالحہ میں سے بہترین عمل یعنی نماز میں مشغول ہوتے ہیں۔

ایک دن کی مخصوص گھڑی میں لوگوں کا اس طرح ایک جگہ جمع ہونا اخوت کے لئے بے نظیر تربیت اور نفوس و اصلاح کی اصلاح کا بہترین ذریعہ ہے۔ ان مقاصد کو خطیب اپنی تلاوت کردہ آیات اور وعظ و نصیحت کے ذریعہ سامعین کے دل میں تازہ کر دیتا ہے۔ ایسے محکم، عمدہ اور بے نظیر نظام کا وجود اور کہاں ہو سکتا ہے؟ صدق العظیم۔

"ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیراً"

(اور اگر یہ اللہ کے سوا اور کسی کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بہت اختلافات پاتے)

اور امام کیا ہے؟ وہ جماعت کی رہنمائی محراب میں کرتا ہے، اس کے لئے کتاب وسنت کی تشریح کرتا ہے، نمازوں میں اس کی رہنمائی کرتا اور اسے نیکیوں کی طرف بلاتا ہے کیا وہ صرف دینی اقتدار کا مالک اور روحانی معاملات کا نگراں ہے۔ نہیں، اسلام میں دو الگ الگ اقتدار نہیں ہیں اور نہ اسلامی معاشرہ دو مختلف رجحانات کے درمیان زندہ رہ سکتا ہے۔ یہاں اقتدار کا ایک ہی مرکز ہے اور وہ اسلامی حکومت ہے، یہ معاشرہ کے دینی و دنیوی معاملات کی نگرانی ہوتی ہے اور لوگوں کی بھلائی کا اہتمام کرتی ہے، قوانین نافذ کرتی ہے، امن اور ڈسپلن قائم کرتی ہے، عبادت گاہ میں امامت کا اور مدرسہ میں تدریس کا فریضہ انجام دیتی ہے اور لوگوں کے درمیان عدل کے ساتھ فیصلے کرتی ہے۔

"ان اللہ یامرکم ان تؤدوا الامانات الی اھلھا واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل"

ذالٰہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے مالکوں کو لوٹا دو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو)

تو اے ائمہ کرام ! اپنی ذمہ داری کا احساس کیجئے اور لوگوں کو خیر و حق اور روشنی کی طرف لے جائیے۔ آپ ان کے ضامن اور راستہ نما ہیں ! کان لگا کر سنو اپنے دلوں کو حاضر رکھو اور ان بہترین نصائح پر غور کرو، ان کو اپنی عمل سنت بنالو۔ علم دو طرح ہے۔ علم نافع تو قلب میں ہے اور زبانی علم جو ابن آدم کے خلاف اللہ کی حجت ہے۔

اور اے نماز سے غافل رہنے والو ! تم نماز سے کیوں رکتے ہو، وہ تمہاری روح کی تربیت ہے، تمہارے دل کا مرکزی نقطہ ہے تمہارے نفس کی طہارت ہے، تمہارا تمہارے رب کے ساتھ تعلق ہے۔ دنیا کا بہترین عمل ہے اور آخرت کا ثواب ہے اور اس کے سب سے بڑی اس میں کوئی مشقت یا تکان بھی نہیں ہے۔

میرے بھائیو نماز کی طرف دوڑو اور اللہ کے داعی کی پکار پر لبیک کہو۔

ومن لا یجب داعی اللہ فلیس بمعجز فی الارض ولیس لہ من دونہ اولیاء
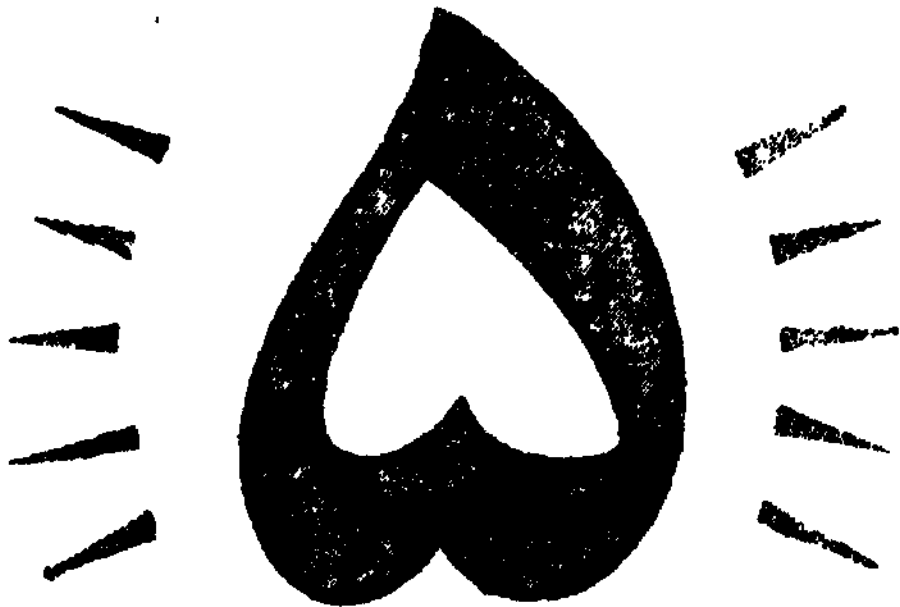
۵
آزمودہ دواؤں کا مرکب
انالجین
سر درد ۔ کمر کا درد ۔ دانت کا درد
ایام ۔ انفلوئنزا اور ہر قسم کے دوسرے درد کے لئے
یقینی زود اثر اور بے ضرر علاج ہے
Opal
Spoctk

سہیل برکاتی

فلسفہ اور سائنس کا رہنما مذہب ہے

تلاش و تجسس انسانی فطرت ہے۔ جوں جوں انسان ذہنی طور پر بیدار ہوتا جاتا ہے اور جیسے جیسے اُس کی عقل پاتی جاتی ہے اُس کی تحقیق و جستجو کی جبلت اپنی جڑیں مضبوط سے مضبوط تر بناتی جا رہی ہے۔ طرز فکر نئے نئے پہلو ڈھونڈتا ہے خود اپنی ذات، اپنے ماحول، خاندان، قوم، ملک و ملت اور کائنات کو سمجھنے اور اس پر غور کرنے کے لئے اُس کے ذہن میں عجیب غریب سوال جنم لیتے ہیں۔ کبھی وہ فلسفیانہ طریق پہ سوچتا ہے تو کبھی ان سب چیزوں پر ایک تنقیدی نظر ڈالتا ہے ــــ انسان کی حقیقت کیا ہے؟ حیات کیا ہے؟ یہ دنیا کیسی ہے؟ اس کی ابتدا کیا ہے۔ انتہا کسے کہتے ہیں۔ اس کا خالق کون ہے! اور اس قسم کے بہت سے سوالات جو ان کے ذہن میں آئے دن پیدا ہوتے رہتے ہیں، اس کے جبلی تقاضوں کی حیثیت رکھتے ہیں یا کی قدرتی بے چینی ہے۔

زیر نظر مضمون میں ہم اس کائنات اور زمین کے وجود میں آنے پر بحث کریں گے۔ یہ سوال دراصل مذہبی نوعیت کا ہے۔ اس کا حل کرنا مذہب کی اصل غرض و غایت ہے ــــ ہم چاہتے ہیں کہ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی معلوم کیا جائے کہ علوم عقلیہ نے اس سوال کا جواب دیا ہے۔ علوم عقلیہ کی دو اہم شاخیں سائنس اور فلسفہ ہیں۔

فلسفہ

(PHILOSOPHY) فلسفہ کی ایک شاخ مابعد الطبیعات METAPHYSICS کہلاتی ہے۔ اس کی تعریف اس طرح کی جاتی ہے :۔

مسئلہ وحدت یا دو مسئلہ جس کا مبحوث عنہ وہ مبداء اساسی ہے؟ وہ قادر و خلاق قوت ہے، جو حیات کائنات کا سرچشمہ ہے فلسفہ کی جو شاخ اس مسئلہ سے بحث کرتی ہے مابعد الطبیعات کہلاتی ہے۔

کائنات کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کا مبداء یا تو مادہ (MATTER) ہے یا روح، یا یہ دونوں کی ترکیب کا نتیجہ ہے لہٰذا فلسفی دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ ایک وہ جو مبداء کائنات کو واحد تسلیم کرتے ہیں خواہ یہ روحانی ہو یا مادی۔ اس کے لوگ وحدئین (MONISTS) کہلاتے ہیں اور یہ گروہ "وحدیئہ" دوسرے وہ ہیں جو مبداء کائنات کو دو جداگانہ مبداؤں کی ترکیب کا نتیجہ خیال کرتے ہیں یعنی ایک روح اور ایک مادہ، جو ایک ساتھ موجود ہیں۔ اس گروہ کے فلسفیوں کو ثنویین (DUALISTS) کہا جاتا ہے۔

وحدتیین کے پھر دو گروہ ہیں، ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ کائنات کی تشکیل کا دارومدار صرف مادہ پر ہے اس گروہ کو
ین کہا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ شے روح ہے اس گروہ کو روحانیئین کا نام دیا گیا ہے۔
ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم روح اور مادہ کی تعریف سے واقف ہو جائیں۔ اس لئے یہاں مختلف فلاسفروں کی پیش کی
تعریفیں درج کی جاتی ہیں۔

ڈاکٹر شفلر SHEFFLER کہتا ہے کہ، "روح مادہ ہی کی ایک قوت کا نام ہے جو اعصاب سے پیدا ہوتی ہے"
ڈیرشو کا قول اس بارے میں یہ ہے کہ "روح ایک قسم کی میکانیکل حرکت MECHANICAL MOTION ہے"
بوشنر BUCHHER کی رائے یہ ہے کہ، "تمام اعصاب میں ایک کہربائی تموج پایا جاتا ہے اور جس کو فکر کہتے ہیں وہ
ہی کی ایک شکل کا نام ہے"
کانٹ کہتا ہے "آخر کار ہم اس ہیئت مادہ کی نسبت اس سے زیادہ کیا جانتے ہیں کہ وہ ہماری شعوری کیفیات کی ایک
فی اور فرضی علت کا نام ہے"
ارسطو کے نزدیک مادّہ نہ ایک ہے نہ چند، نہ واحد ہے نہ کثیر، نہ ثقیل ہے نہ خفیف، نہ حار ہے نہ بارد گویا وہ "کچھ نہیں"
شئے) کے مترادف ہے۔
دیمقراطیس کا خیال مادہ کے متعلق یہ ہے کہ وہ سالمات اور چھوٹے ذرّات کا مجموعہ ہے۔
ڈارون وغیرہ بھی اسی نظریہ کے حامی ہیں آیئے اب ایک ایک گروہ کے افکار کا ذرا تفصیل سے مطالعہ کریں۔

دیئین جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے یہ وحدتیین کی وہ جماعت ہے جو مادہ پر یقین رکھتی ہے۔ مادیین گروہ سے تعلق
رکھنے والا سب سے قدیم فلسفی دیمقراطیس (یونانی) ہے۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ مادہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ
ہے گا اور یہ مادہ نہایت باریک ذرات یا سالمات کی شکل میں، جو خود ناقابل تجزی ہیں، فضا میں پھیلا ہوا ہے، یہ ذرات جب مختلف
راد میں مختلف ترتیب کے ساتھ آپس میں ملتے ہیں تو اس کیفیت کو حیات کہتے ہیں اور جب یہی ترتیب درہم برہم ہو جاتی ہے تو اسے موت
ا جاتا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی اپنی کتاب "فلسفیانہ مضامین" میں تحریر فرماتے ہیں۔
"دیمقراطیس یونانی کے بعد، مادیت کا سجادہ ایک عرصہ دراز تک خالی رہا، یہاں تک کہ سترہویں صدی میں ہابس
اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے وہ خالص فلسفیانہ حیثیت سے نہیں بلکہ علم النفس کے نقطہ خیال سے تحریر کیا ہے۔ اس لئے اس
قع پر ہم اس کے ذکر سے قطع نظر کرتے ہیں۔ ہابس کے بعد ہو لیک، ولیمٹری نے اس مذہب کو خوب فروغ دیا"
ان کے علاوہ مادیین جماعت سے تعلق رکھنے والے ممتاز فلاسفر یہ ہیں۔ ووگٹ، بوشنر، مولشاٹ، پروفیسر لیبشوغیرہ
پروفیسر لیبز لکھتا ہے کہ:-
"چونکہ ہم کائنات کے آغاز اور انجام سے ناواقف ہیں اس لئے ہمارا یہ منصب نہیں کہ کسی ازلی یا ابدی وجود کا
انکار کریں جس طرح ہمارا یہ کام بھی نہیں کہ ہم اس کو ثابت کریں" (علم الکلام - مولانا شبلی)

مادئیین کائنات کی ہر چیز کی علت اور سبب مادہ کو قرار دیتے ہیں لیکن خود مادہ کیا چیز ہے اسے وہ ثابت نہیں اور نہ اس کے موجود ہونے کا کوئی ٹھوس ثبوت پیش کر سکتے ہیں۔ مادئیین کا کہنا ہے کہ ہم کو اس عالم کے سوائے دوسرے کا نہ کوئی علم ہے اور نہ ہم پا سکتے ہیں اور نہ کوئی تعلق آج تک معلوم ہوا ہے۔ اس لئے دوسرے عالم کو تسلیم کرنا عقل سے بات ہے۔

روحانیین وحدتیین کی دوسری جماعت یعنی روحانیین میں بھی کئی ممتاز فلاسفہ نظر آتے ہیں مثلاً اسپینوزا۔ فختے۔ شیلانگ۔ ہیگل وغیرہ۔ ان سے پہلے برونو نامی فلسفی نے "وحدت الوجود" کے نام سے اس کی بنیاد ڈالی تھی ـــــ برونو کے نزدیک خدا یا ہستی لا محدود اور کائنات بالکل ایک ہیں اور جو لوگ خدا کو دیگر موجودات علاوہ موجود سمجھتے ہیں وہ دراصل خدا کو محدود اور متناہی قرار دیتے ہیں۔ خدا نہ تو دنیا کا خالق ہے نہ متحرک اول بلکہ دنیا کی روح ہے۔

اسپینوزا نے اس نظریہ کو ترمیم و تفصیل کے بعد مکمل کر دیا اور اس کو اس طرح پیش کیا۔

" دنیا میں وجود ایک جوہر کا ہے اور وہ خدا ہے وہ لا محدود مطلق ہے، دیگر محدود متناہی جوہر سب خدا ہی کی ذات پیدا ہوئے ہیں اور اسی میں موجود ہیں "

ـــــــــ اور ـــــــــ

" یہ کہنا صحیح نہیں کہ عالم دو مختلف اشیاء روح اور مادہ سے مرکب ہے، کیونکہ دراصل یہ دو مختلف و مستقل ہی نہیں بلکہ ایک ہی ذات کے دو مظاہر، ایک ہی تصویر کے دو رخ، ایک ہی نور کے دو پرتو ہیں اور وہ ذات واحد ذات باری ہے جو تمام عالم کے مجموعے کے مترادف ہے ـــــ خدا کو بہر حال غیر محدود نا قابل انقسام تسلیم کرنا چاہیئے جس محدود مظاہر تمام موجودات عالم ہیں " (فلسفیانہ مضامین)

شلر، گیٹے۔ ہیگت۔ برڈ شیلی۔ وحدۃ الوجود کے قائل ہیں۔ اسپینوزا کے بعد برکلے نے بھی نہایت مدلل طرز پہ مذہب روحانیین کو آگے بڑھایا ہے۔ اس کا طرز استدلال ملاحظہ ہو۔

" جب ہم مادہ کا لفظ زبان سے نکالتے ہیں تو اس سے کیا مراد لیتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ ایسے موقع پر ہمارا منشا یہ ہوتا ہے کہ ایک جوہر یعنی قائم بالذات ہستی کا وجود ہے۔ جس کے چند اغراض غیر منفک ہیں۔ مثلاً صلابت۔ رنگ وغیرہ، لیکن غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ تمام اغراض اپنے وجود کے لئے ایک روح یا ذہن کے محتاج اور اس پر مبنی ہیں۔

فختے۔ برکلے کا ہم خیال ہے اور شیلانگ نے اسپینوزا کے نظریہ کی ترجمانی کی ہے اس کے بعد ہیگل آتا ہے اور یہ بیش رو شیلانگ کی طرح ایغو اور غیر ایغو کو ہم ماہیت بتاتے ہوئے اپنا نظریہ پیش کرتا ہے اور کہتا ہے۔

" گویا اصل حقیقی شے، صرف وہ تعلق یا وہ نسبت ہے جو ایغو اور غیر ایغو کے درمیان پائی جاتی ہے یہ تعلق یا نسبت جو اصل حقیقت ہے، محیط کل ہے یعنی تمام کائنات اسی کی جلوہ گاہ مظاہر ہے اور یہی خدا ہے "

ثنویئین DUALISTS اب وہ جماعت آتی ہے جس نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ مبداء کائنات روح اور مادہ

رزوں ہیں ۔ فلاسفر کی اس جماعت کے ہم خیال انکساغورث اور دیمقراطیس ہیں اس کے علاوہ سعف کے دو عظیم الشان شہرہ
فاق ودانا فلسفی یعنی افلاطون اور اس کے نامور شاگرد ارسطو بھی شامل ہیں ۔

دورِ جدید میں ڈیکارٹ ۔ میبلرانش ۔ لائینٹز ۔ کومٹ ۔ مل ۔ اسپنسر ۔ بیکن ۔ ونٹ ۔ جیمس اس نظریہ سے متفق ہیں
افلاطون کا اس بارے میں یہ نظریہ تھا کہ عالم دو ہیں ۔ عالم مثال اور عالم مادہ ۔ وہ عالم جس میں ہر شے اپنی پوری اصلیت
کے ساتھ موجود ہے وہ عالم مثال ہے دوسری طرف حواس ظاہری سے ہمیں جو کچھ محسوس ہوتا ہے وہ عالم مادی ہے ۔ ارسطو نے
مادہ کی علت کے دو اجزا ٹھیرائے ہیں ۔ یعنی ہیولیٰ اور صورت اور یہ دونوں لازم وملزوم ہیں یعنی کوئی صورت ہیولیٰ سے اور کوئی
ہیولیٰ صورت سے خالی نہیں ۔

ثنویین کے نظریہ کو ترقی دینے میں ڈیکارٹ کا بہت کچھ ہاتھ ہے اس نظریہ میں انتقائیہ اور گیولنکس نے کچھ ترمیم کی
عیسوی عقائد سے مطابقت رکھنے کی وجہ سے اس نظریہ نے قرونِ وسطیٰ میں اپنی جڑیں خاصی مضبوط کرلیں ۔ ڈیکارٹ کو بلاشبہ
اس نظریہ کا بانی کہا جاسکتا ہے ۔ ڈیکارٹ نے مادہ (شئی ممتد) اور ذہن (شئی ذی فکر) میں تمیز قائم کی کہ یہ بالکل مختلف
جوہر ہیں، ایک دوسرے کے بالکل مخالف اور متضاد ہیں ۔ ایک دوسرے کے مانع اور منافی ہیں ۔

ذہن یا روح غیر ممتد، غیر مادی، فاعل و آزاد ہے لیکن جسم مادہ ممتد اور بے روح ہے، انسان روح وجسم ہر دو
کی ترکیب کا نتیجہ ہے اس جماعت کے ایک اور فلسفی لائینٹز کے خیال میں جسم و روح کے درمیان عالم حیات میں آنے سے قبل
ہی ایک خاص تناسب موجود ہے ۔

نظریۂ سالمیت ہمیں معلوم ہے کہ عالم میں رونما ہونے والے مظاہر ایک نظم وضبط اور ایک قاعدے کے تحت
ہوتے ہیں ۔ ذہنِ انسانی میں یہ سوال ابھرتا ہے اور اسے ابھرنا چاہئے کہ آخر اس نظم وترتیب کا کیا
سبب ہے ۔

دیمقراطیس اور ہرقلیتوس کا خیال ہے کہ وحدت صرف نمود بے نمود ہے دراصل لامتناہی العنصر سالمیت کی ایک
نامحدود تعداد فضا میں بلا کسی غرض وغایت کے حرکت کررہی ہے، کائنات میں کسی غایت ومقصد کا وجود ہی نہیں چونکہ ان سالمات
کی تعداد جو فضا کے لامحدود میں حرکت کررہے ہیں خود لامحدود ہے ۔ لہٰذا ان کی حرکت سے ہر ممکن ترکیب پیدا ہوگی
اور مکرر ہوگی ۔ اس نظریہ کو نظریۂ سالمیت کہتے ہیں ۔

اس نظریہ کو مرتب ومدون کرنے میں لیوسپس اور اس کے شاگرد دیمقراطیس کا ہاتھ ہے ۔ عالم کی باضابطگی کی توجیہہ
کی غرض سے ایک اور فلسفی انکساغورث نے ایک عنصر کے وجود کو تسلیم کیا اور اس قوت کو اس نے عقل یا نفس کا نام دیا ۔
اور اس قوت کا کام صرف یہ تھا کہ اختلال وپریشانی میں ایک نظم وترتیب پیدا کرے اور اس طرح محرک اول کا کام دے لیکن
اس کا یہ مطلب نہیں کہ مادہ کو اس نے خلق کیا ہے ۔ مادہ تو ازلی ہے ۔ یہ تھا انکساغورث کا نظریہ ۔

دینیت کائنات کی علت پر بحث کرتے ہوئے اس نظریہ میں کہا گیا ہے کہ ۔
" خدا نے مادہ کو عدم سے پیدا کیا ہے" فلاطون، ارسطو، لیبنز اور کانٹ تمام اس نظریہ کے قائل ہیں ۔

وہ ایک ہستی یعنی خدا کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں، جو کائنات کی علت اولیٰ ہے۔

سائنس علوم عقلیہ کی ایک شاخ کے نظریات آپ کے سامنے پیش کئے گئے۔ اب سائنس کے نظریات بھی ملاحظہ فرمائیے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سائنس میں ترقی کے بغیر آج کی کوئی قوم دنیا میں اپنا مقام حاصل نہیں کرسکتی، سائنس نے دنیا میں اپنا سکہ بٹھا دیا ہے۔ روز روز نئی نئی اور عجیب و غریب ایجادات نے دنیا میں ہلچل مچا دی ہے اس علم کی اہمیت و افادیت سے کون انکار کرسکتا ہے۔ مگر افسوس کہ اس نے اپنا دائرہ کار وسیع کرتے ہوئے کچھ اس طرح کے بھی قدم اٹھائے ہیں کہ وہ دنیا کے لئے فائدہ مند اور مفید ہونے کی بجائے اس کے لئے مہلک خطرات اور تباہی کا باعث بن گئے ہیں، زیر بحث موضوع پر سائنس کے بے شمار ماہرین نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور وہ اس میں کہاں تک کامیاب ہے اس کا جواب تو وہ خود آپ کو دیں گے۔

سر جیمز جینز JAMES JEANS اپنی کتاب THE MYSTERIOUS UNIVERSE میں لکھتا ہے۔

"تاہم ہم یقین رکھتے ہیں کہ اب سے کوئی دو ارب سال قبل یہ غیر معمولی حادثہ پیش آیا ہوگا کہ ایک دوسرا ستارہ جو فضا میں بھٹکتا پھر رہا تھا۔ سورج کے بہت قریب آگیا جس طرح چاند اور سورج زمین پر لہریں پیدا کرتے ہیں اسی طرح اس ستارے نے بھی سورج کی سطح پر لہریں اٹھائی ہوں گی۔ لیکن یہ لہریں اُن چھوٹی لہروں سے بہت مختلف ہوں گی جو مختصر سا دو والا چاند ہمارے سمندر میں اٹھاتا ہے ایک مد وجزر والی لہر سورج کی سطح پر سے گزری ہوگی اور آخر کار وہاں ایک بڑا پہاڑ بن گیا ہوگا۔ بے ترتیب ہونے کے سبب، قریب آنے پر یہ پہاڑ بلند سے بلند تر ہوتا چلا گیا ہوگا اور اس سے قبل کہ دوسرا ستارہ پیچھے ہٹنا شروع ہو اس کی رستارے کی ہوائی کشش اتنی طاقت ور ہوگئی کہ یہ پہاڑ ٹکڑوں میں بٹ گیا اور اپنے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ادھر ادھر پھینکنا شروع کئے۔ جس طرح ایک لہر پھوار پھینکتی ہے اور اب تک یہ چھوٹے ٹکڑے اپنے مورث اعلیٰ سورج کے گرد چکر لگا رہے ہیں یہ چھوٹے بڑے سیارے ہیں اور ہماری زمین بھی انہی میں سے ایک ہے —"

مصنف مذکور آگے چل کر کہتا ہے۔

"اس کائنات کی جو ہماری زمین کو خلا میں گھیرے ہوئے ہے۔ ہئیت اور مقصد معلوم کرنے کی کوشش کریں تو ہمارا پہلا تاثر خوف اور دہشت کا ہوگا" آپ نے دیکھا کہ علم سائنس کے یہ ماہر۔ جو کسی ایسی بات کو تسلیم نہیں کرتے جس کا وہ عملی طور پر مشاہدہ کرلیں، اس موضوع پر کتنے بڑھ چڑھ کر قیاس آرائیاں کر رہے ہیں سائنس کی اس بے بسی کا اندازہ کرنے اور اس درماندگی کا مطالعہ کرنے کے بعد بکسلے نے کیا خوب کہا ہے۔

"وہ کسی چیز کی بھی کامل توجیہہ نہیں کرسکتی اُس کے سارے اسباب اول سے آخر تک نہیں بتائے جاسکتے کیونکہ انسان کا اعلیٰ سے اعلیٰ علم بھی توجیہہ میں آغاز اشیاء کی جانب چند قدم سے آگے نہیں بڑھ سکا"

HOYLE اور DCYTETTETON کا نظریہ بھی یہی ہے کہ یہ سیارے سورج کے ایک سانحے کے دھماکے سے پھٹنے کا نتیجہ تھے۔

دور حاضر کے ایک سائنسداں جان الفریڈ ویلنٹائن نے جیمز جینز کے عقائد سے اختلاف کیا ہے وہ اس خیال کو غلط تصور کرتا ہے کہ کائنات میں زندگی ایک حادثہ کا نتیجہ تھی اس کا نظریہ یہ تھا کہ کائنات ہماری جیسی زندگی کے لئے بنائی گئی تھی۔ اور ہماری زمین کے علاوہ دوسرے سیاروں پر بھی زندگی اپنے ماحول کے زیر اثر بدلی ہوئی شکل میں موجود ہو سکتی ہے۔

ایک اور سائنسداں ILECOMTG DU NOUY اپنی کتاب VVMAN DESTINY میں لکھتا ہے۔ کہ ہماری زمین کی عمر کا اندازہ لگایا جائے تو یہ کسی صورت میں بھی دو ہزار ملین سال سے کم نہیں ۔ ہماری زمین کی عمر ریڈیو ایکٹو ویٹی کے ذریعہ بھی معلوم کی گئی ہے اس طریقہ سے پتہ چلایا گیا ہے کہ زمین نے آج سے ۱۵۰۰ اور ۱۸۰۰ ملین سال کے درمیان کسی وقت ٹھوس شکل اختیار کی ہوگی۔

مسلمانوں کے ایک نامور عالم و فلسفی مولانا مناظر احسن گیلانی نے اس موضوع پر اپنے مخصوص انداز میں مدلل اور مبسوط بحث کی ہے آپ نے سائنس اور مذہب کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی کتاب "الدین القیم" میں تحریر کیا ہے۔

"پس سچ یہ ہے کہ سائنس جہاں اپنی تحقیقات ختم کر دیتی ہے۔ مذہب وہیں سے اپنا درس شروع کرتا ہے، سائنس صرف عالم شہادت و عالم محسوس کے چند واقعات محسوسہ کو کلیات کی شکل میں پیش کر کے اپنے بازو ڈال دیتی ہے۔ محسوسات کے آگے قدم رکھتے ہی اس پر رعشہ طاری ہو جاتا ہے وہ کچھ نہیں کہہ سکتی کہ آگے کیا ہے اور مذہب انسان کا یہیں سے ہاتھ پکڑتا ہے اور غیب (عالم غیر محسوس) کے سارے اسرار کو اس کے سامنے بے نقاب کرتا چلا جاتا ہے۔ سائنس کچھ نہیں بتا سکتی کہ دنیا کی ابتدا کیونکر ہوئی مذہب آتا ہے اور اس حقیقت سے پردہ اٹھا دیتا ہے۔ (الدین القیم)

اس سے پہلے کہ ہم قرآن مجید کی آیات بینات پیش کریں ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس موضوع پر بعض دوسرے فرقوں کے عجیب غریب نظریات بھی رقم کر دئے جائیں۔

ایک فرقہ ایسا ہے جو کہتا ہے کہ (معاذ اللہ) خدا کی مثال ایک انڈے کی سی تھی اور جس طرح انڈا پھوٹ کر مرغی بن جاتا ہے اسی طرح خدا بھی پھوٹ کر عالم بن گیا ——— یجروید میں لکھا ہے کہ :-

"اس پرماتما کی نابھی (ناف) سے درمیانی عالم، سر سے بالائی عالم، پاؤں سے زمین اور کانوں سے سمت بن گئے۔ اسی طرح وہ سب لوگوں کو پیدا کرتا ہے :"

بعض ایسے بھی ہیں جو خدا اور عالم کا رشتہ سمجھانے کے لئے دریا اور موج اور عنکبوت اور تار جیسی تشبیہات سے بھی گریز نہیں کرتے ایک اور جماعت اس مسئلہ پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے یہ مثال پیش کرتی ہے کہ جس طرح کوئی صانع (مصنوعات بنانے والا) مصنوعات بناتا ہے۔ مثال کے طور پر معمار مکان یا کمہار برتن بناتا ہے گویا اسی طرح خدا نے عالم کو بنایا ہے اور جب ان سے سوال کیا جاتا ہے کہ کیا کوئی صانع مصنوعات کو بغیر مادہ کے پیدا کر سکتا ہے ؟ یعنی کمہار بغیر مٹی کے اور نجار بغیر لکڑی کے اپنی چیزیں بنا سکتا ہے ——— ؟ اور جب تم خدا کو اسی طرح کا صانع کہتے ہو تو اس نے بغیر مادہ کے کس طرح عالم کو بنایا ہے ؟ ہندوؤں کے فلاسفروں کی ایک جماعت نے اسی بنا پر یہ مان لیا کہ ابتدا میں صرف خدا نہ تھا بلکہ خدا کی طرح مادہ بھی خود بخود موجود تھا۔ اس مادہ سے خدا نے عالم کو پیدا کیا ———

اور آئیے اب خالق کائنات، مولائے کل کے ارشادات میں اپنے اس سوال کا جواب تلاش کریں۔

قرآن پاک کا بیان ہے کہ خدا کُن فیکون کی قوت سے اپنی مخلوقات کو پیدا کرتا ہے۔ ایک جگہ ارشادِ ربانی ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ جب کسی چیز کے متعلق ارادہ کرتا ہے تو فرماتا ہے ہو جا۔ وہ چیز فوراً ہو جاتی ہے۔

قرآن پاک نے واضح الفاظ میں یہ بتایا ہے کہ کائنات کی علت کا مادّہ سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے عالم کو بغیر مادہ کے پیدا کیا ہے جیسا کہ بدیع السماوات والارض کے قرآنی الفاظ کا اقتضا اور مفہوم ہے۔

اور پھر ایک حدیث سے بھی اس آیت کریمہ کی تفسیر سن لیجئے۔ حدیث شریف ہے کہ "کان اللّٰہ ولم یکن معہٗ شئ" جس کے معنی یہ ہیں کہ آسمان و زمین کچھ نہ تھے اور پھر پیدا ہو گئے۔ اس لازوال و بے بدل کتابِ ربانی میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ موجودہ نظامِ عالم کی بربادی کے لئے (یا قیامت کے لئے) پلک جھپکانے بلکہ اس سے بھی کم زمانے کی ضرورت ہے اور اللہ تعالیٰ ہی کا کلام سب سے زیادہ سچا اور صداقت و حقیقت کے عین مطابق ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ سائنس اور فلسفہ کی بھول بھلیوں میں مذہب ہی صحیح رہنمائی کرتا ہے اور اس طرح کتاب و سنت ہی فکر و دانش اور عقیدہ و عمل کے حقیقی ماخذ اور معیار قرار پاتے ہیں۔
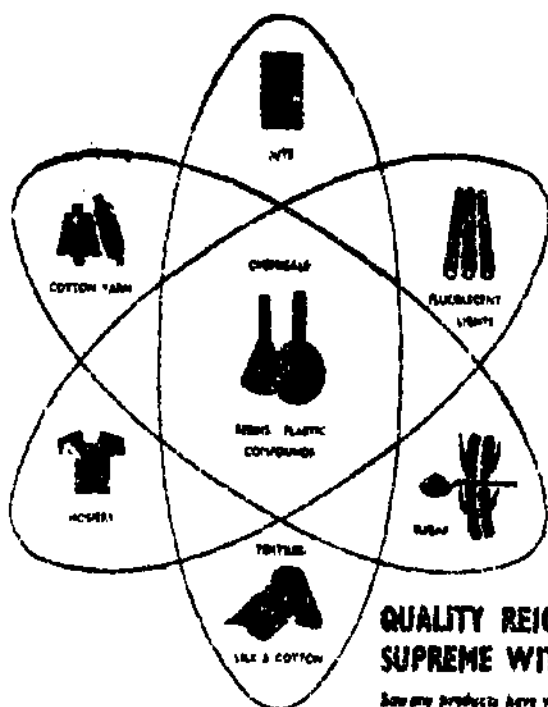
COTTON YARN
TEXTILES
SILK & COTTON
QUALITY REIGNS
SUPREME WITH US

مولانا محمد مصطفےٰ

غالب اور تغزل

ملے سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں   خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

حسن کا شیدائی جب گلزار و لالہ زار کے حسینوں کو دیکھتا ہے تو حسن تخیل اُسے یہ بتاتا ہے کہ اس خاک کثیف سے ایسے نازک و لطیف پھول تو پیدا نہیں ہو سکتے، ہو نہ ہو یہ گلے زمانے کے مہوشان لالہ رو اور گلرخان سمن بر ہیں جو عالم برزخ سے نقاب خاک کو اُلٹ کر اس طرح جلوہ نماں ہیں؛ اور یہ بھی چند ہیں ورنہ چند در چند تو اپنی خلوت ناز سے جھانکتے تک نہیں اور جب یہ ہیئت کذائیہ اُن کی یہ آن بان ہے تو ہائے اس زندگی میں آن کی کیا نہ کچھ شان ہوگی۔

"سب کہاں" سے کمیت کی کثرت، ظاہر ہوگئی اور "کیا" نے کیفیت حسن کے ناقابل بیان ہونے کو بتا دیا۔

ایک میرے ہندو شاگرد نے اثنائے درس میں یہ کہا کہ اس شعر سے تناسخ TRAN SMIGRATION کا مسئلہ ثابت ہوتا ہے، میں نے جواب دیا کہ نہیں اس میں حسن تعلیل و حسن تخئیل ہے،

تناسخ کے معنی میں روح کا وقت مقررہ پر ایک جسم حیوانی کو چھوڑ کر دوسرے جسم میں داخل ہونا اور یہ مسلمہ ہے کہ گل و لالہ از قسم نباتات ہیں نہ کہ از قبیل حیوانات۔

اگر یہ تناسخ کی کوئی نئی اصطلاح یا دریں ہے تو ایک نقطہ کا خط منحنی یا مستقیم ہو جانا تبخیر سے پانی کا ہوا ہو جانا اور تکثیف و تبرید سے اولا بن جانا یہ سب تناسخ ہوگا تو محبوب کا محب اور محب کا محبوب ہو جانا بھی تناسخ، بلکہ میں تو علیٰ سبیل الترقی یہ کہتا ہوں کہ انسان کا گلی کوچوں میں گشت لگانا اور بازار و لالہ زار میں سیر کر کے گھر واپس آ جانا بھی اگر تناسخ ہے تو کیا کہنا اس تناسخ کا، قربان جائیے اس تناسخ کے!

ملے نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں   تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

خوش نصیب جو کسی کو محبوب کا قرب و وصال اور مشاہدہ جمال حاصل ہوا دن اس کا عید اور رات اس کی شب برات ہے جتنا بھی ناز وہ کرے بجا ہے کیونکہ زلف پریشاں کی حمائل نے جسے اپنے حصار عافیت میں لے لیا ہے اب اُسے غم

ہزاروں سانپ کا ئیں پیچ اٹھ ہو وے تو میں جانوں

اس کے خلاف ایک عاشق ہے مہجور جسے نہ دن کو چین نہ رات کو نیند جس کی زبان حال کا یہ قال ہے:-

سے شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبالِ دوش   صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

۱۱۵

رات ہمسایوں نے اُٹھ اُٹھ کے دعائیں مانگیں — شور نالہ مرا مدھم نہ ہوا پر نہ ہوا

ات دن زلف بتاں کی طرح پیچ و تاب میں ہے اور دلجمعی سے کوسوں دور۔

میں نے ایک زمانہ گذرا کہ دیوان حافظ کا مطالعہ کیا تھا اور کسی شارح نے خواجہ حافظ کے اس شعر پر سے

کہ در ہمہ دست این غرض یارب کہ ہمدستاں شوند — خاطر مجموع ما زلف پریشان شما

ت کا اظہار فرمایا تھا کہ زلف پریشاں تو عاشق کی پریشانی خاطر کا باعث ہوتی ہے۔

اس اعتراض کو سن کر مجھے بھی پریشانی ہوتی تھی، الحمدللہ کہ مرزا کی زبان سے وہ اشکال حل ہو گیا اور دلجمعی نصیب ہوئی۔

میں چمن میں کیا گیا، گویا دبستاں کھل گیا — بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

ایسا بد دماغ خدا کی خدائی میں شاید ہی کوئی ہو جو محبت کے زمزموں کا قائل اور عشق کی داستان سے متاثر نہ ہو، سچ تو ہے کہ زمین تا آسمان اسی محبت پر قائم ہیں، محبت پاک نہ ہو تو دنیا ویران ہو جائے۔

محبت کا متوالا جب چمن میں جا نکلے گا تو گل کو دیکھ کر رخ محبوب کی یاد تازہ ہوگی، سرو اسے کسی کا قد دکھلائے گا اور نرگس بلا آنکھیں، پس وہ زار قطار خود روئے گا اور اس کے حال پر ہر گل تر ایک چشم خوں فشاں ہو جائے گا۔

ہاں اگر کہیں وہ شاعر بھی ہے تو اس کا نالہ منظوم بھی ہے، موزوں بھی ہے، یہ غزل کیا ہے، خدا جھوٹ نہ بلوائے، ایک طرح نالہ ہی تو ہے، اس کی اس طرز فغاں کو قمریاں اور طوطیاں بھی اُڑا لیتی ہیں اور بلبلیں تو صحیح معنی میں اس کی حقیقی جانشین بن جاتی ہیں۔

استعارہ کی زبان میں چمن بزم سخن ہے، بلبلیں فصحا و شعرا ہیں، شعر میں اشارہ ہے کہ درد عشق و سوز و گداز تغزل کی جان ہے رجسے یہ مل گیا بلاغت بھی اس پر نثار اور فصاحت بھی قربان،

میں گیا بھی واں تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب — یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہو گئیں

کیا کہنا اس تسلیم و رضا کا، کیا کہنا اس محبت والہانہ کا، اول تو محبوب کی سرکار میں جانے کی ہمت نہیں اور کسی نہ کسی طرح رسائی ہو گئی تو خالی ہاتھ کیونکر جاؤں، لے دے کر اپنے پاس ایک دعائیں رہ گئی تھیں سو وہ بھی سب کی سب درباں کو دے چکا۔ اب تو کوئی ایسی مستعمل دعا بھی نہیں رہی جسے محبوب پر نثار کر سکوں ایسی دعاؤں میں کوئی شریک نہ ہو ایسی دعا جو انہی اور صرف انہی کا حصہ ہے۔

"نفتہ" یہ کہتی ہے کہ عاشق یہاں "اشتراک فی المحبتہ" سے پرہیز کا اعلان اور توحید محض کی تلقین کر رہا ہے۔

ظرافت نے کہا یہ معاملہ تو ایسا ہی ہے جیسے بعض ریاستوں میں امیدوار جب کسی افسر سے ملنا چاہتا ہے تو اردلی ہی کے پاس اس جیب جواب دے جاتی ہے اور افسر کے پاس جانے کا منہ نہیں رہتا، متانت نے کہا کہ نہیں ایسا نہیں ہے افسر ایسے موقع پر امیدوار گالی نہیں دیتے بلکہ وہ تو اپنے عملہ کا شریک و سہیم ہوتا ہے۔

ہاں یہاں عاشق اور بوالہوس کا فرق معلوم ہو گیا کہ بوالہوس تو گالیاں کھا کے "بے مزہ" نہیں ہوتا لیکن عاشق کو وہ مزہ آتا ہے کہ لیوں کے معاوضہ میں ایسی دعائیں تلاش کرتا ہے جو اب تک کسی کو نہ دی ہوں۔

خواجہ حافظ نے ایسے موقع پر "عفاک اللہ نکو گفتی" کہا اور خوب کہا، لیکن مرزا غالب ہی مستعمل دعا سے اپنے محبوب کی شان

کو بالاتر سمجھتے ہیں، اب دیں تو کیا دیں اور کہیں تو کیا کہیں اس لئے حیران ہیں کہ "ان کی گالیوں کا کیا جواب"؟!!

شہ یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں — دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

آنکھوں سے بہیں جو سیحون یا گنگ، دجلہ تو ایران و ہندوستان کے شعراء نے بہائے ہیں لیکن یہ طوفانِ نوح بس غالب ہی کی آنکھوں میں سمایا ہے، دوسرے کا اس میں حصہ نہیں۔

کہتے ہیں کہ غالب اگر اسی طرح شدومد سے روتا رہا تو یہ امر یقینی ہے کہ اس کے نالوں سے ایسا طوفان عالمگیر برپا ہوگا کہ دنیا ویران ہو کر رہے گی۔

ایک صاحب نے بہ اردو کے ایم اے کے واقعہ (قصہ پیرانہ امتحان) میں اس تحریر پر کچھ مستحسن کی بات کا جواب دے کر آئے تھے مجھ سے دریافت کیا کہ اس کے نکات اور محاسن؟

میں نے جواب دیا۔ اس میں کم از کم سات نکات ہیں:-

۱۔ یونہی، کیفیت و شدت نالہ و بکا کو ظاہر کرتا ہے۔

۲۔ گر روتا رہا بشرطِ استمرار کی اس وجہ سے ہے کہ اول تو یہ آہ و بکا اُسے خود ہی ڈبو دے گی، ایک مدت تک دل کھول کر نہ سکے گا اور بالفرض ایسی ہمت کر گیا اور اتنا سخت جان نکلا تو یہ امر یقینی ہے کہ دیکھنا الخ

۳۔ غالب کا اپنی ذات کو صیغۂ غائب سے تعبیر کرنے میں یہ راز ہے کہ شدتِ محویت کے باعث یہ بھی یاد نہیں کہ آیا غالب میں ہی ہوں یا کوئی اور"

۴۔ اہلِ جہاں، یہ تخاطب بتاتا ہے کہ اس کی فریاد اطراف و اکنافِ عالم کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

۵۔ بستیوں سے جہان کو تعبیر کرنے میں یہ مصلحت ہے کہ ویرانے تو ویرانے ہی ہیں۔

۶۔ وہ کیا خاک ویران ہوں گے، اور غرق کہنے میں یہ خرابی تھی کہ اس کے لئے پانی لازم نہیں اور بستی اور ویرانہ متضاد بھی ہیں

۷۔ ہو گئیں مستقبل کو ماضی کے صیغہ سے ادا کرنا بوجہ تیقن کے ہے کہ آئندہ واقعہ ایسا ہے گویا کہ ہو چکا۔ ذرا بھی شک و شبہ نہیں۔

ماہر القادری

غلط فہمیاں

اس دنیا میں بعض ایسی باتیں بھی ہیں جو عوام ہی میں نہیں بلکہ خواص میں بھی غلط طور پر مشہور ہوگئی ہیں اور شہرت نے ان غلطیوں کو "مسلمات" بنا دیا ہے۔

شہاب الدین مقتول اور شہاب الدین سہروردی دو جدا جدا شخصیتیں ہیں، مگر ناموں کی یکسانی کی وجہ سے عوام نہیں خواص تک کو دھوکا ہو جاتا ہے یہاں تک کہ علامہ اقبال سے بھی تسامح ہوگیا۔

ہم اپنے بچپن میں فقیروں کی زبان سے ایک غزل سنا کرتے تھے، جس کے مطلع کا پہلا مصرعہ تھا۔

لے نار میں نورِ جبین و نما ہوگیا

اس غزل کا یہ شعر — ایک کی کھال ملتاں میں کھنچ گئی — ایک آرے سے چِر کر فنا ہوگیا

خاص طور سے زیادہ شہرت پاگیا۔ یہ غزل انتہائی سطحی اور عامیانہ ہے مگر اس کو کیا کیجئے کہ اسے خاصی شہرت حاصل ہوئی اس شعر کے دونوں مصرعوں میں تلمیح ہے۔ مصرعہ اولیٰ میں شمس تبریز رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے مصرعہ میں زکریا علیہ السلام کے واقعہ قتل کی طرف اشارہ ہے اس مصرعہ کی شہرت سے لوگوں کو دھوکا ہوگیا کہ حضرت شمس تبریز ملتان میں مدفون ہیں۔ حالانکہ حضرت شمس تبریز ہندوستان اور پاکستان کبھی نہیں آئے۔ ملتان میں جن صاحب کی قبر ہے، ان کا نام ہے شاہ شمس ہے۔ مگر وہ دوسرے بزرگ ہیں، شمس تبریز نہیں ہیں۔

عراق میں فارسی کا کوئی شاعر گزرا ہے جس کا تخلص محی تھا۔ حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا لقب "محی الدین" تھا۔ اس سے لوگوں کو یہ دھوکا ہوا کہ محی حضرت شیخ جیلانی کا تخلص تھا اور اس غلط فہمی کی بنا پر دیوان محی، دیوان غوث الاعظم کے نام سے چھپنے لگا اسی طرح ملا معین کے فارسی دیوان کو لوگ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کا دیوان سمجھ کر پڑھتے ہیں۔

ابوجہل کو عوام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا سمجھتے ہیں۔ حالانکہ حضور کا چچا ابولہب تھا۔ ابوجہل نہیں تھا۔ ابوجہل کا تو قبیلہ بھی دوسرا تھا

عام طور پر مشہور ہے کہ زلیخا بوڑھی ہونے کے بعد نئے سرے سے جوان ہوگئی اور حضرت سیدنا یوسف علیہ السلام سے اس کا نکاح ہوا مگر یہ بات بے اصل ہے شعر و افسانہ نے اسے اتنا زیادہ مشہور کر دیا ہے۔

انگریز اہل قلم نے یہ غلط فہمی پھیلائی ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو FOUNDER OF ISLAM لکھتے ہیں ان کی دیکھا دیکھی بہت سے مسلمان مورخین نے بھی حضور کو "بانی اسلام" لکھا ہے حالانکہ اسلام کا آغاز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے

سے نہیں ہوا۔ پہلا انسان جو دنیا میں پیدا ہوا وہ "اسلام" پر تھا۔ اسی لئے اسلام کو دینِ فطرت کہا گیا ہے، اسلام اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا دین ہے۔ کسی نبی، پیغمبر نے اسے ایجاد نہیں کیا اور کوئی انسان اسلام کا بانی نہیں ہے۔ ہر نبی مسلم تھا اور اس نے دنیا کو اسلام کی دعوت دی
یہ جو عوام مسلمان نماز کی نیت یوں کرتے ہیں "نیت کرتا ہوں، چار رکعات نماز فرض، وقت عشا پیچھے اس امام کے"

تو

کتاب و سنت سے اس طرح نیت کرنے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا اور نہ صحابہ کرام زبان سے نیت کیا کرتے تھے۔ نیت دل میں کرنی چاہئے۔ کیونکہ جس کی عبادت کی جاتی ہے وہ نیت اور دل کے حال سے واقف ہے۔ ھو لطیف خبیر۔

اچھے خاصے لکھے پڑھے لوگ اس شعر

حسن جب مقتل کی جانب تیغ براں لے چلا　　عشق اپنے مجرموں کو "پا بجولاں" لے چلا

میں "پا بجولاں" کا "دوراں" کے وزن پر تلفظ کرتے ہیں، حالانکہ "جولاں" میں واؤ معروف ہے اور اس کا وزن "لوراں" ہے "جولاں" جس کے "ج" اور "واو" پر زبر ہے اس کے معنی دوڑانے کے ہیں، میر انیس فرماتے ہیں۔

برچھی ہلا کے زخ نے جولاں کئے سرنگ

مگر مندرجہ بالا شعر میں "جولاں" زنجیر اور بیڑی کے معنی میں استعمال ہوا ہے — یہ کہ عشق اپنے مجرموں کو "پابہ زنجیر" لے چلا۔

فارسی کا مشہور مصرعہ ہے۔

حب الوطن از ملک سلیماں خوشتر

یہ مصرعہ ضرب المثل بن چکا ہے اور ضرب المثل میں ظاہر ہے کہ ترمیم یا اضافہ نہیں کیا جاتا۔ مگر شاعر نے "حب الوطن" غالباً نہیں کہا ہوگا۔ اور کہا ہے تو اس میں معنوی سقم پایا جاتا ہے پورا شعر ہے۔

حب الوطن از ملک سلیماں خوشتر　　خار وطن از سنبل و ریحاں خوشتر

مصرعہ ثانی میں "خار وطن" کو "سنبل و ریحاں" سے زیادہ خوبصورت بتایا گیا ہے۔ اس مناسبت سے "ملک سلیماں" کو "سنبل و ریحاں" کی طرح کسی مشہود و نظر آنے والی چیز سے خوشتر بتانا چاہئے۔ اس لئے گمان غالب یہ ہے کہ شاعر نے "حب الوطن" نہیں "جَب الوطن" کہا ہوگا "جُب" عربی میں کنوئیں اور گڑھے کو کہتے ہیں، شاعر نے یہ بات کہی ہے کہ اپنے وطن کا "گڑھا" ملک سلیماں سے بھی زیادہ بھلا لگتا ہے اور وطن کا کانٹا سنبل و ریحاں سے زیادہ خوش منظر ہے۔

وہ آئے بزم میں اتنا تو میر نے دیکھا　　پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

شعر کی معنوی غلطی کو سمجھنے کے لئے ان مثالوں پر غور کیجئے۔ محبوب باغ میں گیا اور اس کے جاتے ہی باغ میں بہار نہ رہی یا لوگوں نے دیکھا کہ پھولوں کی رنگت ہی غائب ہو گئی۔ تو یہ محبوب کے "حسن و جمال" کی تعریف کے بجائے اس کے "سبز قدم" اور منحوس ہونے کی علامت ہے حالانکہ کہنا یوں چاہئے تھا کہ محبوب باغ میں جو گیا تو پھولوں کا رنگ پھیکا دکھائی دینے لگا اور گلشن کی بہار شرما گئی۔ دوسری مثال۔ فلاں مولانا شہر میں کیا آئے کہ علماء ان کے علم و فضل کے آگے اپنے کو جاہل محسوس کرنے لگے۔

محبوب کے حسن و جمال کی تعریف اس انداز میں کرنا کہ اس کے کہیں پہونچنے سے کسی چیز منظر یا انسان کا حسن بڑھتا یا فلاں خوبی رخصت

ہو گئی۔ اس میں پیشگوئی اور محبوب کے "سبز قدم" ہونے کی علامت پائی جاتی ہے۔

غالبؔ کی غزل ہے۔

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جزمرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

نواب سراج الدین خاں سائلؔ دہلوی جو مرزا غالبؔ سے خاندانی قرابت بھی (رکھتے تھے)، اور انہوں نے اپنے بچپن میں غالبؔ کو دیکھا تھا انہوں نے راقم الحروف سے بیان کیا کہ غالبؔ نے "ہونے تک" نہیں "ہوتے تک" کہا تھا۔ مگر بعد میں یار لوگوں نے "ت" کا لفظ غائب کرکے "ہونے تک" بنا لیا۔ مالک رام (ایم۔ اے) مرزا غالبؔ پر سند مانے جاتے ہیں ان کی تحقیق بھی یہی ہے کہ مرزا غالبؔ کے دیوان کے قدیم نسخوں میں "ہوتے تک" (ت کے ساتھ) ہی املا کیا گیا ہے۔ کوئی شک نہیں آج کی زبان "ہونے تک" ہی ہے مگر "ہوتے تک" نامانوس نہیں معلوم ہوتا اور ذوق و وجدان پر گراں نہیں گزرتا۔

حفیظؔ جونپوری کا مشہور شعر ہے۔

بیٹھ جاتا ہوں، جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے! کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

اس شعر کی عوام نہیں خواص تک بہت تعریف کرتے ہیں اور کوئی شک نہیں شعر ہے بھی تعریف کے قابل! مگر اس طرف کسی اہل نظر کی شاید نگاہ نہیں گئی کہ قافیہ کی مجبوری کے سبب شاعر کو "گھنی" لانا پڑا۔ ورنہ غریب الوطنی میں "گھنی چھاؤں" کی قید کیوں؟ کہنا یوں چاہیے تھا کہ تھوڑی سی چھاؤں بھی جہاں ہوتی ہے وہاں میں بیٹھ جاتا ہوں۔ یعنی پردیس میں ذرا سا سہارا بھی بہت ہوتا ہے۔

مشاہیر کی شخصیتوں کے بارے میں بعض غلط نسبتیں شہرت پا جاتی ہیں اور ان کے بعض کمالات نمایاں ہونے نہیں پاتے۔ مثلاً اسحاق موصلی کو دنیا باکمال مغنی اور مطرب کی حیثیت سے جانتی ہے حالانکہ یہ شخص علم و فضل میں بلند مرتبہ رکھتا تھا۔ علامہ شبلی نعمانی کی شاعری [illegible] تصانیف کے مقابلہ میں دب کر رہ گئی ہے۔ افسوس ہے شعرا کے تذکروں میں شبلی کا نام تک نہیں آتا، حالانکہ علامہ شبلی نغز گو شاعر ہیں۔

مانی کو لوگ ایک فنکار مصور کی حیثیت سے جانتے ہیں حالانکہ وہ ایک مذہب کا بانی ہے اور مزدکیت کی طرح مانویت کو بھی ایرانی کے لوگوں نے مذہب کے طور پر قبول کیا ہے۔

ہے تو ایک لطیفہ، مگر اس سے بعض لوگوں کی دماغی سطح کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک صاحب نے کسی کالج میں "یوم اقبال" کے ایک اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ اقبال نے بڑا ایثار کیا۔ قوم کی خاطر آرام و آسائش کو اہمیت نہیں دی۔ قلندرانہ زندگی گزاری؛ وہ ولایت سے "ڈاکٹری" پاس کرکے آتے مگر ایک دن بھی ڈاکٹری نہیں کی۔

ہم نے اپنے بچپن میں سنا تھا کہ پنڈت موتی لال نہرو اور ان کے فرزند پنڈت جواہر لال نہرو کے کپڑے الہ آباد سے پیرس دھلنے کے لئے جاتے ہیں۔ پنڈت نہرو نے اپنی خود نوشتہ سوانح عمری میں اس واقعہ کی واضح الفاظ میں تردید کی اور انہوں نے لکھا کہ اس واقعہ کی ہم جتنی تردید کرتے ہیں اتنا ہی بعض لوگوں کو اس واقعہ کی صداقت پر یقین ہوتا جاتا ہے کہ ہم انکسارِ نفس کے سبب ایسا کہتے ہیں اس واقعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ بڑے لوگوں کے بارے میں کیسی کیسی عجیب و غریب باتیں تصنیف کرکے مشہور کر دی جاتی ہیں۔

امریکہ کے ایک ادب پتی تاجر کے بارے میں یہ بات سننے میں آتی کہ اس کے یہاں مال و دولت کی فراوانی کا یہ عالم ہے کہ چائے بنانے کے لئے پانچ سو کے نوٹ جلائے جاتے ہیں۔ حالانکہ کوئی صاحب ہوش ایسی حماقت نہیں کر سکتا، روپیہ پیسہ کے اندھا دھند خرچ کرنے کے بہت سے

محل و مقام اور طریقے ہیں۔

نواب کلب علی خاں مرحوم والیٔ رامپور کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ صبح سویرے سو روپے کی لاگت کا ایک پیالہ پیتے ہیں اور اس میں اشرفیوں کا بگھار دیا جاتا ہے۔ اب سے اسّی (۸۰) سال پہلے کے سو روپیہ آج کے کم از کم دو ہزار روپوں کے برابر ہوتے ہیں۔ اتنی قیمت کا ایک پیالہ کون پی سکتا ہے اور وہ کیسی چیزیں ہوں گی جن کے مرکب محلول یا شربت و حریرہ کی اتنی قیمت ہوگی پھر اشرفیوں کا بگھار بھی ایک افسانہ ہی معلوم ہوتا ہے ایک گاؤں والے نے سو روپیہ کے پیالہ کی روایت سن کر کہا، کیا نواب صاحب نرا گھی پیتے ہیں۔ اس کے نزدیک گھی ہی سب سے زیادہ قیمتی چیز تھی، اس طرف اس کا خیال ہی نہیں گیا کہ ایک پیالے میں تو آٹھ آنہ کی قیمت کا گھی بھی مشکل ہی سے سما سکتا ہے۔

تذکروں میں بعض بزرگوں کے بارے میں ہم نے پڑھا ہے کہ وہ ایک رات میں ایک ہزار رکعت نوافل پڑھتے تھے۔ تذکرہ نویسوں نے اس کا حساب نہیں لگایا کہ کوئی شخص غروب آفتاب سے لے کر سپیدۂ صبح نمودار ہونے تک مسلسل نماز پڑھتا رہے اور ایک منٹ میں ایک رکعت ادا کرے تو بارہ گھنٹوں میں زیادہ سے زیادہ سات سو بیس رکعتیں پڑھ سکتا ہے۔ مدح ہو یا ذم جب لوگ مبالغہ پر آتے ہیں تو انہیں اس کا خیال نہیں رہتا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں کیا ایسا ہو بھی سکتا ہے؟

ایران کے مشہور پہلوان رستم کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کی طاقت کا یہ عالم تھا کہ جب وہ چلتا تھا تو اس کی ٹانگیں زمین میں دھنس جاتی تھیں۔ اس مبالغہ کو عقل سلیم کس طرح باور کر سکتی ہے۔ ایران کے مشہور شاعر فردوسی "صاحب شاہ نامہ" نے رستم سے عجیب و غریب باتیں منسوب کر دی ہیں۔ جس کا خود اس نے اعتراف بھی کیا ہے۔

منم کردہ ام رستمے داستاں   وگرنہ یلے بود در سیستاں

میں نے اپنی شاعری کے زور سے رستم کو اتنا مشہور کر دیا ہے ورنہ وہ تو سیستان کا ایک معمولی پہلوان تھا۔

راقم الحروف کا آغاز شباب تھا ان دنوں فانی بدایونی کی غزلیں بہت مشہور تھیں۔ خاص طور سے ان کی اس غزل ؎

سنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے   کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

کا ہر طرف چرچا تھا، فانی وکالت کا پیشہ کرتے تھے، ان کے بارے میں سننے میں آیا کہ وہ کسی مقدمہ کی پیروی کے لئے بریلی جا رہے تھے، ایک اسٹیشن پر سیکنڈ کلاس میں ایک نہایت حسین عورت انہیں نظر آئی اسے دیکھ کر وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ اضطرار و بے اختیاری کے عالم میں اسی ٹرین میں بے ٹکٹ سوار ہو گئے اور لکھنؤ کے ریلوے اسٹیشن پر ٹکٹ چیکر نے انہیں پکڑ لیا بے چارہ مدعا علیہ سر پیٹ کر رہ گیا۔ وکیل کے نہ پہنچنے سے مدعی کے کیس کو خاصہ فائدہ پہنچا۔

اس روایت کے سننے کے تقریباً دس سال بعد حضرت فانی بدایونی مرحوم سے حیدرآباد دکن میں میری ملاقات بلکہ خاصی بے تکلفی ہو گئی تو ایک دن میں نے اس روایت کا ان سے ذکر کیا وہ اس پر بہت ہنسے اور پھر سنجیدہ انداز میں فرمایا کہ میں حسن پرست تو ہوں مگر ایسا بے وقوف اور عقل کا اندھا نہیں ہوں جیسا روایت گھڑنے والے نے مجھے ظاہر کیا ہے میں ایسی حرکت کر ہی نہیں سکتا یہ روایت کسی ستم ظریف نے تصنیف کی ہے۔

یہ دنیا ہے یہاں لوگ پر کا کوا بنا ہی دیتے ہیں مگر اب بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ "پر" کا نام و نشان تک نہیں ہوتا اور کووں کی بارات کا واقعہ تصنیف کر دیا جاتا ہے۔

امیر عبدالرحمٰن خاں مرحوم فرمانروائے کابل افواہ پھیلانے والے کو سخت سزا دیا کرتے تھے، جب کوئی اس جرم میں پکڑا ہوا آتا

ے پوچھتے "تم نے یہ بات کس کی زبان سے سنی تھی"
اگر وہ شخص کسی شخص کا نام بتا دیتا تو پھر اس شخص سے پوچھ گچھ کی جاتی اور اگر کوئی یہ کہتا کہ۔
"شہر میں یہ خبر اڑ رہی ہے۔لوگ ایسا کہہ رہے ہیں میں نے کسی محفل میں لوگوں کی زبانی ایسا سنا تھا یہ بات شہر میں گشت کر رہی ہے"
یا اُسے سخت سزا دی جاتی۔

لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، ہیر رانجھا کے جو قصے مشہور ہیں، ان میں نہ جانے کتنی باتیں لطف و تفریح اور گرمئ محفل کے لئے یار
نے تصنیف کی ہیں، حسن و محبت کی شہرت ہو یا رسوائی ہر کسی کو نہیں ملتی، اس حقیقت کے ساتھ یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے۔

ممکن نہیں کہ عشق میں رسوا نہ ہو کوئی! مجنوں کے بس کی بات نہ لیلےٰ کے بس کی بات
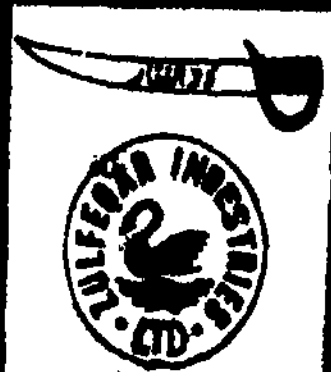
صوفی عبدالرشید (چاٹگام)

پاکستان ادارہ تحقیقات اسلامی کے ڈائرکٹر جناب ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی انگریزی کتاب "اسلام" کے ترجمے کے چند اقتباسات دار ماہنامہ فکر و نظر میں شائع ہو رہے ہیں نظر سے گزرے۔ اسلام کے مسلمہ بنیادی اصولوں کے خلاف جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ گمراہ کن ہیں ہر مسلمان جسے اپنا دین و ایمان عزیز ہے ایسی عبارت پڑھ کر اضطراب محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ نبوت، احادیث، وحی اور قرآن شریف کے متعلق چودہ سو سال سے اکابرین امت اور صحابہ کرام نے جو تشریحات قرآنی آیتوں کے حوالے سے پیش کئے ہیں ان سب کو ناپختہ عقل والوں کی پیداوار ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ڈاکٹر صاحب کی تحقیقات میں دراصل انہی فرسودہ باتوں کو نئے انداز میں پیش کیا گیا ہے جنہیں آج سے تقریباً ۳۰ سال قبل برصغیر پاک و ہند کے علماء نے مدلل ثبوت کے ساتھ باطل قرار دے دیا تھا۔ شاید ۱۹۳۹ء یا ۱۹۴۰ء تھا کہ لکھنؤ کے ماہنامہ نگار کے مدیر نیاز فتحپوری صاحب نے وحی کو رسول اللہ کے قلبی تاثرات اور کلام اللہ کو کلام رسول ثابت کرنے کی کوشش کی تو پورے ہندوستان کے مسلمانوں نے غم و غصہ کا اظہار کیا۔ مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالماجد دریاآبادی نے ماہنامہ معارف کے مدلل اور دندان شکن جوابات دے کر نیاز صاحب کو اپنی عبارت پر نادم ہونے پر مجبور کیا۔ ریاست حیدرآباد میں نگار کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا۔ لیکن آج ہماری یہ بدقسمتی ہے کہ ایک صاحب حکومت کے ادارے سے وابستہ ہو کر، تحقیقات کے پردے میں تحریف کا پارٹ ادا کر رہے ہیں اور ہم خاموش تماشائی بن کر سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔

مندرجہ ذیل اقتباسات ملاحظہ ہوں :-

"نبوت اور الہام نبوی کا یہ تصور کہ نبی کے شعور کی سطح معمول کے مطابق ہوتی ہے" راسخ العقیدہ علماء نے واضح طور پر بہت بعد میں قائم کیا۔ پھر جب زمانہ بعد میں نبوت کا یہ تصور قائم کر لیا گیا تو اس تصور کی قصداً اشاعت کی گئی۔ مقصد یہ تھا کہ وحی الٰہی معروضیت (یعنی خارجی چیز ہونا) اور فرشتہ کی خارجیت کا یعنی اس تصور کا کہ یہ وحی الٰہی کوئی داخلی الہام نہ تھا بلکہ خارج سے ایک آواز آ رہی تھی یا فرشتہ خدا کی طرف سے پیغام لاتا تھا ممکن ہے آج ہمیں یہ کوشش عقل میں ناپختگی معلوم ہو لیکن اپنے دور میں جب کہ عقائد اسلام زیر تشکیل تھے بعض حالات کی بنا پر ایسی کوشش عمل میں آنی ضروری تھی۔ بالخصوص عقلیت پسندوں سے جو مباحثے ہو رہے تھے، ان کے پیش نظر ایسا کرنا ضروری تھا۔ اس زمانے میں بہت سی احادیث کی اشاعت عمل میں آئی جنہیں بعد میں سند قبولیت حاصل ہو گئی۔ ان احادیث میں یہ بتایا گیا تھا کہ رسول اللہ جبرئیل سے لوگوں کے سامنے ہمکلام ہوتے تھے۔ نیز ان میں جبرئیل کی ظاہری کیفیت کی مرقع آرائی بھی کی گئی تھی۔ یہ احادیث قرآن سے بالکل متناقض ہیں،

کیونکہ قرآن کا ارشاد ہے نزل بہ الروح الامین علی قلبک لتکون من المنذرین ۔ اس کو ایک امانت دار فرشتہ لے کر آیا ہے آپ کے قلب پر تاکہ آپ بھی منجملہ ڈرانے والوں کے ہوں (اس سلسلے میں مزید دیکھئے سورہ البقرہ آیت ۹۷) اس کے باوجود مسلمانوں کے ذہن میں یہ عقیدہ اس قدر راسخ ہو چکا ہے کہ جبریل کا وجود خارج میں ہے اور وحی الٰہی خارج سے رسول اللہ پر نازل ہوئی، کہ اب وہ حقیقت سے آشنا ہونے پر آمادہ نہیں (فکر و نظر اگست ۶۷ء)

تعجب ہے اس دیدہ دلیری پر۔ جن آیتوں کو پیش کیا گیا ہے خود انہی سے جبریل کی خارجی حیثیت ثابت ہو جاتی ہے مگر موصوف انہیں اس کی تردید کے لئے پیش کر رہے ہیں کیا ان آیتوں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ایک شے جس کا نام روح الامین ہے قلب رسول پر نازل ہوتی۔ نازل کے نعل سے صاف ظاہر ہے کہ رسول اللہ کے ذہن یا شعور میں کوئی بات فی نفسہ پیدا نہیں ہوگی بلکہ علی قلبک سے صاف ظاہر ہے کہ کوئی خارجی شے نازل ہوئی تو پھر یہ کس طرح سے مان لیا جائے کہ یہ داخلی الہام تھا اور پھر قرآن شریف تو یہ کہتا ہے کہ انہ لقول کریم وما ھو بشاعر ” یہ قرآن فرشتہ عالی مقام کی زبان کا پیغام ہے اور یہ کسی شاعر کی زبان کی بات نہیں (پارہ ۲۹ آیت ل فرشتہ کے مقابلے میں قول شاعر کا ذکر کرنا اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ وحی کسی داخلی الہام کا نام نہیں ہے بلکہ جس طرح زبان سے باتیں ہیں اسی طرح وحی لفظ بلفظ نازل ہوئی خارجی آواز کے ساتھ ۔ مزید تشفی کے لئے مندرجہ ذیل آیت ملاحظہ ہو۔

لا تحرک بہ لسانک لتعجل بہ ان علینا جمعہ وقرانہ فاذا قرانہ فاتبع قرانہ

اے محمد وحی کے پڑھنے کے لئے اپنی زبان کو حرکت نہ دیا کرو کہ اس کو جلد یاد کر لو اس کا جمع کرنا اور پڑھانا ہمارے ذمہ ہے جب ہم وحی پڑھیں تو تم اس کو سنا کرو اور پھر اُسی طرح پڑھا کرو (۲۹ پارہ ۱۸ آیت)

اس آیت سے دو باتیں خاص طور سے ظاہر ہوتی ہیں ایک یہ کہ وحی رسول اللہ کو پڑھ کر سنائی جاتی تھی یعنی لفظ بلفظ۔ اور دوسری فاتبع قرانہ سے صاف ظاہر ہے کہ نہ صرف الفاظ بلکہ تلاوت کا لہجہ و طریقہ بھی بغور سننے اور اسی طرح پڑھنے کا حکم دیا گیا۔ کیا ہم ذہن یا شعور میں داخلی الہام کہہ سکتے ہیں۔ ان دو باتوں سے تیسری بات جو لازمی طور پر عیاں ہے وہ یہ کہ وحی خارجی آواز کے ذریعہ رسول اللہ تک پہونچتی تھی۔ لہذا خارجی آواز کے خلاف ڈاکٹر صاحب کا نظریہ بھی بالکل غلط ثابت ہو گیا اور اس غلطی پر تم بنے بال تک اپنے ایمان ——— کی صحت و درستی کا دعویٰ کر سکتا ہے !

جبریل امین سے لوگوں کے سامنے رسول اللہ کے ہمکلام ہونے کے متعلق بھی ڈاکٹر صاحب کو یقین نہیں بلکہ ان کی تحقیقات نے یہ بتایا بزرگان دین نے جبریل کی ظاہری کیفیت کی مرقع آرائی کی تھی اور یہ احادیث قرآن سے بالکل متناقض ہیں۔ پتہ نہیں کہ اس قسم کی تحقیقات قرآنی آیتوں پر پردہ ڈالنا ہے یا صحیح معنوں میں قرآنی آیتوں سے لاعلمی کا نتیجہ ہے۔ قرآن کریم میں ایسی بہت سی آیتیں ہیں جن سے فرشتے کی شکل میں ظاہر ہونا ثابت ہوتا ہے تو پھر ان احادیث کو قرآن سے بالکل متناقض کیسے کہا جا سکتا ہے ذیل میں صرف اختصار کی خاطر ان کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے متعلق اللہ کا پیغام لے کر جب فرشتہ حضرت مریم کے پاس آیا تو اس کے متعلق قرآن شریف یہ کہتا ہے۔

فارسلنا الیھا روحنا فتمثل لھا بشرا سویا (۱۶ پارہ آیت ۱۹)

اس وقت ہم نے ان کی طرف اپنا فرشتہ بھیجا تو وہ ان کے سامنے ٹھیک آدمی کی شکل بن گیا۔

(۲) جن فرشتوں کو حضرت ابراہیم کے پاس اللہ نے پیغام لے کر بھیجا وہ بالکل آدمی کی شکل میں آئے تھے۔

هل اتٰك حديث ضيف ابراهيم المكرمين اذ دخلوا عليه فقالوا سلاما قال سلام قوم منكرون ٥ فراغ الى اهله فجاء بعجل سمين۔ جلا تجہارے پاس ابراہیم کے مہمانوں کی خبر پہونچی ہے؟ ان کے پاس آئے تو سلام کہا انہوں نے بھی جواب دیا۔ سلام کہا (دیکھا تو) ایسے لوگ ہیں نہ جانی پہچان تو اپنے گھر جا کر ایک (بچھڑا بھنا ہوا) مرغ لائے اور کھانے کے لئے ان کے آگے رکھ دیا (۲۶ پارہ آیت ۲۶) ان آیات کے باوجود اگر کوئی شخص یہ کہے کہ فرشتوں کی خارجی حقیقت نہیں ہے اور جو وحی لیکر آتے تھے وہ ذہن و شعور میں اتار دیا جاتا تھا۔ یعنی الفاظ قرآن خود پیغمبر کے ہوتے تھے، تو ایسے شخص کے متعلق عوام خود فیصلہ کرلیں۔ کہ وہ قرآن و وحی کے بارے میں کتنے فاسد اور ناقص عقائد رکھتا ہے،

ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو۔

● ــــ "جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاقی اور روحانی ادراک ترقی کرکے بلند ترین درجے پر پہونچا تو ادراک خود اخلاقی قانون کا عین بن گیا تو الہام کے ساتھ الفاظ کا بھی نزول ہوا، چنانچہ قرآن خالصاً کلام الہی ہے، لیکن بہرحال اس کے ساتھ وہ آنا ہی پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عمیق ترین شخصیت سے بہت زیادہ مربوط ہے اور قرآن پاک اور آپ کی شخصیت کے اس ربط کا تصور میکانکی طور پر اس طرح نہیں کیا جاسکتا جیسے کہ فونوگراف اور ریکارڈ کا ربط ہے۔ کلام الہی کا سوتا پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قلب سے پھوٹ کر نکلا۔"

اسے کہتے ہیں الفاظ کی شعبدہ بازی۔ ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ الہام کے ساتھ الفاظ کا بھی نزول ہوا۔ چنانچہ قرآن خالصاً کلام الہی ہے لیکن دوسری طرف یہ کہا جاتا ہے کہ کلام الہی کا سوتا پیغمبر کے قلب سے پھوٹ کر نکلا اور ان کی شخصی ادراک کے چشمے سے پھوٹ کر نکلا اس شخصی ادراک کے چشمے کو کلام الہی اور آواز فرشتہ سے ویسا ربط نہیں ہے۔ جیسے فونوگراف یا ریکارڈ کو اپنی اصلی چیز سے ربط ہوتا ہے یعنی دیگر ہم لوگوں تک جو الفاظ قرآن پہنچے ہیں وہ پیغمبر کے شخصی چشمے سے پھوٹ کر نکلے ہیں۔ یعنی قرآن شریف موجودہ شکل میں جو ہمارے پاس ہے وہ کلام رسول ہے۔ فرشتہ اور آواز کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

یہ ہے دینی مسلمات کی وہ گمراہ کن تحریف جسے "تحقیق" (RESEARCH) کا نام دیا گیا ہے۔

ے نگہ کی نامسلمانی سے فریاد!

عبدالحمید صدیقی (ایم۔اے)

روحِ انتخاب

عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اشتراکیت صرف ذرائع پیداوار کو حکومت کی تحویل میں دے دینے کا نام ہے۔ حالانکہ یا نظریہ کا بالکل سطحی مطالعہ ہے۔ ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنانا تو اس بنیادی اور اساسی اصول کی محض ظاہری علامت ہے جس کے تحت معاشرے کو خدا اور انسان کو اس کا بندہ بنا دیا گیا ہے۔ جس طرح نماز میں انسان رکوع و سجود کر کے باری تعالیٰ کی بڑائی اور اپنے عجز کا اظہار کرتا ہے بالکل اسی طرح افراد کو حقوقِ ملکیت سے محروم کر کے انہیں یہ بتایا جاتا ہے کہ اُن کا زندگی کے کسی معاملے میں بھی کوئی مستقل حق نہیں ہے۔ اُن کا جان، مال، عزت، آبرو سب اجتماعی مفادات کے تابع ہیں۔ اُن کی ساری وابستگیاں صرف معاشرے کے لئے ہونی چاہئیں معاشرہ اگر انہیں زندہ رہنے کا حق دے تو انہیں زندہ رہنا چاہئے۔ اور اگر وہ انہیں اس سے محروم کرے تو انہیں خود بخود بڑی خوشی کے ساتھ اس سے دستبردار ہونا چاہئے۔ جس طرح ایک بندۂ مومن خدائی احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہے اسی طرح انہیں معاشرے کی زمام کار سنبھالنے والوں کی دل و جان سے اطاعت کرنی چاہئے۔ اور ان کے ہر حکم اور فیصلہ کو اسی جذبۂ اخلاص سے قبول کیا جانا چاہئے جس طرح خدا کے فیصلوں کو قبول کیا جاتا ہے، حتیٰ کہ انہیں اس کے خلاف کچھ سوچنے کا حق بھی حاصل نہیں ہے۔ اشتراکیت میں معاشرے سے بالا کوئی عبادت اور پرستش کے لائق نہیں۔ اس کے مفادات سے زیادہ کوئی مفاد عزیز نہیں اس کے حقوق پر کسی دوسرے کا حق فائق نہیں۔ حقِ ملکیت سے محرومی تو محض اس کی معاشرے کے سامنے عجز و نیاز اور عبودیت کا عملی ظہور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اشتراکی معاشرے اپنے اس حق کا مختلف مقامات پر مختلف طریقوں سے تقاضا کرتے ہیں۔

مندرجہ بالا معروضات پر ایک مرتبہ پھر نگاہ ڈالیں اور دیکھیں کہ کیا ایک مسلمان خدائی کے مقام پر کسی دوسرے شخص، ادارے یا انسانوں کے کسی بڑے سے بڑے گروہ کو فائز کر کے اس کی غیر مشروط اطاعت و بندگی کر سکتا ہے؟ آخر ایک مسلمان مسلمان رہتے ہوئے اپنے خالق و مالک سے اپنی بندگی کا تعلق توڑ کر معاشرے کی بندگی کا قلادہ کس طرح گلے میں پہن سکتا ہے؟ یہ اگر شرک اور بت پرستی نہیں تو اور کیا ہے؟ جب آپ انسان کی انفرادیت اس کے انفرادی حقوق اور خدا کے ساتھ اس کے ذاتی تعلق کو ختم کر کے اُسے اجتماعی مفادات کا پرستار بنا دیں گے۔ تو وہ پھر لازمی طور پر معاشرے کی خدائی کا علمبردار ہو گا اور وہ ہر اس اصول کو ٹھکرائے گا جو ان مفادات کے لئے کسی طرح مفید نہ ہو، روس اور چین کی بہت سی مساجد جو کلبوں میں تبدیل ہو گئی ہیں اُن کی وجہ اُس کے سوا اور کیا ہے کہ انہوں نے نماز کو مادی مفادات کے نقطۂ نظر سے محض تضیعِ اوقات سمجھ کر، بلکہ معاشرے کے سوا کسی اور کے مسجود ہونے کو معاشرے سے بغاوت سمجھ کر اس سے انحراف کو ناگزیر قرار دیا ہے جس طرح ایک مسلمان مسلمان رہتے ہوئے کفر کی راہ اختیار نہیں کر سکتا بالکل اسی طرح ایک مسلمان اشتراکیت کو بھی اپنا مسلکِ زندگی نہیں بنا سکتا۔

ماہر القادری

یادِ رفتگاں

عبداللہ المسدوسی مرحوم

ریاست حیدرآباد دکن کا ایک ضلع "محبوب نگر" تھا جس کے نواح کے شریفے (سیتاپھل) بہت مشہور تھے بے حد شیریں اور حجم میں چھوٹے کٹورے کے برابر۔ محبوب نگر سے میل ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ایک درخت تھا جس کی شاخوں کا پھیلاؤ رقبہ کے لحاظ سے کئی فرلانگ کا تھا! ایک بڑا قافلہ اس درخت کے سائے میں ٹھیر سکتا تھا۔ یہی محبوب نگر عبداللہ المسدوسی مرحوم کا مولد و منشا تھا۔

اُن کی تعلیم بلدہ حیدرآباد میں ہوئی جب وہ ہائی اسکول میں پڑھتے تھے، تو نواب بہادر یار جنگ مرحوم اُن کے ہم مدرسہ اور ہم جماعت تھے، پھر وہ جامعہ عثمانیہ میں داخل ہو گئے اور وہاں سے بی۔ اے اور ایل۔ ایل۔ بی کے امتحانات میں کامیابی حاصل کی۔ تحریر و تقریر کا شوق ہائی اسکول ہی کے زمانے سے تھا۔

تعلیم ختم کرنے کے بعد مسدوسی صاحب نے حیدرآباد میں وکالت شروع کی اور اوسط درجہ کے وکلاء میں اُن کا شمار ہونے لگا، بنگلہ میں رہتے تھے اور سواری کے لئے موٹر تھی! سیاسی زندگی کا آغاز مجلس اتحاد المسلمین کی رکنیت سے ہوا، مگر نواب بہادر یار جنگ مرحوم کی پالیسی سے اختلاف کے سبب اتحاد المسلمین سے کنارہ کش ہو گئے، اُن کا اپنا خاص مزاج تھا ارباب اقتدار پر نقد و احتساب کے مقابلے میں اُن سے تعاون کو زیادہ پسند کرتے تھے، اسی لئے وہ خلفاء بنی اُمیہ کے مداح تھے، کئی بار راقم الحروف سے اس مسئلہ پر بحث ہوئی! پاکستان میں بھی مسدوسی صاحب مرحوم کا یہی مزاج اور رنگ رہا۔

حیدرآباد دکن کے سیرۃ النبیؐ کے جلسوں میں اُن سے کئی بار ملاقات رہی مگر میرا اُن کے یہاں آنا جانا نہ تھا۔ پاکستان پہنچنے کے بعد کراچی میں مولانا ظفر احمد انصاری کے مکان پر اُن سے ملاقاتیں ہوتی رہتیں اور اس طرح اُن سے خاصے گہرے روابط ہو گئے، کئی کھانوں کے علاوہ "حلیم" اُن کے یہاں خاصے اہتمام سے تیار کیا جاتا، مجھے کئی بار مرحوم کے یہاں کی دعوتوں میں شریک ہونے کا موقعہ ملا اور دسترخوان پر اُن کی سیرچشمی کا تجربہ ہوا۔

پاکستان پہنچنے کے دو سال بعد "زکوٰۃ کمیٹی" حکومت نے مقرر کی تھی اس میں وہ ریسرچ کا کام کرتے تھے، اردو کالج کے شعبہ قانون میں برسوں لیکچرار رہے اور یہ وقتی خدمت (PARTTIME) تھی جو اُن سے متعلق تھی، "قانونِ شہادت

ب خاصی بصیرت حاصل تھی !

تقریر بہت اچھی کرتے تھے، اگر طول بیانی کی عادت نہ ہوتی تو فن تقریر میں خاصی شہرت اور قبول عام حاصل کرتے!
پ سے چند سال قبل بہاولپور میں سیرۃ النبی کا جلسہ اعلیٰ پیمانہ پر ہوا، اس جلسہ میں آن کا ساتھ رہا. ایک ہی جگہ قیام کیا:
فقہ شافعی کے پیرو تھے مگر کبھو کوئی اختلافی گفتگو آن کی زبان سے سننے میں نہیں آئی. احناف کی امامت میں کسی کراہت کے
یر نماز پڑھتے :

"مذاہب عالم" ــــ "اسلام" افریقہ ــــ "ایشیا میں" آن کی یہ بلند پایہ کتابیں خاصی مشہور اور مقبول ہوئیں مذاہب
م کو تو یونیورسٹیوں کے ایم.اے کے نصاب میں داخل کر لیا. تصنیف و تالیف میں محنت کا یہ عالم کہ بچہ پڑھا ہوا ہے اور
م کئے جا رہے ہیں: جسم منحنی، زکام کے دائمی مریض. اس کے سبب ہلکا ہلکا بخار بھی رہتا! انہی امراض اور تنگی معیشت کی حالت میں
ارت حرمین شریفین کی سعادت بھی حاصل کی.

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے غزوات نبوی کو نقشوں کی صورت میں پیش کیا تھا ــــ مگر عبداللہ مسعود کی مرحوم عہد نبوی
. اس کے بعد کی اسلامی تاریخ کو نقشوں میں دکھانا چاہتے تھے اس پر وہ کئی سال سے کام کر رہے تھے اور متعدد نقشے تیار کر چکے
. اب سے سات آٹھ مہینے پہلے مرحوم اور راقم الحروف ایک دعوت میں شریک تھے، وہاں انہوں نے اپنے نقشوں کا ذکر کیا. دعوت
، بعد میں آن کے مکان پر گیا گھنٹہ پون گھنٹہ تک نقشوں کو دکھاتے اور سمجھاتے رہے میں نے بعض مشورے دیے تو فراخدلی
، ساتھ قبول کر لئے، اور فرمایا کہ نقشوں میں آپ کے کہنے کے مطابق اصلاح کر دی جائے گی، فرماتے تھے کہ بیوی کا زیور بیچ کر
ضرورت پڑی تو مکان رہن رکھ کر لندن جاؤں گا کہ یہ نقشے وہاں کے چھاپے خانوں ہی میں خاطر خواہ اہتمام کے ساتھ چھپ
تے ہیں! یہ ایک عظیم الشان علمی، دینی اور تاریخی کارنامہ تھا جس کا سہرا آن کے سر بندھنے والا تھا ــــــــ کہ
ی دوران میں بیمار ہوئے اور چند دن کے بعد اللہ کو پیارے ہو گئے: غفر لہ اللہ تعالیٰ! (آمین)

عیش فیروزپوری مرحوم

اُن کے نام کے ساتھ "علامہ" لکھا جاتا تھا۔ بڑے مشاق، پُرگو اور زود گو شاعر تھے۔ طبیعت میں انکسار کے ساتھ بے نیازی بھی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اپنے پیچھے شاگردوں کی خاصی بڑی تعداد چھوڑی، جن میں سے بعض فارغ التحصیل ہو چکے تھے۔ اُن کے دم سے قدیم اساتذہ کی یاد تازہ تھی۔ مرحوم کی استادانہ حیثیت اپنی جگہ مسلم تھی، بہت سے اہلِ سخن نے اُن سے استفادہ کیا۔

جناب مذاق العیشی نے ملتان سے اپنے اُستاد حضرت عیش فیروزپوری کا کلام عنایت فرمایا ہے جس کا انتخاب درج ذیل کیا جاتا ہے۔

نظارۂ رخِ ساقی کمالِ مستی ہے — شراب مینہ کی طرح عیش پر برستی ہے

بشکل دیدۂ حیراں ہے دامنِ یوسف — مجالِ عشق! یہ تیری دراز دستی ہے

حق اس کی لودتی کا اے دوست ہے جہاں تک — یہ زندگی وہیں تک وابستۂ سفر ہے

دیکھے میں آپ آئیں، آئیں ضرور آئیں — بیمار جاں بلب ہے مشکل میں چارہ گر ہے

نظر سے جلوۂ رنگینِ یار گزرا ہے — مرے قریب سے عہدِ بہار گزرا ہے

اسی کو ڈھونڈنے اک دن قیامت آئے گی — گزار کر جو شبِ انتظار گزرا ہے

تبسم سے دیا میں نے جواب اُس کے تبسم کا — خود اپنے ہاتھ سے تہ کر کے غم کی داستاں رکھ دی

(رباعی)

مدہوش انہی باتوں سے ہو جاؤں گا — تم سامنے بیٹھے ہو میں کھو جاؤں گا

افسانہ سناؤ نہ شبِ وصل مجھے — برسوں کا ہوں جاگا ہوا سو جاؤں گا

نصرت قریشی مرحوم

جناب نصرت قریشی نے تحریکِ پاکستان میں ایک پُرجوش عملی کارکن کی حیثیت سے حصہ لیا۔ پاکستان آنے کے بعد بھی انہوں نے سماجی خدمات انجام دیں۔ شعر و ادب اُن کا اوڑھنا بچھونا تھے، اسی ایک شعر سے اُن کی فنکارانہ صلاحیتوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ فرماتے ہیں:

میں نے اُسی مقصدِ تخلیق سمجھ کر
جو عمر ملی تھی وہ محبت میں بسر کی

نو آموز شاعروں کو انہوں نے آگے بڑھایا اور پوری زندگی اُردو زبان و ادب کی خدمت، ترقی اور ترویج میں صرف کر دی!

ت تر بشی کی شاعری میں مقصدیت اور دینی غیرت بھی پائی جاتی ہے۔
جناب انوار قمر چشتی نے مرحوم کے حالات اور اُن کا کلام بھیجا ہے جس کے انتخاب سے قارئین فاران یقیناً محظوظ ہوں گے۔

کچھ سعیٔ جستجو بھی تو کر منکر خدا ۔۔۔ آ جائے گی یقین کی منزل گماں کے بعد

خدا خود بھی نصرت جسے چاہتا ہے ۔۔۔ میں اُس کو خدا کی قسم چاہتا ہوں

بلند فکر و نظر مل گئے تو کیا حاصل ۔۔۔ مزہ تو جب ہے کہ سوزِ دروں میسر ہو
نفی سے اور بڑھے گی تری پریشانی ۔۔۔ خدا کو مان کہ دل کو سکوں میسر ہو

جب مجھے بے خودی سی رہتی ہے ۔۔۔ دل کو کیا کیا خوشی سی رہتی ہے
اور کچھ ہو نہ ہو محبت سے ۔۔۔ دل میں اک روشنی سی رہتی ہے
حکایت گل و شبنم ہے یوں پسند مجھے ۔۔۔ یہ حرف حرف مری داستاں سے ملتی ہے

قطعہ

حالی کے خیالوں کا سہارا اُردو ۔۔۔ اقبال کے اقبال کا تارا اُردو
تہذیب و تمدن کا بدلنا معلوم ۔۔۔ تہذیب و تمدن ہے ہمارا اُردو

حضرت شفا گوالیاری مرحوم

محمد علی صاحب صدیقی (لیاقت آباد، کراچی) نے اپنے خط میں لکھا ہے :-
"انتہائی افسوس کے ساتھ یہ اطلاع ہم پہونچائی جا رہی ہے کہ بھوپال میں حضرت شفا گوالیاری ۲۲ر جولائی ۶۸ء کو رحلت فرما گئے۔

مرحوم کو آپ سے دلی تعلق تھا، وہ آپ کا بے حد احترام فرمایا کرتے تھے، ان سے وہ تمام تبصرے پڑھے ہیں جو آپ وقتاً فوقتاً اُن کے کلام پہ فرماتے رہے ہیں ....."

جس دن یہ مکتوب غم ملا ہے اُسی دن انجمن ترقی اُردو ہند کے ہفتہ وار اخبار "ہماری زبان" میں شفا گوالیاری مرحوم کے انتقال پُر ملال کی خبر پڑھی!

مرحوم حضرت سیماب اکبرآبادی کے فارغ الاصلاح تلامذہ میں تھے اور اب خود استادی کے منصب پر فائز تھے، اُن کے کلام کے چار مجموعے (آیات شفا، شاخ زیتون، نبض حیات اور رحیم اُردو) شائع ہو چکے ہیں، پانچواں مجموعہ "زخم گل" مرتب ہو چکا ہے مگر طبع نہیں ہو سکا۔

دو ڈھائی سال ہوئے سلطان پور کے رسالہ "شمع ادب" نے "شفا نمبر" خاصے اہتمام سے شائع کیا تھا، شفا مرحوم تحت لفظ پڑھتے تھے مگر شاعروں میں رنگ جما دیتے، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

جناب سید بضاعت احمد تمیز ٹونکی

راجستھان کے ممتاز شاعر ہیں، مدت سے علیل ہیں اور صاحبِ فراش ہیں زمانہ کے حالات نے سازگاری نہیں کی، اس لئے شعر و ادب کی دنیا میں شہرت نہیں پائی۔ تمیز صاحب کا دیوان خمس اور مرتب ہو چکا ہے مگر اس کی طباعت کی نوبت نہ آسکی۔ فرمانروایان ریاست ٹونک کے درباروں سے انہیں خطابات سے بھی نوازا گیا ہے، صاحبِ موصوف نے اپنا انتخاب کلام عنایت فرمایا ہے۔ اسی انتخاب کے منتخب اشعار یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

ہے دیر و حرم سے جدا میری منزل — وہاں میں نہیں ہوں جہاں اور بھی ہیں

ایک وحشت ہے مری وارفتگی جب تو نہ ہو — اک جنونِ عشق ہے دیوانگی تیرے بغیر

زندگی جس سے عبارت ہے وہ تیرے ساتھ ہے — اور مفہومِ اجل ہے زندگی تیرے بغیر

کوچۂ یار کی جانب میں اشارہ کردوں — میری مرضی کی جو پوچھے کوئی جنت مجھ سے

یہ جو تمیز میاں بیٹھے ہیں تائب ہو کر — کل ملے تھے درِ میخانہ پہ حضرت مجھ سے

اُن منزلوں کا منزلِ الفت سے واسطہ — جن منزلوں میں تیرا قدم درمیاں نہیں

تمیز آپ سے نہ بھی تو یہ چار دن

پھر میکدے میں آنکھ بچا کر چلے گئے

کہاں وہ محفلِ عشرت یہ غم خانہ کہاں لیکن — خیالِ یار تیری بزم آرائی نہیں جاتی

نہ ملنا بھی قیامت تیرا ملنا بھی قیامت تر — محبت میں قیامت کونسی شامل نہیں ہوتی

بظاہر مدعا دیوانہ کا کچھ بھی نہیں ہوتا — مگر دیوانگی بے مدعائے دل نہیں ہوتی

طلب کی خامیوں کا نام منزل رکھ دیا کس نے — اگر شوقِ طلب ہو تو کوئی منزل نہیں ہوتی

یہ نقشہ انقلابِ دہر کی آنکھوں نے دیکھا ہے — جو بنتے ہیں کسی پر وہ اڑاتے ہیں ہنسی اپنی

تمیز ہم کو زمانہ کی شکایت ہے تو بے جا ہے — حقیقت میں زمانہ ساز کب تھی زندگی اپنی

بس ترکِ تعلق زندگی ہے موت سے بدتر — ستم بھی یاد ہوتا ہے کرم بھی یاد ہوتا ہے

قیامت رونما ہونے ہی پہ شاید سکوں ہوگا — ابھی تکمیلِ دنیا میں خرابی کی ضرورت ہے

ہماری نظر میں

تفسیر آیاتِ قرآنی

از:- حضرت مولانا عبدالشکور لکھنوی، ضخامت ۲۴۴ صفحات (مجلد، گردپوش کے ساتھ) قیمت چھ روپیہ پچاس پیسے (علاوہ محصول ڈاک)

ملنے کا پتہ:- محمود الحسن نور محمد تاجران کتب ۲۰۷ ہی شاہ عالم روڈ، مارکیٹ لاہور

حضرت مولانا عبدالشکور لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ کا نام اور کام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے آپ نے ساری زندگی اُن نفوس قدسیہ (صحابہ کرامؓ) کی مدافعت اور تعریف میں گزار دی، جو وحی الٰہی کے مخاطبین اولین ہیں اور جن کی دینی خدمات آفتاب کی طرح روشن ہیں۔ اس کتاب میں مولانا موصوف نے مہاجرین و انصار کے فضائل و مناقب تشریح و تحقیق کے ساتھ بیان کئے ہیں اور کتاب و سنت سے یہ بات ثابت کی ہے کہ خلفاء ثلاثہ کی خلافت منہاج النبوۃ پر قائم تھی۔

اس کتاب میں خود حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ اور بعض دوسرے ائمہ اہل بیت کے اقوال سے اس کا ثبوت دیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر اور حضرت عثمان (رضی اللہ عنہم) اللہ کے دین کی حدود کے محافظت کرنے والے تھے۔

علامہ ابن میثم بحرانی شرح نہج البلاغہ میں اس شبہ کے جواب میں کہ جناب امیر علیہ السلام نے حضرت معاویہؓ سے تو جنگ کی، لیکن خلفاء ثلاثہ سے کیوں نہ کی، لکھتے ہیں۔

ان الفرق بین الخلفاء الثلٰثة وبین معاویة	بہ تحقیق خلفائے ثلاثہ اور امیر معاویہ کے درمیان
فی اقامة حدود اللّٰہ والعمل بمقتضیٰ	اللہ کی حدوں کے قائم رکھنے اور اوامر و نواہی
اوامرہ ونواھیہ ظاھرٌ	شریعت کے مطابق عمل کرنے میں جو فرق تھا ظاہر
	ہے۔

قل لا اسئلکم علیہ اجرًا الا المودة فی القربیٰ ——— پر فاضل مصنف نے تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ یہ بات شانِ نبوت کے منافی ہے کہ وہ دین کی تبلیغ پر کسی سے اجر چاہے اور یوں کہے کہ تم میرے قرابت داروں کے ساتھ مودّت کا سلوک کرنا: قرابت داروں کے ساتھ سلوک ——— تو خود "اجر" کی ایک صورت ہے! اس آیت کا مفہوم یہ ہے ——— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی وحی کی بنا پر کفار قریش سے کہہ رہے ہیں کہ تم جو میرے ساتھ

ظالمانہ سلوک کر رہے ہو کیا تمہیں قرابت اور رشتہ داری کا بھی خیال نہیں آتا، کیا عزیزوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا جاتا ہے؟ یہ آیت تب کی ہے، جب تک حضرت سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے نکاح بھی ہوا تھا۔

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور کتاب "منہاج السنہ" کا جو متن اُردو ترجمہ کے ساتھ دیا گیا ہے اس سے آیت کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

آیت امامت ——— آیت تقسیم خمس ——— آیت ولایت ——— آیت رضوان ——— آیت مباہلہ ——— آیت . . . . . کی اس کتاب میں عام فہم اور دل نشین انداز میں تشریح کی گئی ہے اور ہر مسئلہ کو خوب منقح کیا گیا ہے، یہ کہ صحابہ کرام اور خاص طور سے خلفاء ثلاثہ کی عظمت اور دینی خدمات پر دلیل ساطع اور برہان قاطع ہے، حضور کے صحابہ کی محبت اسلام اور ایمان کا تقاضا ہے (رضی اللہ عنہم اور رضوا عنہ)

اسلامی تعلیم حصہ اوّل و دوم

مرتبہ :- مولانا مجیب اللہ ندوی، حصہ اول کی ضخامت ۴۸ صفحات قیمت د، حصہ دوم کا حجم ۵۶ صفحات، قیمت ۷۵ پیسے

ملنے کا پتہ :- جامعۃ الرشاد، رشاد نگر، اعظم گڑھ (یو۔ پی۔ انڈیا)

بچوں کی دینی تعلیم کے لئے یہ مفید سلسلہ مرتب کیا گیا ہے، حصہ اول کا پہلا سبق "اللہ" اور دوسرا سبق "رسول" ہے بعد کے اسباق میں نماز کی مفصل ترکیب بتائی گئی ہے، نماز دین کا ستون ہے اور کفر و اسلام کے درمیان حد فاصل اور وجہ امتیاز ہے، بچوں کو شروع ہی سے نماز کا شوق دلانا ضروری ہے۔ حصہ دوم کے اسباق حسب ذیل ہیں :-

ایمان مفصل ——— اللہ پر ایمان لانے کا مطلب ——— فرشتے ——— اللہ کی کتابیں ——— اللہ کے رسول ——— آخرت ——— قیامت کا دن ——— دوبارہ اٹھایا جانا ——— جنت ——— دوزخ ——— تقدیر طہارت و نجاست ——— اور پھر وضو، تیمم، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے مسائل!

مسلمان بچوں کے لئے دینی تعلیم کا یہ سلسلہ ہر لحاظ سے مفید ہے جو بچہ ان اسباق کو سمجھ کر پڑھ لے گا اس کے دل و دماغ میں دین رچ جائے گا!

آج کل دسترخوان کے علاوہ میز کرسی پر اور کھڑے ہو کر کھانے کا بھی رواج ہو گیا ہے، جو مباح ہے ——— اس لئے کھانا کھانے کے ان طریقوں کی طرف کچھ نہ کچھ اشارہ ہونا چاہئے!

افادات فاضلیہ جلد اول

مکالمات حضرت فضل شاہ صاحب

مرتب :- علامہ ارشد، حافظ ضیاء الاسلام، نگران۔ ابو مسلم صحافی۔ ضخامت ۱۷۶ صفحہ (مجلد، پلاسٹک کور) قیمت چار روپے

ملنے کا پتہ :- ادبستان، لاہور

جناب فضل شاہ صاحب سلسلہ طریقت کے شیخ ہیں اور صاحب نسبت بزرگ ہیں، شاہ صاحب موصوف کے اقوال و ارشادات اس کتاب میں جمع کئے گئے ہیں، ان میں مریدین اور معتقدین کے کچھ تجربے اور مشاہدے بھی قید تحریر میں آگئے ہیں۔

کوئی شک نہیں ان مکالمات میں بڑی حکمت اور دین و دانش کی باتیں بیان کی گئی ہیں اور بعض نازک مسائل کی گرہیں کھولی گئی ہیں، جن کے مطالعہ سے قلب انشراح محسوس کرتا ہے اور دل و دماغ پہ وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

صاحب مکالمات کے نام کے ساتھ یہ القاب ــــ تقدس مآب، سلطان الحقیقت، شیخ الامت اعلیحضرت ــــ لکھے گئے ہیں! "اعلیحضرت" مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے نام کے ساتھ اُن کے مریدین اور معتقدین لکھا کرتے ہیں، مولانا بریلوی کے بعد یہ دوسرے "اعلیحضرت" ہیں، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے نبیوں اور رسولوں کے ناموں کے ساتھ صرف "حضرت" لکھا جاتا ہے۔ کتاب میں جہاں کہیں بھی "صاحب مکالمات" کا ذکر آیا ہے اُس میں نام کی بجائے "تقدس مآب" اور "سلطان الحقیقت" لکھا گیا ہے، حالانکہ کتابوں میں صحابہ کرام اور تابعین عظام کا نام مفسرین، محدثین اور علماء بلا تکلف لکھتے ہیں اور بزرگوں کے نام لینے اور لکھنے کو ادب کے منافی نہیں سمجھتے۔

"سب سے پہلے جدّ انبیاء حضرت ابراہیم کو ایصال ثواب کے لئے دوگانہ ادا کیا جاتا ہے" (ص ۳۵)

کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام تہجد کی نماز سے قبل دو رکعتیں پڑھ کر، سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی روح کو ایصال ثواب فرمایا کرتے تھے؟

"اس سے فارغ ہو کر اسمائے غوث الاعظم اور درود تاج ورد کیا جاتا ہے" (ص ۳۵)

اللہ تعالیٰ کے اسماء کی بجائے اسماء غوث الاعظم کا ورد کیوں؟ ذکر و ورد کے قابل تو اللہ تعالیٰ ہی کے اسماء حسنہ ہیں۔

درود تاج اب سے اسّی نوے سال پہلے کسی ہندوستانی مسلمان نے لکھا تھا، جو عوام میں خاصہ مقبول ہو گیا مگر خواص اُن کلمات درود کا ورد کرتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں! درود تاج میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کے بارے میں لکھا ہے "جبرئیل خادمہٗ" حالانکہ قرآن کریم حضرت جبرئیل علیہ السلام کی یہ شان بتاتا ہے۔

"علّمہ شدید القویٰ"

صفحہ ۴۱ پر لکھا ہے۔

"رات دن کے چوبیس گھنٹے میں آپ پر ایسا وقت بھی آتا ہے، جب آپ پر "لی مع اللّٰہ وقت" کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

اول تو "لی مع اللّٰہ وقت . . " والی روایت ہی محل نظر ہے، صوفیہ البتہ اپنی کتابوں میں اس قول کا تذکرہ کرتے ہیں، دوسرے یہ حدیث اگر صحیح ہے تو "صاحب مکالمات" (حضرت فضل شاہ صاحب) پر اس خاص کیفیت کا طاری ہو جانا، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص ہے، قلب مومن میں جو حضورؐ کی عظمت و محبت سے معمور ہونا چاہئے، خاصی کھٹک پیدا کرتا ہے۔

"باصفت کی صفت کو جو پالیتا ہے، وہ جس کی وہ صفت ہے وہ دونوں ایک جگہ پائے جاتے ہیں، خواہ ان دونوں کے درمیان زمانہ اور فاصلہ کتنا ہی بعد کیوں نہ ہو، علاوہ ازیں صفت پانے والا جس وقت کسی صفت میں حلول کر جاتا ہے تو وہ مجسمہ وہی بن جاتا ہے جس کی وہ صفت ہوتی ہے (ص ۸۵)

فن تصوف کی یہ وہ زبان اور انداز بیان ہے جس نے "حلول و اتحاد" کے مزلات میں لوگوں کو مبتلا کیا ہے۔ اس قسم کی نکتہ سنجیوں سے

اجتناب کرنا چاہیے! اس میں بڑے خطرے ہیں۔

"اللہ والے، اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوتے ہیں؛ اس لئے موت ان پر اثر انداز نہیں ہوتی۔" (ص ۱۰۱)

یہ بات بداہتہً، تجربہ اور مشاہدہ کے بھی خلاف ہے! قرآن کریم میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک سے "موت" کی نسبت کی گئی ہے:
اولیاء اللہ پر کسی اشتباہ کے بغیر موت واقع ہوتی ہے اور ان کے جنازوں کو قبروں میں دفنایا جاتا ہے (رحمہم اللہ تعالیٰ)

"پس بزرگانِ دین کو ماننا قرآن کو ماننا ہے، ان کا قول سننا قرآن پاک کو سننا ہے"

بزرگوں کے اقوال کو قرآن پاک کے ہم مثل ٹھیرانا، یہ وہ غلوِ عقیدت ہے جس سے شریعت نے روکا ہے۔

بڑھے جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
نہ ہوں جو مشکلیں تو زندگی دشوار ہو جائے (ص ۱۰۶)

یہ اصغر گونڈوی کا شعر ہے جس کی صحیح صورت یہ ہے۔

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

مثنوی مولانا روم کے اس شعر میں ———

چیست دنیا از خدا غافل بدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

"قماش" کی جگہ "قمایش" کتابت ہو گیا۔

دین یہ ہے کہ اللہ اور رسول کی محبت پر کسی کی عقیدت غالب نہ آنی چاہیے، بزرگانِ دین بھی دین کے مبلغ اور خدمت گزار ہیں خود ان کی ذات عینِ دین اور اصلِ دین نہیں ہے اور معیارِ حق تو صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔ بزرگوں سے بہ تقاضائے بشریت غلطیاں بھی سرزد ہوتی ہیں کہ عصمت انبیاء کی صفت ہے! دین میں "فرقِ مراتب" کا لحاظ ضروری ہے پیروں اور بزرگوں کے غلوِ عقیدت نے مسلمانوں میں عقیدہ و عمل کی خرابیاں پیدا کی ہیں۔

مکاتیب احمد سعید

مرتبہ:- سید نصیر حسین دہلوی، ضخامت ۲۰۲ صفحات (مجلد گرد پوش کے ساتھ) قیمت ۲ روپے ۰۰ پیسے
ملنے کا پتہ:- دینی بک ڈپو، اردو بازار، جامع مسجد دہلی

مولانا احمد سعید دہلوی مرحوم کی شخصیت اور جمعیۃ علماء ہند کا نام "چولی دامن" کی طرح لازم و ملزوم رہا ہے، مولانا احمد سعید کا شمار ان علماء میں ہوتا ہے جو ہندوستان کی تحریک آزادی کی روح رواں تھے، مولانا مرحوم نے حق گوئی کے جرم میں قید و بند کی مصیبتیں بھی جھیلی ہیں، اب سے چالیس سال پہلے مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا آزاد سبحانی، مولانا عبدالماجد بدایونی اور مولانا احمد (اور شیعوں میں مولانا سبط حسن) صفِ اول کے مقرر مانے جاتے تھے، خاص طور سے مولانا احمد سعید کے مواعظ میں دلی کی ٹکسالی زبان کا چٹخارہ ہوتا تھا۔

مولانا احمد سعید دہلوی کے نام کے ساتھ بعض اخباروں، رسالوں اور اشتہاروں میں "سحبان الہند" بھی لکھا جاتا تھا، انہوں نے

کی کتابیں بھی لکھی تھیں ، ظرافت ، بذلہ سنجی اور خوش طبعی نے اُن کی شخصیت کو باغ و بہار بنا دیا تھا ۔

جناب سید ضمیر حسن دہلوی نے مولانا مرحوم کے مکاتیب کو کتابی شکل میں جمع کر دیا ہے اور اس کتاب پر خاصہ دلچسپ اور زبان و ادب کے اعتبار سے دلکش مقدمہ تحریر فرمایا ہے جو صاحب مکاتیب کی شخصیت سے متعلق ہے کتاب کے آغاز میں مولانا احمد سعید مرحوم کا عکس تحریر ہے ، مولانا مرحوم ، حضرت مفتی کفایت اللہ رحمتہ اللہ علیہ کی طرح خوش قلم نہیں تھے ، پھر بھی اُن کے خط میں پختگی پائی جاتی ہے ، مولانا مرحوم کی "شبیہ" اگر اس کتاب میں نہ ہوتی تو اچھا تھا ۔

زیادہ تر خطوط ملا واحدی کے نام ہیں ، جو مولانا کے ہم محلہ بھی رہے ہیں ، ہم عمر بھی اور بے تکلف دوست بھی ! مولانا کو اس کا پتہ ہوتا کہ ان کے نجی خطوط کتابی صورت میں چھاپ دئے جائیں گے ، تو وہ غزالی صاحب کا ذکر اس انداز میں کا ہے کو کرتے ـــــ

"یہاں غزالی تو آپ بھی بچپنے سے جانتے ہیں ، وہ وعدہ خلافی کا عادی ہے ، یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی کسی کام کو کر نہیں رہا ـ قدرتی طور پر وہ جس حسن و صورت کا مالک بنایا گیا تھا ، اگر اس میں حسن سیرت[1] بھی ہوتی تو سبحان اللہ وہ فرشتہ ہوتا

[illegible]

.. غزالی اپنی عادت نہیں بدل سکتا ، اور یہی چیز اس کی ترقی میں مانع ہے ، کیونکہ وہ ابتدائی دور میں اس عادت کی بنا پر لوگوں کی بد دعائیں سمیٹتا رہا ہے ان ہی بد دعاؤں کا اثر ہے کہ وہ پریشان رہتا ہے ، ، ، ، ، ،"

کسی شاعر نے بڑے پتہ کی بات کہی ـــــ

وہ کون تھا جو خرابات میں خراب نہ تھا
ہم آج پیر ہوئے کیا کبھی شباب نہ تھا

مولانا احمد سعید دہلوی مرحوم کے خطوط میں زبان و بیان کی سادگی اور روانی ملتی ہے ۔ دو تین اقتباسات [illegible] ـــ

- ـــــ " انجکشن لگ رہے ہیں ، اول تو حکیم بہت کم ہیں پھر لوگوں پر ڈاکٹروں کا اثر بہت ہے چوری چھپے اس کسی حکیم کی چٹکی پھانک لیتا ہوں ، ، ، ، ، "
- ـــــ " لوگ نکاح پڑھانے کے لئے پکڑ کر لے جاتے ہیں اب اسی کام کا رہ گیا ہوں ، ، غمی والے جنازے کی نماز پڑھانے کے لئے گھسیٹتے ہیں ، مجھے اپنی خبر نہیں میرے جنازے کی نماز کون پڑھائے گا ؟"
- ـــــ " آپ کی دعاؤں کی برکت سے زندہ ہوں ، بڑھاپے میں نئی نئی تکلیفیں پیدا ہوتی رہتی ہیں ، چھوٹی موٹی کا درخت ہوں ، دور سے ہرا بھرا معلوم ہوتا ہوں ، ہاتھ لگاؤ تو بیکار ہوں ، ، ، ، ، ، "

---

[1] یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے ۔ "حسن سیرت" تو مذکر ہے ، ہاں "سیرت" مونث ہے ۔

مولانا نے "جوشاندہ" کو "جشاندہ" لکھا ہے، یعنی "املا" دلی والوں کے عام تلفظ اور لہجہ کے مطابق!

فاضل مرتب نے صفحہ ۱۰ پر دلی والوں کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے اُن کی "مہمان نوازی" کو بھی سراہا ہے حالانکہ دلی والے "مہمان نوازی" میں کوئی خاص شہرت نہیں رکھتے!

"مکاتیب احمد سعید" کو شبلی اور اکبر کے خطوط کے مقابلہ میں بھی نہیں رکھا جا سکتا، مگر یہ دلچسپ ضرور ہیں، اور گزشتہ دلی کی سیاست و معاشرت کے بعض گوشوں پر بھی ان سے روشنی پڑتی ہے۔

ربانی حکومت یا انسانی حکومت

از:- ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی۔

ضخامت ۸۰ صفحات۔

ملنے کا پتہ:- امامیہ مشن پاکستان ٹرسٹ لاہور (پوسٹ بکس ۱۸۵۴)

کتاب کا آغاز اس عبارت سے ہوتا ہے۔

"پیغمبر اسلام کی آنکھ بند ہوتے ہی، مسلمان دو مکاتبِ فکر میں تقسیم ہو گئے ایک "طبقہ الٰہی حاکمیت کا مدعی تھا اور" دوسرا انسانی حاکمیت" کا علمبردار! الٰہی حاکمیت کے علمبرداروں کی قیادت آل رسولؐ کے ہاتھوں میں تھی اور انسانی حاکمیت کے مدعی ان کے مخالف تھے" (ص ۴)

یہ خیالِ فکر اور واقعہ سو فیصدی غلط ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مسلمان دو "مکاتبِ فکر" میں تقسیم ہو گئے تھے: خلفاءِ ثلاثہ کو "انسانی حاکمیت" کا علمبردار کہنا یہ فکر بھی صحیح اور مطابق واقعہ نہیں ہے، ایسی باتیں وہ لوگ کرتے ہیں جو یہ غلط اور فاسد عقیدہ رکھتے ہیں کہ رحلت نبویؐ کے بعد چند صحابہ کے علاوہ تمام صحابی (معاذ اللہ) مرتد ہو گئے تھے فساد کی جڑ یہی عقیدہ ہے جو آگے چل کر اور زیادہ شاخ در شاخ ہوتا چلا گیا اور اس کے برگ و بار بڑے ہی کڑوے کسیلے ثابت ہوئے۔

ڈاکٹر صاحب موصوف نے آگے چل کر خود اقرار کیا ہے:-

"کلمۂ لا الٰہ الّا اللہ سے نہ صرف یہ کہ بتوں کی خدائی ختم کر ڈالی گئی بلکہ قیصر و کسریٰ کے تخت بھی الٹ دئے گئے" (ص ۷)

قیصر و کسریٰ کے تخت لا الٰہ الا اللہ کے زور سے کس نے اُلٹے تھے؟ انہی نفوسِ قدسیہ نے جن کو فاضل مصنف نے "انسانی حاکمیت کا علمبردار" کہا ہے!

"سقیفہ بنی ساعدہ میں عرب زعماء کا ایک اجتماع ہوا تا کہ الٰہی حاکمیت کے مقابلہ میں دوبارہ انسانی حاکمیت کے اصول کو نافذ کیا جائے" (ص ۱۰)

بنی سقیفہ کا یہ اجتماع انسانی حاکمیت نہیں، حکومتِ الٰہیہ کے نفاذ کے لئے ہوا تھا اور دنیا نے دیکھ لیا کہ خلفائے راشدین نے کس بے نفسی اور للّٰہیت کے ساتھ اقامتِ دین کا فرض انجام دیا۔ ان سے بہتر حاکم دنیا نے پھر پیدا نہیں کئے۔ حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ نے اس انتخاب امارت و خلافت کی تحسین کی ہے، فرماتے ہیں۔

ووتقسم ان فاقام و استقام حتیٰ	اور حاکم ہوا مسلمانوں پر ایک حاکم اس نے دین کو
ضرب الدین بجرانہ ۔	قائم کیا اور ٹھیک۔ یہاں تک کہ دین نے اپنا سینہ
(نہج البلاغہ ۔ دوم ۔ ص ۲۵۳)	زمین پر رکھ دیا۔

اونٹ جب آرام دہت کے عالم میں ہوتا ہے تو ایسی حالت میں اپنا سینہ زمین پر رکھ دیتا ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی اس تشبیہ کا یہ مطلب ہے کہ اس حاکم کے دور حکومت میں دین کو قوت اور اطمینان و آسودگی حاصل ہوئی تو آہ مگر "سے حضرت عمر فاروق

"سقیفہ بنی ساعدہ میں "خلافت" کو جو دین کے ستون کی حیثیت رکھتی تھی، جمہور کے منشاء و مرضی پر چھوڑ دیا گیا" (ص ۱۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر نبوت ختم ہوگئی، کیونکہ اللہ کا دین ہر اعتبار سے مکمل ہو چکا تھا۔ عصمت جو نبوت کی خاصیت ہے وہ بھی حضور کے بعد کسی کو حاصل نہیں ہو سکتی اور "وحی نبوت" بھی آنا بند ہوگئی۔ اس لئے حضور کے بعد آپ کا جانشین (خلیفہ رسول اللہ) نبی کی طرح اللہ تعالیٰ کی جانب سے مقرر نہیں ہو سکتا تھا اس کا فیصلہ انتخاب ہی کے ذریعہ ہونا چاہئے تھا اور ایسا ہوا۔

". . . . یہ ایک بنیادی غلطی تھی، جو سقیفہ میں کی گئی اور بعد میں مسلمانوں کی خلافت کے سلسلہ میں جو تلخ حالات کا سامنا کرنا پڑا ان کی ذمہ داری تمام انہیں حضرات پر ہے جنہوں نے سقیفہ بنی ساعدہ میں جمہوریت کی جو نمائش کی، اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ کی حکومت کے مقابلہ میں انسانی حکومت کا اصول مسلمانوں نے تسلیم کر لیا۔" (ص ۱۲)

سقیفہ میں "خلیفہ" کا انتخاب کوئی "غلطی" نہ تھی، غلطی اور کجی خود مصنف کے ذہن و فکر میں ہے اس لئے انہیں ایک نیک کام اور صحیح بات میں غلطی نظر آتی ہے! اللہ تعالیٰ مالک الملک ہے، زمین و آسمان کا خالق اور کائنات کا حاکم و مالک ہے اس کے حکم کے بغیر ایک پتہ اور ذرہ بھی نہیں ہل سکتا، مگر وہ خود تو حاکم، فرمانروا اور خلیفہ بن کر دنیا کے سامنے نہیں آتا، انسان ہی دنیا میں حکومت کے فرائض انجام دیتے ہیں، "حکومت الہیہ" کے حاکم کو اللہ تعالیٰ نبی اور رسول کی طرح مبعوث نہیں فرماتا، ان حاکموں کو عوام مسلمان منتخب کرتے ہیں اور یہ ارباب حکومت دین و شریعت کے مطابق جس حکومت کو چلاتے ہیں وہی "حکومت الہیہ" کہلاتی ہے، خلفاء ثلاثہ کی خلافت "حکومت الہیہ" ہی تھی ان کے عہد حکومت میں تمام امور دین کے تقاضوں کے مطابق انجام پاتے تھے، کسی خلیفہ نے اپنے بیٹے یا بھائی کو جانشین مقرر نہیں کیا، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی نامزدگی میں اجلّ صحابہ اور شیوخ قبائل کا مشورہ شریک تھا!

"حضرت علی علیہ السلام نے قبول خلافت کے بعد، حکومت الہیہ کے وہ قوانین و اصول نافذ کرنا شروع کئے جو غلامی کو ختم کرنے اور انسانی آزادی کو بحال کرنے کے لئے قرآن نے پیش کئے تھے" (ص ۱۷)

یہ بحث انتہائی نازک اور اہم ہے اس لئے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے نافذ کردہ دو چار اصول و قوانین ثبوت میں پیش کرنے تھے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جاتا کہ فلاں فلاں قانون "حکومت الہیہ" کی ممتاز خصوصیت ہے، ایسے مواقع پر "مثالوں" سے گریز اس امر

کی شہادت دیتی ہے کہ کہنے والا صرف لفظوں کی شیشہ گری سے کام لے رہا ہے اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے دورِ خلافت میں خلفاء ثلاثہ اور خاص طور سے شیخینؓ کے قوانین واحکام پر کوئی اضافہ نہیں کیا، نہ اس کا اعلان فرمایا کہ "ربانی حکومت" تو اب قائم ہوئی ہے اس سے پہلے تو "انسانوں کی حکومت" تھی۔

نہج البلاغہ میں حضرت علیؓ کا ایک خط امیر معاویہؓ کے نام ہے اس خط میں آپ لکھتے ہیں:۔

انہ بایعنی القوم الذین بایعوا ابابکر وعمر وعثمان علی ما بایعوھم علیہ فلم یکن للشاھد ان یختار ولا للغائب ان یرد وانما الشوریٰ للمھاجرین والانصار فان اجتمعوا علیٰ رجل وسموہ اماماً کان ذلک للہ رضی . . . .

بہ تحقیق مجھ سے بیعت کی ہے ان لوگوں نے جنہوں نے بیعت کی تھی ابوبکر اور عمر اور عثمانؓ سے انہیں شرائط پر جن شرائط کے ساتھ ان سے کی تھی بندا ب حاضر کو اختیار حاصل ہے کہ کسی اور کو پسند کرے اور نہ غائب کو یہ ہے کہ مخالفت کرے خلافت کے مشورہ کا حق مہاجرین اور انصار کو ہے وہ اگر کسی شخص پر متفق ہو جائیں اور ان کو امام کہہ دیں، تو وہ اللہ کا پسندیدہ امام ہے

(نہج البلاغہ)

حضرت علیؓ کے مکتوب گرامی کے اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے سقیفہ کے جس انتخاب پر ڈاکٹر ذاکر حسین نے "جمہوریت کی نرکی طنز فرمائی ہے یہ طنز ذرہ برابر کوئی وزن نہیں رکھتی۔ حضرت علیؓ تو اپنی خلافت کے انتخاب کے جواز میں حضرات ابوبکر، عمر، عثمان رضی اللہ عنہم کے انتخاب کی شرائط کو پیش فرما رہے ہیں، اس عبارت سے "امام" کا منصوص ہونا بھی ثابت نہیں ہو

.. رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھیں بند ہوتے ہی جمہوریت کی بنیاد پر خلافت کی نسبت کا جو فیصلہ ہوا تھا کہ خلافتِ الٰہیہ کے حقیقی وارث وامین حضرت علی علیہ السلام نے اس لئے تسلیم نہیں کیا کہ آپ یہ جانتے تھے کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں جو بنیادیں ڈالی گئی ہیں، ان پر تعمیر ہونے والی عمارت کمزور اور کج ہوگی۔ . . . . . .

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی دور بین نگاہیں یہ دیکھ رہی تھیں کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں خلافت کے متعلق جو فیصلہ کیا گیا ہے اس کے دور رس اثرات کیا ہونے والے ہیں، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ آپ نے حضرت ابوبکر کی بیعت نہیں کی آپ کے گلے میں رسی باندھی گئی، مکان پر لکڑیاں جمع کی گئیں آپ کی زوجہ حضرت صدیقہ طاہرہ کے پہلوئے انور پر دروازہ گرا دیا گیا (ص ۳۸ - ۳۹ - ۴۰)

زیر تنقید کتاب کے ان اقتباسات میں صریحی طور پر غلط بیانیوں سے کام لیا گیا ہے، خلافتِ الٰہیہ کا کوئی مخصوص شخص اللہ اور رسول کی طرف سے وارث اور امین نہ تھا، اگر کسی کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہوتا کہ فلاں صحابی میرا وارث اور جانشین ہوگا۔ تو یہ روایت زیادہ سے زیادہ صحابہ کو معلوم ہونی چاہئے تھی، اس ہدایت اور فرمان و وصیت کے ذکر کرنے اور حوالہ دینے کا بہترین وقت وہ تھا جب حضور کے وصال کے بعد سقیفہ میں "خلافت" کا مسئلہ درپیش تھا، صحابہ کرام

فطرت اور مزاج سے بہت بعید تھی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیئے ہوئے تمام احکام کو حرز جاں بنائے ہوئے تھے انہوں نے جانشینی رسول حدیث کو قصداً بھلا دیا یا چھپا دیا (یا اس کے ماننے سے انکار کر دیا)

حضرت علیؓ کی بیعت حضور پر بار سے ثابت ہے وآپ کے گلے میں رسی باندھنے اور حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اذیت پہنچانے کی روایتیں درست نہیں ہیں

"آپ نے یہ تینوں کام سرانجام دیئے، قرآن جمع کیا، قرآن کے ساتھ تفسیر مدون تحریر فرمائی اور احادیث صحیحہ کا نسخہ مرتب دیا۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ آج ہم ان جواہر پاروں سے محروم ہیں، ورنہ اگر یہ چیزیں باقی رہ جاتیں تو یہ آج اسلام میں جو فرقہ بندیاں نظر آتی ہیں ان کا وجود نہ ہوتا" (ص ۹۸)

جس صحابی نے بھی کوئی مصحف یا قرآن شاد داشت جمع کی تھی اس کے باقی نہ رہنے پر افسوس نہیں کرنا چاہیے بلکہ خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ قرآن کریم "اختلاف الفاظ" سے محفوظ ہو گیا اور قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کی حفاظت کا جو وعدہ فرمایا تھا، اس کے مطابق جو قرآن پایا جاتا ہے وہی اصل قرآن ہے اور قرآن کا محفوظ رہنا اللہ تعالیٰ نے مقدر فرما دیا تھا، کوئی مسلمان "قرآن کریم" کے بارے میں یہ شک نہیں کر سکتا کہ اس میں معاذ اللہ کچھ ترمیم یا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ — : الم ذلک الکتاب لا ریب فیہ : دنیا میں صرف یہی ایک کتاب ہے جو شک ریب اور ظن و تخمین سے پاک ہے!

حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ نے بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں کتابت فرمائی تھیں — مگر یہ کہنا مبالغہ ہے کہ آپ نے احادیث صحیحہ کا کوئی ایسا مجموعہ مرتب کیا تھا جس میں تمام صحیح حدیثیں آگئی تھیں۔

جہاں تک خلافت و ملوکیت کے فرق و امتیاز کا تعلق ہے وہ اپنی جگہ مسلم ہے مگر حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے امیر معاویہؓ سے صلح فرما کر اور وظیفہ قبول کر کے، اس کے لئے سند جواز دے دی کہ بعض حالات میں بادشاہوں سے صلح اور تعاون کیا جا سکتا ہے۔

"دنیائے اسلام میں یہ شرف صرف "فرقہ شیعہ اثنا عشریہ" کو حاصل ہے کہ اس نے کبھی بادشاہوں اور سلاطین کے نام اپنے خطبہ جمعہ میں شامل نہیں کیے" (ص ۷۷)

اس "شرف" کا ہم بھی اقرار کرتے ہیں مگر ابن علقمی نے "مستعصم باللہ" کی حکومت کے ساتھ جو سلوک اور جس کردار کا مظاہرہ کیا، اس قسم کے بھی الیسے اگر جمع کئے جائیں تو یہ "شرف" جس کا دعویٰ کیا گیا ہے واقعات کے اس گرد و غبار میں شاید گم ہو کر رہ جائے گا!

"خلافت راشدہ" جس میں حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کا دور حکومت بھی شامل ہے نہ تو ملوکیت ہے اور نہ انسانی حکومت کا جابلی دور ہے جیسا کہ صفحہ ۔۔ پر مضمون نگار نے لکھا ہے: خلافت راشدہ وہ "معیاری طرز حکومت" ہے جس پر اسلامی تاریخ فخر کرتی ہے اس دور میں اسلام اور مسلمانوں کو جو سربلندی نصیب ہوئی ہے اور خلفائے راشدین نے جس بے نفسی اور للہیت کے ساتھ اسلامی حکومت کو چلایا ہے اس کا اقرار غیر مسلم مورخین تک نے کیا ہے، یہ وہ نفوس قدسیہ ہیں جو ہماری تاریخ کے رخ پر جگمگا رہے ہیں!

"ربانی حکومت یا انسانی حکومت" یہ لاہور کے ماہنامہ "پیام عمل" کے ماہ اگست ۱۹۶۸ء کا ضمیمہ ہے اس ضمیمہ کے مندرجات فکر و نگاہ کی اور بیہ زخیالی کے فساد کا شاہکار ہیں، سوچنے کا بنیادی طرز ہی صحیح نہیں ہے اس عمارت کی پہلی اینٹ ہی چونکہ ٹیڑھی ہے، اس لئے اس پر جو عمارت اٹھائی گئی ہے وہ ٹیڑھی ہوتی چلی گئی ہے! اللہ تعالیٰ ہر شخص کو صحت فکر عطا فرمائے۔

گلشن ہمیشہ بہار

از :- نصر اللہ خاں خویشگی - مرتبہ :- ڈاکٹر اسلم فرخی، ضخامت ۲۸۸ صفحات، قیمت ۷ روپے۔
ملنے کا پتہ :- انجمن ترقی اردو، بابائے اردو روڈ، کراچی

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے مشہور تذکرے "گلشن بے خار" کے جواب میں یہ تذکرہ (گلشن ہمیشہ بہار) نصر اللہ خاں خویشگی (۱۲۹۹ھ) نے لکھا تھا۔ ڈاکٹر اسلم فرخی نے اس تذکرہ کو بڑی محنت و تحقیق کے ساتھ مرتب (داش) کیا ہے اُن کی محنت و تحقیق کا اندازہ صرف اس ایک "گرفت" سے ہو سکتا ہے کہ :-

بھی سمت غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخ نہال غم جسے دل کہیں ہری رہی

یہ سراج اورنگ آبادی کی غزل کا مشہور شعر ہے مگر اُسے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اور نصر اللہ خاں خویشگی دونوں نے سراج الدین علی سے منسوب کیا ہے۔ فاضل مرتب نے ذیلی حاشیہ میں اس غلط نسبت پر گرفت کی ہے۔

شعرائے اردو کا یہ تذکرہ فارسی زبان میں ہے، اشعار کے انتخاب میں نصر اللہ خاں خویشگی نے "گلشن بے خار" کو سامنے رکھا ہے، شعرا کا ذکر ڈیڑھ دو سطروں میں کیا ہے اور صرف ایک شعر بطور نمونہ کلام درج کیا گیا ہے۔ چند منتخب اشعار :-

نگہ وہ دشنہ کہ دشنہ کنارہ مارے — مژہ وہ تیر کہ خنجر کو دو پہرہ مارے (شاہ بہلول الہام لکھنوی)
تم تو بیٹھے ہوئے پہ آفت ہو — اُٹھ کھڑے ہو تو کیا قیامت ہو (شیخ ظہور الدین حاتم)
قیس صحرا میں رہا، کوہ میں فرہاد رہا — میں بگولے کی طرح دشت میں برباد رہا (خلیفہ محمد علی سکندر)
قد کو تیرے جس جگہ مشق خرام ناز ہے — اس جگہ شورِ قیامت فرش پا انداز ہے (مرزا محمد رفیع سودا)
آوارہ و سرگشتہ نہ دیوار نہ در کے — سایہ کی طرح ہم نہ ادھر کے نہ اُدھر کے (فدوی)
ناکہ ہووے گا ترا اور مرا ساماں ہوگا — چاک جب صبح قیامت کا گریباں ہوگا (غلام ضامن کرم)
جس کو تری آنکھوں سے سروکار رہے گا — بالفرض جیا بھی تو وہ بیمار رہے گا (نواب محبت خاں محبت)

بعض غیر معروف اور نیچے درجہ کے شاعروں کے حالات پورے ایک صفحہ میں دئے ہیں اور اُن کے دس دس بلکہ اس سے بھی زیادہ اشعار کا انتخاب درج کیا ہے لیکن حیرت ہے کہ خواجہ حیدر علی آتش لکھنوی کا ذکر صرف تین سطروں میں کیا ہے اور تین شعر منتخب کئے ہیں۔ شعروں کا انتخاب اچھا نہیں ہے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے اچھے شعروں کو چھوڑ کر اس قسم کے شعروں :-

قبر سے اُٹھ کے یہ بے دھیان مگر آیا — وہ تو آتے نہیں میں آپ مگر کیوں کر آیا
نقش تسخیر غیر کو اُس نے — خوں لیا تو مرے کبوتر کا

کا انتخاب تذکرہ نگار کی بے ذوقی کی دلیل ہے۔

"گلشن ہمیشہ بہار" پر ڈاکٹر اسلم فرخی کا مقدمہ خوب نہیں بہت خوب ہے، انجمن ترقی اردو (پاکستان) نے اس کتاب کو اپنی روایات کے مطابق خاصے اہتمام سے شائع کیا ہے۔

نیشنل اور الفرڈ
ILFORD
ILFORD
HP3 FILM
ILFORD
HP3
ROLL FILM
ہمہ وقت
آپ کی
مسرتوں
کے ساتھی!
رضوی برادرز لمیٹڈ
کراچی ——— لاہور ——— ڈھاکہ

ORIENT

KIWI
BLACK
کیوی کینوز
کیوی میٹل پالش (لیکوڈ)
KIWI
چمک اور حفاظت کے لئے
دنیا کی مقبول ترین
کیوی
مصنوعات
کیوی کریم
KIWI
PLATE POWDER
کیوی ویکس
KIWI
WAX
KIWI
Car Polish
کیوی کار پالش

اکتوبر ۱۹۶۸ء

ماہنامہ فاران کراچی

شمارہ: ۵ - - - - - - - - - - جلد: ۱

ایڈیٹر: ——— ماہر القادری

ترتیب

سالانہ چندہ: ۔ ۷ روپے ——— قیمت فی پرچہ ۶۲-۲ پیسے

پبلشر: ۔ ماہر القادری

دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی

باہتمام مستفیض احمد صدیقی پبلشر ماہر القادری نے انٹرنیشنل پریس کراچی میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

پاکستان کے دینی طبقوں نے اس خبر کو انتہائی مسرت کے ساتھ سُنا کہ ادارہ تحقیقات اسلامی کے ناظم جناب ڈاکٹر
الرحمٰن صاحب اپنے عہدے سے مستعفی ہو گئے، اور ان کے استعفیٰ کو کسی تامل کے بغیر ہاتھ کے ہاتھ منظور بھی کر لیا گیا۔
ان کے علماء اور دین پسند عوام کو ڈاکٹر صاحب موصوف کی ذات سے کسی قسم کی کوئی کد نہ تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی متجددانہ روش
زاد خیالی سے انہیں شکوہ تھا، اس آزاد خیالی سے جو تحقیق کے پردے میں دین کی تحریف کا کارنامہ انجام دیتی ہے! صاحب
ف کی علیحدگی کو پاکستان کے دیندار طبقہ نے اس طرح محسوس کیا، جیسے اُن کے سینہ پر ایک بھاری پتھر رکھ دیا گیا تھا۔
کایک ہٹ گیا۔ اور انہیں اس بارِ غم سے نجات مل گئی! بیشک اللہ تعالیٰ حلیم ہے وہ غلط کاروں کو ڈھیل بھی دیتا ہے
ذات بے ہمتا حلیم اور غفور رحیم ہے وہ "شدید العقاب" بھی تو ہے۔

ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب نے "وحی نبوت" کی جو تعریف کی ہے وہ سو فیصدی گمراہ کن ہے۔ اپنے استعفیٰ میں انہوں نے
ہ لغو خیالات سے رجوع نہیں کیا۔ اور معذرت کا ایک لفظ بھی نہیں لکھا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مستشرقین یورپ
عقائد و نظریات کا رنگ اُن کے ذہن و فکر پر پوری طرح چڑھ چکا ہے اور تجدد و آزاد خیالی اُن کے دل و دماغ میں
ہو چکی ہے، علماءِ حق کے کسی مشورے پر کان دھرنے کو وہ تیار نہیں ہیں اور کوئی خیرخواہانہ نصیحت اُن پر کارگر نہیں ہو
مغرب زدہ نظریات اور مادیت پروردہ خیالات کی جس دلدل میں وہ پھنس گئے ہیں اُس سے وہ نکلنا ہی نہیں
تے! صاحب موصوف نے اپنے استعفیٰ میں حکومت کی بدنامی کا ذکر فرما کر، اربابِ اقتدار کی ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش
ہے کہ حکومت کو بدنامی سے بچانے کے لئے وہ اپنے عہدے کی قربانی دے رہے ہیں۔

پاکستان کے مسلمانوں کے ذہنوں میں یہ واقعہ تازہ ہوگا کہ چند ماہ قبل پاکستان کے دارالخلافہ میں ایک کانفرنس بلائی گئی تھی۔ جس میں پاکستان کے علاوہ دوسرے اسلامی ملکوں کے اکابر علماء نے شرکت فرمائی تھی۔ یہاں تک کہ روس کے مفتی اعظم بھی اس میں شریک ہوئے ــــ انہی ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب نے علماء کے انتخاب کی ذمہ داری قبول کی اور اُن کو دعوت دی۔ توقع یہ تھی کہ یہ علماء خاندانی منصوبہ بندی، بنک کا سود، تعدد ازدواج اور مخلوط تعلیم جیسے مسائل کی تائید کریں گے اور دین و سائنس کے مابین ہم آہنگی و مطابقت کے اُس نظریہ کو پیش فرمائیں گے۔ جس کی رو سے دین کے منصوص ارکان و فرائض کے مقابلہ میں "تسخیر کائنات" کو زیادہ اہم سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ اُسے اولیت کا درجہ دیا جاتا ہے ــــ اس طرح تنویر فکر، روشن خیالی ــــ اور قدامت زدگی اور تنگ نظری کے دونوں رُخ پاکستان کے مسلمان دیکھ لیں گے!

ــــــــ مگر ــــــــ

ان علماء کی فراست و بصیرت نے بھانپ لیا کہ اس کانفرنس کے انعقاد کی اصل غایت کیا ہے! انہوں نے جرأت کے ساتھ اعلان کیا کہ ہم یہاں اس لئے نہیں آئے کہ اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو حلال کیا ہے، اُسے حرام ٹھیرا دیں اور جسے حرام قرار دیا ہے اُسے حلال بنا دیں۔ باہر سے آئے ہوئے قریب قریب تمام علماء کی یہی روش رہی کہ وہ "تجدد آزاد خیالی" کی حمایت نہیں کر سکتے پاکستان کے ایک عالم نے اپنی تقریر میں متجددانہ خیالات پیش کئے تو مجمع نے اُنہیں بُری طرح ہوٹ کر دیا! افسوس ہے اخبارات میں اس کانفرنس کی مفصل روداد نہ آسکی، بعض دینی رسائل میں تفصیل شائع ہوئی تو پتہ چلا کہ کانفرنس کی اکثریت "دین خالص" کی کتنی پرجوش مؤید تھی۔ اور جس بڑے سے بڑے شخص نے بھی اپنے حدود سے بڑھ کر کوئی بات کہی۔ اُس کے لئے کانفرنس کی فضا کو ناسازگار بلکہ برہم پایا گیا۔ اس کانفرنس کے ــــــــ بعد ہی ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کی تقدیر کا ستارہ گردش میں آگیا۔

یہ تحقیق؟! یہ بات چڑھتی ہوئی دھوپ کی طرح روشن ہے کہ پاکستان میں صلوٰۃ و زکوٰۃ کے نظام کو قائم و برپا نہیں کیا گیا، کوئی مسلمان نماز پڑھے یا نہ پڑھے، زکوٰۃ ادا کرے یا نہ کرے، اس قسم کے فرائض کو نجی مسائل سمجھ کر اُن سے بے تعلق ہو جانا یہ تو "لادینی ریاست" کی خصوصیت ہے! انگریز کے دورِ حکومت میں نہ حج کا کوٹہ مقرر تھا۔ اور نہ کوئی ایسی پابندی عائد کی گئی تھی جس کے باعث حج کے لئے جانا دشوار ہو جائے، مگر پاکستان بننے کے بعد اس دینی مرحلے میں بھی۔ پابندیوں اور دشواریوں سے مسلمانوں کو دوچار ہونا پڑا یہاں فریضۂ حج کی اہمیت اور ثواب آخرت کے مقابلہ میں "زرمبادلہ" کی بچت کا زیادہ خیال کیا جاتا ہے! پاکستان میں اسلامی اخلاق کی بنیادوں پر معاشرے کو قائم کرنے کی کوشش بھی نہیں کی گئی۔ بلکہ اس کے مقابلہ میں گرلز گائڈ کے "تبرج" مخلوط تعلیم کے فتنہ اور تعلیمی درسگاہوں میں طالبات کے رقص و سرود کے مظاہروں کو شہ دی گئی ہے۔

اس گذارش کا مقصد یہ ہے کہ اصل میں جو کام کرنے کے تھے اور "امر بالمعروف" اور "نہی عن المنکر" کے جن فرائض کو انجام دینا تھا،

اسلام جن کو معروف اور منکر کہتا ہے وہ کسی تحقیق و جستجو کے محتاج نہیں ہیں اور قرآن کریم کا کوئی لفظ گم ہو گیا ہے۔ جسے تلاش کیا جائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت بھی احادیث کے مجموعوں میں محفوظ ہے اور کتاب و سنت ہی دین کے اصل ماخذ ہیں

ستونوں پر دین کی عمارت قائم ہے۔

مسلمان فرد ہو، جماعت ہو یا حکومت جب وہ اسلامی احکام و ارکان کی عملاً پابند ہو جائے اور خاص طور سے حکومت تمام ذرائع معاشرے کو اسلامی اخلاق کی اساس پر استوار کرنے میں لگا دئے جائیں۔ اس وقت حکومت "تحقیقاتی ادارے" قائم کر سکتی ہے مگر یہ تحقیق اسلامی نظریوں اور دینی قدروں کی تبلیغ اور تائید کے لئے ہوگی، ان کی "تحریف" کے لئے نہیں ہوگی، دینی قدروں اور اسلامی نظریوں میں ترمیم و اضافہ کو "تحقیق" نہیں کہہ سکتے، یہ تو "تحریف" ہوئی! عقل و بصیرت اور فہم و دانش کی اہمیت اور افادیت سے کون احمق انکار کر سکتا ہے مگر اسلام میں مسلمان کی عقل دین کے تابع ہوتی ہے۔ عقل کو اس طرح کی آزادی نہیں دی جا سکتی کہ وہ تابع بننے کے بجائے متبوع بننے کی کوشش کرے۔ اس طرح تو دین کا حلیہ بگڑ کر رہ جائیگا عقل ہی کا یہ تقاضا اور فیصلہ ہے کہ اگر مسلمان رہنا ہے تو عقل کو دین کا تابع بن کر رہنا پڑے گا، کسی بڑے سے بڑے آدمی کی عقل بھی دینی مسائل میں معیار حق نہیں بن سکتی اور کسی شخص کو "تحقیق" کے نام پر دین میں ترمیم و اضافہ اور تحریف و تصرف کی اجازت نہیں دی جا سکتی! ملت نے فارابی اور ابن سینا جیسے عظیم دانشوروں کے اُن نظریوں کو رد کر دیا اور انہیں باطل قرار دیا، جو یونانی فلسفہ کا ظل و عکس تھے اور جن کی زد اسلامی نظریوں پر پڑتی تھی۔ جب ملت اسلامیہ کا یہ مزاج رہا ہو تو جو مسلمان دانشور اور ریسرچ اسکالرز مستشرقین کے ملحدانہ نظریوں سے متاثر ہو کر، دین میں ان افکار کو سمو دینا چاہتے ہیں اُن کی "تخریب" و "تحریف" اور تصرف بے جا کو کس طرح گوارا کیا جا سکتا ہے، یہ گروہ تحسین و ستائش کا نہیں ملامت و بیزاری کا مستحق ہے، عقل، تحقیق، تجربہ اور دانشوری اپنی معراج پر پہونچ کر بھی دین میں کانٹ چھانٹ اور رد و بدل کرنے کی مجاز نہیں ہیں! شیطان نے اللہ تعالیٰ کی ذات کا انکار نہیں کیا تھا، اُس ظالم نے یہی غلطی تو کی تھی کہ حکم الٰہی کے مقابلے میں عقل کو ترجیح دی، عقل کے غلط استعمال اور نافرمانی کی بناء پر اُسے ملعون قرار دیا گیا اور وہ مطرود و مردود اور ملعون و رجیم ٹھیرایا گیا۔

قرآن کریم کی تلاوت سے قبل "اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم" پڑھنے کی جو تاکید کی گئی ہے اُس کا یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مقابلہ میں رائے زنی کر کے کہیں شیطان کی روش اختیار نہ کر لینا۔ قرآن پاک میں بیشک بار بار تعقل و تفکر کی دعوت دی گئی ہے، مگر عقل و فکر کی یہ جولانیاں دین کے حدود کو توڑنے کے لئے نہیں بلکہ ان حدود کی نگہداشت کے لئے ہونی چاہئیں، مثلاً کوئی مفکر اور اہل عقل قرآن کریم کی آیات حجاب کو پڑھ کر اس نتیجہ پر پہونچے کہ قرآن کا یہ حکم موجودہ ترقی یافتہ معاشرے کا ساتھ نہیں دے سکتا اور حالات کی تبدیلی کے ساتھ دین کے احکام بھی بدل جاتے ہیں، آج کل تو مرد و زن کے اختلاط کے بغیر معیشت و معاش کا کاروبار ہی نہیں چل سکتا ———— لہٰذا قرآن کریم جسے "تبرج جاہلیۃ" کہتا ہے وہ آج کی دنیا میں "صنعت و فن" اور "علم و دانش" کے ظہور کی دلیل ہے (استغفر اللہ) قرآن کریم میں غور و تفکر کے بعد اس قسم کے نتائج پر پہونچنا یہی وہ "نزغ شیطان" ہے، جس سے پناہ مانگی گئی ہے!

آج کل کے مسلمان متجددین اور مستغربین یہی غلطی کر رہے ہیں کہ انہوں نے کتاب و سنت کو اپنی عقل و دانش کی خرادوں پر چڑھا دیا ہے جس کے نتیجہ میں دین کا حلیہ بگڑتا چلا جا رہا ہے! قرآن کریم کا وہ مصرف اس غرض سے کرتے ہیں کہ یورپ کے مادیت پرور نظریوں کو صحیح ثابت کرنے کے لئے قرآن کریم کی آیتوں میں قطع و برید کریں اور اس کاٹ چھانٹ اور تحریف و دراز دستی کا نام اُن کی اصطلاح میں "تحقیق" ہے، جس پر وہ شرمانے کی بجائے اُلٹا فخر کرتے ہیں اور علماء دین پر قدامت زدگی اور رجعت پسندی کی پھبتیاں کستے ہیں۔

عورتوں کے "حجاب" کا مسئلہ ملاؤں کے ذہن و فکر کی پیداوار نہیں ہے، اس کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے۔ "جلابیب"
ر" کی اصطلاحیں بھی قرآن کی دی ہوئی ہیں، مسلمان عورتوں کو بناؤ سنگھار اور مقام زینت کی نمائش سے بھی قرآن کریم
نے روکا ہے اور اسے "تبرج جاہلیت" کا نام دیا ہے صنف نازک کی عصمت و عفت کا مسئلہ اس قدر نازک ہے کہ قرآن کریم
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کو نامحرم صحابہ کرام تک سے پردے کی آڑ سے گفتگو کی اجازت دی ہے وہ بھی
، احتیاط کے ساتھ کہ لب و لہجہ میں اس قسم کا کوئی لوچ نہ ہو جس سے سننے والے کے دل میں کوئی لگاوٹ یا غلط قسم کی توقع
دا ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ کے قربان جائیے کہ اس نے مسلمانوں کے معاشرے کی تطہیر کے لئے نامحرم مرد و زن کے
ل جول پر کتنی نفسیاتی پابندیاں لگائی ہیں!

یورپ، روس اور جاپان و چین کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں، ان ملکوں میں نامحرم مرد و زن کے اختلاط نے ہوائے نفس کو
ق و فجور کی اس سطح تک پہونچا دیا ہے، جسے دیکھ کر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس مشاہدہ و تجربہ سے مسلمانوں کو
بت حاصل کرنی چاہئے تھی مگر ہو یہ رہا ہے کہ ان منکرات و فواحش کو ترقی اور روشن خیالی کے نام پر قبول کیا جا رہا ہے جن مسلمان
الک میں تبرج جاہلیت اور مرد و زن کے اختلاط کا یہ فتنہ ابھرا ہے وہاں شراب اور لحم خنزیر کی بھی ارزانی ہوئی ہے، اس گراوٹ
اللہ اور رسول کی مسلسل نافرمانی کے بعد کفر اور اسلام کا بس قانونی طور پر فرق باقی رہ جاتا ہے، جہاں تک اعمال و مشاغل کا
تعلق ہے مسلمان اور کافر ایک ہی سطح پر آجاتے ہیں!

ایک طرف قرآن کریم نے نامحرم مرد و زن کے درمیان وہ فطری حدیں قائم کی ہیں، جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، دوسری
رف ریڈیو، ٹیلی ویژن، سینما اور تھیٹر میں مسلمان عورتوں کے رقص و سرود اور اداکاری کے حیا سوز مناظر ہیں، مرد و زن کا بے باکانہ
تلاط ہے، مقامات زینت کو نمایاں کرنے اور جاذب نظر بنانے کی زیادہ سے زیادہ کوشش ہے ان کھلے ہوئے فواحش و منکرات
سائنس کی ترقی کے نام پر "تحقیق" کے ذریعہ سند جواز دینے کی کوشش، اسلامی اخلاق کے خلاف سازش نہیں تو اور کیا ہے۔ جس ملک
ں اور جہاں بھی کہیں یہ افسوسناک صورت حال پائی جاتی ہے اس پر علمائے حق نکیر کریں گے چاہے پروپیگنڈے کی قوت سے ان
ے ماتھوں پر جس "تنگ نظر" کے لیبل ہی کیوں نہ لگا دئے جائیں اور آج کی مہذب دنیا میں وہ اچھوت بن کر کیوں نہ رہ جائیں۔ اسلام
ب کفار قریش کے لئے اجنبی تھا تو قریش کے لونڈے حضرت بلال کو مکہ کی گلیوں میں گھسیٹتے ہوئے پھرتے تھے۔ اور داعیان حق کا
رح طرح سے مذاق اڑایا جاتا تھا، آج بھی مسلمان اگر دنیا کے لئے غریب و اجنبی (۔ ۔ ۔ ۔ سیعود غریبا) ہو گیا ہے تو اللہ کے دین کی
فاظت کرنے والے اور کتاب و سنت کی طرف دعوت دینے والے ان پھبتیوں، ذلتوں، تکلیفوں اور مصیبتوں سے کیسے بچ
سکتے ہیں۔ جن سے صحابہ کرام نہ بچ سکے!

تحقیق و اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہوا، تحقیق و اجتہاد کی اہمیت کے ہم منکر نہیں ہیں مگر تحقیق اور اجتہاد اسلام کی قائم کر
دہ حدود کے اندر رہ کر ہو سکتا ہے، تحقیق و اجتہاد دین کے کسی معروف کو منکر سے نہیں بدل سکتے اور نہ کوئی "منکر" اکتشاف و تحقیق
ور اجتہاد و رائے کی اس کوشش کی بدولت مباح قرار دیا جا سکتا ہے! نئے مسائل میں "اجتہاد" ہونا ہی چاہئے، مگر اجتہاد کے کچھ
رائط ہیں اور ہر شخص کو اجتہاد کا منصب نہیں سونپا جا سکتا، ایسا "اجتہاد" جس سے دین کی کوئی حد ٹوٹتی ہو اور اسلام کے ضابطہ
خلاق اور قانون شریعت سے جو متصادم ہوتا ہو اجتہاد نہیں "فساد" ہے! آج کے مسلم ارباب تحقیق کو یہ کام انجام دینا ہے کہ مستشرقین
نے اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف جو طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلا دی ہیں، ان کو پوری قوت اور زور استدلال کے ساتھ رفع

کرنے کی کوشش کریں اور یورپ پر اُن کے دانشوروں کی بددیانتی اور اسلام دشمنی واضح کردیں۔ اسلام کے نظام معیشت و اقتصادیات کا سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی نظام سے مقابلہ کر کے دکھائیں اور ثابت کریں کہ اسلام کا معاشی نظام ان دونوں نظاموں کے مقابلہ میں بہتر، فطری تقاضوں کے عین مطابق اور سہل العمل ہے! دنیا کی الہامی کتابوں اور آسمانی صحیفوں میں وہ آیتیں اور عبارتیں تلاش کریں جو قرآن کریم کی آیتوں سے ہم آہنگ ہیں! قرآن کریم میں جن قوموں کا ذکر آیا ہے اُن کے تاریخی آثار کا بھی پتہ لگانا "تحقیقی کام" ہے! غرض یہ "تحقیق" اس غرض اور مقصد کے لئے ہونی چاہئے، جس سے اسلام کی حقانیت، صداقت، دینِ فطرت اور اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ ضابطۂ حیات ہونے پر لوگوں کو اطمینان دلایا جاسکے!

"اسلامی تحقیق" کا یہ کام دہریوں، فساق، فجار، بدعمل اور اخلاق باختہ ریسرچ اسکالروں کے اندازہ پر نہیں ہونا چاہئے۔ جو شراب پی کر، کلبوں میں عورتوں کے ساتھ ناچ کر، اور جواکھیل کر لفسانی، ناقص اور لذت حاصل کرتے ہیں، اور آخرت کی بازپرس کا کوئی تصور ہی سرے سے نہیں رکھتے اُن کے سامنے اُن کی قوم اور ہوس نفسانی ہوتی ہے! مگر اس کے برخلاف مسلمان اہلِ تحقیق اور ہماری اصطلاح میں دانشور (RESEARCH SCHOLARS) اول تو اسلام کے برحق اور دینِ فطرت ہونے پر پوری طرح مطمئن ہوتے ہیں، پھر اُن کے دل و دماغ خشیتِ الٰہی اور آخرت کی بازپرس کے خوف سے لبریز ہوتے ہیں، اُن کی زندگیوں میں بھی تقویٰ کی جھلک پائی جاتی ہے، اُن کا ذہن سلجھا ہوا، اُن کا مطالعہ وسیع، اُن کی فہم صحیح و مستقیم اور اُن کی نگاہ بصیرت افروز ہوتی ہے یہی وہ دانشور ہیں، جن کی تحقیق سے اسلام کو فائدہ پہونچتا ہے اور علم و تحقیق کی نئی نئی راہیں کھلتی ہیں۔ اُن کا دماغ اسلام کو مسخ کرنے کے لئے نہیں بلکہ اسلام کی حفاظت اور اُس کی صداقت کو اُجاگر کرنے کے لئے علمی نکتے پیدا کرتا ہے! موجودہ دور میں سید عبدالقادر عودہ شہید، سید محمد قطب شہید، علامہ ابوزہرہ، مصطفےٰ زرقا، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور محترمہ مریم جمیلہ کے نام پیش کئے جاسکتے ہیں کہ ان حضرات کی تحقیق نے دین کی حقانیت کو واضح کیا ہے اور اُن کی کتابوں اور تحریروں سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ دنیا کے تمام ازموں اور نظاموں میں اسلام ہی بہترین نظام ہے جس میں انتہا پسندی کی بجائے کمال درجہ کا اعتدال پایا جاتا ہے، جو وقتی اور ہنگامی نہیں ابدی ہے اور جس کے تحت زندگی گزار کر افراد جماعتیں اور حکومتیں دین و دنیا کی سعادت حاصل کرسکتی ہیں۔

تلافی اور اصلاح؟ ادارۂ تحقیقات اسلامی کے اس عہدے کے لئے صرف تعلیمی ڈگریوں کا دیکھنا کافی نہ تھا، سب سے پہلے اس کا پتہ لگانا تھا کہ جس شخص کو اس دینی ادارے کی نظامت سونپی جارہی ہے، اُس کے دینی افکار کیا ہیں؟ اُس نے دینی تعلیم کہاں پائی ہے؟ اُس کے ذہن و فکر کی پرورش کس ماحول میں ہوئی ہے؟ اُس کے رجحانات اور میلانات کا رُخ کیا ہے۔ دینی ارکان کی پابندی میں اُس کا کیا حال ہے؟

ایک "وحی الٰہی" ہی کا مسئلہ نہیں ہے، ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کے ذہن و فکر پر تجدد آزاد خیالی کا پوری طرح غلبہ ہے مستشرقین یورپ کے ملحدانہ افکار سے وہ خاصے متاثر ہیں اور میکگل یونیورسٹی کے مشہور دشمنِ اسلام پروفیسر (مسٹر اسمتھ) کے یہ صاحب ارشد تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں اس سلسلے ڈاکٹر صاحب موصوف نے "تحقیق" کے نام پر شریعت کی مرمت کرنے اور دین کا حلیہ بگاڑنے کا خاصہ اہم کارنامہ انجام دیا ہے، پاکستان کے علماء ڈاکٹر صاحب کے گمراہ کن نظریوں کی تردید اور اُن پر احتساب

کرتے ہوئے ادارۂ تحقیقات اسلامی کے اُردو آرگن مجلّہ "فکر و نظر" کے بعض مضامین پر "فاران" میں بھی احتساب کیا گیا۔ مگر اس احتساب و احتجاج کے باوجود ——— ڈاکٹر صاحب اپنے گمراہ کن افکار اور غلط قسم کے نظریوں کی تبلیغ سے باز نہیں آئے اور نہیں مدکا نہیں گیا۔ اُن کی کتابیں چھپتی رہیں، اُن کے مضامین رسالوں میں آتے رہے اور اب یہ نگاہ کی کجی کی حد ہو گئی، صاحب موصوف قرآن کریم کے احکام تک کو زمانہ کے حالات کے تحت قابل تغیر و تبدل سمجھتے ہیں (اس عقیدے سے اللہ کی پناہ)۔

ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب ہی تنہا تجدد و آزاد خیالی کے مرض میں مبتلا نہیں ہیں، بعض مسلمان ارباب فکر نے یورپ سے افکار و نظریات مستعار لئے ہیں اور جن کے خوب و ناخوب کا معیار مغرب بن چکا ہے وہ اکثر و بیشتر دین و شریعت کے ساتھ یہی سلوک کرتے ہیں۔ مثلاً یورپ "یک زوجگی" کا قائل ہے، تعدد ازدواج کو وہ پسند نہیں کرتا تو جو مسلمان یورپ سے متاثر ہیں اور مغرب کے دانشوروں سے مرعوب ہیں، وہ کتاب و سنت میں کاٹ چھانٹ کر کے اُنہیں "یک زوجگی" کے مغربی نظریہ پر فٹ کرنے کی کوشش کرتے ہیں' ان حضرات نے دین کے مزاج ہی کو نہیں سمجھا! اس ناسمجھی نے انہیں تخریب دین کی راہ پر ڈال دیا ہے دین کو حالات زمانہ کے مطابق بنا کر اور اُس کا حلیہ بگاڑ کر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ علم و تحقیق کا بہت بڑا کارنامہ انہوں نے انجام دیا ہے۔

ڈاکٹر فضل الرحمٰن ادارۂ تحقیقات اسلامی سے چلے گئے، مگر سوال یہ ہے کہ اُن کے بعد ادارۂ مذکور کی پالیسی بھی کیا بدل جائیگی! اگر ادارہ اُنہی کے انداز فکر کے تحت بدستور چلتا رہا اور دینی مسائل میں اُسی طرح آزاد خیالی اور تجدد کی کارفرمائی رہی، تو پھر ڈاکٹر صاحب موصوف کے چلے جانے سے کوئی فرق واقع نہیں ہوگا، اصل چیز دیکھنے کی یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب جو بگاڑ پیدا کر گئے ہیں اُس کی تلافی اور اصلاح کی کیا صورت ہو گی؟ اور اُن کے افکار کے اثرات سے ادارے کی "تحقیق" کو کس طرح محفوظ رکھا جائے گا!

یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ تو خرابی کا ایک رُخ تھا پاکستان میں دین اور قرآن کے نام پر طرح طرح کے فتنے اُبھر رہے ہیں مثال کے طور پر ادارۂ طلوعِ اسلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مطہرہ کے خلاف برسوں سے مستقل محاذ قائم کر رکھا ہے، اس ادارہ کا مشن ہی یہ ہے کہ احادیث نبوی جن سے سنت نبوی متشکل ہوتی ہے اُن کے بارے میں مسلمانوں کے دلوں میں طرح طرح کے شبہات اور غلط فہمیاں پیدا کی جائیں۔ مسٹر غلام احمد پرویز اس ادارے کی روح رواں اور نفس ناطقہ ہیں، انہی کے گمراہ کن نظریوں کی تبلیغ و اشاعت اس ادارے کا اصل مشن ہے۔

مسٹر پرویز کا دعویٰ یہ ہے کہ "قرآنی اسلام" صرف ان کے پاس ہے اُن کے علاوہ ساری اُمت کا مذہب "زمانہ قبل قرآن کا مذہب" ہے، وہ فرماتے ہیں۔

> "..... لیکن اس تیرہ سو سال میں مسلمانوں کا سارا زور اسی میں صرف ہوتا رہا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اسلام کو قرآن سے پہلے زمانے کے "مذہب" میں تبدیل کر دیا جائے، چنانچہ وہ اس کوشش میں کامیاب ہو گئے، اور آج جو اسلام دنیا میں مروج ہے، وہ زمانہ قبل قرآن کا مذہب ہوگا، قرآنی دین سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ...." (سلیم کے نام پندرہواں خط ص ۲۵۱-۲۵۲)

"زمانہ قبل قرآن کا مذہب" یا تو نصرانیت ہوگا یا یہودیت یا کواکب پرستی اور بت پرستی یعنی کفر و شرک ——— تو پرویز صاحب کے قول کے مطابق جمہور امت یا تو نصرانی ہے یا یہودی ہے یا کافر و مشرک ہے، بہر حال آج کے مسلمان "قرآنی اسلام" سے ناآشنا ہیں مفتیوں اور عالموں پر پھبتیاں کسی جاتی ہیں کہ وہ کفر کے فتوے صادر کرتے رہتے ہیں مگر ان کفر کے فتووں کا تعلق چند افراد یا حد سے حد کسی ایک گروہ یا جماعت سے ہوتا ہے مگر پرویز صاحب نے تو تمام مسلمانوں کے اسلام کو غیر معتبر اور قرآن کا مخالف قرار

قرآن کریم میں جگہ جگہ "اللہ" آیا ہے، اس لفظ کا مفہوم متعین کرنے میں مفسرین کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے مگر پرویز صاحب نے "اللہ" کا جو مفہوم سمجھا ہے اُس کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیے۔

"رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ" (انہوں نے قانونِ خداوندی سے موافقت پیدا کرلی، اور وہ قانون اُن کا رفیق، یاور بن گیا۔" (قرآنی نظام ربوبیت صلا)

اس آیت میں مسٹر پرویز نے "اللہ" کا ترجمہ "قانونِ خداوندی" کیا ہے؟

"ان اللہ ھو الرزاق ذو القوۃ المتین (اللہ کا نظام رزق دینے والا اور بڑی قوتوں والا ہے۔"

اس آیت میں بھی "اللہ" کا ترجمہ "اللہ کا نظام" کیا گیا ہے (قرآنی نظام ربوبیت صہ)

"کل من علیھا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذو الجلال والاکرام — میں بھی ان صاحب نے "وجہ رب" (یعنی ذاتِ باری) سے "قانونِ ربوبیت" مراد لیا ہے!

اسی کتاب (قرآنی نظام ربوبیت) کے صفحہ ۱۱۶ پر "لوکان فیھما آلھۃ الا اللہ لفسدتا" میں پرویز صاحب نے "اللہ" سے معاشی زندگی کا قانون مراد لیا ہے، لکھتے ہیں —

"کیا ان لوگوں نے اپنی معاشی زندگی (ارض) کے الگ الگ قوانین تجویز کر رکھے ہیں جن کی یہ اطاعت کرتے ہیں، اور ان کے سہارے اپنے معاشی پروگرام کو تمام کرنا چاہتے ہیں......"

پرویز صاحب "اللہ" کو "معاشی زندگی کا قانون" کہتے ہیں! یہ قرآن کریم کی کھلی ہوئی معنوی تحریف نہیں تو اور کیا ہے۔

اور سنئے — "عالم الغیب والشھادۃ......

"...... لیکن قانونِ خداوندی ان محسوس نتائج کے علاوہ ان نتائج کا حامل بھی ہوتا ہے، جو تمہاری آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہیں اور جو تمہاری مستقبل کی زندگی کو سنوارتے ہیں"
(قرآنی نظام ربوبیت صـ۱۳)

یعنی "غیب وشہادہ" کا عالم اللہ تعالیٰ نہیں ہے، اُس کا "قانون" ہے۔

زیغ وضلالت، تفسیر بالرائے اور قرآن کی معنوی تحریف کی حد ہوگئی کہ "الحمد للہ رب العلمین" تک کی معنویت مسخ کردی، قرآن کریم کا یہ عجیب وغریب شارح اور نادر الوجود مفسر لکھتا ہے —

"جس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں وہی معاشرہ تعریف وستائش کا مستحق ہوگا جو رب العلمین (تمام نوعِ انسانی کی ربوبیت) کے محکم اصول پر قائم کیا جائے گا۔"
(سلیم کے نام بارہواں خط صـ۱۹۴)

اللہ تعالیٰ اور اس کے قانون کو ایک جیسا سمجھنا کتنی بڑی گمراہی اور غلط اندیشی ہے، کائنات کا خالق اور ارض وسمٰوٰت پیدا کرنے والا، رازق، حی وقیوم، غفور ورحیم، حکیم وعلیم اور عالم غیب والشہادہ اللہ تعالیٰ ہے اُس کا قانون نہیں ہے الٰہ اور معبود ورب "اللہ" ہے، اُس کا حکم اور قانون نہیں ہے۔

عربی مالی اور قرآن فہمی تو بڑی چیز ہے، جو کوئی اردو زبان وادب کا بھی صحیح ذوق رکھتا ہے اور ساتھ ہی فہم صحیح بھی، وہ

"عالم الغیب والشہادۃ" اور "حکیم" سے اللہ تعالیٰ کا قانون مراد نہیں لے سکتا کیا "عالم" و "حکیم" کسی قانون و دستور اور ضابطہ کی صفت ہو سکتی ہے، کیا کسی قانون کو عالم، حکیم، سمیع، بصیر اور غفور و رحیم کہا جا سکتا ہے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ پرویز صاحب کو اللہ تعالیٰ کی ذات سے کد کیوں ہے کہ قرآن کریم کی جن محکم اور غیر متشابہ آیتوں میں "اللہ تعالیٰ" کی ذات کے سوا اور کسی شے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا وہاں بھی وہ تحریف و تلبیس سے کام لیتے ہیں، اسی آیت (الحمد للہ رب العالمین) میں انہوں نے "رب العالمین" سے "معاشرہ" مراد لیا ہے (استغفر اللہ) ــــ تو کیا نوعِ انسانی کی ربوبیت کے محکم اصول پر قائم ہونے والا معاشرہ "مالک یوم الدین" بھی ہے اور اسی طرح "معاشرہ" کی کیا اہل ایمان عبادت کرتے ہیں اور اُس سے مدد چاہتے ہیں اور کیا اسی معاشرے سے یہ دعا کی جاتی ہے ــــ اھدنا الصراط المستقیم ــ!

جس شخص نے "اللہ" کے مفہوم کو بدل کر کچھ سے کچھ بنا دیا ہو، وہ قرآنی آیات کے ترجمہ اور تشریح و تفسیر میں جو شگوفہ بھی چھوڑ دے، اور جو گل بھی کھلا دے تھوڑا ہے، یہ قرآن کی شرح و تفسیر کیا ہوئی، قرآن کی معنوی تحریف ہوئی؟ یہ تفسیر بالرائے ہی نہیں "تفسیر بالہوا" بھی ہے، قرآن کریم کے ساتھ ایسا مذاق تو شاید باطنیوں نے بھی نہیں کیا!

قرآن کریم میں بار بار "قیام صلوٰۃ" کا حکم آیا ہے ــ مگر یہ "صلوٰۃ" کیا ہے؟ اس "حکم" کی تشریح پرویز صاحب یوں کرتے ہیں۔

> "آج جب کہ مسلمانوں میں صلوٰۃ کا مفہوم صرف نماز، پرستش یا ہندی زبان میں پوجا پاٹ رہ گیا ہے، یہ سمجھنا ذرا دشوار ہے کہ "قیام صلوٰۃ" کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ ہمارے یہاں "قیام صلوٰۃ" کا ترجمہ کیا جاتا ہے "نماز قائم کرو" اور اس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ نماز پابندی کے ساتھ پڑھو اور اس سے مقصود ہوتا ہے خدا کی پرستش، اس لئے یہ بات بمشکل سمجھ میں آ سکتی ہے کہ اس "پرستش" کو "معاشی امور" سے کیا واسطہ؟ یہ شبہ کوئی نیا نہیں، وحی کی طرف سے ہمیشہ دین (نظام زندگی) ملتا تھا، لیکن اسے انسان رفتہ رفتہ مذہب (دھرم) میں بدل دیتے تھے، اسی طرح دین کے وہ تمام عناصر جو نظام زندگی کے ستون تھے، رفتہ رفتہ پوجا پاٹ میں بدل جاتے تھے اور ان کا انسانی زندگی سے کوئی واسطہ نہیں رہتا تھا۔ یہی کچھ سابقہ اقوام نے کیا، اور یہی کچھ مسلمانوں سے ہوا۔"
>
> (قرآنی نظام ربوبیت ص۱۵)

قرآن پاک میں "صلوٰۃ" کے اوقات کی تفصیل ہے، وضو اور تیمم کے احکام دئے گئے ہیں، رکوع و سجود کا ذکر آیا ہے، نماز میں "ماتیسر من القرآن" کی تلاوت کا حکم ہے ــ تو وہ "صلوٰۃ" جس کے قیام کا قرآن کریم میں حکم وارد ہوا ہے، جس میں اقامت قعود ہے، رکوع و سجود، تلاوتِ قرآن ہے، تسبیح و تہلیل اور تکبیر ہے، جس کے قائم کرنے کے لئے "اذان" دی جاتی ہے اور جس کے لئے مسجدیں تعمیر کی گئی ہیں، اسی نماز کو مسلمان ادا کرتے ہیں۔ نماز کے ان ارکان پر جو قرآن سے ثابت ہیں "پوجا پاٹ" کی پھبتی، خود قرآن کریم پر طنز ہے۔

قرآن کریم ہی میں "تبدیل قبلہ" کا حکم آیا ہے کہ بیت المقدس کی بجائے کعبۃ اللہ کو نماز ادا کرنے (اقامت صلوٰۃ) کی جہت مقرر کیا گیا تو یہ "جہت قبلہ" نماز کے لئے تبدیل کی گئی تھی یا "معاشی نظام" کا رُخ بدلنے کے لئے اس جہت کو تبدیل کیا گیا تھا۔

"یا ایہا الذین اٰمنوا اذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ
فاسعوا الیٰ ذکر اللہ وذروا البیع"

(اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن نماز کے لئے پکارا جائے، تو
اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو اور خرید و فروخت کو چھوڑ دو)

یا جمعہ کی نماز کے لئے اذان "معاشی امور" کے اہتمام کے لئے دی جاتی ہے ـــ اس آیت میں تو قرآن نماز ادا کرنے کے لئے "معاشی امور" (خرید و فروخت) کے چھوڑ دینے کا حکم دیتا ہے!

قرآن شریف میں جس مسجد کا ذکر آیا ہے کہ اُس کی اساس تقویٰ پر رکھی گئی ہے، اس مسجد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نماز پڑھا کرتے تھے یا وہاں تجارتی و معاشی امور پہ مذاکرے ہوا کرتے تھے؟ "اقیموا الصلوٰۃ" کے حکم کی تعمیل خود مہبطِ وحی و رسالت نے "نماز" کی صورت اور ہیئت میں کی اور اُس وقت سے اب تک پوری امت "نماز" کو اسی طرح ادا کرتی چلی آ رہی ہے، جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ادا کیا تھا۔ جہاں تک اخلاص و تقویٰ اور خشوع و خضوع کا تعلق ہے اُس کی کیفیت میں بہت کچھ فرق واقع ہو گیا ہے مگر نماز کی ہیئت و صورت اور کمیت وہی ہے!

مسٹر پرویز نے قرآنی اصطلاحات ـــ حق و باطل ـــ نفس ـــ طیبات ـــ اعمالِ صالحہ ـــ تقویٰ ـــ کی بھی معنوی تحریف کی ہے! "**اعمالِ صالحہ**" کا ترجمہ اور اُس کی تشریح وہ یوں کرتے ہیں۔

"انسانی ذات اور معاشرہ میں ہمواریاں پیدا کرنے والا پروگرام۔ وہ اعمال جو انسان کی صلاحیتوں کو اُبھار کر نشوونما دیں۔"

نیکی، تقویٰ، صالحیت ۔۔۔ اس قسم کے تمام لفظوں سے پرویز صاحب کو چڑ ہے۔ نیکوکاری اور خوفِ خدا کا کوئی تصور بھی وہ ذہن و قلب میں پیدا کرنا نہیں چاہتے اور خشیتِ الٰہی کا کوئی خانہ اُن کے مرتبہ افکار میں سرے سے پایا ہی نہیں جاتا۔ انہوں نے "اعمالِ صالحہ" کی جو ترجمانی کی ہے اُس کے آخری جزو کی رو سے تو ایک بت تراش بت بنا کر اور صنم تراش کر "صالح" ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس طرح اُس نے اپنی صلاحیتوں کو اُبھارا ہے۔ فلموں کے ایکٹر اور ایکٹرسیں اور کلب گھروں اور ڈانسنگ ہالوں کے رقاص اور رقاصائیں یہ سب کے سب "عملِ صالح" ہی کے تحت اپنی صلاحیتوں کو نشوونما دے رہے ہیں اور یہ "آرٹ سرکل" عملِ صالح کے سب سے بڑے مراکز ہیں (نعوذ باللہ)

تقویٰ ـــ کا ترجمہ اور مفہوم پرویز صاحب نے ان لفظوں میں ادا کیا ہے:-

"معاشی پروگرام کو مستقل اقدار (قانونِ خداوندی) کے ساتھ ہم آہنگ رکھنا، اور اس طرح فرد اور معاشرہ کو خوف اور حزن سے محفوظ کر لینا"

کوئی شخص نہ نماز پڑھے نہ روزہ رکھے، نہ حج کرے، بس "معاشی پروگرام" کو مستقل اقدار کے ساتھ ہم آہنگ کر دے، تو پرویز صاحب کی نگاہ میں وہ "صاحبِ تقویٰ" ہے۔ "تقویٰ" کے لئے اُن کے یہاں فکر و خیال کی طہارت اور سیرت و عمل کی پاکیزگی کی کوئی شرط نہیں! کوئی شخص سود پہ تجارتی کاروبار کرے اور شراب بیچ کر معاشی پروگرام میں توازن پیدا کر دے تو پرویز صاحب کے نظریہ کے مطابق وہ "صاحبِ تقویٰ" ہے ان کے نقطۂ نگاہ سے متقین کا سب سے بڑا امام اور پیشوا تو کارل مارکس تھا جس نے معاشی پروگرام کے سوا اور کوئی چیز پیش ہی نہیں کی، مسٹر پرویز کے "قرآنی افکار" بھی معاشیات کے محور پہ گردش کرتے ہیں۔

عربی کی مشہور متداول لغت "المنجد" کا مؤلف (لوئس معلوف) عیسائی ہے، اُس تک نے قرآن کے "التقویٰ" کی ترجمانی یوں کی ہے ـــ

مخافۃ اللہ والعمل بطاعتہ

(اللہ کا خوف اور اُس کی اطاعت و حکم کے مطابق عمل)

صاحب لغات القرآن "تقویٰ" کی تعریف بیان کرتے ہیں :-

"نفس کو ہر اُس چیز سے بچانے کا نام ہے، جو گناہ کی طرف لے جائے یہ بات ممنوعات کے اجتناب سے حاصل ہوتی ہے۔"

پرویز صاحب دراصل یہودی مفکر مارکس کے معاشی پروگرام کے مبلغ اور مناد ہیں، اس پروگرام کو سچا اور مفید ثابت کرنے کے لئے ان صاحب نے قرآنی آیات میں ایسی ایسی معنوی تحریفیں کی ہیں، جنہیں پڑھ کر دل لرز جاتا ہے اس شخص نے بعید انقیاس تاویلوں کے ذریعہ قرآن کریم کو بقول علامہ اقبال سچ مچ "پاژند" بنا دیا ہے۔

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر
تاویل سے قرآں کو بنا دیتے ہیں پاژند

مسٹر پرویز کی کتابوں کو اگر سرکاری محکموں، دفتروں، پولیس، فوج اور دوسرے اداروں میں اشاعت کی شہ مل جائے، تو مسلمانوں کے عقیدہ و عمل کا کیا حشر ہوگا؟ پرویز کے لٹریچر سے جن دماغوں کی تربیت ہوگی، وہ پاکستان کو ماسکو اور پیکنگ تو بنا سکتے ہیں مگر مکہ اور مدینہ کی اخلاقی فضا پیدا نہیں کر سکتے، دین و ایمان کا کتنا بڑا فتنہ ہے جو پاکستان میں پرورش پا رہا ہے!

مسٹر پرویز کی فکر بنیادی طور پر غیر قرآنی فکر ہے، ان کی کتابیں پڑھ کر ایک مسلمان کو عقیدہ و عمل اور اخلاق کے نقصان کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔

ماہر القادری
۳۰ ستمبر ۷۸ء

قرآن کریم اور ہم

(یہ چند اوراق، زیر ترتیب کتاب "ہندوستانی مسلمان" سے ماخوذ ہیں۔ دسمبر ۱۹۴۲ء
میں راقم الحروف نے مولانا آزاد تعلیمی مرکز (اسریٹھ، جونپور) کے لئے تعلیمی مقاصد اور پروگرام
کا ابتدائی خاکہ مرتب کیا تھا چنانچہ سطور ذیل اور کتاب مذکور میں کہیں کہیں اس کی عبارتیں
شامل ہیں ـــــ ر۔ک۔ف)

کتاب الٰہی کی بندہ نوازیاں حیرت آفریں ہیں۔ اونٹوں کے چرانے والے دنیا کے امام ہو گئے۔ گلہ بانوں کو وہ قسمت ملی کہ قیصر و کسریٰ کا
جلال و جبروت اُن کے سامنے گرد ہو گئے۔ وہ طوفان بن کر اٹھے اور سحاب رحمت بن کر چھا گئے۔ وہ بجلی بن کر چمکے اور چاندنی بن کر
پھیل گئے۔ کیا اُن میں یورپ، امریکہ یا روس کی یونیورسٹیوں کے فاضل تھے؟ کیا وہ روم و اسکندریہ سے ڈگریاں لے کر پلٹے تھے؟
کیا وہ فلسفہ افلاطون و ارسطو کے حافظ تھے۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ بلکہ کھجور کی گٹھلیاں اگانے والے، نوشت و خواندسے بیشتر ناآشنا
اور خانہ بدوش یا قبائلی تھے، اور یہی نہیں بلکہ وحی منزل کا امین جو قرآن لایا، وہ بھی آشنا اور حرف شناس بھی نہ تھا۔
یہ کوئی کرامات تھی جس نے مس خام کو کندن بنا دیا کہ سارا دنیا کے علوم و فنون منہ دیکھتے رہ گئے اور وہی بادیہ نشین
جو کل تک گونگے تھے، گویا ہو گئے، وہی صحرا نورد جو کل تک جاہل تھے، یک جنبش قدم بالا دست و قہرمان اقوام
عالم بن گئے۔ اگر صدیق و فاروق و عثمان و علی کے سامنے یونانی فلسفے، رومی قانون اور ایرانی علوم کا دفتر کھول دیا
جاتا تو یقین کیجئے کہ ایک زیرلب تبسم کے ساتھ اپنی مطلق بے علمی کا اعتراف کر لیتے، انہیں ابن رشد بننے کا کوئی شوق نہ ہوتا اور بو علی سینا
بننے پر کوئی فخر نہ ہوتا لیکن جسے زندگی کہتے ہیں اُس کی سائنس اور اُس کا آرٹ صرف وہی جانتے تھے۔

اُن کے پاس دنیا جہان کے کتب خانے نہ تھے اور اگر خدانخواستہ اتنی کتابوں کا بوجھ انہیں ڈھونا پڑتا تو وہ یقیناً قیامت عالم کا
بار نہ اُٹھا سکتے۔ بس ایک کتاب تھی اور وہ بھی کس طرح کی کتاب؟ نہ اس پر مذہب و مطلا جلد نہ تختہ اور ہانگ کانگ کی سی کتابت
طباعت نہ دبغت و حریر کا جزدان، کھجور کے پتوں اور چمڑے کے پارچوں پر لکھے ہوئے اوراق۔ قرآن نے انہیں ایک انوکھا علم دیا
تھا۔ سراپائے عمل بن جانے کا علم۔ قرآن کے نزدیک علم اور عمل جدا جدا نہیں ہیں۔ وہ جہاں کہیں لفظ علم استعمال کرتا ہے ہمیشہ عملی و اطلاقی
علم (APPLIED AND PRACTICAL KNOWLEDGE) مراد لیتا ہے۔ علم بے عمل اُس کی نظر میں جہالت
اور عمل بے علم جاہلیت ہے۔

قرآن انسانی زندگی کے ہر تقاضے کا جواب ہے۔ وہ تمام امراض حیات کے نسخوں کی ایک قرابادین (MATERIA MEDICA)
ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کا اظہار، استعارے کی زبان میں ابن عباس نے فرمایا تھا۔

اسلامی مقاصد ـــــ عام انسانی زندگی کی تحسین و تزئین اور اس کے نتیجے میں آخرت کی تعمیر کیلئے استعمال کا قائل ہے۔

لیکن چشم فلک نے یہ دردناک منظر بھی دیکھا کہ وہ بندے جنہوں نے قرآن حکیم کو رہنمائی کے لئے قبول کیا تھا اُسے ملّا چھوڑ بیٹھے اس سے بڑا سانحہ کیا ہو سکتا ہے کہ کسی کے پاس آبِ بقا کا مجرب نسخہ ہو اور اُسے احتراماً سینے سے لگائے بیٹھا رہے کہ اس سے ہمارے آبا و اجداد کو زندگی ملی تھی لیکن خود ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرجائے یا کسی کے قبضے میں دولت کا خزانہ ہو اور وہ کوڑی کوڑی کے لئے اغیار کے آگے ہاتھ پھیلائے۔ ابھی قرآن کی سادہ و بے آمیز دعوت کو دو ہی صدیاں گزری تھیں کہ انسانی تصانیف میں کلام الٰہی سے زیادہ دلچسپی لی جانے لگی۔ اور قرآن ضابطہ حیات بننے کی بجائے صرف متبرک صحیفہ بن کر رہ گیا۔ عباسی حکمرانوں کا زمانہ دیکھئے دینی علوم میں کیسی کیسی موشگافیاں کی گئیں۔ یونانی منطق اور یونانی فلسفے کے دفاتر دیکھ کر رال ٹپک پڑی اور ہم یہ بھول گئے کہ جس یونان کو ہم قبلۂ عقیدت بنا رہے ہیں وہ اخلاقی اور سیاسی دنیا میں صدیوں پہلے دیوالیہ ہو چکا ہے اور ظلمت کدے سے شعاعوں کی بھیک مانگنا اس ملت کو قطعاً زیب نہیں دیتا جو اسی لئے پیدا کی گئی ہے کہ مشرق و مغرب کے دامن میں شب رنگ ستارے ٹانک دے، یہی نہیں عجمی باطنیات و عرفانیات کا آسیب بھی چمٹ کر رہ گیا۔ خود ہندوستان میں علوم اسلامیہ کا تدریسی نظام عہد مغلیہ میں مدوّن ہوا لیکن عہد مغلیہ تو خود اسلامی تہذیب کے زوال کا دور تھا اس لئے بدقسمتی سے یہاں اسلامی علوم کی بنیاد ہی ریگ رواں پر رکھی گئی۔ جب زندگی عیش و راحت کا حسین خواب ہو کر رہ جائے دربار داری مصاحبت اور دروغ گوئی کا نام علم پڑ جائے، شعرا اور وہ بھی قصیدہ گو شعرا سونے میں تولے جانے لگیں، مستقبل کے فیصلے خدا سے چھین کر نجومیوں اور کاہنوں کو سونپ دیئے جائیں، جھوٹی زرکاریوں اور کھوکھلے طمطراق کو شوکت ہارونی اور جلال اکبری کا نام دیا جائے تو پیغام فطرت کی بلاغتوں پر توجہ کرنے کا وقت کہاں سے مل سکتا ہے۔ انسان جب نفس کی پرورش کرتے کرتے حدود سے آگے نکل جاتا ہے اور اغراض کی مکڑیاں ضمیر پر جالا تننے لگتی ہیں تو آنکھیں حقیقتوں کو دیکھتی ہیں مگر نہیں دیکھتیں، کان صداقتوں کو سنتے ہیں مگر نہیں سنتے۔ گم کردہ راہی کا خیال آتا ہے اور ضمیر کے کچوکے محسوس ہوتے ہیں لیکن مادی پستی اور زحمت عمل کا تصور ذہنی تفکر و تامل کی مہلت نہیں دیتا اور انسان اپنے آپ کو فریب دینے لگتا ہے۔ قرآن کے ساتھ بھی ہم نے یہی کچھ معاملہ کیا۔ قرآن کو ماننے والے اپنے آپ کو مسلمان کہنے والے آج کیا ہیں اپنی رفعتِ رفتہ کا نوحہ اور وہ بھی نوحۂ خاموش، اپنی عظمتِ دیرینہ کا سایہ اور وہ بھی سایۂ گریزاں۔

تاویل بے جا اور مدیح خود بزبان خود سے نفس کو تسکین ہوتی ہو تو ہوتی ہو لیکن خارجی دنیا کا ایک ذرہ بھی ان خفی تسلیوں سے نہیں بل سکتا۔ آپ ہر طرح کے تعصبات سے بلند ہو کر ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کا موازنہ کر لیجئے۔ آپ کو پتہ چل جائے گا کہ اخلاقی گراوٹ کی فراوانی کس کے یہاں ہے!

اس سے بڑی سیہ بختی یہ ہے کہ جس مرض نے حالت غیر کر دی ہے اُس کی صحیح تشخیص اب بھی نہیں ہو رہی ہے کہیں سے آواز آتی ہے کہ اسلام دورِ جدید کے تقاضوں کے مطابق ڈھل جائے: کوئی کہتا ہے کہ مسلمان سیکولرزم کی تعمیر میں لگ جائیں۔ کہ سیکولرزم کی بنیادی قدریں عین اسلامی قدریں ہیں، کوئی یہ نسخہ تجویز فرماتا ہے کہ مسلمان ہندوستانی کلچر اختیار کر کے یکسو ہو جائیں! کسی کا ارشاد ہے کہ جدید تعلیم اور سائنس اور ٹکنالوجی کے اسلحہ سے لیس ہونا ہی مسلمانوں کے درد کا واحد مداوا ہے۔ لیکن اللہ کے ایسے بندے خال خال نظر آئیں گے جو یاد دلاتے ہوں کہ اعتصموا بحبل اللّٰہ جمیعاً اور کہتے ہوں کہ قرآن اور صرف قرآن کو محورِ حیات بناؤ، کتنا مضحکہ خیز ـــ نہیں، نہیں کتنا اندوہناک نظارہ ہے کہ جڑ سوکھ چکی ہو اور درخت گرا چاہتا ہو مگر کچھ خیراندیش (؟) شاخوں اور پھنگوں پر اوس ٹپکا دینا کافی سمجھتے ہوں۔ کل کیسی بلندیاں تھیں" آج کیسی پستیاں ہیں۔ اس طائر کی قسمت کو کیا کہئے جو انتہائی بلندیوں پر پہنچ کر اپنے بازو سمیٹ لے اور اُس کی موت کا ماتم کیجئے یا اُس کی نادانی کا؟

آپ اکثر لوگوں کو کہتے سنیں گے کہ غیر مسلم قومیں ترقی کر رہی ہیں حالانکہ غور کیجئے تو یہ اُن قوموں کا عروج نہیں ہے یہ ہمارا زوال ہے ہم کہانی کے خرگوش کی طرح راستے میں یوں محوِ خواب ہو گئے ہیں کہ کچھوے کی رفتار بھی تیز معلوم ہونے لگی ہے۔ خدا فراموش قوموں میں ترقی اور تنزل کا جو تناسب ہمیشہ رہتا ہے۔ وہ ظہورِ محمدیؐ کے وقت بھی تھا اور آج بھی ہے۔ ہمارے حصے میں ناکامیاں صرف اس لئے آتی ہیں کہ ہم نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ عددی یا مادّی اعتبار سے تو ہم دنیا کے امام کبھی نہ تھے لیکن ہماری اخلاقی اور روحانی قوت اکثریت اور مادّیت پر ہمیشہ غالب آتی تھی ہم نے اپنے اصل سرمائے کو پھینک دیا اور نادانی سے دوسری قوموں کی طرح سوچنے لگے کہ کثرتِ تعداد قابلِ فخر ہے اور مادّی ترقی ہی ترقی ہے۔ ہم کتنی جلد اپنا تجربہ بھول گئے کہ اگر کسی مادّی اور عددی طاقت کے مقابل اخلاقی قوتیں زندہ اور فعال (ACTIVE) ہوں تو مادّی اور عددی طاقت کا قلعہ دھڑام سے زمین پر آ رہتا ہے۔ چند سال پہلے کی بات ہے اور دورِ خلافت کے مومنین و کفار کی نہیں، دو مسلمان حریفوں کی بات ہے کہ پہلی مغل فوج جب بابر کے ساتھ ہندوستان آئی تو برسوں کے بھوکے، سوکھے، مریل فاقہ اور ریگستانی موسموں کے ستائے ہوئے اور پردیس کے مارے ہوئے صرف بارہ ہزار آدمیوں پر مشتمل تھی لیکن اُس نے ابراہیم لودی کے ایک لاکھ فربہ و تازہ دم عیش کوش سورماؤں کو شکست دی اور کروڑوں کی آبادی رکھنے والے ملک پر متصرف ہو گئی۔ اب ذرا اسے بھی یاد کیجئے کہ ان بارہ ہزار غریب الدیاروں کی قائم کی ہوئی حکومت جب تباہ ہوئی ہے تو اُس کے پاس ان گنت اسبابِ جنگ اور لاکھوں فوجیں موجود تھے ——— وہ فوجیں جن کے پیٹ سرخ و سپید تھے اور پیٹ حلق تک بھرے ہوئے۔ مغربی قومیں کچھ ہماری کشور کشائیوں کی ریس میں اور کچھ طلب زمین و زر کے اُس شوق میں جو کفر کا طبعی خاصہ رہا ہے، ہمیشہ کی طرح دنیا میں بنانے میں مصروف رہیں اور اگرچہ وہ ہمارے اخلاقی سرچشموں سے نابلد تھیں تاہم حصول وقار سیادت کے لئے انہوں نے افادی اخلاق کے کچھ اصول اپنائے اور ان پر سختی سے عمل کیا۔ مادہ جو کبھی ہماری روح کے آگے سربسجود رہتا تھا۔ بے لگام ہو کر کھل کھیلا۔ مغربی اقوام کی روح بیمار ہی لیکن جسم بہر حال توانا ہے اور وہ ہم سے جن کے جسم و روح دونوں پر سکرات کا عالم طاری ہے، بہر حال بہتر ہیں اور انصاف کی بات یہ ہے کہ جب تک ہماری مدہوشی باقی ہے وہ ہم پر ہی نہیں ساری دنیا پر حکمرانی کی مستحق ہیں۔

مسلمان جو گویا محمد الرسول اللہ کے بعد اس کے ذمہ دار تھے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض ادا کرتے رہیں آج امت کی حیثیت سے پریشان و منتشر اور ایک بیالو جماعت کی حیثیت سے تقریباً معدوم سے ہو چکے ہیں۔ سچ کہا تھا سید قطب شہید رحمۃ اللہ نے کہ "آج اُمتِ مسلمہ کا حقیقی وجود کہیں نہیں ہے"۔ آپ خود دیکھیں کہ وہ اُمت جو ساری دنیا کو ایک امت بنانے کے لئے آئی تھی۔ اس کے فرزندوں کی غالب تعداد دوسری قوموں کی نقل میں عرب قومیت کا نعرہ بلند کر رہی ہے ساری دنیا کے کیتھولک منظم ہو گئے ——— پروٹسٹنٹ منظم ہو گئے بلکہ نئے پوپ نے تو کیتھولکوں اور پروٹسٹنٹوں کو ایک لڑی میں پرو دینے کے بعد یہودیوں کا جرم صلیب بھی جس پر مسیحیوں کا ایمان ہے معاف کر دیا تاکہ تورات و انجیل کے فرزند باہم مجتمع ہو سکیں لیکن ہم مسلمانوں میں سقوطِ بغداد کے بعد سے آج تک کوئی حقیقی بین الاسلامی تنظیم نہ بن سکی۔ ایک بوسیدہ تسمہ خلافتِ ترکیہ کا لگا رہ گیا تھا۔ سو وہ بھی بیسویں صدی کے ربع اول میں ٹوٹ گیا۔ ابھی کل پاپائے روم ہندوستان آئے تھے۔ اُن کی پذیرائی میں اس قدر مبالغہ کیوں کیا گیا، ہندوستان کی بلند ترین کرسیوں نے انہیں سلام عقیدت کیوں عرض کیا؟ کیا اس لئے کہ انہوں نے کچھ غربا کی مدد کی تھی، بعض اداروں کو روپیہ دیا تھا۔ نہیں، اُن سے کہیں زیادہ روپیہ تو شیخ کویت سے ملا تھا۔ پوپ کی تعظیم و تکریم صرف اس لئے تھی کہ وہ کروڑوں انسانوں کے جذباتی رہنما ہیں اور یہ خراج تحسین و احترام اُن کے واسطے سے اس اتحاد اور اُس تنظیم کو پیش کیا گیا تھا جس پر مسیحی بجا طور پر نازاں ہیں، تثلیث کی دنیا اپنے مسخ شدہ عقیدوں اور اپنی کم عیارگی کے باوجود اتفاق و اتحاد سے منظم اور توحید کی دنیا جیب و دامن میں دولتِ کونین رکھنے کے باوجود خانہ بخانہ منقسم اور پارہ پارہ

ے یعنی مسلمان قومیں مگر حق و صداقت کے داعیوں اور علمبرداروں کی حیثیت سے اُن کا جماعتی وجود محل نظر ہے۔

یا محرومی اور ایسی محرومی۔ اللہ ! اللہ ! ! اللہ !!!

حالات کا کتنا افسوس ناک کتنا دلدوز پہلو یہ ہے کہ اسلام سے جو انتساب کل تک باعثِ فخر تھا، وہی آج باعث رسوائی ہے،
چینی مت سے واقف ہیں اس مت کے ماننے والے اپنے عہدِ زوال سے پہلے پاکباز و پرہیزگار ہوتے تھے جنسی بے احتیاطیوں سے
ن درجہ پاک کہ اُن کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ لوگ بے خل و غش بادشاہوں کے حرم میں رکھے جا سکتے ہیں اور بیگمات ان سے اس درجہ
بے تکلف رہ سکتی ہیں جیسے سگے بھائیوں سے نہیں، چینیوں میں نجاست و طہارت کا مبالغہ آمیز معیار رائج تھا مثلاً بچہ پیدا ہونے پر کسی
زیز کے مرنے پر یا کسی کے شراب پی لینے پر پاکی حاصل کرنا ضروری ہوتا، اس پاکی کے لئے شہری چینیوں میں جو بہت کم تھے نہانے، لباس بدلنے
پانی کے چھینٹے دینے کا رواج عام تھا لیکن دیہی علاقوں میں جہاں چینیوں کی اکثریت بستی تھی، طہارت کی ایک شکل بہت اور وہ یہ کہ وہ کسی
مسلمان کو چھو لیتے۔ اسے بھی لئے کہ چینیوں میں نفس کشی کی خاطر گوشت خوری قطعاً ممنوع تھی اور مسلمان اس اعتبار سے اُن کے نزدیک محترم نہیں
تھے۔ لیکن مسلمانوں کے اعمالِ صالحہ کا اس درجہ احساس و یقین تھا کہ اُن کا وجود نہ صرف طاہر بلکہ مطہر بھی تسلیم کیا گیا تھا۔ ان کو
دیوتاؤں کی طرح مقدس سمجھا جانا کوئی معمولی بات نہیں ہے، حافظے پر ذرا زور ڈالئے، ایک مسلمان مسافر چینی اور لعوتی علاقوں سے ہو کر گزرتا تھا
غیر مسلم اس کی راہ میں آنکھیں بچھاتے تھے۔ محض اس لئے کہ وہ مسلمان ہے لیکن آج یہ کیا ہو گیا ہے کہ ہمارا مسلمان ہونا ہی جیسے ہماری نااہلی
یا بےوقعتی (DISQUALIFICATION) بن کر رہ گیا ہے کیا اس لئے کہ ہم سے حکومت چھن گئی ! ہرگز نہیں حکومت کی مادی قوتیں تو اخلاق
کے بل پر چلتی ہیں، وجہ صرف یہ ہے کہ ہم سیرت کے حسن سے محروم اور اخلاق سے دست کش ہو گئے ہم نے قرآن کو چھوڑ دیا۔ دوسری قوموں نے اگرچہ
قرآن سے کسبِ نور تو نہیں کیا لیکن اپنے لئے قومی اور بین الاقوامی اخلاق کے کچھ ضابطے تجربات کی بنا پر ضرور بنا لئے ہیں جن پر وہ عامل ہیں۔ وہ خدا
کے ڈر سے نہ سہی اپنی دنیوی ساکھ اکھڑ جانے کے ڈر سے ہی سہی کسی نہ کسی درجے میں انصاف و دیانت کو اپنائے ہوئے ہیں۔ ہم نے اپنے آفتاب
کو فراموشی کی تہ بہ تہ گھٹاؤں میں لپیٹ دیا لیکن اس زعم میں کہ ہم صاحبِ نور و ضیا ہیں، اطمینان سے سو رہے دوسروں نے اندھیرے میں ٹٹول
کر صراطِ مستقیم نہیں پائی تو کیا، چل تو پڑے ہیں، انہیں آفتاب نہیں ملا تو کیا، کچھ ٹمٹماتے ہوئے دیئے تو انہوں نے بنا ہی لئے جن کی روشنی خفیف
و حقیر سہی مگر ہماری تاریکیوں سے بہر حال بہتر ہے پھر ہم غیروں کی شکایت کرنے کی جگہ اپنے ہی گریباں گیر کیوں نہ ہوں ؟

عزت کب ملے گی ؟

مسلمان کو جب عزت ملے گی، دعوت ایمان کی پیروی سے ملے گی، اور جب وہ ذلیل ہوگا، قرآن کو چھوڑ دینے
سے ہوگا۔ ہم اسلام کی بلندی سے ہٹے تو تحت الثریٰ تک جا پہنچیں گے، دوسروں کے لئے درمیانی مراحل ہیں
ہمارے لئے نہیں ہیں کیونکہ ہماری غایت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینا ہے، ہم نے اللہ سے سودا کیا تھا کہ ہم جنت کے عوض
جان و مال دیتے ہیں پھر ہم نے اپنے جان و مال تو باطل کے حوالے کر دئے اور دنیا کی متاعِ قلیل پر تکیہ کر بیٹھے نتیجہ یہ کہ اب وہ متاعِ
قلیل بھی ہمارے ہاتھوں سے نکلی جاتی ہے بلکہ نکل گئی ہے اور ہم دنیوی اعتبار سے بھی ہر جگہ ناکام و نامراد ہیں۔ مسلمان دین سے ہٹ کر
دنیا بھی نہیں پا سکتا اور نہ کبھی اس نے پائی ہے۔ اسلام کی منطق یہی ہے۔

ہم مسلمانوں کی ملی حیثیت دنیا کی ہر قوم سے مختلف ہے یوں ساری دنیا ہماری ہے لیکن سوچیے تو ہمارا کوئی وطن، کوئی ملک نہیں

---

(٢) ENCYCLOPAEDIA OF RELIGION AND PURIFICATION (Jain)

ن پر ساری دنیا کے مسلمان دعویٰ کر سکیں۔ امریکہ کے سیاست داں فلسطین میں یہودیوں کو از سرِ نو بسا سکتے ہیں یہ کہہ کر کہ فرق !
ن پہلے یہودی ہی فلسطین کے اصل باشندے (ABORIGINES) تھے لیکن ہمارے لئے کون سی سرزمین ہے جس پر قومی یا نسلی
ثیت سے تمام مسلمانوں کا حق پہونچتا ہو۔ دنیا کا ہر انسان ایک قومی وجود ہے لیکن ہم جہاں کہیں ہیں اپنے عقائد و ایمانیات کی بنا پر
ر او ملت ہی کہے اور سمجھے جائیں گے اور ہمارا وجود نظریاتی اور ملی ہی رہے گا اور اگر خدا نخواستہ اسلام کا رشتہ کٹ جائے تو
ر ہماری زندگی اور اُس کا انجام معلوم! دوسری ہر حال میں روسی اور انگریز ہر حال میں انگریز رہ کر جی سکتے ہیں مگر ہماری زندگی کی سبیل
مسلمان بننے ہی میں ہے۔ یہی وہ رمز ہے جسے قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا۔

انتم الاعلون ان کنتم مومنین۔ تم سربلند رہو گے مگر شرط یہ ہے کہ ایمان پر قائم رہو۔

ہم اس حیثیت سے خوش نصیب بھی ہیں کہ دنیا کا گوشہ گوشہ ہم سے آباد ہے قطب شمالی اور قطب جنوبی کے سرے ہم ہو سکتے ہیں
بشرطیکہ ہم میں فکر و عمل کا اتحاد ہو۔ ایمان ہمیں جوڑنے والا عامل (UNIFYING FACTOR) ہے یہ منقطع ہوا تو ہم خفیف
سے صدمے سے تارِ عنکبوت کی طرح ٹوٹ جائیں گے۔ بلاشبہ مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا لیکن اگر ہم نے قرآن فراموشی کا یہ عمل
جاری رکھا تو اس دنیا کا ایک سوکھا تنکا بھی ہمارا نہیں ہے اور آخرت۔ آخرت کے متعلق کچھ کہتے ہوئے روح لرز جاتی ہے!

آپ ذرا دیر کے لئے غور کریں کہ دوسرے فرقے، مذاہب اور ممالک ہم سے کیوں چڑتے ہیں؟ کیا اس لئے کہ ہم مسلمان بڑی خوبیوں کے
لوگ ہیں؟ آج کیا، کسی دور میں بھی انسانیت کا اجتماعی ضمیر عالی ظرف اور خلیق انسانوں سے خائف یا بیزار نہیں ہوا۔ ہماری اصل
خطا یہ ہے کہ ہمارے نام مسلمانوں کے سے ضرور ہیں مگر ہم عام انسانی اخلاق سے بھی فروتر ہیں، ہم وثیقہ دار لوالیوں کی طرح آج بھی ہر آئند
و روند کے سلام کا انتظار کر رہے ہیں اور بھول بیٹھے ہیں کہ اورنگ ریاست بساطِ شطرنج کے عوض رہن بھی رکھا جا چکا۔ ہم کاغذ پر تاریخ
کے عہد رفتہ کی داستانیں لئے پھرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ساری دنیا ہمارے دعوے کے سامنے سجدہ ریز ہو جائے۔ دنیا کاغذ کے
ذخیروں اور روشنائی کی لکیروں کے سامنے نہیں جھکتی اُن زندہ و پائندہ انسانوں کی بارگاہ میں سر نیاز خم کرتی ہے جن کی روح عمل جاگ
رہی ہو۔ دنیا ماضی کی باجگزار نہیں ہوا کرتی۔ حال کی عظمتوں کو خراج دیا کرتی ہے۔

ہاں اگر ہم انسانیت کی اُس بلندی پہ بالفعل پہونچ جائیں جسے اسلام کہتے ہیں تو سارا عالم ہماری دشمنی پر کمربستہ نظر نہ آئے۔ مغربی
اقوام کو جو مادیت کی دلدل میں بری طرح پھنس گئی ہیں۔ اپنے روحانی بحران کا احساس ہے لیکن اُن کے سامنے کوئی عصری نمونہ نہیں ہے،
جس کی تقلید کر سکیں۔ لباس میں سینکڑوں پیوند دے لینے اور اونٹ کی مہار تھام کر یا دہ پا چلنے میں بجائے خود کوئی کشش نہیں ہے جو
وہ ہم قلاشوں کی پیروی کرنے لگیں۔ فقر کی ان اداؤں میں جلالت و جاذبیت اُس وقت آتی ہے جب اس ہیئت کے ساتھ فاروقی کردار
بھی ہو۔ آج کردار فاروقی کی پرچھائیاں بھی نہیں نظر آتیں ہاں ہمارے عمل نے فقر و فاقہ پر ضرور مجبور کر دیا ہے پھر مغرب ہم سے کیا سیکھے اور
خدائی نور کہاں سے اخذ کرے وہ یقیناً بجا طور پر اپنے اخلاقی افلاس کو ہمارے اخلاقی دیوالیے پن سے بہتر جانتا ہے اور دنیوی عیش کو سب
کچھ نہ سمجھ کر بھی کچھ نہ ہونے سے اچھا سمجھتا ہے۔ آخر وہ گمراہوں کو رہنمائی کیونکر سونپ دے یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ ان گمراہوں کے آبا اچھے
رہنما تھے۔ مغربی اقوام کے لئے ناممکن ہے کہ جو لوگ سیاسی، مادی اور تنظیمی و تمدنی لحاظ سے اُن سے پست تر ہیں اُن سے علم
زندگی سیکھنے آئیں پھر جب وہ دیکھتی ہیں کہ اُن کی چمک دمک دیکھ کر مسلمانوں کی رال ٹپکی پڑتی ہے۔ اور جہاں اُن کے خوانِ نعمت
سے ذرا سی بھونس نصیب ہوئی، مسلمانوں کی باچھیں کھل اُٹھتی ہیں تو اسلام کی رہی سہی وقعت بھی اُن کی نگاہوں سے گر جاتا ہے یہ!
اُن کے عوام کا حال ہے اُن کے مفکرین ہمارے اس زندگی کے تضاد کا شعور بھی رکھتے ہیں ورنہ برنارڈ شا کیوں کہتا "اسلام سب سے اچھا

مذہب ہے لیکن مسلمان سب سے بُرے لوگ ہیں" سچ پوچھئے تو ہم مسلمان کچھ نیم شعوری طور پر اسلام کے سب سے بڑے دشمن بنے ہوئے ہیں۔ ہمارا وجود ساری دنیا کے لئے رحمت کی جگہ عذاب بن کر رہ گیا ہے اور ہم اپنے نامۂ اعمال کی سیاہی میں شبانہ روز اضافہ کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ہماری گردن پر اس معصوم، اس مجبور، اس مظلوم دنیا کا خون ہے، ہمارا گنجینہ عالم واقعہ میں اور کہیں نظر آئے گا لیکن اُسے دیکھنا ہو تو آئینہ دیکھ لیجئے، ہم قرآن کے گرد کنڈلی مارے اپنا کالا گھناؤنا مکروہ پھن کاڑھے بیٹھے ہیں۔ نہ کوئی ناموس الٰہی کے اس خزانے تک آسکتا ہے اور نہ ہم خود اس سے نفع اندوز ہو سکتے ہیں۔

اہل دنیا کی بھلائی آگے بڑھنے کی رٹ لگانے پر ہو تو ہو ہماری ترقی عقب میں اور حضورؐ کے صحابہؓ کی طرف پلٹ جانے میں ہے لن یصلح اٰخر ھذہ الامۃ الا بما صلح بہ اولھا امت اسلامیہ کے دورِ متاخر کی اصلاح انہیں ذرائع سے ہو سکتی ہے جن سے اُس کے دورِ اول کی اصلاح ہوئی تھی یعنی ہر زمانے میں دین و شریعت کا دامن تھامنے ہی سے سبیل سیادت کھل سکتی ہے۔ پیچھے ہٹنے یا رجعت پسندی کا نام آتے ہی نوجوان چراغ پا ہو جاتے ہیں۔ اور فوراً یورپ کے ارتقا اور انگلینڈ کی ترقی کے گن گانے لگتے ہیں۔ اُن کو یاد دلایئے کہ آپ کا انگلینڈ تو اتنا روایت پرست اور ماضی کا غلام ہے کہ بکنگھم اور ونڈزر کاسل جیسی دقیانوسی، بے ہنگم عمارتوں کی بار بار مرمت پر کروڑوں روپیہ خرچ کرے گا کیونکہ وہ عہدِ رفتہ کی یادگار ہیں اور اُن کے ساتھ عوام کی عقیدتیں وابستہ ہیں لیکن اس کے حکمراں نئی عمارتوں میں منتقل نہ ہوں گے۔ ایک موم بتی لالٹین جو صدیوں پہلے روشنی کے لئے پارلیمنٹ میں لائی جاتی تھی وہ برقی روشنی کے اس دور میں بھی لا کر میز کے نیچے رکھ دی جاتی ہے کیونکہ اس ریت کا قدیم تاریخ سے رشتہ ہے "رجعت پسند" مسلمانوں نے بار بار حرم کی ہیئتیں بدلیں، نئے نئے نقشوں کے مطابق مسجدِ نبوی کی تعمیر کی۔ لیکن انگریز ماڈرن ہیں اور ہم اولڈ فیشنڈ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم رسم و طرز کے تحفظ پر اصرار نہیں کرتے اور اس میدان میں ہر "ماڈرن" سے بڑے ماڈرن ہیں لیکن اقدارِ عالیہ کے تحفظ پر اصرار کرتے ہیں اور اقدارِ عالیہ وہ ہیں جنہیں قائم رکھنے سے ہر دور کا انسان انفرادی و اجتماعی اعتبار سے محفوظ و مطمئن ہوتا ہے اور جنہیں نظر انداز کرنے سے ہر زمانے کا آدمی اور ہر زمانے کا معاشرہ مغموم و مضطرب ہو جاتا ہے شلاً عدالت، صداقت، وحدتِ انسانی (جو وحدتِ الٰہی کا نتیجہ ہے) وغیرہ وغیرہ ہم کسی سے پیچھے لوٹ چلنے کے لئے ان معنوں میں نہیں کہتے کہ کھجور کی کاشت کرنے لگو، اونٹ پر بیٹھو، تلوار سے لڑو، خیموں میں رہو، تہبند پہنو، لٹھ اور عمامہ استعمال کرو، ثرید کھاؤ، ہم یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ کسی کی جائداد پر ناجائز قبضہ نہ کرو، پیدل چلنے والوں کو کاروں سے کچل نہ دو۔ کسی کوریا یا ویٹ نام پر بمباری نہ کرو، دوسروں کی جھونپڑیاں گرا کر اپنے کوٹھیاں نہ بنواؤ۔ غریبوں کو ننگا کر کے خود سوٹ نہ پہنو، بھوکوں کے آگے سے تھالی نہ اُچک لو، سیاہ بازاری اور سود خوری سے اپنے ہم جنسوں پر عرصۂ حیات نہ تنگ کرو اور یہ سارے مطالبات زمان و مکان کی حدود سے بے نیاز ہیں۔ ہم کسی کی رفتار پر قدغن لگانا نہیں چاہتے لیکن رفتار کو بے راہ روی بنتے دیکھنا ہمارے لئے ناممکن ہے۔ بہت سے سیارے سریع السیر ہوتے ہیں لیکن سیاروں کا نظام جبھی قائم رہ سکتا ہے جب وہ اپنے سیر (ORBIT) کے اندر گردش کریں کہ اگر سست روی پیدا ہو آئے تو نتیجہ بربادی ہے اور صرف بربادی۔

اور ذرا اس پر غور کیجئے کہ ماضی سے ہر طرح کا تعلق توڑ لینا کیا انسان کے لئے ممکن بھی ہے؟ ارتقاء کے کس نظریے میں حیات کی سابقہ صورتیں کارفرما نہیں ہیں۔ ڈارون کا ارتقا ہو یا سپنسر، لائڈ مارگن، ایگزانڈر اور برگساں کا سب تحفظ یا سبق ——— (CONSERVATION) کے قائل ہیں فلسفے اور استعارے کی زبان بھی چھوڑیئے اور روزمرہ کے سادہ تجربات کی زبان میں سوچئے ——— راہِ راست سے بھٹک کر کسی نے کچھ فاصلے کر لیا ہو تو کیا وہ اس ڈر سے کہ لوگ رجعت پسندی کا الزام نہ دیں، آگے بڑھتا چلا جائے اور منزل کی قطعاً پروا نہ کرے یا واپس جا کر جہاں سے قدم بہکے تھے وہیں سے پھر چلنا شروع کر دے فقط سیدھی راہ پر اگر ترقی پسندی ہے

تو ہم اُس رجعت پسندی پر سو جان سے نثار جو غلط روی کی اصلاح کرتی ہے اور اگر ہم اس اصلاحی رجعت پسندی پر آمادہ ہو جائیں تو زمانے کی ترقی پسندی ہمارے آگے سرنگوں ہو سکتی ہے۔

یہاں تک جو کچھ قرآن نے ہمارے ساتھ کیا اور جو کچھ ہم نے قرآن کے ساتھ کیا اس کا ذکر ہوا۔ بحث تشنہ رہ جائے گی اگر اُن سیہ کاریوں اور ریشہ دوانیوں کا تذکرہ نہ کیا گیا جو مغرب ہمیں قرآن سے دُور رکھنے کے لئے صدیوں سے کر رہا ہے۔ ہم جانیں یا نہ جانیں وہ تو بخوبی جانتی ہیں کہ ہمارا قرآن سے وابستہ رہنا اُن کی سیاسی سربلندیوں اور خودمستیوں کی ضمانت ہے۔ ہم قرآن کے بخشے ہوئے آبِ حیات سے لذت آشنا نہیں رہے لیکن وہ تو سمجھتی ہیں کہ جہاں ہم نے اس کتاب کو خضرِ راہ بنایا ہم جہالت کے بھنور سے نکلے اور جہاں ہم جہالت کے بھنور سے نکلے مکر و سیاست کے شاداب ساحل پر اُن کا رقصِ مطلق حرام ہو جائے گا۔ قرآن میں حریت، عالمی انقلاب، اتحاد اور جہاد فی سبیل اللہ کی آیتوں کے مضمرات (IMPLICATIONS) پر ہماری نظر نہیں ہے تو کیا، مستشرقین (ORIENTALISTS) تو جانتے ہیں کہ یہ قرآنی تعلیم کسی وقت بھی امتِ مسلمہ کی، جو اگرچہ راکھ کا ڈھیر ہو چکی ہے، دبی ہوئی چنگاریوں کو شعلۂ بیدار بلکہ جنگل کی آگ بنا سکتی ہے۔ جب ایک مغربی مفکر نے کہا تھا کہ قرآن کا حرف حرف غیر اللہ کے خلاف بانگِ درا ہے اور جب تک یہ کتاب پڑھی جاتی ہے مسلمانوں کو محکوم نہیں بنایا جا سکتا تو اُس نے پورے یورپ کے احساس کی ترجمانی کی تھی۔

یورپ صلیبی جنگوں سے لے کر اٹھارویں صدی کے اواخر تک مسلمانوں کی قوت و فیروزمندی کے راز کی جستجو کرتا رہا اور آخر اس نتیجے پر پہونچا کہ قرآن سے مسلمانوں کا تعلق جو خوش نصیبی سے ضعیف ہو چکا ہے، بالکل کاٹ دیا جائے۔ آپ اس منظم سازش کی سینکڑوں شانوں میں سے صرف ایک مثال ملاحظہ کر لیں۔ لارڈ کرومر نے جب مصر پر قبضہ کیا اور حکومت کے محکمے تقسیم ہوئے تو ڈنلپ مشیرِ تعلیم بنائے گئے انہوں نے ابتداءً نہایت معصومانہ اور ہمدردانہ اعلان کیا کہ جن مکاتب میں قرآن کی تعلیم ہوتی ہے وہاں اگر ایک گھنٹہ حساب کے لئے وقف کر دیا جائے تو حکومت مالی امداد (GRANT) دے گی جب حساب شامل نصاب ہو گیا تو پھر سال بہ سال تاریخ اور جغرافیہ وغیرہ کے گھنٹے بڑھانے پر تحریص کے سبز باغ دکھائے جاتے رہے یہاں تک کہ مدارس میں اوقات کے نظام نامے پر دوسرے مضامین چھا گئے اور قرآن کا صرف ایک گھنٹہ رہ گیا۔ ابھی چند ماہ گزرے تھے کہ ایک حکم نامے کے ذریعے قرآن کو اختیاری مضمون (OPTIONAL SUBJECT) قرار دے دیا گیا بلکہ دیکھتے ہی دیکھتے قرآن کے پرچے میں حاصل کئے ہوئے نمبر اصل قرآن سے جس پر کامیاب یا ناکام ہونے کا انحصار ہوتا ہے، علیحدہ کر دئے گئے یعنی وہ ایک زائد (ADDITIONAL) مضمون بنا کر رکھ دیا گیا تاکہ قرآن تعلیمی کیریئر کے لئے بے اثر اور زندگی کے لئے غیر ضروری ہو جائے۔ یہ ہے استعماری طاقتوں کا تمدنی زہر (POISON) جسے ہم نے نوشینہ جان کر خدایانِ باطل کو دعائیں دی ہیں اور یہ ہے اس کا ثبوت کہ ہم کس بھولے پن سے دجال کی روٹی دیکھتے ہی جاقبت کا سودا کر بیٹھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ دجال دینداری کے معاشی مسئلے کا حل پیش کر رہا ہے، اس پر لطف یہ ہے کہ جب ہم روٹی کے لئے ہاتھ پھیلاتے ہیں تو وہ ہاتھ کھینچ لیتا ہے اور روٹی پھر اُسی کی جھولی میں پہونچ جاتی ہے، نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم، اور سچ پوچھئے تو وصالِ صنم کے بے خدا اُمیدواروں کا ہمیشہ یہی حال ہوا ہے۔

یہ بھی تاریخ انسانی کی طنزِ بلیغ ہے کہ قرآن کی، جو مومنانہ زندگی کا دوسرا نام ہے، ضرورت پر بحث کرنے کی ضرورت آپڑی ہے ہر شخص دیکھ رہا ہے کہ قرآن ہمارے نظام نامۂ شب و روز سے بے دخل ہو چکا ہے اور مسلمان ایک طوفان کی موجوں پر زیر و زبر ہوتے ہوئے آبشار کی طرف بڑھ رہے ہیں! آنکھیں نہ بند کیجئے، آنکھیں بند کرنے سے نہ طوفان فرو ہوگا نہ آبشار اپنی جگہ بدل دے گا۔ اس طوفان کی راہ میں ایک چٹان ہے سراسیمگی سے نہیں ہوش و حواس سے کام لے کر اپنی چٹان پر پاؤں جما دیجئے اور کھڑے ہو جائیے خذ الکتٰب

بقدر تو یہ سوچ کر بھی اپنے آپ کو تسکین نہ دیجئے کہ دنیا کی دنیا اعلیٰ اقدار سے محروم ہے اور ہمیں نہیں، ساری دنیا تباہ ہو جائے گی نہیں، دنیا آپ کی تباہی کا تماشا دیکھ کر تباہ ہو گی اور آپ اس کے سامنے اپنی خفت نہ چھپا سکیں گے بلکہ تباہ ہو جانے کے بعد بھی چین نہ کیونکہ بڑی حد تک دنیا کی تباہی کے مجرم بھی آپ ہی ٹھیریں گے۔ دنیا کی تباہی میں ابھی دیر ہے کیونکہ اس کے پاس مادی وسائل ہیں اور اگر اپنا مقصدِ وجود نظر انداز کر کے دنیوی وسائل کی تحصیل و تعمیر میں مشغول ہو جائیں تب بھی مغربی ایجادات کی تیز رفتاری کا مقابلہ نہ کر سکیں گے کیونکہ ہم یورپ سے صدیوں پیچھے ہیں۔ سچ پوچھئے تو اس میدان میں ہمارا اُن کا مقابلہ نہ کیمیائی اور تجربی وار کا ساتھ اُن کے پہلو بہ پہلو آنا ہی محال ہے چہ جائیکہ اُن کی امامت کرنا۔ ایک اپنی زندگی کا ثبوت دینا بلکہ اوروں کو زندگی کا صالح پیغام بخشنے کا ایک اور صرف ایک راستہ ہے قرآن کی روشنی میں اعلیٰ اقدار و اخلاق کی تعمیر، تکمیل اور تبلیغ —— جو اعمال ہم اب تک کاشت کرتے رہے اُن کی فصل ہم نے بہت کاٹ لی اب جن اعمال کا حکم قرآن دیتا ہے اُن کی تخم ریزی کے سوا چارہ نہیں۔ وہ دور اول جب ہمیں اوجِ بلند حاصل تھا اور دنیا کی باگیں ہمارے ہاتھوں میں تھیں ہمارے کانوں میں نہ جانے کس نے پھونک دیا کہ دنیوی امارت، وجاہت، طنطنہ و تمکنت اور سطوت و ہیبت کا بھی ناٹک اسلامی حکومت کے وقار و استحکام میں معین ہو گا اور ہم نے اس آواز نفس کو خلوصِ دینی کے پردے میں روم و ایران کے انہیں فرسودہ و شکست خوردہ ہتھکنڈوں کو استعمال کرنا شروع کر دیا لیکن اس نظریہ کا مہتمم بانشان جدوس کی فطرت ہی یہ ہے کہ کچھ دنوں زندگی کی شاہراہ پر چلتا ہوا ایک اندھی گلی (BLIND LANE) میں جا نکلتا ہے اور یہ اندھی گلی اپنی آغوش میں عیش و رنگ اور نشہ و نغمہ کا سوانگ لیتے ہوئے موت کے تاریک غار پر ختم ہو جاتی ہے یہی کچھ ہمارے ساتھ ہوا اور ہمیں زندگی کا اسٹیج خالی کر دینا پڑا۔ عروج و زوال کا ڈراما دوسری قومیں کھیلنے لگیں اور پھر وہی چکر چل پڑا جسے ختم کرنے کے لئے اسلام آیا تھا۔

خیر وہ آزمائش بھی گزر گئی اور گو ہم اس میں پورے نہ اترسکے تاہم مکمل تباہی سے بھی بال بال بچ گئے لیکن اب ایک اور غلط فہمی دامن گیر ہے یعنی ہماری اکثریت اب بھی یہی سمجھتی ہے کہ مادی طاقت ہاتھوں سے نکل گئی، اس لئے ہم زوال پذیر ہو گئے حالانکہ معاملہ اس کے برعکس تھا اور ہم مادیات میں ڈوب جانے سے زوال پذیر ہوئے تھے، کاش ہم عقل کے ناخن لیتے اور سمجھتے کہ معاش و مادہ کی دوڑ میں قوموں کی ہمسری کا امکان ختم کر کے قدرت نے ہم پر ایک احسان کیا ہے اور شاید ہمارے حال پر ترس کھا کر اس آزمائش سے بچا لیا گیا ہے جو اگلوں کو پیش آئی تھی۔ پہلے ہمارے سامنے تین راستے تھے، حصول دنیا، تحصیل آخرت اور تباہی و گمنامی، —————— دین سے بے نیاز ہو کر دنیا بنانے کا راستہ بند ہو چکا ہاں آخرت بنانے کا راستہ یعنی اخلاقی سربلندی و امتیاز حاصل کرنے کا ذریعہ کھلا ہوا ہے اور شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جب یہ امتیاز حاصل ہو جائے گا تو ہم دنیا میں بھی اپنے جائز حصے سے محروم نہ رہیں گے۔ آج دنیا کی کسی قوم کا یہ مشن نہیں ہے کہ اخلاقی سربلندی کا امتیاز حاصل کیا جائے اور یہ میدان ہمارے لئے بہت کا قرن خالی پڑا ہے، بہتر ہے کہ ہم اسے دوبارہ مسخر کر لیں۔ ذی شعور قومیں اپنے تلخ تجربوں سے شیریں ثمر حاصل کرنے کا ہنر جانتی ہیں اور اگر حیات پذیری کی صلاحیت باقی ہے تو ادبار امروز کو بھی اقبالِ فردا کا سرنامہ بنا لیا کرتی ہیں۔

قرآن اس وقت ہمارے درمیان دو اہم معرکے انجام دے سکتا ہے، وحدت افکار و وحدت اعمال دین کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس پر سب متفق ہوں لیکن الحمدللہ کہ قرآن کے سلسلے میں آج بھی کوئی اختلاف نہیں ہے۔ فروعات و نعائد کی ماری ہوئی امت بکھری ہوئی اتفاق و اتحاد کی شیرازہ بندی آیاتِ قرآنی کے تانے بانے کے ہی کی جاسکتی ہے۔ جس دن ہم نے قرآن کی کسوٹی چھوڑی، فکری اختلافات سر اٹھانے لگے۔ یہ اندیشہ ہمارا رسول اللہؐ سے زیادہ کسے ہو سکتا تھا چنانچہ یہی وجہ تھی کہ دنیا سے پردہ فرماتے وقت استفانا حضورؐ نے

۵
آزمودہ دواؤں کا مرکب
انالجین
سردرد۔ کمر کا درد۔ دانت کا درد
ایام۔ انفلوئنزا اور ہر قسم کے دوسرے درد کے لئے
یقینی زود اثر اور بے ضرر علاج ہے
Opal

محمد نعیم ندوی صدیقی
رفیق دارالمصنفین اعظم گڈھ

علامہ شبلی — دارالمصنفین اور بھوپال

علامہ شبلی نعمانی علیہ الرحمتہ کے حسین خوابوں کی حسین ترین تعبیر دارالمصنفین اور خطہ بھوپال کے درمیان جو گہرے تاریخی روابط ہیں۔ ان سے آج کوئی بھی اہل نظر انکار نہیں کر سکتا۔ اور ——— جب بھی علم وفن کی ماجدانی دارالمصنفین کی تاریخ لکھی جائے گی وہ بھوپال کے ذکر کے بغیر قطعی نامکمل کہلائے گی کیونکہ ——— اپنی گوناگوں علمی خدمات کی بنا پر آج دارالمصنفین نے عالمی شہرت کی جو فلک بوس عمارت تعمیر کرلی ہے، اس کا سنگ اساسی درحقیقت بھوپال ہی ہے جس طرح بنیاد کے بغیر عمارت وجود میں نہیں آیا کرتی اسی طرح اگر بھوپال کے علم پرور حکمرانوں نے آگے بڑھ کر دارالمصنفین کے قیام میں دلچسپی نہ لی ہوتی تو ممکن ہے کہ شبلی کا یہ خواب صرف خواب و خیال ہی رہتا۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب سرزمین بھوپال ایک خودمختار ریاست (STATE) تھی اس کی اپنی فوج اور پولیس تھی اور سیاست کا آئین بھی آزاد تھا۔ علامہ شبلی کے زمانہ میں تخت حکومت پر ایک جانشین خاتون سلطان جہاں بیگم جلوہ افروز تھیں، جو بقول شبلی اپنی وسعت معلومات خوش تقریری، فصاحت لسانی اور نکتہ سنجی میں آپ ہی اپنی نظیر تھیں۔ ان کی فیاضی سے اس عہد کا کوئی بھی قومی ولی ادارہ محروم نہ رہا۔ ندوہ، دیوبند، علی گڑھ، انجمن ترقی اردو آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس وغیرہ سب ان کے ابر کرم سے سیراب ہوتے۔ خدا بخشے مرحومہ خود بھی صاحب تصنیف اہل قلم تھیں اور علم دوستی اور علماء نوازی اُن کی سیرت کے درخشاں ابواب ہیں ———

علامہ شبلی نے ——— جو اپنے گوناگوں علمی کمالات اور کارناموں کی بدولت تاریخ علم وادب میں زندہ جاوید ہیں ——— تقریباً نصف صدی تک داد تحقیق دینے کے بعد عمر کے آخری حصہ میں سرور کونین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے دربار میں اپنے "اخلاص وعقیدت کا نذرانہ" پیش کرنے کا ارادہ کیا، لیکن راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ سرمایہ کی نایابی تھی ———

چنانچہ علامہ شبلی نے جنوری سنہ ۱۹۱۲ء کے الندوہ میں قوم کے نام یہ اپیل شائع کی کہ جو اس سعادت کو حاصل کرنا چاہتا ہو وہ دست تعاون دراز کرے۔ منشی محمد امین زبیری نے جو ہر ہائینس

نواب سلطان جہاں بیگم مرحومہ کے لٹریری سکریٹری تھے یہ اپیل دیکھ کر سرکار سے کونین کی اس لٹتی ہوئی دولت سے اپنے دامن کو بھر لینے کی درخواست کی اور اس علم نواز خاتون نے بسر و چشم اس کو قبول کر کے مصنف علام کو دوسرے آستانوں سے مستغنی اور تمام افکار سے بے نیاز کر دیا۔

منشی ابن زبیری ——— مرحوم کا ذکر نوک قلم پر آ گیا ہے تو چند سطور ان کے متعلق بھی گوارا کر لی جائیں زبیری مرحوم ——— کو علامہ شبلی سے غایت درجہ عقیدت تھی۔ چونکہ وہ ریاست کے شعبہ تاریخ کے مہتمم بھی تھے اس لئے وہ ریاست کی تصانیف و تالیفات کے سلسلہ میں علامہ مرحوم سے مشورہ لیتے رہتے تھے، سیرت کی امداد کرانے میں موصوف کی جد و جہد کو بڑا دخل تھا۔ علامہ شبلی کے مطبوعہ مکاتیب میں زبیری کے نام ۱۳ خطوط پائے جاتے ہیں، ان کے مطالعہ سے بھی دونوں کے تعلقات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

لیکن ——— اپنے ممدوح (علامہ شبلی) کی رحلت کے بھی ایک عرصہ کے بعد جب مولانا سید سلیمان ندوی کی شہرہ آفاق تصنیف "حیات شبلی" منصۂ شہود پر آئی اور اس نے علمی دنیا میں دھوم مچا دی تو ——— انہی زبیری مرحوم نے یکدم "قلب ماہیت" اختیار کر لی اور نہ صرف سید صاحب علیہ الرحمۃ سے انتہائی بدظن ہو گئے بلکہ علامہ شبلی کی ثقاہت کو مجروح کرنے کی فکر ان پر مسلط ہو گئی۔ بظاہر تو انہوں نے یہ شکوہ کیا ہے کہ "حیات شبلی" کے مصنف نے سوانح نگاری کا حق ادا نہیں کیا ہے اور شبلی کی زندگی کا صرف ایک رُخ دکھایا ہے۔ تصویر کے دوسرے رُخ سے ——— جسے زبیری "رنگین زندگی کا نام دیتے ہیں ——— چشم پوشی کی ہے۔

مگر ——— اہل نظر خوب جانتے ہیں کہ شبلی کی "رنگین زندگی" سے اغماض کا الزام سید صاحب پر صرف برائے الزام ہی ہے، ورنہ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ زبیری مرحوم کے بار بار اصرار کرنے پر بھی سید صاحب نے "حیات شبلی" کا مسودہ ان کو دیکھنے کو نہ بھیجا۔ بس ——— اسی پر ہو کر زبیری صاحب نے اپنی بقیہ عمر شبلی و سلیمان ر کی مخالفت اور ان پر طنز و تعریض کرنے میں گزاری عبدالحق صاحب نے جو خود کو حالی اسکول کا نمائندہ خ تھے۔ منشی محمد امین زبیری کی حوصلہ افزائی کی۔

خیر ——— اس طویل جملۂ معترضہ کے بعد موضوع کی طرف واپس آتا ہوں۔ زبیری صاحب کی تحریک پر علیا حضرت نواب بیگم آف بھوپال نے سیرت النبی کی کے لئے دو سال تک دو سو ماہوار امداد دینا منظور کر مولانا شبلی نے مئی ۱۹۱۲ء کے الندوہ میں اس خوش خ اعلان کرتے ہوئے لکھا۔

"مجلس تالیف سیرت نبوی کے لئے چندوں کے وصو کرنے کی جو مختلف تدابیر کا اعلان کیا گیا تھا، ا زبیدہ وقت کی فیاضی نے ان سب کو منسوخ کر (حیات شبلی ص۴۰۶)

اور ——— مربی نفس نے امداد جاری کرتے جو الفاظ اپنی زبان گہر افشاں سے کہے وہ ان کی علم اور رسول اکرمؐ سے ان کی شیفتگی کی زندہ تصویریں ہیں۔ ی آج کے بہت سے مسلم حکمرانوں کے لئے تازیانہ عبرت "۔ چونکہ اردو میں اس وقت تک آنحضرت صلعم کی کوئی مفصل اور مستند سوانحعمری موجود نہیں ہے اس لئے جب مجھے معلوم ہوا کہ شمس العلماء مولانا شبلی جو تاریخ اسلام کے ایک باکمال اور مستند عالم ہیں۔ سیرت نبوی مرتب کرنا چاہتے ہیں لیکن مالی امداد سے مجبور ہیں، اور انہوں نے ایک اپیل امداد کے لئے شائع کی ہے میں نے اس اپیل کو دیکھا اور افسوس ہوا کہ ایسی ضروری اور مذہبی تصنیف کے لئے پبلک سے اپیل کرنے کی نوبت پہونچی ہے میں نے ان کا مطلع کیا وہ

فوراً کام شروع کر دیں اور جس قدر روپیہ
کی اپیل کی گئی ہے وہ میں دوں گی، لیکن
اپیل میں ان کتابوں کے متعلق ذکر نہ تھا
جو تالیف سیرت نبوی میں ضروری تھیں،
جب حمید اللہ خاں کو یہ ضرورت معلوم
ہوئی تو انہوں نے اس ثواب میں حصہ لینے کے
لئے فوراً دو ہزار روپیہ خرید کتب کے لئے مولانا
موصوف کے پاس بھیج دئے اور اجازت دی
کہ جس قدر مزید کتابوں کی ضرورت ہو وہ
بھی خرید لی جائیں اور ان کی قیمت ادا کی
جائے ——"

(بیگمات بھوپال ص ۲۹/۱۹۲)

اس طرح —— اس علم پرور خاتون نے
شاہ علم و تحقیق کو اتنا یکسو اور مطمئن کر دیا تھا کہ اس کے
، وہ جو ماہواری چندے اور یکمشت رقمیں موصول ہوتی تھیں
بس کر دیا گیا کہ اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی، چنانچہ علامہ
حوم ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"—— ماہواری چندے اور یکمشت رقمیں
بہت سی آئیں، میں نے سب واپس کر دیں
لوگوں کو شکایت ہے کہ اس سعادت میں ہمیں
موقع کیوں نہیں دیا جاتا"

مصارف کی طرف سے مطمئن ہو کر علامہ شبلی نے سیرت
نبوی کی تالیف شروع کر دی، لیکن —— تحقیق و تدقیق، کتب
حدیث و رجال کی چھان بین میں کام اندازہ سے بڑھ گیا
اور اندیشہ ہونے لگا کہ یہ کام دو سال کی مقررہ مدت میں مکمل
نہ ہو سکے گا، چنانچہ مئی ۱۹۱۳ء کے اواخر میں علامہ مرحوم
جب بمبئی جاتے ہوئے بھوپال میں اترے تو شرف باریابی
حاصل کر کے صورت حال کو نواب صاحبہ سے عرض کیا، مرحومہ
نے بغور سن کر فرمایا۔

"آپ مطمئن رہئے جو مصارف ہوں گے وہ میں
دوں گی ——"

اور پھر —— دو برس پورے ہونے سے
قبل ہی مرحومہ نے ۳۰ دسمبر ۱۹۱۳ء کو اپنی امداد کی مدت تا
تکمیل کتاب بڑھا دی بقول زبیری "سرکار عالیہ کی اس فیاضی
اور جوش و حوصلہ سے مولانا شبلی پر ایک خاص اثر ہوا اور ——
اسی اثر کے نتیجے میں ۔ ار مئی ۱۹۱۴ء کے خط میں منشی زبیری کو
ایک قطعہ لکھ بھیجا جو یہاں ذیل میں درج ہے۔

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں بہر صورت
کہ ابر فیض سلطان جہان بیگم زرافشاں ہے
رہی تالیف و تنقید روایات تاریخی
تو اس کے واسطے حاضر مرا دل ہے مری جاں ہے
غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل
کہ جن میں اک فقیر بے نوا ہے ایک سلطاں ہے

ہاں —— مرحومہ سے علامہ شبلی کی جس ملاقات کا
ابھی اوپر ذکر ہوا اس میں نواب بیگم نے یہ بھی کہا کہ "آپ کی صحت تو
اتنی خراب ہے کہ دو دو وقت آپ کھانا نہیں کھاتے، اگر آپ نہ
رہے تو کتاب کیونکر پوری ہوگی"
—— مولانا نے فرمایا "کتاب ضرور پوری ہوگی، میں نے
دو آدمی تیار کر لئے ہیں، حمید الدین اور سید سلیمان، وہ پوری
کریں گے" (بیگمات بھوپال ص ۵۰/۲۹۶)

مولانا شبلی کی آرزو تھی کہ بھوپال کی یہ امداد مستقل ہو جاتی تو
سلسلہ سیر کا جو ایک طویل خاکہ ذہن میں ہے اس کی تکمیل کی طرف سے
بھی اطمینان خاطر ہو جاتا چنانچہ زبیری کو ۳۰ جنوری ۱۹۱۴ء
کے خط میں لکھتے ہیں۔

"سیرت کی یہ قسم بھی مستقل ہو جاتی تو بہت اچھا تھا یعنی اس کی تصنیف کا مستقل سلسلہ قائم ہو جاتا، کانوں میں بھنک تو ڈال دیجئے، یہ وسیع سلسلہ ہے، مثلاً سیر الصحابہ، سیر ازواج پیغمبر علیہ السلام وغیرہ وغیرہ"

(مکاتیب شبلی صفحہ $\frac{۲۵۵}{۱}$)

لیکن ——— اسی سال کے اواخر میں علامہ مرحوم راہی عالم جاوداں ہو گئے اور ان کی زندگی میں اس آرزو کی تکمیل نہ ہو سکی، مگر پھر جب ——— سرکار عالیہ کی رحلت کے بعد نواب حمید اللہ خاں سریر آرائے حکومت ہوئے تو علامہ مرحوم کی یہ امید پوری ہو کر رہی اور بھوپال کی امداد دار المصنفین کے نام منتقل ہو گئی۔ جس سے دس جلدوں میں سلسلہ سیر الصحابہ کی تکمیل ہوئی۔

یہاں اس امر کا ذکر بھی غالباً بے محل نہ ہوگا کہ اگرچہ علامہ مرحوم نے ریاست بھوپال سے امداد کی درخواست کی تھی اور اس کے وہ مرتے دم تک شکر گذار رہے۔ تاہم اس عالم میں انہوں نے اپنی خودداری کو کبھی مجروح نہیں ہونے دیا، چنانچہ علماء کی ایک جماعت نے علامہ مرحوم کی سیرت النبیؐ کو بغیر دیکھے پڑھے پورے ملک میں یہ پروپیگنڈہ شروع کر دیا کہ اس کے مضامین اہل سنت کے مسلمہ عقائد کے خلاف ہیں، اس مخالف پروپیگنڈے سے خطرہ لاحق ہوا کہ ممکن ہے کہ نواب بیگم بھی اس سے متاثر ہوں، چنانچہ ایک خط میں علامہ شبلی لکھتے ہیں۔

"یہ معلوم ہے کہ میرا کام رک نہیں سکتا میں خود مصارف کا متکفل ہو سکتا ہوں اس کے علاوہ جس ریاست سے خواہش کروں اعانت کے لئے تیار ہوگی ———"

(مکاتیب شبلی صفحہ $\frac{۲۶}{۱۴}$)

علامہ مرحوم کے اس دار فانی سے رحلت فرما جانے کے بعد جب ان کے لائق تلامذہ نے اپنے استاد کے منصوبے کے مطابق دار المصنفین کی داغ بیل ڈالی تو سب سے اہم مرحلہ سیرت کی تکمیل کا تھا، جس کی صرف دو ہی جلدیں علامہ مرحوم لکھ سکے تھے۔ علاوہ ازیں بھوپال کی امداد کے منقطع ہو جانے کا اندیشہ تھا، لیکن ——— یہ اندیشہ اس وقت پانی کے بلبلے کی طرح ہوا ہو کر ثابت ہوا، جب مرحومہ ہز ہائینس نے خود ہی مولانا حمید الدین فراہیؒ اور حضرت سید صاحبؒ کو اس سلسلہ میں گفتگو کرنے کے لئے بھوپال طلب کیا اور ان کے بار بار ہونے پر اس اہم کام کی تکمیل کے لئے وعدہ افزائی کرتے ہوئے فرمایا۔

"اطمینان کے ساتھ کام جاری رکھا جائے اور جس امداد کی ضرورت ہو فوراً درخواست کی جائے"

چنانچہ ۱۹۱۸ء میں سیرت النبیؐ کا پہلا حصہ بڑے تزک و احتشام کے ساتھ اہل نظر کے سامنے آیا اور جب مرحومہ کے سامنے وہ پیش کیا گیا تو انہوں نے پڑھتے ہی عقیدتمندانہ لہجہ میں کہا۔ "یہ تو بڑا کام ہوا ———"

اور پھر ——— اس کے بعد بھوپال کے سایہ عاطفت میں دار المصنفین ترقی کی شاہراہوں پر تیزی سے گامزن ہو گیا ——— مرحومہ نواب بیگم کو جب سیرت کی پہلی جلد کے ملنے پر حضرت سید صاحب کی رپورٹ سے علم ہوا کہ دار المصنفین نے نہ صرف سلسلہ کی تکمیل کر لی ہے بلکہ اس کے علاوہ سیرت عائشہؓ، سیر الصحابہ، اور سیر الصحابیات وغیرہ بھی مکمل کر لی ہیں، لیکن وہ زیور طبع سے آراستہ ہونے کے لئے کسی چشم فیاض کی منتظر ہیں، تو ——— موصوفہ نے اسی وقت یہ حکم لکھا کہ

"——— تین ہزار روپے مولوی سید سلیمان ندوی کو بہ شکریہ کتاب سیرۃ النبیؐ دیئے جائیں تاکہ ایسی کتب ہائے خیر کا سلسلہ جاری رہ کر قوم کو استفادہ ہو۔" (بیگمات بھوپال صفحہ $\frac{۱۵}{۱۲}$)

اس کے بعد ——— دار المصنفین ریاست بھوپال کے علم نواز حکمرانوں کی قومی فیاضیوں کے خوان کرم سے برابر بہرہ اندوز

...نا اور دارالمصنفین ہی پر کیا منحصر ہے ——— مسلمانانِ ...ی شاید کوئی تعلیمی تحریک ایسی نہیں۔ جس کو ریاست بھوپال ...مالی امداد نہ ملی ہو۔

سید صاحب علیہ الرحمتہ سیرت النبی کی جلد اول (طبع دوم) ...دیباچہ میں بھوپال کی اس فاضل حکمراں کو خراج تحسین وعقیدت ...کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

"——— فرمانروا خواتین اسلام نے جو مذہبی کارنامے
اب تک انجام دئے ہیں۔ آئندہ مؤرخ اس
کارنامہ (تصنیف سیرت کے لئے امداد۔ ن ص م)
کو اُن سب سے بڑا قرار دے گا کہ اس کا تعلق
اس ذات اقدس سے ہے جو اسلام کی تاریخ
میں کائنات کی سب سے بڑی ہستی تھی۔"

(دیباچہ سیرت طبع دوم ص ۲)

پھر ——— جب ہندوستان کی تمام خود مختار ...ستیں "پٹیل گردی" کی نذر ہو گئیں اور بھوپال کا انضمام ...ق بھی دیگر ریاستوں کی طرح ہندوستان کے ساتھ ہو گیا ——— ظاہر ہے ——— خود مختاری ختم ہو جانے کی ...سے ریاست خود ہی داخلی مشکلات سے دوچار ہو گئی تھی، ...صورت میں دارالمصنفین کی امداد کا سلسلہ منقطع ہونا فطری ...لازمی تھا، اور ——— وہ بند بھی ہو گئی، لیکن ——— ...مورخ بھوپال کی اس معارف پروری کو نظر انداز نہیں ...سکتا۔

سرزمین بھوپال سے دارالمصنفین کے انہی قدیم روابط ...کا نتیجہ تھا کہ جب ۱۹۶۵ء میں اپنا پچاس سالہ جشن سیمیں منانے ...کا فیصلہ کیا تو ——— ادارہ کے اراکین نے اس میں شرکت ...کے لئے موجودہ علیا حضرت نواب ساجدہ سلطان سے درخواست ...جسے انہوں نے شرف قبول بخشا، اور اتنے دور دراز کا سفر ...کے نہ صرف اپنے اسلاف کی علم نوازی کی روایت کو زندہ ...بلکہ اپنی علم دوستی کا ثبوت دیتے ہوئے چھ ہزار کا عطیہ بھی دیا۔

محترمی شاہ معین الدین صاحب ندوی نے ان کی خدمت میں جو سپاسنامہ پیش کیا تھا اس میں انتہائی نپے تلے انداز میں فرمایا کہ۔

"اس لئے یہ (بھوپال کی امداد برائے تصنیف
سیرت۔ ن ص م) وہ بنیادی پتھر ہے، جس
پر دارالمصنفین کی عمارت تعمیر ہوئی اور جب تک
وہ قائم ہے اس کے در و دیوار پر دارالمصنفین کا
نام ثبت رہے گا ———"

کاش! آج کی دنیا کے مسلم حکمران بھی علوم دینی کی خدمت میں حسب استطاعت حصہ لیں اور دینی مراکز کو علم دین کی خدمت کے لئے ہر طرح سے مطمئن کر دیں:

(صفحہ ۱۵ کا بقیہ)

حقیقت یہ ہے کہ احادیث و روایات میں جو تضاد و اختلاف نظر آتا ہے۔ وہ اکثر ان کے موقع و محل، وقت و زمانہ، تقیید و اطلاق، تخصیص و تعمیم اور ناسخ و منسوخ وغیرہ کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ ہوتا ہے، جس سے منکر حدیث غلط فائدہ اٹھاتے ہیں۔ امام طحاوی نے ان سب پہلوؤں پر اس کتاب میں بحث کی ہے۔ لیکن طوالت کے خوف سے ان کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔

(مولوی ضیاء الدین اصلاحی
رفیق دارالمصنفین)

شبیر احمد خاں غوری

اسلام میں علمی سرگرمیوں کا اجمالی جائزہ

(پہلی چار صدیاں)

الف ۔ اسلام اور علم و حکمت کی ہمت افزائی

اسلامی آئیڈیالوجی کی رو سے خلاق کائنات نے انسان کو نعمت وجود (تخلیق) سے نوازنے کے بعد سب سے پہلے "علم اسما کی دولت سے مالا مال کیا اور یہ وہ دولت تھی جس سے ملائکہ بھی تہی دامن تھے ۔ قرآن کہتا ہے :۔

وعلم آدم الاسماء کلها ثم عرضهم علی الملائکة فقال انبئونی باسماء هؤلاء ان کنتم صادقین ۔ قالوا سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العزیز الحکیم ۔

اور اس نے (اللہ تعالیٰ) نے آدم کو سب (چیزوں کے) نام سکھائے ۔ پھر ان کو فرشتوں کے سامنے کیا اور فرمایا کہ اگر تم سچے ہو تو مجھے ان کے نام بتاؤ ۔ انھوں نے کہا تو پاک ہے ۔ جتنا علم تو نے ہمیں بخشا ہے اس کے سوا ہمیں کچھ معلوم نہیں ۔ بے شک تو توانا (اور) حکمت والا ہے ۔

اسی آئیڈیالوجی کا نتیجہ تھا کہ اسلام نے پہلے سے "عقلیت" کی اہمیت پر زور دیا ۔ قرآن اپنے مخاطبین سے عقل و فہم و تدبر کے استعمال کا بار بار مطالبہ کرتا ہے ۔" افلا تعقلون " " افلا یتدبرون " " اولم یتفکروا " اس کی دعوت کا عام جزو ہے ۔ اسی معقولیت پسندی کی تعلیم کا نتیجہ ہے کہ وہ کورانہ تقلید کو جو امم ماضیہ میں عام تھی ، شرک سے تعبیر کرتا ہے ۔ اس کے دستور حیات میں سب سے بڑا گناہ ہے اور جسے وہ کسی صورت میں نظر انداز نہیں کر سکتا ۔ چنانچہ اس کورانہ تقلید کی مذمت کے سلسلے میں قرآن پچھلی مذہبی برادریوں کے بارے میں کہتا ہے ۔

" اتخذوا احبارهم و رهبانهم اربابا من دون الله "

انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے علماء اور راہبوں کو (باعتبار طاعت کے) رب بنا رکھا ہے ۔

کیونکہ علم و حکمت کے ان خود ساختہ اجارہ داروں نے خدا کے بندوں کو اوہام باطلہ کا شکار بنا رکھا تھا ، جن کے بار گراں سے ان کی مضطرب انسانیت دبی جا رہی تھی ، مگر نکل نہ سکتی تھی ۔ جس طرح وہ سوسائٹی کے جھوٹے ٹھیکہ داروں کی معاشی دستبرد سے زبوں تھی ، لیکن راہ مفر نہ تھی ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا انسانیت پر بڑا احسان ہے کہ حضور نے اسے اپنے ہی بنی نوع کا

ذہنی ومعاشی غلامی سے آزاد کرایا۔ قرآن آپ کے بارے میں کہتا ہے :۔

ویضع عنہم اصرہم والاغلال التی کانت علیہم ۔ اور ان لوگوں پر جو بوجھ اور طوق تھے اُن کو دُور کرتے ہیں ۔

پھر اسلام نے اقداریات کا جو نقشہ کھینچا ہے، اُس میں علم وحکمت کو زندگی کی "قدر اعلیٰ" (خیر کثیر) قرار دیا ہے :۔

" ومن یوت الحکمۃ فقد اوتی خیراً کثیراً " ؛ اور (ہر بیع قریہ ہے) جس کو حکمت مل جائے اُس کو بڑی بھلائی (خیر کثیر) مل گئی ۔

لہٰذا وہ دوسرے سماجوں کی طرح سوسائٹی کی تقسیم نسلی امتیاز یا مال و دولت کے اصول پر نہیں کرتا، بلکہ دانائی اور نادانی کی بنیاد پر کرتا ہے :۔

قل ھل یستوی الذین یعلمون والذین لایعلمون۔ آپ فرما دیجئے کیا علم والے اور جہل والے (کہیں) برابر ہو سکتے ہیں

اُس کے یہاں سوسائٹی میں بلند ترین مقام دیوتاؤں کی ذرّیت اولاد یا اہل ثروت کو حاصل نہیں ہے، بلکہ " خدا سے ڈرنے والوں " کو ہے

" ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم " ان کے نزدیک تم سب میں بڑا شریف وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو

اور یہ تقویٰ اور خوف وخشیت الٰہی صرف اہل علم ہی کا حصہ ہے :۔

" انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء " اللہ تعالیٰ سے اُس کے بندوں میں سے صرف علماء ہی ڈرتے ہیں۔

اس لئے اسلامی تعلیم کی رو سے سخاوت عظمیٰ اور سب سے بڑی نعمت صرف "علم" ہے۔

(ب) عہد نبوی میں علم وحکمت کا آغاز

اسلام ایسے ملک میں مبعوث ہوا جہاں کے باشندوں کو اپنے علم پر نہیں، بلکہ جہل پر ناز تھا۔ چنانچہ ایک جاہلی شاعر کا قول ہے :۔

الا لا یجہلن احد علینا فنجہل فوق جہل الجاہلینا

(خبردار، کوئی ہم سے جہالت کے ساتھ نہ پیش آئے ورنہ ہم جاہلوں سے بڑھ کر جاہل ہیں)

لیکن اللہ رب العزت نے ایسے سماج کی قلب ماہیت کے لئے کسی با جبروت شہنشاہ کو نہیں بھیجا، بلکہ "معلم کتاب وحکمت" کو مبعوث فرمایا۔ قرآن کہتا ہے۔

لقد من اللہ علی المومنین اذ بعث فیہم رسولاً من انفسہم یتلو علیہم آیاتہ ویزکیہم ویعلمہم الکتاب والحکمۃ وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین ۔

حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر احسان کیا جبکہ اُن میں اُن ہی کی جنس سے ایک ایسے پیغمبر کو بھیجا کہ وہ اُن لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور اُن لوگوں کی صفائی کرتے رہتے ہیں اور ان کو کتاب اور حکمت کی باتیں بتلاتے رہتے ہیں اور بالیقین یہ لوگ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔

اس معلم برحق نے اپنے پیرووں پر جو دستور حیات فرض کیا، اُس میں حصول علم بھی ہے، چنانچہ آپ کا ارشاد ہوتا ہے :۔

" طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم و مسلمۃ "

اپنے جاں نثاروں کو حکم دیا کہ اس متاع بے بہا کی تلاش میں "چین" (انتہائے عالم) تک کے سفر سے دریغ نہ کریں :۔

" اطلبوا العلم ولو کان بالصین "

نے یہ بھی بتا دیا کہ "حکمت" مردِ مومن کی متاعِ گم گشتہ ہے، جہاں ملے وہ اُس کے لے لینے کا زیادہ حقدار ہے :۔

" کلمۃ الحکمۃ ضالۃ المومن اینما وجدھا فھو احق بھا "

اسلام جب عرب میں مبعوث ہوا تو اُس وقت کل سترہ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ مگر یہ اسلام ہی کا کارنامہ ہے کہ اُس نے تحصیل علم کے ساتھ نوشت و خواند پر بھی زور دیا۔ وحی الٰہی کا آغاز ہی "اقراء" (پڑھو) کے ایجابی امر سے ہوا :۔

" اقراء باسم ربک الذی خلق "

اور انسان پر معبود برحق کی سب سے بڑی نعمت یہ بتائی گئی ہے کہ اُس نے اسے لکھنا سکھایا اور اُس نادان کو دانائی کی تعلیم دی :۔

" اقراء وربک الاکرم الذی علم بالقلم۔ علم الانسان ما لم یعلم "۔

بنا اس نے اپنے متبعین کو مامور کیا کہ وہ اپنی عملی زندگی میں " لکھنے" سے کام لیں :۔

" یا ایھا الذین آمنوا اذا تداینتم بدین الی اجل مسمی فاکتبوہ ولیکتب بینکم کاتب بالعدل "

اے ایمان والو! جب معاملہ کرنے لگو اُدھار کا ایک میعاد معین تک کے لئے تو اس کو لکھ لیا کرو اور یہ ضروری ہے کہ تمہارے آپس میں (جو) کوئی لکھنے والا (ہو وہ) انصاف کے ساتھ لکھے۔

اس طرح نوشت و خواند مسلمانوں کا ایک دینی فریضہ بن گئے اور اسلامی معاشرے میں تعلیم اور نوشت و خواند کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوگئی، حالانکہ اقوام قدیمہ میں سے بہت سی قوموں نے تعلیم کو صرف مخصوص طبقات ملک کے لئے محدود کر دیا تھا اور دوسرے طبقات کو اس سے محروم قرار دیا تھا۔ لیکن اسلام نے اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کی تقسیم میں کسی امتیاز کو روا نہ رکھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تحریر و کتابت کی تعلیم سے جو دلچسپی تھی، اُس کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جا سکتا ہے کہ جنگ بدر میں جو قیدی گرفتار ہو کر آئے اور اُن میں سے جو لوگ زرِ فدیہ ادا کرنے سے قاصر تھے، آپ نے اُنہیں حکم دیا کہ ہر ایسا شخص مدینہ منورہ کے دس بچوں کو نوشت و خواند سکھا دے، یہی اُس کا فدیہ ہے۔ آپ نے زید بن ثابتؓ کو حکم دیا کہ وہ یہود کی زبان سیکھیں اور اُنہوں نے پندرہ دن میں اس زبان کو سیکھ لیا۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلام نے عربی کے سوا دوسری زبانوں کے سیکھنے کی بھی ہمت افزائی کی ہے۔

اس عہد کا سب سے بڑا مدرسہ مسجد نبوی تھا۔ ہر قبیلہ سے ایک وفد تحصیل علم کے لئے مدینہ منورہ آتا اور حصول علم کے بعد اپنے قبیلہ میں واپس جا کر اُس کی اشاعت کرتا، جیسا کہ قرآن کہتا ہے :۔

فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون۔

سو ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ اُن کی ہر بڑی جماعت میں سے ایک چھوٹی جماعت (جہاد میں) جایا کرے تاکہ باقی ماندہ لوگ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرتے رہیں اور تاکہ یہ لوگ اپنی (اس)

قوم کو جبکہ وہ اُن کے پاس واپس آویں ڈراویں تاکہ وہ
(اُن سے دین کی باتیں سُن کر برے کاموں سے) بچیں

ج۔ خلافت راشدہ

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے جانشین سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہوئے، خلیفہ ہونے کے بعد آپ کو فتنۂ ارتداد سے اور دوسری جانب مدعیانِ نبوت کی وسیسہ کاریوں سے مقابلہ کرنا پڑا ان میں سخت ترین مقابلہ مسیلمہ کذاب ۔ جس میں بے شمار مسلمان شہید ہوئے ۔ ان میں سے ایک کثیر تعداد حفاظِ قرآن کی تھی ۔ اس سے خود قرآن کے جاتے رہنے کا اندیشہ لہذا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشورے سے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت زید بن ثابت سے قرآن حکیم کو ایک کتاب کی شکل میں مدون کرایا ۔ اس طرح مسلمانوں میں جو پہلی کتاب مدون ہوئی وہ "اللہ کی کتاب" تھی ۔

اس زمانہ میں شمع رسالت کے پروانوں نے اپنے ہادی و رہنما کے اقوال و اعمال کو قلمبند کیا ۔ حدیث رسول کے ان ابتدائی مدونین میں حضرت علی بن ابی طالب، عبداللہ بن عباس، انس بن مالک، ابوہریرہ اور عبداللہ بن عمرو بن عاص رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے نوشتے زیادہ مشہور ہیں ۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے ۔ آپ کے زمانہ میں فتوحات کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا اور بے شمار روپیہ مال میں آنے لگا ۔ اس غرض سے آپ نے بیت المال قائم کیا ۔ بیت المال میں روپیہ رکھنے اور اُسے تقسیم کرنے کے لئے حساب دانی کی ضرورت نیز لوگ ترکہ میں بڑی بڑی رقوم چھوڑنے لگے ۔ اس طرح "مناسخہ" کے پیچیدہ مسائل پیدا ہونے لگے ۔ ان وجوہ سے علم الحساب کی ترقی ہو گئی ۔ چنانچہ حضرت عمر نے اس کی بدیں طور ترغیب دی ۔

"اذا لھوتم فالھوا بالرمی واذا تحدثتم فتحدثوا بالفرائض" جب تم کھیلو تو تیر اندازی کا کھیل کھیلو اور جب آپس میں باتیں کرو تو وراثت کی باتیں کرو ۔

سنہ ۱۶ھ میں سوادِ عراق کا علاقہ فتح ہوا جسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خراج پر مفتوحین ہی کے پاس چھوڑ دیا ۔ تشخیص خراج کے لئے عثمان بن حنیف سے اس علاقہ کی پیمائش کرائی ۔ اس طرح "علم المساحت" اور "علم الہندسہ" کی بنیاد پڑی ۔

نبی کی شہادت کی بہت افزائی اور نجوم و جوتش کے ڈھکوسلوں کی ممانعت کے ذریعہ علم الہیئت کے لئے عہد نبوی ہی میں زمین ہموار ہو چکی تھی ۔ عہد فاروقی میں سن ہجری کے اجراء سے اس کی ترقی کے امکانات کی تکمیل ہو گئی ۔

عہد عثمانی میں مصحف صدیقی کی نقلیں مختلف ممالک میں بھیجی گئیں ۔

عہد مرتضوی میں ابوالاسود دؤلی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زیر ہدایت علم النحو کی بنیاد ڈالی ۔

لیکن اس زمانہ کا خاص علم دینیات تھا ۔ مگر ابھی اس کے اندر مختلف شاخوں (تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، احسان) کے تخصص کا آغاز نہیں ہوا تھا ۔ صحابہ کرام بیک وقت قرآن و حدیث کے محرم راز اور فقہ (بشمول علم الاعتقاد) کے ماہر ہوتے تھے ۔ ان کے اجلّ علماء خلفاء راشدین کے علاوہ عبداللہ بن مسعود، اُبی بن کعب، معاذ بن جبل، سالم مولیٰ حذیفہ، عبداللہ بن عباس، زید بن ثابت، ابوموسیٰ الاشعری، عبداللہ بن زبیر اور ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم تھے ۔

س زمانہ میں آج کل کے سے درسی مدارس کا دستور نہ تھا۔ ہر عالم بجائے خود درسگاہ ہوتا تھا جو یا تو مسجد نبوی کا یا حرم شریف میں درس
ر اپنے مکان پر۔

وی حکومت

ضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت (۴۰ھ) کے چھ مہینے بعد امیر معاویہ خلیفہ ہوئے۔ جنہوں نے اموی خاندان کی بنیاد ڈالی۔
تین ذیلی ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

۔ امیر معاویہ، اُن کے بیٹے یزید اور پوتے معاویہ کا زمانہ:۔ امیر معاویہ کو تاریخ سے بڑی دلچسپی تھی۔ اُنہوں نے یمن سے عبید بن
ر تاریخ پر کتابیں لکھوائیں اور اس طرح مسلمانوں میں تاریخ کا فن ظہور میں آیا۔ اُنہوں نے زیاد بن ابیہ کو جو اُن کے باپ کی
د تھا، اپنا جائز بھائی قرار دیا۔ زیاد نے عرب قبائل کی کمزوریوں پر "مثالب العرب" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ امیر معاویہ
ن ابی اُصیبعہ نے لکھا ہے کہ وہ اپنے مخالفوں کو علانیہ قتل کے بجائے زہر خورانی کے ذریعہ ختم کرا دیا کرتے تھے۔ اس باب میں
میر خاص ایک نصرانی طبیب ابن آثال تھا۔

یزید کا دور ناقابل بیان فسق و فجور اور ظلم و ستم کا دور ہے، کربلا کا حادثہ فاجعہ، حرم رسول کی بے حرمتی اور مکہ معظمہ کی تباہی
ات ہیں جن کے پیش نظر اُسے بجا طور پر نیرو کا جانشین کہا جا سکتا ہے۔ اُس کا بیٹا معاویہ صرف چالیس دن کے بعد دستبردار

لیکن اس عہد کا خاص علمی واقعہ یہ ہے کہ سیدنا امام حسنؓ کے خلافت سے دستبردار ہو جانے کے بعد جب اُن کے معتقدین کے لئے
رمیوں میں کوئی دلچسپی نہ رہی تو اُنہوں نے مساجد کے اندر گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ اس لئے وہ "معتزلہ" کہلائے اب اُن کا وقت
رعلمی بحث و تحقیق میں گذرتا تھا۔

مروانیوں کا عروج:۔ معاویہ بن یزید کی چند روزہ خلافت کے بعد مروان اور پھر اُس کا بیٹا عبدالملک خلیفہ ہوا۔ طے یہ پایا تھا
ں کے بعد یزید کا بیٹا خالد خلیفہ ہوگا۔ مگر عبدالملک نے خالد کو معزول کر کے حکومت اپنے خاندان میں لے لی۔ خالد نے حصول
سے مایوس ہو کر ازدیاد دولت کی حرص میں کیمیا پر توجہ کی اور یونانی و قبطی زبانوں سے کیمیا، نجوم اور طب کی کتابیں ترجمہ کرائیں
غیر زبانوں سے عربی میں ترجمہ کی تحریک کا آغاز ہوا۔ عبدالملک ہی کے زمانہ میں دیوان خراج رومی اور فارسی زبانوں سے عربی زبان میں
ہوا۔

اس ذیلی دور کے آخری خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ تھے، اُنہوں نے محدثین کو روایت حدیث کے لئے ترغیب دی نیز اہرن القس کی
ن" کا ماسرجویہ سے عربی میں ترجمہ کرایا۔ اُنہیں کے زمانہ میں اسکندریہ کا مدرسہ فلسفہ جو وہاں تقریباً ایک ہزار سال سے چلا آتا تھا،
منتقل ہوا۔

لیکن علماء وقت پر دینیات غالب تھی۔ اس عہد کے مشہور فضلاء میں سعید بن جبیر، مجاہد، عکرمہ، عطاء بن ابی رباح، ابوالعالیہ،
زید، عامر بن شراحیل، حسن بصری، ابراہیم النخعی، سعید بن المسیب، عروہ بن زبیر اور زہری رحمہم اللہ تعالیٰ تھے۔
طریق تعلیم میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا۔ ہر عالم بجائے خود ایک درسگاہ ہوتا تھا جو مسجد میں تلامذہ کے حلقہ کا صدر ہوتا تھا۔

مروانیوں کا زوال :- حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے جانشین نالائق نکلے۔ اُنہوں نے قدیم عربی تعصب کو زندہ کیا، جس کے نتیجے میں آخرکار اُنہیں تختِ خلافت سے ہاتھ دھونے پڑے۔ حکومتوں کے عہدِ زوال میں جو خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں، اُن میں بھی پیدا ہو گئی تھیں۔ اس عہد میں معتزلہ میں سے واصل بن عطاء نے علمِ کلام کی باقاعدہ تجدید کی۔ فقہ کے اندر دو مکتبِ فکر ہو گئے۔ حجاز کے اندر حدیث کا چرچا تھا۔ لیکن عراق میں جہاں ابن غرض نے حدیث کے اندر تدلیس اور فریب کاری شروع کر دی تھی۔ رائے کو بھی اعتبار کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ اس عہد کے مشہور اہل الرائے فقیہ حماد بن ابی سلیمان تھے، جن کی وفات پر امام ابوحنیفہؒ اُن کے جانشین ہوئے۔ اُنہوں نے ہی حنفی مذہب فقہ کی بنیاد ڈالی۔ دیگر علماء میں مکحول، عمرو بن دینار، قتادہ بن دعامہ، ابوالزناد، ہشام بن عروہ اور ربیعہ بن عبدالرحمٰن تھے۔ اُدھر ابوالاسود دئلی کے شاگردوں نے نحو کی ترقی کو جاری رکھا۔ ان میں مشہور یحییٰ بن یعمر اور نصر بن عاصم تھے۔ موخرالذکر نے حجاج بن یوسف کے زمانہ میں حروفِ متشابہ پر نقطے لگا کر عربی رسم الخط کو مکمل کیا۔

اس زمانہ میں بھی دوسری زبانوں سے ترجمہ کی تحریک جاری رہی۔ جبلہ بن سالم نے ایران قدیم کی تاریخ "خدائی نامہ" کا ترجمہ کیا۔ سالم نے ارسطو کے اُن خطوط کا جو اُس نے سکندر کو لکھے تھے، عربی میں ترجمہ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اسی زمانہ میں ارسطو کی منطقی تصانیف سے "قاطیغوریاس" (CATEGORIES - کتاب المقولات) کا بھی ترجمہ ہوا۔

امویوں کے عہد میں توہم پرستی بڑھ گئی اور نجوم کا رواج ہونے لگا۔ اس فن میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں، جن میں سے ۱۲۵ھ کی لکھی ہوئی ایک نجوم کی کتاب ملانو (MILAN) کے کتب خانہ میں ہنوز موجود ہے۔

طریق تعلیم میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔ البتہ اس زمانہ میں پیشہ ور معلموں کا ذکر بھی سننے میں آتا ہے، جن میں حجاج بن یوسف اور اُس کا باپ یوسف، معبد الجہنی، غیلان دمشقی، ہشام بن عروہ، امام زہری، علقمہ بن ابی علقمہ، عبدالحمید الکاتب، عطاء بن ابی رباح، ضحاک بن مزاحم، عبداللہ بن حارث زیادہ مشہور ہیں۔ بعض معلمین خلفاء و اُمراء کے بچوں کو تعلیم دیتے تھے، جیسے امام زہری بعض عوام کے بچوں کو بلا معاوضہ پڑھاتے تھے۔ جیسے ضحاک بن مزاحم اور عبداللہ بن حارث بعض لوگوں نے بالغوں کو قرآن پڑھانے کے لئے مدرسے کھول رکھے تھے۔ بعضوں نے اعلیٰ تعلیم کے مدرسے کھولے تھے چنانچہ علقمہ بن ابی علقمہ اپنے مدرسہ میں عربی ادب، نحو اور عروض پڑھایا کرتے تھے۔

۲۔ عباسی خلافت کا عروج۔

امویوں کو ختم کر کے ۱۳۲ھ میں عباسی خاندان تختِ خلافت پر متمکن ہوا۔ عباسیوں نے علمی سرپرستی پر خصوصیت سے توجہ دی اس خاندان کا دوسرا خلیفہ ابوجعفر منصور تھا۔ وہ خود بڑا عالم تھا۔ اُس نے ایک نئی علمی تحریک کا آغاز کیا۔ بقول مورخ ذہبی اُس کے زمانہ میں (۱۴۳ھ) علمائے دینیات نے باقاعدہ تصنیف و تالیف کا کام شروع کیا۔ منصور ہی کے زمانہ میں عبداللہ بن المقفع نے جو "کلیلہ و دمنہ" کے مترجم کی حیثیت سے مشہور ہے سب سے پہلے ارسطاطالیسی منطق کی پہلی تین کتابوں (قاطیغوریاس، باری ارمینیاس اور انالوطیقا) نیز فرفوریوس کی "ایساغوجی" کا عربی میں ترجمہ کیا۔ منصور نے قیصر روم سے یونانی علوم بالخصوص طبیعات و ریاضیات کی کتابیں ترجمہ کرا کے منگائیں۔ انہیں میں "اصول اقلیدس" بھی تھی۔ منصور کو نجوم سے خاص دلچسپی تھی۔ اُس کا خصوصی منجم نوبخت تھا۔ نجوم و ہیئت سے اُس کی دلچسپی کے قصے سن کر ہندوستان کا ایک علمی وفد بغداد پہونچا اور "برہم سدھانت" کا نسخہ خلیفہ کے سامنے پیش کیا۔ منصور کے حکم سے محمد بن ابراہیم

ازی اور یعقوب بن طارق نے اس کتاب کا "السند ہند" کے نام سے عربی میں ترجمہ کیا۔ منصور نے جندی سابور کے اطباء کو بلا کر
طب کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرایا۔

منصور کے بعد اس کا بیٹا مہدی (۱۵۸ھ-۱۶۹ھ) خلیفہ ہوا۔ اس نے متکلمین کو بلا کر زنادقہ کے رد میں کتابیں لکھوائیں۔ اس طرح علم
ی ترقی ہوئی۔ مہدی کے زمانہ میں ابو نوح کاتب نصرانی نے ارسطالیسی منطق کی کتب ثلٰثہ نیز "طوبیقا" (کتاب الجدل) کا سریانی
جمہ کیا۔ مہدی نے نجوم کی سرپرستی بھی جاری رکھی۔ اس کا درباری منجم توفیل بن توما الرہاوی تھا۔

مہدی کے بعد پہلے ہادی اور پھر ہارون (۱۷۰-۱۹۳ھ) خلیفہ ہوئے۔ ہارون کا عہد برامکہ کی علمی سرپرستیوں کے لئے مشہور ہے۔
ہندی الاصل کشمیری نژاد خاندان تھا۔ اس لئے اسے "ہندوستانیات" سے بڑی دلچسپی تھی۔ انہوں نے ایک وفد ہندوستان
ی بوٹیاں لانے اور اس ملک کے مذاہب و ادیان کی کیفیت معلوم کرنے کے لئے بھیجا۔ ان کے اعتنا سے ہندو طب کی بہت سی کتابوں
بی میں ترجمہ ہوا۔ انہیں کے ایما سے بطلیموس کی "المجسطی" نیز "اصول اقلیدس" عربی میں منتقل ہوئیں۔ لیکن ۱۸۷ھ میں یہ علم دوست
ان ہارون کے شکوک و شبہات کا شکار ہو کر برباد ہو گیا۔

ہارون ہی کے زمانہ میں بیت الحکمۃ کی بنیاد پڑی جو اس زمانہ میں "خزانۃ الحکمۃ" کہلاتا تھا۔ یہ ایک عظیم الشان لائبریری تھی۔ جس کا
رین سلما تھا۔ سلما ہی نے ارسطالیسی منطق پہلی تین کتابوں کا تیسری مرتبہ براہ راست یونانی سے عربی میں ترجمہ کیا۔ انقرہ کی جنگ
و کتابیں ہاتھ آئیں، ہارون نے یوحنا بن ماسویہ سے ان کا ترجمہ کرایا۔ ہارون کے زمانہ میں بھی ہندوستانی طب کے ساتھ اعتناء برقرار رہا۔

ہارون کے بعد پہلے امین اور پھر مامون (۱۹۸-۲۱۸ھ) تخت خلافت پر بیٹھے۔ مامون عقلیت کا پرستار تھا۔ لہٰذا جس تحریک کا
ناج اس کے پردادا منصور نے کیا تھا، اس نے تکمیل تک پہنچایا۔ اس نے بڑی مشکل سے قیصر روم کو اس بات پر راضی کیا کہ یونانی علم و
ت کے جو ذخیرے اس کے ملک میں دیمک کی غذا بن رہے تھے۔ انہیں بغداد روانہ کر دے۔ جب یہ سرمایہ بغداد آ گیا تو اسے عربی میں
تقل کرنے کے لئے بیت الحکمہ کی تجدید کی۔ اسے اس کام سے اتنا شغف تھا کہ اپنی جزرسی کے باوجود جن کاغذوں پر حنین ترجمہ کیا
تا تھا، ان کے ہم وزن اسے انعام میں سونا دیتا تھا۔ مامون نے ایک عظیم الشان رصدگاہ بھی قائم کی تھی جس میں وقت کے مشہور
ت دان عباس بن سعید الجوہری سند بن علی یحییٰ بن ابی منصور اور خالد بن عبد الملک فلکیاتی تحقیقات کیا کرتے تھے۔ اس رصدگاہ
سب سے بڑا کارنامہ محیط ارضی کی پیمائش ہے۔ اسی عہد کا مشہور ہیئت دان محمد بن موسیٰ الخوارزمی ہے جو فن "الجبر والمقابلہ" کا
جد بھی ہے۔

مامون کے بعد پہلے معتصم اور پھر واثق خلیفہ ہوئے۔ ان کے زمانہ میں بھی علمی ترقی جاری رہی۔ واثق کے بعد متوکل خلیفہ ہوا مگر اس
زمانہ میں ترکوں کا زور بڑھ گیا اور انہیں کے ہاتھوں وہ ۲۴۷ھ میں قتل ہوا۔ متوکل ہی کے زمانہ میں ہندوستان کے اندر نیم خود مختار عرب
مت کی بنیاد پڑی ([illegible])۔ اس عہد کے مشہور فضلا و فقہا و محدثین کے علاوہ جن کی تعداد شمار سے باہر ہے، الکندی، حبش
حاسب اور بنو موسیٰ ہیں۔

امویوں کے آخری زمانہ میں امام ابو حنیفہؒ نے حنفی فقہ کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس عہد میں بقیہ تین مذاہب: شافعیت، مالکیت اور
حنبلیت ظہور میں آئے۔ مامون کے زمانہ سے واثق کے زمانہ تک مذاہب معتزلہ ہی چھائے رہے۔ مگر متوکل کے زمانہ میں ان کا زوال شروع
ہوا۔ بایں ہمہ ملک کے عام تعلیم یافتہ طبقہ کا رجحان اسی جانب تھا، البتہ علماء محدثین و فقہاء اس مسلک سے بیزار تھے۔ وہ طریق سلف
کے پیرو تھے۔ اس لئے اہل السنت والجماعت کہلاتے تھے۔

و۔ عباسیوں کے زوال کا آغاز

متوکل کے قتل کے بعد ترک گردی کا دور دورہ شروع ہوا۔ جسے چاہتے خلیفہ بنا دیتے، جسے چاہتے معزول کر کے قتل کر دیتے، آنکھوں میں سلائی پھروا دیتے۔ مرکز خلافت کے ضعف و انحلال سے دور دراز صوبوں میں بغاوتیں ہونے لگیں۔ خود مستقر حکومت کے قریب بصرہ میں زنجیوں نے بغاوت کر دی جو بڑی مشکل سے فرو ہو سکی۔

لیکن ان سب سے زیادہ خطرناک قرمطی یا باطنی تحریک تھی، جس کا مقصد تخریب اسلام اور عرب اقتدار کو ختم کر کے اُن کی جگہ مجوسی مذہب اور ساسانی حکومت کو بحال کرنا تھا۔ لیکن عامۃ الناس میں مقبولیت حاصل کرنے کے لئے انہوں نے تولائے اہل بیت کا اور خواص میں اپیل کرنے کے لئے تفلسف پسندی کا سہارا لیا۔ اس طرح اس عہد میں ایک جانب "اسماعیلی تحریک" کی بنیاد پڑی جو آگے چل کر مصر کی فاطمی خلافت کے نام سے موسوم ہوئی اور دوسری جانب فلسفہ اور دیگر علوم حکمیہ بالخصوص نجوم و ہیئت کو ترقی ہوئی۔ اسماعیلیوں کے دعاۃ پوری تسلم رو ئے خلافت میں پھیل گئے۔ یہ لوگ جہاں پہونچے وہیں انقلاب کی تیاریوں کے لئے علوم دینیہ کے بجائے علوم فلسفیہ کی تعلیم پر خفیہ طور سے زور دیا۔

اوپر ذکر آ چکا ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز کے زمانہ میں اسکندریہ کا مدرسہ فلسفہ انطاکیہ اُٹھا دیا گیا تھا۔ متوکل کے زمانہ میں یہ انطاکیہ سے حران پہونچ گیا۔ جہاں سے اس کا اثر بغداد میں بھی پھیلنے لگا۔ جب اس کی گرم بازاری بہت زیادہ بڑھ گئی تو دربار خلافت سے فلسفہ کی اشاعت پر پابندی لگائی گئی (سنہ ۲۶۲ھ)، مگر اس کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا، کیونکہ اگلے خلیفہ المعتضد باللہ (۲۷۹ - ۲۸۹ھ) کے زمانہ میں مدرسہ فلسفہ کھلے بندوں بغداد پہونچ گیا۔ اس کا گل سرسبد ابو نصر فارابی تھا جو اپنی فلسفہ دانی کی بنا پر "معلم ثانی" کہلاتا ہے یہی شیخ بو علی سینا کا "معنوی اُستاد" ہے۔

اس عہد کے آخری حصہ کا مشہور واقعہ "اشعریت" کا آغاز ہے۔ اس کے بانی امام ابو الحسن الاشعری تھے۔ انہوں نے معتزلہ ہی کے حلقہ میں تعلیم پائی تھی۔ مگر بعد میں سنہ ۳۰۰ھ کے قریب اعتزال سے تائب ہو کر طریق اہل السنت والجماعت اختیار کر لیا اُن کے پیرو اشاعرہ کہلاتے ہیں۔

اس سلسلے میں دوسرے مشہور سنی عالم ابو منصور ماتریدیؒ تھے۔ وہ مسلکاً حنفی تھے۔ انہوں نے بھی اعتزال کی تردید کی اور اہل السنت والجماعت کے مسلک کی منطقی بنیادوں پر تعمیر کی۔ اُن کے پیرو (یعنی احناف) عقیدتاً "ماتریدی" کہلاتے ہیں۔ ہندوستان کے علماء عموماً ماتریدی تھے۔ مگر یہاں اشاعرہ کے ساتھ بھی رواداری برتی جاتی تھی۔ یوں بھی دونوں مسلکوں میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں ہے۔

چونکہ مہدی کے زمانہ سے دربار پر معتزلہ چھا گئے تھے۔ لہذا اہل السنت والجماعت نے دربار داری سے بالکل علیحدگی اختیار کر لی۔ یوں بھی یہ حضرات حکومت سے کسی نہج کی وابستگی کو اپنی حریت ضمیر کے لئے سم قاتل سمجھتے تھے۔ اس لئے علماء اور دربار کے درمیان خلیج وسیع سے وسیع تر ہو گئی۔ اُس زمانہ میں آج کل کے سے مدرسے بھی نہیں ہوتے تھے، اس لئے سرکاری امداد اور حکومتی اعانت کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ ہر عالم بجائے خود ایک مدرسہ ہوتا تھا، مگر "مدد معاش" کے عنوان سے علماء سرکاری امداد کو ناپسند کرتے تھے، کیونکہ بیت المال کے اکثر ذرائع آمدنی اُن کے نقطۂ نظر سے مشکوک و مشتبہ تھے۔

بہر حال سنہ ۳۳۴ھ میں آل بویہ نے آ کر بغداد پر قبضہ کر لیا۔ خلیفہ اب بھی عباسی خاندان ہی کا ہوتا تھا۔ مگر اُس کی حیثیت بویہیوں کے وظیفہ خوار کی سی تھی۔ اصل اقتدار آل بویہ کے ہاتھ میں چلا گیا۔

ز۔ **بغدادوں کا قیام** ۔ مرکز خلافت کے ضعف و انحلال اور مختلف صوبوں کی خود مختاری سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ ایک بغداد

ے بجائے متعدد "بغداد" بن گئے جن میں سے ہر ایک علم و حکمت کی ترقی میں کوشاں تھا۔ چوتھی صدی ہجری کے آغاز میں مشہور صوبائی حکومتیں
حسب ذیل تھیں۔

بویہی خاندان: یہ تین بھائی تھے، بڑا بھائی عماد الدولہ فارس میں دوسرا رکن الدین جبال میں اور تیسرا معز الدولہ بغداد
ں۔ عماد الدولہ لاولد مرا۔ معز الدولہ کے بعد اُس کا بیٹا عز الدولہ بختیار اُس کا جانشین ہوا۔ مگر اس کے چچا زاد بھائی عضد الدولہ
نے حملہ کرکے اُسے بغداد سے بے دخل کر دیا۔ اور خود قابض ہوگیا۔ وہ اپنے بھائی فخر الدولہ کے بھی در پئے آزار ہوگیا۔ فخر الدولہ
نے سامانی حکمرانوں سے مدد مانگی، مگر کامیاب نہ ہوسکا۔ البتہ عضد الدولہ کے انتقال کے بعد فخر الدولہ جبال کے صوبے کا بادشاہ
ن گیا۔ اُس کے مرنے پر اُس کا بیٹا مجد الدولہ باپ کا جانشین ہوا۔ مجد الدولہ ہی سے محمود غزنوی نے رَے کو چھینا تھا۔

افریقہ میں اور پھر مصر میں قیامت برپا تھی۔ فاطمیہ مصر ہی کے ایک داعی جعم بن شیبان نے ملتان میں اسماعیلیوں کی حکومت
قائم کر لی تھی۔ اُس کے جانشین داؤد کی ملحدانہ سرگرمیوں کے تدارک کے لئے محمود کو ملتان پر حملہ کرنا پڑا اور بعد میں برصغیر کا شمالی
مغربی حصہ اُس کی سلطنت میں شامل ہوگیا۔ اور بھی حکومتیں تھیں، جن کی تفصیل موجب تطویل ہوگی۔ البتہ "سامانی حکومت" اس سے قبل
کر ہے کہ اسی کے کھنڈروں پر غزنوی سلطنت قائم ہوئی۔

سامانی خاندان کا مورث اعلیٰ ایران کے ایک قدیم معزز خاندان سے تعلق رکھتا تھا، جس کا سلسلۂ نسب بہرام چوبین تک پہنچتا
ہے۔ مامون نے خراسان کے والی کو ہدایت کی کہ اسد بن سامان کو جو رئیس قوم تھا تعظیم و اکرام کے ساتھ رکھے۔ چنانچہ اُس نے اُس کے بیٹوں
مختلف اقطاع ملک کی حکومت دی۔ ۲۶۱ھ میں اس خاندان کے مشہور تاجدار نصر بن احمد سامانی کو معتمد باللہ عباسی نے ماوراء النہر
باقاعدہ منشور ایالت عطا کیا۔ اُس کی وفات پر ۲۷۹ھ میں اُس کا بھائی اسمٰعیل تخت نشین ہوا۔ اُس نے صفاریوں سے خراسان بھی
چھین لیا۔ ۲۹۵ھ میں اسمٰعیل کی وفات پر اُس کا بیٹا تخت نشین ہوا۔ اس زمانہ میں قرمطی تحریک زور پکڑ چکی تھی اور اس کے دعاۃ خراسان
بھی تخریبی سرگرمیوں میں منہمک تھے، انہیں کے نتیجہ میں احمد سامانی ۳۰۱ھ میں قتل ہوا اور اس کا بیٹا نصر بن احمد تخت نشین ہوا۔
ی کا ملک الشعراء رودکی تھا، جس کا قصیدہ

بوئے جوئے مولیاں آید ہمی　　　　یاد یار مہرباں آید ہمی

رسی ادب کی تاریخ میں مشہور ہے۔ شروع میں نصر بن احمد کا رجحان اسمٰعیلی تحریک کی جانب تھا۔ مگر بعد میں وہ اس خیال سے
آگیا۔ اس کے بعد اُس کا بیٹا نوح اُس کا جانشین ہوا، جس نے اپنے مقدور بھر باطنی تحریک کا قلع قمع کیا۔ ۳۴۳ھ میں اُس کی
فات پر اُس کا بیٹا عبد الملک اُس کا جانشین ہوا، جس نے ۳۴۹ھ میں الپتگین کو خراسان کا سپہ سالار بنا کر بھیجا۔ مگر اُس
ے جانشین منصور بن نوح کا دل الپتگین کی طرف سے صاف نہ تھا، کیونکہ اُس نے اُس کی تخت نشینی کی حمایت نہیں کی تھی۔ لہٰذا
س نے اُسے معزول کر دیا۔ الپتگین نے جاکر غزنی میں علم بغاوت بلند کیا اور ایک نئی حکومت کی بنیاد ڈالی، جس پر سولہ سال بعد
سبکتگین اور اس کی اولاد کا قبضہ ہوگیا۔ منصور بن نوح نے ۳۶۵ھ میں وفات پائی اور اس کا بیٹا نوح بن منصور اُس کا جانشین
ہوا۔ اُس نے ۳۸۷ھ میں وفات پائی۔ اس عرصہ میں ظاہری شوکت کے باوجود اندر ہی اندر زوال و انتشار کی قوتیں اپنی کارفرمائی
میں مصروف تھیں۔ نوح بن منصور کے بعد اُس کا بیٹا منصور بن نوح تخت پر بیٹھا۔ مگر جلد ہی دو سال بعد ۳۸۹ھ میں راہی ملک عدم
ہوا۔ اُس کے بعد اُس کا بھائی عبد الملک بن نوح تخت پر بیٹھا۔ اب شکست و انتشار کی قوتیں پورے شباب پر پہونچ چکی تھیں،
جن کی اصلاح نوجوان بادشاہ کے قابو سے باہر تھی، لہٰذا سامانی حکومت ختم ہوگئی اور اُس کے کھنڈروں پر غزنوی سلطنت قائم ہوئی۔

سامانی ایک کریم النسب خاندان سے تعلق رکھتے تھے، لہذا بزرگی و نجابت کے ساتھ اہل کمال کی قدرشناسی بھی اُنہوں نے اپنے اب
سے ورثہ میں پائی تھی، چنانچہ میرخوند نے "روضۃ الصفا" (جلد چہارم ص۳) میں پہلے سامانی تاجدار کی ہنرپروری کے بارے میں

"ارباب تواریخ گفتہ اند کہ اسماعیل بادشاہ خیر و کریم الطبع بود۔ فضلاء در ایام دولت او معزز شدہ
و محترم بودند۔"

اسی طرح سامانی عہد کے بخارا کی (جو سامانیوں کا دارالحکومت تھا) علمی و ادبی عظمت کے بارے میں ثعالبی نے "یتیمۃ الدھر" میں لکھ

"سامانی خاندان کے عہد حکومت میں بخارا بزرگی کا گہوارہ، ملک کا مرکز، منتخب روزگار لوگوں کے جمع ہونے
کی جگہ، روئے زمین کے ادبا کا مطلع النجوم اور فضلائے دہر کا بازار تھا۔"

اسی طرح بشاری مقدسی جو اس خاندان کے آخری زمانہ حکومت میں یہاں پہونچا تھا، سامانیوں کی علم نوازی و علماء پروری کے بارے میں

"سامانی حکمرانوں کا دستور ہے کہ وہ علماء کو زمین بوسی کی تکلیف نہیں دیتے۔ ماہ رمضان کی جمعراتوں کو
بعد عشاء مجالس مناظرہ اپنے سامنے قائم کرتے ہیں۔ پہلے بادشاہ کوئی مسئلہ دریافت کرتا ہے، پھر علماء
اس میں قیل و قال کرتے ہیں . . . .
بخارا میں سب سے زیادہ فقہ داں کو منتخب کرکے اُس کا رتبہ بڑھاتے ہیں، اُسی کی رائے پر عمل کرتے ہیں
اُس کی ضروریات کو پورا کرتے ہیں اور اُس کے مشورے سے اعلیٰ عہدوں پر عمال حکومت کا تقرر کرتے ہیں۔"
(احسن التقاسیم صفحہ ۳۳۸)

سامانی حکومت ہی کے کھنڈروں پر غزنوی سلطنت قائم ہوئی اور سیاسی اقتدار کے ساتھ علم و فضل کی سرپرستی بھی اُنہوں
سامانیوں ہی سے ورثہ میں پائی تھی۔ جب بعد میں غزنوی فاتحین اپنے ہمراہ غزنوی سے لاہور لیتے گئے اور اس طرح پہلے شمالی مغ
ہندوستان کے غزنوی مقبوضات میں اور پھر لاہور کے غزنوی دربار میں یہی انداز حکومت اور یہی ثقافتی نظام مروج ہوا۔ بعد میں
غزنوی حکومت کے بعد غوری حکومت اور اُس کے بعد ممالیک کی "دہلی سلطنت" قائم ہوئی، تو یہی سیاسی و ثقافتی روایات "دہلی
میں منتقل ہوئیں اور آخر تک برقرار رہیں۔

مگر اس کی تفصیل ایک جداگانہ پیش کش کی متقاضی ہے وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

ملّا واحدی

تاثرات

جو لوگ اللہ پر اور قیامت کے دن پر (صدق دل سے) ایمان رکھتے ہیں تم ان کو ایسے لوگوں سے یارانہ بڑھاتے (کبھی) نہ پاؤ گے جو اللہ کے اور اس کے رسول (صلعم) کے مخالف ہیں، خواہ وہ (مخالف) اُن کے باپ (دادا) یا اُن کے بیٹے ہوں، یا ان کے بھائی ہوں یا اُن کے (دُور و نزدیک کے) رشتہ دار ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ سچے مسلمانوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے ایمان (لکھ) دیا ہے اور اپنی رحمتِ (خاص) سے اُن کی مدد فرمائی ہے (انہیں توفیق ایمان و عمل عطا کی ہے) اللہ انہیں ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں (اور ایک دو نہیں) وہ ہمیشہ اُن جنتوں میں رہیں گے۔ اللہ اُن سے راضی ہوگا اور وہ اللہ سے راضی ہوں گے۔ یہ اللہ کا گروہ ہے اور سن لو کہ اللہ ہی کا گروہ (بالآخر) فیروز و فلاح پانے والا ہے۔ (مفہوم سورہ ۵۹۔ آیت ۲۲)

اعلموا انما الحیوٰۃ الدنیا ...... ثم یکون حطاما (اور) خوب سمجھ لو کہ (تم نے) دنیا کی زندگی کا مقصد (محض) لہو و لعب اور ٹیپ ٹاپ اور ایک دوسرے پر بڑائی جتانا اور مال و اولاد میں زیادتی چاہنا قرار دے رکھا ہے (یہ صحیح نہیں ہے) ان چیزوں کی بہار چند روزہ ہے (اس قسم کی) زندگی کی مثال اُس بارش کی سی ہے جس سے (سبزہ لہلہا) اُٹھتا ہے اور پیداوار کسانوں کو مگن کر دیتی ہے پھر وہ اور زور پکڑتی ہے (مگر انہیں خوشی منانے زیادہ عرصہ نہیں گزرتا کہ) پیداوار خشک ہونے لگتی ہے اور تم سبزے کو زردی سے بدلتا دیکھتے ہو اور آخر وہ روندن میں آجاتی ہے (تم فوراً سے روندتے ہو اور چلا جاتا) ہے روندوا تے ہو۔ پھر شادابی اور خوشنمائی کا پتہ نشان نہیں رہتا۔ یہی حال تمہارے لہو ولعب، ٹیپ ٹاپ اور آپس کے تفاخر کا ہے) (مفہوم سورہ ۵۷۔ آیت ۲۰)

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ۔ عارضی بہار کے فریب میں پھنس کر عاقبت کو خراب نہ کرو۔ عاقبت میں صرف ایمان اور نیک اعمال کام دیں گے۔ یہ چیزیں کام نہیں دیں گی جنہیں تم نے اختیار کر رکھا ہے۔ وفی الاٰخرۃ عذاب شدید و مغفرۃ من اللہ و رضوان ۔ وما الحیوٰۃ الدنیا الا متاع الغرور ..... (جس طرح بارش سے اچھی زمین لالہ زار بن جاتی ہے اور خراب زمین میں کانٹے اُگتے ہیں ٹھیک اسی طرح دنیا کے فریبوں میں پھنسنا عاقبت میں سخت ترین عذاب کا موجب ہوگا، اور ایمان اور نیک اعمال کے ساتھ زندگی بسر کرنا مغفرت و خوشنودی باری تعالیٰ کا ذریعہ بنے گا۔ کچھ شک نہیں کہ) دنیا کی زندگی دھوکے کا مال ہے (ہوش مند اس کے نقصانات سے بچتے ہیں اور مدہوش مار کھا جاتے ہیں) (مفہوم سورہ ۵۷۔ آیت ۲۰)

سابقوا الیٰ مغفرۃ من ربکم (لوگو!) اپنے پروردگار کی بخشش (اور رضا جوئی) کی طرف دوڑو (اور موت سے پہلے

وہ کام سامنے کر جاؤ گے) جو عاقبت میں کام آئیں۔ (مفہوم سورہ ۵۔ آیت ۲۱)۔

بھارت اور پاکستان میں ایک جماعت رہتی ہے جو پارسی کہلاتی ہے۔ اس جماعت کی تعداد بھارت اور پاکستان کی اور تمام سے کم ہے۔ لیکن یہ سب پڑھے لکھے اور خوش حال لوگ ہیں۔ ان سے بڑھ کر منظم لوگ بھارت اور پاکستان میں دوسرے نہیں ہیں۔ اپنی تنظیم کا ڈھول نہیں پیٹتے۔ ان کی جماعتی جدوجہد کی خبریں باہر نہیں نکلتیں۔ جو کچھ کرنا ہوتا ہے، خاموشی سے کرتے ہیں انہیں سے یا ہندو مسلمانوں سے اپنی جماعت کے لئے حقوق مانگتے آپ نے شاید ہی کبھی سنا ہو۔ پارسی جو کچھ کرتے ہیں اپنی جماعت کے کرتے ہیں۔

دلی میں پارسی بہت تھوڑے تھے۔ ان کا مرکز نمبر اول بمبئی ہے اور نمبر دوم کراچی۔ لیکن دلی میں بھی پارسیوں کا وقار تھا بھارت میں حکومت کے حصہ دار ہیں اور نہ پاکستان میں ان کا وزن کسی جگہ کم نہیں ہے۔

میں نے ہوش سنبھالا تو فرنگی تہذیب و تمدن میں پارسیوں کو دلی کی ہر جماعت سے پیش پیش دیکھا۔ پارسی فریہ انگریز تھے۔ مگر جتنے انگریز وہ ستر بہتر برس پہلے تھے اُتنے ہی انگریز آج بھی ہیں۔ تقلیدِ فرنگ کی رفتار پارسیوں کی مسلما برابر کیا ہندوؤں کے برابر بھی تیز نہیں ہے۔ ہندوؤں میں گاندھی جی کی سودیشی تعلیم کے باوجود خاصی تبدیلی آئی ہے اور مسلمانوں نے تو فرنگ کا ریکارڈ قائم کر دیا ہے۔ مسلمان انگریزوں اور امریکنوں کو مات دے رہے ہیں اور انہیں پیچھے چھوڑتے جاتے ہیں۔ پارسی جیسے ستر بہتر برس پہلے تھے ویسے ہی اس وقت ہیں۔ مسلمانوں نے ٹیڈی بوائے اور ٹیڈی گرل تک ترقی کر لی ہے، پا نے اس اعتبار سے مطلق ترقی نہیں کی ہے۔

ستر بہتر برس پہلے کے مرے ہوئے مسلمان اگر آج زندہ کر دئے جائیں تو اپنی قوم کو پہچان نہ سکیں اور پہچان لیں تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کریں کہ یا اللہ! ہمیں تو تو قبروں ہی میں بھیج دے۔

ستر بہتر برس پہلے کے اکثر مسلمانوں کو اللہ کا یہ فرمان یاد تھا کہ (اے رسول صلعم!) تم مسلمان مردوں سے کہہ (اخلاقی حالت درست رکھنی چاہتے ہیں تو نامحرم عورت پر نظر پڑتے ہی) اپنی نظر نیچی کر لیں اور مسلمان عورتوں سے کہہ (نامحرم مرد کا سامنا ہو جائے تو) وہ اپنی نظر نیچی کر لیں ...... (اور مسلمان عورتوں کو اتنا اور سمجھا دو کہ) اپنے سنگھار کا مظاہرہ کرتی نہ پھریں۔ (مفہوم سورہ ۲۴۔ آیات ۳۱-۳۰)

اب تو بناؤ سنگھار کیسا، ہم جسم کا جوڑ جوڑ دکھاتے پھرتے ہیں۔ پارسیوں کے پاس قرآن جیسا ضابطہ حیات نہیں ہے طور طریق کے پابند ہیں۔ ہم نے قرآن اور قرآنی طریقوں کو بھلا دیا ہے۔ پاکستان ہی نہیں، جملہ اسلامی ممالک ہیں۔ بلکہ پا دیگر اسلامی ممالک سے ابھی غنیمت ہے۔ کاش ان ممالک کے ساتھ اسلامی کا لفظ نہ لگایا جاتا اور اسلام کو بدنام نہ کیا جاتا۔

یبنی اسرائیل اذکروا نعمتی التی انعمت علیکم واوفوا بعهدی اوف بعهدکم ۚ وایای

اے بنی اسرائیل! میں نے تم پر جیسے جیسے احسان کئے ہیں انہیں (فراموش نہ کرو، انہیں) یاد رکھو اور مجھ سے جو عہد باندھا تھا اس دکھاؤ میں بھی وہ عہد پورا کروں گا (تمہارے عمل کا بدلہ دوں گا)۔ تم میرے سوا کسی سے مت ڈرو، (صرف) مجھ سے ڈرو۔ (مفہوم سورہ ۱ اللہ تعالیٰ کا یہ خطاب کیا بنی اسرائیل سے ہے۔ آج کل کے مسلمانوں سے نہیں ہے۔ قرآن مجید میں جو اس آیت کو محفوظ اور ۲۵

ہے کیا اس کا مقصد صرف اتنا ہے کہ اسے پڑھیے اور حاشیہ پر لکھ دیجئے کہ "پڑھ لیا" ؟ ہرگز نہیں۔ کیا مسلمان کسی عہد اور
ارے نہیں پھرے ہیں۔ اللہ یہ خطاب اب ان سے نہیں ہو رہا ؟

اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل سے فرماتا ہے :- وَاٰمِنُوا بِمَآ اَنْزَلْتُ .... وَاَنَّھُمْ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ ۞ اس
پر ایمان لاؤ جو میں نے نازل کیا ہے جو تمہارے پچھلے (منزل) صحیفوں کا مصدق ہے۔ قرآن کے منکر اولین نہ بنو اور اپنی آنے
ن کے انکار کا وبال اپنے اوپر نہ لو) اور چند پیسوں کی خاطر میری آیتوں کی کاٹ چھانٹ مت کرو (دنیا کے دن کی اور دین کے فائدے
کے۔ آخرسا لقہ مجھ سے پڑنا ہے) میرے غضب سے بچو۔ حق سے باطل کو مت ملاؤ، اور حق کو چھپاؤ اور دباؤ نہیں۔ نظام صلوٰۃ قائم
رۃ دو اور رکوع و سجود کرنے والوں کے ساتھ رکوع و سجود کرو۔

یہ کون سی خوبی کی بات ہے کہ دوسروں کو اچھے کام کرنے کی تلقین کرتے ہو اور (خود اچھے کاموں سے بھاگتے ہو) اپنے تئیں بھولے
تم تو (اس کے مدعی ہو کہ) کتاب اللہ پڑھتے ہو۔ (پھر یہ بے عنوانیاں کیوں ہیں ؟) سوچتے کیوں نہیں، صبر و صلوٰۃ کے ذریعے
ی مدد حاصل کرنے کی کوشش کرو (حب مال اور حب جاہ کو مقصود نہ جانو۔ ضبط کی عادت ڈالو۔ تحمل کی مشق بڑھاؤ ــــ
ب کے مقابلے کی قوت پیدا کرو) لیکن صبر و صلوٰۃ پر بھروسہ کرنا ہے دشوار۔ ان چیزوں پر وہی بھروسہ کرتے ہیں جو اپنے آپ کو
دہ سمجھتے ہیں، اور خیال کرتے ہیں کہ ایک دن اللہ کے سامنے جانا ہے اور اللہ کے پاس واپس پہنچنا ہے (ملاحظہ ہو سورۃ ۲ آیت ۴۱ تا ۴۶)

اے آج کل کے مسلمانو! کیا اللہ تعالیٰ یہ سب کچھ بنی اسرائیل ہی سے کہہ رہا ہے، مجھ سے اور تم سے نہیں کہہ رہا ہے ؟ ہم مسلمان
جب اللہ تعالیٰ کے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنا اختیار کیا تھا تو ہم بنی اسرائیل سے کہیں زیادہ نوازے گئے تھے۔ ہمیں اللہ تعالیٰ
رائیل سے بہت زیادہ اونچے مقام پر پہونچا دیا ہے اور جب ہم نے اللہ تعالیٰ کے قوانین سے بے رخی برتی اور بے اعتنائی کی تو
حال جیسا ہے ظاہر ہے۔

COTTON YARN
SILK & COTTON
QUALITY REIGNS
SUPREME WITH US

مولانا محمد مصطفیٰ

۱　نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا　　کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

ہر نقش و تصویر کا پیرہن کاغذی ہوتا ہے اور جس کا پیرہن کاغذی ہو وہ فریادی ہوتا ہے (ایران کی رسم یہی ہے) اس لئے ہر نقش و تصویر بھی کسی ہستی کی فریادی ہے اور وہ ہستی نقش تو ہو نہیں سکتی کیونکہ تمام نقوش و تصاویر کاغذی لباس میں فریادی ہیں پس ثابت ہوا وہ تصویر اپنے مصور کی قدرت اور وہ نقش اپنے نقاشِ ازل کے حضور میں زبانِ حال سے فریاد کرتا ہے کہ آپ کی شوخیٔ تحریر و کمالِ صنعت نے مجھے اس لباس میں ملبوس فرمایا،

کیا کہنا اس کے کمالِ قدرت کا جس نے معدومات کو موجود کر دیا، خلقتک ولم تک شیئاً اور کیا کہنا اس شوخیٔ تحریر کا جس نے بے جان تصویروں میں جان ڈال کر ان کو اپنا والہ و شیدا بنایا۔

سبحان اللہ توحیدِ باری تعالیٰ پر کیسی مضبوط دلیل بیان فرمائی ہے کہ ہر شے کا وجود، وجوبِ مستعار و حادث، اپنے خالق اور محدث کا اعلان ببانگِ دہل کر رہا ہے۔

۲　ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا　　وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاقِ نسیاں کا

زاہد ہے اور جنت کی تعریف، ہم ہیں اور بے خودیٔ عشق، زاہد جس باغِ جنت کی تعریف سے اپنے بیان کو آراستہ کرتا ہے وہ ہماری نظر میں بس ایک ایسا گلدستہ ہے جسے طاقِ نسیاں پر رکھ دیا جائے، اس لئے کہ وہ باغِ رضواں کا شیدائی ہے اور ہم رضوان من اللہ کے، سچ ہے طالبِ صادق کی نظر سوائے محبوب کے کسی پر نہیں پڑتی، ع وہ یاد ہے اس کی کہ بھلا دے دو جہاں کو۔

۳　مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی　　ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

جمادات، نباتات، حیوانات، انسان بلکہ سارے عالم میں کون و فساد کا عمل ہے اور اسی لئے ع ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے دیکھو، دہقان نے جد و جہد کی، خرمن تیار ہوا اور بجلی نے اسے جلا کر خاکِ سیاہ کر دیا، اصل یہ ہے کہ دہقان کی جد و جہد، اس کا خونِ گرم جو خرمن ساز تھا وہی بجلی بن کر گرا اور خرمن سوز ثابت ہوا، نہ وہ خرمن تیار کرتا نہ خرمن جلتا، معلوم ہوا کہ تعمیرِ خرمن میں خرابی کی صورت مضمر تھی جس سے برق کا ہیولیٰ نمودار ہوا۔

یہی قاعدہ حیاتِ انسانی میں جاری و ساری ہے، ہمارا خون گرم کیا ہے حرارتِ غریزی اور رطوبتِ غریزی جس سے چراغ

زیست جل رہا ہے، یہی حرارت اس طرب آنا فانا ختم کرتی رہتی ہے، حتیٰ کہ ایک دن یہ چراغ خاموش ہو جاتا ہے یعنی یہی خونِ گرم اس خرمنِ حیات کو برق کی طرح جلا ڈالتا ہے۔

حدوث اشیاء کی بہت عمدہ دلیل ہے، سبحان اللہ صلِّ علیٰ!

۲ہے خیالِ حُسن میں حُسنِ عمل کا سا اثر — خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا

اعمال دو قسم کے ہیں، ایک قلب کے، دوسرے قالب کے، جب قالب کے اعمال نتیجہ خیز ہیں تو قلب کے اعمال بے نتیجہ کیوں ہوں گے؟ یہی وجہ ہے کہ باوجود اعمالِ حسنہ کی کمی کے قبر میرے لئے جنت بن گئی ہے، کیونکہ تصورِ محبوبِ حقیقی نے نئے نئے شگوفے کھلائے ہیں، مشائخ نے فرمایا ہے تفکر ساعۃ خیر من عبادۃ ستین سنۃ محبوب کی شیریں کاری اور لطف و کرم کی دریاؤں میں غور و فکر کرنا خواہ ایک ساعت ہی کیوں نہ ہو ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے۔

۳غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے — غمِ عشق اگر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا

غمِ روزگار سے بچنا چاہو تو غمِ عشق اختیار کرو، یہ غم لطیف، لذیذ، اور متبرکات اخروی اسرمدی ہے، غمِ روزگار میں مبتلا ہو گئے تو آخرت میں حسرت نصیب ہو گی، کیونکہ روزگار فانی ہے۔

قرآن پاک میں ہے "الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون"

۴قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل — کھیل لڑکوں کا ہوا، دیدۂ بینا نہ ہوا

نگاہِ عارف قطرہ میں دجلہ کو یعنی جزو میں کل دیکھتی ہے، مراد یہ کہ کثرت میں وحدت کا نظارہ کرتی ہے۔

ناظم الطوفسنے "غالب ادرفتہ" میں دلائل سے ثابت کیا ہے کہ یہ تمثیل درست نہیں، یہ مخلوقات خالق کا جز نہیں، البتہ یوں کہنا چاہئے کہ جس طرح مصنوع میں صانع کا نظارہ ہوتا ہے، یا اہلِ منطق کی اصطلاح میں جس طرح جزئی سے کلی کا تصور ہوتا ہے اس طرح دیدۂ بینا ما رأیت شیئاً الا و رأیت اللہ فیہ کا مصداق ہو جاتا ہے۔

۵سب کے دل میں ہے جگہ تیری، جو تو راضی ہوا — مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائے گا

سب مجھ سے راضی ہیں، تو مجھ سے راضی ہو جائے گا تو گویا سب مجھ سے راضی ہو جائیں گے۔ "گویا" اس لئے بھی کہا ہے کہ بعض کا سنشنا جو کالعدم ہیں (مثلاً منکرانِ خدا) اس کلیت میں قادح نہیں۔ اہلِ اللہ کی ایک شان یہ بھی ہے کہ طبعِ سلیم اُن کی طرف مائل ہے مخلوق میں ان کو قبولِ عام حاصل ہوتا ہے۔

۶کیا وہ نمرود کی خدائی تھی — بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

بندہ اگر بندہ ہے تو نفس کی آمادگی سے فرعون کی طرح "انا ربکم الاعلیٰ" کے دعوے اس کے قال یا حال سے سرزد نہ ہوں گے (ایسا بندہ "ایاز قدرِ خود بشناس" پہ نظر رکھے گا، اور "ایاز" سے "بندۂ محمود" ہو جائے گا۔ ورنہ خسر الدنیا والآخرۃ رہے گا) مشائخ نے فرمایا ہے کہ ہر نفس میں فرعونیت ہے۔

ان النفس لامّارۃ بالسّوء الا ما رحم ربّی (قرآن پاک)

۷ہنوز محرمیِ حسن کو ترستا ہوں — کرے ہے ہر بُنِ مُو کام چشمِ بینا کا

شوقِ دیدار میں سراپا چشمِ بینا بن گیا ہوں، تاہم اس کے دیدار سے ہنوز محروم ہوں، صحیح ہے اصطلاحی مشاہدہ اور دیدار میں فرق ہے، پہلا اہل اللہ کو دنیا میں حاصل ہے اور دوسرا نہیں دلیل اس کی ہے "لن ترانی" خواجہ حافظؒ فرماتے ہیں ؎

عنقا شکار کس نشود دام باز چین — کاین جا ہمیشہ باد بدست است دام را

۱۱ فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اس کو یاد اسد — جفا میں اس کی ہے انداز کار فرما کا

حافظ شیراز کا شعر بھی سن لیجئے ۔

سپہر دور قمر را چہ اختیار — در گردش اند بر حسب اختیار دوست

توحید کا تقاضا یہ ہے کہ جب انسان نعمت میں منعم کو دیکھے گا تو جفا میں اس کی نظر تجلی پر ہوگی

۱۲ نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا — ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

پہلا فقرہ پہلے مصرع کا گویا ترجمہ ہے کان اللّٰہ ولم یکن معہٗ شئی" کا اور دوسرا فقرہ اس پر تفریع ہے اب دوسرے مصرع میں اس تفریع سے یہ جزئیہ نکالنا کہ "نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا" اور "ڈبویا مجھ کو ہونے نے" اس سے اس بات کی طرف صاف اشارہ کرنا کہ میں خدا ہوتا سراسر علم معقول اور اصول کے بھی خلاف ہے اس لئے کہ صریح نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ خدا ہوتا اور میں نہ ہوتا کیونکہ جب وہ ذات جس کو انا (یا "میں") سے تعبیر کیا گیا ہے معدوم ہوتی تو کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ وہ معدوم شے خدا ہوتی، لاحول ولا قوۃ الا باللّٰہ العلی العظیم ۔

۱۳ باغ شگفتہ تیرا بساط نشاط دل — ابر بہار خم کدہ کس کے دماغ کا

روایت ہے کہ چند اہل دل حضرت رابعہ بصریہؒ کی خدمت میں گئے، موسم بہار تھا، اس لئے کہا کہ آپ کنج عزلت سے نکل کر باغ و راغ کی سیر کریں اور مظاہر قدرت و مناظر فطرت سے لطف اندوز ہوں ۔ حضرت رابعہ بصریہؒ نے جواب دیا کہ صانع کے مطالعہ نے مصنوعات کے مطالعہ سے بے نیاز کر کے مجھ کو اپنی طرف لگا لیا،

شغلتنی مطالعۃ الصانع عن مطالعۃ المصنوع

اب مرزا کے شعر کی اس کی روشنی میں خود داد دیجئے ۔

۱۴ یک الف بیش نہیں صیقل آئینہ ہنوز — چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

گریبان عاشق کی قسمت تو آپ جانتے ہی ہیں ؟ پس جذب و سلوک کے مرحلوں میں اس کی دھجیاں اڑائی جا رہی ہیں اور پھر بھی طالب صادق کو یہ محسوس ہو رہا ہے کہ آئینہ دل ہنوز زنگ آلود ہے، اس لئے کہ رخ یار کا انعکاس اس میں نہیں ۔
بات یہ ہے کہ یہ ترقی امر محسوس نہیں اور محبوب حقیقی کے استتار میں یہ مصلحت بھی ہے کہ اس طرح عشاق کے سمند شوق پر تازیانے لگتے رہیں ۔ مولانا رومؒ سے

اے برادر بے نہایت درگہیست — ہرچہ بروے می رسی بر روے مایست

۱۵ دل ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا — بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

رونا لوازم عشق سے ہے، یعنی اگر عشق نہ بھی ہوتا تو بھی ہمارا دل پریشان رہتا، کیونکہ اب گریہ عشق کی وجہ سے اگر جر ہے تو اس وقت بے آب ہونے اور خاک اڑنے کی وجہ سے بیاباں ہوتا، تعمیر دل مناسب ہے نہ جب ہوتی یہ وہی بات ہے کہ سے

تنگیٔ دل کا گلہ کیا یہ وہ کافر دل ہے — کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا ۔

اور

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے — غم عشق گر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

شلہ دیکھا تھا نہ جب تک کہ قدِ یار کا عالم میں معتقد فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

مرزا صاحب! خوب ہوا جو آپ عاشق ہوئے، عشق کی بدولت تشکیک تو دور ہوئی انکارِ محشر تو جاتا رہا جب تو آپ نے دیکھا کہ زندوں کو مارتا اور مُردوں کو جِلاتا ہے تو آمنتُ باللہ ...... والبعث بعد الموت تو آپ کو کہ سچ ہے قامتِ یار بھی ایک قیامت ہے لیکن ذرا سانچے میں ڈھلا ہوا سلہ

ملہ بر روئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے • یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا

آئینہ کا دروازہ سب کے لئے کھلا ہوا ہے، ناقص ہو یا کامل، جو آنا چاہے آجائے، آئینہ زبانِ حال سے سب کو ہدایت اور نہایت خوبی سے لوگوں کے عیب و ہنر واضح کر دیتا ہے یہی کیفیت اُن حضرات کی ہے جو "آئینہ دل" ہیں اُن کی خدمت میں بھی بد بہر طرح کے لوگ پہونچتے ہیں اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق فیض حاصل کرتے ہیں۔

سلہ آپ کہیں گے کہ اس شعر کو کلام یا تصرف سے کیا تعلق، میں کہوں گا کہ قدّ بینی کی خود بینی ہے ملاحظہ فرمائیے۔ قدِ یار یعنی قدم یار (یہاں اضافت متوالی مخل فصاحت نہیں) مطلب یہ ہوا کہ فی الارض آیات للسائلین وفی انفسکم افلا تبصرون جب میت ہدہ ہمہ دم ہے کہ وہ موجود کو معدوم اور معدوم کو موجود کرتا ہے تو وجودِ محشر میں استبعاد ؟

مولانا سید یحییٰ ندوی

سلطان غیاث الدین

(۷۶۹ - ۷۷۵ ہجری ــــــ ۱۳۶۷ - ۱۳۷۳ء)

گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

بنگال کا فرمانروا سلطان غیاث الدین بن سکندر شاہ شعراء و ادباء کی قدردانیوں کے علاوہ علماء و فضلاء کے احترام میں
. تھا اور شریعت غرّا اور اسلامی قوانین کی متابعت میں اس نے فرق نہ آنے دیا۔ اس کے عدل و انصاف اور احترام احکام شریعت
ب تاریخی واقعہ بنگال کے بچہ بچہ کی زبان پر جاری ہے اس واقعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہندوستان میں اسلامی نظام
ت مسلم سلاطین کے عہد میں پورے طور پر اگرچہ جاری اور نافذ نہ تھا، وہ شخصی حکومت تھی۔ باایں ہمہ اسلامی قوانین اور احکام
یت کی پابندی کا کس قدر لحاظ رکھا جاتا تھا اور حدود شرعی سے تجاوز محکمہ قضا کے لئے ناممکن تھا۔ اسلامی عدل دست
ل کیا جاتا تھا۔ ساتھ ہی یہ کہ عدلیہ، انتظامیہ سے ہر طرح آزاد تھی۔

ایک روز سلطان تیر اندازی کی مشق کر رہا تھا کہ اتفاقاً ایک تیر کمان سے جست کرکے اور ناگاہ قضا بن کر ایک بیوہ عورت کے بچے
لگا۔ یہ بیوہ عورت قاضی وقت قاضی سراج الدین کی عدالت میں آئی اور داد خواہ ہوئی۔ قاضی شہر موصوف نہایت اور متحیر اور متردد
اگر بادشاہ کی رعایت کرتا ہوں تو روز آخرت میں خدائے ذوالجلال کی بارگاہ میں ماخوذ ہوں گا اور اگر عدل و انصاف کو ملحوظ رکھتا
تو بادشاہ کی عدالت میں طلبی کس قدر دشوار ہے۔ آخر کچھ دیر سوچنے کے بعد قاضی موصوف نے ایک پیادہ کے ذریعہ بادشاہ کو طلب کرنے
ستغیثہ کے دعویٰ کا جواب محکمہ قضا میں حاضر ہو کر پیش کرنے کا پروانہ جاری کیا اور ایک درہ اپنی مسند قضا کے نیچے چھپا دیا۔ قاضی
دہ جب بادشاہ کے دربار میں پہونچا تو اس نے دیکھا کہ بادشاہ کے دربار میں پہونچنا آسان نہیں ہے، اس نے اذان دینا شروع کر دی۔
وقت اذان سن کر سلطان نے موذن کو حاضر ہونے کا حکم دیا۔ حاجبوں نے اسے بادشاہ کے حضور میں حاضر کیا۔ بادشاہ نے بے وقت
ن دینے کا سبب پوچھا، اس نے جواب میں عرض کیا۔

مجھے قاضی شہر سراج الدین نے اس امر پر متعین کیا ہے کہ بادشاہ کو محکمہ عدالت شرعیہ میں لے چلوں۔ چونکہ حضور سلطانی میں پہونچنا
دشوار تھا لہٰذا اس حیلے سے اپنے کو حاضر کیا۔ پروانۂ عدالت پیش کیا اور کہا کہ محکمہ قضا میں حاضر ہو جائیے، آپ نے ایک بیوہ کے بچے کو تیر کا

زخم لگایا ہے۔ وہ مستغیثہ عدالت میں حاضر ہے۔

بادشاہ فوراً اٹھا اور ایک چھوٹی سی تلوار اپنی بغل کے نیچے چھپالی اور عدالت کے لئے روانہ ہوگیا۔ محکمہ عدالت میں پہنچا موصوف نے بادشاہ کی تعظیم کرنا تو کجا، اس کی جانب التفات تک نہ کیا،

فریقین کا بیان لینے کے بعد یہ فیصلہ صادر کیا کہ جب تک ضعیفہ بیوہ راضی نہیں ہوتی، آپ پر حدِ شرعی جاری ہو کر رہے گی۔ سلطان نے قاضی کے فیصلہ کے آگے سرِتسلیم خم کر دیا۔ اور ضعیفہ کو معقول خون بہا دے کر اُسے بالآخر راضی کرلیا۔ پھر قاضی موصوف سے سلطان نے کہا کہ وہ ضعیفہ راضی ہوگئی۔ قاضی نے مستغیثہ سے پوچھا کہ تو نے داد پالی۔ اور صلح پر راضی ہوگئی؟

اس نے کہا۔ جی ہاں! میں راضی ہوگئی۔

جب مقدمہ فیصل ہوچکا تو قاضی موصوف خندہ پیشانی کے ساتھ اُٹھے۔ بادشاہ کی تعظیم کی اور مسند پر بٹھایا۔ سلطان نے وہ تلوار بغل سے نکالی اور بولا۔

"قاضی صاحب! میں اسلامی شریعت کے بموجب آپ کے محکمہ میں حاضر ہوا۔ اگر آپ سے سرمو شریعت کے قوانین کے خلاف ورزی دیکھتا تو اسی تلوار سے آپ کی گردن اُڑا دیتا۔ خدا کا شکر ہے کہ مقدمہ کا انجام بخیر ہوا اور آپ نے منصبِ قضا کا حق پورا پورا ادا کیا۔"

قاضی صاحب نے بھی فوراً مسند کے نیچے سے درہ کھینچا اور فرمایا۔

"اے سلطان! اگر آج شریعت کی حدود سے ذرا بھی تجاوز آپ کی طرف سے دیکھتا تو قسم خدا کی اسی درے سے آپ کی پیٹھ سرخ و سیاہ کر دیتا۔ آج ہم دونوں کے امتحان کا دن تھا۔"

امام طحاوی سب سے پہلے اس اصول کو بیان کرتے ہیں کہ درحقیقت کلام رسول میں تعارض اور تناقض سرے سے ہوتا ہی نہیں ہے، چنانچہ فرماتے ہیں :-

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت سے اس لئے خطاب کیا ہے کہ اس کو دین کے حدود و ضوابط اور آداب و احکام سے واقف کرائیں، اس لئے ارباب دانش کو یہ اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ آپ کے احکام و حدود میں کوئی تضاد نہیں ہو سکتا، اگر آپ کے ایک خطاب اور دوسرے خطاب کے الفاظ مختلف معلوم ہوں تو اس کی وہی نوعیت ہے جو زیر بحث حدیث کے سلسلہ میں ہم نے بیان کی ہے، لیکن اگر کسی شخص کے ذہن میں یہ بات ہے کہ آپ کے خطاب میں تضاد ہے تو اس کو تلاش و تحقیق سے کام لینا چاہئے، اگر اس سے اس کا خلجان رفع نہ ہو — تو اس کو اپنے قصور علم و فہم کا اعتراف کرنا چاہئے کیونکہ اس میں درحقیقت اختلاف نہیں ہوتا، جب خدا نے رسول کے صدق کی ضمانت اور ذمہ داری لی ہے، تو پھر اس کے کلام میں تناقض کو کیسے باور کیا جاسکتا ہے، البتہ

ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیراً (نساء - ۱۱)	اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کا کلام ہوتا تو ضرور لوگ اس میں تفاوت پاتے -

منکرین حدیث بعض اوقات کمزور روایتوں کو صحیح روایتوں کے معارض قرار دے کر انکار حدیث کا سامان فراہم کرتے ہیں، امام طحاوی کی دوربین نگاہوں نے اس اشکال کو بھی حل کیا ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں ہے "عید کے دونوں مہینے یعنی رمضان اور ذی الحجہ ناتمام اور ناقص نہیں ہوتے" اس پر جو شبہات ہوتے ہیں ان کو رفع کرنے کے لئے پہلے وہ یہ روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا "چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور افطار کرو اور اگر چاند نظر نہ آئے تو ۳۰ دن پورے کرلو" اس سے ظاہر ہو گیا کہ رمضان کا مہینہ کبھی ۲۹ دنوں کا ہوتا ہے البتہ اس کی حیثیت دوسرے مہینوں سے اس لئے مختلف ہے کہ اس میں روزہ رکھا جاتا ہے۔ غالباً اسی وجہ سے عام ذہنوں میں یہ شبہ پیدا ہوا ہوگا کہ ۲۹ کو چاند ہونے سے روزہ میں نقص پیدا ہو جائے گا۔ اس لئے آپ نے فرمایا کہ چاند چاہے ۲۹ کو ہو یا ۳۰ کو، ان دونوں مہینوں کی فضیلت اور خصوصیت میں فرق نہیں آسکتا، اس توجیہ سے ظاہری تضاد خود بخود رفع ہو گیا، لیکن اس کے متعلق یہ جو روایت کی گئی ہے کہ ہر محترم و مقدس مہینہ ۳۰ دن کا ہوتا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس کے راوی عبدالرحمٰن بن اسحٰق کا پایہ حفظ و ضبط اور ثقاہت کے اعتبار سے گذشتہ روایت کے راوی خالد حذاء سے بہت کمتر ہے دوسرے یہ روایت مشاہدہ اور بداہت کے بھی سراسر خلاف ہے۔

(بقیہ صفحہ پر)

رنگا رنگ

عروج زیدی :—

روز افزوں تم پہ ہے شانِ ستم
تم بھی ثابت قدم، ہم بھی ثابت قدم

چومتا ہوں میں جب اُن کا نقشِ قدم
مجھ کو حسرت سے تکتے ہیں دیر و حرم

جب یہ سوچا کہ ان کو سنواریں گے ہم
بڑھ گئے اور بھی زلفِ گیتی کے خم

ہم سے ہے اعتبارِ وجود و عدم
زیست بھی معتقد، موت بھی محتشم

ہنستے ہنستے بھی آنکھوں میں اشک آ گئے
کوئی ہم سا نہیں دوستدارِ الم

ظلم پر چپ ہیں یوں مصلحت آشنا
جیسے اُن کے سروں پہ ہو تیغِ دو دم

کچھ زباں سے کہیں، یہ ضروری نہیں
اُن کا دامن بھی نم، اپنا دامن بھی نم

ناشناسوں کو یہ کیا بتاؤں عروج
شعرِ فانی میں غم ہے کہ عرفانِ غم

(اشعار جو غزل نہ بن سکے)

شاہد کوثر فاروقی :—

اگر اُجاڑنے والوں کے حوصلے یہ ہیں
ہمیں بھی ضد ہے یہیں آشیاں بنانے کی

تیز گامی تو کوئی رہبر نہیں، رہبر وہ ہے
شکست رفتاروں کو اپنے ساتھ جو لے کر چلے

کبھی محفل میں ہنستا ہوں تو کھوتا ہوں خلوت میں
کہ دم بھر کو تمہارے غم کا دامن چھوٹ جاتا ہے

آدمی کیا ہے یہ معلوم نہیں ہے لیکن
پا بہ زنجیر بھی ہے، رقص پہ مجبور بھی ہے

اُتر اُتر کے تہِ آب چن کر ڈھونڈتا ہے
کبھی کبھی وہی موتی ملے ہیں ساحل پر

عجیب شہر ہے سب خون پی رہے ہیں یہاں
مگر شراب کو ظالم حرام کہتے ہیں

اختر سکندروی :—

غمِ دل کے نکتہ چینو! کہیں دل لگا کے دیکھو
مجھے زخم دینے والو کوئی زخم کھا کے دیکھو

مرے دل کو سوزِ غم سے بڑی روشنی ملی ہے
کبھی تم بھی اپنے گھر میں یہ دیا جلا کے دیکھو

یہ بجا کہ ہے تبسم مرا مضمحل مگر تم
مری طرح فرطِ غم میں کبھی مسکرا کے دیکھو

کوئی آئے کس توقع پہ تمہاری انجمن میں
نہ نظر ملا کے دیکھو نہ نظر چرا کے دیکھو

مری چاک دامنی پر تو ہے سہل مسکرانا
کسی صاحبِ گریباں کا مذاق اُڑا کے دیکھو

عزیز سلوزوی :—

کچھ نہیں لوگ سب احسان و کرم آپ کے ہیں — جلوے بھی عام ہیں، یہ دیر و حرم آپ کے ہیں
آج یہ کیا ہے کہ تاثیر نے رُخ بدلا ہے — میرا افسانہ ہے اور دیدۂ نم آپ کے ہیں
پیکرِ صبر و سکوں، صورتِ تسلیم و رضا — سچ تو یہ ہے کہ ہر اک شکل سے ہم آپ کے ہیں

کیا قیامت ہے کہ میں خود بھی نہیں اپنا عزیزؔ
اور وہ مجھ سے یہ کہتے ہیں کہ ہم آپ کے ہیں

تری ہر ایک جفا ہے، مری وفا کا جواب — شکستِ شیشۂ دل کا جواب کیا ہوگا
مرا وجود ہے سرمایۂ جمالِ بہار — مرے بغیر چمن پہ شباب کیا ہوگا

سعید احمد سعیدی :—

اُس نے جب قصۂ وفا چھیڑا — ہم پشیماں تھے بے وفا کی طرح
لے قیاس و گمان و وہم سے دور — دل میں آ حرفِ آشنا کی طرح
وقت پہ بن گئے وہی پتھر — ہم نے پوجا جنہیں خدا کی طرح
دیکھئے کیا دکھائے صبحِ اُمید — رات تو کاٹ دی سزا کی طرح
ساتھیو آؤ دشتِ غربت میں — دردِ دل بانٹ لیں دوا کی طرح

اُس کی تقدیس کیا بیاں ہو سعیدؔ
جو رہے آنکھ میں حیا کی طرح

اکبر حمیدی :—

منظرِ شامِ تمنا نہیں دیکھا جاتا — مجھ سے یہ خون کا دریا نہیں دیکھا جاتا
خون ہی خون افق تا بہ افق ہے یارو — مجھ سے یہ سُرخ سویرا نہیں دیکھا جاتا
مقتلِ عشق میں وہ لوگ نہ آئیں ہرگز — جن سے خود اپنا تماشا نہیں دیکھا جاتا

روشن کیا ہے آتشِ نمرود نے مجھے — بجھنے لگا تھا، پھر سے اُجالا گیا ہوں میں
کندن ہی بن کے نکلوں گا زندہ رہا اگر — اپنے لہو کی آگ میں ڈالا گیا ہوں میں

ممتاز القادری :—

ازل سے زندگانی شوق کا عنوان ہے ساقی — مگر تو ہے کہ سب کچھ جان کر انجان ہے ساقی
کرم کو بھول جاتا ہے ستم کو یاد رکھتا ہے — یہ دل بیچارہ ہے کم ظرف ہے نادان ہے ساقی

جعفر حسن جعفر :—

مرا پیام ہے یہ انگبیں کو سم نہ کہو — کہے زمانہ مگر تم تو کم سے کم نہ کہو
غلط نہیں ہے کہ غم زندگی کا حصہ ہے — مگر خدا کیلئے زندگی کو غم نہ کہو
بس ایک لقمۂ تر کے لئے جو بک جائے — اُس ایک چوبِ مقطع کو تم قلم نہ کہو

خیال و فکر کی آوارگی نہیں مجھ سے — مجھے نیاز[1] کہو جوش یا عدم نہ کہو
ضرور تھا جو مرے ساتھ ہو لئے جعفر — جو ہو سکے تو انہیں میرا ہمقدم نہ کہو

وارث القادری :- یہ بھی پوچھنے کی بات ہے کوئی — جو خوشی آپ کی رضا میری
جن کو جینے کا بھی شعور نہیں — وہ بھلا، اور رہبری میری
کیا تمہاری ہنسی نہیں اس میں — لوگ اُڑانے لگے ہنسی میری

کامیاب وفا ہوا وارث
شکر ہے بات بن گئی میری

خورشید احمد افروز کاشمیری :- کچھ ایسے پھول کھلے اب کے گلستاں میں ندیم! — جو خواب میں بھی نہ دیکھے گا باغباں برسوں
نگاہِ خاص سے دیکھا ہے آج اس نے مجھے — ابھی رہوں گا مرے دوست! میں جواں برسوں

جمیل اختر :-

ہم نے ہی نام حق و صداقت کیا بلند — ٹھیرے ہیں پھر بھی ہم ہی گنہگار دوستو
نکلا ہے کوئی حلقۂ زنجیر توڑ کر — کیا تم نے بھی سنی کوئی جھنکار دوستو

ہر برگِ گل سے ٹپکے ہے خونابِ آرزو
گلشن کی شاخ شاخ ہے تلوار دوستو

تابش دہلوی :- کانٹوں پہ ہے نکھار گلوں پہ شباب ہے — اے جذبۂ جنوں ابھی موسم خراب ہے
غلام محی الدین اشرفی :- اپنی خرابیوں کو کوئی دیکھتا نہیں — ہر شخص کہہ رہا ہے زمانہ خراب ہے
محشر بدایونی :- کوئی غنچہ کھلے چونک پڑتا ہوں ایسے — جیسے میری ہی جانب ہے روئے سخن

استاد قمر جلالوی :-

اُس جگہ بزم میں ساقی نے بٹھایا ہے مجھے — ہاتھ پھیلاؤں تو جاتا نہیں پیمانے تک

دعا بہار کی مانگی تھی اتنے پھول کھلے — کہیں جگہ نہ رہی میرے آشیانے کو

چمن والو! قفس کی قید بے میعاد ہوتی ہے — جو تم چاہو تو مل جانا مرا آنا تو کیا ہوگا

---

[1] یہ نیاز فتحپوری نہیں، ظفر علی خانی دور کے نیاز ہیں، جو ممتاز شاعر اور ادیب ہیں، جن کے شہ پارے "مصور" کے نام سے روزنامہ "زمیندار" میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ آج کل اپنے وطن آیہ میں زندگی کے آخری ایام بسر کر رہے ہیں، اسلام اور فطرت ان کی تحریروں کے موضوعات ہیں۔

ہماری نظر میں

مقام صحابہؓ از:- مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، ضخامت ۷۲ صفحات، قیمت مجلد ۱ روپیہ ۶۰ پیسے، سفید کاغذ ۸۵ پیسے
ملنے کا پتہ:- مکتبہ آئین نسیم مارکیٹ، ریلوے روڈ لاہور

جناب عاصم نعمانی نے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی منتخب تحریروں سے یہ کتاب مرتب کی ہے جس سے روز روشن کی طرح ثابت ہوتا ہے کہ مولانا موصوف صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے بارے میں وہی اعتقاد اور جذبات عقیدت و احترام رکھتے ہیں جو اہل سنت والجماعت کا طغرائے امتیاز ہیں؛ مولانا موصوف لکھتے ہیں:-

● ــــ "صحابہ کرام کو برا کہنے والا، میرے نزدیک صرف فاسق ہی نہیں ہے بلکہ اُس کا ایمان بھی مشتبہ ہے من ابغضھم فببغضی ابغضھم (ترجمان القرآن اگست ۱۹۶۱ء)

● ــــ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد افضل الناس ابوبکر صدیقؓ ہیں، پھر عمرؓ بن خطاب پھر عثمانؓ بن عفان، پھر علیؓ ابن ابی طالب ــــ یہ سب حق پر تھے اور حق کے ساتھ رہے" (خلافت وملوکیت)

● ــــ "خلافت راشدہ کا یہ دور جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، ایک روشنی کا مینار تھا، جس کی طرف بعد کے تمام ادوار میں فقہاء و محدثین اور عام دیندار مسلمان ہمیشہ دیکھتے رہے اور اُسی کو اسلام کے مذہبی سیاسی اخلاقی اور اجتماعی نظام کے معاملہ میں معیار سمجھتے رہے" (خلافت وملوکیت)

● ــــ "صحابی کی تعریف میں اگرچہ سلف میں اختلاف ہے مگر حضرت معاویہؓ کو ہر تعریف کے لحاظ سے شرف صحابیت حاصل ہے، آپ کے بعض انفرادی افعال محل نظر ہو سکتے ہیں، مگر بہ حیثیت مجموعی اسلام کے لئے آپ کی خدمات مسلم اور ناقابل انکار ہیں اور آپ کی مغفرت اور اجر یقینی امر ہے" (خط بنام محمد سلیمان صاحب صدیقی کراچی ــ ۱۰ راکتوبر ۱۹۶۵ء)

جو لوگ مولانا موصوف کو صحابہ کرام کی عقیدت و احترام کے مسئلہ میں بدنام کر رہے ہیں، وہ کوئی ثواب اور نیکی کا کام نہیں کر رہے کسی شخص کے عقیدے، مسلک اور رجحان کے خلاف، اُس سے باتیں منسوب کرنا اہل حق کو زیب نہیں دیتا۔

اس کتاب کی مقبولیت کی دلیل یہ ہے کہ مئی ۱۹۶۸ء سے لے کر اگست ۱۹۶۸ء تک چار مہینہ کی مدت میں اس کے تین ایڈیشن نکل چکے ہیں؛ جناب عاصم نعمانی جو اس کتابچہ کے مرتب ہیں اور مکتبہ آئین جو اس کا ناشر ہے مبارکباد کے مستحق ہیں!

اسلام کا نظام تقسیم دولت از حضرت مولانا مفتی محمد شفیع مدظلہ ضخامت ۷۶ صفحات، قیمت ایک روپیہ ۲۵ پیسے
ملنے کا پتہ:- ادارہ اسلامیات ۱۹۰- انارکلی، لاہور ــــ ادارۃ المعارف - کراچی ۱۴

راولپنڈی میں جو بین الاقوامی اسلامی کانفرنس منعقد ہوئی تھی، یہ مقالہ حضرت مفتی صاحب نے اُس کے لئے مرتب فرمایا تھا یہ مقالہ جب وہاں پڑھا گیا۔ تو علماء کرام اور ارباب فکر نے اس کی تحسین کی! پھر یہ مقالہ متعدد رسالوں میں نقل کیا گیا، اب اسے مولانا خلیل الرحمن مظاہری کی نگرانی میں مکتبہ دارالعلوم کراچی ملا نے بڑی آب و تاب کے ساتھ کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ اس کے بعض اہم ابواب عنوانات دولت اور ملکیت کی حقیقت ـــــ تقسیم دولت کے اسلامی مقاصد ـــــ اشتراکیت اور اسلام ـــــ سرمایہ داری اور اسلام حرمت سود کا اثر تقسیم دولت پر ـــــ کرایہ اور سود کا فرق ـــــ اجرتوں کا مسئلہ ـــــ زکوٰۃ . . . . . !

کوئی شک نہیں یہ مقالہ اپنے موضوع پر صحیفۂ تحقیق اور شہ پارہ فکر و تدبر ہے۔ حضرت مفتی صاحب نے معاشیات کی جدید مسلمات کے پیش نظر، عقل و نقل اور تجربہ و تجزیہ کی روشنی میں اس حقیقت کو ثابت اور واضح کیا ہے کہ اسلام کا نظام معیشت اور نظام تقسیم دولت اشتراکیت اور سرمایہ داری سے ہر حالت میں بہتر ہے' اس میں "انتہا پسندی" نہیں فطری اعتدال ہے، دنیا میں اسلامی نظام معیشت اگر نافذ کر دیا جائے تو محنت و سرمایہ کی کشمکش کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ سرمایہ داری اور اشتراکیت کی لعنت نے دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے' اسلامی نظام معیشت اس جہنم کو جنت بنا سکتا ہے۔

امیر حزب اللہ از:- ڈاکٹر عبدالغنی، ضخامت ۴۳۲ صفحات (مجلد۔ حضرت امیر حزب اللہ کے فوٹو کے ساتھ) قیمت قسم اعلیٰ کرنافلی پندرہ روپیہ، قیمت اولڈ نیوز پرنٹ تیرہ روپے' ملنے کا پتہ:- ادارہ حزب اللہ جلال پور شریف۔

"حزب اللہ" اور اس کے بانی جناب ابوالبرکات سید محمد فضل اللہ شاہ کا نام اور کام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ ۱۹۳۷ء میں "حزب اللہ" کا قیام عمل میں آیا، اور جناب سید محمد فضل شاہ صاحب بہ اتفاق رائے اس کے امیر منتخب ہوئے' اس ادارے کے وجود میں آنے کا مقصد "حکومت الہیہ کا قیام تھا، امیر حزب اللہ نے اس مقصد کے لئے ایثار و قربانی اور جفاکشی کا ثبوت دیا، انہوں نے بعض اوقات پیدل بھی سفر کیا اور گاؤں گاؤں جا کر اس پیغام کو پہونچایا۔ انگریزی دور میں جن اہم مسائل سے ملک کو دوچار ہونا پڑا، حضرت سید محمد فضل شاہ صاحب نے اُن سے بھی عہدہ برآ ہونے کی جد و جہد فرمائی، حضرت موصوف نے ہندوستان سے باہر جو سفر کیا، اس سفر اور سیاحت میں بھی اسلامی دنیا کی بین الملی مسائل پر نگاہ رکھی، تصوف اور سیاست کا ایسا اجتماع کم ہی دیکھنے میں آیا ہے! جناب سید صاحب موصوف تقریر و تحریر میں بھی ید طولیٰ رکھتے ہیں آپ کے قلم سے شعلے بھی نکلے ہیں اور شبنم کی بارش بھی ہوئی ہے، آپ کی تحریروں نے مسلمانوں میں جوش جہاد اور عزت و خودداری کے ساتھ زندہ رہنے کا ولولہ پیدا کیا ہے۔

اس کتاب پر جناب شاد فاروقی نے ایک بسیط مقدمہ لکھا ہے، شاد صاحب تصوف سے بہت متاثر ہیں! تصوف کی حمایت میں وہ اس مبالغہ کی حد تک پہونچ گئے ہیں ۔

"سیدنا حضرت آدم علیہ السلام سے اسلام میں روحانی زندگی کا آغاز اور تصوف کی ابتدا ہوتی ہے" (ص الف) حضرت آدم علیہ السلام سے "تصوف" کی نسبت عجیب و غریب ریسرچ" ہے، جس کی اولیت کا سہرا شاد فاروقی صاحب کے سر پر بندھنا چاہئے ؛ ؟ ؟

"لیکن ذات باری تعالیٰ میں اور انسان میں ما بہ الاشتراک کوئی چیز بھی نہیں کیونکہ وہ خدا ہے اور یہ بندہ، وہ خالق یہ مخلوق، وہ رب یہ مربوب، یہ عبد وہ معبود، وہ بے کفو و شریک جس کی نہ مثال نہ مثیل نہ ضد نہ ، ذات میں یگانہ، صفات میں یکتا، اول، آخر، ظاہر، باطن، ازلی ابدی، حی و قیوم، بھلا انسان بے چارے کی اس ذات پاک سے کیا نسبت"؟

تا و فاروقی صاحب کی یہ عبارت جو "توحیدِ خالص" کی ترجمان ہے، آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے۔

"فقر و درویشی کے اس پیکرِ جلال کے سامنے امیر معاویہ بہ ہمہ جاہ و جلال اور شکوہ و عظمت دم مارنے کی جرأت نہیں کر سکتے اور کھسیانے ہو کر رہ جاتے ہیں" (صـ۶)

"امیر معاویہ کھسیانے ہو کر رہ جاتے ہیں"؟ یہ کس قدر سطحی اور عامیانہ اندازِ بیان ہے!

اس کتاب میں فاضل مرتب نے جناب ابو البرکات سید محمد فضل شاہ صاحب کے حالاتِ زندگی بڑی تفصیل سے پیش کئے ہیں اور عقیدت و احترام کا حق ادا کر دیا ہے، حضرت شاہ صاحب کے اقوال و ملفوظات میں روحانیت جگمگاتی ہوئی نظر آتی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ مصنف کی عقیدت اُس غلو تک پہونچ گئی ہے جس سے دین میں روکا گیا ہے، اس کتاب میں ایسی باتیں بھی ملتی ہیں، جو دینی نقطۂ نگاہ سے محلِ اعتراض ہیں اور اُن پر نکیر ہی کرنی چاہئے:

"سنگِ مرمر کا مقبرہ بنوا کر، اس پر مطلّا اور مذہب نقش و نگار سے گلکاری کرائی گئی" (صـ۷)

جس نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قبروں کو پختہ اور چونہ (مجصص) کرنے سے روکا تھا، اس کی امت نے مزاروں اور مقبروں کو مطلّا اور مذہب کر کے چھوڑا، حیرت ہے کہ ایسی خلافِ شریعت باتوں کو، ڈاکٹر عبدالغنی جیسے اہلِ قلم اور سوانح نگار فخر کے ساتھ پیش کرتے ہیں، جیسے دین و شریعت اور روحانیت کا یہ کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا گیا ہے۔

"صاحبزادہ کی عمر ۱۵ سال تھی، سید محمد مظفر شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصرار پہ حضرت اعلیٰ نے صاحبزادہ کو بیعت فرما لیا تھا، اور اس سفر سے پہلے خرقۂ خلافت بھی عطا فرما دیا تھا۔ اب مقصود یہ تھا کہ تکمیلِ تربیت ہو اور حضرت خواجہ شمس العارفین قدس سرہٗ العزیز سے وہ فیوضاتِ باطنی دلائے جائیں، جو صاحبزادہ صاحب نے اس دربارِ مقدس سے حاصل کرنے تھے" (صـ۱۵)

اگر اسلام میں دین و شریعت اور روحانیت کے امتیاز کے لئے نیابت و خلافت کے خرقے دینے کا رواج ہوتا تو خلفاءِ راشدین کے آثار میں اس کا ثبوت ملنا چاہئے تھا! ہر مسلمان اپنے عمل سے دین میں ترقی کرتا ہے، باطنی فیوض کسی کو دلائے نہیں جا سکتے اور نہ خاندانوں میں ان کی وراثت چلتی ہے۔

"شعراء میں مولانا عاشق حسین سیماب وارثی اکبر آبادی کو درجہ امتیاز حاصل ہے۔ سرکارِ حیدریؒ میں انہیں فی الواقعہ وہ مقام حاصل ہے، جو سرکارِ مدنی میں حسان بن ثابتؓ کو حاصل تھا" (صـ۲۹)

"سرکارِ حیدری" اور "سرکارِ مدنی" میں جو "برابری" کا انداز پایا جاتا ہے وہ قلبِ مومن کے لئے کس قدر تکلیف دہ ہے! اس عبارت کے اندازِ فکر اور اس غلوِ عقیدت سے ہزار بار توبہ!

نقشۂ فردوس ہے تصویرِ بیت اللہ ہے　　پیر حیدر شاہ کی درگاہ کیا درگاہ ہے

کیا کسی بزرگ کی درگاہ کو "تصویرِ بیت اللہ" کہا جا سکتا ہے!

"جب رسولِ مقبول صلعم نے وفات پائی . . . . تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا برا حال ہوا . . . پتھروں سے سر ٹکراتے، دریاؤں میں غوطے کھاتے، خودکشی کرتے . . . ." (صـ۳۱)

مدینہ منورہ میں دریا کہاں تھے، جس میں حضرت بلالؓ غوطہ زنی کرتے تھے، اور حضرت بلالؓ سے "خودکشی" کی نسبت یہاں پر تہمت ہے۔

"آپ نے حضرت خواجہ غریب نواز کی روح سے استمداد کی درخواست کی۔" (ص ۶۴)

اولیاء سے استمداد و استغاثہ یہ عمل اور عقیدہ دین و شریعت کے خلاف ہے ،

"فاتحہ کے بعد استدعا کی ، بہت سے آدمی حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کی روح اطہر سے استمداد کے لئے جالی کے اندر ہاتھ پھیلائے ہوئے تھے ؛ اور مطالب براری اور حوائج کے پورا ہونے کے لئے التجا کر رہے تھے" (ص ۲۶)

بزرگوں کی قبروں پر جا کر اُن سے استمداد اور حاجت براری کی التجا ، توحید کے تقاضوں کی عین ضد ہے ۔۔

"... سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے فتح کرنے کے وقت سے کر اسلامی جھنڈا با قاعدہ بیت المقدس میں لہراتا تھا ، اور صاحبزادہ صاحب کے پاک دل نے کہا انشاء اللہ یہ جھنڈا وہاں ہمیشہ لہراتا رہے گا" (ص ۳۵)

صاحب زادہ صاحب کی تمنا بہت مبارک تھی مگر اُن کے "پاک دل" کا کہا پورا نہیں ہوا !

"جہاں سیدنا زین العابدین رضی اللہ عنہ ہر روز ہزار رکعت نفل پڑھا کرتے تھے" (ص ۱۴۹)

حضرت زین العابدین رضی اللہ بہت بڑے عابد و زاہد تھے مگر دن بھر کی مدت میں ایک ہزار رکعت پڑھنے کی روایت مبالغہ آمیز ہے ۔

"حالانکہ فقہا نے اپنے والدین کی قبر پر بوسہ دینا مستحسن بلکہ سنت لکھا ہے" (ص ۱۶۹)

حجر اسود کے علاوہ اور کسی مقام کو بوسہ دینا درست نہیں ہے ؟ جو فقہا والدین کی قبر کو بوسہ دینا جائز سمجھتے ہیں ، حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اُن کے قول پر نکیر کی ہے ۔

"حضور نے مسند نشین ہوتے ہی تعمیر روضہ اطہر کی طرف توجہ شروع کر دی" (ص ۲۴۳)

"حضور" رسول اللہ علیہ وسلم کے لئے اور "روضہ اطہر" بھی حضور کے مزار مبارک کے لئے بولا اور لکھا جاتا ہے ، اس کتاب کے لکھنے والے عقیدت کے جوش میں "فرق مراتب" کو ملحوظ نہ رکھ سکے ! قبروں پر عمارتیں اور گنبد بنانے کی شریعت میں ممانعت آئی ہے ، حیرت ہے کہ "حضرت" نے مسند نشین ہوتے ہی اس کام کا آغاز فرمایا ، جو دین میں پسندیدہ نہیں ہے ــــ اس بارے میں ان کو اس قدر غلو تھا کہ مقبرے کی عمارت ــــ

"عہد مغلیہ کی عمارات کے ہم پلہ ہو"

بادشاہوں کی عمارتوں سے ہمسری کا جذبہ ...... ؟ اسے کیا کہا جائے ،

"اس عمارت جمیل و جلیل کی تکمیل ۱۹۲۴ء میں ہوئی ، ایک پورے چار سال تک بیسیوں مزدور ، متعدد کاریگر اور کئی نگران کار شب و روز کام کرتے رہے اور پھر یہ معجزۂ فن جلوہ افروز ہوا اس زمانہ کے حساب سے کم و بیش دو لاکھ روپے خرچ ہوئے" (ص ۲۳۵)

مقبروں پر مال و دولت کا یہ صرف دینی نقطۂ نگاہ سے اسراف بیجا ہے اور تبذیر بھی ہے !

رسالہ "صوفی" کا ایک اقتباس اس روضہ کی تعریف میں نقل کیا گیا ہے ۔

"... وسیع الفیوض کعبۂ مرادات ہے جہاں فرشتے رحمتوں اور برکتوں کے بادے کر آتے ہیں قدسیان فلک دست بستہ کھڑے ہوتے ہیں اور وحش و طیور اس مقام کے طواف کو حیات کا حاصل سمجھتے ہیں ... یہ وہ مقدس دربار ہے جہاں حاجت مندوں کے پرے اپنی تمنائیں اور مرادیں ہاتھ میں لئے کھڑے ہیں ...." (ص ۲۳۵)

"قدسیانِ فلک دست بستہ کھڑے ہیں" ـــــ یہ الفاظ بعینہٖ رسول کو زیب دیتے ہیں ــــ مندرجہ بالا عبارت کے باقی اجزاء "مشرکانہ عقیدہ" کی ترجمانی کرتے ہیں، خود روضۂ رسول پر صلوٰۃ و سلام کے بعد دُعا اور التجا اللہ تعالیٰ ہی سے کرنی چاہئے، صحابہ کرام کا یہی معمول تھا۔

"جلال پور شریف میں خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کی تجلیات عرفان چشم ظاہر و باطن سے دیکھ لینے کے بعد سیماب صاحب پر دوسرا اثر یہ ہوا کہ عالم اور ما فی العالم سے بالکل بے نیاز ہو گئے، فقر کی وہ دولت نصیب ہوئی کہ ارباب جاہ و اقتدار کو خاطر میں نہیں لاتے تھے" (ص۲۲۹)

مولانا سیماب اکبرآبادی کے بارے میں جو باتیں کہی گئی ہیں وہ سرتاپا بے اصل اور خلاف واقعہ ہیں۔

انگریزی دورِ حکومت میں ابوالبرکات سید محمد فضل شاہ صاحب کے خاندان والوں کو بڑے مراتب و اعزاز میسر آئے، کوئی صاحب کونسل آف اسٹیٹ کے رکن منتخب ہوتے، کسی کو "نواب" اور "سر" کا خطاب ملا، کوئی صاحب ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر مقرر ہوئے ــــ فاضل مصنف لکھتے ہیں کہ:-

"پیر بھائی خاندان عالیہ کی اس حیرت انگیز ترقی کو حضرت اعلیٰ کی کرامت سمجھتے تھے اور بے حد خوش ہوتے تھے"۔ (ص۲۵)

حیرت ہے کہ اپنے خاندان والوں کو حضرت اعلیٰ نے اپنی کرامت کے زور سے سرکار، دربار، جاہ و اقتدار اور مال و دولت کے جھمیلوں میں اُلجھا دیا، مگر مولانا سیماب اکبرآبادی کو فقر کی ایسی دولت عطا فرمائی کہ عالم اور ما فی العالم سے وہ بے نیاز ہو گئے

"مجلس عرس میں اولیاء کرام کی ارواح طیبہ شامل ہوتی ہیں" (ص۳۳)

کتاب و سنت میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، خود "عرس" ہی دین میں بدعت ہے!

"معترضین کو اس بات کا ہرگز علم نہیں کہ اس فقیر کو اللہ تعالیٰ کی جناب میں کیا منصب حاصل ہے اور کس قدر قرب" (ص۱۹۹)

یہ امیر حزب اللہ سید فضل شاہ صاحب کا قول ہے ـــــ حالانکہ کسی صحابی نے اللہ تعالیٰ کے دربار میں اپنے قرب و منصب کا اظہار لوگوں پر نہیں کیا۔

"راجہ غضنفر علی خان جیسی شخصیتیں طویل سالوں کے بعد پیدا ہوتی ہیں آپ پاکستان کے مایۂ ناز سپوت تھے اور آپ کی حب الوطنی ہمیشہ یادگار اور مشعل راہ رہے گی، راجہ صاحب مرحوم دارِ آخرت سے بجا طور پر نوجوانانِ ملت کو پکار سکتے ہیں۔

زیارت گاہِ اہل عزم و ہمت ہے لحد میری
کہ خاکِ راہ کو بخشا ہے میں نے ذوقِ الوندی (ص۲۷)

راجہ غضنفر علی خان کی قبر بھی "زیارت گاہِ اہل عزم و ہمت" بن گئی، یا بننے کے قابل ہے!

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے

"حضور ہی غوث وقت اور قطب زماں ہیں"

غوث اور قطب کے یہ مناصب صدیوں بعد وضع کئے گئے ہیں، قرون اولیٰ میں ان کا کوئی نشان اور اتا پتا نہیں ملتا؛ پیدا طینوں کا

تماشا ہوا عقیدہ ہے کہ ائمہ اور بزرگ قبروں اور مزاروں سے نظام کائنات کو چلاتے ہیں۔

"پاکستان کے قیام و بقا سے آپ کو والہانہ شیفتگی ہے اس لئے متعدد بار آپ نے فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں صدر پاکستان کی ان مساعی جمیلہ کو سراہا ہے" (صفحہ ۵۹۵)

مگر ملک میں آج تک نہ معروف قائم ہوئے نہ منکرات پر کوئی پابندی لگی، اس طرف حضرت شاہ صاحب کا دھیان ہی نہ گیا۔

"اذا تم الفقر فهو الله — حضور نے اچانک بندہ کی طرف رخ کر کے فرمایا، تیرا اعتقاد درست ہے، مولانا روم اسی لئے کہتے ہیں

اولیاء اللہ و اللہ اولیا (صفحہ ۵۶۵)

بندے اور خدا کے فرق و امتیاز کو جس کسی کا بھی قول مجروح کرتا ہو، وہ رد کر دینے کے قابل ہے! کوئی شخص فقر و تصوف کے تمام مقامات کی تکمیل کرلے پھر بھی وہ بزرگ اللہ تعالیٰ کا محتاج اور بندہ ہی رہتا ہے، وہ "خدا" نہیں بن جاتا۔

"منشی صاحب ہر روز بوقت صبح روضہ انور کا سات بار طواف کیا کرتے تھے" (صفحہ ۵۸۵)

کعبۃ اللہ کے علاوہ کسی قبر، روضہ، مشہد اور یادگار کا طواف کرنا جائز نہیں، ایسا کرنے والا گنہگار ہوتا ہے۔

"عرس مبارک میں جب آپ نے شمولیت فرمائی، اور روضہ مبارک پر حاضری کے وقت دروازہ بند کر کے صاحبزادہ صاحب کے ساتھ اندر ہے تو گویا انہیں معرفت و ولایت کی دستار فضیلت اپنے فیاض پیر و مرشد کے بابرکت ہاتھوں سے زیب سر کرائی، اس لئے صاحبزادہ کا وجود اطہر مجسم کرامت بن گیا" (صفحہ ۶۰۵)

روضہ کا دروازہ بند کرنے سے صاحبزادہ کا جسم "مجسم کرامت" بن گیا۔ یہ وہ عقیدت ہے جو پیروں کو "مافوق الانسان" کر چھوڑتی ہے!

"مقولہ ہے — الشيخ في قومه كالنبي في أمته" اپنی قوم میں شیخ زماں کا وہی مقام ہوتا ہے جو نبی کا امت میں ...." (صفحہ ۶۱۶)

یہ جس کا بھی مقولہ ہے سراسر لغو ہے! شیخ زماں کو نبی کے برابر ٹھہرانا، ضلالت اور شدید قسم کی ضلالت ہے اسی قسم کے اقوال و (؟) سے تو قادیانی دلیلیں لاتے ہیں۔

میاں خدا بخش کا حلفیہ بیان درج کیا ہے کہ یہ شخص عرصہ دراز تک بیمار رہنے کے بعد مرگیا اس کی روح کو فرشتے آسمان پر لے گئے، وہاں اس کا حساب و کتاب ہوا، حساب بالکل صاف نکلا اور خوشنودی الٰہی کا پروانہ مل گیا۔

"اس وقت ندا آئی کہ سید محمد فضل شاہ صاحب سفارش فرماتے ہیں کہ خدا بخش کو واپس بھیجا جائے لیکن میں نے انکار کر دیا، میں نے عرض کی اب تو خداوند کریم کی رضامندی حاصل ہو گئی ہے دنیا میں گیا تو غلطیاں سرزد ہوں گی گرفت ہو گی اور مجھے آخرت کی رسوائی نصیب ہو گی، اس وقت مجھے یقین دلایا گیا کہ پھر آنے پر تمہیں موجودہ درجہ ضرور ملے گا فکر نہ کرو، اس یقین دہانی کے بعد میں زمین پر واپس آگیا، میرے وجود میں حرکت پیدا ہوئی، آنکھ کھلی تو دیکھا چارپائی کے اردگرد تمام رو رہے ہیں، مجھے پھر زندہ دیکھ کر سب حیران ہو گئے" (صفحہ ۶۲۹)

اگر کوئی قسم کھا کر بھی ایسی ہوائی تباہی بات بیان کرے تو اُسے تسلیم نہیں کیا جائے گا، اس روایت میں دینی اعتبار ت

اول تو یہی بات غلط ہے کہ "آسمان پر مرنے والے کی روح سے حساب کتاب لیا گیا تھا۔ حساب و کتاب تو قیامت کے دن لیا جائے گا
اس واقعہ کو اگر خواب سمجھ لیا جائے کہ بیماری کی شدت سے اس شخص پر غشی طاری ہو گئی تھی اور وہ مردانہ تھا، اس عالم خواب غشی میں اس نے
یہ سب کچھ دیکھا، تو اس خواب کی توجیہہ و تعبیر ہو سکتی ہے!

"سفر زیارت پیر و مرشد طریقت ذمہ دار" (ص ۲۱) یہ عقیدہ صوفی صدری غلط ہے۔ ہر سفر میں اللہ تعالیٰ ہی ضامن اور حافظ و نگہبان ہوتا ہے۔ "امام ضامن" باندھنے کی رسم بھی غیر اسلامی رسم ہے!

> "میاں احمد دین درزی حضور کی قدمبوسی کے لئے جلال پور شریف حاضر ہوئے، حضور روضہ شریف کی فاتحہ خوانی کے بعد واپس محل تشریف لا رہے تھے کہ انہوں نے جھک کر قدمبوسی کی۔ حضور نے ایک خاص نظر سے دیکھا اور پھر یہ حالت ہو گئی کہ جہاں کہیں بھی کوئی بات ہونے والی ہوتی، انہیں اطلاع مل جاتی" (ص ۶۲)

حالانکہ یہ معجزہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک سے ثابت نہیں ہے ۔ کہ جہاں بھی کہیں کوئی بات ہونے والی ہوتی تھی اس کی حضور کو خبر ہو جاتی تھی ۔ مشہور واقعہ ہے کہ غزوہ تبوک کے سفر میں سیدنا عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جنگل میں اکیلی رہ گئیں اور نبی کریم اور صحابہ کرام کی جماعت کو اس کی خبر نہ ہو سکی۔

> "پیر صاحب نے انہیں بتایا ہم سفید لوگ سادات عظام اور پنجتن پاک پر زبردست عقیدہ رکھنے والے ہیں اگر یہ سچ ہے تو میں آپ کو بتا دوں کہ جس وقت امیر حزب اللہ پالکی سوار تھے، میں نے یوں سمجھا کہ آپ اس وقت عرش بریں سے نبی اکرم، علی مرتضیٰ اور حسنین کی شان لے کر اترے ہیں (ص ۲۹)

جس بدبخت نے یہ بات کہی تھی، اس کے منہ میں مٹی ڈال دینی چاہئے تھی، یہ قول کیا شاہ صاحب کی مدح و منقبت میں نقل کرنے کے قابل تھا۔ عرش بریں سے اترنا اور "نبی اکرم" کی شان لے کر اترنا ـــــ ایسی باتیں ایک مسلمان کے زبان و قلم سے بھلا نکل سکتی ہیں! استغفر اللہ
شاہ صاحب خود اپنے بارے میں فرماتے ہیں :۔

> "میرے کان چونکہ حقیقی سماعت رکھنے والے تھے، میری آنکھیں چونکہ حقیقت بین واقع ہوئی تھیں اور میرا دل دانائے راز ـــ اس لئے میں نے خلاق آواز کو پوری توجہ سے سنا، قدرت کے غیر مرئی مگر شان نزول رینے والے ہاتھ کے اشاروں کو دیکھ لیا" (ص ۴۲)

جن مریدوں کی تربیت اس ماحول میں ہوگی وہ اپنے پیروں کے بارے میں غلو عقیدت سے نہیں بچ سکتے! پیروں کے ان دعووں کے بعد عقیدت مند مرید جو کچھ بھی انہیں سمجھنے لگیں، تھوڑا ہے۔

طواف کرتے ہیں انوار ذات اقدس کا کہ حسن مصطفوی روئے رشک ماہ میں ہے
ہے ان کا نطق حمزہ، فصاحت جبریل مزاج خوئے نبی خلق فضل شاہ میں ہے

اس سے قطع نظر کہ یہ اشعار شاعرانہ نقطۂ نگاہ سے کتنے پست ہیں ـــ ان میں شاہ صاحب کو ذات رسالت مآب کا ہمسر اور شبیہ بنا کا جو جذبہ کار فرما ہے، وہ نفرت اور ملامت کا مستحق ہے۔

اصل تو بر فضل تو آمد گواہ اسم پاکت شد "محمد فضل شاہ"

"اسم پاک" اللہ تعالیٰ کے "اسم" کے لئے بولا اور لکھا جاتا ہے ـــ سبحان اللہ عما یصفون
حقیقت میں مشکل کشا، غریب نواز، اور "داتا" تو اللہ تعالیٰ ہے مگر عقیدت مندوں نے یہ القاب بعض اولیاء اللہ سے منسو

کر دیتے ہیں، حضرت خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کو "غریب نواز" اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ کو "محبوب سبحانی" کہا جاتا ہے ——— مگر جلالپور کے خانوادۂ تصوف میں بھی بعض بزرگ "غریب نواز" اور "محبوب سبحانی" گزرے ہیں۔

"بیماری کا غلبہ پاؤں ہاتھوں اور زبان پر بہت زیادہ تھا، چلنا پھرنا بند ہو گیا، بمشکل آپ اس قابل ہوئے کہ کسی کے سہارے سے یا تنہا چند قدم اٹھاتے تھے، دائیں ہاتھ پر سوجن نمودار ہو گئی اور اس کی انگلیاں سیدھی نہیں ہو سکتی تھیں، بایاں ہاتھ بھی کمزور پڑ گیا، زبان مبارک پر لکنت کا غلبہ ہو گیا، الفاظ کا ادا کرنا سخت مشکل ہو جاتا تھا۔ ——— " (ص ۱۰۵)

یہ سید فیض شاہ صاحب کی حالت بیان کی گئی ہے، حیرت ہے کہ مرید اس بات کو نہیں سوچتے کہ جو شاہ صاحب فالج کے حملہ کو نہیں روک سکتے اور جو مفلوج ہو کر چند قدم بھی کسی کے سہارے کے بغیر نہیں چل سکتے وہ مریضوں کو شفا کس طرح بخش سکتے ہیں اور ان کے بارے میں یہ عقیدہ کس طرح قائم کیا جا سکتا ہے کہ وہ سارے جہان کے دستگیر اور مشکل کشا ہیں۔

"اگرچہ راقم سطور کی بے خبری اظہر من الشمس ہے پھر بھی یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ حضور کا موجودہ مقام جمالی و جلالی کا مرتبہ ہے جس پر اغواث و اقطاب فائز ہوتے ہیں، اور کون و مکاں کی باگ ڈور اُن کے حوالے کر دی جاتی ہے، اس وقت وہ جو کچھ چاہتے ہیں ہو جاتا ہے، دکھائی کہیں دیتے ہیں موجود کہیں ہوتے ہیں . . . . . اُن کے اشارۂ ابرو سے امور مملکت طے پاتے ہیں" (ص ۱۱۵)

یہ عقیدہ "مشرکانہ عقیدہ" ہے اللہ تعالیٰ نے کسی بندے کو بھی کون و مکاں کی باگ ڈور حوالے نہیں فرمائی، اللہ تعالیٰ کائنات کا نظام خود چلا رہا ہے کیا اللہ تعالیٰ ایسے بندوں کو کائنات کی باگ ڈور حوالے کر سکتا ہے اور وہ بار خداوندی اٹھا سکتے ہیں، جو مفلوج ہو کر چل پھر بھی نہ سکیں اور اُن کی زبان ٹھیک طرح الفاظ بھی ادا نہ کر سکے!

ڈاکٹر عبدالغنی مشتاق انشا پرداز نہیں ہیں کتاب میں زبان و بیان کی غلطیاں اور کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔

"بڑا سجادی اژدہام موجود تھا" (ص ۲۱) "موجود" زاید ہے۔ "مسلمانوں نے اب فاتح ٹیم سے کھیلنا تھا" (ص ۶۲) مسلمانوں کو اب فاتح ٹیم سے کھیلنا تھا" صحیح زبان ہے ——— "اس میں ضروری کتابیں، پارچات اور کچھ مختصر سا سامان تھا" (ص ۸۰) ڈاکخانہ، پارچہ وغیرہ کی جمع میں "جات" لگانے کا قاعدہ ہے ــــ پارچہ جات، ڈاکخانہ جات!

"شیخ . . . . . کی مزار پر فاتحہ پڑھتے ہوئے" (ص ۹۱) "مزار" بالاتفاق مذکر ہے ——— "ادھر خود ہندوستان میں ایک محشر رونما ہو چکی تھی" (ص ۹۴) جن لوگوں کو تذکیر و تانیث تک کا پتہ نہیں ہے انہیں کتابیں لکھنے کی کیا مار پڑی ہے۔ "محشر" کسی اختلاف کے بغیر مذکر ہے ہاں! "قیامت" مونث ہے ـــ "رضاکاروں سے حلف لی جاتی تھی" (ص ۳۹) "حلف" بھی مذکر ہے ـــ "ذرا حضور کے ان سالوں کے خطبات پڑھ کر دیکھیں" (ص ۱۵۵) "سالوں" کی بجائے "اس زمانے" یا "اس مدت" لکھنا تھا۔

صفحہ ۱۰۶ پر "نفخۃ الیمن" کی بجائے "نفحۃ الیمن" پڑھنا چاہئے، یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ "اسٹیشن ملاڈ" (ص ۹۵) یہ "ملاڈ" نہیں "ملاڈ" صحیح ہے، بمبئی کا مشہور مضافاتی ریلوے اسٹیشن ـــ "بحیرۂ روم کا طلاطم" (ص ۱۱۲) لکھے پڑھے لوگ "تلاطم" لکھا کرتے ہیں، "طلاطم" بالکل غلط املا ہے ——— "مصر کا نیل حریت ناغول پاشا" (ص ۱۴۴) اصل نام "ناغلول پاشا" ہے وہ غار بھی دور سے نظر آتی تھی" (ص ۱۹۶) "غار" بھی مذکر ہے ——— "روحانی فتوحات سے استفادہ کثیر حاصل ہوا" (ص ۱۳۹) "استفادہ" کے ساتھ "حاصل" حشو و زاید ہے!

اس قسم کے ملفوظات اور سوانح عمریوں نے مسلمانوں کے ذہن و فکر کو غلط راہ پہ ڈالا ہے! اور مسلمانوں کو مشائخ اور پیروں کی اس
تقیت میں مبتلا کیا ہے جو "پرستش" کی حد تک پہنچ جاتی ہے! جہاں جہاں شاہ صاحب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات
ے مشابہت دی گئی ہے، وہ مقامات ایک مسلمان کے لئے کس قدر تکلیف دہ ہیں، ڈاکٹر عبدالغنی صاحب کو ایسی باتوں سے توبہ کرنی چاہیے
نده میں الوہیت کا رنگ پیدا کرنا چاہا ہے، وہ مقامات بھی ناقابل برداشت ہیں اور غیرت توحید اُن کو کسی طرح گوارا نہیں کر سکتی

لۂ آزادی

از :- کیف بنارسی، ضخامت ۱۶۵ صفحات و مجلد، رنگین گردپوش، قیمت خصوصی ایڈیشن ۵ روپے، مقبول عام ایڈیشن ۳ روپے۔ ملنے کا پتہ :- مکتبہ کیف ۱۴۴- کورنگی ٹاؤن کراچی ۳۱

جناب کیف بنارسی اپنی طالب علمی کے زمانہ ہی سے تحریک پاکستان کے پرجوش موید اور مبلغ رہے ہیں، انہوں نے تحریر، تقریر
عری کے ذریعہ مسلمانوں میں جوش و ولولہ پیدا کیا ہے، تقسیم ہند کے بعد وہ اپنا سب کچھ لٹا کر پاکستان میں آئے اور یہاں
نت بازو سے کمایا! قائداعظم مرحوم کے وہ انتہائی عقیدت مند ہیں!
کیف بنارسی کی نظموں میں خاصہ جوش اور ولولہ پایا جاتا ہے وہ تعمیر پسند شاعر ہیں اور ملت کے درد سے اُن کا سینہ لبریز ہے۔
"پشاور یونیورسٹی کا قیام" ایک اچھی نظم ہے، شعروں کا رنگ یہ ہے ــــ

زندگی کی لہر دوڑے گی وزیرستان میں
علم کے دریا بہیں گے وادیٔ کاغان میں

"رداۓ کا کی تباہی" میں جوش جہاد موجزن ہے۔

غلامانِ شاہِ حجازی چلے
ہتھیلی پہ سر لے کے غازی چلے

ار کس قدر جاذب توجہ ہیں۔

مژہ پر قطرۂ خوناب جھلملاتا ہے	فلک پہ صبح کا تارا تلاش کرتا ہوں
بہت دنوں سے ہے گم گشتہ کاروانِ طلب	چراغ لالہ صحرا تلاش کرتا ہوں
بہت دنوں سے ہے بے رنگ خاتم ہستی	جو گر چکا وہ نگینہ تلاش کرتا ہوں
ہوا کے رخ پہ جلاتا ہوں آندھیوں کے چراغ	اندھیری شب میں سویرا تلاش کرتا ہوں

نخ :- اس طرح چھائی ہوتی ہیں غربتوں پہ عشرتیں   بستیوں پہ جس طرح ہوتی ہیں غالب رفعتیں   (ص ۸۵)
شعر میں وہ تاثیر نہیں پائی جاتی، جسے شاعر شعر میں سمو دینا چاہتا ہے۔ "ہوتی ہیں" کا املا "ہوتیں ہیں" کیا گیا ہے۔

خون تک وقتِ ضرورت پہ دیا ہے ہم نے   زندگی ملک پہ قربان کیا ہے ہم نے   (ص ۸۶)

ن" بالاتفاق مونث ہے، شاعری میں اور گردوں" کا انداز بیان! حیرت ہے!

اے امیر کارواں اے رہبر منزل شناس   اے کہ ہے رازِ کجی جادہ تجھ پہ فاش فاش   (ص ۸۹)

ن جادہ" غریب و نامانوس ترکیب ہے، "فاش" کی تکرار بھی بھلی نہیں لگتی۔

بھلا کے ہند کی رنگینیاں دماغوں سے   یہاں کی خاک سے اپنا وطن بنائیں گے   (ص ۹۲)

روانی بہت کمزور ہے، مصرعہ ثانی میں "خاک سے" کی بجائے "خاک کو" ہونا چاہیے!

مٹنے ہی کو ہے گلشنِ کشمیر بچا لے یارب! نگہ شوق کی تصویر بچا لے (ص ۱۰۲)

مصرعہ ثانی خیال، اندازِ بیان اور زبان غرض ہر لحاظ سے پست و کمزور ہے۔

رازآگہِ اخوت باہم کوئی نہیں ہم فکر و درک قائد اعظم کوئی نہیں (ص ۱۰۸)

رازآگہِ اخوت ــــ "ہم فکر و درک" ان ترکیبوں میں کتنی غرابت پائی جاتی ہے۔

آج سرشار ہیں بچپن کی فسوں کاری سے کل سنبھالیں گے وطن کو بڑی ہشیاری سے (ص ۱۲۰)

نومشقوں کا سا اندازِ بیان :

تو دختران قوم کے آنچل بجا گیا
عفت کے دامنوں میں ستارے سجا گیا
کچھ اور شانِ حرمتِ نسواں بڑھا گیا (ص ۱۲۱)

مصرعہ اولیٰ زبان و بیان کے اعتبار سے خاصہ محل نظر ہے۔

ہو کر شہید عظمت کردار دے گیا آخر ثبوت "حیدر کرار" دے گیا (ص ۱۳۲)

"عظمت" تو بالاتفاق مونث ہے!

اسی سوچ میں ہیں بہت دیر سے کہ ہم اور نضا کے سپاہی لڑے (ص ۱۳۳)

مصرعہ ثانی غیر شاعرانہ:

شعارِ وطرزِ وفا زا تلاش کرتا ہوں سرشتِ دل کا تقاضا تلاش کرتا ہوں (ص ۱۳۴)

"طرزِ وفا زا" کتنی بے تکی ترکیب ہے۔ مصرعہ ثانی بھی مبہم ہے۔

عروسِ شام کی افشاں بکھر گئی ساری یہ فالِ بد ہے کہ اچھا تلاش کرتا ہوں (ص ۱۳۴)

مصرعہ ثانی کسی کام کا نہیں :

برائے حق جسے سقراط نے پیا تھا کبھی وہ زہرِ شوق کا پیالہ تلاش کرتا ہوں (ص ۱۳۵)

"پیالہ" بروزن "ہمالہ" اور "ہالہ" درست ہے۔ کیف صاحب نے "لالہ" کے وزن پر نظم کیا ہے!

تمام گردشِ دوراں سمیٹنے کے لئے دلِ فراخ و کشادہ تلاش کرتا ہوں (ص ۱۳۶)

"گردشِ دوراں" کس طرح سمیٹی جا سکتی ہے :

شدید دھوپ ہے ہستی ہے التہاب سے پُر سکونِ سایہ طوبیٰ تلاش کرتا ہوں (ص ۱۳۷)

"ہستی ہے التہاب سے پُر" اس ٹکڑے نے شعر کو بے لطف بنا دیا۔

لبِ حیات پہ اب کس لئے نہیں فریاد سخن طرازیٔ دنیا تلاش کرتا ہوں (ص ۱۴۰)

"لبِ حیات" سے کیا مراد ہے؟ "اب" کس لئے لایا گیا ہے، یعنی اب سے پہلے "لبِ حیات" پر فریاد تھی ــــ مصرعہ ثانی بے معنی :

اس شعر میں کس قدر شدید تاثر اور خلوص و سوز پایا جاتا ہے۔

الٰہی! ملتِ اسلام کا رہے پردہ ردائے فاطمہ زہراؓ تلاش کرتا ہوں

توقع ہے کہ اسی بارہ مشق و تجربہ اور مطالعہ و مشاہدہ کے بعد کیف بنارسی کے کلام کی خامیاں دور ہوتی چلی جائیں گی اور وہ اپنے کلام کا

نیشنل اور الفرڈ
ILFORD
ILFORD
HP3
ROLL FILM
ہمہ وقت
آپ کی
مسرتوں
کے ساتھی!
رضوی برادرز لمیٹڈ
کراچی — لاہور — ڈھاکہ

JUTE
COTTON YARN
CHEMICALS
RESINS PLASTIC
COMPOUNDS
SUGAR
TEXTILE
SILK & COTTON

آپ وقت سے پہلے کیوں مرجھائیں!
دس میں سے نو آدمیوں میں قبل از وقت بڑھاپے کے آثار نظر آنے
لگتے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا سبب ناقص اور ناکافی غذا ہوتی ہے۔
اس غیر طبعی حالت سے بچنے کے لئے ہمدرد کا ماء اللحم دو آتشہ
استعمال کیجئے۔ یہ صحت و شباب قائم رکھنے کا بہترین ذریعہ ہے۔
جدید طبی تحقیق کی مدد سے ماء اللحم کے خواص اور خوبی کو کمال تک
پہنچا دیا گیا ہے اور اب یہ ہر لحاظ سے ایک ایسا مکمل اور مؤثر
ٹانک بن گیا ہے جو تھکے ہوئے اعصاب کو قوت بخشتا ہے اور
پورے نظام جسمانی کو چاق و چوبند کر کے سال بھر کے لئے
مرد۔ی توانائی مہیا کرتا ہے۔ بیشمار لوگ اس کی تاثیر کو آزما چکے ہیں
ماء اللحم
جاڑوں میں نئی قوت اور صحت حاصل کرنے کے لئے ایک مکمل اور مؤثر ٹانک
ہمدرد
ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان
کراچی - لاہور - ڈھاکہ - چٹاگانگ

نومبر ۱۹۶۸ء

ماہنامہ فاران کراچی

شمارہ :- ۸ جلد :- ۲۰

ایڈیٹر :- ماہر القادری

ترتیب

سالانہ چندہ ۷ روپے — قیمت فی پرچہ :- ۶۲ پیسے

پبلشر :- ماہر القادری

دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

باہتمام مستفیض احمد صدیقی پبلشر ماہر القادری نے انٹرنیشنل پریس کراچی میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

چین اور روس کی دوستی کی آڑ لے کر، بعض اشتراکی اہلِ قلم نے جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی کے خلاف بڑے جوش و خروش کے ساتھ مہم شروع کر رکھی ہے، جماعت کو عوام مسلمانوں میں نامقبول بنانے اور ناپسندیدہ ٹھیرانے کے لئے کذب و افترا کی مصنوعی فصلیں اگائی جا رہی ہیں اور ایسے ایسے الزام تراشے جا رہے ہیں، جنہیں ثقاہت سنجیدگی اور شرافت کسی عنوان گوارا ہی نہیں کر سکتی، اختلاف و عداوت کے بھی کچھ حدود ہیں، کسی فرد یا جماعت کی دشمنی میں اخلاق و دیانت کی حدود کو توڑ دینا، اہلِ فکر اور اربابِ قلم کو زیب نہیں دیتا۔

پاکستان اور ہندوستان کے مسلمانوں نے سیاسی پارٹیوں اور بعض مذہبی جماعتوں کا تجربہ کیا ہے، اس لئے وہ سمجھتے ہیں کہ جماعتِ اسلامی انہی جیسی کوئی تنظیم ہوگی! یہ تجربہ بھی جماعتِ اسلامی کے بارے میں بعض غلط فہمیوں کا سبب بن رہا ہے جو لوگ جان بوجھ کر جماعتِ اسلامی کو بدنام کرنا چاہتے ہیں، ان کی مخالفت، اسلوبِ تنقید اور طرزِ استدلال سے ان غلط فہمیوں کو غذا ملتی ہے!

”جماعتِ اسلامی“ کا حال نہ تو مسلمانوں کی ان ”سیاسی اور سماجی پارٹیوں“ جیسا ہے، جن کے منشور اور ضابطہ دستور میں ارکانِ دین یہاں تک کہ نماز کی پابندی بھی شامل نہیں ہے — اسی طرح ”جماعتِ اسلامی“ ان ”مذہبی جماعتوں“ کی مانند بھی نہیں ہے جو ارکانِ دین کی پابندی پر تو زور دیتی ہیں مگر ”سیاست و حکومت“ کو دنیوی کاروبار بلکہ شجرِ ممنوعہ سمجھتی ہیں —— اس مزاج و فکر کی مذہبی جماعتیں کسی ”منکر“ پر احتجاج تک نہیں کرتیں! جماعتِ اسلامی کا موضوعِ فکر اور عنوانِ عمل ”اقامتِ دین“ ہے اور یہ اس قدر جامع دینی اصطلاح ہے جو دعا سے لے کر جہاد تک ہر نیک عمل اور کارِ خیر و ثواب کو محیط ہے، ”اقامتِ دین“ کی جد و جہد کا اصل مقصد اور حقیقی غرض و غایت اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنا ہے!

جماعتِ اسلامی کا مقصد اللہ تعالیٰ کے دین میں پوری زندگی کو سمو دینا اور دینِ حق کے کسی ایک جزو کو نہیں ”کل“ کو قائم کرنا ہے، اس لئے جس فرد، جماعت، تنظیم اور حکومت و سیاست میں جہاں بھی جاہلیت پائی جاتی ہے، وہ جماعتِ اسلامی کو اپنا حریف اور مدِ مقابل سمجھتی ہے اور اسی نقطے سے اختلاف کا آغاز ہو جاتا ہے، وہ جو علامہ اقبال نے فرمایا ہے —

باطل دوئی پسند ہے، حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

تو

جماعتِ اسلامی حق و باطل کے بین بین کسی موقف اور مقام کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے !

تحریکِ پاکستان

پاکستان بننے سے کئی سال قبل جماعتِ اسلامی وجود میں آ چکی تھی، پٹھان کوٹ اس کا مرکز تھا اور غیر منقسم ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں اس کی شاخیں تھیں !

ہندوستان میں جماعتِ اسلامی کی اپنی جداگانہ مستقل تنظیم تھی، اس لئے نہ تو وہ کانگریس سے کوئی تعلق رکھتی تھی اور نہ مسلم لیگ کی حاشیہ بردار تھی ! جماعت کے اس موقف کے باوجود اس کے کسی رکن یا متفق کی زبان و قلم سے کوئی ایسا لفظ نہیں نکلا جس نے ہندوستان کی تحریکِ آزادی کو ذرہ برابر نقصان پہنچایا ہو اور انگریزی اقتدار نے اسے اپنی پالیسی کے لئے مفید سمجھا ہو۔ جماعتِ اسلامی نے مسلم لیگ کے نقطۂ نگاہ کے مطابق کانگریس کو ہندوؤں کی نمائندہ جماعت سمجھا اور اس کے اصرار پر ہندوستانی مسلمانوں کی جداگانہ قومیت جو تقسیمِ ہند اور تحریکِ پاکستان کی اساس تھی، اس کی تائید میں مضامین لکھے۔ اس سلسلہ میں جماعتِ اسلامی، مسلم لیگ کی ہم خیال اور ہم آواز تھی۔

کانگریس یہ کہتی تھی کہ مسلمانوں کی کوئی جداگانہ قومیت نہیں ہے۔ ہندوستان میں بسنے والے سب کے سب "ہندوستانی قوم" ہیں، اس بنیاد پر کانگریس تمام ہندوستانیوں کی نمائندگی اور اجارہ داری کا جن میں مسلمان بھی شامل تھے، دعویٰ کرتی تھی، کانگریس کے اس دعوے کے علی الرغم مسلم لیگ کا یہ کہنا تھا کہ ہندوستان کے مسلمان مستقل جداگانہ قومیت رکھتے ہیں ہندو اور مسلمان جدا جدا قومیں ہیں اس لئے کانگریس ہندو قوم کی نمائندہ جماعت ہے، مسلمان قوم کی نمائندگی کا دعویٰ اسے زیب نہیں دیتا۔

اس نظریاتی کشمکش میں مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی نے "دو قومی نظریہ" کی پرجوش حمایت کی اور بڑے معرکہ کے مضامین لکھے، مولانا موصوف کی مدلل اور عالمانہ تحریروں سے مسلم لیگ کے اس موقف کو بڑی قوت حاصل ہوئی، ہندوستان کے جو علماء کانگریس کے ساتھ تھے، قومیت اور وطنیت کے بارے میں جب ان کے خیالات اخباروں میں آئے تو علامہ اقبال مرحوم نے مشہور صحافی م اسلم دمحمد شفیع صاحب م سے فرمایا کہ ان کانگریسی علماء کا جواب دینے کے لئے مودودی کافی ہے، مشرق کی اس جوہر شناس اور بالغ نظری کی داد دینی چاہئے کہ مولانا مودودی نے تنہا "قومیت اور وطنیت" کے مسئلہ پر کانگریسی علماء سے ٹکر لی اور ان کے "وطنی و قومی نظریہ" کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں ــــــ پاکستان کے سابق وزیر خارجہ پیرزادہ سید شریف الدین صاحب نے اپنی کتاب "منزل بہ منزل" (اردو ترجمہ) میں مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کی ان علمی کوششوں کو سراہا ہے اور اشارتاً بھی کوئی ایسی بات نہیں لکھی جس سے یہ مترشح ہوتا ہو کہ مولانا مودودی تحریکِ پاکستان کے مخالف تھے۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے "تہذیب و ثقافت" پر جب لادینی خیالات کا اظہار کیا تو مولانا مودودی نے اپنے رسالہ "ترجمان القرآن" میں پنڈت جی کے ان خیالات کی عقلی دلائل کے ساتھ پر زور تردید کی ! ثقافت، قومیت اور وطنیت کے مسائل پر مولانا مودودی کی حکیمانہ تحریروں اور بصیرت افروز مضامین نے تحریکِ پاکستان کے لئے سازگار فضا پیدا کی۔

مولانا مودودی اگر تحریکِ پاکستان کے مخالف ہوتے تو انہیں سب سے پہلے "ایک قومی نظریہ" کی حمایت کرنی تھی یعنی اس باب میں ان کا وہی موقف ہوتا جو موقف مولانا حسین احمد مدنی مرحوم کا تھا، جس پر علامہ اقبال نے شاعرانہ پیرایہ میں تنقید کی ــــ

سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است ۔ چہ بے خبر ز مقام محمد عربی است

مولانا مودودی نے اپنے مضامین میں اس نظریہ کی تردید کی کہ ملت وطن سے بنتی ہے، انہوں نے ثابت کیا کہ ہندو اور مسلمان ایک ملک کے باشندے ہونے کے سبب "ایک قوم" نہیں ہیں ——— ٹھیک یہی موقف مسلم لیگ کا تھا۔

اگر مولانا مودودی تحریک پاکستان کے مخالف ہوتے تو انہیں علماء کی اس کمیٹی کے لئے کیوں نامزد کیا جاتا جو نئی تو ہیں کا مزہ لینے کے لئے مسلم لیگ نے مقرر کی تھی ——— ہاں! یہ بات مولانا مودودی نے ضرور کہی تھی کہ مسلم لیگ کے لیڈر ایک نیشنل گورنمنٹ (قومی حکومت) تو بنا سکتے ہیں مگر "اسلامی حکومت" قائم نہیں کر سکتے، مولانا موصوف کی ایمانی فراست قابل ستائش ہے !

حالات کی تبدیلی

مولانا مودودی نے جمہوریت اور پارلیمانی نظام کے بارے میں اب سے تقریباً پچیس تیس مضامین لکھے تھے۔ اور ان مسائل پر جن خیالات کا اظہار کیا تھا اُن کا تعلق انگریزی حکومت کے دور سے تھا! انگریزی دور میں جمہوری روایات اور پارلیمانی نظام کے تحت انتخابات ہونے کے بعد اکثریتی فرقہ یعنی "ہندو" برسر اقتدار آتے اور ملک کے قانون و دستور، ثقافت و تہذیب اور معاش و اقتصاد کی زمام انہی کے ہاتھوں میں ہوتی دینی نقطۂ نگاہ سے یہ صورتِ حال اسی قابل تھی کہ اُس پر تنقید کی جاتی ! کافروں کے بنائے ہوئے دساتیر و قوانین کو ملتِ اسلامیہ کس طرح قبول کر سکتی ہے ——— اس لئے مولانا مودودی نے انگریزی حکومت کے حالات کے اعتبار سے جمہوریت اور پارلیمانی نظام پر جو تنقید کی وہ درست تھی۔

پاکستان بننے کے بعد حالات بدل گئے، یہاں بالغ رائے دہی، جمہوری روایات اور پارلیمانی نظام کے تحت ہی قرآن کے حکم "شوریٰ" کی بہتر طریقہ پر تعمیل ہو سکتی تھی، انگریزی دور میں ہندوؤں کے برسر اقتدار آنے کا جو خطرہ تھا وہ جاتا رہا، یہاں جمہوری اور پارلیمانی نظام کے تحت مسلمان ہی برسر اقتدار آتے ——— اس لئے مولانا مودودی نے جمہوریت کی تائید میں مضامین لکھے اور جماعتِ اسلامی نے صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں کے انتخابات میں حصہ لیا۔

ذریعہ اور تدبیر کی حد تک دینی نقطۂ نگاہ سے مسائل کی نوعیت میں تبدیلی جائز ہے، مثلاً ایک زمانہ میں متحدہ ہندوستان کے علماء نے انگریز سے "ترکِ موالات" کا فتویٰ دیا اور ان سے تعاون و موالات کو حرام ٹھیرایا۔ مگر پھر ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ مسلمانوں کو اسمبلیوں کے انتخابات میں حصہ لینا پڑا اور "ترکِ موالات" نے "معاملات" کی صورت اختیار کر لی ——— اور کسی صاحب ہوش و عقل نے علماء کرام پر یہ تنقید نہیں کی کہ جس چیز (موالات) کو وہ ایک زمانہ میں ناجائز اور حرام بتاتے تھے وہ چیز پھر کس طرح جائز ہو گئی ؟

جمہوریت اور پارلیمانی نظام اور اس کے متعلقات کے بارے میں مولانا مودودی کا بھی یہی موقف ہے کہ انگریزی دور میں جس جمہوریت پر انہوں نے ولولہ انگیز انداز میں تنقید کی پاکستان بننے کے بعد پُرجوش طریقہ پر اُس کی تائید فرمائی! مولانا موصوف کے ناقدین جس چیز کو مولانا کا "تضاد" کہتے ہیں، وہ درحقیقت حالات کی تبدیلی کا نتیجہ ہے۔ اور "دین" اس تبدیلی کی اجازت دیتا ہے !

جماعت اسلامی نے کیا کیا

پاکستان بننے کے بعد یہ مسئلہ سب سے پہلے سامنے آیا کہ اس ملک کا "دستور" کیسا ہونا چاہئے ——— تبلیغی جماعت کی طرح جماعتِ اسلامی اس مسئلہ پر خاموش نہیں بیٹھی رہی۔ اُس نے اس مقصد کے لئے باقاعدہ مہم چلائی کہ پاکستان کا دستور "کتاب و سنت" کی اساس پر مدون ہونا چاہئے! اسی موضوع پر جماعت اسلامی نے ہزاروں صفحوں کا لٹریچر پیش کیا اور درایت و روایت کی دلیلوں کے ساتھ ثابت کیا کہ "کتاب و سنت" ہی پاکستانی دستور کا ماخذ اور اساس ہو سکتے ہیں، کتاب و سنت سے سر مو انحراف بھی برداشت نہیں کیا جا سکتا۔

جماعتِ اسلامی نے اسمبلیوں کے انتخابات میں بھی حصہ لیا مگر انتہائی دیانت واخلاق اور راستبازی کے ساتھ اگر جماعت کے کسی رکن اور متفق نے ذرا سی بھی بے عنوانی کی ہے تو اس پر سخت احتساب کیا گیا، جماعت نے دنیا کو دکھا دیا کہ انتخابات جو بگڑ گئے ہوا کرتی ہیں اُن کو کس طرح پاک و طاہر بنایا جا سکتا ہے۔

جماعتِ اسلامی نے پاکستان کے ہر دورِ حکومت میں مُنکر کے خلاف احتجاج کیا، حق گوئی کے معاملہ میں جماعت کا کردار بے داغ رہا ہے کسی دھونس اور دھمکی سے وہ مرعوب نہیں ہوئی اور کوئی لالچ اُسے مصلحت اندیش نہیں بنا سکا! پاکستان میں جماعت نے اپنی استطاعت کی حد تک اقامتِ دین کے تقاضے پورا کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔

جماعت اسلامی پر بڑے نازک وقت بھی آئے ہیں اُس کے ارکان کو بارہا قید و بند کی مصیبتیں بھی جھیلنی پڑی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے جماعت کی استقامت و عزیمت میں کوئی فرق نہیں آیا، جماعتِ اسلامی نے یہ قربانیاں اللہ تعالیٰ کے دین کو پورا اور سربلند کرنے کے لیئے دی ہیں، اس کی تمام جد و جہد کا مقصد موضوع اور مرکز اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول رہا ہے، جماعت فرشتوں کی نہیں انسانوں کی جماعت ہے اور انسانوں سے بہ تقاضائے بشریت کوتاہیاں بھی سرزد ہو جایا کرتی ہیں۔ جماعتِ اسلامی کے ارکان بھی معصوم نہیں ہیں، اس لیئے اُن کو غلطیوں سے محفوظ نہیں سمجھا جا سکتا ——— لیکن مجموعی طور پر جماعتِ اسلامی سے خیر ہی کا صدور ہوا ہے اور اُس کی جد و جہد سے دینی محاذ کو تقویت ملی ہے، جماعت اسلامی کے لٹریچر نے لاکھوں نوجوانوں کی زندگیوں میں دینی انقلاب پیدا کیا ہے، جس کی مثالیں ہر شہر اور ہر قصبہ میں مشاہدہ کی جا سکتی ہیں۔

جماعتِ اسلامی سے جو لوگ متاثر ہیں وہ دنیا کے جس خطہ اور جس شہر میں بھی پائے جاتے ہیں اُن کی کوششیں اعلاءِ کلمۃ الحق ہی میں صرف ہو رہی ہیں، ڈیکٹریا اور دفاتر ہوں یا تجارتی کمپنیاں، تعلیمی درسگاہیں ہوں یا زندگی کا دم جماعت اسلامی کے ارکان و متفقین استطاعت کی حد تک ہر جگہ "اقامتِ دین" کے لیئے جد و جہد کرتے رہتے ہیں، یہ وہ اچھے، نیک اور شریف لوگ ہیں جن کی سیرت و کردار پر اعتماد کیا جا سکتا ہے جن شہریوں سے اُن کا سابقہ پڑتا ہے وہ ان کی نیکی اور شرافت کے گواہ ہیں۔

"منیر کمیشن کی رپورٹ" ہو یا عائلی قوانین، فتنۂ انکارِ سنت ہو یا قادیانی مسئلہ، جماعتِ اسلامی نے ہر مسئلہ کا علمی اور دینی نقطۂ نگاہ سے تجزیہ کر کے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر کے رکھ دیا، پورے پاکستان میں یہ کارنامہ جماعت اسلامی ہی کے ایک اہلِ قلم نے انجام دیا کہ پاکستان کے محترم صدر عالی جناب فیلڈ مارشل محمد ایوب خان صاحب کی کتاب (FRIENDS NOT MASTERS) پر پوری جرأت و صداقت کے ساتھ قانون و اخلاق اور تہذیب و شرافت کی حدود میں رہ کر تبصرہ کیا۔

جماعت اسلامی کی یہ خوش بختی ہے کہ اُسے ایسا قائد میسر آیا ہے جس کے دینی افکار نے عرب و عجم کے علماء اور دانشوروں کو متاثر کیا ہے اور جس کی کتابیں انڈونیشیا سے لیکر ترکی تک تمام مسلمان ملکوں میں شوق و دلچسپی کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں، مولانا مودودی جیسے عظیم مفکر صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں جس مسئلہ پر مولانا موصوف نے قلم اُٹھایا ہے بس اُس کا حق ادا کر دیا ہے، مولانا موصوف صرف قلم ہی کے دھنی نہیں ہیں وہ ایثار و قربانی کے بھی مردِ میدان ہیں، اس دور میں عزیمت و استقامت کے سنتِ الذہب کو اُنہوں نے استوار کر دیا، پھانسی کی سزا کا حکم سن کر اُن کے ماتھے پر شکن تک نہیں آئی۔ پھانسی گھر میں بھی اس مردِ مجاہد کو مطمئن اور راضی بہ رضا دیکھا گیا۔ جو لوگ قالینوں پر بیٹھ کر کشف و کرامت اور روحانیت کی باتیں کرتے ہیں اُنہیں سوچنا چاہیئے کہ حق کی راہ میں اس عزیمت کے بعد مولانا مودودی کا شمار کیا علماء ظواہر ہی میں ہوگا، روحانیت کی کونسی بلندی اُن کو سر سے میسر نہیں آئی۔ دنیا کی دوسری اسلامی تنظیموں اور مسلم جماعتوں میں یہ امتیاز صرف جماعتِ اسلامی کو حاصل ہے کہ اُس کے ارکان میں ہر

مکتبۂ فکر) کے پیرو یہاں تک کہ اہلِ حدیث حضرات بھی شامل ہیں اور فقہی اختلافات کے باوجود "اقامتِ دین" کی راہ میں اُن
انتہا کمال درجہ کا اتحاد، اخوت اور وحدتِ فکر و عمل پائی جاتی ہے۔ بعض شیعہ حضرات بھی جماعت میں آئے اور جماعت میں
شامل ہو کر وہ خلفائے راشدین اور صحابۂ کرام کے ناقد و قادح نہیں رہے بلکہ عقیدت مند اور مداح ہو گئے! شرکت و بدعت کے مظاہر
کے ساتھ جماعت اسلامی کی روش اجتناب و احتراز کی روش ہے! روزگار اور معاش کے سلسلہ میں جماعت اسلامی والے
"کل حلال" کا خیال رکھتے ہیں، اُن میں کتنے ایسے بھی ہیں جنھوں نے روزی کے مشتبہ ذرائع کو چھوڑ کر اپنے کو مشقت میں ڈالا

جماعت اسلامی کے ارکان اور متفقین صوبائی اور علاقائی عصبیت اور رنگ و نسل کے امتیازات کے پاس تک نہیں پھٹکتے۔
مغربی پاکستان کے کسی رکنِ جماعت کے دل میں یہ خطرہ تک نہیں گزرتا کہ جماعتِ اسلامی کا امیر ہم میں سے کیوں نہیں ہوتا؟ عہدہ و
کے لئے جماعت اسلامی کا کوئی رکن کنویسنگ یا کسی قسم کی کوئی کوشش کرے، تو اس کی رکنیت خطرے میں پڑ جائے۔ اُردو کے
سلسلے میں بنگلہ بولنے والوں کے جذبات کس قدر نازک بلکہ عصبیت زدہ ہو گئے ہیں لیکن مشرقی پاکستان کے ارکانِ جماعت "اردو"
ان سے محبت کرتے ہیں اور اردو کی ترقی اور چلن انہیں قطعاً ناگوار نہیں گزرتا ـــ پاکستان میں جماعتِ اسلامی کا وجود علاقائی عصبیتوں
صوبائی رقابتوں کے علی الرغم وحدت و اخوت کا مظہر ہے۔ جو زبانِ حال سے کہہ رہا ہے ـــ

من برائے وصل کردن آمدم

جماعتِ اسلامی نے اسلامی قانون و دستور کے مطالبہ کے لئے مظاہرے بھی کئے ہیں اور عظیم الشان جلوس بھی نکالے ہیں۔
لیکن کسی مظاہرے اور جلوس میں کوئی ایسا ناگوار واقعہ پیش نہیں آیا جس سے پبلک کو ذرہ برابر تکلیف ہوئی ہو یا پولیس کو کسی
طرح کی زحمت کرنی پڑی ہو یا بجلی کے کسی کھمبے تک پر ذرا سی خراش نہیں آئی! حالانکہ ایسے موقعوں پر لازمی طور پر ہنگامے ہو جایا
کرتے ہیں ـــ جماعت اسلامی نے مزدوروں میں کام کیا مگر کوئی ہڑتال نہیں ہونے دی! انتشار اور ہنگامہ آرائی جماعت
کا مزاج ہی نہیں ہے۔

پاکستان اور ہندوستان کی جنگ کے دوران جماعت اسلامی نے اپنے سارے اختلافات لپیٹ کر رکھ دئیے، اور دا
[illegible] سے حکومتِ پاکستان کے ساتھ پورا تعاون کیا اور تمام پارٹیوں اور اداروں سے بڑھ چڑھ کر اس جہاد میں حصہ لیا،
[illegible] یں گے کہ جماعتِ اسلامی نے کس اخلاص و دردمندی اور لگن کے ساتھ اُن سے اشتراک کیا ہے۔
[illegible] نے "خدمتِ خلق" کا شعبہ کھول کر بے لوث سماجی خدمات کی پاکستان میں ایک روشن مثال قائم کر دی!
[illegible] سے بعض چوٹی کے ارکان علیحدہ ہوئے ہیں، مگر اس علیحدگی نے جماعت کے نظم میں کسی قسم کا کوئی ضعف اور
ضعف پیدا نہیں ہونے دیا۔ جماعت سے نکلنے والے جن بعض ارکان نے جماعت کا پیچھا لیا ہے اور جماعت کی مخالفت کو اپنا شعار بنایا
ہے، اُن کی اخلاقی سطح بجائے خود عالم پر نقشِ عبرت بن کر رہ گئی ہے۔ ایک نیک انسان جماعت کی مخالفت کا یہ وبال ان پر پڑنا ہی
اچھا تھا۔

جماعت اسلامی کا وجود پاکستان کا شیرازہ بند ہے، اس جماعت کو جو کوئی انتشار پسند کہتا ہے، خود اُس کے دماغ میں انتشار
پایا جاتا ہے، جماعت اسلامی پاکستان کی وحدت و سالمیت اور اُس کے تحفظ و ترقی کو دینی فریضہ سمجھتی ہے پاکستان کی سرزمین
جماعت کے نزدیک مسجد کی طرح مقدس ہے۔

وہ کسی شاعر نے کہا ہے —

اے روشنیٔ طبع تو بر من بلا شدی

تو ———

جماعت اسلامی کی خوبیاں ہی اُس کی مخالفت کا سبب بن گئی ہیں۔

جماعت اسلامی کو بدنام کرنے اور عوام کی نگاہ میں ناپسندیدہ اور نامقبول بنانے کے لئے یہ پروپیگنڈا کیا گیا کہ جماعت اسلامی کو غیر ملکوں سے امداد ملتی ہے۔ کبھی ہندوستان کا نام لیا گیا اور کبھی امریکہ کا! ایک مولوی صاحب نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ہندوستان سے جماعت کے نام ایک ایک لاکھ کے منی آرڈر آتے ہیں! جھوٹ بولنے اور تہمت لگانے کے لئے بھی تھوڑا بہت سلیقہ درکار ہے، ان مولوی صاحب کو کوئی کہے تو کیا کہے، جنہیں اس بات کا پتہ تک نہیں کہ ایک منی آرڈر کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ کتنی رقم بھیجی جا سکتی ہے۔

پاکستان بنے ہوئے اکیس سال ہو گئے مگر اس مدت میں جماعت کے خلاف بیرونی ممالک کی امداد کا ذرہ برابر کوئی ثبوت نہیں مل سکا۔ اور نہ مل سکتا ہے، کہ اس الزام میں ذرہ برابر صداقت اور واقعیت نہیں۔

تحریک آزادیٔ کشمیر کے سلسلہ میں امیر جماعت اسلامی (مولانا مودودی) کا بیان توڑ موڑ کر شائع کیا گیا اور ان سے وہ باتیں منسوب کی گئیں۔ جو انہوں نے نہیں کہی تھیں۔ حالانکہ کشمیر کے سلسلہ میں مولانا مودودی نے جو خدمات بین الاقوامی سطح پر انجام دی ہیں، اس کا اعتراف کشمیر کے سب سے بڑے لیڈر اور مخلص ترین رہنما چوہدری غلام عباس خان مرحوم نے کیا، انہوں نے فرمایا کہ مولانا مودودی نے تنہا کشمیر کے لئے جو کام کیا ہے وہ ہم سب نے مل کر بھی نہیں کیا[1]۔

ریلوے کے کارکنوں کی ہڑتال ہو یا لاہور میں طلبا کا ہنگامہ ان میں جماعت اسلامی کو ملوث کرنے کی کوشش کی گئی، مگر دنیا نے دیکھ لیا کہ اس قسم کے غباروں کی ہوا بہت جلد نکل گئی، ان ہنگاموں میں جماعت کے کسی بعید ترین تعلق اور خفیف سے خفیف ایما کا ثبوت نہ مل سکا۔

جماعت اسلامی کے بارے میں بعض "دیندار طبقوں" نے یہ شوشہ چھوڑا کہ جماعت اسلامی ایک جداگانہ فرقہ بنتا جا رہا ہے ——— مگر عوام و خواص کے تجربہ اور مشاہدہ نے اس بدفالی اور الزام کی تردید کر دی! جماعت اسلامی کامل فرقہ بندی، گروہ سازی اور تحزب کا بطلان کرتا ہے جو لوگ جماعت اسلامی سے متعلق ہیں وہ فرقہ بندی اور تحزب کی سطح سے بلند ہو کر احناف، شوافع، موالک اور اہل حدیث سب کے پیچھے کسی کراہت کے بغیر نماز پڑھتے ہیں اور فقہ کے جزوی اختلافات کو سبب نزاع نہیں بناتے، جماعت اسلامی والوں نے اپنی مسجدیں بھی دوسرے اسلامی فرقوں کی طرح علیحدہ نہیں بنائیں! فقہ اور کلام میں جماعت اسلامی جمہور امت سے علیحدہ اور جداگانہ اپنا کوئی مسلک نہیں رکھتی!

بعض علماء دین اور شیوخ طریقت نے ڈنکے کی چوٹ، مولانا مودودی پر ایسے ایسے رکیک اور بے سروپا الزامات لگائے ہیں اور اتنی گھٹیا اور بازاری زبان استعمال کی ہے کہ اُن کا دہرانا اور لکھنا کسی شریف آدمی کے بس کا روگ نہیں ہے ——— حیرت ہے کہ "دینداری" اتنی غیر ذمہ دار اور محاسبہ آخرت سے اتنی بے خوف بھی ہو سکتی ہے۔

---

[1] ان کے بیان کا متن سامنے نہیں ہے، مفہوم یہی ہے (ق - م)

تازہ ترین الزام

جماعتِ اسلامی پر تازہ ترین الزام یہ لگایا جا رہا ہے کہ وہ چین کی مخالفت کرکے پاکستان کے دوست ملک اور خیر خواہ حکومت سے تعلقات خراب کرانا چاہتی ہے! یہ تو اُن الزامات کا خلاصہ اور لب لباب ہے اس کی تفصیل بڑی افسوسناک ہے، جماعت اسلامی کو بدنام کرنے کے لئے اشتراکیت زدہ اہلِ قلم کے طوفانی مضامین اخباروں میں دھڑا دھڑ آرہے ہیں!

جن لوگوں کے مسلمانوں جیسے نام ہیں، مگر ان کی زندگیوں میں اسلام کی کوئی جھلک نہیں پائی جاتی، صلوٰۃ جسے اسلام اور کفر کے درمیان سبب امتیاز بتایا گیا ہے اور جس کے ایک وقت کے دانستہ چھوڑ دینے پر "فقد کفر" کی وعید آئی ہے، اسلام کے اس بنیادی رکن سے جو یکسر بے پروا ہیں، شراب جن کے نزدیک ایک "لطف انگیز" مشروب ہے، اسلام جسے "معروف" کہتا ہے، اُس سے ان لوگوں کو کوئی دلچسپی نہیں، اور دین جسے "منکر" قرار دیتا ہے اُس کے لئے کوئی کراہت ان کے دلوں میں نہیں پائی جاتی! اسلام کے مقابلے میں یہ حضرات دوسرے نظام ہائے زندگی کو ترجیح دیتے ہیں ان کو تو بس لطف و عیش کی زندگی چاہئے —— اس مزاج و فکر کے لوگوں کے نزدیک نظریہ اور اصول کی کوئی اہمیت نہیں ہے،

بابر با عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

یہ مصرعہ اور اس کی معنویت سے ان کی زندگی میل کھاتی ہے!

ان لوگوں کے برخلاف جماعتِ اسلامی زندگی کے تمام شعبوں، سیاست و معاشرت اور حکومت کے معاملات اور ملک کے داخلی اور خارجی امور پر اس نقطۂ نگاہ سے غور و فکر کرتی ہے۔ کہ فلاں منصوبہ، اسکیم، سمجھوتے، معاہدے اور اصلاح و ترقی سے دین کو فائدہ ہوتا ہے یا نقصان؟ اگر کسی پالیسی اور اسکیم کے سبب دینی اقدار پر آنچ آتی ہوئی دکھائی دے تو جماعت اسلامی بڑی سے بڑی مادی ترقی کو دین کے نقصان کے مقابلے میں ہیچ سمجھتی ہے۔ کوئی چاہے تو دینی اقدار کی افادیت سے انکار کرسکتا ہے اور دین کے مقابلے میں لادینیت کو ترجیح دے سکتا ہے —— مگر ایک مسلمان سے اس کا مطالبہ نہیں کرسکتا کہ وہ مسلمان ہوتے ہوئے دینی قدروں اور نظریوں کو پس پشت ڈال کر ان سے بے تعلق ہو جائے، اور دین کے اصولوں کی اُس کی نگاہ میں کوئی اہمیت اور وقعت ہی نہ رہے۔

جب پاکستان کی پچھلی حکومتوں کے امریکہ سے انتہائی خوشگوار تعلقات تھے تو اُس وقت بھی جماعت اسلامی نے احتجاج کیا تھا کہ ہم امریکہ سے مالی امداد اور اسلحہ لے سکتے ہیں مگر امریکہ کے نظریئے نہیں لے سکتے اور نہ ان کے کافرانہ تمدن و تہذیب سے متاثر ہوسکتے ہیں —— یہی بات اِس وقت جماعتِ اسلامی کی طرف سے کہی گئی ہے کہ چین نے پاک و ہند کی جنگ میں جس انداز میں ہمارے موقف کی تائید اور حمایت کی ہے اُس کے ہم شکر گزار ہیں، مگر یہ جو چین سے دھڑا دھڑ اشتراکی لٹریچر پاکستان میں آرہا ہے اور ہمارے بہت سے نوجوان ماؤزے تنگ کی تصویریں اپنے سینوں پر لگائے پھرتے ہیں، یہ صورتِ حال خاصی تشویشناک ہے! جماعتِ اسلامی کے اس بروقت اور واقعی "انتباہ" کو چین دشمنی سے تعبیر کرنا اور حکومت اور عوام کو یہ تاثر دینا کہ جماعتِ اسلامی اس طرح تنقید کرکے چین اور پاکستان کے تعلقات کو بگاڑنا چاہتی ہے —— غلط قسم کا تاثر ہے!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفارِ قریش اور مدینہ کے یہودیوں سے معاہدے کئے تھے مگر اُن کے نظریوں کو مسلم معاشرے میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی، پاکستان کی حکومت بھی غیر مسلم حکومتوں سے سیاسی اور تجارتی معاہدے کرسکتی ہے اُن کو اپنا "حلیف" بنا سکتی ہے، اُن سے امداد اور اسلحہ لے سکتی ہے —— مگر ان کے نظریوں، اصولوں اور تہذیب و ثقافت کا اثر

قبول نہیں کرنا چاہئے! اسلحہ، اسباب معیشت اور تجارتی سامان کے ساتھ ان حلیف حکومتوں کے نظریئے اور عقائد کی بھی درآمد ہو رہی ہو، تو اس کو تدبیر و حکمت کے ساتھ روک دینا چاہیئے! اگر دین دے کر دنیا ہاتھ آئے تو بقول علامہ اقبال -

؎ ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارہ

مسلمانوں کے وہ ممالک جنہوں نے روس کی امداد و تعاون کی قیمت پر سوشلزم کو قبول کیا ہے دین کے معاملہ میں اُن کا انحطاط ہمارے لئے سبقِ عبرت ہونا چاہیئے!

روس اور چین میں مسلمان حکومتوں کے جو وفود جاتے ہیں، انہیں پرانی مسجدیں اور قدیم مقبرے دکھا کر یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ ان حکومتوں میں مسلمان ہر طرح سے آزاد ہیں اور وہ اپنی زندگی اسلامی تعلیمات کے مطابق گزار سکتے ہیں ——— مگر جو حضرات اسلام سے عقیدہ اور عمل کی مخلصانہ وابستگی رکھتے ہیں، ملت اسلامیہ کے درد سے جن کے سینے لبریز ہیں اور دنیا کے تمام مسلمانوں کو ایک جسم کی طرح ملتِ واحدہ سمجھتے ہیں کہ ایک مسلمان کے پاؤں میں کانٹا چبھتا ہے تو پورا جسم یعنی تمام ملت بے قرار ہو جاتی ہے اُن کی اطلاع کے مطابق کمیونسٹ ملکوں میں مسلمان آزاد نہیں ہیں -

کمیونزم صرف ایک معاشی اور مادی نظام ہی نہیں ہے، بلکہ اس کی بنیاد خدا کے انکار پر ہے اور اسلام کی اساس "ایمان" ہے اس اعتبار سے اسلام اور کمیونزم ایک دوسرے کی ضد واقع ہوئے ہیں ——— اشتراکی ملکوں کی دوستی کے سبب پاکستان میں اشتراکی رجحانات اُبھر رہے ہوں، ایسی صورت میں اسلام پسند افراد یا جماعتیں اس فتنہ کی نشاندہی کریں اور پاکستان کے ارباب حل و عقد اور مسلمانوں کے سامنے ان خطرات کے امکانات کو لائیں ——— تو اسے روس یا چین کی دشمنی کا نام دے کر شور مچانا اور واویلا کرنا، کوئی منصفانہ بات نہیں ہے!

امریکہ اور برطانیہ کی دوستی اور قربت نے مغربی معاشرے کو ہم پر مسلط کر دیا، شراب کی ارزانی، سود و قمار کا چلن، مخلوط تعلیم کا فتنہ، کالجوں اور مدرسوں میں مسلمان لڑکیوں کے رقص و سرود کے حیا سوز مناظر، نامحرم مرد و زن کا بے باکانہ اختلاط، دینی ارکان کی پابندی سے بے پروائی، زیادہ سے زیادہ عیش و تفریح کی خواہش ——— جس معاشرے کا خاصہ بڑا حصہ اخلاق کے اس انحطاط کو پہونچ گیا ہو ——— اشتراکیت کی تبلیغ اور کمیونسٹ لٹریچر سے اُس کا متاثر ہو جانا بہت آسان ہے -

جہاں تک اخلاقی سطح کا تعلق ہے برطانیہ و امریکہ اور چین و روس کی اخلاقی سطح ایک جیسی ہے، اسلام جن کو فواحش و منکرات کہتا ہے سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی نظام میں وہ "معروف" کا درجہ رکھتے ہیں، اشتراکیت ان تمام اخلاقی برائیوں کے علاوہ "مذہب دشمنی" کا جذبہ اور "انکار خدا" کا نظریہ اور عقیدہ بھی اپنے ساتھ لے کر آتی ہے! روس اور چین کا لٹریچر جو پاکستان میں آرہا ہے، اُس میں یہ دکھایا جاتا ہے کہ اشتراکی انقلاب کی بدولت وہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہنے لگی ہیں اور مادی ترقیوں نے ان ملکوں کو سچ مچ جنت ارضی بنا دیا ہے ——— اس لٹریچر کو پڑھ کر نوجوان "کمیونزم" کی طرف مائل ہوتے جا رہے ہیں، کیونکہ مغربی تہذیب کے اثرات نے انہیں پہلے ہی سے عیش و تفریح کا رسیا بنا دیا ہے، اشتراکیت اس جذبہ کو اور ہوا دیتی ہے، اور مغربی تہذیب کی کسی بے راہ روی پر پابندی نہیں لگاتی -

اسلام میں بے شک رہبانیت نہیں ہے مگر اسلام میں رہبانیت نہ ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ دنیا کی عیش و تفریح اور لذت و آسودگی ہی اُس کا مقصود ہے! اسلام میں اصل اہمیت "اخلاقی اقدار" کو حاصل ہے، اخلاقی قدروں کو قربان کر کے جو مادی ترقی عیش و تفریح اور تلطف و آسودگی حاصل ہوتی ہے، اسلام کی نگاہ میں وہ زندگی کا زیاں اور سیرت و کردار کا نقصان ہے ——— سرمایہ دارانہ

نظام اور خاص طور سے اشتراکی نظام میں عیش و تفریح پر اخلاقی قدروں کو بے دریغ قربان کر دیا جاتا ہے۔ اس لئے اشتراکی ملکوں کی مادی ترقیاں اور دنیاوی آسودگیاں اسلامی نقطۂ نگاہ سے کوئی وقعت نہیں رکھتیں! اشتراکی حکومتوں نے لوگوں کو فقر و فاقہ سے نجات دلا کر انہیں اخلاق کے افلاس اور خیر و تقویٰ کے قحط میں مبتلا کر دیا ہے۔ اسلامی نقطۂ نگاہ سے غریبی اور افلاس کو برداشت کیا جا سکتا ہے مگر اخلاقی افلاس کو گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام کی تاریخ نانِ شعیرِ حیدریؓ اور فقرِ ابوذرؓ و سلمانؓ پر ناز کرتی ہے!

اسلام لوگوں کو بھوکا ننگا رکھنا نہیں چاہتا، عوام کی خوشحالی کے لئے اس کے یہاں معاش و اقتصاد کا پورا نظام اور مسائل کا حل موجود ہے، مگر اسلامی حکومت میں سیاست و تجارت اور معاش و روزگار اخلاقی قدروں کے تحت چلتے ہیں۔

اسلام اس دنیوی زندگی کے بعد آخرت کی زندگی کا بھی قائل ہے، جہاں انسانوں کے عقائد و اعمال کے مطابق جزا اور سزا دی جائے گی! اشتراکی نظام میں محاسبۂ روزِ حشر اور آخرت کی جزا و سزا کا سرے سے کوئی تصور ہی موجود نہیں ہے! اشتراکیت کے نقطۂ نگاہ سے دنیا کے نجات دہندہ اور بڑے آدمی کارل مارکس، اینجلز، لینن اور ماؤزے تنگ ہیں! اسلام کہتا ہے کہ انسانیت کی پوری تاریخ میں "انسانِ کامل" بس ایک ہی ہوا ہے اور وہ عظیم ترین شخصیت نبی آخر کی ہے کہ جن کی ذاتِ گرامی پر تمام خوبیوں کا اتمام کر دیا گیا اور اس انسانِ کامل کی اطاعت کے بغیر کوئی سعادت حاصل نہیں ہو سکتی! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے تحت فقر و فاقہ خدا کی قسم دوسروں کی اطاعت میں بڑی سے بڑی آسودگی مل جانے سے بہتر اور گراں قدر ہے۔

حرفِ آخر

پاکستان ایک جمہوری ملک ہے حکومت کی داخلی اور خارجی پالیسی پر عوام کو تنقید کرنے کا حق حاصل ہے! ہم حکومت پاکستان سے دریافت کرنے کا حق رکھتے ہیں کہ روسی حکومت کا آرگن "طلوع" تو پاکستان میں شائع ہو رہا ہے مگر اس کے مقابلہ میں پاکستان کے کسی مجلہ اور جریدے کی بھی روس میں اشاعت ہو رہی ہے؟ اگر ہو رہی ہے تو اس مجلہ کے نام اور مقاصد سے عوام کو مطلع کیا جائے اور نہیں ہو رہی ہے تو یہ کس قسم کی دوستی ہے کہ پاکستان میں تو روس کو اشتراکیت کی تبلیغ کی اجازت ہے مگر روس میں اسلام کی تبلیغ نہیں ہو سکتی۔ ایک مہینہ ہوا، اسی "طلوع" میں جلی حرفوں میں یہ عبارت نظر سے گزری ——

"اشتراکیت کا دشمن، اسلام کا دشمن ہے"

اس قسم کے سو فیصدی غلط خلافِ واقعہ بلکہ گمراہ کن خیال و فکر کی اشاعت پر کیا کوئی نوٹس لیا گیا ——! چین اور روس کی دوستی اپنی جگہ مسلّم اس پر دین پسند طبقہ کو کوئی اعتراض نہیں ہے، مگر اس قسم کا لٹریچر سیاسی تعلقات و روابط کے ساتھ پاکستان میں آ رہا ہو، تو دینی طبقہ اور اسلام پسند دانشور اس پر تنقید و احتجاج کا حق رکھتے ہیں، اگر وہ ایسا نہیں کرتے، تو اپنے فرض سے غفلت برتتے ہیں، جس کی خدا کے حضور ان کو جواب دہی کرنی ہو گی۔

مجلہ "ترجمان القرآن" میں انہی خطرات اور مسلمان نوجوانوں کے جدید رجحانات کی نشاندہی کی گئی تھی، اس مضمون کو مشرقی پاکستان کی جماعتِ اسلامی نے بنگلہ میں ترجمہ کر کے شائع کیا، ان حقائق کو "چین دشمنی" کا رنگ دے کر جماعت اسلامی پر غیظ و غضب اور الزام و تہمت کی چاند ماری کرنا اور اس حق پسند جماعت کو بدنام کرنے کے لئے طرح طرح کے شگوفے چھوڑنا، فکر و دانش کے مریض ہونے کی علامت ہے، وطن، ملک، ملت اور انسانیت کے بہی خواہ شریف آدمی اور حق پسند جماعتوں اور تنظیموں کو ذلیل اور بدنام کرنے کا روبار اپنے سر نہیں لیا کرتے۔

اشتراکیت پر جب بھی بحث ہو گی اشتراکی ملکوں کے حالات بھی پیش کئے جائیں گے کہ وہاں مذہب کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا ہے؟ اس کا ذکر بھی آئے گا کہ اشتراکی ملکوں میں انقلاب آنے سے پہلے مسلمانوں کی کیا تعداد تھی اور اب ان کی کیا تعداد ہے

سید قطب شہید کے الفاظ میں ملّتِ اسلامیہ کو یہ بھی بتایا جاتے گا ؛ —

"کمیونزم نے بھی ایک نرالے طرز کا معاشرہ قائم کرنا چاہا اور ان دیواروں کو مسمار کرنے کا دعویٰ کیا جو رنگ و نسل قوم و وطن اور جغرافیہ نے چن رکھی تھیں، لیکن اس اجتماع کی تعمیر بھی "انسانی دوستی" کی ہمہ گیر نیو پر نہیں کی گئی، بلکہ طبقاتی تقسیم کر بنائے اجتماع قرار دیا گیا ہے، اس لحاظ سے کمیونسٹ معاشرہ قدیم رومی معاشرہ ہی کا دوسرا رُخ ہے، رومی معاشرہ طبقہ شرفا کو امتیاز دیتا ہے اور کمیونسٹ معاشرہ طبقہ عمال (پرولتاریہ) کو یہ امتیازی حیثیت دیتا ہے . . . . . وہ اپنی داغ بیل اس بات پر ڈالتا ہے کہ انسان کے اندر صرف حیوانی اور سفلی اوصاف کو برانگیختہ کرے اور اُن کو خوب پالے پوسے اور اُن کو زیادہ سے زیادہ طاقت ور بنائے۔ اس لئے اُس کی نگاہ میں انسان کے بنیادی مطالبات وہی کچھ ہیں جو حیوان کے بنیادی تقاضے اور ضرورتیں ہیں، یعنی غذا، مکان اور جنسی تسکین، چنانچہ اس فلسفہ کی رُو سے پوری انسانی تاریخ روٹی کی تلاش میں سرگرداں رہی ہے (معالم فی الطریق —— اُردو ترجمہ)

حکومت پاکستان دنیا کے تمام ملکوں اور حکومتوں سے سیاسی تعلقات قائم کرسکتی ہے اُن سے رقمی امداد، ضروریات زندگی کا سامان اور اسلحہ لے سکتی ہے مگر ان دوستانہ تعلقات میں اس کا پورا لحاظ رکھنے کی ضرورت ہے کہ کسی ملک کی دوستی پاکستان کے مقصد وجود —— اسلام —— اور ہمارے دینی و اخلاقی معاشرے پر اثر انداز ہونے پائے اگر ایسی صورت پیدا ہو رہی ہو تو حکومت کو حسن تدبیر اور حکمت عملی کے ساتھ اس کی روک تھام کرنی چاہئے ؛ ساری دنیا کی حکومتوں اور ملکوں کی دوستی اور زمین کے تمام خزانے اسلام کی قیمت نہیں ہوسکتے !

دنیا کے جو نظام (ISM) دُنیوی عیش و آسودگی اور مادی ترقیوں کے علمبردار اور اللہ تعالیٰ کے باغی اور منکر ہیں ان کے حق میں قرآن کریم یہ فیصلہ دے چکا ہے اور اہل ایمان کو متنبہ کرچکا ہے۔

لا یغرنک تقلب الذین کفروا فی البلاد
متاع قلیل ثم ماوٰھم جھنم وبئس المھاد
لکن الذین اتقوا ربھم لھم جنٰت تجری
من تحتھا الانھار خلدین فیھا نزلاً من عند اللہ
وما عند اللہ خیر للابرار (آل عمران)

"ملکوں میں خدا کے نافرمان لوگوں کی چلت پھرت تمہیں کسی دھوکے میں نہ ڈالے، یہ محض چند روزہ زندگی کا تھوڑا سا لطف ہے پھر یہ سب جہنم میں جائیں گے، جو بدترین جائے قرار ہے، برعکس اس کے جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرتے ہیں ان کے لئے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان باغوں میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ کی طرف سے یہ سامان ضیافت ہے ان کے لئے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے نیک لوگوں کے لئے وہی سب سے بہتر ہے"

…چی بات یہی ہے کہ جس کسی نے "خدا سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کی" اُس کی زندگی کامیاب اور بامراد ہے،
…رگ خدا سے بغاوت و انکار کی حالت میں عطارد و قمر اور زہرہ و مشتری کو بھی فرش پا انداز بنا دیں، قرآنی
…زگی سے اُن کی زندگیاں ناکام ہیں؛ اور جن حکومتوں کی بنیاد خدا کے انکار و نافرمانی پر ہے اُن کی مادی ترقیوں پر
…یمان کو للچائی ہوئی نگاہیں نہیں ڈالنی چاہئیں ۔

ہم پاکستانی مسلمان ہر حکومت سے دوستی اور معاہدوں کے ساتھ اپنے دین و ایمان اور تہذیب و ثقافت کا پورا تحفظ
…ہتے ہیں اور ارباب حل و عقد سے اس ہوشمندی، زیرکی و دانائی بلکہ ایمانی فراست کی توقع رکھتے ہیں کہ دوسری حکومتوں کی
…ستی اور خوش گوار تعلقات کی بدولت پاکستان کو مادی فوائد بھی حاصل ہوں اور ہمارے دینی اقدار اور تہذیب و تمدن بھی
…فوظ رہیں ۔

ماہر القادری
[illegible]

ایک جھوٹے نبی اور کاذب مسیح موعود کا خط

راقم الحروف (مدیر "فاران") کے نام ضلع بنگلور (بھارت) سے ایک خط موصول ہوا ہے جو بلفظہٖ درج ذیل کیا جاتا ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

14-9-68

محترمی۔ السلام علیکم

بلاشبہ "دین حق" کی حمایت و اشاعت کے سلسلہ میں آپ بہترین قلمی جہاد انجام دے رہے ہیں

خدا آپ کو اس کی جزائے خیر دے۔

موقر جریدہ "فاران" کے دو شمارے ارسال فرما کر مشکور فرمائیں۔ شکریہ

والسلام

آتر الجسدی العنصری میں ہوں، ایک زندہ عیسیٰ مسیح ناصری

SYED ISA MASIH NASIRI
MOHAMMADI HOUSE,
P.O. MAGADI
Dt- BANGLORE (S.j)

جواب:-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نصلی علیٰ خاتم النبیین

والسلام من اتبع الہدیٰ! ملت اسلامیہ کا یہ متفقہ عقیدہ ہے کہ حضرت سیدنا محمد ابن عبد اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد کوئی نیا نبی قیامت تک دنیا میں نہیں آ سکتا اور جو کوئی کسی قسم کی نبوت کا بھی دعویٰ کرے گا اُسے کاذب "بے دین" یا وہ گو اور پاگل سمجھا جائے گا۔ حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام دنیا میں جب تشریف لائیں گے تو ان کی مخصوص علامات ہوں گی، جن کے سبب اُنہیں پہچان لیا جائے گا۔ آپ نے جو خود کو زندہ نبی عیسیٰ مسیح ناصری سمجھ لیا ہے تو یہ شیطان کا کھلا ہوا فریب ہے، جس میں آپ مبتلا ہیں، اور آپ کی اب وہ کیفیت ہے جسے قرآن پاک میں "یتخبطہ الشیطان" کہا گیا ہے، اس دعوے کے بعد آپ دین اسلام سے خارج ہو گئے اب آپ مسلم نہیں مرتد ہیں اور کفر و ارتداد کی حالت میں کوئی عمل خیر معتبر نہیں ہو سکتا، اور کسی نیکی کا پھل آخرت میں نہیں مل سکتا، ملت اسلامیہ

ساتھ آپ کی خیر خواہی کا جذبہ بھی مصنوعی ہے جس سے نہ تو ملت کو فائدہ پہونچ سکتا ہے اور نہ خود آپ اس "منافقت" سے کوئی دینی اور اخلاقی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ آپ ملتِ اسلامیہ کے فرد ہی نہیں ہیں۔ اس جھوٹے اور کافرانہ دعوے کے بعد ملت سے آپ خارج ہو گئے یعنی مسلمان نہیں رہے۔

آپ اچھے "زندہ نبی" ہیں جو "فاران" کے مضامین سے استفادہ کی تمنا رکھتے ہیں۔ انبیاء اُمتیوں کو سکھاتے ہیں۔ اُن سے تو سیکھا نہیں کرتے، انبیاء خود "معلم" ہوتے ہیں "متعلم" نہیں ہوتے، انبیاء کرام علیہم السلام کا ایک کلمۂ جامعہ ارباب دانش کے لکھے ہوئے دفتروں پر بھاری ہوتا ہے۔

انبیاء اور رسول نہ تو شاعر ہوتے ہیں اور نہ مضمون نگار، اور نہ وہ خود شاعروں اور مضمون نگاروں کے افکار و خیالات سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

شیطان نے آپ کے کان میں پھونک دیا ہے اور یہ بات آپ کے دل میں ڈال دی ہے کہ آپ ——— "بہ جسد عنصری زندہ نبی عیسیٰ بن ناصری" ہیں اور ملاءِ اعلیٰ سے آپ کا نزول ہوا ہے۔ اس "نزغ شیطانی" سے آپ صدقِ دل سے توبہ کر کے نئے سرے سے مسلمان بن جائیے! اللہ تعالیٰ آپ کو توبہ کی توفیق دے (آمین)

اس وقت آپ جس شیطانی فریب کا شکار ہیں، اگر اسی حالت میں آپ کو موت آ گئی تو کافروں اور مرتدوں کے ساتھ آپ کا حشر ہوگا، جن کو عذاب دینے کے لئے اللہ تعالیٰ نے جہنم تیار کر رکھی ہے۔

آپ اپنے قصبہ یا شہر کے کسی عالم سے دریافت کر سکتے ہیں کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی کیا نشانیاں احادیث کی کتابوں میں لکھی ہوئی ہیں؟ اور ان نشانیوں سے آپ کا کوئی دور کا بھی تعلق اور مشابہت ہے؟؟

خود آدمی کے نفس کے فریب اور شیطان کے دھوکے بڑے ہی پُر پیچ اور انتہائی باریک ہوتے ہیں، طبیعت خیر پسند ہو اور آدمی اپنی اصلاح کا طلبگار ہو، تو حق واضح ہو سکتا ہے اور آدمی اس چکر سے نکل سکتا ہے۔

راقم الحروف کے جس "قلمی جہاد" کی آپ نے تعریف کی ہے، تو یہ جہاد ہر منکر و باطل کے خلاف ہے ——— جس میں جھوٹے مدعیانِ نبوت اور کاذب مسیحانِ موعود ——— بھی شامل ہیں! میرے دل میں آپ کے لئے نفرت و ملامت کے سوا اور کوئی جذبہ نہیں ہے۔

میرے جذبہ خیر خواہی پر اگر آپ کو اعتماد ہے، تو میں پوری دلسوزی اور اخلاص کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ آپ "مسیح ناصری" نہیں ہیں، نہ آپ کو آسمانوں سے اتارا گیا ہے آپ اپنے ماں باپ کے بیٹے ہیں اور وہ "مسیح ابن مریم" نہیں ہیں جن کو یہودیوں نے سولی پر چڑھانے کی کوشش کی، اور اللہ تعالیٰ نے اُنہیں (علیہ السلام) آسمان پر زندہ اُٹھا لیا اور پھر قربِ قیامت کے وقت وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے زمین پر نزول فرمائیں گے۔

آپ کو شیطان نے مخبوط الحواس بنا دیا ہے، اس کا علاج اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ و استغفار ہے، ایمان کی جو دولت آپ سے چھن گئی ہے توبہ کے بعد اُس سے آپ بہرہ مند ہو سکتے ہیں!

ماہر القادری

مدیر "فاران"

کراچی ——— ۱۳ر اکتوبر ۱۹۶۸ء

محمد نعیم ندوی صدیقی
رفیق دار المصنفین، اعظم گڑھ

شاہ ولی اللہ بحیثیت ادیب و شاعر

اٹھارہویں صدی عیسوی میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کے خانوادۂ عالیہ نے جو گرانقدر علمی خدمات انجام دی ہیں وہ کسی توضیح و بیان کی محتاج نہیں۔ اس نامور خاندان کا ہر ہر فرد فضل و کمال میں یکتائے روزگار اور یگانۂ زمن تھا، اور بلاشبہ آج برصغیر میں جتنے بھی حلقہائے علم و نظر ہیں سب کا مرجع یہی خانوادہ ہے۔ آسمانی الفاظ میں خاندانِ ولی اللّٰہی کی مثال "شجرِ طیبہ" کی مانند ہے جس کی جڑیں مستحکم ہیں اور اس کی شاخیں اپنی رفعت میں آسمان تک پہونچ رہی ہیں۔

شاہ ولی اللہ دہلوی ——— کے حالات اور ان کے علمی کارناموں پر کافی لکھا جا چکا ہے اور اہلِ قلم ہنوز ان پر عقیدت کا نذرانہ پیش کرنے میں مصروف ہیں، لیکن ——— راقم الحروف کے خیال میں ابھی تک شاہ صاحب کی ایک حیثیت کو اجاگر کرنے کی طرف اعتنا نہیں کیا گیا۔ وہ ——— ان کی ادیبانہ اور شاعرانہ حیثیت ہے، یہ بالکل درست کہ شاہ صاحب نے ہر علم و فن میں دو سو سے بھی زائد کتابیں تصنیف کرکے صفحۂ گیتی پر اپنے دوام کے انمٹ نقوش ثبت کئے، لیکن ——— اس کے علاوہ شاہ صاحب کا ایک قابل ذکر کمال یہ بھی ہے کہ انہوں نے عربی طرزِ تحریر کی قدیم روایت کو توڑ کر ایک نئے اسلوب کی بنیاد رکھی، وہ اسلوب ——— جو فصاحت اور بلاغت کا شاہکار ہوتے ہوئے بھی نہایت سہل اور عام فہم ہے۔ ذیل کا مضمون حضرت شاہ صاحب کی اسی حیثیت کو اجاگر کرنے کی ایک ادنیٰ کوشش ہے۔

شاہ صاحب سے پہلے متحدہ ہندوستان میں عربی زبان

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ متحدہ ہندوستان میں عربی دانی کا اعلیٰ ذوق کبھی نہیں رہا۔ ہندوستانی علماء کی جو عربی تصانیف پائی جاتی ہیں ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی عربی میں وہ روانی، سلاست، برجستگی اور حسن مفقود ہے جو اہل عرب کی تحریرات کا امتیاز ہے[1]۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ متحدہ ہندوستان کے عربی مدارس میں جو نصاب مروج ہے اس میں نثر کے مقابلہ میں نظم کا حصہ زیادہ شامل ہے، جس کی بنا پر ہندوستانی علماء عربی شاعری میں ملکہ تامہ رکھنے کے باوجود نثر میں حسن پیدا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔

---

[1] اس کلیہ سے وہ علماء مستثنیٰ ہیں جن کی زندگی کا کافی زمانہ عرب ممالک میں گذرا جیسے میر غلام علی آزاد بلگرامی وغیرہ۔

اٹھارہویں صدی عیسوی تک ——— ابن حریری کے مقامات عربی نثر کا شاہکار تسلیم کئے جاتے ہیں اور اسی نمونہ کو
... تقلید تصور کیا جاتا تھا، حالانکہ "مقامات حریری" کی زبان سنجیدہ اور علمی مضامین کے لئے قطعی ناموزوں ہے، جیسا کہ اہل نظر سے
... نہیں کہ اس میں اغلاق اور پیچیدگی، نامانوس الفاظ، پرشکوہ ترکیبیں اور توافی کی شدید پابندی پائی جاتی ہے، یہ درست ہے کہ
——— اس عہد میں یہی طرز تحریر رائج تھا اور عام طور سے اسے قبول عام بھی حاصل تھا، اسی بنا پر حریری کے مقامات
... پوری دنیا میں چلا (اور اب بھی چل رہا ہے) لیکن ——— عصر جدید نے اب طرز بیان میں اس قسم کی پیچیدگی اور دقت
... ندی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے ۔

اردو ادب میں بھی اس کی مثال موجود ہے، فورٹ ولیم کالج کے قیام سے پہلے اور بعد میں بھی، جو کتابیں تصنیف کی گئی ہیں
... میں تکلف اور تصنع کی کارفرمائی ہے، چنانچہ ——— نصلی کی دہ مجلس، تحسین کی نو طرز مرصع، میر امن کی باغ و بہار،
مرزا رجب علی بیگ کی فسانۂ عجائب اس طرز تحریر کے جیتے جاگتے نمونے ہیں، ان میں مقفی اور مسجع عبارتیں، عربی و فارسی الفاظ
... کثرت، پرشکوہ ترکیبیں اور تشبیہات و استعارات کی بھرمار ہے۔ اگرچہ یہ انداز نگارش آج بالکل نامانوس معلوم ہوتا ہے اور اسی
... غیر مقبول بھی ہے۔ لیکن ——— اٹھارہویں صدی تک یہی اسلوب اہل قلم کا کمال تصور کیا جاتا تھا ۔

پھر ——— سرسید احمد اور مرزا غالب نے اس لفظی شیشہ گری کو ختم کر کے ایک نئی شاہراہ قائم کی۔ تاریخ کے
... اول علامہ شبلی نعمانی کا نام قابل ذکر ہے کہ انہوں نے اپنی جودت طبع سے ایک ایسا دلکش اور عمدہ اسلوب ایجاد کیا جو بقول مولانا
... بادی علمی مضامین کو ادا کرنے کے لئے بے نظیر اور قابل تقلید ہے ۔

بہرحال ——— عربی میں ابن حریری نے جو لفظی بازیگری کا سحر قائم کیا تھا اسے سب سے پہلے آٹھویں صدی ہجری کی
... علامہ ابن خلدون نے توڑا، اور تمام بے جا قیود اور بندشوں سے آزاد ہو کر علمی و تاریخی مضامین کو بے جا تکلف اور بولتی ہوئی زبان میں
... کیا، لیکن ——— مقدمہ ابن خلدون کے بعد پھر صدیوں تک اس طرز کی تصنیف نایاب رہی ۔

شاہ صاحب بحیثیت ادیب

اٹھارہویں صدی عیسوی میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے آفتاب علم نے خاک ہند پر ضوفشانی
کی، اور انہوں نے اپنی بے عدیل صلاحیتوں کے جوہر دکھائے، شاہ صاحبؒ نے اپنے عہد کی مروجہ
... زبانوں (عربی اور فارسی) میں بکثرت کتابیں تصنیف کیں، لیکن ان پر ظہوری اور بیدل کے طرز تحریر کی چھاپ بھی نہیں پڑ سکی۔ بلکہ ———
——— ان میں ایجاز کے ساتھ وسعت نظر، سلامت فہم، سلاست زبان، قوت استدلال، رفعت خیال اور دقت نظر کی
... فرمائی پورے عروج پر ملتی ہے جو ایک اعلیٰ نثر کی خصوصیات ہیں ۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رقمطراز ہیں :-

"شاہ ولی اللہ پہلے ہندوستانی مصنف ہیں جن کی عربی تصانیف (بالخصوص حجۃ اللہ البالغہ) میں
اہل زبان کی سی روانی و قدرت اور ادبا عرب کی سی عربیت ہے اور وہ ان عجمی اسالیب سے پاک
ہیں جو عجمی علماء کی عربی تحریروں میں پائی جاتی ہیں ———"

شاہ ولی اللہ دہلوی کا اس سلسلہ میں صرف یہی کارنامہ نہیں ہے کہ انہوں نے اپنے زمانہ کے مروجہ طرز نگارش کو وسعت
... کر کے بے جا تکلفات اور لفظی طلسم سے آزاد کیا، بلکہ وہ درحقیقت ایک نئے اسلوب اور جداگانہ طرز کے بانی اور موجد
... ہیں، شاہ صاحب نے جو انداز تحریر اختیار کیا وہ بقول ایک اہل قلم اپنی جامعیت زور بیان، محکم واقعیت اور فصاحت و بلاغت میں

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز تکلم کی پیروی پیش نظر معلوم ہوتی ہے۔

مولانا مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں کہ :-

"عربی زبان میں شاہ صاحب نے جتنی کتابیں لکھی ہیں ان میں ایک خاص قسم کی انشاء کی جوان کا مخصوص اسلوب ہے، پوری پابندی کی ہے . . . . شاہ صاحب پہلے آدمی ہیں جنہوں نے ایسی عبارتوں میں زیادہ تر "الجامع الکلم" النبی الخاتم صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز گفتگو کی پیروی کی ہے، حتی الوسع وہ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ اپنے مدعا کا اظہار انہی لغات اور انہی محاوروں میں کریں جو لسان نبوت اور زبان رسالت سے خاص تعلق رکھتے ہیں ــــــ"

یہ ایک حقیقت ہے کہ ـــــــ ہر زمانہ کا ادب اپنے گرد وپیش کے حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا ادب و زندگی میں بہت ہی گہرا ربط ہوتا ہے، اردو شعراء کے لکھنؤ اور دلی کے دبستانوں میں الفاظ و معانی کا جو واضح فرق نظر آتا ہے وہ ادب اور زندگی کے اسی باہمی ربط کا نتیجہ ہے، شاہ ولی اللہ صاحب نے ــــــــ جس زمانہ میں تصنیفی خدمات انجام دیں وہ نہایت پرفتن اور پرآشوب دور تھا، اس وقت ملت مسلمہ نہ صرف سیاسی حیثیت سے زوال و انحطاط سے دوچار تھی بلکہ ــــــ علمی، اخلاقی اور معاشرتی حیثیت سے بھی اس کا دیوالہ نکل چکا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ظہور پذیر ہوا کہ شاہ صاحب کی تحریروں میں تحقیق و علم اور فکر و نظر کے ساتھ ساتھ سوز و گداز خلوص اور دردمندی کے جوہر پیدا ہو گئے ؟

علامہ سید سلیمان ندوی حضرت شاہ صاحب کی اس خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ :-

"شاہ صاحب کی تصنیفات کے ہزاروں صفحے پڑھ ڈالئے آپ کو یہ بھی معلوم نہ ہوگا کہ یہ بارہویں صدی کے پرآشوب زمانے کی پیداوار ہیں جب ہر طرف بے اطمینانی اور بدامنی کی ندی تھی، ہر طرف یہ معلوم ہوگا کہ فضل و علم کا ایک دریا ہے جو کسی شور و غل کے بغیر سکون و آرام کے ساتھ بہہ رہا ہے اور جو زبان و بیان کے خس و خاشاک کی گندگی سے پاک و صاف ہے ــــــ"

عربی نثر کے نمونے

اب ذیل میں حضرت شاہ صاحب کے عربی طرز نگارش کے چند نمونے بطور مشتے از خروارے پیش کئے جاتے ہیں، جن کے مطالعہ سے یہ اندازہ لگانا کچھ دشوار نہیں کہ وہ کون سی خصوصیات ہیں جن کی خاک ہند کے اس مایہ ناز فرزند نے خود اہل زبان کو بھی حیرت میں ڈال دیا۔ ملحوظ رہے کہ شاہ صاحب کی تصنیفات میں ان کے اس مخصوص اسلوب کی جھلک سب سے زیادہ حجۃ اللہ البالغہ میں پائی جاتی ہے، علاوہ ازیں شاہ صاحب کے خطوط و مکاتیب میں بھی انشاء و تحریر کے اچھے نمونے ملتے ہیں، جنہیں اگر یکجا کیا جائے تو عربی ادب کی ایک ایسی عمدہ کتاب تیار ہو سکتی ہے جس کو بلا مبالغہ جاحظ اور بدیع الزماں کے مقابلہ میں رکھا جا سکتا ہے۔

اسلام میں بہت سے اعمال و ارکان ایسے ہیں جو فرض عین نہیں ہیں بلکہ فرض کفایہ ہیں، یعنی ایک شخص کی ادائیگی سے وہ عمل بستی کے لوگوں کی طرف سے ادا ہو جاتا ہے۔ حضرت شاہ صاحب اس کی حکمت پر روشنی ڈالتے ہوئے کتنے سلیس اور سادہ انداز میں رقمطراز ہیں کہ :-

" واعلم ان من اسباب جعل الشئ فرضاً بالکفایۃ ان یکون اجتماع الناس علیہ

باجمعهم مفسداً لمعاشهم ومفضياً الى اهمال ارتفاقاتهم ولا يمكن
تعيين بعض الناس بالجهاد وآخرين للتجارة وآخرين للفلاحة وآخرين
للقضاء وتعليم العلم. فان كل واحد يتيسر له مالا يتيسر لغيره ولا
يعلم المستعد لشيء من ذلك بالأسامي والاوصاف ليدار الحكم عليها ... (حجة ص ...)

ایک عربی مکتوب کا طرز تحریر ملاحظہ ہو، یہ خط حافظ جار اللہ پنجابی کو سرزمین عرب سے لکھا گیا ہے۔ جہاں حضرت شاہ صاحب سلسلۂ حج تشریف لے گئے تھے۔

"وقد وقعت بالدهلي داهية عظيمة، فنهب الكفار من قوم جت البلدة القديمة، من الدهلي وعجزت الدولة عن دفعهم فنهبت الاموال و انتهكت وحرقت البيوت، ولكن الله تعالى خلصني مع جميع اهلي وعيالي وبيوتي من ايديهم ...... وكانت الواقعة في اوائل رجب ۱۱۶۰ھ واستمرت الى الاخر شعبان[1] ــــــ"

ــــــ اور ــــــ

"بملازمة العلم وغنيمة مجالسة الورعاء وعزمه الله في مواظبة طاعته والاهتمام لعبادته اعلم ان الملاعبة لا تورث الا حسرة وان المفاكهة الا قسوة، اياك واضاعة اوقات في المداهنة والبطالات والآلام تنكص على عقبيك ولا تهتم بما بين يديك، احسن الناس من اذا سمع وعى وحقق ما ادعى، والسلام[2] ــــــ"

فارسی نثر

شاہ صاحبؒ عربی نثر پر پوری قدرت اور مہارت کے ساتھ ساتھ اپنے وقت کی مقبول ترین زبان فارسی میں بھی ادیبانہ شان رکھتے تھے۔ بالخصوص ان کے فارسی کے بعض خطوط تو ادب و انشا کا بیش قیمت خزانہ ہیں۔

"ــــــ خدائے عزوجل آں امیر الغزاۃ رئیس المجاہدین را محفوظ و محظوظ و بہ تعین عنایت ملحوظ دارد، بعد سلام واضح آں کہ رقیمہ کریمہ رسید، الحمد اللہ برکت و سلامت ذات سامی بجا آوردہ شد، در پردہ غیب برانداختن ایں دو فرقہ ضالہ یعنی مرہٹہ و جٹ ہم شدہ است موقوف بر وقت است ہمیں کہ عزیزاں کہ ہمت لبستند۔ و در صدد تتالی آمدند، طلسم کفر انشاء اللہ شکند ــــــ"

ــــــ اور ــــــ

"آنچہ فقیر را معلوم می شود آنست کہ اہالی باز خواہد آمد، برائے کہت کفار و ازالہ دولت

---

[1] شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات ص۹۸ [2] حیات ولی ص۵۳۰

"آں فریق و بعد اتمام موعود درہمیں سرزمین ودیعت حیاۃ اومی نماید و بقا امر با وجود کثرت ازدیاد و تراکم لعن بجہت ہمیں دولت کفار بودہ است والسلام —"

اسی طرح

"مقدمہ مہم تر آنست کہ مسلمانان ہندوستان چہ دہلی وچہ غیر آں چندیں صدمات دیدہ اند، و چند بار نہب و غارت آزمودہ، کارد با ستخواں رسیدہ است جائے ترحم است ہبائے خدا و برائے رسول خدا تاکید بلیغ باید کرد کہ تعرض مال مسلمانے نشود، درایں صورت امید آنست کہ ابواب فتوح پے در پے کشادہ گردد، اگر در ایں امر تغافل شود بترسم کہ آں منظومان سدراہ مقصود گردد والسلام ۔ —"

عربی اور فارسی تحریر کے جو نمونے اوپر دئے گئے ہیں، اُن میں کس بلا کی سلاست، روانی اور برجستگی پائی جاتی ہے، تعقید اور پیچیدگی نام کو بھی نہیں، حضرت شاہ صاحبؒ کی نگارشات میں ایسے ادبی شہ پارے جا بجا بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔

شاہ صاحبؒ کا ذوق شعر و سخن

تاریخ اسلام کی ورق گردانی سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ ائمہ متقدمین اور علمائے متاخرین میں سے بیشتر اپنی گوناگوں علمی صلاحیتوں کے باوصف شعر و سخن سے بھی بہرہ وافر رکھتے تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ ——— بھی، اگرچہ فطری شاعر نہ تھے، بایں ہمہ شعر گوئی کا پورا ملکہ ان میں ودیعت تھا۔

مولانا محمد منظور نعمانی حضرت شاہ صاحبؒ کی اس حیثیت پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:۔

"— یہ تو ظاہر ہے کہ شاعری شاہ صاحب کا پیشہ بلکہ کام بھی نہ تھا، البتہ کبھی کبھی "آتش دل" کے شعلے "غیر شاعر دل" کی زبان پر بھی شعری شکل اختیار کر لیتے ہیں، میرے نزدیک شاہ صاحب کی شاعری کی حقیقت بھی بس یہی ہے —"

چنانچہ جب ——— شاہ صاحب کے واردات قلبی اور احساسات باطنی میں اضطراب اور اندرون دل میں التہاب پیدا ہوتا تو تاثرات و جذبات کلام موزوں بن کر زبان پر آ ہی جاتے، اسی بنا پر شاہ صاحب کے کلام میں نہ صرف شستگی زبان اور برجستگی مضامین کی چاشنی ملتی ہے بلکہ درحقیقت وہ تذکیر و موعظت اور حکمت و بصیرت کے بیش بہا موتیوں سے بھرا ہوا ہے۔

عربی میں حضرت شاہ صاحبؒ کا کلام زیادہ تر نعتیہ قصائد پر مشتمل ہے چنانچہ "اطیب النغم" کے عنوان سے ایک نعتیہ قصیدہ پایا جاتا ہے جو اپنی نظیر نہیں رکھتا، اس کا پہلا شعر ملاحظہ ہو۔

کان نجوماً اومضت فی الغیاہب　　　عیون الافاعی او رؤس العقارب

الد ——— فارسی میں آپ کی غزلیں اور رباعیاں بکثرت ہیں۔ اُس میں آپ امین تخلص کرتے تھے، ایک فارسی قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جو برجستگی اور روانی کا شاہکار ہیں۔

لہ شاہ صاحبؒ کے فارسی مکتوبات کے مذکورہ بالا تینوں اقتباسات پروفیسر خلیق احمد نظامی کے مرتبہ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات سے ماخوذ ہیں

من ندانم بادہ ام یا بادہ را پیمانہ ام — عاشق شوریدہ ام یا عشق یا جانانہ ام
مبتلائے حیرتم جاں گریست با جانِ جاں — اصطلاحِ شوق لیلا است و من دیوانہ ام
با جمالِ ذاتیش حسن دگر در کار شد — چشم او را سرمہ ام یا زلف او را شانہ ام

ایک غزل کا مطلع ہے ـــ

دلے دارم ز خود خالی جالیش می‌تواں گفتن
درد کیفیتے جوش سراپش میتواں گفتن

ایک اور غزل کے تین شعر میں ـــ

ز زلف پیچ در پیچ کسے گم کردہ ام خود را — خود شے در دل شبہا نمی کردم چہ مے کردم
کسے با مل ہے سازد کسے با گل ہمی بازد — اگر من یاد آں بیہا نمی کردم چہ مے کردم
دلے پُر درد، جاں افگار، پا رشتہ خودارم — جہاں را بر نیا یہا نمی کردم چہ مے کردم

حضرت شاہ صاحب نے غزلوں کے علاوہ رباعیاں بھی کہی ہیں دو رباعیاں درج ذیل کی جاتی ہیں، ان کے مطالعہ سے ارباب ذوق یقیناً محظوظ اور متاثر ہوں گے۔

در عشقِ تو از جملہ جہاں بگذشتم — وز ہر چہ بجز یاد تو از آں بگذشتم
مقصودِ من بندہ بجز وصل تو نیست — اندر طلبت از دل و جاں بگذشتم

دائم دلِ من پیش تو حاضر باشد — چشمم برخ خوب تو ناظر باشد
در مذہب ما شرک جلی ہست و صریح — گر بر دگرے خطرہ خاطر باشد

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شعر و ادب کا یہ مختصر ترین تعارف ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شاہ صاحب کا "ادب" کتنا بلند ہے اور شاعری میں بھی آن کی طبیعت نے اپنے جوہر دکھائے ہیں۔
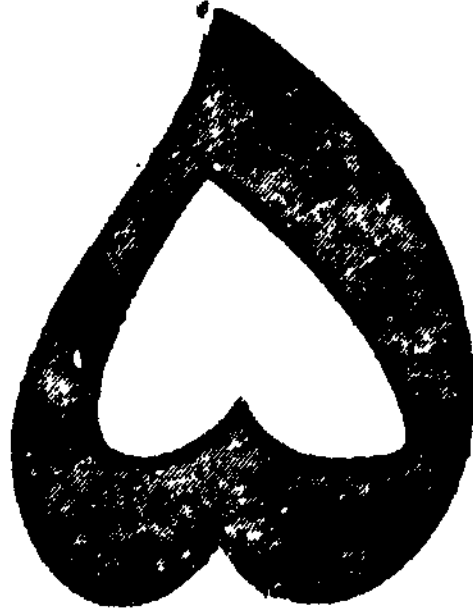
۵
آزمودہ دواؤں کا مرکب
انالجین
سر درد ۔ کمر کا درد ۔ دانت کا درد
ایام ۔ انفلوئنزا اور ہر قسم کے دوسرے درد کے لئے
یقینی زود اثر اور بے ضرر علاج ہے
Opal
Spotlit

مولانا ابو علی (اعظم گڑھ)

دارالمصنفین کے کتب خانہ میں عربی، انگریزی ... اردو ماہوار رسائل کا بڑا اچھا ذخیرہ تھا، جن میں انگریزی میں ماڈرن ریویو کلکتہ، انڈین ریویو، عربی میں المنار، المقتطف، المقتبس اور مصر کے مشہور عیسائی صحافی، انشا پرداز، مصنف اور مورخ جرجی زیدان کا مصور الہلال جس کی اس وقت عربی دنیا میں بڑی دھوم تھی اور لوگ اس کو بڑے ذوق شوق سے پڑھتے تھے اور اردو میں اس دور کے تمام موقر الشیوع ماہنامے مثلاً صبح امید لکھنؤ، زمانہ کانپور، اردوئے معلی علیگڑھ اور الناظر لکھنؤ وغیرہ تھے۔ "الناظر" جو مولانا ظفر الملک علوی کی ادارت میں لکھنؤ سے نکلتا تھا، اور جس کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں مولانا عبدالماجد دریابادی جیسے صاحب طرز انشاپرداز، فلسفی اور اہل قلم تھے۔ اور جلیبی کے قلمی نام سے نیرہ مانی کے عنوان سے اور اس پر کچھ دلچسپ شذرات لکھتے تھے، یہ رسالہ ملکی مسائل پر بھی بحث کرتا تھا اور اس کو ہر حلقہ کے لوگ بڑی دلچسپی سے پڑھتے تھے بلکہ شائقین کو اس کی آمد کا بڑا انتظار رہتا تھا، اس اخبار کو الگ الگ زبانوں میں تقسیم کرنے اور پھر ان کو سال کے حساب سے ترتیب دینے کے لئے مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو ایک بہت معمولی پڑھے لکھے آدمی کی ضرورت تھی۔ جس کا تذکرہ انہوں نے ہمارے شہر کے مشہور مسلم جناب محمد اسحق صاحب قبلہ سے کیا جو اس زمانہ میں وہاں کی بزم سخن کے مستقل بیٹھنے والے تھے، اور مختلف جہات سے وہاں کے ارباب بست و کشاد کو ان پر بڑا اعتماد تھا۔ میں اس زمانہ میں گاندھی اسکول میں جو تحریک ترک موالات کے سلسلہ میں نیا نیا قائم ہوا تھا، اور جس کے تعلیمی اسٹاف میں سی پی اور بہار ہاسٹل تک کے فضلاء شامل تھے اور تعلیمی خدمات انجام دے رہے تھے۔ نویں اور دسویں درجہ کو اردو پڑھاتا تھا، اس وقت میری عمر غالباً زیادہ سے زیادہ ۱۶ برس کی تھی۔ میں جب تنگے لڑکوں کے حلقہ میں بیٹھ کر درس دیتا، تو تماشہ بن جاتا تھا، اس کا سیشن ختم ہو رہا تھا۔ اور نئے سیشن کے لئے لوگوں پر ارباب نظام کی نگاہ انتخاب پڑ رہی تھی جس کو حکیم اسحق صاحب جیسے مخلصین بھانپ گئے انہوں نے ازراہ اخلاص ہمدردی دارالمصنفین کی اس جگہ کا مجھ سے تذکرہ کیا اور فرمایا کہ شروع میں تمہیں معقول ... تک یہ کام کرنا ہے میں اس کام کے لئے جو میرے ذوق کے مناسب تھا، فوراً تیار ہو گیا، اور انہوں نے مجھ کو سید صاحب موصوف کے سامنے پیش کیا، سید صاحب نے مجھ کو بہت غور سے دیکھا اور پسند فرما کر ... ماہوار پر مجھے رکھ لیا۔ اس وقت وہاں کے رفقاء میں مولانا ... ندوی، پروفیسر عبدالباری ندوی مصنف برکلے، مابعدیات الٰہی، مولانا

سعید انصاری مولف سیر الصحابہ مولانا ابو الحسنات ندوی اور انگریزی شعبہ میں مولانا سید نجیب اشرف صاحب ندوی تھے، یہ سلسلہ
نائب پھر دار المصنفین کو اس کی پوری عمر میں نصیب نہیں ہوا مولانا حاجی معین الدین صاحب ندوی مولف خلفائے راشدین چند روز پہلے
ہمیشہ کے لئے اورینٹل لائبریری پٹنہ کے کیٹلاگر ہو کر چلے گئے تھے۔ جن کی کتاب کا مسودہ ان کے جانے کے کئی برس کے بعد مولانا
شاہ معین الدین ندوی کے فاضلانہ مقدمہ کے ساتھ شائع ہوا، جس کو بہت پسند کیا گیا۔ اور بعد میں ان حاجی صاحب موصوف
کی جانشینی انہی کو ملی۔ اور انہی نے دار المصنفین کے سلسلہ مہاجرین کو مکمل کیا اور خود تین کتابیں اس موضوع پر لکھیں۔ جو ان کی
ابتدائی تصنیفی زندگی کا اچھا کارنامہ ہے مولانا عبد السلام ندوی اور مولانا عبد الباری ندوی سید صاحب کے معاصر اور ہم بزم تھے ان
سے تو میں اس کمسنی میں بہت زیادہ بے تکلف نہیں ہو سکتا تھا، لیکن بقیہ حضرات کی خدمت میں میں بہت جلد بے تکلف ہو گیا اور ان
کی صحبتوں میں شریک ہونے لگا؛ ان رسالوں کا مرتب کرنا تنہا میرے بس کا کام نہیں تھا۔ ان کی تعداد رفتہ رفتہ ہزاروں تک
پہونچ گئی تھی۔ لیکن ان منتشر پرچوں کو ترتیب دینے میں اور ان رسالوں کے بعض اچھے مضامین کے پڑھنے میں مجھے جو لطف آیا اس
کو میں آج بھی محسوس کر رہا ہوں، یہ سارا انبار جناب سعید انصاری متعلم جامعہ ملیہ (دہلی) اور انہی پروفیسر نجیب اشرف صاحب
ندوی کی مدد سے چند ہفتوں میں مرتب کر دیا اور ان کی الگ الگ جلدیں بندھ گئیں، جو اب تک کتب خانہ میں محفوظ ہیں، یہ کام ہو گیا
تو سید صاحب نے تصحیح اور پروف پڑھنے کا کام میرے سپرد کیا، پہلے انہوں نے الف لیلہ کی ایک لمبی عبارت پڑھوائی اس کے
بعد اس کا ترجمہ کرایا، جس میں میں کہاں تک کامیاب ہوا میں نہیں کہہ سکتا بہرحال میں انکی براہ راست نگرانی میں تصحیح کا نازک ترین کام
کرنے لگا۔ لیکن خود ان کے نزدیک تصحیح کا کام بے مزہ اور بے کیف تھا جس میں وہ خود اپنا قیمتی وقت ضائع کرنا پسند نہیں کرتے
تھے۔ لیکن وہ روزانہ —— جب دفتر بند ہو جاتا تھا مجھے روک کر تصحیح کا کام کرتے تھے۔ میرے ہاتھ میں اصل ہوتی تھی اور ان
کے ہاتھ میں کاپی، مغرب تک یہ کام ہوتا تھا۔ پھر تو مجھ کو اس کام سے اتنا لگاؤ ہو گیا اور اس معاملہ میں انہوں نے مجھ پر اتنا اعتماد کیا، کہ لوگوں
کے لئے قابل رشک ہو گیا، میرے اس ذوق کی اور اس کام میں میرے لگاؤ کی انہوں نے مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی تک سے تعریف فرمائی
کہ ہم کو اس کام کے لئے یہیں ایک بہت موزوں آدمی مل گیا، بلکہ ایک مرتبہ انہوں نے ان کی خدمت میں مجھ کو پیش بھی کیا اور شیروانی
صاحب موصوف بھی جب دار المصنفین آتے تھے، تو مجھ جیسے معمولی کارکن کو بلا کر ملتے تھے اور خیریت پوچھتے تھے ایک مرتبہ ایسا اتفاق
ہوا کہ مجھے ان سے نیاز حاصل نہیں ہوا، سید صاحب کے ساتھ کتب خانہ میں تشریف لائے میں اپنے تصحیح کے کمرہ میں کام کر رہا تھا۔
ان کی نگاہیں مجھ کو تلاش کر رہی تھیں۔ جس کو سید صاحب بھانپ گئے اور آواز دے کر مجھے بلایا، میں حاضر ہوا، تو بڑی شفقت سے
فرمایا اور سب لوگوں سے تو ملاقات ہو گئی تھی، آپ سے نیاز نہیں حاصل ہوا تھا۔ آج بے اختیار جی چاہا کہ آپ سے بھی مل لوں یہ مشفقانہ
کلمے ان کی زبان مبارک سے نکل رہے تھے اور میں فرط ندامت سے زمین میں گڑا جا رہا تھا۔ مولانا سید نجیب اشرف صاحب مستقلاً
کس موضوع پر کام کر رہے تھے، مجھ کو یاد نہیں، لیکن معارف کے لئے وہ زیادہ تر انگریزی رسالوں کے اچھے مضامین کا ترجمہ،
تلخیص، اور اخبار علمیہ کے عنوان سے علمی خبریں جمع کرتے تھے، اور کبھی کبھی مضمون بھی لکھتے تھے۔ جس کے لکھنے میں وہ بڑی محنت کرتے
تھے، مولانا ابو الحسنات صاحب کے ذمہ واقعات عالمگیری کی ترتیب و تدوین کا کام تھا، جس کو وہ اپنی مستقل علالت کی وجہ سے
پایۂ تکمیل کو نہ پہنچا سکے، اور کچھ دنوں کے بعد رنگر کی پہاڑیوں میں جہاں وہ علاج کے لئے تشریف لے گئے تھے، انتقال ہو گیا اور سید
صاحب نے معارف میں ان کا ماتم لکھا، مولانا سید نجیب اشرف صاحب کو مغربی سیاسی، و علمی کاموں کا ذوق تھا، مولانا مسعود علی
ندوی کہیں باہر تشریف لے جاتے تھے تو قیادت عامہ کی باگ انہی کے ہاتھوں میں آ جاتی تھی۔ وہ سر پر سفید گاندھی ٹوپی، گلے میں سفید

کھدر کی شیروانی، ٹانگوں میں کھدر کا چست پائجامہ اور پاؤں میں نقش و نگار سفید ناگرہ جوتہ پہن کر بازار میں نکلتے تھے، اور دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر خاص طور سے ہندوؤں کو سلام کرتے جاتے تھے۔ تو معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان کا پرنس آف سوراج بایں شان و تمکنت جا رہا ہے اور لوگ ہیں کہ اس کے سامنے بچھے چلے جا رہے ہیں، ہندو عوام میں ان کی یہ غیر معمولی مقبولیت مولانا مسعود علی کی نگاہ میں کھٹک گئی وہ ان کو یہاں کی قومی زندگی میں اتنا اونچا درجہ دینے کے لئے کسی طرح تیار نہیں تھے، اور آہستہ آہستہ ان کو انہوں نے میدان سیاست سے کھینچ لیا، وہ یہاں شاید بی اے کرکے آئے تھے، کچھ دنوں کے بعد ان کو یکایک مزید تعلیم کا خیال پیدا ہوا اور تاریخ میں ایم اے کرنے کے لئے کلکتہ چلے گئے اور وہاں سے گولڈ میڈلسٹ ہو کر واپس آئے، کلکتہ یونیورسٹی میں پروفیسر جدوناتھ سرکار تاریخ کے پروفیسر تھے، مغل پیریڈ خصوصاً اورنگ زیب عالمگیر کا عہد ان کا خاص موضوع تھا۔ اور اس پر کئی کتابیں بھی لکھ چکے تھے، وہ مولانا سید نجیب اشرف صاحب کو بہت مانتے تھے، نجیب صاحب کو بھی ان سے بڑی عقیدت پیدا ہو گئی تھی۔ اور جب ان کا نام آتا تھا تو فرطِ احترام سے ان کی گردن جھک جاتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود ان کو متعصب مورخ سمجھتے تھے، اور مغل تاریخ کے متعلق ان کے بعض نظریات و خیالات و افکار سے سخت اختلاف رکھتے تھے جس کا وہ برملا اظہار بھی فرمایا کرتے تھے، انہی کی محبت میں ان کو رقعات عالمگیری کے مطالعہ کا ذوق پیدا ہوا، جب وہ ایم اے کرکے دوبارہ دارالمصنفین آئے تو سید صاحب نے مولانا ابوالحسنات ندوی کو جن کو فارسی کا بڑا اچھا ذوق تھا۔ اور فارسی اور اردو میں طبع آزمائی کرتے تھے، رقعات عالمگیری کی ترتیب و تدوین کا تمام کام ان کے سپرد کیا اس مشکل اور سنگلاخ کام کو انہوں نے بڑے ذوق و شوق سے شروع کیا اس سلسلہ میں سب سے پہلا کام رقعات عالمگیری کے تمام معلومہ قلمی و مطبوعہ نسخوں کا ہندوستان کے ایک ایک کونے سے جمع کرنا تھا، جس میں ان کو کلکتہ یونیورسٹی کے استاد پروفیسر جدوناتھ سرکار نے بڑی مدد دی اور اپنے کتب خانہ کے تمام بیش قیمت رقعات عالمگیری کے نسخے بھیج دئے، مجھے بھی تھوڑا بہت فارسی کا ذوق ہے، ان نسخوں کی نقل انہوں نے میرے سپرد کی اور میں نے ان کی نگرانی میں رقعات کی نقل شروع کر دی، انہوں نے ان رقعات کو کئی حصوں میں تقسیم کیا تھا، پہلا حصہ جنگ جانشینی تک کے رقعات پر مشتمل تھا، جن کو انہوں نے رقعات کے مختلف مجموعوں سے نہایت دیدہ ریزی سے ایک ایک حرف پڑھ کر اکٹھا کیا تھا۔ وہ مرتب ہو گیا تو اس پر انہوں نے نہایت پرمغز مقدمہ لکھا جو برادرانہ جنگ تک کے حالات و واقعات پر مشتمل تھا، اس میں رقعات و مراسلات کی تاریخ، اس کے آداب اور اسلوب وغیرہ پر بھی روشنی ڈالنی ضروری تھی، جس کے لئے کسی قدر عربی دانی کی بھی ضرورت تھی اور وہ عربی محض واجبی واجبی جانتے تھے۔ انہوں نے اپنی اس ضرورت کا اظہار سید صاحب سے کیا تو انہوں نے ان کو حماسہ ابی تمام پڑھنے کا مشورہ دیا انہوں نے سید صاحب سے پڑھنا شروع کیا تو از راہ ہمدردی میرے شوق کو دیکھ کر مجھے بھی شریک درس کر لیا۔ لیکن کتب خانہ میں اس وقت حماسہ کا ایک ہی شاندار مصری نسخہ تھا۔ جو نہایت سفید و دبیز کاغذ پر چھپا ہوا تھا۔ اور پڑھنے والے دو۔ ایک میں اور ایک وہ۔ لیکن کہیں دوسرا نسخہ باوجود ہزار تلاش و جستجو کے بھی میسر نہیں آیا تو میں نے نقل کرنا شروع کر دیا۔ جتنا پڑھتا تھا اتنا روزانہ نقل کر لیتا تھا۔ لیکن افسوس درس و تدریس کا یہ مبارک سلسلہ سید صاحب کی گوناگوں مشغولیتوں اور سفروں کی وجہ سے جو اکثر پیش آیا کرتے تھے۔ اور جو انکی زندگی کا لازمہ بن گئے تھے، تھوڑے دنوں جاری رہ کر ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا، یہ قلمی یادگار اب تک میرے پاس محفوظ ہے، جب اس پر نظر پڑتی ہے تو بے اختیار میری نگاہوں کے سامنے وہ منظر آجاتا ہے۔ جب میں اور پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی ایم۔ اے گولڈ میڈلسٹ کلکتہ یونیورسٹی، سن و سال، فضل و کمال، عقل و شعور، فہم و بصیرت اور عہدہ و منصب کے تفاوت کے باوجود دوش بدوش سید صاحب کے سامنے بیٹھتے تھے۔ اور ان سے حماسہ کا درس لیتے تھے، میں تو کچھ زیادہ مستفید نہ ہو سکا لیکن موصوف

نے اتنے ہی دنوں میں اپنے ذوق و ذہانت کی بدولت اتنی عربی حاصل کر لی کہ عربی کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا۔

مقدمہ کے پہلے باب فن انشاء کی رجال تاریخ لکھنے میں عربی کے تمام ضروری ماخذ ہے

مثلاً تاج العروس، الفہرست، فتوح البلدان بلاذری، صبح الاعشیٰ، زرقانی وغیرہ سے براہ راست فائدہ اٹھایا اور اس با حسب ذیل تحتانی عنوانات قائم کئے، دیوانوں کی تقسیم، کاتب کے اوصاف، کاتب کے فرائض، کاتب کے اقسام، زبان کی تبدیلی ہندوستان میں فن انشاء، خطوط و مراسلات کے اقسام، فرمان و منشور، مثال، مکتوب، عریضہ، عہد مغلیہ میں فن انشاء، طرز از طریقہ تحریر وغیرہ، خطوط کے اقسام، فرمان، شقہ اور احکام، نشان، عرضہ داشت، فتح نامہ، حسب الحکم، احکام، ورخ، اشا، سند، پروانہ، دستک، رقعہ، محضر، اوقات فرمان نویسی، شاہی مہریں، فن انشاء، عہد مغلیہ میں فارسی زبان کے فن انشا میں ہندوؤں کا بہت بڑا حصہ ہے، انہوں نے عہد جہانگیری بلکہ دور اکبری ہی سے اس میں کمال حاصل کرنا شروع کر دیا تھا۔ راجہ ٹوڈرمل نے دیوان خانہ کے تمام عملہ کو اس کے حاصل کرنے پر مجبور کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ ذوق ہندوؤں میں عام ہو گیا اور ان میں بڑے بڑے فارسی زبان کے انشاء پرداز اور اہل قلم پیدا ہونے لگے، اس عہد کا سب سے بڑا ہندو انشا پرداز چندر بھان برہمن ہے، جو صاحب تصنیفات بھی ہے اس کے بعد تو ہندوؤں نے نہ صرف اس فن انشاء پردازی میں بلکہ تمام علوم و فنون میں فارسی میں بے شمار کتابیں لکھیں، اس کے بعد فن انشا پر فارسی میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کی ایک مختصر فہرست دے دی ہے، اس کے بعد مکاتیب اورنگ زیب کا باب ہے، جس میں رقعات پر تبصرہ ہے اور اورنگ زیب عالمگیر نے اس میں جو جدتیں پیدا کیں، ان کو تفصیل سے دکھایا ہے، یہ باب بھی مصنف مقدمہ کے رقعات عالمگیری کے وسیع مطالعہ کا مظہر ہے، جس میں انہوں نے خوب خوب داد سخن دی ہے اور نہ رف نگاہی کا حق ادا کر دیا ہے۔ اتنی دیدہ ریزی سے شاید ہی ان سے پہلے کسی ریسرچ اسکالر نے رقعات کا مطالعہ کیا ہو، اس کے بعد سیرت اورنگ زیب کے ماخذ کا باب ہے اس کے حاشیہ میں انہوں نے لکھا ہے کہ ان ماخذ کے مرتب کرنے میں سر جدو ناتھ سرکار کی تصنیف اورنگ زیب سے بھی مجھے بڑی مدد ملی ہے۔ ماخذ میں سب سے زیادہ مستند تو خود اورنگ زیب عالمگیر کے رقعات کے مجموعے ہیں، جن کی ایک لمبی فہرست دی ہے اور انہی رقعات اور خطوط کی روشنی میں اورنگ زیب عالمگیر کی پیدائش سے لے کر، برادرانہ جنگ تک کے تمام واقعات و سوانح حالات مرتب کئے ہیں، اس سے آپ اس مقدمہ کی جامعیت کا اندازہ کر سکتے ہیں، کاش کہ یہ سلسلہ قائم رہتا اور تخت نشینی سے لے کر موت تک کے تمام حالات خود اورنگ زیب ہی کے خطوط و رقعات کی روشنی میں مرتب ہو جاتے لیکن افسوس کہ خدا کو یہ منظور نہ تھا اور تاریخ ہند کا یہ مفید ترین کام ناتمام پڑا ہوا ہے۔ دیکھئے اس کے تکمیل کی توفیق کس صاحب ذوق کو ارزانی ہوتی ہے۔

جب یہ رقعات کا مجموعہ اور اس کا مقدمہ چھپ کر شائع ہوا، تو میں نہیں کہہ سکتا کہ سید صاحب علیہ الرحمۃ کو کتنی خوشی ہوئی اور انعام کے لئے حاجی معین الدین صاحب کی خلفائے راشدین اور ان کا یہ مقدمہ ہندوستانی اکاڈمی کے سامنے پیش کر دیا جس کے ایک اہم محرک بنیادی رکن سید صاحب بھی تھے۔ اب مجھے یاد نہیں کہ دارالمصنفین کی ان دونوں مایہ ناز کتابوں پر ہندوستانی اکاڈمی کی طرف سے سید صاحب کی خواہش کے مطابق انعام ملا یا نہیں مگر اس کام کی تکمیل پر سید صاحب کو بڑا فخر تھا، لیکن افسوس کہ وقت کے اس ضروری و اہم کام کی ملک نے باوجود اورنگ زیب عالمگیر کی ذات سے غیر معمولی عقیدت رکھنے کے قدر دانی نہیں کی اور اس کا بقیہ کام ہمیشہ کے لئے ٹھپ ہو گیا، اس کے بعد پروفیسر نجیب اشرف صاحب کی زندگی کا رخ یکایک بدل گیا۔ بوہروں کے اسماعیل کالج اندھیری بمبئی سے فارسی و اردو کی لیکچر شپ کے لئے دارالمصنفین میں آفر آیا اور وہ تصنیف و تالیف اور جمع و تدوین کا سارا چکیف کام جو سالہا سال سے بڑے جوش و خروش سے انجام دے رہے تھے چھوڑ چھاڑ کر بمبئی روانہ ہو گئے اور اس میں وہ ایسے پھنسے کہ پھر زندگی بھر اس سے نہ نکل سکے، بعد میں بتدریج ترقی کرتے

کرنے وہ بمبئی یونیورسٹی میں فارسی اور اردو کے ریڈر ہوگئے تھے، اور پورے علاقہ بمبئی کے جس میں گجرات و مہاراشٹر وغیرہ سب شامل تھے مشرقیات کے ممتحن بھی ہوگئے تھے۔ انہوں نے اپنا ذاتی بنگلہ بھی بنوالیا اور بچوں اور بچیوں کو اعلیٰ تعلیم بھی دلوائی۔ اس عہدے سے ریٹائر ہوئے تو انہوں نے انجمن اسلام بمبئی کے تحت ایک اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا جس کے وہ پہلے ڈائرکٹر تھے ایک سہ ماہی بلند پایہ تحقیقی رسالہ "نوائے ادب" بھی اپنی ادارت میں شائع کرنا شروع کیا جو اب تک بڑی پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ اس ادارہ کی طرف سے مفید و بلند پایہ کتابیں مختلف موضوع پر شائع ہوئیں۔ جن میں ان کی ایک کتاب لغات گجری بھی ہے جو ان کے قلم کی آخری یادگار ہے۔

پورے ۳۴ برس کے بعد وہ یکایک دارالمصنفین آئے، تو میں بیمار اور صاحب فراش تھا۔ ایک صاحب میری عیادت کو آئے تو ان کی زبانی ان کی آمد کا مژدہ ملا۔ میں ان سے اسی حالت میں ملنے کے لئے بے قرار ہوگیا اور دوسرے دن اس ضعف اور نقاہت کے عالم میں رکشے پر بیٹھ کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو مجھ جیسے قدیم نیازمند کے ساتھ اس اخلاق، محبت اور گرم جوشی کے ساتھ پیش آئے کہ مجھے محسوس ہی نہیں ہوا کہ میں پورے ۳۴ برس کے بعد مل رہا ہوں۔ فرمایا کہ میں تم سے ملنے کے لئے بڑا بے چین تھا۔ میں رقعات عالمگیری کا کام دوبارہ شروع کرنا چاہتا ہوں اور اس سلسلہ میں پہلے کی طرح تمہارا تعاون چاہتا ہوں، میں اس کا سارا ذخیرہ یہیں چھوڑ کر چلا گیا تھا، پہلے یہ کرو کہ وہ سب اکٹھا کرو اور مجھے اطلاع دو۔ پھر میں اور کام بتاؤں گا میں نے ان سے کہا کہ کئی برس ہوتے ہیں کہ کتب خانہ جو سید صاحب کے زمانہ سے میرے ہاتھ میں تھا، مجھ سے لے لیا گیا، اور لائبریرین کی الگ پوسٹ یہاں قائم کردی گئی ہے۔ اس عرصہ میں میرے ہاتھ کی رکھی ہوئی ساری چیزیں منتشر ہوگئیں جن میں رقعات عالمگیری کے متعلق آپ کی قیمتی یادداشتیں بھی تھیں، جو مجلد رجسٹروں کی شکل میں تھیں، اب میں نہیں کہہ سکتا کہ آپ کا یہ منتشر سرمایہ بہم ہوسکے گا یا نہیں، تاہم یہ معلوم کرکے مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ اپنی زندگی کا تمام کام یہیں بیٹھ کر مکمل کرنا چاہتے ہیں۔ اور آپ نے کارفرمایان دارالمصنفین کی دعوت قبول بھی فرمالی ہے۔ یقیناً آپ کے آنے سے دارالمصنفین کا وقار بڑھ جائے گا۔ لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ بمبئی میں اس کام کے لئے ان کو جو سکون حاصل ہوگیا ہے وہ یہاں نصیب نہیں ہوسکتا اس لئے کام بمبئی ہی میں رہ کر انجام دیں گے، جو مولانا شبلی کا ایک تصنیفی مرکز بھی تھا۔ بلکہ ناتمام سیرت کا آغاز انہوں نے جمالستان بمبئی میں بیٹھ کر کیا تھا۔ شعر العجم کی بعض جلدیں بھی انہوں نے وہیں لکھی تھیں، اس بنا پر مجھے ان کے اس فیصلہ سے خوشی ہوئی اصل چیز کام کی تکمیل ہے اور وہ جہاں بھی بیٹھ کر انجام پائے اور پھر بمبئی تو نجیب اشرف صاحب کے لئے وطن ثانی بن گیا ہے۔ پوری یونیورسٹی ان کے ہاتھ میں ہے، وہاں کے سارے کتب خانوں میں ان کی رسائی ہے ہر قسم کی سہولت ان کے لئے پہنچ سکتی ہے۔

انہوں نے مجھ کو خط لکھا، کہ ہاں میں نے اب عزم کرلیا ہے اور کسی نہ کسی طرح جو تھوڑی بہت زندگی باقی رہ گئی ہے جلدی جلدی اس ادھورے کام کو مکمل کرلینا چاہتا ہوں، جوبلی کے سلسلہ میں شاہ معین الدین صاحب ندوی اور صباح الدین صاحب بمبئی گئے تو اس کام میں انہوں نے ان کا بہت ہاتھ بٹایا یا انہوں نے اور ان کے عزیز شہاب دسنوی صاحب نے اور دوسرے قدردانان دارالمصنفین نے اچھی خاصی رقم وہاں سے فراہم کرادی، وہاں سے یہ حضرات لوٹنے لگے تو انہوں نے صباح الدین صاحب کے ذریعہ رقعات عالمگیری کا ایک بہت طویل قلمی نسخہ نقل کرنے کے لئے میرے پاس بھیجا، جو مدت تک مزید ہدایات کے انتظار میں میری میز پر پڑا رہا، نہ صباح الدین صاحب نے اس کی یاد دہانی کی نہ خود سید صاحب موصوف ہی نے اس کی خبر لی، جوبلی میں

شرکت کے لئے آئے بھی تو اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا اور میں مطمئن ہو گیا۔ کہ شاید یہ کام بہت جلدی کا نہیں ہے، جانے سے پہلے انہوں نے مجھے بارہا یاد کیا، لیکن میں اپنی خانگی مجبوریوں کی وجہ سے ان سے جوہلی کے بعد پھر مل نہ سکا۔ اور وہ روانہ ہو گئے، جس کا مجھے بڑا غم ہوا کہ معلوم نہیں اب کب اُن کی زیارت نصیب ہوگی، بمبئی پہونچنے کے کچھ دنوں کے بعد یکایک ان کو اپنی اس جلد کا خیال آیا اور مجھ کو لکھا کہ تم نے ابھی نقل کرنا شروع کیا یا نہیں، میں نے معذرت کا خط لکھا، تو بہت سخت خفگی کا خط آیا، کہ میرا پیمانہ عمر لبریز ہوتا چلا جا رہا ہے، عوارض کا ایک سلسلہ ہے جو ختم ہونے کو نہیں آ رہا ہے معلوم نہیں کب زندگی دغا دے جائے اور میری زندگی کا یہ کام رہ جائے، برسوں سے وہ کتاب لئے پڑے ہو اور نقل نہیں کر رہے ہو، اس خفگی کے خط کے بعد، ہزار پانچ سو صفحہ کی کتاب میں نے نقل کر کے بھیجدی تو اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے کہ تم نے میرا کام بہت آسان کر دیا، لیکن میرے خیال میں اُن میں اس کام کی تاب بڑھاپے کی وجہ سے باقی نہیں رہ گئی تھی، ایک حرص تھی جو بار بار ان کو آمادہ کرتی تھی، میں نے ایک مرتبہ اس کام کی یاد دہانی کی، تو مجھے کوئی جواب نہیں دیا، لیکن یہ لکھا کہ تم نے جو محنت کی ہے مجھے اس کا خیال ہے، میرا خیال ہے کہ وہ اپنے اس ادھورے کام کا ارادہ ہی کرتے رہ گئے اور دنیا سے چل بسے اور اس کی حسرت اپنے ساتھ لے گئے۔

اُن کی شروع جوانی میں اردو کے عناصر خمسہ پر، الناظر بک ڈپو کی طرف سے ایک انعامی مقابلہ کا اعلان ہوا، جس کے ممتحنین میں ایک مولانا عبدالماجد دریا بادی بھی تھے۔ جن کا باقاعدہ تعلق الناظر سے تھا اور اس میں اُن کے فلسفیانہ مضامین شائع ہو رہے تھے۔ اس میں اُس وقت کے کئی اہل ذوق نوجوانوں نے حصہ لیا تھا، ان میں ایک پروفیسر نجیب اشرف صاحب بھی تھے، انہوں نے اس پر بہت محققانہ مضمون لکھا اور ثابت کیا کہ اردو کے عناصر اربعہ میں سب سے بڑے انشاء پرداز مولانا شبلی ہیں۔ اس کا مسودہ میں نے ہی صاف کیا تھا خیال تھا کہ دارالمصنفین اور شبلی کے رنگ کا یہ فاضلانہ مضمون لوگوں کو سب سے زیادہ پسند آئے گا اور انعام انہی کو ملے گا، لیکن مولانا عبدالماجد دریا بادی نے اعظم گڈھ کے ایک نوجوان طالب علم کے حق میں جو بزم شبلی کے ایک رکن بھی تھے، اور مولانا شبلی سے اور ارباب دارالمصنفین سے بڑا اخلاص رکھتے تھے، فیصلہ دے دیا، اور انعام انہی کو مل گیا، انہوں نے بھی مولانا شبلی ہی کو ترجیح دی تھی، بعد میں یہ سارے مضامین کتابی شکل میں شائع ہوتے اور نیز اب یہ اعلیٰ قابلیت وغیرہ کے امتحان میں شامل ہیں اُن میں نجیب صاحب کا بھی مضمون ہے، جس کو پڑھ کر آج بھی حیرت ہوتی ہے کہ مصرین نے آخر ان کے حق میں فیصلہ کیوں نہیں دیا، لیکن نوجوان کو اس کا کوئی غم نہیں تھا کہ قسمت ان کو ایک بہت بڑے کام کے لئے تیار کر رہی تھی۔ رقعات عالمگیری کا مقدمہ ان کی تصنیفی زندگی کا شاہکار ہے۔ جس پر اردو ادب و تاریخ کو ہمیشہ فخر رہے گا لیکن اردو کے عناصر اربعہ کے مضمون نگار دل کو آج کون جانتا ہے، انہوں نے بمبئی میں رہ کر اردو کی بڑی خدمت کی، یہ انہی کی کوششوں کا فیض ہے کہ اردو سب سے زیادہ بمبئی یونیورسٹی میں پڑھی جاتی ہے طلبا اس میں بی۔ اے، ایم۔ اے اور پی، ایچ ڈی تک کرتے ہیں۔ وہاں کے تمام کالجوں میں اچھے سے اچھے اردو کے اساتذہ ہیں، جن کو اردو سے عشق ہے اور اردو کا کام آگے بڑھا رہے ہیں، اس وقت پورے ہندوستان میں اردو پر جو لوگ خاموش کام کر رہے ہیں اُن میں ایک ان کی بھی ذات تھی۔ افسوس اردو زبان و ادب ایک بہت مخلص پرجوش فعال اور سرگرم خادم سے محروم ہو گیا، وہ اردو ہی کے لئے مرتے اور جیتے تھے، اسی کے لئے دن رات ہندوستان کا چکر لگایا کرتے تھے، آج حیدرآباد میں ہیں تو کل پنجاب میں، ابھی مدراس میں ہیں تو ابھی بہار میں سرگرداں نظر آتے ہیں، کہاں کہاں جا کر انہوں نے اردو کی صدا نہیں لگائی اور ان کی آواز پر لوگوں نے لبیک نہیں کہا، اور اردو کی خدمت کے لئے انجمنیں اور مجلسیں قائم نہیں کیں، اُن کا فیض بمبئی سے لے کر آسام تک پھیلا ہوا تھا، ان کا دائرہ عمل یونیورسٹیوں، کالجوں اور

حلقوں تک محدود تھا، اردو کی ترقی و اشاعت و فروغ کا سارا کام اس دائرہ کے اندر کرتے تھے۔ اور کامیاب تھے۔
میرا ان سے ساری عمر کبھی فکری و نظری، عملی اختلاف نہیں ہوا، مولانا مسعود عالم ندوی کی طرح جو سید صاحب کے بڑے عقیدت کیش تھے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے بھی اپنے نام کے سید صاحب کے سارے مکاتیب کو اپنے حواشی و تعلیقات کے ساتھ دو جلدوں میں شائع کرنے کا اعلان اپنے ذاتی اخبار صدق جدید میں کیا تو اس سے وابستگان دامن سلیمانی میں جن لوگوں نے اختلاف کیا، ان میں ایک یہ بھی تھے اور ان خطوط کی اشاعت کی تائید میں سید صاحب کی ذات سے فرط محبت کی بنا پر صدق جدید مورخہ یکم نومبر ۶۲ء میں میرا جو طویل مراسلہ شائع ہوا تھا، اس سے ان کو بھی رنج پہنچا، مجھے جب اس کا پتہ چلا تو میں نے اپنے خیال کی تائید میں ان کو بہت مدلل خط لکھا۔ اور عرض کیا اصل معاملہ ماجد صاحب کی کسی کتاب، کسی تحریر، کسی مضمون اور کسی مکتوب کی اشاعت کا نہیں۔ سید صاحب علیہ الرحمۃ کے خطوط کا ہے، جو مولانا دریابادی کے نام ہیں۔ جو سید صاحب کی لائف کے مستند ترین ماخذ بن سکتے ہیں اور جن سے سید صاحب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑ سکتی ہے انہوں نے میرے اس خط کا جواب نہیں دیا۔ سید صاحب کے تمام قدیم نیازمندوں میں ایک تنہا میں تھا۔ جو ان خطوط کی اشاعت کا موید تھا۔ ورنہ عام طور سے سب کے سب مخالف تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ سید صاحب کے خلاف جواب دنیا میں نہیں رہ گئے ہیں، مزید فتنے اٹھیں اور ان کی روح تک کو صدمہ پہونچے، اس پر مولانا دریابادی نے اپنے خاص اسلوب میں مقدمہ لکھا، اور اس کو انہوں نے صدق میں شائع کیا تو ان خطوط کی اشاعت اور زیادہ محل اعتراض بن گئی، اس سے سب سے زیادہ دلچسپی مولانا ابوالکلام کے معتقدین نے لی، اور اس پر انہوں نے خوب خوب مضامین لکھے میں سب سے پہلے سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب کے ایما سے مولانا ابوالکمال عبدالحکیم صاحب دستوی کے نام کے، سید صاحب کے سارے خط نقل کر چکا تھا، جس سے مجھ کو بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی، اس وقت تک میں سمجھتا تھا کہ سید صاحب نے اپنے اہل وطن دوست اور عزیزوں کو اپنے تمام احباب تلامذہ، رفقا اور ارادتمندوں میں سب سے زیادہ خط لکھے ہیں۔ جب صدق میں ماجد صاحب کا مقدمہ شائع ہوا تو معلوم ہوا کہ ان سے بھی کہیں زیادہ خط انہوں نے اپنی زندگی میں ماجد صاحب کو لکھے ہیں، جن کی اتنی تعداد ہے کہ وہ دو جلدوں میں آئیں گے، تو فطری طور پر میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ کاش یہ سارے خطوط جو طرح طرح کے علمی نکات و فوائد پر مشتمل ہوں گے، منظر عام پر آ جاتے، یہ خطوط بعد میں مولانا عبدالماجد صاحب کے اپنے پروگرام کے مطابق دو جلدوں میں شائع ہوئے ایک جلد تو کئی سال پہلے شائع ہوئی جس میں ان کا مقدمہ مکاتیب بھی ہے۔ اور دوسری اب شائع ہوئی ہے، جو سید صاحب کے کراچی کے زمانہ قیام تک کے خطوط پر مشتمل ہے اور بعض اور تحریریں بھی ہیں، یہ دونوں مجموعے خوب مقبول ہوئے اور خوب پڑھے جا رہے ہیں، سید صاحب کی تحریروں میں جو خالص علمی رنگ ہوتا ہے ان میں سے اکثر خطوط اس کے حامل ہیں، جو کافی دلچسپ اور پڑھنے کے لائق ہیں، مجھے ان خطوط کے ساتھ ان خطوط پر ماجد صاحب کے حواشی و تعلیقات کا بڑا انتظار تھا۔ جس کا اعلان خاص طور سے انہوں نے صدق میں کیا تھا اور میں سمجھتا تھا کہ وہ اتنے مفصل ہوں گے۔ کہ ان سے دو معاصر بزرگوں کے طویل تعلقات و روابط کی ایک مربوط تاریخ بن جائے گی۔ لیکن پہلی جلد چھپ کر سامنے آئی تو مجھے سب سے زیادہ ماجد صاحب کے حواشی و تعلیقات ہی بہت تشنہ نظر آئے بس حواشی میں کہیں کہیں محض اشارے کر دئے ہیں جن سے کسی طرح ذوق کو تسکین نہیں ہوتی، بہرحال ماجد میاں کا یہ کام جو انہوں نے بڑی توقعات کے ساتھ انجام دیا، حلقۂ سید کو جس کے ایک ممتاز فرد پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی مصنف مقدمہ رقعات عالمگیری بھی تھے، پسند نہیں آیا۔ لیکن ایک حلقہ سید صاحب کے مسترشدین کا بھی ہے جو سید صاحب مرحوم سے عشق کی حد تک تعلق رکھتے ہیں، ان میں ایک حیدرآباد کے مولوی غلام محمد بی۔ اے ہیں، جنہوں نے تذکرہ سلیمان لکھا ہے اور ایک پروفیسر محمد اشرف صاحب ہیں جو پشاور یونیورسٹی میں لکچرار ہیں انہوں نے ان مکاتیب کی اشاعت

(باقی صفحہ ۶۳ پر)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

کا مکتوب گرامی

مدیر "فاران" کے نام

باسمہٖ سبحانہٗ

لیسٹر
۱۰/اکتوبر ۶۸ء

برادرم ماہر صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

عنایت نامہ مورخہ ۲۰ ستمبر یہاں ڈاک کے ہنگامے کی وجہ سے بڑی تاخیر کے ساتھ ملا۔ میں آپ کا اور تمام احباب کا تہ دل سے شکر گزار ہوں جو میرے لیے فکرمند ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ آپ سب لوگوں کو اس شفقت و محبت کا اجر جزیل عطا فرمائے۔

چودھری صاحب اب برمنگھم سے منتقل ہو کر یہاں میرے پاس آگئے ہیں۔ اگرچہ بہت کمزور ہوگئے ہیں لیکن اللہ کے فضل سے وہ پیپ جو انہیں اندر ہی اندر کھائے جا رہی تھی پوری طرح نکل گئی ہے۔ اب ان کا بھی ایک آپریشن ہونا باقی ہے اور میرا بھی۔ پہلے آپریشن کے اثرات ختم ہونے کا انتظار کیا جا رہا ہے اور سردست کوئی تاریخ مقرر نہیں کی گئی ہے۔

چودھری صاحب آپ کو سلام کہتے ہیں۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ

محمد حفیظ اللہ پھلواروی

شمس الدین التمش

(۶۰۷ - ۶۳۳ ہجری ——————— ۱۲۱۰ — ۱۲۳۶)

قطب الدین ایبک کی وفات اور اس کے جانشین آرام شاہ کی معزولی کے بعد شمس الدین التمش برصغیر ہند و پاکستان میں سند حکومت پر بیٹھا اور دہلی کو اپنا پایہ تخت بنایا۔

مصنف بزم مملوکیہ کے الفاظ میں ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں میں شمس الدین التمش ایک عدیم المثال فرماں روا گزرا ہے غلامی سے ترقی کرکے نہ صرف دہلی کے تاج و تخت کا مالک بنا بلکہ اپنی سپہ گری، سیاسی ہوشمندی، عشق الٰہی اور علم نوازی میں اپنی نظیر آپ ہوا۔ تاریخوں اور تذکروں میں اس کا ذکر ایک بہادر سپاہی، بیدار مغز حکمراں اور جلیل القدر اہل علم کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔ اس کی دینی بزرگی اور نیک سیرت کی بھی اہل تاریخ نے تعریف کی ہے۔

مشائخ کی صحبت میں رہ کر التمش نے صرف علوم باطن و علوم شریعت حاصل کرنے کی کوشش میں بھی برابر لگا رہا۔ قدرت کی طرف سے اس کو قوی حافظہ بھی ملا تھا۔ اس کے حافظہ کی تعریف خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے بھی کی ہے۔ فوائد الفواد میں ایک موقع پر فرمایا۔

"طبع حافظ قوی داشت" ص ۲۱۳

ظاہر ہے کہ اس قوی حافظہ کے ساتھ مشائخ و علماء کی صحبت میں اس کے علم و فضل کی جلا کس قدر ہوئی ہوگی۔ (بزم مملوکیہ)

مورخین نے التمش کو ایک بلند پایہ سیاست داں فرماں روا قرار دیا اور اسے تخت دہلی کے کامیاب حکمرانوں میں شمار کیا ہے علاوہ اپنی سیاسی مصروفیتوں اور انتظام سلطنت میں مشغول رہتا لیکن اس کی سیاسی سرگرمیاں اس کی علم پروری اور معارف نوازی میں مانع نہ ہو سکیں اس نے ارباب فضل و کمال کی بڑی قدر افزائی اور سرپرستی کی۔ اس نے عنان حکومت ہاتھ میں لینے کے بعد ہی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود علماء، فضلاء اور شعراء کی مجلسیں گرم رکھیں۔ میدان جنگ میں بھی علماء و فضلاء کی ایک جماعت سلطان کے ہمراہ رہا کرتی تھی۔ التمش علم و ہنر کا بہت بڑا قدرداں اور مربی تھا۔ اس نے مدارس اور تعلیمی مراکز کی دریا دلی سے سرپرستی کی۔

التمش کے دربار کی رونق محمود اور سنجر کے درباروں کی یاد تازہ کرتی تھی۔ معاصرین نے اس کے عزم و جلال میں سکندر کی تصویر دیکھی تھی۔ (تاریخ فیروز شاہی)

بقول ابن بطوطہ التمش نہ صرف نیک چلن اور انصاف پرور تھا بلکہ عالم و فاضل بھی تھا۔ وہ علمی ذوق رکھتا تھا اور علماء و فضلاء کا بڑا قدرداں تھا۔

التمش نے دہلی کی نوزائیدہ سلطنت کو مضبوط کرکے ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کیا۔ غرض التمش ہندوستان میں اس عظیم سلطنت کا بانی بنا اور اس زمانہ کی رسم کے مطابق ہندوستان کی شہنشاہی کا پروانہ دربار خلافت بغداد سے بھی آگیا گویا رسمی حیثیت سے ضابطہ کے ساتھ سلطنت غزنی سے اس کے جداگانہ وجود کی مزید تصدیق ہوگئی (عہد اسلامی کا ہندوستان)
دہلی کا پہلا سلطان جس کو باضابطہ خلیفۂ اسلام نے خلعت بھیجا شمس الدین التمش تھا۔ جس کے سکوں پر پہلے ہی دن سے ناصر الدین الخ کندہ تھا۔ ۶۲۶ھ میں خلیفہ ابوجعفر منصور المستنصر باللہ کے وکلا دہلی پہونچے۔ سلطان ان کے وزراء بلکہ غلاموں تک کے لئے خلعت لائے۔ اس موقع پر بہت خوشیاں منائی گئیں۔ شہر آراستہ کیا گیا اور وکلاء کی بے حد آؤ بھگت ہوئی۔
(منہاج سراج ص ۱۷۴)

جب سلطان نے یہ خلعت بھیجا تو مولانا تاج الدین ریزہ نے ایک طویل قصیدہ لکھ کر شاعرانہ کمال دکھایا۔
اس قصیدہ کا مطلع ہے۔

مژدہ عالم را از عالم آفریں آوردہ اند
زانکہ شہ را از خلیفہ آفریں آوردہ اند

مولانا منہاج الدین نے سلطان التمش کی فیاضی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"اپنی بادشاہت کے اول روز سے علماء پر، سادات پر، ماتحت بادشاہوں پر اور امراء واکابر پر ایک کروڑ سالانہ سے زیادہ خرچ کرتا تھا"

دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

"اگرچہ قطب الدین نے بھی اپنے عہد میں بخشش وعطا سے کام لیا، مگر شمس الدین التمش نے اصحاب علم وکمال کو ایک لاکھ کی جگہ ایک کروڑ سے نوازا"

"خزینۃ الاصفیاء" کے مؤلف نے التمش کے جود وسخا کو قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے وہ لکھتا ہے:۔

"وہ رات کو آخری حصہ میں گدڑی اوڑھ لیتا اور رعایا کی خبر گیری کے لئے شہر کا گشت کرتا۔ علماء وصلحا اور اصفیا کو بڑی بڑی رقمیں دیا کرتا تھا اس کا یہ طریقہ تھا کہ مٹی کے برتن میں اشرفیاں بھر دیتا اوپر سے گیہوں رکھ دیتا تاکہ اس کی سخاوت مخفی رہے اور اس کا اظہار موجب ریا نہ ہو۔ سلطان کی اس فیاضی کا نتیجہ یہ تھا کہ بیرونی ممالک سے بکثرت اہل فن کھچ کھچ کر دہلی میں جمع ہوگئے تھے۔ اور یہ شہر علماء وفضلاء کا عظیم الشان مرکز بن گیا تھا"

فقیروں درویشوں کو ہدیئے بھیجا، علماء وفضلاء کے وظیفے مقرر کئے۔ محتاجوں اور مسکینوں کو سخاوت سے غنی کردیا، ملک میں جا بجا مسجدیں، خانقاہیں، سرائیں اور پل بنوائے۔ بہت سے باغ لگوائے۔ نہریں نکلوائیں غرض وہ سب کام کئے جو نیک نامی ونیک بختی کے ضامن ہیں۔ (خلاصۃ التواریخ)

مسٹر الفنسٹن سلطان التمش کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"اس نے عالموں اور فاضلوں پر ایسی ایسی بخششیں کیں اور ایسے ایسے وظیفے مقرر کئے کہ پہلے کسی بادشاہ نے مقرر نہ کئے تھے۔ اس نے طرح طرح کی فیاضی اور دریا دلی سے شفا خانے بنائے اور محتاج خانے جاری

کئے اور قلمرو کے تمام عالموں اور فاضلوں سے ایسے ایسے سلوک کئے کہ اس کے مناقب اور محامد کے چرچے جا بجا ہونے لگے۔

دینی دلچسپیاں :-

مذہب کی جو عظمت اور محبت ابتدائی زمانہ میں التمش کے دل میں قائم ہو گئی تھی وہ تخت نشینی کے بعد بھی اس کے قلب و جگر کو گرماتی رہی اور سیاسی زندگی کی مصروفیتیں اس کے روحانی مشاغل میں حارج نہیں ہوئیں اس نے اپنی دینی دلچسپیوں کا اتنا گہرا نقش دلوں پر بٹھا دیا تھا کہ تذکرہ نویس اولیاء و مشائخ میں اس کا شمار کرنے لگے اور تقریبا اس کا نام لے کر رقص کرنے لگے۔ مولانا غلام سرور نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ — "اگرچہ ظاہر میں اس کا تعلق بادشاہی سے تھا لیکن جہاں تک دل کا تعلق ہے وہ فقیر دست تھا۔ (خزینۃ الاصفیاء ج ۱ ص ۲۷۶)

نظام الدین احمد بخشی نے اس کا شمار تو بادشاہوں ہی میں کیا، لیکن اس کی سیاسی طاقت کو یہ کہہ کر مذہبی رنگ دے دیا کہ اس کے چراغ دولت نے تائید الٰہی کے نور سے روشنی پائی تھی (طبقات اکبری ج ۱ ص ۶۳) بحوالہ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات)

مراۃ الاسرار میں ہے :-

"سلطان شمس الدین مرید پاک اعتقاد خواجہ قطب الاسلام بختیار اوشی بود"

خزینۃ الاصفیاء میں ہے :-

"از خلفائے نامدار و مریدان با اعتقاد خواجہ قطب الدین بختیار است"

اسی تذکرہ میں یہ بھی ہے :-

"او (یعنی سلطان التمش) از محبوبان و منظوران خواجہ معین الدین سنجری بود و کمال اعتقاد بخدمت اہل چشت نیک سرشت پیدا کرد" (بزم مملوکیہ)

التمش صاحب علم و فضل اور علماء و ماہرین فن کا قدر داں اور دیندار، تہجد گزار اور صاحب زہد و ریاضت تھا، ورعلماء کی خدمت میں حاضر رہنے کی سعادت کو یقین سمجھتا تھا۔ (عہد اسلامی کا ہندوستان)

التمش زہد و عبادت پر مائل تھا، ہر جمعہ کو جامع مسجد میں نماز ادا کرتا، وعظ سن کر اتنا متاثر ہوتا کہ آنسو بہنے لگتے۔ ہر معاملہ میں شریعت کا خیال رکھتا تھا۔ (خلاصۃ التواریخ)

سلطان شمس الدین طاعت و عبادت کی بڑی لگن رکھتا تھا۔ جمعہ کے دن مسجد جاتا تھا اور سفر الحق و نوافل کی ادائیگی کے لئے وہاں قیام کرتا تھا (طبقات اکبری ج ۱ ص ۶۹)

حضرت نظام الدین اولیا کا بیان ہے کہ

"راتوں کو جاگتا تھا اور کسی کو بیدار نہیں کرتا تھا" (فوائد الفواد ص ۲۰۳)

وہ ہفتہ میں تین بار وعظ سنا کرتا تھا اور رمضان کے ہفتے میں وعظ کی مجلسیں روزانہ منعقد ہوا کرتی تھیں۔ جمعہ کی نماز کے بعد ایک مجلس منعقد ہوتی تھی جس میں اکابر و مشائخ شریک ہوتے تھے اور با سلطان حلقہ کردہ نشستند۔ (سیر العارفین قلمی نسخہ)

التمش کے دربار میں علماء و مشائخ کے اجتماع کے متعلق برنی نے بلبن کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "اس طہارت اور پاکیزگی کے لوگ

اس نے کبھی دیکھے اور نہ سنے (تاریخ فیروز شاہی صلا)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے التمش کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ :-

"مشائخ علماء اور زہاد کی تعظیم میں وہ بادشاہان وقت میں اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا"

مورخوں میں عصامی نے اپنی منظوم تاریخ "فتوح السلاطین" میں التمش کو صاحب ولایت، پارسا، صاحب شریعت، غمخوار دین اور خوش نفس وغیرہ جیسے القاب سے یاد کیا ہے۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء نے بھی سلطان کا ذکر جا بجا بہت ہی عزت و احترام اور لطف و محبت سے کیا ہے بلکہ اس کے بعض قول اور فعل کو بطور نصیحت اپنے مریدوں کے سامنے نقل بھی کیا ہے۔

قطب صاحب کے ملفوظات فوائد السالکین میں بھی التمش کا ذکر بار بار اچھے الفاظ میں کیا گیا ہے ایک جگہ فرمایا :-

"آں مرد یکے از واصلان حق بود" صلا (بزم مملوکیہ)

ارباب فضل و کمال کی آمد

جس وقت التمش دہلی کے تخت پر بیٹھا تھا اس زمانہ میں صدہا علماء و مشائخ وسط ایشیاء کے حالات سے بددل ہو کر جنوبی ہند و پاکستان آ رہے تھے۔ سلطان نے ان بزرگوں کا پرجوش خیر مقدم کیا اور شاہی مہمان رکھا۔ اس کی مہمان نوازی نے مقناطیس کا کام کیا اور بہت سے مشاہیر فن اور بزرگ یہاں آ کر بس گئے (طبقات ناصری)

مولانا ضیاء الدین برنی لکھتے ہیں کہ چنگیز خانیوں کے فتنہ سے عاجز و پریشان ہو کر ارباب فضل و کمال عہد شمسی میں اس کثرت سے جمع ہو گئے تھے کہ ربع مسکون میں اس کی مثال ناپید تھی۔

چنگیزی حادثہ سے جس قدر امراء، فضلاء و علماء سلاطین تاتار خوارزمی وغور، خراسان و ایران، بغداد و عراق سے جان بچا کر دہلی آئے، سب کی غور و پرداخت حسب مدارج کی گئی اور ان کے نقصان کی تلافی کی گئی۔ ملازمت، جاگیر و معافی، تنخواہ و وظیفہ کی امداد سے کثیر التعداد پناہ یافتوں کی تسلی خاطر ملحوظ رکھی گئی اور غریب الوطن شرفاء کی معاونت میں چنگیز خاں جیسے جابر و قاہر خاقان کی مخالفت کی پرواہ نہ کی۔ اور اپنی ذات اور فوج سے اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ شہزادوں اور امراء کا اس قدر جمگھٹا ہوا کہ دہلی میں ان کے لیے علیحدہ علیحدہ محلے بنانے پڑے۔ فضلاء و علماء و مشائخ عظام کے اجتماع سے دہلی حقیقی مدینۃ الاسلام بن گئی (تاریخ ملت)

اصحاب کمال

سلطان التمش کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ ہر قسم کے اصحاب کمال کو اپنے دارالسلطنت میں جمع کرے۔

نظام الملک قوام الدین محمد بن ابوسعید جنیدی کو جو تیس سال تک خلیفۂ بغداد کا وزیر رہ چکا تھا۔ وزارت کے منصب پر فائز کیا۔ نظام الملک علم و دانش کے لیے مشہور و نامور تھا۔

مولانا تاج الدین دہلوی صاحب دیوان و کمال تھے۔ بہاء الملک تاج الدین حسن بن احمد اشعری جو اپنے دور کے ممتاز اہل علم تھے۔ سلطان ناصر الدین قباچہ کے زوال کے بعد التمش کے دامن دولت سے وابستہ ہو گئے۔

عین الملک فخر الدین حسین بن احمد اشعری التمش کے دربار سے وابستہ تھا۔

حضرت نور الدین المبارک غزنوی کو سلطان التمش اپنے دربار میں سب سے اونچی مسند پر بٹھاتا اور ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیتا اور

ں میں ان سے برکت حاصل کرتا۔ (نزہت الخواطر)

حضرت نور الدین دہلی والوں کے روحانی پیشوا اور شیخ الاسلام تھے۔ سلطان التمش کے زمانے میں لوگ آپ کو امیر
کہتے تھے۔ (اخبار الاخیار)

برنی نے تاریخ فیروزشاہی میں ایک طویل وعظ شیخ نور الدین مبارک سے منسوب کیا ہے جس سے ان کے انداز فکر، بلکہ
دائی دور کے ذہنی کشمکش پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ وعظ شمس الدین التمش کی مجلس میں کیا گیا اور اسی میں بادشاہوں کے فرائض
ہی ذکر ہے (آب کوثر)

سلطان التمش نے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کو شیخ الاسلامی کے عہدے پر مقرر کرنا چاہا لیکن آپ نے انکار فرمایا۔
ندین الصغریٰ اس منصب پر سرفراز ہوئے۔ نجم الدین کو ان کے اعمال کے سبب التمش نے برطرف کر کے حضرت بہاء الدین زکریا
منصب کو قبول کرنے کی استدعا کی جس کو آپ نے قبول فرمالیا۔ اس دور کے ممتاز مشائخ میں آپ کا درجہ بہت بلند تھا۔

قاضی نصیر الدین معروف بہ کاسہ لیس عالم اجل ہندوستان کے قاضی القضاۃ تھے۔

قاضی سعید الدین کردری، قاضی حمید الدین ناگوری، قاضی جلال الدین، قاضی کبیر الدین اور قاضی قطب الدین کاشانی التمش
ہد میں ممتاز فقہا تسلیم تھے۔

مولانا تاج الدین ریزہ (ریاسنگریزا) بلند پایہ شاعر تھے۔ فتح گوالیار پر آپ کے یہ اشعار شاعر کے جذبات عقیدت و احترام کا
یتے ہیں۔

ہر قلعہ کہ سلطان سلاطین گرفت

از عون خدا نصرت دیں بگرفت

آں قلعہ گوالیار و آں حصن حصین

در ست مائۃ سنہ ثلثین بگرفت

جواہر فریدی سے نقل ہے کہ سلطان شمس الدین التمش کی سخاوت کا شہرہ دور دور تک پہنچا تو ناصری شاعر ایک قصیدہ سلطان
ان میں لکھ کر لایا۔ یہاں حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کی کرامت و فضل و کمال کا شہرہ سنا۔ ایک قصیدہ حضرت کی شان
لکھا۔ اور حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر قصیدہ پڑھ کر دعا چاہی کہ بادشاہ کی سرکار سے مجھ کو خاطر خواہ صلہ ملے۔ حضرت نے
کی اور فرمایا کہ "تجھ کو بہت کچھ ملے گا"
جب دربار ناصری میں پہونچا قصیدہ پڑھا بادشاہ بہت خوش ہوا اور پچپن ہزار ٹنکے ان کو عطا کئے (سوانح خواجہ قطب الدین)
قصیدہ کا مطلع یہ ہے :-

اے فتنہ از نہیب تو زنہار خواستہ

تیغ تو مال رنیق ز کفار خواستہ (منتخب التواریخ)

مولانا شہاب الدین مہمرہ بدایونی عربی کے عالم اور فلسفی تھے۔ انہوں نے التمش کی مدح میں قصیدہ لکھا۔ یہی مولانا مہمرہ
رت خسرو کے استاد تھے۔

نمونداً ناقلا کا بیان ہے کہ ایک اور مصنف نصیر الدین تھے جس نے بہت سے مشہور تاریخی قصص فارسی میں لکھ کر ان کا ایک

مجموعہ تیار کیا تھا، سلطان کے دربار سے منسلک تھا اور اسے شاہی اعانت اور سرپرستی حاصل تھی۔ فرشتہ کے بیان کے مطابق مصنف کا پورا نام نورالدین محمد علی تھا۔

اس عہد کے ممتاز شعراء میں بہاؤالدولہ علی بن احمد جاجی کو امتیاز حاصل تھا۔ وہ صاحب سیف امراء سے تھا۔

شیخ علی بن حامد کوفی اور شیخ فخرالدین عمید تولکی کے بہترین قصائد التمش کی شان میں ہیں۔

تصنیف و تالیف

التمش کے عہد میں ایک بڑا گروہ فاضلوں اور انشاپردازوں کا بادشاہ کے سایہ عاطفت میں اپنی تصنیف و تالیف سے عوام کو فائدہ پہونچا رہا تھا۔ اس گروہ میں نورالدین عوفی کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ اس مشہور فاضل نے جامع الحکایات تصنیف کر کے التمش کے وزیر نظام الملک محمد بن سعد جنیدی کے نام سے معنون کیا (فرشتہ)

اس کے دیباچہ میں التمش اور نظام الملک کے نام سے انتساب کرنے کا ذکر آیا ہے (عہد اسلامی کا ہندوستان)

عوفی نے قاضی تنوخی کی الفرج بعد الشدۃ کو عربی سے فارسی میں منتقل کیا (عہد اسلامی کا ہندوستان)

التمش کے ایک دوسرے ممتاز صاحب علم و قلم مورخ فخرالدین محمد بن مبارک شاہ المعروف بہ فخر مدبر نے فنون حرب پر اپنی کتاب "آداب الحرب والشجاعۃ" سلطان التمش کے نام سے معنون کی۔

اسی عہد کے ایک اور صاحب قلم جاجرمی نے امام غزالی کی مشہور تصنیف "احیاء العلوم" کا فارسی ترجمہ کیا اور اس کا انتساب سلطان التمش کے نام سے کیا۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ قرون وسطیٰ میں مشائخ کے ملفوظات، اوراد اور دواوین بڑی کثرت سے وضع کئے گئے ہیں۔ اسی طرح کی ایک تصنیف "گنج الاسرار" ہے۔ اس کتاب کو خواجہ اجمیری سے منسوب کیا جاتا ہے۔ مقدمہ میں سبب اور مقصد تالیف اس طرح بیان کیا گیا ہے:-

"خواجہ عثمان ہرونیؒ نے اس درویشوں کے خادم اضعف العباد معین الدین حسن سنجری کو حکم دیا کہ طالب صادق سلطان شمس الدین کی استقامت اور تربیت کے لئے آیات، احادیث، اقوال مشائخ وغیرہ کی بنیاد پر ایک کتاب لکھو تاکہ ہمیشہ سفر (روحانی) میں ساتھ رہے اور سلطان کا دل خیالات کے تمام خطرات و تفرقات سے کلیتاً بچا رہے"

پھر لکھا ہے کہ خواجہ عثمان ہرونیؒ دہلی تشریف لائے تھے۔ التمش ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے خلوص کی قسم کھا کر یقین دلایا کہ وہ راہ حقیقت کا طالب ہے اور خواجہ صاحب سے ارادت کی دلی تمنا رکھتا ہے۔ خواجہ ہرونیؒ نے جب اس کو "انسان کامل" پایا تو کلاہ ارادت سے سرفراز کیا اور خواجہ معین الدین چشتی کو اس کی تربیت پر مامور کیا"

(سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات)

فرشتہ کا بیان ہے کہ:-

"محمد بندہ حاجی کی تاریخ میں لکھا ہے کہ خواجہ معین الدین چشتی کے پیر یعنی شیخ عثمان ہرونی شمس الدین محمد التمش کے عہد میں دہلی تشریف لائے اور چونکہ شمس الدین ان کا مرید تھا اس لئے ان کی تعظیم و تکریم

میں کوئی دقیقہ نہ رکھا۔

نظامی صاحب لکھتے ہیں کہ فرشتہ کا یہ بیان تصدیق طلب ہے۔

غرض التمش کی علم دوستی اور معارف پروری کے باعث دہلی، ممالک اسلامیہ کے بڑے بڑے اہل کمال کا مرجع بن گئی اور اس طرح عہد سلطنت میں ارض ہند وپاک ایک بین الاقوامی مرکز بن گیا۔ طبقات ناصری کے مؤلف التمش کے عہد کی دہلی کو مرکز دائرہ اسلام اسلام، مشارق گیتی جیسے امتیازی القاب سے یاد کرتا ہے۔

[درس] گاہیں۔

اسلامی ہند کے ابتدائی دور میں مندرجہ ذیل قسم کی درس گاہیں ملتی ہیں:۔

(۱) حکومت کی قائم کی ہوئی (۲) خانقاہوں سے ملحق (۳) مسجدوں سے ملحق (۴) مزارات سے متعلق (۵) انفرادی۔

حکومت کی قائم کی ہوئی درسگاہوں میں معزی مدرسہ اور ناصری مدرسہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

ایک اور التمش کے زمانہ میں ہندوستان میں چشتیہ اور سہروردیہ کے سلسلہ کی خانقاہیں قائم ہوئیں۔ چشتیہ سلسلہ کی خانقاہوں [میں] علی مریدوں کی تعلیم کا انتظام تھا۔ (حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی)

التمش نے خاص دارالسلطنت دہلی میں متعدد مدارس قائم کئے۔ گو یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا لیکن قرینہ سے ثابت ہوتا ہے [کہ دہلی] کا مشہور و معروف مدرسہ معزی اسی علم پرور بادشاہ کے عہد حکومت کی یادگار ہے کیونکہ بدایوں میں بھی شمس الدین التمش نے اپنے ایام [حکومت] میں ایک مسجد اور اس کے متصل معزی نامی مدرسہ قائم کیا تھا، قرینہ یہ ہے کہ اس نے یہ مدارس اپنے آقا ولی نعمت شہاب الدین غوری جس کا [نام مع]ز الدین محمد غوری تھا۔ کے نام پر قائم کئے تھے۔

مدرسہ معزی دہلی کے ایک مدرس مولانا بہاءالدین اسحاق بخاری تھے۔ جو معقول اور منقول میں اپنے وقت کے سرآمد روزگار تھے۔

اسی عہد میں ایک اور عظیم الشان مدرسہ کا پتہ چلتا ہے۔ جس کا نام مدرسہ ناصریہ تھا۔ یہ مدرسہ ناصرالدین شہزادہ محمود بن سلطان [شمس] الدین التمش کے نام پر قائم کیا گیا۔ طبقات ناصری کے مصنف سراج الدین عفیف اس مدرسہ کے مہتمم اور نگران تھے۔

(ہندوستان کی قدیم درس گاہیں)

اس دور کے ممتاز علماء و فضلاء میں ارباب مسند درس و کمال اساتذہ میں مولانا شرف الدین ابو توامہ حنفی دہلی بھی ہیں جن کے حلقۂ درس [میں] شیخ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری بھی رہ چکے تھے۔ شیخ علی بن حامد کوفی، شیخ فخر الدین عمید تولکی جن کے بہترین قصائد بھی التمش [کی] شان میں ہیں احمد ملا جلال الدین وغیرہ تھے۔

خاص دہلی میں شاہی اخراجات سے اعلیٰ درجہ کا دارالعلوم کھلا ہوا تھا جس میں معلمین کو تنخواہ اور متعلمین کو اخراجات تعلیم دئے جاتے تھے [ب]مفت تعلیم ہوتی۔ ہر ایک قوم کو تعلیم کی اجازت تھی۔

روحانی مدارس اس وقت خانقاہیں تھیں جن میں علمی تعلیم دی جاتی تھی۔ بڑی خانقاہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی تھی۔ [زہد] و ورع تقویٰ و طہارت کی مشق اس مدرسہ میں کرائی جاتی۔ یہاں کے طلبا کو فقر و فاقہ، تکلیف و مصیبت کی برداشت کی عادت ڈلوائی [جا]تی تھی۔ (ماخوذ از تاریخ ملت)

علمی تحفہ۔

سلطان التمش کے علمی و ادبی مذاق کا شہرہ ہندوستان سے گذر کر بیرونجات کے دور دراز اسلامی ممالک تک پہونچ گیا تھا۔

بیرونی ممالک سے جو ارباب علم وفن سلطان کی خدمت میں آتے تو اس کے لئے علمی تحفے ساتھ لاتے۔ چنانچہ قاضی جلال عروسی بغداد سے دہلی آئے تو سلطان کے لئے خلیفہ مامون کے ہاتھ کی ایک تفسیر لائے جو اس نے "سفینۃ الخلفاء" میں لکھی تھی۔ سلطان کو اس تحریر کو پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی۔

تاریخ فیروزشاہی کے ایک اندراج سے خیال ہوتا ہے کہ شمس الدین التمش نے نہ صرف بیرون ہند کے علماء کی قدردانی کی، وہ بیرون ہند سے اچھی اچھی کتابیں منگواتا تھا اور اس ملک کے علمی خزائن کو مالامال کرتا تھا۔۔ آداب السلاطین اور مآثر السلاطین جیسی کتابیں بغداد سے منگوائی گئی تھیں۔

(آب کوثر)

علماء اور مشائخ کا استقبال۔

سلطان شمس الدین التمش علماء و مشائخ کی صحبت کا بڑا شوقین تھا جب کسی بزرگ یا عالم کی آمد کی خبر سنتا تو میلوں دور جا کر اُن کا استقبال کرتا اور محل شاہی میں مہمان رکھتا۔ (فتوح السلاطین صفحہ ۱۰۹) اس کی علم دوستی سے متاثر ہو کر صدہا علماء، شعراء اور ادیب اس ملک میں آکر بس گئے۔

(حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی)

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء نے فوائد الفواد میں ایسی روایتیں بیان کی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان شمس الدین شاہ صلحا کا خیر مقدم بڑے احترام سے کرتا۔

حضرت جلال الدین تبریزی دہلی تشریف لائے تو التمش نے علماء و مشائخ کی ایک جماعت کے ساتھ شہر سے باہر نکل کر ان کا استقبال کیا اور ان کو دیکھتے ہی گھوڑے سے نیچے اتر پڑا اور ان کو ساتھ لے کر اس طرح شہر میں داخل ہوا کہ مولانا کی سواری آگے تھی۔ اور وہ خود ان کے پیچھے تھا۔

حضرت شیخ بدرالدین غزنوی دہلی تشریف لائے اور التمش سے ملنے گئے تو اس نے شاہی محل سے باہر نکل کر ان کی پیشوائی کی اور ان سے بغلگیر ہوا، انہیں محل میں لے گیا اور نذرانہ وغیرہ پیش کیا۔

حضرت شیخ سلیمان ابن عبداللہ عباسی الہاشمی ہندوستان تشریف لائے تو سلطان نے اُن کیلئے شاہی محل میں قیام کا انتظام کیا اور چار ہزار تنکہ چاندی دیا۔ (نزہت الخواطر)

شیخ محمد ابن احمد المدنی متوفی ۶۰۰ھ کی بھی التمش بے حد تعظیم کرتا۔ قاضی شہاب الدین عمر زاری دولت آبادی نے اپنی کتاب ہدایت السعداء میں یہ اور اضافہ فرمایا ہے کہ سلطان ممدوح کے دربار میں ان کی نشست سب سے بلند تھی وہ سر دربار ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیتا اور ان سے برکت حاصل کرتا۔ (نزہت الخواطر)

قاضی حمید الدین ناگوری التمش کے دربار میں ایک محضر میں بلائے گئے تو درباری مغلیہ رنگ منع کرنے کے باوجود سلطان اُن کی تعظیم کے لئے تخت سے اتر گیا اور ان کی طرف لپک کر ان کے ہاتھوں کو بوسے دئے اور پھر محضر کے دوران ان سے اس قدر متاثر ہوا کہ ان کے قدموں پہ گر پڑا۔

تعظیم اوشاہ برخاستے نظر از جالش بیاراستے (فتوح السلاطین)

قاضی قطب الدین کاشانی جو اپنے زمانہ کے مشہور علماء میں تھے۔ دہلی تشریف لائے تو التمش سے بھی ملنے گئے۔ اُس وقت سلطان کے پاس سید نورالدین مبارک اور قاضی فخر الائمہ بیٹھے تھے۔ سلطان نے کھڑے ہو کر قاضی قطب الدین کا استقبال کیا ہاتھ پکڑ کر خرگاہ کے اندر

ہو گیا، اور وہاں نزدیک خود بنشاند (فوائد الفواد ص ۲۳۵)

خواجہ قطب الدین کے دو مرید عماد الدین اور سید محمد صغری سے التمش کو عقیدت تھی۔ خواجہ عماد الدین بلگرام کے شاہ ولایت ہیں۔ سید محمد صغری کے متعلق آزاد بلگرامی کا بیان ہے کہ وہ سلطان شمس الدین کے ساتھ رہتے تھے۔

قاضی حمید الدین ناگوری دہلی پہونچ کر خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے عقیدت مندوں میں شامل ہو گئے وہ سماع کے بڑے دلدادہ تھے اور سلطان شمس الدین التمش کے عہد حکومت میں علما کی مخالفت کے باوجود بادشاہ وقت سے اس کی اجازت لی۔ انہوں نے کئی کتابیں لکھیں جن میں طوالع الشموس زیادہ مشہور ہے ان کا ایک اور رسالہ عشقیہ جس میں عشق الٰہی کے مضامین شاعرانہ نثر میں بیان ہیں شائع ہو چکا ہے۔ (آب کوثر)

سرور الصدور میں لکھا ہے کہ شیخ نجیب الدین نجشی حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے دوستوں میں تھے۔ التمش کے عہد میں خواجہ صاحب چالیس یاروں کے ساتھ دہلی پہونچے۔ لکھا ہے:-

"کہتے ہیں کہ سلطان شمس الدین نے ہر ایک کو گراں بہا انعام دئے، شیخ نجیب الدین نے اپنا سب حصہ بانٹ دیا، دعوت کی اور دہلی میں رہ گئے۔ سلطان شمس الدین نے ان کو "باپ" بنایا اور شیخ الاسلام دہلی، ان کو خطاب دیا" (بحوالہ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات)

خواجہ بختیار کاکی سے عقیدت۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی حیات ہی میں ہندوستان کی سیاسی مرکزیت اور اقتدار اجمیر سے دہلی منتقل ہو گیا۔ خواجہ بزرگ نے دہلی میں اپنے جانشین و خلیفۂ اعظم خواجہ بختیار کاکی کو بٹھایا اور خود اجمیر میں رہے۔ حضرت خواجہ اجمیری نے اس وقت رحلت فرمائی جب ہندوستان میں اُن کے ہاتھ کا لگایا ہوا پودا جڑ پکڑ چکا تھا۔ اور دار الحکومت دہلی میں ان کا جانشین و تربیت یافتہ شیخ وقت (خواجہ قطب الدین کاکی) ارشاد و ہدایت کے کام میں سرگرم و منہمک تھا۔ اور ان کا عقیدت مند حلقہ بگوش سلطان شمس الدین التمش اسلامی حکومت کی توسیع و استحکام اور عدل گستری و خلق پروری میں مشغول تھا۔ (تاریخ دعوت و عزیمت)

حقیقت یہ ہے کہ شمس الدین التمش نے بڑی خوشامدوں سے حضرت قطب صاحب کو خواجہ بزرگ سے مانگ لیا تھا۔ میر خورد کی روایت ہے کہ جب دلی میں رہنے کی اجازت خواجہ بزرگ نے قطب صاحب کو عطا فرمائی تو سلطان شمس الدین سعادت قدم بوس شیخ را دریافتہ ہمراہ قطب الدین بشادی تمام متوجہ شہر گردید (اسیر الاولیاء ص ۵۵)

سلطان التمش کو حضرت خواجہ بختیار کاکی سے بڑی عقیدت تھی سلطان نے ان سے گذارش کی کہ محل کے قریب ہی قیام فرمائیں۔ قطب صاحب نے یہ درخواست قبول کرنے سے انکار کر دیا تو ہفتہ میں دو بار ان کی قیام گاہ پر حاضر ہونا اپنا معمول بنا لیا۔

ہر چند کہ التمش اس قدر عقیدت سے پیش آتا تھا۔ لیکن قطب صاحب اس کے دربار میں جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیر سے دہلی تشریف لائے۔ صورت یہ تھی کہ ان کے بیٹوں نے ایک افتادہ زمین پر کاشت شروع کر دی تھی۔ مقطع اجمیر نے فرمان طلب کیا، لڑکوں نے بوڑھے باپ سے اصرار کیا کہ دہلی جا کر فرمان شاہی حاصل کریں۔ قطب صاحب نے گزارش کی کہ آپ غریب خانہ پر قیام فرمائیں میں خود جا کر فرمان لے آؤں گا۔ قطب صاحب کو دربار میں دیکھ کر التمش کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اُس نے بارہا تشریف لانے کی درخواست کی تھی۔ لیکن کبھی قبول نہیں ہوئی تھی۔ (سیر الاولیاء)

سید محمد گیسو دراز کا بیان ہے کہ جونہی سلطان نے شیخ کی تشریف آوری کی بابت سنا، تخت سے نیچے اتر آیا اور ننگے پیر

دیتا۔ دوسرے صحن میں ملاقات ہوتی۔ شیخ کو اوپر جانے کی زحمت نہیں دی۔ اسی جگہ قالیچہ بچھا دیا۔ چند بار سلطان خود شیخ کے دروازے پر حاضر ہوا تھا۔ لیکن شیخ نے نہ دروازہ کھولا نہ اس کو اپنے پاس بلایا۔ آج خود تشریف لائے تھے، پوچھا کس سبب شیخ نے بندہ کو نوازا! بہرحال التمش نے فوراً فرمان تیار کرا کر شیخ کے حوالے کر دیا۔

سلطان التمش کی عقیدت برابر ترقی کرتی رہی۔ اہل شہر کا ایسا رجوع عام ہوا کہ شیخ الاسلام وقت شیخ نجم الدین صغری کو کشیدگی اور شکایت پیدا ہو گئی۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی دہلی تشریف لائے تو شیخ نجم الدین نے جو اُن کے قدیم دوست تھے شکایت کی خواجہ اجمیری نے حضرت بختیار کاکی کو اجمیر چلنے کا حکم دیا اور مرید صادق بے چون و چرا و بلا تامل تیار ہو گیا۔

خواجہ قطب الدین اپنے شیخ کے ساتھ اجمیر روانہ ہوئے اس اطلاع سے شہر دہلی میں ایک شور برپا ہو گیا۔ اہل شہر مع سلطان شمس الدین شہر سے نکل کر آپ کے پیچھے ہو لئے۔ جہاں خواجہ قطب الدینؒ کا پاؤں پڑتا تھا لوگ خاک پا کو تبرک سمجھ کر اٹھا لیتے تھے۔ لوگ بڑے بے قرار اور آہ و زاری میں مصروف تھے۔

ایک دل کو خوش کرنے کے لئے اور ایک جزوی مصلحت کی خاطر لاکھوں خدا کے بندوں کے دل کو رنجور کرنا جائز نہ تھا۔ مرشد نے مرید رشید اکو اجمیر لے جانے کا ارادہ فسخ کیا۔

سلطان شمس الدین نے جس کا دارالحکومت اس نعمت سے محروم ہوا جا رہا تھا۔ شیخ کا شکریہ ادا کیا۔ اور خواجہ قطب الدینؒ شہر دہلی واپس آئے اور خواجہ معین الدین اجمیر واپس ہوئے۔ (تاریخ دعوت و عزیمت م

عمارتیں۔

سلطان قطب الدین ایبک نے دہلی کی فتح کے بعد مسجد قوۃ الاسلام اور قطب مینار کی تعمیر شروع کی تھی۔ قطب مینار کے صرف دو نیچے کے درجے قطب الدین ایبک کے زمانے میں تیار ہوئے تھے۔ سلطان التمش نے باقی اوپر کے درجے تعمیر کرا کر اس مینار کو پایۂ تکمیل کو پہنچایا اور مسجد قوت الاسلام میں بھی تین دروازے اضافہ کئے۔ حوض شمسی بھی جس کو تالاب شمسی کہتے ہیں اس کی یادگار ہے۔ (آئینہ حقیقت نما)

۲۶ر اپریل ۱۲۳۶ء کو سلطان التمش کا انتقال ہوا۔

سلطان التمش نے شمالی ہند میں اسلامی شہنشاہی قائم کر کے قطب الدین ایبک کے زمانے سے بھی زیادہ طاقتور اور ہر قسم کے نوخشوں سے پاک و پرامن سلطنت چھوڑی (آئینہ حقیقت نما)

جب سلطان کا انتقال ہوا تو حضرت خواجہ نظام الدین اولیا نے حسب ذیل شعر میں اس کی وفات تاریخ قلمبند کی۔

بہ سال ششش صد و سی و سہ بود کہ از ہجرت
نماند شاہ جہاں شمس دین عالمگیر

(بحوالہ بزم مملوکیہ)

میں وہ صحیح سمجھے جاتے ہیں اور اُردو زبان و ادب سے "صحت" کے نام پہ ان لفظوں اور ترکیبوں کو دیس نکالا نہیں دیا جا سکتا۔ اس قسم کی بے جا کوشش سے اُردو کے سرمایہ کو بڑا نقصان پہونچے گا۔

"روحِ رواں" کی حیثیت "غلط العام" کی بھی نہیں ہے یعنی اس لفظ میں کسی قسم کی معنوی، لفظی یا قواعد کی غلطی نہیں پائی جاتی، صوتی طور پر بھی اس ترکیب میں ذرہ برابر ثقالت نہیں ہے۔ اس کا لکھنا اور بولنا بھی ناگوار نہیں گزرتا یہ ترکیب (روحِ رواں) جس مفہوم کی ترجمانی کرتی ہے کسی دوسرے لفظ سے اس کا بدل اب تک وجود میں نہیں آیا —— پھر یہ سوا سو سال کی مدت سے مسلسل ہر دور میں شاعروں اور ادیبوں کے یہاں استعمال ہوتا رہا ہے اور نصف صدی سے تو اس کا بے تحاشہ بے حساب ہو رہا ہے —— اور اب صورت یہ ہو گئی ہے کہ "روحِ رواں" کے مقابلہ میں "روح و رواں" میں ایک قسم تکلف پایا جاتا ہے۔

روایت و درایت، عقل و تجربہ، مشاہدہ و سامعہ اور لغت، روزمرہ اور زبان و بیان کا یہ فیصلہ ہے کہ ——
"**روحِ رواں**" کا استعمال کسی تردد، کسی شائبہ ارتیاب و شک کے بغیر جائز ہے اور جو کوئی اس لفظ کے استعمال میں احتیاط برتتا ہے وہ نا فہمی اور سطحی آدمی ہے! "روحِ رواں" میں ظاہری اور معنوی دونوں قسم کی خوبیاں پائی جاتی ہیں ادبیہ لفظ قلم و زبان کو از بر ہو چکا ہے اور معدنِ اُسعد کا تیر خالص، الماس بے جرم اور گوہر شب چراغ ہے! •

مولانا محمد مصطفیٰ

غالب

کلام و فلسفہ و تصوف

(۲)

وا کر دیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن　　　غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

محبوب نے تمام اطراف عالم میں اپنا حسن مختلف شیون میں ظاہر کر دیا ہے، وہ محجوب نہیں، بے حجاب ہے، ہم ہی محجوب ہیں، ہمارے اور اس کے درمیان "نگاہ" حائل ہے یہ نگاہ اگر جاتی رہے تو اس حسن کو دیکھ لیں،
غیر از نگاہ کا مطلب یہ ہے کہ جو وہ مشہود نہیں ہوتا تو اس نگاہ ناقص کا قصور ہے گویا یہی حائل ہے یا یہ کہ تو خود حجاب خودی، حافظ از میاں برخیز، اگر بے خودی حاصل ہو تو اُسے دیکھ لیں کیونکہ وہ خودی میں نہیں ملتا بے خودی میں ملتا ہے۔

غافل بہ وہم ناز خود آرا ہے ورنہ یاں　　　بے شانۂ صبا نہیں طرّہ گیاہ کا

غافل انسان خوبیوں کو اپنی جانب منسوب کرتا ہے اور اس پر اُسے ناز ہے کہ میں ایسا ہوں، ویسا ہوں، میں نے یہ کیا، وہ کیا، حقیقت تو یہ ہے کہ انسان تو انسان کوئی طرۂ گیاہ بھی ایسا نہیں جو توفیق الٰہی کے بغیر آراستہ ہو جائے۔

موجِ خوں سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے　　　آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا

جان رہے یا جائے لیکن آستانِ یار ایسی جگہ نہیں جہاں سے طالب صادق اُٹھ جائے، اس جذبہ اور وجدان سے حضرات لطف اندوز ہیں جو کفار ظاہری کے مقابلہ میں میدان جہاد کو آستانِ یار سمجھتے ہیں اور ایمان شہودی یا شہادت ظاہری کا جام حیات بخش پی لیتے ہیں یا وہ قدسی صفات بزرگ جو کفار باطنی یعنی شیطان اور نفس امارہ سے دست و گریبان ہو کر جہاد اکبر کے فریضہ کو انجام دیتے ہیں اور خنجر تسلیم و رضا سے شہادت باطنی اور حیات جاودانی حاصل کرتے ہیں۔

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی　　　چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

لطافت محض کا ادراک و مشاہدہ بغیر آمیزش کثافت بہت مشکل ہے، دیکھو آئینہ میں اگر زنگار نہ ہو تو رویت العکاس اسی طرح اگر چمن نہ ہو تو محض باد بہاری کا جلوہ کیونکر دیکھنے میں آئے۔

ہاں! انسان کا وجود بھی لطافت وکثافت سے مرکب ہے اس لئے وہ تجلی گاہ ربانی ہو سکتا ہے وہ آئینہ انوار ہے، ملائکہ میں لطافت ہی لطافت ہے اور شیاطین میں کثافت ہی کثافت، دوسرے حیوان بھی قوت ناطقہ سے محروم ہیں کہ مقدمات ترتیب دے کر صحیح نتائج تک رسائی حاصل کریں، ان کا مطمح نظر صرف کھانا پینا اور نفسی لذائذ ہیں، جمادات و نباتات اُن سے بھی اسفل درجہ میں ہیں، یہی وجہ ہے کہ بنی آدم "لقد کرمنا" کے خلعت سے مشرف کیا گیا ہے، اس کے مجموعۂ وجود میں قدرت الٰہی کی بادبہاری کا سب سے زیادہ مظاہرہ ہوتا ہے۔

۲۱ عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

دوا کی خوبی یہ ہے کہ درد نہ رہے جب درد حد سے گذر گیا تو درد نہ رہا، اس لئے وہ "دوا" ہو گیا، پس اے شخص دوا کی فکر کیوں کرتا ہے، درد جب حد سے گذر جائے گا تو خود "دوا" ہو جائے گا۔ اس لئے تو با درد بساز و بیچ در مطلب دخیام۔ یا اے طالب سر رق یہ فنا ہی تیری بقا ہے، دیکھو قطرہ جب دریا میں جا ملتا ہے تو آفت سے محفوظ رہتا ہے اب قطرہ قطرہ نہیں رہا، گویا قطرہ، فنا ہو گیا، لیکن یہ فنا اس کے لئے بقا ہے کہ وہ سابقاً ضعیف تھا، اب ہو گیا، دریا اُس کو اپنی گود میں لئے ہوئے ہے، موجیں اُس کو سینہ سے لگائے ہوئے ہیں تو بھی اگر محبوب کی رضامندی میں فنا ہو تو دریائے رحمت تجھ کو بقائے ابدی عطا فرمائے گا۔

ہاں اس تمثیل کا مقصد یہی تھا کہ فنا بقا ہو جاتی ہے، نہ یہ کہ تمثیل میں ممثل لہ اور ممثل میں کلی مطابقت ہے انسان ہے اور ذات باری دریا، قطرہ، توبہ، توبہ، کیونکہ انسان اُس کا جزو نہیں، ذات باری مرکب نہیں اور جسم بسیط بھی نہیں کہ اُس کا جزو ہو سکے، پھر قطرہ جس طرح دریا میں داخل ہوتا ہے انسان اپنے مولی سے اس طرح واصل نہیں ہوتا۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

اتصالے بے تکیّف، بے قیاس ہست ربّ الناس را با جانِ ناس

اور ؎ خاصانِ خدا خدا نباشند لیکن ز خدا جدا نہ باشند

راقم الحروف نے تائید الہی سے مختلف اشعار کی تشریح میں اور مختلف مضامین میں اس جزو کل کی معقولیانہ دلائل سے تردید کی ہے۔

۲۲ ضعف سے گریہ مبدّل بہ دمِ سرد ہوا باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

کیا غالب استحالۂ عناصر یا تمیں تبخیر و تکثیف سے واقف نہ تھے۔ اس گلاس بیرونی سطح پر جس میں برف رکھ کر دیا جائے، پانی بھاپ بن کر سب آ جائے گا۔ پانی کا ہوا ہو جانا ہے، مطلب یہ ہے کہ ہم سنا بھی کرتے تھے اور خارجی دنیا میں دیکھا بھی کرتے تھے کہ پانی ہوا بن جاتا ہے، یعنی ہمیں اس کا علم الیقین بھی تھا اور عین الیقین بھی لیکن اب اسی داخلی دنیا میں کامشاہدہ ہوا اور حق الیقین ہو گیا، کیونکہ رو تے رو تے جب ضعف میں زیادتی ہوئی تو قطرات اشک نے دم سرد کی صورت اختیار کی، رونا تو گیا لیکن ٹھنڈی سانسیں پیدا ہو گئیں، یعنی پانی ہوا ہو گیا۔

۲۳ نہیں گر سرو برگِ ادراکِ معنی تماشائے نیرنگ صورت سلامت

سرو برگ ادراک معنی کے حامل تو عارف دا کا ہر شائخ ہیں، ہماری وہاں تک رسائی کہاں؟ اگر عجائب قدرت رفسرفی دیکھ دیکھ کر مصور کائنات کی یاد پیدا ہو جائے تو یہ بھی غنیمت ہے۔

؎ گلزارِ ہست و بود نہ دیوانہ وار دیکھ ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

ملہ ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ دن رات کا مشاہدہ ہے۔

بلا سے ہیں جو یہ پیشِ نظر در و دیوار　　　نگاہِ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار

بیگانۂ عشق کے لئے تو دنیا کے یہ تمام مناظر و حوادث محبوبِ حقیقی کا پردہ ہیں، لیکن نگاہِ مشتاق کے لئے یہی بال و
م کرتے ہیں، اس لئے کہ عوائق و موانع پیش آنے پر عشاق کے عزم آہنیں میں ایسی برقی قوت پیدا ہوتی ہے کہ جو نہ ہیں
ال میں طے ہوتیں وہ آنِ واحد میں طے ہو جاتی ہیں۔

چھوڑوں گا میں نہ اس بتِ کافر کا پوجنا　　　چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

اس کا مطلب خسروؒ کی زبان سے سنئے

خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی می کند　　　آرے آرے می کنم با خلق و عالم کار نیست

اب اگر اس کا صوفیانہ مطلب کوئی دریافت کرے تو میں قاصر ہوں اور یہ شعر اس وجہ سے بھی یہاں درج کیا ہے تاکہ معلوم
ہو کہ ہر عاشقانہ شعر کو کھینچ تان کر تصوف میں نہیں بیان کر سکتے۔

زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال　　　رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

ظاہر میں بت پرستی کا سبق ہے حقیقت یہ ہے کہ صوفیہ کی اصطلاح میں زنار "یک رنگی" کا نام ہے اور سبحہ لازمۂ دو رنگی
ہے سبحہ صد دانے کی وجہ سے ہموار نہیں ہوتی، زنار ہموار ہوتا ہے، دوسرے مصرع میں زنار باندھنے اور سبحہ توڑنے کی
ہی سی وجہ بیان کر دی ہے مطلب یہ ہے کہ یکرنگی کا دو رنگی چھوڑ کر یک رنگ ہو جا۔

فنا کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا　　　فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن پر

اگر تو طالبِ معرفت ہے تو "فنا" کی منزل طے کر کے دیکھ! خس و خاشاک کیسی بے حقیقت چیز ہے لیکن گلخن میں جب وہ فنا ہو
ہے تو اس کی قسمت جاگ اٹھتی ہے، وہ کثیف شئے اپنی روشنی سے ظلمت کو بھی دور کر دیتی ہے۔ پس اے عزیز گلخنِ عشق و محبت
میں اپنے آپ کو جھونک دے تاکہ علم و معرفت کا گلشن لہلہانے لگے۔

نہ ہو بہ ہرزہ بیاباں نوردِ وہمِ وجود　　　ہنوز تیرے تصور میں ہے نشیب و فراز

تمام عالم کو موجود سمجھنا وہم ہی کا وہم ہے جس کی حقیقت نہیں، یہ میدان تو بیابان ہے جہاں وجودِ حقیقی نہ دار و اس
کی تشنگی دور نہیں ہو سکتی، یہ آب نہیں سراب ہے، پس اس کی طلب میں تیری جد و جہد عبث۔

(الیقاظ) عالم کا وجود مجازی ہے اس لئے کہ حادث ہے اور ہر مجاز کے لئے ایک حقیقت ہے اور ہر حادث کے لئے ایک
ن ہے، پس اصل بات تو یہ ہے ؎

وہ شوخ نہاں گنج کے مانند ہے اس میں
معمورۂ عالم جو ہے ویرانہ ہے اس کا

ہر ایک ذرۂ عاشق ہے آفتاب پرست　　　گئی نہ خاک ہوئے پہ ہوائے جلوۂ ناز

وجوہ کا یومئذٍ ناضرۃ الی ربہا ناظرۃ، عاشقانِ الٰہی کی شان میں ہے، گئی نہ خاک ہوئے پہ الخ
رزخ میں موانع مرتفع ہونے کی وجہ سے ہوائے جلوۂ ناز اور بڑھ جاتی ہے۔

زبانِ اہلِ زباں میں ہے مرگ خاموشی　　　یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیٔ شمع

بجھی ہوئی شمع کو شمع کشتہ اور شمع خاموش کہتے ہیں، اور روشن شمع کی لو کو زبانِ شمع کہتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ خاموشی

مرگ کا دوسرا نام ہے۔

اس شعر کے معنی صوفیہ کی زبان میں بھی بہت صاف ہیں کہ وہ دل جو ذاکر نہیں، غافل ہے، مُردہ ہے اگرچہ بظاہر زندہ ہو۔

ش۲۱ یہ تو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم — میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

آفتاب نے شبنم کی طرف ایک نظرِ التفات کی کہ وہ فنا ہوگئی، بس میرا بھی یہی حشر ہوگا جب آپ نظرِ عنایت سے دیکھیں گے تو مجھے بھی مرتبہ "فنا" حاصل ہو جائے گا۔ سچ ہے جلانا اور مارنا محبوب کی نظر کے کرشمے ہیں (دھوپچھی دکمیت)

ش۲۲ گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دعا نہ مانگ — یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ

"دلِ مدعا" ایک گوہرِ نایاب ہے اگر تو دعا مانگتا ہے تو اسے مانگ ؎

لاکھ دینے کا ایک دینا ہے — دلِ بے مدعا دیا تو نے (داغ)

اوّلِ ما آخرِ ہر منتہی است — آخرِ ما جیبِ تمنا تہی است (امام ربانیؒ)

ش۲۳ ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گُل — بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

بلبل عاشقِ مجاز، اور گل محبوبِ مجازی، حافظ فرماتے ہیں ؎

نشانِ مہر و وفا نیست در تبسمِ گل

نہال بلبلِ بیدل کہ جائے فریاد است

ش۲۴ سطوت سے تیرے جلوۂ حسنِ غیور کی — خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ قبائے گل

حسنِ غیور حسنِ ازل ہے جو شرکِ خفی کو بھی پسند نہیں کرتا، گل سے مراد محبوبِ مجاز ہے، ایک عارفِ کامل کی تربیت اسی طرح کی جاتی ہے ؎ چنداں بود کرشمہ و ناز سہی قداں — کاید بجلوہ سروِ صنوبر خرامِ ما

جاء الحق و زھق الباطل (قرآن)

ش۲۵ بنالہ حاصلِ دلبستگی فراہم کر — متاعِ خانۂ زنجیر جز صدا معلوم

جس طرح خانۂ زنجیر کا حاصل "صدا" کے علاوہ اور کچھ نہیں، اسی طرح دلبستگیٔ دنیا کا حاصل سوائے "نالہ" کے اور کچھ نہیں، پس دنیا سے دل لگاؤ تو عمر بھر روتے رہو اور پھر بھی وہ مکّارہ تمہاری نہیں ہونے کی۔

ش۲۶ رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے — انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

عشق میں متضاد صفتیں ہیں، ویراں ساز بھی ہے، رونقِ ہستی بھی ہے، دوسرا مصرعہ مثال ہے، برق رونقِ خرمن بھی ہے کہ شمع کی طرح اس کو روشن کر دیتی ہے۔ اور ویراں ساز بھی ہے کہ جلا کر خاک سیاہ بنا دیتی ہے، عشق بھی برقی صفت رکھتا ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ جب تک ایک اللہ اللہ کہنے والا بھی زندہ رہے گا قیامت قائم نہ ہوگی، یہ رونقِ ہستی ہونا ہوا، اور ویرانہ سازی میں دو پہلو ہیں ۱۔ عاشق کا وجود اولاً برباد ہوتا ہے ۲۔ خارجی دنیا بھی عاشق کی نظر میں ویرانہ معلوم ہوتی ہے

ش۲۷ زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن — غیر سمجھا ہے کہ لذت زخمِ سوزن میں نہیں

مداوائے مرض مقامِ رضا کے خلاف نہیں، اس علاج میں بھی لطف ہے اور مرض میں بھی، ناواقف یہ سمجھتے ہیں کہ راضی برضائے مولا ہونے کے معنی یہ ہیں کہ دوا سے پرہیز کیا جائے۔

اگر گرسنگی میں کھانا کھانا اور تشنگی میں پانی پینا اور مصیبت میں دعا کرنا منافی رضا نہیں تو بیماری میں علاج کرنا کیونکر منافی

کمتا ہے، ہاں! یہ ضرور ہے کہ بعض اصحاب مقام رضا پر بھی ایسی کیفیات کا غلبہ بھی ہوتا ہے - کہ وہ علاج کے متحمل نہیں ہوسکتے -

نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب　　سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

اگر انسان جنونِ عشق میں بیاباں میں نکل گیا اور ترک خانماں کیا، تو اس کو کچھ نقصان وزیاں نہیں اس لئے کہ گھر اگر وسیع ہے تو بیاباں تو وسیع تر ہے، بعض مشائخ جذبۂ عشق میں سلطنت پہ لات مار کر رو بصحرا ہوگئے اور دنیوی ملک کی بجائے اُن کو ملکوت میں باریابی ہوئی -

اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے　　جتنا کہ وہم غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

ان النفس لا تتوجه الى شيئين فى آن واحد۔ جتنا غیر خدا کا تصور و خیال رہے گا اتنا ہی اُس ذات پاک سے بعد رہے گا اور جتنی غفلت اتنا ہی بُعد، جتنی یاد اتنا ہی قرب -

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے　　حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

یہ حیرت مرزا کو اس سبب سے ہے کہ وہ شاہد و مشہود و مشاہدہ کو ایک سمجھتے ہیں - مشاہدہ کے لئے تو لازم ہے کہ ان تینوں میں تغایر ہو، کاش مرزا صاحب اس پہ مزید غور فرماتے اور اپنے مسلک کو تبدیل کر دیتے -

ہے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر　　یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

راقم الحروف نے "غالب اور فقہ" میں اس شعر پر جو لکھا ہے وہ بھی ملاحظہ ہو -

کہتے ہیں کہ بعض چیزوں کا وجود ہوتا ہے بے نمود، مثلاً بحر کہ بحر (سمندر) کو تلاش کرو تو کہیں نہ دکھائی دے گا - بعض قطرہ اور حباب دکھائی دیں گے اور بعض چیزیں نمود رکھتی ہیں بے بود مثلاً قطرہ، موج و حباب کہ دکھائی دئے اور ختم، نمود تو ہے وجود نہیں، بود نہیں، بس یہی حال اشیاء عالم کا خلاق عالم کے ساتھ ہے کہ عالم نمود رکھتا ہے لیکن بود نہیں اور خلاق عالم بود رکھتا ہے، لیکن نمود نہیں -

احقر عرض کرتا ہے کہ یہ تمثیل ہی غلط ہے، بحر مرکب ہے ان چیزوں سے، خدا تعالیٰ واحد احد ہے، مرکب نہیں، جسم بسیط نہیں پھر جو صورتوں کی نمود ہے اور بود نہیں تو اس نمود کی بھی بود ہے کہ نہیں، اگر نہیں تو دعویٰ ہی باطل ہوگیا، اور ہے تو پھر یاں کیا دھرا ہے "یہ مضمون غلط ہوگیا، پھر جب وجودِ بحر مشتمل ہے نمودِ صور پر اور صور معدوم ہیں اور نمود بھی معدوم تو بحر بھی معدوم (تعالى الله عن ذالك علواً كبيراً)

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز　　پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

کل یوم هو فى شان، یعنی علم غیب و مشیت ازلی کے مطابق اپنی شان دکھاتے رہتے ہیں -

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ　　پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

مدعیانِ کمال کمال سے عاری ہوتے ہیں خواہ کتنا ہی طمطراق دکھائیں بس ریا و سمعہ اُن کا شیوہ ہے، انہی اوصاف کو پیر بنا کے پیر کیا ہے وہ راہرو بھی نہیں چہ جائیکہ راہبر ہوں" "راہبر تو یمشون على الارض ہونا" کا مصداق ہوتے ہیں کیونکہ وہ عباد الرحمٰن ہیں، بندۂ شیطان نہیں -

ایک سادہ لوح انسان ایسے ہی لوگوں کے پھندے میں پھنس جاتا ہے پھر جب توفیق الٰہی شامل حال ہوتی ہے تو متنبہ ہو کر اُن سے علیحدہ ہو جاتا ہے -

۴۴ی قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن ہم کو تقلید تنک ظرفی منصور نہیں

مرتبۂ اتصالی یا استغراق میں انا الحق کا دعویٰ تنک ظرفی ہے، بندہ کی شان یہ ہے کہ "ایاز قدر خود بشناس" پر نظر رکھے، محبت کے خم کے خم پی جائے، لیکن ہوشیار رہے۔

۴۵ی اہل بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب لطمۂ موج کم از سیلیٔ استاد نہیں

مصیبت میں بشر کے جوہر مردانہ کھلتے ہیں مبارک بزدلوں کو گردش قسمت سے ڈر جانا (چکبست)

بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے وہ بدنصیب جسے بخت نارسا نہ ملا (یاس)

(صفحہ ۴۱ کا بقیہ)

اخلاق کو اپنی زندگی میں سمولیں اور خدا کی صفات خلاقی کو اپنائیں بہتر ہے کہ ہم سعید حلیم پاشا کے ذکر کو علامہ مرحوم کے چند شعروں کے انتخاب پر ہی ختم کریں ؎

غربیاں را زیرکی ساز حیات شرقیاں را عشق راز کائنات
شعلۂ افرنگیاں نم خوردہ ایست چشم شاں صاحب نظر دل مردہ ایست
چوں مسلماناں اگر داری جگر در ضمیر خویش و در قرآں نگر
صد جہاں تازہ در آیات اوست عصرہا پیچیدہ در آنات اوست

دین حق از کافری رسواتر است زانکہ ملا مومن کافر گر است
دین کافر فکر و تدبیر جہاد دین ملا فی سبیل اللہ فساد
مرد حق از کس نگیرد رنگ و بو مرد حق از حق پذیرد رنگ و بو
ہر زماں اندر تنش جان دگر ہر زماں او را چو حق شانی دگر

مسٹر غلام احمد پرویز کی دینی تحریفات :-

(۱) اللہ و رسول سے مراد ہے "مرکزی حکومت" (CENTRAL AUTHORITY) اور اولی الامر سے مراد افسرانِ ماتحت
(معارف القرآن از پرویز ج ۴ ص ۶۲۶ شائع کردہ ادارہ طلوع اسلام کراچی)

(۲) قرآن کریم میں جہاں اللہ اور رسول کا ذکر آیا ہے اس سے مراد مرکز نظامِ حکومت ہے۔ (معارف القرآن ص ۶۲۳ ج ۴)

(۳) بالکل واضح ہے کہ اللہ و رسول سے مراد مرکزِ حکومت ہے۔ (معارف القرآن ج ۴ ص ۶۲۲)

(۴) اللہ و رسول سے مراد ہی مرکزِ ملت ہے۔ (معارف القرآن ج ۴ ص ۶۵۴)

(۵) اللہ و رسول سے مراد مسلمانوں کا "امام" ہے۔ (معارف القرآن ج ۴ ص ۶۲۴)

(۶) بعض مقامات پر اللہ اور رسول کے الفاظ کے بجائے قرآن اور رسول کے الفاظ بھی آئے ہیں جن کا مفہوم بھی وہی ہے یعنی مرکز
جو قرآنی احکام کو نافذ کرے (معارف القرآن ج ۴ ص ۶۲۳)

(۷) قرآن کریم میں مرکزِ ملت کو اللہ اور رسول کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا۔ (معارف القرآن ج ۴ ص ۶۳۱)

۱۔ "اللہ اور رسول کی اطاعت" سے مراد "مرکزی حکومت کی اطاعت ہے جو قرآنی احکام کو نافذ کرے گی"
(اسلامی نظام از پرویز ص ۸۶ شائع کردہ ادارہ طلوع اسلام کراچی)

۲۔ "اللہ اور رسول یعنی "مرکزِ نظامِ ملت" کی تاکید کی گئی ہے" (معارف القرآن ج ۴ ص ۶۳۱)

۳۔ "رسول اللہ کے بعد خلیفۃ الرسول" رسول اللہ کی جگہ لے لیتا ہے اور اب خدا و رسول کی اطاعت سے مراد یہی جدید مرکزِ ملت
اطاعت ہوتی ہے" (معارف القرآن ج ۴ ص ۶۸۶)

۴۔ اس آیت مقدسہ میں عام طور پر اولی الامر سے مراد لئے جاتے ہیں ارباب حکومت (مرکزی اور ماتحت سب کے سب)
اس کی تشریح یوں کی جاتی ہے کہ اگر قوم کو حکومت سے اختلاف ہو جائے تو اس کے تصفیہ کا طریقہ یہ ہے کہ قرآن (اللہ) اور
حدیث (رسول) کو سامنے رکھ کر مناظرہ کیا جائے اور جو ہار جائے فیصلہ اس کے خلاف ہو جائے۔ ذرا غور فرمائیے کہ دنیا میں کوئی نظام
حکومت اس طرح بھی قائم رہ سکتا ہے کہ جس میں حالت یہ ہو کہ حکومت ایک قانون نافذ کرے اور جس کا جی چاہے اس کی مخالفت
کو کھڑا ہو جائے اور قرآن و احادیث کی کتابیں بغل میں داب کر مناظرہ کا چیلنج دے دے۔

٭ دین اور اہلِ دین سے برگشتہ کرنے میں پرویز کا کردار بھی وہی ہے جو کمیونسٹوں کا ہے۔

اس آیتِ مقدسہ کا مفہوم بالکل واضح ہے کہ اس میں اللہ اور رسول سے مراد "مرکزِ ملت" CENTRAL AUTHORITY
ہے اور اولی الامر سے مفہوم افسرانِ ماتحت۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ اگر کسی مقامی افسر سے کسی معاملہ میں اختلاف ہو جائے تو بجائے
کے کہ وہیں مناقشہ شروع کر دو امر متنازعہ فیہ کو مرکزی حکومت کے سامنے پیش کرو۔ اسے مرکزی حکومت کی طرف (REFER) کرو
مرکز کا فیصلہ سب کے لئے واجب التسلیم ہوگا۔" (اسلامی نظام ص ۱۱۰ و ۱۱۱)

ویمح اللہ الباطل ویحق الحق بکلمتہ ۴۲/۲۴ خدا کا قانون کائنات تخریبی قوتوں کے نتائج کو مٹا دیتا ہے اور تعمیری
قوتوں کے نتائج کو برقرار رکھتا ہے۔ جو ٹھوس شکل میں موجود ہوتے ہیں۔ (لغات القرآن ج ۲ ص ۵۴۰)

والذی اخرج المرعیٰ فجعلہ غثاءً احویٰ ۸۷/۴ خدا کا قانون زمین سے چارہ نکالتا ہے پھر اسے خشک کر کے
سیاہ رنگ کا کوڑا کرکٹ بنا دیتا ہے (لغات القرآن ج ۲ ص ۵۶۵)

دعا، پکارنے کا تعلق بھی خدا کے قانون سے ہے ہم اسی کے قانون کو آواز دیتے ہیں اور جب ہم اس کے متعلق عمل کرتے
تو وہ ان اعمال کے مشہود نتائج کو سامنے لا کر ہماری پکار کو جواب دیتا ہے۔ (لغات القرآن ج ۲ ص ۶۶۱)

اس گوشہ میں جہاں کہا جاتا ہے کہ اللہ ایسا کرتا ہے یا اللہ نے ایسا کیا تو اس کے معنی ہیں کہ اللہ کا قانون اس طرح
کرتا ہے۔ (من ویزداں ص ۳۰۸)

یذکرون اللہ قیاماً وقعوداً وعلی جنوبھم ۳/۱۹۱ وہ اُٹھتے بیٹھتے لیٹتے ہر وقت قانون خداوندی کو ا-
سامنے رکھتے ہیں۔ قلب و نگاہ کا ایک نقطہ پر مرتکز ہونا "دعا" کہلاتا ہے یعنی قدم قدم پہ قانون خداوندی کو پکارنا۔
(من ویزداں ص ۳۴۸)

(ذرا ملاحظہ فرمایئے! قرآن کریم کی آیات کو کس جرأت کے ساتھ مسخ کیا جا رہا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات سے ا
کی جا رہی ہے، یاد رکھئے "قانون خدا" سے مراد "پرویزی مذہب" میں فطری قوانین ہوتے ہیں)

اس نظام میں اور تو اور خود "داعیٔ نظام" یعنی رسول کی حیثیت بھی کسی حاکم اور آمر کی نہیں ہوگی۔ بلکہ جماعت کے ایک
کی ہوگی (نظام ربوبیت ص ۱۵۸)

"باہم رفیق" اور "بے ہمہ شدن" یہ ہے فرد اور جماعت کا تعلق یہی وجہ ہے کہ جب نبی اکرم پر حقائق کائنات کو منکشف
کیا گیا جسے "نبوت" کہتے ہیں تو آپ کو حکم دیا گیا کہ اب اٹھو اور افراد معاشرہ کو ایک قافلہ کی شکل میں ترتیب دو "مزمل" کے
معنی ہیں۔ (نظام ربوبیت ص ۱۸۴)

"یہ تصور قرآن کی بنیادی تعلیم کے منافی ہے کہ اطاعت اللہ کے سوا کسی اور کی بھی ہو سکتی ہے۔ حتیٰ کہ خود رسول کے
واضح اور غیر مبہم الفاظ میں بتلا دیا گیا ہے کہ اسے بھی قطعاً یہ حق حاصل نہیں ہے کہ لوگوں سے اپنی اطاعت کرائے لہٰذا اللہ
سے مراد وہ مرکز نظام دین ہے جہاں سے قرآنی احکام نافذ ہوں۔" (معارف القرآن ج ۴ ص ۶۱۶)

رسول کی حیثیت

(۱) اور تو اور انسانوں میں سب سے زیادہ ممتاز ہستی (محمد) کی پوزیشن بھی اتنی ہی ہے کہ وہ اس قا
کا انسانوں تک پہونچانے والا ہے: اسے بھی کوئی حق نہیں کہ کسی پر اپنا حکم چلائے۔ خدا اپنے قا
کسی کو شریک نہیں کرتا۔" (سلیم کے نام از پرویز ج ۲ ص ۴۴ شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام لاہور)

(۲) پھر اسے بھی سوچئے کہ محبتِ رسول سے مفہوم کیا ہے؟ یہ مفہوم قرآن نے خود متعین کر دیا ہے۔ جب نبی اکرم خود موجود

۔ "جیدمین مرکزِ ملت" آپ کی اطاعت فرض اولین تھی" (مقام حدیث از پرویز ج ۱ ص ۱۹ شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام کراچی)

"عربی زبان میں اطاعت کے معنی ہی کسی زندہ کے احکام کی تابعداری ہے اسلامی نظام میں اطاعت امام موجود کی
گی جو قائم مقام ہوگا" خدا اور رسول کا" یعنی" مرکزِ نظام حکومتِ اسلامی" (اسلامی نظام ص ۱۱۲)

ختم نبوت کا مطلب

(۱) ختم نبوت سے مراد یہ ہے کہ اب دنیا میں انقلاب شخصیتوں کے ہاتھوں نہیں بلکہ تصورات کے ذریعہ رونما ہوا کرے گا اور انسانی معاشرہ کی باگ ڈور اشخاص کی بجائے نظام کے ہاتھ میں ہوا کرے گی"۔
(سلیم کے نام پندرھواں خط از پرویز ص ۲۵ طبع اول ۱۱ اگست ۱۹۵۳ء شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام کراچی)

(۲) "اب سلسلہ نبوت ختم ہوگیا ہے" اس کے معنی یہ ہیں کہ اب انسانوں کو اپنے معاملات کے فیصلے آپ کرنے ہوں گے صرف یہ
دیکھنا ہوگا کہ ان کا کوئی فیصلہ ان غیر متبدل اصولوں کے خلاف نہ ہو جائے جو وحی نے عطا کئے ہیں اور جو اب قرآن کی دفتین میں
ں محفوظ ہیں" (سلیم کے نام۔ اکیسواں خط ج ۲ ص ۱۲۰)

(۳) "تم نے دیکھ لیا سلیم! کہ ختم نبوت کا مفہوم یہ تھا کہ اب انسانوں کو صرف اصولی راہ نمائی کی ضرورت ہے۔ ان اصولوں
ی روشنی میں تفصیلات وہ خود متعین کریں گے۔ لیکن ہمارے ہاں یہ عقیدہ پیدا ہوگیا (اور اسی عقیدہ پر مسلمانوں کا عمل چلا آرہا
ہے) کہ زندگی کے ہر معاملہ کی ہر تفصیل بھی پہلے سے متعین کر دی گئی ہے اور ان تفاصیل میں اب کسی قسم کا ردوبدل نہیں ہو سکتا۔
عقیدہ اس مقصدِ عظیم کے منافی ہے جس کے لئے ختم نبوت کا انقلاب عمل میں آیا تھا" (سلیم کے نام بیسواں خط ج ۲ ص ۱۰۳)

قرآن عبوری دور کے لئے

(۱) "اب رہا یہ سوال کہ اگر اسلام میں ذاتی ملکیت نہیں تو پھر قرآن میں وراثت وغیرہ کے احکام کس لئے دئے گئے ہیں۔ سو اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن انسانی معاشرہ کو اپنے متعین کردہ پروگرام کی
نوی منزل تک آہستہ آہستہ بتدریج پہنچاتا ہے اس لئے وہ جہاں اس پروگرام کی آخری منزل کے متعلق اصول اور احکام متعین کرتا ہے
بوری دور کے لئے بھی ساتھ کے ساتھ رہنمائی دیتا چلا جاتا ہے۔ وراثت، قرضہ، لین دین، صدقہ وخیرات سے متعلق احکام اس
بوری سے متعلق ہیں جس میں سے معاشرہ گزر کر انتہائی منزل تک پہنچتا ہے" (نظام ربوبیت از پرویز، تعارف ص ۲۵ شائع کردہ
دارہ طلوعِ اسلام)

(۲) "قرآن میں صدقہ وخیرات وغیرہ کے لئے جس قدر ترغیبات وتحریصات یا احکام وضوابط آتے ہیں وہ سب اسی عبوری
دور ——— (TRANSITIONAL PERIOD) سے متعلق ہیں" (نظام ربوبیت ص ۱۶۷)

(۳) "اس نظام کے قیام کے بعد کوئی مفلس اور محتاج باقی نہیں رہ سکتا۔ لہٰذا مفلسوں اور محتاجوں کے متعلق اس قسم کے احکام
صرف عبوری دور سے متعلق ہیں" (سلیم کے نام، دوسرا خط ج ۱ ص ۴۴ شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام لاہور)

"اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی متعین فرمودہ جزئیات کو قرآنی جزئیات کی طرح قیامت تک واجب الاتباع (یعنی ناقابلِ تغیر وتبدل)
بنا تھا تو قرآن نے ان جزئیات کو بھی خود ہی کیوں نہ متعین کر دیا؟ یہ سب جزئیات ایک ہی جگہ مذکور اور محفوظ ہو جاتیں اگر خدا کا منشا یہ ہوتا
کہ زکوٰۃ کی شرح قیامت تک کے لئے اڑھائی فیصد ہونی چاہئے تو وہ اسے قرآن میں خود ہی بیان کر دیتا۔ اس سے ہم ایک نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ
یہ منشائے خداوندی تھا ہی نہیں کہ زکوٰۃ کی شرح ہر زمانے میں ایک ہی رہے۔"
(مقام حدیث ج ۲ ص ۲۹۲ و ۲۹۳ شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام کراچی)

وارث القادری :—
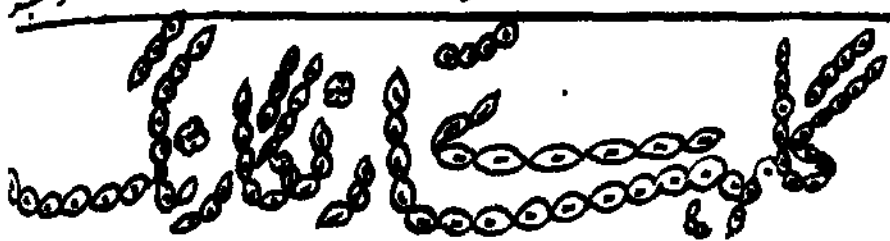
شادماں ہو گیا کامراں ہو گیا — جو غمِ عشق کا رازداں ہو گیا
ہم چمن میں نشیمن کو ترسا کئے — کوئی گل چیں کوئی باغباں ہو گیا
بزمِ جاناں کا دستور کیا خوب ہے — دے دیا جس نے دل بے زباں ہو گیا
اہلِ دنیا میں بھی جانبانہ کوئی نہیں — سر کا سودا اب اتنا گراں ہو گیا
ہر قدم پہ محبت میں ٹھوکر لگی — راہ چلتے رہے امتحاں ہو گیا

انور ظہوری :—

کون سی منزل کی جانب وہ خدا جانے گئے — راہ میں اُن کے نقوشِ پا نہ پہچانے گئے
بزمِ ساقی میں صلائے عام کا شہرہ بھی — ہم وہاں بھی لے کے اپنے ساتھ نذرانے گئے
جانے کس آواز پہ بادہ گسارانِ وفا — انجمن میں چھوڑ کر لبریز پیمانے گئے

منزل کے پاس چند نشیب و فراز تھے — کس مرحلے پہ سرد ہوا قافلے کا جوش
کیا وقت کو ہے آنکھ ملانے کا حوصلہ — خود میں نے زندگی کو بنایا ہے سخت کوش

جاوید احسن :—

بھرا ہے اس قدر غم میرے دل میں — کہ آنسو بس بہانہ ڈھونڈتے ہیں
تنکے چنتے ہی دن گزرتے تھے — ہائے تعمیر آشیانے کی
بڑی دور تک برق لہرا رہی ہے — بڑی دور تک چھا رہا ہے اندھیرا
ہو گئی پوری حیاتِ جاوداں کی آرزو — ریت کی تختی پہ اپنا نام لکھ کر سو گئے

فضل کریم فضلی :—

ہم نے چاہا تھا انہیں حدِ نظر تک ڈھونڈ آئیں — جس قدر بڑھتے گئے حدِ نظر بڑھتی گئی
عشق کی کوئی حد ہی نہیں ہے — عشق میں کیا حد سے گزرنا
کیا کریں اُن کے تلون کا گلہ — حال پہلا سا ہمارا بھی نہیں
کسی کا آستاں اونچا ہے اتنا — کہ سر جھک کر بھی اونچا ہی رہے گا
جب اُن کو دیکھتا تھا تو ہوتے تھے وہ خفا — اب اور بھی خفا ہیں جو میں دیکھتا نہیں

کلامِ حبیب

(جناب حبیب احمد صدیقی کے کلام کا انتخاب انجمن ترقی اُردو ہند (علی گڑھ) نے کتابی صورت میں شائع کیا ہے، اُنہی کا ہمارے مطلوب ہم نے بھی عطر کشید کیا ہے —— نایاب)

ہوں کشتۂ کرم و التفات اے ناصح　　مجھی سے کیا میں ہر اک مہرباں سے ڈرتا ہوں

یکساں ہے اب بہار و خزاں اپنے واسطے　　بے فصلِ گل بھی چاکِ گریباں ہے اور ہم

محبت کے ستم کیا کم تھے اُس پر　　بہت ناصح بہت غم خوار ہو چکے

جن پہ ہوتا ہے ستم قدرِ ستم کیا جانیں　　یہ تو ہم سے کسی محرومِ ستم سے پوچھو

شمعِ اُمید کی لَو ہوتی ہے کتنی خوش رنگ　　یہ کسی کشتۂ اُمیدِ کرم سے پوچھو

اللہ اللہ اک نگاہِ بے تعلق کی کشش　　ایسا لگتا ہے کہ دل سینے سے نکلا جائے ہے

ہم کو آتی ہے نہ آئے گی زمانہ سازی　　گر ہنر یہ ہے تو بے بہرہ اہلِ ہنر ہی ہی

پیشِ رقیب تغافل پیہم بجا سہی　　اک نشترِ نگاہِ پشیماں بھی چاہیے

پھولوں کی قدر کیا خس و خاشاک کے بغیر　　آرائشِ چمن کو بیاباں بھی چاہیے

جذبۂ حرماں غم کو بنانے کے لئے　　اک زیادہ پرستشِ غم اور سہی

کرنے جاتے ہیں تغافل کا گلہ　　ایک تعذیبِ ستم اور سہی

کچھ بہ تعزیرِ وفا ظلم سہے　　کچھ بہ اُمیدِ کرم اور سہی

اک محبت کی نظر کے آگے　　ساری بالغ نظری بھول گئے

آپ شرمندۂ جفا کیوں ہوں　　جن پہ گزری تھی وہی بھول گئے

جنابِ شیخ سے روئے سخن نہیں میرا　　میں کہہ رہا ہوں کہ انسان کی آزمائش ہے

دورِ یاس میں چھٹنے لگا ہر دامنِ صبر　　اب ان کے لطفِ گریزاں کی آزمائش ہے

رفتہ رفتہ ذوقِ خود بینی بڑھا اتنا کہ ہم　　خود تراشیدہ بتوں کے مدح خواں بنتے گئے

عافیت کی اُمید کیا کہ ابھی　　دلِ اُمیدوار باقی ہے

اپنے دامن میں ایک تار نہیں　　اور ساری بہار باقی ہے

قفس سے سوئے چمن لے چلی تو ہے تقدیر　　خدا کرے کہ نظر سے نہ آشیاں گزرے

خزاں تو خیر خزاں تھی گلہ ہی کیا اُس کا　　مگر بہار کے دن اور بھی گراں گزرے

ہوش آیا ہے تو کس سے پوچھے　　تھا نگاہِ ناز کا پیغام کیا

جو دو جہان بھی مانگے تو میں نے کیا مانگا　　وہ کیا طلب جو بقدرِ عطائے یار نہ ہو

ہر چند زندگی ہے کسی اور شے کا نام　　جینے کے واسطے غمِ دنیا بھی چاہیے

ہماری نظر میں

جادہ و منزل از :- سید قطب شہید۔ مترجم :- خلیل احمد حامدی۔ ضخامت ۳۶۴ صفحات۔ قیمت اعلیٰ ایڈیشن پانچ روپے جلد کے ساتھ ۶ روپے، سستا ایڈیشن ۴ روپے۔

ملنے کا پتہ :- اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ۱۳۔ ای شاہ عالم مارکیٹ لاہور

سید قطب شہید رحمۃ اللہ علیہ کا نام اور ان کی دینی خدمات کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں، عالم اسلام میں اُن کی جرأتِ ایمانی اور عزیمت و استقامت کی دھوم مچی ہے، ناصری دور کا یہ سب سے زیادہ مظلوم گھرانا ہے۔ اس مقدس خانوادے کے مردوں ہی نے نہیں، خواتین نے بھی حق کی خاطر ایسے دردناک مظالم برداشت کئے ہیں کہ اُن کے تصور سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں! سید قطب شہید نے اللہ تعالیٰ کے دین کی حفاظت اور اعلاءِ کلمۃ الحق کی خاطر تختۂ دار پر چڑھ کر ایثار و قربانی اور شہادتِ حق کی ایک روشن مثال قائم کر دی! وہ شخص شقی القلب ہے، جو سید قطب شہید کی شہادت کو نظر انداز کرکے، اُن پر زبان طعن دراز کرتا ہے۔

سید قطب شہید عربی زبان و ادب کے نامور انشاء پرداز اور عظیم اسلامی مفکر ہیں، وہ تجربہ و تحقیق کے مختلف ادوار سے گزرے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کا قلم حق کی حمایت کے لئے وقف ہو گیا، ان کی کتابیں اسلامی ادب کا لازوال سرمایہ ہیں۔ خاص طور سے "فی ظلال القرآن" جس کی آٹھ جلدیں شائع ہو چکی ہیں، سید قطب شہید کا عظیم کارنامہ ہے!

یہ کتاب سید قطب شہید کی تصنیف "معالم فی الطریق" کا اُردو ترجمہ ہے، کتاب کے آغاز میں فاضل مترجم نے خاصی تفصیل کے ساتھ قطب شہید اعلی اللہ مقامہ کے سوانح حیات درج کئے ہیں، جو تذکرہ نویسی اور سوانح نگاری کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ ان میں یہ بھی لکھا ہے:

> "ایک موقع پر ٹریبونل کے صدر نے سید قطب سے یہ سوال کیا کہ کیا یہ خیالات تم نے ابوالاعلیٰ مودودی کی تصنیفات سے نقل نہیں کئے، سید قطب نے جواب دیا، میں نے مولانا مودودی کی کتابوں سے استفادہ کیا ہے، عدالت کی طرف سے پھر یہ سوال کیا گیا کہ "تمہاری دعوت اور ابوالاعلیٰ کی دعوت میں کیا فرق ہے؟" سید نے کہا "لافرق" (کوئی فرق نہیں)

یہ کتاب حسب ذیل بارہ ابواب پر مشتمل ہے۔

قرآن کی تیار کردہ لاثانی نسل ـــــ قرآن کا طریقِ انقلاب ـــــ اسلامی معاشرے کی خصوصیات اور اس کی تعمیر کا صحیح طریقہ ـــــ جہاد فی سبیل اللہ ـــــ لا الٰہ الا اللہ اسلام کا نظامِ حیات ـــــ آفاقی ضابطۂ حیات ـــــ اسلام ہی اصل

تہذیب ہے ـــــ اسلام اور ثقافت ـــــ مسلمان کی تربیت ـــــ دور رس تبدیلی کی ضرورت ـــــ
ـــــ ایمان کی حکمرانی ـــــ اور "وادیٔ پُرخار" ـــــ !

سید قطب شہید اسلام کے دینِ فطرت ہونے پر کامل یقین رکھتے ہیں، اسلام کے بارے میں اُن کا ذہن آئینہ کی طرح مجلّا ہے دین و ملت کے وہ خیرخواہ بھی ہیں، اور قرآن اور مہبطِ قرآن (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اُن کو سچی عقیدت اور خالص محبت ہے، اس لئے انہوں نے جو بات کہی ہے پورے اطمینان و وثوق کے ساتھ کہی ہے، سید قطب جاہلیت سے کسی نوعیت پر بھی صلح کرنا نہیں چاہتے، اُن کے نزدیک اسلام اور صرف اسلام ہی انسانیت کی سعادت و فلاح کی واحد شاہراہ ہے اور اسلام کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ باطل اور جاہلیت ہے۔

یہ کتاب فاضل مصنف کے دینی افکار کی آئینہ دار ہے، اس میں جوش ہے، ولولہ ہے، اقامتِ دین کی دعوت ہے، پوری کتاب استدلال اور اثر انگیزی میں شروع سے لے کر آخر تک ایک ہی رنگ ہے!

اس کتاب میں کیا ہے! اس کا اندازہ کرنے کے لئے "جادہ و منزل" کا صرف ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے:-

"اسلام جاہلیت کے ساتھ نیچے درون، نیچے بیرون نوعیت کی کوئی مصالحت قبول نہیں کرتا، معاملہ خواہ اس کے تصور اور نظریہ کا ہو، خواہ اس تصور اور نظریہ پر مرتب ہونے والے قوانین حیات کا اسلام رہے گا یا جاہلیت رہے گی، تیسری کوئی ایسی شکل جس میں آدھا اسلام اور آدھی جاہلیت، اسلام کو قبول یا پسند نہیں اس معاملے میں اسلام کا نقطۂ نگاہ بالکل واضح اور روشن ہے وہ یہ کہتا ہے کہ حق ایک ایسی اکائی ہے، جس کا تجزیہ نہیں ہو سکتا، حق نہ ہوگا تو لازماً باطل ہوگا، حق اور باطل دونوں میں اختلاط و امتزاج اور بقائے باہم محال ہے، حکم یا اللہ کا چلے گا یا جاہلیت کا، اللہ کی شریعت کا سکہ رواں ہوگا، یا پھر ہوائے نفس کی عملداری ہوگی ...."

صفحہ ۱۴۳ پر یہ عبارت نظر سے گزری:-

"...... اور آپ کے چچا ابولہب اور آپ کے چچازاد بھائی عمرو بن ہشام (ابوجہل) ....." رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی چچا کا نام ہشام نہیں تھا، ابوجہل تو بنو ہاشم کے قبیلہ سے بھی نسبی تعلق نہیں رکھتا، وہ ہاشمی نہیں مخزومی ہے۔

"..... اور انسان ظالم موذی کی تکریم کی جاتی ہے" (صفحہ ۱۹۸) "اتی" لکھنا چاہئے تھا کیونکہ تکریم مونث ہے ـــ "اسلام کو حق پہونچتا ہے کہ وہ ان تمام موانع کو زائل کرتے (صفحہ ۲۱۶) "زائل کرنے کی بجائے" دور کرے ترجمہ کرنا چاہئے تھا۔
ـــ "اس بحث سے اب ہم خود بخود اُس آخری نکتے تک پہونچ گئے ہیں" (صفحہ ۲۴۳) عبارت کے سیاق و سباق کے اعتبار سے (غالباً) "آخری نقطے" ترجمہ ہونا چاہئے ـــــــ "یہ دارالاسلام ہر اُس شخص کی مامن ہے (صفحہ ۲۴۸) "مامن" مونث نہیں مذکر ہے۔

جناب خلیل حامدی نے ترجمہ کا حق ادا کر دیا ہے، ترجمہ انتہائی رواں سلیس، دلکش و سادہ اور اصل کتاب کے شایانِ شان ہے، کتاب پڑھنے میں یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ ترجمہ پڑھا جا رہا ہے۔ خلیل احمد حامدی صاحب عربی اور اردو دونوں زبانوں میں کامل درجہ کی مہارت رکھتے ہیں، اس مہارت و مشاقی کے ساتھ اُن کے اخلاص اور دینی جذبہ نے "ترجمہ" کو اور زیادہ اثر انگیز بنا دیا ہے، مصنف، مترجم اور ناشرین، سب کو اللہ تعالیٰ اس کتاب کی تصنیف و ترجمہ اور اشاعت کا اجر عطا فرمائے گا۔

ISLAM TODAY

از :- مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، ضخامت ۲۴ صفحات، قیمت تین روپیہ ۵۰ پیسے
ملنے کا پتہ :- اسٹوڈنٹس پبلیکیشن بیورو، ادارۂ مطبوعات طلبہ کراچی۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ۱۰ دسمبر ۱۹۶۳ء کو اسلامی جمعیتہ طلبار کے ایک اجلاس میں جس میں طلبہ کے علاوہ اہل فکر اور ارباب دانش کا مجمع بھی تھا ایک تقریر کی تھی، اس تقریر کو انگریزی میں منتقل کرکے کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔

یہ کتاب مولانا مودودی کی دوسری بلند پایہ تصانیف کی طرح ہر اعتبار سے فکر انگیز اور قابل مطالعہ ہے، مولانا کے افکار میں جو غیر معمولی سلجھاؤ پایا جاتا ہے اور ان کا جو طریق استدلال ہے وہ پڑھنے والے کو مطمئن کرکے چھوڑتا ہے! آج ملتِ اسلامیہ کن حالات سے گزر رہی ہے اس کا مولانا موصوف نے بڑی دیدہ ریزی کے ساتھ تجزیہ کیا ہے، انہوں نے بڑے پتہ کی بات کہی ہے کہ عام طور سے مسلمانوں کے ملکوں میں یہ کشمکش پائی جاتی ہے کہ ارباب اقتدار مسلمانوں کو کسی اور راہ پر لے جانا چاہتے ہیں اور مسلمان اسلام کی راہ پر چلنے کا داعیہ رکھتے ہیں، اس کشمکش نے ایک نزاع کی صورت اختیار کرلی ہے اور اس طرح جو قوتیں ملک و ملت کی تعمیر میں صرف ہونی چاہئے تھیں وہ مزاحمت و دفاع میں صرف ہو رہی ہیں۔

ادارۂ مطبوعات طلبہ نے اس کتاب کو شائع کرکے دین و اخلاق کی خدمت انجام دی ہے۔

THE MIDDLE EAST CRISIS

از :- چودھری غلام محمد، ضخامت :- ۱۹۸ صفحات، قیمت :- چار روپے ---- ملنے کا پتہ :- مطبوعات چراغ راہ، ہرمزجی اسٹریٹ فریئر روڈ (آرام باغ کے مغرب میں) کراچی

"مشرق وسطیٰ کے بحران" پر اس سے بہتر کتاب اب تک منظر عام پر نہیں آئی، اس میں "مشرق وسطیٰ" کے ماضی، حال اور مستقبل کا کمال دیدہ ریزی کے ساتھ تجزیہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ عربوں کی شکست کے اسباب کیا ہیں؟ اسلام کے دشمنوں نے کیا چالیں چلیں، کیسے کیسے دام ہمرنگ زمیں بچھائے اور ان میں عربوں کے کون قاید پھنس کر رہ گئے، کس نے کیا پارٹ ادا کیا، امریکہ، برطانیہ اور روس ، اسلام دشمنی نے کیا کیا روپ اختیار کئے، یہودیوں کے سرمایہ نے کن طاقتوں کو کس عنوان سے متاثر کیا؟

مصر، عراق، شام، اردن اور یمن کے سیاسی حالات پر فاضل مصنف نے سیر حاصل تبصرہ کیا ہے، مشرق وسطیٰ میں وہ خود بارہا گئے ہیں وہاں کے اکابر اہل فکر و دانش سے ملے ہیں اور ہر بات کو خوب چھان بین کرنے کے بعد قلم کے ذریعہ کاغذ پر لائے ہیں!

جمال ناصر صاحب کے مداحوں کو یہ کتاب خاص طور سے پڑھنی چاہئے تاکہ ممدوح کے بارے میں وہ جان لیں کہ انہوں نے "عرب قومیت" کے نام پر کتنے " " کارنامے انجام دئے ہیں۔

کتاب کا آخری باب، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا لکھا ہوا ہے، اس میں مولانا موصوف نے تفصیل سے بتایا ہے کہ موجودہ صورت حال سے آخر کس طرح عہدہ برآ ہو سکتے ہیں!

یہ کتاب "مشرق وسطیٰ" کے مسائل پر بڑی معلومات آفریں کتاب اور ایک قیمتی دستاویز ہے، فاضل مصنف نے کمال دیانت، احساس ذمہ داری اور خدا خوفی کے جذبہ کے ساتھ یہ کتاب مرتب کی ہے!

جمہوریت، نمائندگی اور نظام انتخاب

از :- فاتک عزیز چودھری (ایم اے) ضخامت ۱۲ صفحات
قیمت :- ایک روپیہ ۷۵ پیسے
ملنے کا پتہ :- فرینڈز پبلیکیشنز ملتان۔

پاکستان میں انتخابات کس بنیاد پر ہونے چاہئیں ! اور کس طرح ہونے چاہئیں پاکستان کے انتخابات پر کون عوامل (برادری دولت ، زمینداری ، سرکاری دباؤ ، ووٹر کا ذاتی کردار ، بے ضمیری حرص اور لالچ کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں ؟ اور ان کی اصلاح کی کیا صورتیں ممکن ہیں ؟ ان مسائل کی فاضل مصنف نے بڑی خوبی کے ساتھ تشریح کی ہے ۔

اس موضوع پر یہ خاصی مفید اور کارآمد کتاب شائع ہوئی ہے یہ خواص و عوام سب کے کام کی چیز ہے اور خاص طور سے عوام کے دل کی آواز ہے ۔

INTRODUCING MAUDUDI

از :- مصباح الاسلام فاروقی ، ضخامت ۵۲ صفحات
قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے
ملنے کا پتہ :- ادارہ مطبوعات طلبہ ۲۰-۴/۱۰۶ گارڈن ویسٹ کراچی ۳

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی زندگی اور سیرت پر متعدد کتابیں آچکی ہیں ، یہ کتاب بھی اسی سنہری سلسلہ کی ایک کڑی ہے ـــــ مصباح الاسلام صاحب فاروقی نے مولانا مودودی کے سوانح حالات بڑی عقیدت و محبت کے ساتھ مرتب کئے ہیں ۔ انہوں نے مولانا موصوف کو بہت قریب سے دیکھا ہے ان کی صحبت اٹھائی ہے ، اُن سے استفادہ کیا ہے ؟ اس لئے سوانح نگار کے تاثرات اور مستند اور واقعی ہیں :
مولانا مودودی انگریزی جانتے ہیں لیکن اس کا علم مصباح الاسلام صاحب کی اس کتاب سے ہوا کہ مولانا موصوف انگریزی کے عالمانہ مضامین کے نوک پلک درست کرنے اور اصلاح دینے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں !
ماہنامہ "ترجمان القرآن" کا آغاز مولانا مودودی نے نہیں مولوی محمد ابوالمصلح نے کیا تھا ۔ آئندہ ایڈیشن میں اس تسامح کی اصلاح کر دینی چاہئے ـــــ بعض مقامات پر عقیدت کا رنگ خاصہ تیز ہو گیا ہے جس سے مولانا کے مخالفین نا جائز فائدہ اٹھا سکتے ہیں

جوہرِ عروض

از :- آغا صادق (ایم ۔ اے) ضخامت ۱۶۰ صفحات (بڑا سائز رنگین گرد پوش) قیمت پانچ روپے
ملنے کا پتہ :- آغا صادق ۶۹ سی گلگشت ، ملتان ۔

فنِ عروض پر ایک اچھی کتاب منظرِ عام پر آئی ہے ۔ فاضل مرتب نے سہل اور عام فہم انداز میں عروض کے دستور و قواعد بتائے ہیں ! اور سببِ خفیف یعنی عروض کی ابتدا سے لے کر عروض کی انتہا یعنی رباعی کے اوزان تک بیان کر دئے ہیں ۔

" چھاؤں ، گاؤں ، پاؤں ـــ ان الفاظ کو نون کے سقوط اور واؤ موقوف سے بوزن فاع باندھنا درست ہے ، مثلاً

مجھ کو اپنا گاؤں اب تک یاد ہے

ان الفاظ کو و کے اشباع سے یعنی گا او پا او بوزن فعلن باندھنا غلط ہے ، بعض متقدمین نے اگر بطریق شاذ باندھا ہے تو اب متروک ہے ، غلط بندش کی مثال یہ نصف مصرعہ ہے ۔

" مکھن سے پاؤں رقص میں "

اُردو کے بعض خاص مصدروں کے آخر الف واؤ آتا ہے مثلاً بناؤ ، لگاؤ ، رچاؤ وغیرہ ان الفاظ کو واؤ موقوف سے باندھنا چاہئے بوزن فعول نہ کہ ہمزہ کے اشباع سے بوزن فعولن "

ان تشریحات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کتاب کس قدر مفید ہے !

" چیونٹی کو بعض شاعر بوزن فعلن باندھتے ہیں ، جو صحیح نہیں چیونٹی کا وزن چُوء ٹی فاعلن درست ہے "

مثلاً ـــــ

چیونٹی ننھی سی تو اک جان ہے (صفحہ ۳۵)

راقم الحروف کی رائے میں "چیونٹی" کو بوزن "فعلن" باندھنا صحیح ہے۔ اس لفظ کو فعلن اور فاعلن ہر دو اوزان پر نظم کیا جا سکتا ہے۔

کئی مقامات (صفحہ ۷۷) پر "مجنون" کو سہو کتابت کے سبب "مجنوں" پڑھنا پڑا۔

جناب آغا صادق اس کتاب پر تحسین و ستائش کے مستحق ہیں! ان کی پوری زندگی تعلیم و تعلم درس و تدریس اور زبان و ادب کی خدمت میں گزری ہے! اپنے علم و مطالعہ کو دوسروں تک پہونچانے کا بیش از بیش جذبہ آغا صاحب موصوف رکھتے ہیں یہ جذبہ کتنا نیک ہے۔

ـــــ صـ۲۹ـ کا بقیہ ـــــ

کا بڑے زور شور سے خیر مقدم کیا اور پہلی جلد پر طویل تبصرے لکھے، سید صاحب علیہ الرحمۃ کے اس وقت تین مجموعہ خطوط عام پر ہیں ایک تو برید فرنگ ہے، جس میں سید صاحب کے سفر یورپ کے سارے خطوط جمع کر دیئے گئے ہیں۔ ان میں ماجد صاحب کے نام بھی کئی خط ہیں، بلکہ زیادہ تر خطوط یورپ سے انہی کو لکھے تھے کہ ان کے حلقۂ احباب میں مغربیات سے دلچسپی انہی کو تھی اور وہی ان کے صحیح مخاطب بھی ہو سکتے تھے دوسرے ان کی عدم موجودگی میں قائم مقام ایڈیٹر معارف بھی تھے، دوسرا مولانا مسعود عالم کے نام کا خطوط مجموعہ ہے جو سید صاحب کے انتقال کے ایک ہی برس کے بعد رہ گرائے عالم باقی ہو گئے، تیسرا ماجد صاحب کے نام کے خطوط کا یہ مجموعہ ہے جو دو جلدوں میں ہے، اس طرح صنف خطوط نگاری سے متعلق سید صاحب کے ادب کا ایک بڑا حصہ محفوظ ہو گیا ہے، کاش کہ ارباب دلیسنہ کے نام کے خطوط کا بھی جن میں سر فہرست یقیناً پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی ہوں گے، کوئی مجموعہ شائع ہو جاتا جس کی تمنا میں مولانا ابوالکمال سید عبدالحکیم دسنوی کے حالات کے سلسلہ میں علی گڑھ کے "ہماری زبان" کی ایک اشاعت مورخہ یکم جون میں کر چکا ہوں، یہ مضمون میں نے شہاب دسنوی کی ایک تحریر پر جو کتب خانہ دلیسنہ کے متعلق اسی پرچہ میں شائع ہوئی تھی، لکھا تھا۔ شہاب دسنوی بڑے فعال بزرگ ہیں، وہ اگر توجہ فرمائیں تو ارباب دلیسنہ کے نام کے خطوط کا ایک بہت ضخیم مجموعہ شائع ہو سکتا ہے جس کی سخت ضرورت ہے!

آپ وقت سے پہلے کیوں مرجھائیں!
دس میں سے نو آدمیوں میں قبل از وقت بڑھاپے کے آثار نظر آنے
لگتے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا سبب ناقص اور ناکافی غذا ہوتی ہے۔
اس غیر طبعی حالت سے بچنے کے لئے ہمدرد کا ماء اللحم دوآتشہ
استعمال کیجئے۔ یہ صحت و شباب قائم رکھنے کا بہترین ذریعہ ہے۔
جدید طبی تحقیق کی مدد سے ماء اللحم کے خواص اور خوبی کو کمال تک
پہنچا دیا گیا ہے اور اب یہ ہر لحاظ سے ایک ایسا مکمل اور مؤثر
ٹانک بن گیا ہے جو تھکے ہوئے اعصاب کو قوت بخشتا ہے اور
پورے نظام جسمانی کو چاق و چوبند کر کے سال بھر کے لئے
ضروری توانائی مہیا کرتا ہے۔ بیشمار لوگ اس کی تاثیر کو آزما چکے ہیں
ماء اللحم
جاڑوں میں نئی قوت اور صحت حاصل کرنے کے لئے ایک مکمل اور مؤثر ٹانک
ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان
کراچی - لاہور - ڈھاکہ - چٹاگانگ

سالانہ چندہ :- ۷ روپے ——— فی پرچہ :- ۶۲ پیسے

پبلشر ——— ماہر القادری

دفتر :- ماہنامہ فاران، کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

باہتمام شفیق احمد صدیقی پبلشر ماہر القادری نے انٹرنیشنل پریس کراچی میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

کیوں کر بیان کیجئے کیا کیا نظر میں تھا
وہ دن بھی خوب تھے کہ مسافر سفر میں تھا

بعض دعوتیں رد بھی کر دی جاتی ہیں، کتنے اصرار ہیں جن کو حکمت سے ٹال بھی دیا جاتا ہے، کہیں جانے کو خود بھی جی نہیں تا، کسی جگہ خوشی خوشی جاتے ہیں مگر پریشان خاطر اور دل گرفتہ واپس آتے ہیں عوام ہوں یا خواص دوست ہوں یا بیگانے، عزیز ما ہوں یا اجنبی، اُن کی محفلوں، دعوتوں اور صحبتوں میں مختلف قسم کے تجربے ہوتے رہتے ہیں!

یہ تو مجھے مہینہ ڈیڑھ مہینہ پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا کہ اسلامی جمعیتہ طلباء کا سالانہ اجلاس حیدر آباد میں ہو رہا ہے، بتہ کے ایک رکن نے مجھ سے کہا بھی تھا کہ اب کی بار آپ کو بھی وہاں چلنا ہے، مگر یہ سرسری سی بات اور رواروی کی دعوت تھی! اجلاس آٹھ دس دن قبل جمعیتہ کے دفتر سے ٹیلی فون آیا پھر اس کے دو رکن غریب خانہ پر تشریف لائے، بالکل اتفاق اور حسن اتفاق کہ انہی دنوں میرا اور پروگرام نکل آیا، بات طے ہو گئی اور اس سفر کے لئے روانہ ہونے سے ایک دن پہلے بلکہ یوں کہئے وقت کے وقت کوئٹہ کے قریب ایک عرے میں شریک ہونے کی دعوت بھی پکی ہو گئی!

یہ دونوں پروگرام نہ بھی ہوتے تو بھی میں حیدر آباد ضرور جاتا۔ اسلامی جمعیتہ طلبہ کی مخلصانہ دعوت کو ٹالنے کے لئے پتھر کا دل چاہئے اور طبیعت، نیک دل اور خوش اوقات اسلام پسند نوجوان ہر طرح کے تعاون دلدہی اور حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں، پاکستان کا مستقبل انہی کی سرگرمیوں سے بہت کچھ وابستہ ہے! ان کا وجود پاکستان کے لئے اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے! اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی طالبات، طلباء اور اساتذہ ان کی نیکی، اسلام دوستی اور شرافت کی گواہی دیں گے!

۲۵ اکتوبر (۱۹۶۶ء) کی صبح طلوع ہوئی اور اُجالا پھیلنے لگا، تو میں اپنا سامان درست کر رہا تھا، دس دن کے مسلسل سفر کے لئے لباس اور بستر کا بہت کچھ بندوبست کرنا تھا، راستہ میں پڑھنے کے لئے دو کتابیں منتخب کیں ایک "مکاتیب ابوالکلام" یہ کتاب حال ہی میں تبصرے کے لئے آئی ہے دوسری کتاب "عبقات" یہ کئی سال سے تبصرے کی کتابوں میں رکھی ہوئی ہے، حضرت شاہ محمد اسمٰعیل شہید رحمتہ اللہ علیہ اس کے مصنف ہیں، مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے اُردو میں اسے منتقل کیا ہے، تصوف کا موضوع ہے، کلامی مسائل بھی آگئے ہیں، منتہی اہلِ فکر کے پڑھنے کی کتاب ہے اس لئے مجھ مبتدی کو ایک ایک صفحہ بڑے غور سے پڑھنا پڑتا ہے اور مسائل کی نزاکتوں اور گہرائیوں میں ذہن و فکر گم ہو کر رہ جاتے ہیں —— ہاں! تو میں اپنے سفر کا ذکر کر رہا تھا! صبح سات بجے جمعیتہ طلبہ کے رکن ... کا ٹیلی فون آیا کہ آٹھ بجے، میں ٹیکسی لے کر آپ کے یہاں پہنچ رہا ہوں، آپ تیار رہیں،

ایکسپریس سٹی ریلوے اسٹیشن سے ساڑھے آٹھ بجے روانہ ہوگی ۔

میں نے اپنا بستر اور سوٹ کیس نیچے بھجوا دیا اور میں خود بھی فلیٹ سے اتر کر سڑک پر آگیا، چند منٹ کے بعد کیا دیکھتا ہوں کہ جمعیتہ طلبہ کے دو رکن ٹیکسی لئے ہوئے چلے آرہے ہیں، ٹیکسی میں سامان رکھوا کر پھر ہم سٹی ریلوے اسٹیشن پہونچے، وہاں طلبا رضاکار پہلے سے کھڑے تھے ۔ میں نے قلی کو آواز دی تو طلبا نے بڑھ کر کہا کہ سامان لے جانے کی خدمت ہم انجام دیں گے، ذراسی دیر میں ان کے ہاتھ سامان ڈبہ میں رکھ دیا گیا، اس ڈبہ میں زیادہ تر اسلام پسند طلبا کی تھی، گاڑی روانہ ہونے سے پہلے انہوں نے ڈبہ پر "اسلامی جمعیتہ طلبہ پاکستان کے نام کا طغریٰ (بینر) آویزاں کیا اور اسٹیشن - اللہ اکبر" اور اسلامی جمعیتہ طلبہ زندہ باد" کے نعروں سے گونج اٹھا۔ طلبہ کے سینوں پر " اللہ اکبر" کے خوش نما بیج لگے ہوئے تھے ۔ معاً میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ ایک وہ نوجوان جو اپنے سینوں پر ماؤزے تنگ کی تصویر لگاتے پھرتے ہیں اور ایک یہ دین پسند طلبا ہیں جن کے سینوں پر "اللہ اکبر" کے نشان آویزاں ہیں ۔

۵ - اپنے اپنے ذوق و طبیعت کی بات ہے

کینٹ اسٹیشن پر بھی کچھ طلبہ ٹرین میں سوار ہوئے اور وہاں بھی اللہ تعالیٰ کے نام کی تکبیریں بلند کی گئیں، ریل کے قلی، مسافر اور سپاہی ان اسلام پسند نوجوانوں کو حیرت اور تحسین کی ملی جلی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے، ان لوگوں نے تو اب تک ایسے نوجوان دیکھے تھے، جو پتلونوں کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ہوئے زنانہ ڈبوں کے سامنے سے بار بار گزرتے ہیں، سیٹیاں بجاتے ہیں اور فلمی گیت گنگناتے ہیں ۔ مگر یہ طلبہ اس مزاج و طبیعت کے نوجوانوں سے بالکل مختلف تھے ۔ سنجیدگی، سادگی اور شرافت و نیکی ان کے چہروں سے اس طرح جھلک رہی تھی، جیسے ہیرے کی جوت اور سچے موتی میں آب !

اسی ایکسپریس سے میں نے ۱۹۵۳ء میں سفر کیا تھا، طلبا کی ایک خاصی بڑی جماعت امتحان دینے کے لئے لاہور جارہی تھی، ان طلبا کی زندہ دلی اور خوش فعلیاں اس حد تک پہنچ گئیں جو دوسروں کے لئے تکلیف دہ بن جاتی ہیں، ٹرین کو بار بار زنجیر کھینچ کر روک لینے، سیٹیاں، تالیاں بجانے، بعض نامناسب نظم و غزلیں گاتے، پانچ چھ گھنٹے، اور آپس میں چھیڑ چھاڑ کرتے، اس طوفانِ بدتمیزی کا یہ نتیجہ نکلا کہ ایکسپریس کو پنڈعیدن کے ایک بجے پہونچنا چاہئے تھا مگر وہ وہاں چار گھنٹے کی تاخیر سے شام کو ۵ بجے پہونچی، کھانے کے بعد ڈھائی بجے جلسہ کا جو پروگرام تھا وہ گڑبڑ ہو گیا، ان طلبا کو نصیحت کرنے کی کس میں ہمت تھی جو کوئی ایسا کرتا تو اس بیچارے کی عزت آبرو کا صحیح سلامت رہنا مشکل تھا ۔

ایک وہ سفر تھا جسے دیکھ کر شرافت اور انسانیت سر پیٹ رہی تھی اور ایک یہ سفر جس میں کسی قسم کا شور و شر، چھیڑ چھاڑ اور بدتمیزی نہیں، طلبہ تعداد میں وہ سو سے کیا کم ہوں گے مگر اتنی بہت سی جوانیاں کسی مسافر کے لئے ذرہ برابر شکایت کا سبب نہیں بنیں ! اور یہ سب اسلام کی برکت تھی، اسلام ہی نے ان نوجوانوں کو لگام دی ہے جس نے ان کو مہذب، شائستہ اور سنجیدہ بنا دیا ہے !

ٹرین فراٹے بھرتی ہوئی چلی جارہی تھی، چھوٹے اسٹیشنوں پر ریل کے بابو ہری جھنڈیاں دکھاتے ہوئے نظر آتے تھے، جھنگ آیا، پھر جھمپیر اور اس کے بعد کوٹری! یہاں ہر ٹرین کو خاصی دیر رکنا پڑتا ہے، کوٹری سے ٹرین جو چلی تو چند منٹ کے بعد دریائے سندھ کا پل آگیا، پاکستان کا سب سے بڑا دریا، کہیں کہیں تو اس دریا میں چھوٹے چھوٹے اسٹیمر چلتے ہیں، اس دریا نے سکندر اعظم کی فتحمندی کو دیکھا ہے، محمد ابن قاسم کی فوج ظفر موج کے قدم چومے ہیں اور ان مجاہدوں

باعت اور کشورکشائی کے مناظر کا مشاہدہ کیا ہے! وادیٔ مہران نے کیسے کیسے عجیب انقلابات دیکھے ہیں، کتنی بادشاہتیں ہیں جن
بہار و خزاں کی داستانیں یہاں کی خاک میں دفن ہیں، عروج و زوال اور عیش و غم کی یہ دھوپ چھاؤں آتی جاتی رہی
..بہاتے سندھ کی موجیں ہمیشہ رواں دواں رہیں، جیسے انہوں نے کسی انقلاب کو قبول نہیں کیا۔

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

اس کائنات میں ساری کشمکش تو دل و دماغ کے شعور کے ساتھ وابستہ ہے زمین و آسمان، دریا، سمندر، پہاڑ،
ل اور دشت و باغ یہاں تک کہ جانوروں اور پرندوں پر کوئی ذمہ داری نہیں ——— انسان نے بارِ امانت اٹھا کر
. ناپیاں قبول کی ہیں، اور وہ اس عالم کون و فساد، دارالعمل اور امتحان گاہ میں اپنا پارٹ ادا کر رہا ہے، جس نے آخرت کو
رش کر کے اور سزا و جزا سے غافل رہ کر اپنی زندگی گزاری وہ گھاٹے میں رہا، جس نے اپنی ذمہ داری کو محسوس کیا، اُس
السلامت پا لی! وہ یورپ ہو یا امریکہ، روس ہو یا چین ان تمام ملکوں اور قوموں کا معاشرہ، آخرت فراموشی اور اللہ تعالیٰ
رف سے ڈالی ہوئی ذمہ داری سے غفلت کے بہاؤ پر چل رہا ہے فرد ہو یا جماعت عوام ہوں یا حکومت جس کسی نے اس معاشرے
نمونہ پر عمل کیا، اس نے اللہ تعالیٰ سے بغاوت کی اور اللہ تعالیٰ کے باغیوں کے لئے آخرت میں دردناک عذاب دیا جائے گا۔
دامی جمعیۃ طلبہ نوجوانوں کو اس عذاب سے بچانے اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے جد و جہد کر رہی ہے اُس
دعوت اسلام کے سوا کسی ازم (ISM) اور نظریہ حیات کی طرف نہیں ہے، پاکستان کے نوجوانوں کی یہ دینی تنظیم اسلام کے
دوسرے نظام حیات اور طریقِ زندگی کو باطل سمجھتی ہے، کتنی مبارک ہے یہ تنظیم اور کس قدر نیک و شریف ہیں اس کے چلانے والے
نوجوان انجیل کی اصطلاح میں زمین کا نمک اور قرآنِ کریم کی زبان میں "اُولٰئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُون" کا مصداق ہیں۔

اس جمعیۃ کے وابستگان و متفقین کا قافلہ بارہ بجے کے قریب حیدرآباد اسٹیشن پہونچا، ان صالح نوجوانوں کے ساتھ یہ
بزرگ شاعر بھی تھا، جو نفس کے چٹخاروں سے ابھی تک دامن نہیں چھڑا سکا ——— پلیٹ فارم پر جمعیۃ طلبہ کے کارکن
و رفقاء کے استقبال کے لئے پہلے سے موجود تھے، ہمارا تانگہ شہر کے بازاروں اور سڑکوں سے ہوتا ہوا اجتماع گاہ میں پہونچا
دروازہ پر مشکل سے چھ سات منٹ انتظار کرنا پڑا، یہاں کے نظم کے مطابق آنے والوں کے نام رجسٹروں میں درج ہوئے،
خیمہ میں ٹھیرے گا اور کہاں سے آیا ہے؟ اس کی جانچ پڑتال ہوئی، راقم الحروف کو جس حصہ میں ٹھیرایا گیا اُس پر جلی حروف میں
حلقہ احباب" لکھا ہوا تھا۔ میں نے اپنا بستر فرش پر بچھا دیا اس خاک نشینی نے نفس کی راحت پسندی اور عادت پر
ب لگائی اور زبانِ حال سے کہا کہ سخت کوشی تو مسلمانوں کا طغرائے امتیاز رہا ہے جب سے ملت عیش و راحت اور لطف و تنعم
و گرویدہ ہوئی اُس کے عروج اور اقبال مندی کے ستارے دھندلے ہوتے چلے گئے!

گھنٹہ سوا گھنٹہ کے بعد اجتماع گاہ سے قریب کی مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کی، دوپہر کا کھانا تاخیر سے ملا مگر نوجوانوں کے
ن انتظام کو دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی، سینکڑوں مہمان وقتِ واحد میں دسترخوان پر کھانا کھا رہے ہیں مگر کسی قسم کا کوئی شور و
ہیں، چھینا جھپٹی نہیں، کھانا کھاتے ہیں ان نوجوانوں کے وقار و سنجیدگی کا سماں دیکھنے کے قابل تھا، منتظمین کھانا کھانے
ں کے چشم و ابرو پر نگاہ رکھتے تھے۔ ذرا سے اشارے پر روٹی، سالن اور پانی حاضر، طعام گاہ سے لے کر غسل خانوں تک
بلکہ صفائی اور ستھرائی، سب سے زیادہ اہتمام وضو کے لئے تھا۔ عصر، مغرب اور عشاء کی تین نمازیں ان نوجوانوں کے ساتھ پڑھنے

کا اتفاق ہوا، ہزار نو سو نوجوانوں کی غالب اکثریت نے جماعت سے نمازیں ادا کیں! وہ جو علامہ اقبال نے ملّتِ مسلمہ کی دینی حالت کا مرثیہ کہا ہے ـــ

صفیں کج، دل پریشاں، سجدے بے ذوق
کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

ـــــــــ مگر ـــــــــ

اسلامی جمعیتہ طلبہ کے ارکان کی نمازوں میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے صفیں بھی سیدھی تھیں اور سجدوں سے بھی ذوق و خشوع نمایاں ہو رہا تھا، توقع ہے کہ ان اسلام پسند نوجوانوں، کے دلوں کو بھی نماز پڑھتے میں سکون، یکسوئی اور روحانی لذت میسر آتی ہوگی۔

اجتماع کے لئے جو مقام منتخب کیا گیا تھا وہ نہایت موزوں تھا، پختہ چار دیواری نے قناتوں کی زحمت سے بچا دیا تقریباً نصف فرلانگ تک شامیانوں کی مسلسل قطار، مغربی پاکستان کے تمام شہروں سے طلبہ آئے تھے، اقامت گاہوں پر اضلاع اور شہروں کے نام لکھے ہوئے ! جلسہ کے منتظمین کس خلوص اور احساس فرض شناسی کے ساتھ اپنے کاموں میں لگے تھے، اتحادِ عمل یک رنگیِ خیال اور وحدتِ فکر کے ایسے مناظر پاکستان میں شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتے ہیں، مہمانوں کے اسباب و سامان کی حفاظت کا پورا انتظام، میرا سامان بکھرا ہوا پڑا تھا اور نوجوان ملنے کے لئے آ جا رہے تھے، مگر کاغذ کا ایک پرزہ تک اِدھر سے اُدھر نہیں ہوا۔

مشرقی پاکستان کے تین طلباء راقم الحروف سے ملنے کے لئے تشریف لائے اُن سے گھنٹہ سوا گھنٹہ تک تبادلہ خیال ہوتا رہا۔ بڑے دُکھ کے ساتھ انہوں نے اس صورتِ حال کا اظہار کیا، کہ مشرقی پاکستان میں نیشنلزم، صوبائی عصبیت، بے دینی اور کمیونزم کا زور بڑھتا جا رہا ہے، اور مجیب الرحمٰن صاحب جن کی شخصیت بے اثر اور گمنام سی ہو گئی تھی۔ وہ اس خطہ کے ہیرو بن گئے ہیں! اسلامی جمعیتہ طلبہ نوجوانوں کو ان فتنوں سے بچانے کے لئے بہت کچھ روک تھام اور دوڑ دھوپ کر رہی ہے مگر ہمارے ذرائع محدود ہیں، ہمارے لئے فضا کو سازگار بھی نہیں بننے دیا گیا' ان طلبار کی گفتگو سے میں بہت زیادہ متاثر ہوا وہ ایک ایک لفظ تول تول کر بول رہے تھے، انتہائی ذمہ دارانہ، سنجیدہ اور باوقار گفتگو! اسلام آدمی کو ہر طرح کا سلیقہ عطا کرتا ہے باطن کے ساتھ ظاہر بھی سنور جاتا ہے، اور دین کے ساتھ دنیا بھی "حسین" ہو کر "حسنات" کا مظہر بن جاتی ہے۔

ان نوجوانوں میں دین وملت اور پاکستان کی خیر خواہی کا بے پناہ جذبہ دیکھ کر جی باغ باغ ہوگیا، کتنے بہت سے چہروں پر ڈاڑھیاں نظر آئیں، دوسری تنظیموں کے طلبار ہوتے تو وقت گزاری کے لئے تاش کے پتے اُن کے ہاتھوں میں ہوتے اور فلمی ریکارڈوں سے جی بہلاتے مگر ان نوجوانوں کے ہاتھوں میں دینی کتابیں نظر آئیں ان کے دینی شغف کو دیکھ کر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب یاد آ گئے، جن کی "دینداری" طلبار کی اس دین دوست، اسلام پسند، نیک شعار اور شرافت آثار تنظیم کی تخریب میں صرف ہو رہی ہے کوئی طالب علم اس جمعیتہ سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہے تو خوشی کے مارے ڈاکٹر صاحب کی باچھیں کھل جاتی ہیں' اس قماش کے منفردین اور خوارج "حلقہ تدبر قرآن" ہی سے رجوع کرتے ہیں! اُن کو یہیں سے رہنمائی ملتی ہے!

جماعتِ اسلامی سے فکر وعمل کی جہاں بھی ذرا سی وابستگی اور ہم رنگی نظر آتی ہے ڈاکٹر صاحب اُسے برداشت نہیں کر سکتے اس دشمنی نے اخلاق وفکر کی اس پستی تک اُنہیں پہونچا دیا ہے کہ اُن کے رسالہ "میثاق" میں جمال ناصر کو سراہا گیا اور ـــ اخوان المسلمون کی مظلومیت پر طنز کی گئی، ماہنامہ "ترجمان القرآن" نے ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے ملحدانہ افکار پر نقد و احتساب کیا

ڈاکٹر صاحب نے اس کے توڑ پر فضل الرحمٰن صاحب کے افکار و خیالات کی مدافعت و تائید فرمائی بلکہ انہیں سراہا اور اُن کی ذہانت کی داد دی ! " دینداری " جب اس قسم کا لباس اوڑھ لیتی ہے ، تو اسلام کی روح چیخنے لگتی ہے کہ :-

" خدا کے لئے مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ "

بات کچھ اور چل نکلی ، راقم الحروف اصل موضوع سے کچھ ہٹ گیا ، مگر کیا کیا جائے ، اسلامی جمعیتہ طلبہ کا ذکر آیا تو اُس کے راہوں اور دشمنوں کا تصور بھی آنا ضروری تھا - اور اس ذکر و تصور کے ساتھ راقم الحروف کے دل کی چوٹیں بھی اُبھر آئیں ! ـــــ میں جمعیتہ طلبہ کے سالانہ اجتماع کی بات کر رہا تھا ، عشاء کی نماز کے بعد ادبی اجلاس ہوا ، جس کی صدارت مجھ سے متعلق تھی رسمی سا اجلاس تھا ، جس کے لئے شاید پہلے سے تیاری بھی نہیں کی گئی تھی ، طلباء نے نظمیں سنائیں ، مشرقی پاکستان کے ایک ران نے میری نظم ـــــ

امیروں کی ضرورت ہے نہ سلطاں کی ضرورت ہے

زمانے کو فقط مردِ مسلماں کی ضرورت ہے

نگلہ میں منظوم ترجمہ سنایا - آخر میں راقم الحروف کی باری آئی ، طلباء کے اصرار پر پون گھنٹہ تک مسلسل غزلیں اور نظمیں سناتا شب میں مجھے جانا تھا ، بارہ بجے کے قریب اس ادبی اجلاس کے اختتام کا اعلان کر کے اجتماع گاہ سے اسٹیشن کے لئے روانہ یا ! خیبر میل وقت پر آیا ، سیٹ دو دن قبل ریزرو کرالی گئی تھی ! راستہ بھر اسلام پسند طلباء کے اس اجتماع اور وہاں کے سلامی اور دینی ماحول کا نشہ سا طاری رہا ـــــ !

ور آگے ! منٹگمری کا اب نام " ساہیوال " ہو گیا ہے ، کاش ! پاکستان میں انگریزی دور کے تمام آثار کے ساتھ یہی سلوک کیا جا سکتا ! ساہیوال شام کے پانچ بجے پہونچا ہوا ، وہاں اسٹیشن سے باہر موٹر کار تیار کھڑی تھی ـــــ

ہیوال سے جامعہ اسلامیہ کے لئے موٹر کار شام کے دھندلکے میں روانہ ہوئی ، بیس بائیس میل چل کر ٹائر پنکچر ہو گیا ، درختوں بھنڈ ، خودرو جھاڑیاں ہریالی ، نہر کا کنارہ ، اس عالم میں غروب آفتاب کا منظر ! کراچی میں ان نظاروں کے لئے ترستے رہتے ہیں ، نہر کے کنارے نشیب میں مغرب کی نماز ادا کی ، ڈرائیور نے بڑی پھرتی دکھائی ، اتنی دیر میں اُس نے پچھلے ہوئے ٹائر نکال کر ثابت ٹائر فٹ کر دیا - چراغ جلے ہم جناب ظفر اللہ رانا صاحب کے یہاں پہونچے ، کشادہ اور وسیع باغ اس میں آرام دہ گی ، امیرانہ ٹھاٹ باٹ مگر رانا صاحب درویش صفت واقع ہوئے ہیں ، درود اور ذکر اللہ سے اُن کی زبان ہر وقت تر رہتی ہے اور نماز کی پابندی کا یہ عالم کہ تکبیر اولیٰ بھی قضا نہیں ہونے پاتی ، یہ علاقہ دُور تک بنجر پڑا تھا رانا صاحب کی محنت نے قابل زراعت بنایا ، اس محنت کا پھل بھی انہیں مل رہا ہے :

جامعہ اسلامیہ کے بانی اور نگران رانا صاحب ہی ہیں ، اسی تعلیمی ادارے کے زیر انتظام سیرت کانفرنس منعقد ہوئی ، پہلے اس کی صدارت حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے فرمائی ، مفتی صاحب موصوف نے اپنی تقریر میں نہایت سادگی کے تھ بڑے کام کی باتیں کہیں ، اس اجلاس میں مجلس اتحاد العلماء کے ایک فاضل رکن نے جو جہلم یا گجرات کی کسی مسجد کے خطیب اس قدر اثر انگیز تقریر کی کہ اس اجلاس کا حاصل قرار پائی افسوس ہے کہ تعارف کے باوجود مولانا موصوف کا نام یاد نہیں رہا !

دوسرے دن دوپہر کا اجلاس مولانا عبدالستار خاں صاحب نیازی کی صدارت میں منعقد ہوا ، سیرت مقدسہ پر تقریریں ہو رہی تھیں ، اتنے میں ساہیوال کے ڈپٹی کمشنر صاحب کا حکم صادر ہوا کہ لاؤڈ اسپیکر جلسہ میں استعمال نہ کیا جائے ، وہ جو

مولانا مودودی صاحب کے مخالفین بھی ان کی مفکرانہ حیثیت کو تسلیم کرتے ہیں مگر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے مولانا موصوف کے " مفکر " ہونے کی بھی تردید کی ۱۵ کو " دانی " تسلیم کیا انسان کے " ارتقائی " ہونے کا کریڈٹ بھی دوسروں کے پلڑے میں ڈال دیا ـــــ جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کی تنقیص میں ڈاکٹر صاحب نے خدا کا خوف کر کے اس نے سلسلے سے [illegible] ہے !

کسی دانشور نے کہا ہے کہ "حکم حاکم مرگِ مفاجات" اس حکم کی تعمیل کی گئی۔ مگر انتہائی دکھ اور ناخوشی کے ساتھ! چوہدری محمد علی صاحب جو نظام اسلام پارٹی کے سربراہ ہیں، شب میں انہیں سیرت کانفرنس کے آخری اجلاس کی صدارت کرنی تھی! یہ پیش بندی اسی لئے کی گئی تھی! عبدالستار خاں نیازی صاحب شعلہ فشاں مقرر ہیں، اُن کے طرۂ دستار اور ہاتھ کے ڈنڈے دیکھ کر ہی آدمی مرعوب ہو جاتا ہے، انہوں نے دھواں دھار تقریر فرمائی، شب میں چوہدری محمد علی صاحب کی عالمانہ تقریر نے سماں باندھ دیا! ان اجلاسوں میں راقم الحروف نے نعتیہ نظمیں سنائیں اور ایک اجلاس میں سیرت پر تقریر کرنے کی سعادت بھی حاصل کی۔

تیسرے دن ناشتہ کے بعد رانا صاحب کی موٹر کار کے ذریعہ لاہور روانہ ہوئے، بارہ بجے لاہور پہونچا ہوا وہاں ایک شب گزاری اور اپنے انتہائی مخلص دوست مولانا... کی کیفی کے یہاں حسبِ معمول قیام کیا ــــ اس سفر میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب ــــ خلافت وملوکیت ــــ پر متعدد حضرات سے بحث وگفتگو ہوئی، اس بحث میں اس کا اندازہ ہوا کہ زیادہ تر حضرات مولانا موصوف کو بدنام کرنے اور اُن کو نشانۂ طنز وملامت بنانے کے لئے اس کتاب کی آڑ لے رہے ہیں: "خلافت وملوکیت" تاریخی کتاب ہے، حدیث وفقہ کی کتاب نہیں ہے، اس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر اخلاق وشرافت کے حدود میں رہ کر! اس کتاب کے منظرِ عام پر آنے سے پہلے مولانا مودودی صاحب کے مخالفین ومعاندین نے مولانا موصوف کو مطعون اور بدنام کرنے کے لئے کون سی کسر اٹھا رکھی تھی!

دوسرے دن صبح کو کوئٹہ کے لئے ٹرین سے روانگی ہوئی، جاڑے کے ڈر سے خاصہ وزنی بستر ساتھ لایا تھا مگر سردی اب تک نہ جانے کہاں چھپی بیٹھی ہے کہ ماہ نومبر شروع ہونے والا ہے اور سردی آنے کا نام نہیں لیتی! چھبیس گھنٹے کے مسلسل سفر کے بعد کوئٹہ پہونچا ہوا اور وہاں سے خضدار، درختوں کا دور دور تک نام ونشان نہیں، ریت ہی ریت اور سنگریزے ہی سنگریزے، آدمی تو آدمی کوئی پرندہ تک نظر نہیں آیا، بیس بیس پچیس پچیس میل پر کہیں کہیں کوئی گاؤں دکھائی دیا، اس علاقہ میں اگر پانی کا انتظام ہو جائے تو زمین سچ مچ سونا اُگلنے لگے اور بلوچستان کے علاقہ کی پیداوار کی کوئی حد ونہایت نہ رہے!

"خضدار" رات میں پہونچے، ڈپٹی کمشنر صاحب کے بنگلہ کے سامنے خیمے لگے ہوئے تھے، انہی میں شعراء صاحبان کو ٹھیرایا گیا، قیام وطعام کا انتظام معقول تھا! ــــ "خضدار" کمشنری قلات کا صدر مقام ہے، آبادی بہت سے بہت تین چار ہزار ہوگی، دفاتر، حکام کے بنگلے، کالج اور دوسری عمارتوں پر حکومت نے ڈیڑھ کروڑ روپیہ خرچ کیا ہے اور جنگل میں منگل کا سماں پیدا کر دیا ہے، علامہ اقبالؔ بہت پہلے پیش گوئی فرما چکے تھے۔

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

قلات کے کمشنر صاحب کی طرف سے شب میں ڈنر ہوا اور اس کے بعد مشاعرہ، اس مشاعرے کو چھوٹے پیمانے پر "کل پاکستان مشاعرہ" کہا جا سکتا ہے، جسے کوئٹہ ریڈیو نے نشر کیا، مشاعرہ توقع سے زیادہ کامیاب رہا، خاران اور مستونگ وقلات کے سردار اور خوانین پسندیدہ شعروں پر "مکرر" ــــ "مکرر" فرماتے تھے، تو مشاعرے میں اور زیادہ گرمی پیدا ہو جاتی۔

یہ معلوم کر کے دلی مسرت ہوئی کہ اس علاقے میں چاروں طرف اُردو ہی کا چلن ہے، چھوٹے سے چھوٹے قریہ میں اُردو بولی اور سمجھی جاتی ہے، تحصیل اور ضلع کے دفاتر اُردو میں ہیں۔ مجسٹریٹوں کے فیصلے تک اُردو میں لکھے جاتے ہیں، مستونگ اور قلات کے

زاروں میں ہرطرف اُردو کے بورڈ نظر آئے ۔ قلات کا نام جغرافیہ کی بدولت بدو شعوری سے سُن رکھا تھا ۔ خضدار سے واپسی میں
یاست کو دیکھ بھی لیا ، خان قلات کا محل دُور سے نظر آیا ، قلات ایک قصبہ کے طرز پر آباد ہے ، عمارتیں اور دوکانیں مٹی کی ،
ر کی نماز قلات کی مسجد میں پڑھی جس کے دروازے پر " مدرسہ تجوید القرآن " لکھا ہوا دیکھا ۔

قلات سے مستونگ مغرب کے قریب پہونچے ، وہاں ایک ہوٹل میں چائے پی ، مستونگ سے کوئٹہ تقریباً چالیس میل دور ہے ،
ڑھے سات بجے کے قریب کوئٹہ پہونچنا ہوا ، وہاں شب کو ایک کلب کی طرف سے پر تکلف عشائیہ کے بعد بزم مشاعرہ منعقد ہوئی ،
بر کا آغاز اور کوئٹہ میں سردی کچھ یوں ہی سی ! صبح ہونے کے بعد دھوپ جو پھیلی تو سویٹر کی بھی ضرورت نہ رہی ۔ دن میں بازاروں
سے گزرنا ہوا ، تو ہمیں بتایا گیا کہ اس بازار میں اسمگلنگ کیا ہوا سامان بکتا ہے ! اور حیرت ہے کہ یہ لوگ احتساب سے محفوظ ہیں ۔
کراچی میں چھالیہ کا بھاؤ چودہ روپے سیر ہے اور کوئٹہ میں چار پانچ روپیہ سیر ! بلوچستان کے بعض امیر خاندانوں کی باہمی دشمنی
قصے بھی معلوم ہوتے ! ملک کی عام اخلاقی حالت کتنی پست ہے ، عام ضروریات زندگی کی مہنگائی کا کیا عالم ہے ، عوام میں کتنی
چینی پائی جاتی ہے ـــــــ اس پر " اصلاحات ترقی کے جشن " کوئی کہے تو کیا کہے : سچ تو یہ ہے جس کسی نے حکومت
ذمہ داری کو قبول کیا اس نے اپنے کو بڑے سخت امتحان میں ڈالا ، قیامت کے دن ان ذمہ داریوں پر سخت بازپرس ہوگی ،
حکومت کا تخت پھولوں کی سیج نہیں ، کانٹوں کا بستر ہے جس نے اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے ان کانٹوں کی چبھن کو محسوس کیا اور
پنے نفس کو لذتوں میں آلودہ نہ ہونے دیا اُس کو آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوگی اور اللہ تعالیٰ کی رضا جس خوش نصیب
حاصل ہو جائے وہی دراصل سربلند و کامیاب ہے ۔

ہر انسان مسافر ہے اور زندگی کی منزل میں رواں دواں ہے ، اس زندگی کے ڈراپ سین کے بعد ایک اور زندگی بھی ہے ! یہ
کی مسافرانہ زندگی تو تنگی ترشی اور آسودگی و فراغت دونوں حالتوں میں بسر ہو ہی جاتی ہے ؎

شب سمور گزشت و شب تنور گزشت

اصل فکر اس آنے والی زندگی کی کرنی چاہئے اُس عالم (آخرت) میں عشرت و آسودگی میسر آئے تو زندگی کامیاب اور
راد ہے اور یہ کامیابی اللہ اور رسولؐ کی اطاعت ہی کے طفیل میں میسر آسکتی ہے ـــــ والعاقبۃ للمتقین

ماہر القادری
۱۵ رمضان المبارک م ۲۶ نومبر ۶۸ء

۵
آزمودہ دواؤں کا مرکب
انالجین
سر درد - کمر کا درد - دانت کا درد
ایام - انفلوئنزا اور ہر قسم کے دوسرے درد کے لئے
یقینی زود اثر اور بے ضرر علاج ہے
Opal
Spotlit

میں حفاظ کی کثیر تعداد شہید ہوئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ضیاع قرآن کا اندیشہ ہوا۔ انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ کو جمع قرآن کا مشورہ دیا اور حضرت ابوبکر نے بحث و تمحیص کے بعد یہ مشورہ قبول کر لیا۔ اگر صحابہ کرام محض لکھے ہوئے قرآن کو کافی سمجھتے تو حفاظ قرآن کی شہادت سے قرآن کے ضائع ہونے کا اندیشہ پیدا نہ ہوتا کیونکہ قرآن کریم تو ان کے پاس لکھا ہوا موجود تھا حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ جو کاتب وحی رہ چکے تھے اور حضرت ابوبکر صدیق نے ان کو جمع قرآن پر مقرر کیا تھا ان کی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن جمع کرتے وقت انہوں نے قرآن کے لکھے ہوئے اوراق کے علاوہ حفاظ سے بھی مدد لی آپ فرماتے ہیں ۔

فتتبعت القرآن اجمعه من العسب واللخاف وصدور الرجال . . . . .
(الاتقان فی علوم القرآن ۔ جزاول صفحہ ۵۹)

پس میں نے قرآن کا تتبع کیا تاکہ میں جمع کروں کھجور کے پتوں، تختیوں، اور آدمیوں کے سینوں میں سے

اگرچہ یہ ٹھیک ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کتابت حدیث کا وہ اہتمام نہ تھا جو اہتمام قرآن کو حاصل تھا اور اس کی ضرورت بھی نہ تھی ۔ کیونکہ قرآن کریم کے معانی کے ساتھ ساتھ اس کے منزل من اللہ الفاظ کی حفاظت بھی ضروری تھی ۔ حدیث میں الفاظ کی حفاظت ضروری نہ تھی ، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں حدیث کی کتابت ہی کا سرے سے انکار سراسر جہالت ہے ۔ کتب حدیث کا جائزہ لینے سے ہمیں بے شمار احادیث و آثار ایسے ملیں گے جن سے عیاں ہوتا ہے کہ کتابت حدیث کا سلسلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر اس کی باقاعدہ تدوین تک موجود رہا ہے اس کی باقاعدہ تدوین حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانے میں شروع ہوئی ہے ۔ ہم وہ احادیث و آثار نقل کرتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بعض صحابہ کرام حضورؐ کے ارشادات لکھ لیا کرتے تھے ۔ پھر ان کے بعد تابعین اور تبع تابعین میں بھی ایسے لوگ موجود رہے ہیں جو حدیث لکھا کرتے تھے ۔

عن عبد اللّٰه بن عمرو بن العاص قال قلت یا رسول انا نسمع منك احادیث افلا نكتبها؟ قال بلى
(مسند امام احمد ۔ الاصابہ جلد ۲ صفحہ ۳۴۳
الاستیعاب جلد ۲ صفحہ ۳۳۹)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ ہم آپ سے (بہت سی) احادیث سنتے ہیں کہ ہم ان کو لکھ نہ لیا کریں ؟ فرمایا ہاں (لکھ لیا کرو)

امام احمد کی دوسری روایت ہے جس میں یہ الفاظ ہیں ۔

قلت فی الغضب والرضا قال نعم فانی لا اقول فیهما الا حقاً

میں نے عرض کیا غصے اور خوشی دونوں حالتوں میں (لکھ لیا کریں) ؟ فرمایا ہاں ۔ کیونکہ ان دونوں حالتوں میں بھی حق کے سوا کچھ بھی میرے منہ سے نہیں نکلتا ۔

اسی سے ملتے جلتے الفاظ میں ابوداؤد اور دارمی نے یہ حدیث نقل کی ہے (ملاحظہ ہو مقدمہ تحفۃ الاحوذی)
اسی کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے ۔ حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں ۔

ما من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احد اکثر حدیثا عنہ منی الا ما کان من عبد اللہ بن عمرو فانہ کان یکتب ولا اکتب۔

(بخاری مع شرح فتح الباری جلد ا صفحہ ۱۹۵)

اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے کوئی بھی مجھ سے زیادہ حدیث نہ جانتا تھا سوائے عبد اللہ بن عمرو کے وہ حدیث لکھ لیا کرتے تھے اور میں لکھا نہ کرتا تھا۔

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص روایت کرتے ہیں۔

بینما نحن حول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکتب اذا سئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ ای المدینتین تفتح اولاً قسطنطنیہ او رومیۃ (مقدمہ تحفۃ الاحوذی للمبارکفوری)

ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد بیٹھے ہوئے لکھ رہے تھے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کون سا شہر پہلے فتح ہوگا قسطنطنیہ یا روم؟

عن راشد الحبرانی قال: اتیت عبد اللہ بن عمرو بن العاص فقلت لہ: حدثنا ما سمعت من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فالقی الی صحیفۃ

(مقدمہ تحفۃ الاحوذی صفحہ ۱۰)

راشد حبرانی کہتے ہیں کہ میں عبد اللہ بن عمرو بن العاص کے پاس آیا اور کہا کہ آپ نے جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، ہم سے بھی بیان کیجئے۔ تو انہوں نے ایک کتاب میری طرف بڑھا دی۔

مندرجہ بالا احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمروؓ اور بعض دوسرے صحابہ احادیث لکھا کرتے تھے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص نے احادیث نبوی کو کتابی شکل میں مرتب کر رکھا تھا جس کا نام "الصادقۃ" تھا۔ صادقہ کے متعلق حضرت عبد اللہ بن عمرو کا دعویٰ تھا کہ اس میں صرف وہی حدیث لکھی گئی ہے جو انہوں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنی ہے۔ ما فیھا الا ما سمعت اذنای من رسول اللہ اس میں صرف وہی لکھا ہوا ہے جسے میرے کانوں نے حضورؐ سے سُنا ہے۔

مشہور تابعی مجاہدؒ صادقہ کے متعلق روایت کرتے ہیں:

رایت عند عبد اللہ بن عمرو کتابا فسئلتہ ما ھذا؟ فقال ھذا الصادقۃ فیھا ما سمعت من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیس بینی وبینہ واسطۃ

(مجلۃ رابطۃ العالم الاسلامی صفحہ ۲ رمضان ۱۳۸۷ھ)

میں نے حضرت عبد اللہ بن عمرو کے پاس ایک کتاب دیکھی میں نے ان سے پوچھا یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا یہ "صادقہ" ہے اور اس میں وہ احادیث ہیں جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بلا واسطہ سُنی ہیں۔

نیز یہی حضرت عبد اللہ بن عمرو سے روایت کرتے ہیں۔

عن عبد اللہ بن عمرو قال ما یرغبنی فی الحیاۃ الا الصادقۃ والوھط فاما الصادقۃ فصحیفۃ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

(مقدمہ تحفۃ الاحوذی ۲)

حضرت عبد اللہ بن عمرو کہتے ہیں مجھے زندگی میں صادقہ اور وہط کے سوا کسی چیز نے ترغیب نہیں دی۔ صادقہ ایک صحیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے

(یعنی اس میں حضورؐ کی احادیث ہیں)

"صادقہ" میں فقہی احادیث درج تھیں (امام ابن تیمیہ۔ فتاوی ابن تیمیہ جلد ۱۸ ص) اور یہ کتاب کافی عرصہ تک آلِ عبداللہ بن عمرو کے پاس رہی اور وہ اس صحیفے سے احادیث بیان کرتے تھے۔ اسی وجہ سے بعض محدثین نے "عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ" کی سند کے متصل ہونے میں کلام کیا ہے۔ مگر جمہور آئمہ حدیث نے عمرو بن شعیب کی حدیث سے احتجاج کیا ہے اور اس کا متصل ہونا تسلیم کیا ہے۔ مثلاً امام مالک بن انس امام سفیان بن عیینہ۔ امام شافعی امام احمد بن حنبل۔ امام اسحٰق ابن راہویہ (اسعاف المبطاء للسیوطی ص۲۳) امام ابن تیمیہ فی فتاواہ جلد ۱۸ ص۱ ان کا کہنا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں لکھی ہوئی حدیث ہم تک پہونچ جائے تو یہ اس کی صحت پر بہترین دلالت ہے۔ صادقہ شاید اب ناپید ہے مگر صادقہ کی تقریباً تمام احادیث متعدد کتب حدیث میں روایت ہو گئی ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ صادقہ کی احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم تک بذریعہ کتابت پہونچی ہیں۔

حضرت ابوہریرہ کی روایت سے جو ہم نے گزشتہ بحث میں نقل کی ہے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوہریرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں احادیث نہیں لکھا کرتے تھے۔ لیکن متعدد روایات میں آیا ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضؓ کے پاس بھی احادیث کا ایک نسخہ موجود تھا شاید انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد لکھنا شروع کیا ہوگا۔ یا حضورؐ سے سنی ہوئی احادیث کسی دوسرے شخص سے لکھوائی ہوں گی۔

عن حسن بن عمرو قال: حدثت عن ابی هریرة بحدیث فانکره فقلت انی سمعته منك قال ان کنت سمعته فانه مکتوب عندی فاخذ بیدی الی بیته فارانا کتبا من کتبه من حدیث رسول الله صلی الله علیه وسلم فوجد ذلك فقال قد اخبرتك انی ان کنت حدثتك فهو مکتوب عندی۔

(مقدمہ تحفۃ الاحوذی۔ مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری)

حسن بن عمرو کہتے ہیں کہ ایک بار میں نے حضرت ابوہریرہ کو ان کی روایت کی ہوئی حدیث سنائی تو انہوں نے اس کا انکار کیا میں نے کہا یہ حدیث تو میں نے آپ ہی سے سنی ہے انہوں نے کہا اگر تو نے مجھ سے سنی ہے تو یہ ضرور میرے پاس لکھی ہوئی موجود ہوگی انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور گھر لے گئے اور حدیث کی کتابوں میں سے ایک کتاب دکھائی اور انہوں نے اس حدیث کو اس کتاب میں موجود پایا کہنے لگے میں نے تم سے کہا تھا کہ اگر میں نے یہ حدیث تمہیں سنائی ہے تو میرے پاس لکھی ہوئی موجود ہوگی۔

عن بشیر بن نهیك قال: کنت اکتب ما اسمع من ابی هریرة فلما اردت ان افارقه اتیته بکتابه فقرأته علیه وقلت له: هذا ما سمعت منك قال نعم

(مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص۱)

بشیر بن نہیک کہتے ہیں کہ میں حضرت ابوہریرہ سے احادیث سن کر لکھ لیا کرتا تھا جب میں نے ان سے جدا ہونے کا ارادہ کیا تو یہ کتاب ان کو سنا دی اور کہا یہ وہ حدیثیں ہیں جو میں نے آپ سے سنی ہیں حضرت ابوہریرہ نے کہا ہاں۔

امام بخاری نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے شاگردوں کی تعداد آٹھ سو بتائی ہے (الاصابہ جلد ا ص۲۰۲)
ا سید ابوالاعلیٰ مودودی ترجمان القرآن کے "منصب رسالت نمبر" میں لکھتے ہیں " ان کے بکثرت شاگردوں نے ان کی
احادیث کو قلمبند کیا ہے" (ص۲۲۱)

حضرت ابوہریرہ کے مشہور شاگرد ہمام بن منبہ (ابو عقبہ ہمام بن منبہ بن کامل الانباری الصنعانی) نے حضرت
ابوہریرہ سے احادیث قلمبند کی ہیں۔ جو تمام کی تمام صحیح ہیں (تہذیب الکمال ص۳۵۲ ۔ مقدمہ ابن الصلاح ص۲۰۴)
ہمام بن منبہ سنہ ۱۳۱ھ میں فوت ہوئے اور ان کی احادیث کا مجموعہ صحیفہ ہمام بن منبہ کے نام سے آج بھی موجود ہے اور
طبع ہو چکا ہے (منصب رسالت نمبر ص۳۲۳) ہمام بن منبہ سے ان کے بھائی وہب بن منبہ اور معمر نے روایت کی ہے
ان کی احادیث صحیح مسلم وغیرہ میں موجود ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس بھی بعض احادیث لکھی ہوئی موجود تھیں جسے وہ اپنی تلوار کے نیام میں رکھا
کرتے تھے ــــ

عن ابی جحیفۃ قال ، قلت لعلی ھل
عندکم کتاب قال : لا الا کتاب اللہ
او فھم اعطیہ رجل مسلم او ما فی
ھذہ الصحیفۃ قال قلت : وما فی
ھذہ الصحیفۃ قال العقل وفکاک
الاسیر ولا یقتل مسلم بکافر ۔
(تحفۃ الاحوذی بحوالہ بخاری ۔ ترمذی ۔ نسائی ابن
ماجہ مسند الامام احمد جلد ۲ ص۳۵ ص۱۹۹ ص۲۱۳)

ابو جحیفہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علیؓ سے پوچھا کہ کیا
آپ کے پاس کوئی کتاب ہے ؟ آپ نے جواب دیا
نہیں سوائے اللہ کی کتاب کے یا اس فہم کے جو ایک
مسلم شخص کو دی جاتی ہے یا سوائے اس کے جو اس صحیفہ میں
موجود ہے میں نے پوچھا اس صحیفہ میں کیا ہے انہوں
نے کہا دیت اور قیدیوں کے فدیہ کے احکام
اور اس میں یہ بھی درج ہے کہ کوئی مسلمان
کافر کے بدلے میں قتل نہ کیا جائے ۔

مسلم اور امام احمد کی دوسری روایت میں ہے ناذا فیھا المدینۃ حرم ۔ اس میں لکھا ہوا ہے کہ مدینہ بھی حرم ہے۔
(مسند امام احمد جلد ۲ ص۴۵ ص۲۲۳)

امام احمد کی ایک اور روایت میں ہے ۔ فیھا فرائض الصدقۃ ۔ اس میں زکوٰۃ کے احکام ہیں ۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ
اس صحیفے کے متعلق امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی جمع کردہ روایات کا استقصاء کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ
نے بہت سی احادیث اس صحیفے میں جمع کر رکھی تھیں ۔ (ملاحظہ ہو مسند الامام احمد بتحقیق احمد محمد شاکر جلد ۲ ۔ ص۳۵ ص۴۵
ص۹۱ ص۲۱۳ ص۲۲۳ ص۱۹۶ ص۲۲۷)

حضرت علی رضہ کے صحیفے کے متعلق روایات میں جو ظاہری طور پر اختلاف نظر آتا ہے ۔ حقیقت میں کوئی اختلاف نہیں ہے ۔
تمام احکام جو ان مختلف روایتوں میں بیان ہوتے ہیں یہ سب کے سب اس صحیفے میں لکھے ہوئے موجود تھے ۔ مگر تمام راوی
تمام احکام یاد نہ رکھ سکے جسے جو کچھ یاد تھا روایت کر دیا ۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت علی رضہ نے مختلف موقعوں پر کسی
ضرورت کی وجہ سے اختصار سے کام لیتے ہوئے کبھی کبھار صرف چند احکام کا ذکر کر دیا اور سننے والوں نے سمجھ لیا
صرف یہی احکام ہیں جو اس صحیفہ میں موجود ہیں ۔ اور راوی نے انہی کو روایت کر دیا۔

عن ابی بکر بن حزم عن ابیہ عن جدہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کتب الی اھل الیمن وکان فی کتاب ان من اعتبط مومنا قتلا فانہ قود یدہ الا ان یرضی اولیاء المقتول وفیہ ان الرجل یقتل بالمرأۃ وفیہ فی النفس الدیہ مائۃ من الابل وعلی اھل الذھب الف دینار۔
(مقدمہ تحفۃ الاحوذی بحوالہ نسائی دارمی)

ابوبکر ابن حزم اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل یمن کو خط لکھا تھا۔ اور خط میں تھا جو کسی مومن کو ظلم کے ساتھ قتل کرے تو اس کے بدلہ میں قتل کر دیا جائے گا۔ الا یہ کہ مقتول کے ورثاء ــــــ راضی ہو جائیں۔ مرد کو عورت کے بدلہ میں قتل کیا جائیگا اس میں لکھا تھا کہ مقتول کی دیت سو اونٹ ہے سونا چاندی کی صورت میں ایک ہزار دینار۔

حضرت انسؓ سے مروی ہے :-

ان ابا بکر کتب لہ ھذا الکتاب لما وجھہ الی البحرین بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ ھذہ فریضۃ الصدقۃ التی فرض رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) علی المسلمین والتی امر اللہ بھا رسولہ فمن سئل من المسلمین علی وجھھا فلیعطھا ومن سئل فوقھا فلا یعط فی اربع و عشرین من الابل فما دونھا من الغنم من کل خمس شاۃ فاذا بلغت خمسا و عشرین الی خمس وثلثین ففیھا بنت مخاض۔
(تحفۃ الاحوذی بحوالہ بخاری مسند امام احمد جلد ۱ صفحہ ۱۸۳)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ نے مجھے بحرین پہ عامل بنا کر بھیجا تو یہ خط لکھ دیا۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم یہ زکوٰۃ کا فریضہ جسے اللہ کے رسول نے فرض کیا اور اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو اس کا حکم دیا پس مسلمانوں میں سے جس سے ٹھیک ٹھیک زکوٰۃ طلب کی جائے تو اس کو چاہئے کہ وہ ادا کرے اگر اس سے زیادہ طلب کی جائے تو (زیادہ) ہرگز نہ دے۔ پس چوبیس اونٹوں تک ہر پانچ اونٹوں پہ ایک بکری۔ جب اونٹوں کی تعداد پچیس ہو جائے تو پینتیس تک ایک جوان اونٹنی۔

اس خط کے متعلق امام احمد بن حنبل علیہ الرحمۃ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ دراصل یہ خط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمال کے لئے لکھوایا تھا، مگر آپ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیق نے اسے عمال کی طرف بھیجا اور اسی پر حضرت ابوبکر صدیق آخر تک عمل کرتے رہے ان کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بھی یہی طریقہ رہا (مسند احمد جلد ۲ صفحہ ۲۸۹ صفحہ ۲۹۰)

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اپنی موطاء میں لکھتے ہیں کہ میں نے صدقہ کے بارے میں حضرت عمر فاروق کا یہ خط پڑھا ہے (ملاحظہ ہو موطاء امام مالک تک مع شرحہ تنویر الحوالک للامام السیوطی الجزء الاول صفحہ ۲۶۵)

صحیح بخاری میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد مسلمانوں کی مردم شماری کروائی تھی اور زکوٰۃ کے احکام لکھنے کا حکم دیا تھا۔ یہ کام دو جلدوں میں مکمل ہوا یہ دونوں جلدیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پھر ابوبکر بن

م کے پاس محفوظ رہیں (مجلہ رابطہ العالم الاسلامی)

ند احمد میں آتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد یمن کے کسی آدمی کا جس کا نام "ابوشاہ" تھا۔
، خطبہ لکھوا کر دیا تھا۔ (مسند امام احمد جلد ۱۲ صفحہ ۲۳۴)

اسماء بنت عمیس کے پاس بھی ایک صحیفہ تھا جس میں انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض اقوال محفوظ
رکھے تھے۔ اسی طرح حضرت سعد بن عبادہ۔ سمرہ بن جندب اور جابر بن عبداللہ رضوان اللہ علیہم کے پاس بھی
لف موجود تھے۔ حضرت جابر بن عبداللہ کے صحیفہ کو قتادہ نے روایت کیا ہے۔

(مجلہ رابطہ العالم الاسلامی رمضان ۱۳۸۶ھ)

عید بن جبیر کہتے ہیں کہ ایک رات میں نے مکہ کے راستے میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے ساتھ سفر کیا حضرت عبداللہ
بن عباس جب کوئی حدیث بیان کرتے تو میں اسے اپنے (اونٹ کے) کجاوہ پر لکھ لیتا صبح کے وقت پھر میں نے اس کو (اپنی کتاب
میں) لکھ لیا۔ (مقدمہ تحفۃ الاحوذی بحوالہ دارمی)

امام ابن شہاب زہری (متوفی ۱۲۴ھ) کا شمار صغار تابعین میں ہوتا ہے ان کے زمانے میں کتابت حدیث کا عام
رواج ہو چکا تھا۔ بے شمار تابعین کے پاس لکھی ہوئی احادیث موجود تھیں۔ خیال رہے یہ سمجھنا ٹھیک نہیں کہ امام زہری کے تدوین
حدیث پر مامور ہونے سے قبل ان کے پاس احادیث لکھی ہوئی نہ تھیں۔ بلکہ امام زہری اپنے طالب علمی کے زمانے ہی سے احادیث
لکھا کرتے تھے۔ اور ان کے احادیث کے بہت سے صحیفے موجود تھے۔

طبرانی صالح بن کیسان سے روایت کرتے ہیں۔

قال: اجتمعت انا والزھری ونحن نطلب
العلم فقلنا نکتب السنن فکتبنا ماجاء عن
النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۔۔۔۔۔۔

ایک دفعہ میں اور زہری ملے اور ہمارا طالب علمی کا زمانہ
تھا۔ ہم نے کہا آؤ سنن نبوی لکھ لیں اور ہم نے جو
بات ہمیں حضورؐ سے پہونچی لکھ لی۔

(البدایہ والنہایہ لابن کثیر جلد ۹ صفحہ ۳۴۵)

ابوبکر بن حزم (ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم) کو بھی حضرت عمر بن عبدالعزیز نے تدوین حدیث پر مامور کیا تھا۔
ان کے پاس جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں پہلے سے حدیث کا ایک صحیفہ موجود تھا۔

حضرت عروہ بن زبیر نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارک پر احادیث جمع کی تھیں (منصب رسالت
بر صفحہ ۳۴۲) حضرت عروہ کے لڑکے حضرت ہشام بن عروۃ اپنے والد سے احادیث لکھا کرتے تھے۔

(ملاحظہ ہو مقدمہ ابن الصلاح صفحہ ۱۶۵)

ن کے بعد حدیث کی تدوین کا باقاعدہ دور شروع ہوا اور لوگوں نے اپنے اپنے شہروں کی احادیث کو باقاعدہ طور پر مدون
رنا شروع کیا چنانچہ :-

امام مالک بن انس نے حجاز کی احادیث کو جمع کیا۔ وفات ۱۷۹ھ
امام اوزاعی نے شام کی احادیث کو مدون کیا۔ وفات ۱۵۶ھ
امام سفیان ثوری نے کوفہ کی احادیث کو مرتب کیا۔ وفات ۱۶۱ھ

امام حماد بن سلمہ بن دینار نے بصرہ کی احادیث کو اکٹھا کیا۔ وفات ۱۶۷ھ

امام ابن جریج نے مکہ میں یہ مقدس کام سرانجام دیا۔ غرض دوسری صدی کے اندر اندر حدیث کا ذخیرہ جو مختلف صحیفوں اور مختلف محدثین حدیث کے سینوں میں تھا۔ انتہائی تعمق اور دقیقہ نظری سے جانچ پڑتال کے بعد باقاعدہ تدوین کے ذریعہ محفوظ کر دیا گیا تھا۔

مندرجہ بالا تاریخی شواہد سے ثابت ہوتا ہے کہ حدیث کی کتابت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک زمانہ سے لے کر عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ تک باقاعدہ تسلسل کے ساتھ موجود رہی ہے۔

جہاں تک حدیث کی داخلی تنقید یا متون حدیث کی جانچ پڑتال کا تعلق ہے تو علم حدیث کا ایک معمولی طالب بھی جانتا ہے کہ حدیث کو پرکھنے کے لئے جس طرح اس کی اسناد پر نظر رکھی جاتی ہے اسی طرح راوی کے ضبط اس کی عدالت مروت اور صداقت کو ضروری خیال کیا جاتا ہے جس طرح حدیث کے متصل یا منقطع اور مرسل یا مسند ہونے کی جانچ پڑتال کی جاتی ہے اسی طرح کسی حدیث کے متن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرتے وقت اس کا خیال رکھا جاتا ہے کہ ایسی بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہ ہو جائے جو فی الواقع حضور نے نہ کہی ہو۔ اصول حدیث کا موضوع ہی یہ ہے کہ ایسی بات جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہو خارجی اور داخلی شہادت کی بنا پر اُسے محقق کیا جائے کہ واقعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کہا یا کیا ہے۔ عزالدین ابن جماعۃ علم حدیث کی تعریف کرتے ہیں۔

علم الحدیث علم بقوانین یُعرف بہا احوال السند والمتن وموضوعہ السند والمتن۔	علم حدیث ایک ایسا علم ہے جس میں کچھ قوانین کے ذریعہ سے سند اور متن کی جانچ پڑتال کی جاتی ہے اور اس کا موضوع سند اور متن ہے۔

(قواعد التحدیث ص۷۵ علامہ جمال الدین القاسمی)

ابن الاکفانی اسی تعریف کو زیادہ واضح طور پر بیان کرتے ہوئے اس کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

علم الحدیث الخاص بالروایۃ علم یشتمل علی نقل اقوال النبی صلی اللہ علیہ وسلم وافعالہ وروایتہا وضبطہا وتحریر الفاظہا وعلم الحدیث الخاص بالدرایۃ علم یعرف منہ حقیقۃ الروایۃ شروطہا وانواعہا واحکامہا۔	علم حدیث جو روایت کے ساتھ مخصوص ہے ایسے علم کو کہتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل کی نقل اس کی روایت ان کے ضبط اور ان کے الفاظ کو تحریر کرنے پر مشتمل ہو، اور علم حدیث جو درایت کے ساتھ مخصوص ہے ایسے علم کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ سے روایت کی حقیقت اس کی شروط اس کی انواع اور اس کے احکام معلوم کئے جاسکیں۔

(قواعد التحدیث ص۷۵)

امام نووی علم حدیث کی تعریف یوں کرتے ہیں:۔ ان المراد من علم الحدیث تحقیق معانی المتون وتحقیق علم الاسناد والمعلل (قواعد التحدیث بحوالہ شرح مسلم للنووی)	علم حدیث سے مراد ہے متون حدیث کے معانی کی تحقیق اور علم اسناد اور معلل کی جانچ پڑتال۔

علم حدیث کی مندرجہ بالا تعریفات سے صاف ظاہر ہے کہ جس طرح روایت حدیث محدثین کا موضوع ہے اسی طرح درایت حدیث سے بھی وہ تعرض کرتے ہیں۔ جب وہ کسی حدیث کو صحیح کہتے ہیں تو وہ متن اور سند دونوں لحاظ سے صحیح ہوتی ہے۔

حدیث صحیح کی مندرجہ ذیل تعریفات سے عیاں ہے کہ متن کا علت و شذوذ سے محفوظ ہونا شرط صحت ہے۔

اما الحدیث الصحیح فھو الحدیث المسند الذی یتصل اسنادہ بنقل العدل الضابط الی منتھاہ ولا یکون شاذا ولا معللاً	اور صحیح حدیث تو وہ اس حدیث کو کہتے ہیں جسے ضابط اور عادل نے بالاتصال اس کے منتہیٰ تک روایت کیا ہو۔ اس میں شذوذ نہ ہو اور نہ وہ معلل ہو۔

(مقدمہ ابن الصلاح ص۱۱)

ائمہ فن نے یہ تعریف کی ہے:۔

الصحیح ما اتصل سندہ بنقل العدل الضابط عن مثلہ وسلم من شذوذ وعلۃ۔	صحیح اس حدیث کو کہتے ہیں جس کی سند متصل ہو اور عادل اور ضابط راوی نے اپنے جیسے راوی سے نقل کیا ہو۔ جو شذوذ اور علت سے محفوظ ہو

(قواعد التحدیث ص۷۹)

امام شوکانی لکھتے ہیں۔

الصحیح من الحدیث ھو ما اتصل اسنادہ بنقل عادل ضابط من غیر شذوذ ولا علۃ قادحۃ۔	صحیح حدیث وہ جسے کوئی عادل وضابط راوی بالاتصال نقل کرے وہ شذوذ اور علت قادحہ سے محفوظ ہو۔

(ارشاد الفحول ص۶۳ امام شوکانی)

روایت کا اتصال راوی کی عدالت مروت اور ضبط یہ تمام اصطلاحات اسناد سے متعلق ہیں۔ مگر علتِ حدیث اور شذوذ کا اطلاق متن کے لحاظ سے ہوتا ہے۔

علامہ نووی کہتے ہیں علت، حدیث میں ایسے خفی معنی سے عبارت ہوتی ہے جو حدیث میں ضعف کا تقاضا کریں اور حدیث ظاہر میں اس علت سے محفوظ نظر آتی ہے۔ ایسی حدیث جس میں کوئی علت قادحہ موجود ہو اسے معلل کہتے ہیں یہ علت کبھی متن میں ہوتی ہے اور کبھی اسناد میں۔

ابوبکر خطیب بغدادی فرماتے ہیں۔

علت حدیث معلوم کرنے کا یہ طریقہ ہے کہ حدیث کے تمام طرق کو جمع کرکے اس کے اختلاف روایت میں غور کیا جاتا ہے تب کہیں علت کے لحاظ سے اس حدیث کا وزن متعین ہوتا ہے۔ امام ابن المدینی کہتے ہیں کہ اگر کسی باب میں تمام طرق کو جمع نہ کیا تو خطا واضح نہیں ہوتی (مقدمہ ابن الصلاح ص۵۲) یہ سب داخلی تنقید ہی تو ہے۔

شذوذ سے یہ مراد نہیں کہ کوئی راوی حدیث روایت کرنے میں متفرد ہو جیسا کہ اس کے لغوی معنی سے متبادر ہوتا ہے۔ بلکہ بقول امام شافعی:

انما الشاذ ان یروی الثقۃ حدیثاً یخالف	شاذ حدیث اس حدیث کو کہتے ہیں کہ ثقہ راوی حدیث

ما رواہ الناس ۔

(مقدمہ ابن الصلاح ص۹)

بیان کرے جو کثیر رواۃ کی روایت کی مخالفت کرے۔

امام شافعی کی مندرجہ بالا تعریف سے معلوم ہوا شاذ حدیث سنداً اگرچہ صحیح ہوتی ہے مگر وہ متن کے نفس مضمون کے لحاظ سے ان تسلیم شدہ روایات کے خلاف ہوتی ہے جن کو زیادہ ثقہ راویوں نے روایت کیا ہے۔ لہٰذا جب کوئی راوی روایت کرنے میں منفرد ہوتا ہے تو متن میں غور کیا جاتا ہے کہ آیا یہ راوی کسی ایسی حدیث کی مخالفت تو نہیں کر رہا جیسے زیادہ ثقہ راویوں نے روایت کیا ہے اگر راوی ایسی حدیث کے مخالف روایت کرے ——— تو اس کی حدیث شاذ کہلائے گی اور رد کر دی جائے گی ۔ اگر اس کی حدیث اپنے سے ثقہ راویوں کی حدیث کی مخالف نہ ہو تو شاذ نہیں کہلائے گی ۔ لہٰذا بالاتفاق محدثین صحت حدیث کے تعین کے لئے عدم شذوذ ضروری ہے کیونکہ تفرد و شذوذ صحت حدیث کے منافی ہے۔

اوپر کی بحث سے معلوم ہوا شذوذ امر خفی ہے متن میں غور و فکر کے بغیر اس کا تعین مشکل ہے لہٰذا احادیث کی جانچ پڑتال کے لئے تنقید داخلی نہایت اہم بلکہ لازم ہے۔

اس کے علاوہ مُدْرَج مقلوب، مضطرب اور موضوع وغیرہ تمام اصطلاحات سند کے علاوہ نفس متن کے ساتھ بھی تعلق رکھتی ہیں۔

مُدْرَج المتن وہ حدیث ہے جس کے متن میں راوی حدیث شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنا کلام اسی طرح شامل کر دے ——— کہ سامع کو گمان ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ہے جیسے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسبغوا الوضوء ویل للاعقاب من النار ۔

(رواہ الخطیب)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وضو اچھی طرح کیا کرو ایڑیوں کے لئے ہلاکت ہے آگ سے۔

اسبغوا الوضوء حضرت ابوہریرہ کا قول ہے راوی سے تسامح ہوا ہے اس نے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام سمجھ لیا۔ صحیح بخاری میں یہ حدیث یوں آئی ہے۔

عن ابی ھریرۃ قال : اسبغوا الوضوء فان ابا القاسم صلی اللہ علیہ وسلم قال ویل للاعقاب من النار ۔

(الباعث الحثیث ص۷۷)

حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں وضوء اچھی طرح کرو کیونکہ ابوالقاسم (فداہ امی وابی) صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایڑیوں کے لئے (ان کے خشک رہ جانے کی وجہ سے) آگ میں ہلاکت ہے۔

حضرت ابوہریرہ مرفوعاً روایت کرتے ہیں ۔

للعبد المملوک اجران والذی نفسی بیدہ لولا الجہاد والحج وبرّ امی لاحببت ان اموت وانا مملوک ۔

(الباعث الحثیث ص۷۷)

غلام بندے کے لئے دو اجر ہیں اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے۔ اگر جہاد۔ حج اور اپنی ماں سے نیکی نہ ہوتی تو میں یہ پسند کرتا کہ میں غلام ہوتا اور مجھے موت آجاتی۔

حضرت ابوہریرہ مرفوعاً روایت کرتے ہیں :-

للعبد المملوک اجران والذی نفسی بیدہ لولا الجہاد والحج وبرّامی لاحببت ان اموت وانا مملوک ۔

غلام بندے کے لئے دو اجر ہیں اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اگر جہاد ۔ حج اور اپنی ماں سے نیکی نہ ہوتی تو میں یہ پسند کرتا کہ میں غلام ہوتا اور مجھے موت آجاتی ۔

(الباعث الحثیث شرح مختصر علوم الحدیث ص۸۵)

حدیث صحیح ہے لیکن " والذی نفسی بیدہ " سے آخر تک حضرت ابوہریرہ کا کلام ہے اور راوی نے غلطی سے اسے حدیث سمجھ لیا ہے ۔ ورنہ حضورؐ کی ماں اس وقت زندہ نہ تھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جو افضل البشر ہیں یہ گمان کرنا محال ہے کہ وہ غلامی کی تمنا رکھتے تھے ۔

بعض دفعہ حدیث کے کسی مشکل لفظ کی وضاحت کرتے ہوئے کوئی فقرہ راوی حدیث بیان کرتے ہوئے اپنی طرف سے کہہ دیتا ہے اور سامع کو گمان گذرتا ہے کہ یہ حدیث کا حصہ ہے ۔ جیسے نسائی کی مشہور حدیث ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ۔

انا زعیم ۔ والزعیم الحمیل ۔ لمن آمن بی واسلم وجاھد فی سبیل اللہ ببیت فی ربض الجنۃ ۔

میں ضامن ہوں ۔ زعیم کہتے ہیں ضامن کو ۔ کہ جو کوئی مجھ پر ایمان لائے اور اسلام قبول کرے اور اللہ کے راستے میں جہاد کرے ۔ جنت کی جگہ میں اس کا گھر ہوگا

" والزعیم الحمیل " راوی (ابن وہب) کی تفسیر ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وضاحت نہیں ہے ۔

مقلوب المتن

روایت کے الفاظ کو اس طرح آگے پیچھے کر دینا کہ حدیث کے معنی تبدیل ہو جائیں جیسے امام مسلم کی روایت ہے جس میں سات ایسے اشخاص کا ذکر ہے جو قیامت کے روز سایہ میں ہوں گے ان میں ایک یہ ہے ۔

رجل تصدق بصدقۃ اخفاھا حتی لا تعلم یمینہ ما تنفق شمالہ ۔

ایک وہ شخص (سایہ میں ہوگا) جو صدقہ کرتا ہے اسے چھپاتا ہے حتی کہ بایاں ہاتھ خرچ کرے تو دائیں ہاتھ کو خبر نہیں ہوتی

حالانکہ خرچ کرنے کے محاورے میں دایاں ہاتھ استعمال ہوتا ہے ۔ اصل حدیث صحیحین میں اس طرح آئی ہے ۔

حتی لا تعلم شمالہ ما تنفق یمینہ

(الباعث الحثیث ص۸۵ لاحمد محمد شاکر)

حتی کہ اس کا دایاں ہاتھ خرچ کرے تو بائیں ہاتھ کو خبر نہیں ہوتی ہے ۔

طبرانی نے حضرت ابوہریرہ سے مرفوعاً نقل کیا ہے ۔

اذا امرتکم بشیٔ فأتوہ واذا نھیتکم عنہ فاجتنبوہ ما استطعتم

جب میں تمہیں کسی چیز کا حکم دوں تو اس کو کرو اور جب اس سے منع کروں تو استطاعت کے مطابق اس سے اجتناب کرو ۔

لیکن صحیحین میں یہ حدیث یوں آئی ہے ۔

ما نھیتکم عنہ فاجتنبوہ وما امرتکم بہ فافعلوا منہ ما استطعتم ۔

(الباعث الحثیث ص۸۵)

میں جس چیز سے تمہیں منع کروں تو اس سے اجتناب کرو اور جس چیز کا حکم دوں تو استطاعت کے مطابق بجا لاؤ

مضطرب المتن اس حدیث کو کہتے ہیں جو بہت سی اسناد سے مروی ہو اور ان تمام روایتوں کے متن آپس میں مختلف ہوں اور ان کی روایت کے لئے کوئی وجہ ترجیح بھی موجود نہ ہو۔ اضطراب بھی حدیث میں ضعف کا موجب ہے۔

اوپر کی تمام انواع کا تعلق داخلی تنقید سے ہے متون حدیث کے عمیق مطالعہ اور اس میں غور و خوض کے بعد ان تمام علل کا پتہ لگایا جاتا ہے اور یہ جہابذہ نقاد کا کام ہے نہ کہ تعلقاً روایت سے عاری لوگوں کا!

حدیث موضوع موضوع احادیث کو پہچاننے کے لئے ائمہ فن نے تنقید کے پیمانے مقرر کئے ہیں انہوں نے اسناد میں جس طرح "جرح و تعدیل" کا فن وضع کیا ہے اسی طرح متن میں بھی وضع کی علامات بتائی ہیں اپنی زندگی متون اور اسناد کے غور و فکر میں صرف کردی۔ حتیٰ کہ انہیں صحیح و سقیم اور موضوع کی معرفت حاصل ہوگئی اگرچہ یہ فن اکتسابی ہے مگر ہر ایک شخص اس سے بہرہ مند نہیں ہو سکتا۔ بقول امام ابن قیم "۔

"۔ جو حدیث کے مطالعہ میں اس کی معرفت حاصل کرنے کے لئے ہر وقت مستغرق رہتا ہے۔ سنن اس کے دل اور دماغ کا وظیفہ بن جاتی ہیں۔ تو اس کو آثار و سنن کی معرفت کا ملکہ حاصل ہو جاتا ہے اس کی نگاہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے اور سیرت پر ہوتی ہے۔ کہ کس چیز سے آپ نے منع فرمایا اور کس چیز کا آپ نے حکم دیا۔ آپؐ کی پسند کیا تھی اور کن چیزوں سے آپؐ نفرت کرتے تھے۔ تو اس کی مثال ایسی ہو جاتی ہے جیسے وہ آپ کی اتباع کا بھی حریص ہے آپ کی طرف منسوب باتوں کی صحت و سقم کو جاننے کے لئے مستعد نظر آتا ہے۔ بھلا دوسروں میں یہ ملکہ کیسے پیدا ہو سکتا ہے جن میں یہ صفات نہیں ہیں (بحوالہ موضوعات کبیر ملا علی قاری)

اور بقول مولانا سید ابوالاعلیٰ المودودی کے ایسا شخص مزاج شناس رسول ہوتا ہے (او کما قال) امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں۔

القلب المعمور بالتقویٰ اذا رجح	جب تقویٰ سے معمور دل مجرد رائے ہی سے کسی کو ترجیح
بمجرد رأیه فهو ترجیح شرعی۔	دے تو یہ ترجیح شرعی ہے۔

ربیع بن خثیم تابعی فرماتے ہیں۔

ان للحدیث ضوءاً کضوء النهار یعرف (صحیح) حدیث میں دن کی سی روشنی ہوتی ہے جس کی وجہ سے پہچان لی جاتی ہے وظلمة کظلمة اللیل تنکر اور (موضوع) حدیث میں رات کی سی سیاہی ہوتی ہے جس کی وجہ سے رد کردی جاتی ہے۔

(قواعد التحدیث ص۱۶۵)

امام ابن الجوزی کہتے ہیں۔

الحدیث المنکر یقشعر منه جلد الطالب	منکر حدیث سے طالب حدیث کا جسم کانپ اٹھتا ہے اور
وینفر منه قلبه	اس سے اس کا دل نفرت کرتا ہے۔ (قواعد التحدیث ص۱۶۵)

شارع کے الفاظ سے کثرت ممارست کی وجہ سے محدث شارع کے اسلوب کلام کو جانتا ہے اور اس کسوٹی پر شارع کی طرف منسوب باتوں کی صحت و سقم کو پہچان لیتا ہے۔

لیکن اس کے باوجود اہل فن نے موضوع حدیث کی جانچ پرکھ کے لئے چند اصول مقرر کئے ہیں ہم انہیں یہاں اختصاراً

ساتھ بیان کرتے ہیں تاکہ مستشرقین اور ان کے مقلدین کے دعویٰ کی حقیقت معلوم ہو جائے کہ محدثین (رضوان اللہ علیہم) تنقید داخلی کے ملکہ سے عاری تھے۔ اس لئے احادیث بلحاظ درایت پرکھی نہیں جا سکیں۔

حدیث صحیح کی شرائط بلحاظ درایت

۱۔ حدیث موجبات عقل کے خلاف نہ ہو۔

۲۔ حس اور مشاہدہ کے مخالف نہ ہو۔

۳۔ قرآن اور سنت متواترہ کی نص یا اس کی قطعی دلالت کے منافی نہ ہو۔

۴۔ اجماع قطعی کے خلاف نہ ہو۔

۵۔ وہ حدیث جو جمّ غفیر میں بیان کی گئی ہو۔ قرینہ کثرتِ روایات کا تقاضا کرے لیکن ایک راوی کے سوا اور کوئی نہ نقل نہ کرے تو یہ موضوع ہوگی۔

۶۔ حدیث میں معمولی کوتاہی پہ شدید وعید کی خبر نہ ہو۔

۷۔ یا معمولی کام کے لئے عظیم ثواب کا وعدہ نہ ہو۔

۸۔ حدیث میں رکیک الفاظ مستعمل نہ ہوں (جن سے عقل سلیم ابا کرے کہ یہ شارع کا کلام ہو سکتا ہے)

(ملاحظہ ہو۔ نخبۃ الفکر حافظ ابن حجر۔ اللمع ابو اسحاق شیرازی۔ قواعد التحدیث۔ الباعث الحثیث وغیرہ)

یہ وہ اصول اور اصطلاحات ہیں جو تنقید داخلی میں مستعمل ہیں۔ جن کو اہل فن نے درایت حدیث میں مدنظر رکھا ہے۔ اس تفصیل سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ احادیث رسولؐ کی کتابت کا آغاز عہد رسالت ہی سے شروع ہو چکا تھا جو نفوس قدسیہ حاملین قرآن تھے۔ انہی (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) نے احادیث کو لکھا، یاد رکھا دوسروں تک پہنچایا اور ان پہ دین میں حجت سمجھ کر عمل کیا۔

ائمہ فن حدیث نے احادیث رسول کی صحت معلوم کرنے کے لئے جو محنت شاقہ برداشت کی ہے وہ انہی کا حصہ ہے دنیا میں کسی انسان کے اقوال کی جانچ پڑتال کے لئے کسی دور میں بھی اتنی کیا اس سے لاکھوں حصہ کم بھی کوشش نہیں کی گئی۔

جس شخص نے سنت رسولؐ کے حجت ہونے سے انکار کر کے اُسے محض تاریخ سمجھا، اُس نے منصب نبوت سے انکار کیا سنت رسولؐ دین میں حجت ہے۔ دین کا ستون ہے اور شریعت کا ماخذ ہے، کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ دوش بدوش حق کی راہ میں رہنمائی کا فریضہ انجام دیتی ہیں!

——— بقیہ (رحمانی کی نظر میں) ———

ملت مراد ہے یعنی حضور کی وفات کے بعد "اطاعت رسولؐ ساقط ہو گئی" ——— اس کفریہ عقیدہ سے اگر میر صاحب نے توبہ نہ کی تو اپنے تمام نیک اعمال اور مفکرانہ خیالات کے باوجود اُن کا خاتمہ ایمان پر نہیں ہوگا! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ٹھیک اسی طرح منصوص اور فرض ہے، جس طرح حضور کی حیات میں تھی! اور حضورؐ کی یہ اطاعت قیامت تک باقی اور نافذ رہے گی۔

افسوس ہے کہ مسلمانوں کے بعض ذہین افراد "حریت فکر" کے نام پر دین کے مسلمات ہی کی بیخ کنی کئے دے رہے ہیں، اور اپنی اس گمراہی کی ہمت سے داد بھی چاہتے ہیں۔

ملّا واحدی

سماع

آپ پتھر پر لوہے کی ہتھوڑی ماریئے، پتھر سے آگ نکلے گی۔ اتنی آگ کہ جنگل کے جنگل جلا کر بھسم کر دے۔ یہی حال انسان کے دل کا ہے اس پر بھی چوٹ پڑتی ہے تو خالی نہیں جاتی۔ انسانی دل پر چوٹ لگانے والی چیزوں میں ایک چیز خوش گلوئی اور موزوں و مناسب ترنم بھی ہے۔ انسانی دل میں آگ چھپی ہوتی ہے، وہ خوش گلوئی اور ترنم سے بھڑکتی ہے۔ یا انسان کا عالم ارواح سے اُس کے عجائبات کے ساتھ جو تعلق ہے وہ تعلق حرکت میں آجاتا ہے۔ حسن و جمال اور خوش گلوئی عالم ارواح کے عجائبات سے مشابہ ہیں۔ عام انسان نہیں سمجھتا کہ ہو کیا رہا ہے، لیکن اہلِ محبت محسوس کر لیتے ہیں کہ پھونک مار کر کسی نے محبت کی آگ بھڑکا دی۔

حضرت امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سماع ان کے لئے جن کے دل میں اللہ کی محبت نہ ہو بلکہ غیر اللہ کی محبت ہو حرام ہے، لیکن جن کے دل میں اللہ کی محبت ہو۔ اُن کے لئے سماع ضروری ہے تاکہ اللہ کی محبت تیز تر ہو جائے۔

علماء کے ایک گروہ نے سماع کو قطعاً حرام قرار دیا ہے۔ اللہ کی محبت کے معنی اُن کی رائے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں ہیں کہ اس کے احکام کی تعمیل کرو۔ اور بس وہ کہتے ہیں کہ محبت تو انسان صرف اپنی جنس سے کر سکتا ہے۔ اللہ سے نہیں کر سکتا۔ اللہ انسان کا ہم جنس نہیں ہے۔

دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ اس کا فیصلہ دل سے کرانا چاہئے۔ دل پر سماع کا بُرا اثر پڑتا ہے تو بے شک سماع حرام ہے، لیکن اچھا اثر پڑے تو صرف حلال نہیں، بعض حضرات کے واسطے ضروری ہے۔

جنس اور غیر جنس کی بحث چھوڑیئے۔ جن کے دل میں اللہ کی محبت نہیں ہے وہ گانا ہرگز نہ سنیں۔ لیکن اگر گانا کسی کو خلاف شرع حرکات کرنے پر آمادہ نہیں کرتا تو پھر گانا سننا جائز ہے اور گانا موافق شرع اعمال کرنے کی آمادگی بڑھائے تو گانا سننا ضروری ہے۔

یہ سب حضرت امام غزالی کے خیالات ہیں۔ گویا سماع اُس کیفیت کو اُبھارتا ہے جس کا دل میں پہلے سے مادہ ہوتا ہے اللہ کے عشق و محبت کو بھڑکانے کے لئے گانا سننا دوسرے گروہ کے نزدیک بھی حرام ہے۔

حضرت امام غزالی نے سماع کی تین قسمیں کی ہیں۔ ایک وہ سماع، جو تماشے اور کھیل کے طور پر سنا جائے۔ حضرت امام غزالی فرماتے ہیں کہ تماشا اور کھیل ناجائز جب ہے جب اُس میں ضرر کا امکان ہو۔ ناک خوشبوئیں سونگھ سکتی ہے، دماغ عقل و حکمت کی باتوں سے لطف لے سکتا ہے۔ زبان لذیذ کھانے کھا سکتی ہے۔ آنکھیں آبِ رواں اور گل و شگوفہ کا نظارہ کر سکتی ہیں تو کانوں نے کون سا قصور کیا ہے جو انہیں لذت سے محروم رکھا جائے۔ حضرت امام غزالی فرماتے ہیں، تماشا اور

کھیل محض دل بہلانے کی غرض سے دیکھنا مباح ہے تو گانا بھی محض دل بہلانے کی غرض سے سننا مباح ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں :- "عید کے دن میرے گھر کے سامنے حبشی کھیل تماشے دکھا رہے تھے۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے پوچھا تم دیکھنا چاہتی ہو ، میں نے کہا ، ہاں ۔ حضور (صلعم) دروازے کے کھڑے ہو گئے اور میرے ساتھ خود بھی دیکھتے رہے۔ بار بار پوچھتے ضرور تھے کہ دیکھ چکیں یا اور دیکھو گی ۔ مگر جب تک میں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ نہیں فرمایا کہ دیکھنا ختم کرو۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی کی ایک اور روایت ہے کہ "عید کے دن دو کنیزیں میرے ہاں دف بجا رہی تھیں اور گا رہی تھیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو کنیزوں کی طرف پشت کرکے لیٹ گئے ۔ (حضور نے گانے سے کوئی دلچسپی نہیں لی) اتنے میں ابوبکر رضی اللہ عنہ آ پہونچے ۔ انہوں نے کنیزوں کو ڈانٹا کہ رسول اللہ کے گھر میں یہ کیا ۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " ان سے ذکر و آج عید ہے " یعنی خوشی کے مواقع پر گانا بجانا کرلیا جائے تو مضائقہ نہیں ہے ۔ گانے بجانے کی طرف حضور متوجہ نہیں ، مگر گانے بجانے کی آواز حضور کے کانوں میں بہرحال جا رہی تھی اور حبشیوں کے کھیل تماشے کے وقت حضور علیہ الصلوٰۃ کی آنکھیں بھی اُدھر تھیں ، البتہ کھیل تماشے کے طور پر گانے بجانے کو اوڑھنا بچھونا بنا لینے کا جواز کہیں نہیں ملتا ۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے روکنے سے تو معلوم ہوتا ہے کہ سماع بڑی احتیاط کی چیز ہے اور صرف اُن ہی کے لئے ضروری ہے جن کو ضرورت مند ہوں ۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے درجے کے بزرگ سماع کے محتاج نہیں تھے ۔

دوسری قسم سماع کی سب کے نزدیک مذموم ہے اور وہ یہ ہے کہ عورت یا لڑکے سے محبت ہو اور اُس کی موجودگی میں لطف کی نیت سے گانا سنا جائے ، یا محبوب موجود نہ ہو ، محبوب کی یاد کو دوبالا کرنے کے لئے سماع کی محفل جمائی جائے ۔ اشعار زلف و رخسار و جمال کے اذکار ہوں اور سننے والا محبوب کا تصور باندھے تو ایسا سماع حرام قطعی ہے ۔ محبت باطل کی آگ تو واجب ہے نہ کہ اُسے مشتعل کیا جائے ۔ ہاں بیوی کی محبت ہو یا شوہر کی محبت ہو اور یہ محبت سماع سے ترقی کرے تو مباح ہے ۔ دنیا کی اور بے شمار چیزوں سے متمتع ہوا جاتا ہے ایک یہ بھی سہی ۔

تیسری قسم سماع کی حضرت امام غزالی کے بیان کے مطابق وہ ہے جس سے اچھے اعمال کرنے کی آمادگی بڑھتی ہے اور نیک اوصاف ترقی پاتے ہیں ۔ اس قسم کے سماع کے حضرت امام غزالی نے چار درجے بتائے ہیں ۔ (۱) حاجی حج کے راستے میں یا حج کو جنتے یا خانہ کعبہ پہونچنے وقت ذوق و شوق میں اشعار گائیں یا کوئی شخص حج کرنے نہ جا سکے اور بے تاب ہو کر خانہ کعبہ کی یاد میں اشعار گائے یا جہاد کے وقت مجاہد رجزیہ اشعار خوش الحانی سے پڑھیں ۔ (۲) رقت اور گریہ لانے کے لئے اشعار گائے جائیں ۔ گناہوں کو کرکے رونا اور اللہ رسول کی محبت میں رونا نعمت ہے ۔ البتہ عزیزوں اور دوستوں کے مرنے پر گریہ کرنا اور گریہ لانے والے اشعار منع ہے ۔ قضائے الٰہی سے اندوہگیں ہونا خراب بات ہے ۔ اللہ کا حکم ہے لِکَیْلَا تَأْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ ، جو مر گیا اُس پر صبر کرو (۳) شادی بیاہ ، ولیمہ ، عقیقہ ، ختنہ ، بچے کی پیدائش ، سفر سے واپسی وغیرہ تمام مسنون تقریبات میں گانا سنا جا سکتا ہے ۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکے سے ہجرت کرکے مدینے میں داخل ہوئے تو مدینے کے مسلمان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے دف بجاتے چل رہے تھے ، اور یہ اشعار گا رہے تھے :

" طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَیْنَا (الخ) "

عید کے دن کے گانے کا ذکر پہلے آ چکا ہے ۔ دو دوست مل کر بیٹھیں ، کھانا کھائیں اور ساتھ کے ساتھ سماع سے بھی ایک

ے کو نوش کرنا چاہیں تو جائز ہے۔

چوتھی قسم کا سماع صرف مباح نہیں، ضروری ہے۔ جس کے دل میں اللہ کی محبت نے گھر کر لیا ہو تو اُسے گانا ضرور
چاہیے۔ صوفیائے عظام کا سماع چوتھی ہی قسم کا تھا۔ سماع اچھائی اور بُرائی دونوں کو اُبھارتا ہے جو جیسی نیت سے
نے گا اُسے ویسا پھل ملے گا۔ حضرت امام غزالی فرماتے ہیں کہ صوفیا میں ایسے بزرگ گزرے ہیں کہ حالت سماع میں انہیں
ت مل جاتی تھی جو بغیر سماع کے اُن کے خواب و خیال میں نہیں آتی تھی۔ سماع میں صوفیا کو مکاشفے ہوتے تھے اور عجیب و
کیف حاصل ہوتا تھا۔ اُن کے وجد کی کیفیت کا عوام تصور نہیں کر سکتے۔ جس طرح چاندی آگ میں تپانے سے نکھر جاتی
ہے اسی طرح سماع سے صوفیا کے قلوب مصفیٰ ہو جاتے تھے۔ دل کی کدورتیں دُھل جاتی تھیں۔ بڑی بڑی ریاضتیں کام
نہیں کر سکتیں جیسا کہ ابتدائے مضمون میں کہا گیا ہے کہ روحِ انسانی کو عالم ارواح سے بڑی مناسبت ہے۔ سماع
مناسبت کو حرکت میں لاتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات روح اِس عالم سے بالکل بے خبر ہو جاتی ہے اُسے اس عالم کی مطلق
میں رہتی۔

علی حلاجؒ شیخ ابوالقاسم گرگانیؒ کے مرید تھے۔ انہوں نے شیخ سے گانا سُننے کی اجازت مانگی۔ شیخ نے کہا، تین دن
ل فاقہ کرو اور چوتھے دن دسترخوان پر عمدہ عمدہ کھانے چنوائو۔ مگر انہیں کھاؤ نہیں۔ دسترخوان سے اُٹھ جاؤ اور سماع میں
ل ہو جاؤ، اگر یہ کر سکو تو سماع کی تمہیں اجازت ہے۔۔۔۔۔ سماع تمہارے لئے حلال ہے لیکن دل پر کیفیات کی فقط جھلکی
ہے اور خواہشات کا بُت ٹوٹا نہیں ہے تو پیر، مرید کو سماع کی اجازت نہیں دے سکتا۔ مضمون ہذا کے ایک ابتدائی فقرے
کر لیجئے کہ اس کا فیصلہ دل سے کرانا چاہیے کہ دل پر سماع کا اچھا اثر پڑے گا یا بُرا۔

حضرت امام غزالی فرماتے ہیں: "جو صاحبان سماع و وجد کے خلاف ہیں، انہیں ہم الزام نہیں دیتے۔ جس شے سے
سابقہ ہی نہیں پڑا، اُسے اُن کے قلوب کیونکر مان لیں **عورتوں سے اور حسین امرد لڑکوں سے گانا سُننے کو ہم بھی
سمجھتے ہیں**۔ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی محبت میں غرق ہو تب بھی وہ عورت اور حسین امرد لڑکے سے گانا نہیں سُن سکتا۔
کے لئے حسین ہونے کی قید نہیں ہے۔ نامحرم عورت خوب صورت ہو یا بدصورت اُسے دیکھنا حرام ہے۔ کجا اُس سے گانا سُننا
زوں کے ساتھ گانا سُننے کی اجازت حضرت امام غزالی نہیں دیتے۔ یہ استثنائے طبل و شاہین و دف۔ سازوں کے ساتھ
تو صوفیوں نے چند صدیوں سے شروع کیا ہے۔ حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے سامنے حضرت
سرود تک سازوں کے ساتھ نہیں گا سکتے تھے۔ حضرت امیر خسرو سازوں کے شوقین تھے۔ مگر حضرت سلطان المشائخ کے
نے بغیر سازوں کے گاتے تھے۔

یہ بھی واضح رہے کہ فقط اچھی قسم کے اشعار سُنے جا سکتے ہیں، بے ہودہ، فحش اور ہجویہ اشعار کا تو کہنا بھی گناہ ہے
مضمون کے لکھنے اور پڑھنے اور سننے کی اجازت نہ نثر میں ہے اور نہ نظم میں۔

سماع میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ شعر کا مضمون کچھ ہے اور سُننے والے کا ذہن اُسے کہیں کا کہیں لے جاتا ہے؛ لہٰذا
العمر لوگوں کو سماع سے بچنا ہی مناسب ہے۔ جوانی میں عشق کے معنی عموماً عشقِ مجازی ہوتے ہیں، سماع کا معاملہ بڑا
ہے۔

سماع میں تین باتوں کا خیال رکھنا چاہیے ایک یہ کہ حاضرینِ مجلس ہم مشرب ہوں، دوسرے یہ کہ نماز کا وقت نہ ہو۔

تیسرے یہ کہ سماع کے لئے ایسی جگہ بیٹھا جائے جہاں کامل سکون اور اطمینان ہو۔

سماع کے وقت ایک دوسرے سے باتیں نہیں کیا کرتے بلکہ ایک دوسرے کی طرف نظر بھی نہیں اٹھاتے۔ گردن جھکا کر دوزانو مؤدب بیٹھتے ہیں۔ اور اللہ تبارک وتعالیٰ سے لو لگاتے ہیں اور منتظر رہتے ہیں کہ اللہ کب کچھ عنایت فرماتا ہے۔ وجد کے معنی ہیں "پایا" سماع میں جو وجد آتا ہے اُسے وجد اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ کوئی شے ملتی ہے، کوئی شے پائی جاتی ہے کسی کیفیت کا انکشاف ہوتا ہے۔ وجد آنے پر انسان اگر ضبط نہیں کر سکتا اور اپنے اوپر قابو نہیں رکھ سکتا اور مستانہ وار کھڑا ہو جاتا ہے تو حاضرین بھی کھڑے ہو جاتے ہیں۔ حضرت امام غزالی کے نزدیک یہ بدعت ہے لیکن ایسی بدعت جس سے شریعت کو ٹھیس نہیں لگتی۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ہر شخص کے ساتھ اس کی عادت اور خو کے مطابق زندگی بسر کرو۔ صحابہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کو کھڑے نہیں ہوتے تھے، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ تعظیم نہیں کرانی چاہتے تھے، لیکن جہاں کھڑے ہونے سے کسی کا جی خوش ہو وہاں کھڑا ہو جانا ارشاد مذکورہ بالا کی رُو سے مستحسن ہے اعرب اور عجم کی عادتیں یکساں نہیں ہیں۔

[illegible] ۱۔ جناب ملا واحدی صاحب نے بڑے متوازن انداز میں مسئلہ "سماع" پر گفتگو کی ہے، صوفیائے کرام کے سماع سے جو کوئی دورِ حاضر کے مزامیر و غنا کی اباحت پر دلیل لاتا ہے وہ ہوائے نفس میں مبتلا ہے، عورتوں کا گانا بجانا اور نامحرم مردوں کو سنانا نہ صرف لہو ولعب ہے بلکہ قطعاً حرام ہے اور اس قسم کے رقص وسرود پر منکر و فحشاء کا اطلاق ہوتا ہے۔ آج کل کی عام موسیقی، فلمی گانے اور کلمات نا تحریم کی حد تک مکروہ اور دینی نقطۂ نگاہ سے ناپسندیدہ ہیں۔

عرس اور نیاز و فاتحہ کی محفلوں میں جو قوالیاں ان دنوں گائی جاتی ہیں اُن میں مشرکانہ مضامین کی بھی آمیزش ہوتی ہے اور جو ساز اور آلاتِ طرب یہ قوال استعمال کرتے ہیں اُن سے ہوائے نفس کو غذا ملتی ہے!

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے "سماع" پر اپنے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ ذوق وشوق اور وجد وکیف کی بات ہے جو کسی شرعی مسئلہ کی بنیاد نہیں بن سکتی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین کے یہاں "سماع" کی محفلوں کا وجود نہیں ملتا، اور تفسیر، حدیث اور فقہ کے ائمہ بھی "سماع" نہیں سنتے تھے، طریقت کے سلاسل میں نقشبندی اور مجددی سلسلوں میں "سماع" کی اجازت نہیں ہے، بعض صوفیاء نے بھی مزامیر کے ساتھ سماع کو پسند نہیں کیا! "سماع" کی بھی کچھ شرطیں اور حدود ہیں!

خوش الحانی، اچھی آواز اور شعر خوانی اسلام میں ممنوع نہیں ہے، مگر مزامیر کے ساتھ "غنا" کا معاملہ خوش الحانی کے ساتھ شعر پڑھنے سے مختلف ہے، باجے اور راگ راگنی کی اسلام میں ممانعت آئی ہے اور اسلام جسے ممنوع کہتا ہے وہ سبب خیر نہیں ہو سکتا! خوشی کے موقعوں پر ہلکے قسم کی موسیقی کے لئے اباحت کی (غالباً) گنجائش نکل سکتی ہے، مگر اس اباحت کو شرعی حدود کا پابند ہونا ضروری ہے

ہمارے نام

کوئٹہ ۳۱ راکتوبر۔

مکرمی و محترمی مولانا صاحب۔ السلام علیکم۔ آپ عام طور پر اپنے موقر جریدہ "فاران" میں کتابوں پر تبصرہ کرتے وقت زبان اور محاورے کی غلطیوں کی نشان دہی کرتے رہتے ہیں۔ یہ ایک مفید سلسلہ ہے، لیکن بہتر ہو گی اگر آپ خود اپنی زبان کی اصلاح کی طرف بھی توجہ دیں۔ اس وقت میرے پیش نظر آپ کا وہ "نقش اول" ہے جو اگست کے پرچے میں شائع ہوا ہے۔ مجھے اس میں جو غلطیاں نظر آئی ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ "ایر پورٹ پر دو صاحبان موٹر کار لیے ہوئے موجود تھے"۔

"دو صاحبان" کی بجائے "دو صاحب" ہونا چاہیے۔ کیا آپ اس قسم کے فقروں کو صحیح قرار دیں گے کہ "دو طبیبان مطب میں موجود تھے، میز پر دو قلمدان رکھے تھے، وغیرہ ؟

۲۔ "اس کی خلاقی اور ربوبیت کے طفیل میں آدمی ایجاد و اختراع کے معجزے دکھا رہا ہے۔"

"طفیل" کے بعد "میں" کی کوئی ضرورت نہیں۔ مولانا حالی، مسدس کے حاشیے میں لکھتے ہیں "وہ لوگ جن کے کام اوروں کے طفیل چلتے ہوں"۔ (نسخہ مطبوعہ تاج کمپنی، صفحہ ۱۲۰)

۳۔ "انسان اپنی زندگی کے بارے میں ہر خطرے کے اندیشے سے فکر مند ہو ہی جاتا ہے"۔

خطرے اور اندیشے میں کیا فرق ہے ؟ (سوائے اس کے کہ خطرہ عربی ہے اور اندیشہ فارسی)

۴۔ "پاکستانی ایرویز پاکستان اور اسلام کا دنیا کے سامنے اچھا تعارف کراتی"۔

"دنیا کے سامنے" کے بجائے "دنیا سے" ہونا چاہیے۔

۵۔ "اس کوٹھی کا رقبہ ڈھائی تین ہزار گز سے کیا کم ہوگا"۔

"ڈھائی تین ہزار گز" کسی جگہ کا طول یا عرض تو ہو سکتا ہے، رقبہ نہیں ہو سکتا۔ "ڈھائی تین ہزار مربع گز" کہیے۔

۶۔ "شب میں جلسہ ہوا"

شب کے بعد "میں" غلط ہے۔ "کو" ہونا چاہیے۔ نور اللغات میں ہے کہ بعض فصحا اس لفظ کے بعد "کو" حذف کرتے ہیں [1]

۷۔ انھوں نے . . . . سوشلزم کے نقائص کو بتایا"

---

[1] غالب فرماتے ہیں۔ شب کو اُن کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں۔

"نقائص بتائے" یا "بیان کئے" ہونا چاہئے۔

۸۔ اُردو زبان سب سے زیادہ کمسن زبان ہے۔

"سے" حرفِ مقابلہ ہے۔ اس کے بعد "زیادہ" لکھنا حشو محض ہے۔

۹۔ "اگر اپنے لوگ ہی غداری نہ کرتے، تو ہندوستان کی تاریخ کچھ اور ہوتی"۔

کلمۂ حصر "ہی" "اپنے" کے بعد آنا چاہئے، یعنی، اپنے ہی لوگ۔

۱۰۔ لالچ نے دین وملت کی تاریخ کو ہمیشہ خطرناک موڑ دیے ہیں۔

"......... کو خطرناک موڑ دیے" اردو روزمرہ کے خلاف ہے۔

۱۱۔ حضرت سید احمد شہید اور حضرت علامہ شاہ اسمٰعیل شہید رحمہم اللہ تعالیٰ" الخ "رحمہم" کے بجائے "رحمہما" ہونا چاہئے

۱۲۔ "نظم ونسق کی خرابی اور ناانصافی کا ازالہ اور سدِّباب ہونا چاہئے تھا"۔

سابقۂ نفی "نا" ہمیشہ صفات سے قبل آتا ہے، جیسے نامناسب، ناجائز، نالائق وغیرہ اور سابقۂ نفی "بے" اسماء سے آتا ہے، جیسے بےعقل، بےوقوف، بےحیا، بےدرد، وغیرہ۔ "ناانصافی" کے بجائے "بےانصافی" ہونا چاہئے۔

۱۳۔ "شمشاد قامت اور سرو قد اونچے درختوں کی مسلسل قطاریں" الخ شمشاد قامت اور "سرو قد" لکھنے کے بعد "اونچے" کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے؟ کیا قد وقامت میں بلندی کا تصور نہیں پایا جاتا؟

۱۴۔ "ہم دل سے یہ کہ تحریک پاکستان تک ہر آزادی کی تحریک اور تنظیم کو اردو زبان نے پروان چڑھایا ہے"۔

"ہر آزادی کی تحریک" کے بجائے "آزادی کی ہر تحریک" ہونا چاہئے۔

۱۵۔ "یہ عصبیت وبا اور متعدی مرض کی طرح پھیلتی چلی گئی"۔

"وبا" کے بعد "متعدی مرض" لکھنا کلام کو ترقی سے تنزل کی طرف لے جانے کے مترادف ہے۔

۱۶۔ "اسلام کا معاشی نظام سوشلزم سے زیادہ بہتر ہے"۔

حرفِ مقابلہ "سے" کے بعد "زیادہ" کی ضرورت نہیں۔ اس کے علاوہ خود "بہتر" میں بھی زیادہ کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

۱۷۔ تحریک پاکستان کے زمانے میں جس طرح متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں میں اخوت، وحدت اور محبت پائی جاتی تھی علاقائی ورانی نقطۂ نگاہ سے وہ سوچتے ہی نہ تھے۔

"جس طرح" کی جزا غائب ہے!

کیا آپ ازراہِ کرم اس خط کو اپنے موقر رسالہ میں شائع کرکے، مذکورہ اعتراضات کا جواب عطا کریں گے؟ اگر یہ ممکن نہ ہو تو براہِ راست ہی جواب دینے کی تکلیف فرمائیں۔ جس کے لئے میں آپ کا شکر گزار ہونگا۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال سلمان انفرمیشن آفس، کوئٹہ

جواب :— ہم نے "فاران" میں بار بار اس کا اعتراف کیا ہے کہ ہم جو دوسروں کی تحریروں پر نقد و احتساب کرتے ہیں اور زبان وبیان کی غلطیاں پکڑتے ہیں اور اہلِ قلم کے ادبی وعلمی تسامحات کی نشان دہی کرتے ہیں —— اس احتیاط کے باوجود خود ہم سے بھی غلطیاں ہوجاتی ہیں، سہو وخطا سے کوئی انسان محفوظ نہیں، بڑے سے بڑے ادیب وشاعر نے اظہار وبیان کی وادی میں

ہٹو کریں کہانی میں نومبر ۶۸ء کے شمارے میں ہمارے مضمون — روحِ رواں — میں یہ شعر —

پیر پیمانہ کش ما کہ روانش خوش باد
گفت پرہیز کن از صحبتِ پیماں شکناں

مرزا غالب سے منسوب ہوگیا ۔ بعض احباب نے اس تسامح پہ گرفت کی اور بتایا کہ یہ شعر حافظ شیرازی کا ہے، دیوانِ حافظ دیکھا تو پتہ چلا کہ ہمارے تسامح پہ صحیح گرفت کی گئی ! خدا وہ دن نہ دکھائے جب ہم اپنی غلطی کے اعتراف میں ہچکچاہٹ محسوس کریں، اپنی بات کی پچ کے لئے غلط قسم کی باتیں تراشیں !

نقد و احتساب کا معاملہ بڑا ہی نازک ہے ، یہ عادت کہ سرسری طور پہ کسی کے کلام یا مضمون میں کوئی کوتاہی نظر آئی ، تحقیق و تامل کے بغیر جھٹ سے اعتراض جڑ دیا معترض کو پشیمان کرتی ہے ! بعض اوقات خود ہی غور و فکر کرنے سے اعتراض رفع ہو جاتا ہے، اس کے بعد کتابیں دیکھنے اور اہلِ علم سے پوچھنے کا نمبر آتا ہے ۔ اس جد و جہد کے بعد " اعتراض " اور نقد و احتساب کو قابلِ اعتماد وزن حاصل ہوتا ہے [1]

وہ جو قرآنِ کریم میں آیا ہے کہ " تمہیں علم تو دیا گیا ہے مگر قلیل " — تو جب کسی لفظ، خیال، مفہوم اور واقعہ کی تحقیق کی جاتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ ہم سامنے کے الفاظ اور معمولی معمولی باتوں سے کس قدر بے خبر تھے ، کسی انسان کا علم بھی تمام کمال جزئیات و تفاصیل کو محیط نہیں ہے، کوئی انسان اس کا دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس کا علم کامل ہوگیا ، اب اس میں مزید اضافہ کی گنجائش نہیں ہے — " ربِّ زدنی علماً " یہ اہلِ کمال کی دعا، تمنا اور اعتراف ہونا چاہئے !

اس تمہید کے بعد اب ہم صاحبِ مکتوب کے اعتراضات اور ان کے جوابات پیش کرتے ہیں ۔

۱ — " ایئرپورٹ پہ دو صاحبان موٹر کار لئے ہوئے موجود تھے " " دو صاحبان کی بجائے " دو صاحب ہونا چاہئے، کیا آپ اس قسم کے فقروں کو صحیح قرار دیں گے کہ دو طبیبان موجود تھے، میز پہ دو قلمان رکھے تھے ۔ وغیرہ "

گزارش ۱ — " دو صاحب آئے یا دو صاحبان آئے " — دو صاحب موجود تھے یا دو صاحبان موجود تھے " ۔ اردو میں دونوں طرح لکھتے اور بولتے ہیں ! " صاحب " کا قیاس " طبیب " اور " قلم " پہ نہیں کرنا چاہئے : اردو میں " طبیب " کی جمع " طبیبان " نہیں بولی جاتی ، ہاں اضافت کے ساتھ بولی جاتی ہے — طبیبانِ شہر — " قلم " کی جگہ " قلمان " اردو روزمرہ کے اعتبار سے غلط ہے ! اردو میں " شہر کے اطبا " بولا جاتا ہے " شہر کے طبیبان " نہیں بولا جاتا ۔

اردو میں عربی اور سنسکرت کی طرح " تثنیہ " نہیں ہے، یعنی دو کے عدد کے لئے بھی جمع ہی استعمال کی جاتی ہے — مثلاً —

---

[1] اردو ترقی بورڈ تقریباً گیارہ سال سے لغت کی ترتیب و تدوین کا کام انجام دے رہا ہے شعبہ لغت کے رکن جناب نسیم امروہوی جن کو شعر و ادب اور علم و فضل دونوں میں ملے ہیں، ان سے تبادلہ خیال ہوا، تو پتہ چلا کہ ایک ایک لفظ کی تحقیق میں کتنی کاوش کرنی ہے اور یہ کام کس قدر صبر آزما ہے ۔ مثلاً فرہنگِ آصفیہ میں " دیکھنا " کے آٹھ معنیٰ اور نور اللغات میں اٹھارہ معنیٰ دئے ہیں مگر اردو ترقی بورڈ کی تحقیق و جستجو کی بدولت اب تک اس لفظ (دیکھنا) کے بتیس (۳۲) معانی آچکے ہیں ۔ گزارش کا مقصود یہ ہے کہ زبان کے مختلف لفظوں کی تحقیق کے لئے خاصی محنت کرنی چاہئے اور اعتراض و تنقید میں تو اور زیادہ تحقیق کی ضرورت ہے !

"... کمشنر اور ڈپٹی کمشنر صاحبان دونوں نے یہ حکم دیا"

مزید وضاحت ـــــ "دو شاعر آئے تھے" بولتے ہیں "دو شاعران" نہیں بولتے، لیکن شاعر کے ساتھ "صاحب" بھی لگانا ہو تو یوں بولیں گے ـــــ "دو شاعر صاحبان آئے تھے"!

صاحبان، پر "طلبیان" اور "قلماں" کا قیاس کرنا ہی غلط ہے!

۲ـ "اُس کی خلّاقی اور ربوبیت کے **طفیل میں** آدمی ایجاد و اختراع کے معجزے دکھارہا ہے"۔

"طفیل" کے بعد "میں" کی کوئی ضرورت نہیں، مولانا حالی مسدس کے حاشیے میں لکھتے ہیں "وہ لوگ جن کے کام اوروں کے طفیل چلتے ہوں"۔ (نسخہ مطبوعہ تاج کمپنی ص ۱۴)

گزارش: ـ اردو میں شعراء نے اکثر و بیشتر "طفیل" ہی نظم کیا ہے "میں" کے بغیر! مگر "طفیل" کے ساتھ "میں" بھی نہیں "سے" بھی استعمال ہوا ہے، میر انیس فرماتے ہیں ـــ

؎ نوروں میں ابتری تھی علیؑ کے طفیل سے (مراثی انیس جلد اول ص ۲۲۴)

امیر مینائی لکھتے ہیں ـــ "تمہارے جد کے طفیل سے مجھ گنہگار کا خاتمہ بخیر ہو" (مکاتیب امیر مینائی ص ۲۳)

"طفیل میں" کی مثالیں ـــ

- ـــ "جس کا لطف ان پڑھ ہندو ہاماؤں کے طفیل میں روزمرہ اٹھاتے ہیں" (مضامین چکبست ص ۲۶۵)
- ـــ "آپ کے طفیل میں شامت آئی، نہ ادھر کا رہا نہ اُدھر کا رہا" (خدائی فوجدار جلد اول ص ۱۶ سرشار)

نسیم امروہوی کے مرثیہ کی بیت ہے ـــ

وان تھے تمہاری جان کے لالے پڑے ہوئے
اس طفل کے طفیل میں اتنے بڑے ہوئے (مراثی نسیم، جلد اول)

راقم الحروف نے جو "طفیل میں" لکھا ہے وہ غلط نہیں ہے، ایسے مواقع پر "طفیل" کے ساتھ "میں" لانے سے صوتیات میں زور پیدا ہوجاتا

۳ـ "انسان اپنی زندگی کے بارے میں ہر خطرے کے اندیشے سے فکرمند ہو ہی جاتا ہے" خطرے اور اندیشے میں کیا فرق ہے (سوائے اس کے کہ خطرہ عربی ہے اور اندیشہ فارسی)

گزارش: ـ "اندیشہ" کے معنی "خطرہ" کے علاوہ ـــــ "سوچ، فکر اور خیال" (فرہنگ آصفیہ جلد اول صفحہ ۲۴۴) کے بھی

"بہادر لوگ خطروں میں کود پڑتے ہیں"

یہ اردو روزمرہ ہے۔ مگر یوں کوئی نہیں بولتا۔

"بہادر لوگ اندیشوں میں کود پڑتے ہیں"

اس سے "خطرہ" اور "اندیشہ" کے معنی کا فرق واضح ہوتا ہے ـــ "خطرے" کے ساتھ "اندیشہ" لانے سے مفہوم میں قوت پیدا ہو جاتی ہے اور خطرے کی "شدت" میں اضافہ ہوجاتا ہے۔

۴ـ "پاکستانی ایرینہ پاکستان اور اسلام کا دنیا کے سامنے اچھا تعارف کرائی"۔ "دنیا کے سامنے" کے بجائے "دنیا" سے ہونا چاہئے۔

گزارش: ـ تعارف کے ساتھ "سامنے" نہیں "سے" ہی بولا جاتا ہے یوں ـــ

"اُس نے اپنے بھائی سے میرا تعارف کرایا"

...یوں عام طور پر نہیں بولتے :—

"اُس نے اپنے اعلیٰ افسر کے سامنے میرا تعارف کرایا"

...اگر یوں بولیں گے تو اُس کا مفہوم یہ لیا جائے گا کہ اُس شخص نے اعلیٰ افسر ہی سے نہیں بلکہ دوسروں سے بھی جو وہاں موجود تھے، اعلیٰ افسر کے روبرو یا اُس کی موجودگی میں میرا تعارف کرایا ——— اس مفہوم کے پیش نظر راقم الحروف نے اپنے جملہ میں "دنیا کے سامنے" جو لکھا ہے ...اقرب" نہیں بلکہ "قریب من الصحت" ہے !

میں اپنے اس جملہ کے بارے میں جس پر مکتوب نگار نے اعتراض وارد کیا ہے، اہل نظر، اہل زبان اور ارباب فن کے ذوق و وجدان سے رہنمائی چاہتا ہوں (بعض ممتاز شعراء سے میں نے دریافت کیا تو انہوں نے میرے جملہ میں "سامنے" کے استعمال کو درست بتایا)

۵ — "اس کوٹھی کا رقبہ ڈھائی تین ہزار گز سے کیا کم ہوگا"

"ڈھائی تین ہزار گز" کسی جگہ کا طول یا عرض تو ہو سکتا ہے رقبہ نہیں ہو سکتا، ڈھائی تین ہزار مربع گز" کہیے۔

گزارش :— "مربع" نہ لکھنے سے کوئی غلطی یا کوتاہی واقع نہیں ہوتی عام طور پر یوں بولتے ہیں —

"عرب میں ہزاروں میل کا رقبہ، بے آب و گیاہ ہے"

رقبہ کے ساتھ مربع تو بولا اور لکھا ہی جاتا ہے مگر جہاں کہیں "رقبہ" استعمال کرتے ہوئے، تنہا میل یا کوس (بغیر مربع) بولا جاتا ہے تو اُس سے "مربع" ہی مراد ہوتی ہے — اور اس میں "مربع" محذوف ہوتا ہے۔

۶ — "شب میں جلسہ ہوا"

شب کے بعد "میں" غلط ہے "کو" ہونا چاہیے، نور اللغات میں ہے کہ فصحا اس لفظ کے بعد "کو" حذف کرتے ہیں (غالبؔ فرماتے ہیں :— شب کو اُن کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں)

گزارش :— "شب میں جلسہ ہوا" اور "شب کو جلسہ ہوا" دونوں صحیح ہیں ! بعض جملوں میں تو "کو" کے بجائے "میں" ہی بولا جاتا ہے،

"اندھیری رات میں چوروں کی بن آتی ہے"

یہاں "کو" بولنا غلط ہے۔

"دن" اور "شب" (رات) کی ایک ہی صورت ہے، نور اللغات میں دن کے ساتھ "میں" اور "کو" دونوں کی مثالیں دی گئی ہیں۔

"دن کو تارے نظر آنا" (جلد دوم۔ صفحہ ۷۶۳)

"دن میں تارے نظر آنے لگنا" (جلد دوم صفحہ ۷۶۴)

۷ — "انہوں نے . . . . سوشلزم کے نقائص کو بتایا"

"نقائص بتائے" یا "بیان کئے" ہونا چاہیے۔

گزارش :— "کو" کا استعمال میرے جملہ میں غلط نہیں ہوا، اس طرح بھی بولتے ہیں :—

● ——— "اسلم نے کاپی کو پھاڑ دیا" اور

● ——— "اسلم نے کاپی پھاڑ دی"

● — "انہوں نے روپیوں کو ٹھکرا دیا"

اور

● — "انہوں نے روپے ٹھکرا دئے"

● — "انہوں نے روپیوں کو گن کر اپنی تسلی کر لی"

اور

● — "انہوں نے روپے گن کر اپنی تسلی کر لی"

● — "وکیل نے استغاثہ کی شہادتوں کو غلط ثابت کر دیا"

اور

● — "وکیل نے استغاثہ کی شہادتیں غلط ثابت کر دیں"

فاضل مکتوب نگار نے جملہ کی جو ترکیب (نقائص بتائے) لکھی ہے، وہ فصیح تر ہے۔

۸ — "اردو زبان سب سے زیادہ کمسن زبان ہے"

"سے حرف مقابلہ ہے، اس کے بعد "زیادہ" لکھنا حشو محض ہے۔

گزارش :— اس جملہ میں "زیادہ" حشو نہیں ہے، کیا عام طور پر یوں نہیں بولا جاتا۔

"یہ لڑکا تمام لڑکوں سے زیادہ شریر ہے"

"یہ قوال تمام گانے والوں سے زیادہ سُریلا ہے"

۹ — "اگر اپنے لوگ ہی غداری نہ کرتے، تو ہندوستان کی تاریخ کچھ اور ہوتی"

کلمۂ حصر "ہی" اپنے کے بعد آنا چاہئے یعنی "اپنے ہی لوگ"

گزارش :— دونوں طرح بولتے اور لکھتے ہیں — یوں :—

"تمہارا بھائی ہی جب تمہارا دشمن ہو گیا"

اور

"تمہارا ہی بھائی جب تمہارا دشمن ہو گیا"

مکتوب نگار کے اس قسم کے اکثر اعتراضات یک رُخے ہیں، انہوں نے لفظوں اور جملوں کے تمام پہلوؤں پر شاید غور نہیں کیا۔

۱۰ — "لالچ نے دین و ملت کی تاریخ کو ہمیشہ خطرناک موڑ دئے ہیں"

..... کو خطرناک موڑ دئے ہیں۔ اردو روزمرہ کے خلاف ہے۔

گزارش :— اس میں اردو روزمرہ کے خلاف ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تو "انداز بیان" ہے جس میں زبان و روزمرہ کی کوئی غلطی نہیں ہے۔ اس طرح اگر احتساب کیا جائے، تو زبان و ادب کے بہت بڑے سرمایہ سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔

مثلاً :— غالب کے اس مصرعہ پر —

موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

اسی قسم کا اعتراض وارد ہو سکتا ہے کہ یہ "روزمرہ کے خلاف ہے" کیوں خلاف ہے؟ اس لئے کہ غالب سے پہلے کسی نے "موجِ خرام" سے

گل کرنے کا مفہوم پیدا نہیں کیا تھا ــــ مکتوب نگار کا شعر و ادب اور زبان و روزمرہ کے بارے میں یہ زاویہ نگاہ حیرت انگیز ہے

۱۱ــ حضرت سید احمد شہید اور حضرت علامہ شاہ اسمٰعیل شہید رحمہم اللہ تعالیٰ ــ "رحمہم" کے بجائے "رحمہما" ہونا چاہئے۔

گزارش :ــ یہ کتابت کی غلطی ہے جس کا تجربہ "فاران" کی کتابت کے سلسلہ میں بیس سال سے ہو رہا ہے کہ "رضی اللہ عنہما" کی بجائے "رضی اللہ عنہ"، "رحمہما" کی جگہ "رحمہم"، "علیہما" کی بجائے "علیہ" کتابت ہو جاتا ہے اور کاپیاں پڑھتے ہیں بھی بعض اوقات اس غلطی کی تصحیح ہونے سے رہ جاتی ہے! یہ بات راقم الحروف کو انشاپردازی کے آغاز ہی سے معلوم ہے کہ "تثنیہ" کے لئے عربی میں "ھما" اور جمع کے لئے "ھم" آتا ہے۔

۱۲ــ نظم و نسق کی خرابی اور ناانصافی کا ازالہ اور سد باب ہونا چاہئے۔ سابقہ نفی "نا" ہمیشہ صفات سے قبل آتا ہے، جیسے نامناسب، ناجائز، نالائق وغیرہ اور سابقہ نفی "بے" اسماء سے قبل آتا ہے جیسے بے عقل، بے وقوف، بے حیا، بے درد وغیرہ "ناانصافی" کے بجائے "بے انصافی" ہونا چاہئے۔

گزارش :ــ "نالائق" کیا اردو روزمرہ نہیں ہے؟ اور مکتوب نگار کے بتائے ہوئے قاعدے کے مطابق "بے لائق" بولا جائے تو زبان، روزمرہ پر اس ظلم کو کون صاحب ذوق گوارا کر سکتا ہے۔ خود فارسی میں "ناتوانی" بولتے ہیں "بے توانی" نہیں بولتے۔ ناداری، ناہمواری، ناشکیبائی، نااہلی، نابالغی، ناپاکی، ناپسندیدگی، ناپائیداری، ناچاری، ناچاقی، ناحق شناسی، ناخوشی، ناراضی، نارسائی، ناسمجھ یہاں تک کہ ناسمجھی بھی بولا اور لکھا جاتا ہے۔ نور اللغات میں "ناانصافی" کے معنی دیئے گئے ہیں اور اس ترکیب کو غلط نہیں بتایا گیا۔

۱۳ــ "شمشاد قامت" اور سرو قد اونچے درختوں کی قطاریں۔"

شمشاد قامت اور سرو قد لکھنے کے بعد "اونچے" لکھنے کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے کیا قد و قامت میں بلندی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

گزارش :ــ کیا آپ نے سرو و شمشاد کو دیکھا ہے؟ اور پہاڑی درخت (شاہ بلوط، چیڑ، دیودار) بھی دیکھے ہیں۔ سرو قد اور شمشاد قامت کہہ دینے سے ان سو سو ڈیڑھ ڈیڑھ سو فٹ اونچے پیڑوں کی لمبائی کا اظہار کہاں ہو سکتا ہے! میں نے پہاڑی درختوں کو سرو اور "شمشاد قامت" ان کی رشاقت کے سبب کہا ہے، یعنی وہ ٹیڑھے ترچھے نہیں ہوتے سرو و شمشاد کی مانند سیدھے (STRAIGHT) اور خوش اندام ہوتے ہیں اسلئے "سرو قد" اور "شمشاد قامت" کہہ کر "اونچے" کہنا پڑا۔

۱۴ــ ہیوم رول سے لے کر تحریک پاکستان تک ہر آزادی کی تحریک و تنظیم کو اردو زبان نے پروان چڑھایا ہے۔

"ہر آزادی کی تحریک" کے بجائے "آزادی کی ہر تحریک" ہونا چاہئے۔

گزارش :ــ گرفت مناسب ہے ــ شکریہ! لیکن "ہر آزادی" سے ہر قسم کی آزادی ــ یعنی سیاسی، مذہبی، اقتصادی، سماجی آزادی مراد لی جائے تو یہ اعتراض بھی قابل غور ہو جاتا ہے، بلکہ ہلکا نظر آتا ہے۔

۱۵ــ "یہ عصبیت وبا اور متعدی مرض کی طرح پھیلتی گئی"

"وبا" کے بعد "متعدی مرض" لکھنا کلام کو ترقی سے تنزل کی طرف لے جانے کے مترادف ہے۔

گزارش :ــ اردو میں "روپیہ پیسہ" بولتے ہیں "پیسہ روپیہ" نہیں بولتے، حالانکہ فاضل ناقد نے بلاغت کا جو اصول بیان کیا ہے اس کے اعتبار سے "پیسہ روپیہ" بولنا چاہئے۔

- ایک دن چاند، سورج اور ستارے بے نور ہو جائیں گے ۔
- شہر میں بغاوت اور لاقانونیت کا دور دورہ تھا ۔
- ملک میں ڈاکہ اور چوری کی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں ۔
- بادشاہ، جاگیردار، اور زمیندار سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں ۔

اردو میں اس طرح بولنے اور لکھنے کا عام چلن ہے، ان جملوں میں یہ بات نہیں کھٹکتی کہ کلام میں ترقی کے بعد تنزل پیدا ہوا ۔ ان جملوں پر راقم الحروف کی معترضہ عبارت کا قیاس کیا جا سکتا ہے ۔

۱۶ ۔ "اسلام کا معاشی نظام سوشلزم سے زیادہ بہتر ہے"

حرف مقابلہ "سے" کے بعد "زیادہ" کی کوئی ضرورت نہیں، اس کے علاوہ خود "بہتر" میں بھی زیادہ کا مفہوم پایا جاتا ہے ۔

گزارش :۔ اردو میں اس طرح بولنے کا عام رواج ہے، زور دینے کے لئے "بہتر"، "کمتر" وغیرہ کے بعد "زیادہ" بھی بولتے اور ہیں یہاں تک کہ "زیادہ تر" بھی بولا جاتا ہے ۔

۱۷ ۔ "تحریک پاکستان کے زمانے میں جس طرح متحدہ ہند ۔۔ ان کے مسلمانوں میں اخوت، وحدت، اور محبت پائی جاتی تھی، علاقائی اور صوبائی نقطۂ نگاہ سے ۔ سوچتے ہی نہ تھے ۔"

"جس طرح" کی جزا غائب ہے ۔

گزارش :۔ "جس طرح" کے ساتھ ہر جملہ میں جزا کا لانا لازمی نہیں ہے، اس کا انحصار جملہ کی ترکیب، ترتیب اور مفہوم پر ہے ۔

اس خط سے بعض معترضین اور ناقدین کے انداز فکر اور لسانی معلومات کا اندازہ ہو سکتا ہے ۔

(ماہرالقادری)
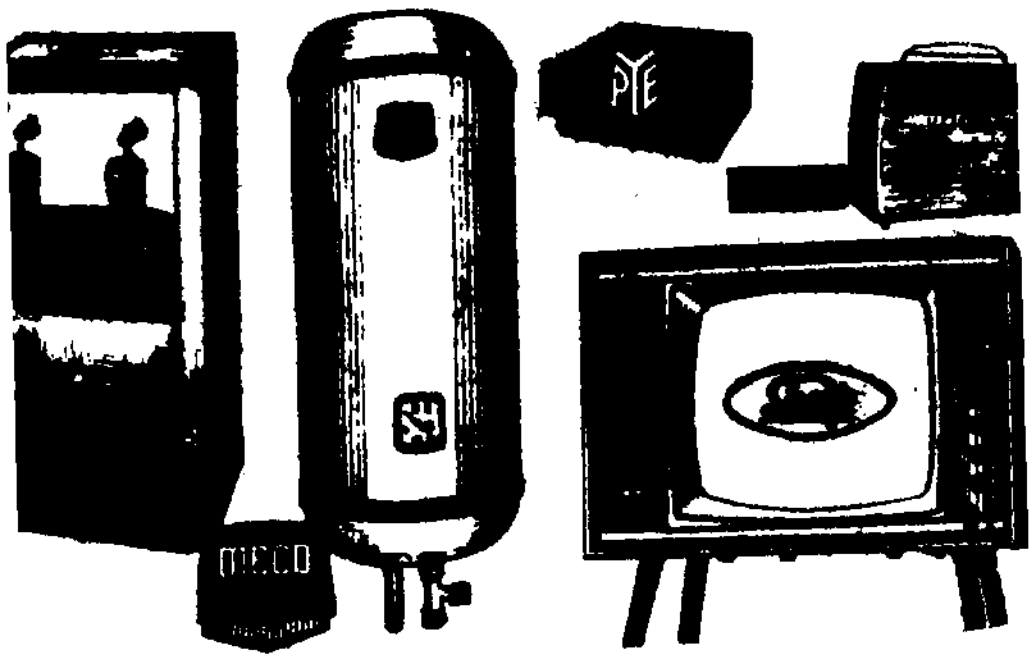
غالب

کلام، تصوف، فلسفہ

(آخری قسط)

مولانا محمد مصطفےٰ

ش۴۶ رنگِ تمکین گل و لالہ پریشاں کیوں ہے ــــ گر چراغانِ سرِ رہگذرِ باد نہیں ؟

حوادث و تغیرات زوال سے انسان تو انسان نباتات بھی محفوظ نہیں، گل و لالہ اگر استعارہ ہے اہلِ کمال سے تو بھی مطلب صاف ہے کہ مشیتِ الٰہی سب پہ کار فرما ہے، جو آج پیدا ہے وہ کل ناپید ہے۔

یہ مضمون دوسرے مقام پہاں طرح ہے ؎

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہرِ گردوں ہے چراغِ رہ گزارِ بادِ یاں

ش۴۷ قیدِ ہستی سے رہائی معلوم ــــ اشک کو بے سر و پا باندھتے ہیں

اشک باوجود بے سر و پا ہونے کے بندھ جاتا ہے یعنی قید میں آ جاتا ہے، انسان بھی باوجود ہستی مستعار کے قیدِ ہستی میں ہے اور رہے گا، یہ بھی اس سے رہا نہیں ہو سکتا ایک انگریزی شاعر کہتا ہے۔

Life is real life is earnest,
And the grave is not its goal,
"Dust thou art, to dust retunest,"
Was not spoken of the soul. ے

ش۴۸ کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل ــــ انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

پیالہ و ساغر کی بھی قسمت میں گردش ہے لیکن وہ گھبراتا نہیں، کیونکہ اس کے پاس دل نہیں، ایک میں ہوں کہ ؎

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں

انسان ہو اور ہمیشہ گردش میں رہے، کب تک نہ گھبرا جائے۔ اسی واسطے چاہتا ہے کہ اس صورت میں تو " اپنی محفل ہی کا پیمانہ بنایا ہوتا "

۴۹ رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج　　مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

خیام نیشاپوری کی زبان سے اس کا مطلب سنئے:-

درماں طلبی، درد تو افزوں گردد　　با درد بساز تا ہیچ درماں مطلب

۵۰ ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے　　دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

مرزا کے شاگرد رشید مولانا حالی کا شعر سن کر محاکمہ کیجئے:-

چھوٹے ہوتے ہیں گو جی، پر دل بندھے ہوئے ہیں　　ملنے سے بھی سوا ہے چھٹنا محال تیرا

۵۱ جب وہ جمال دلفروز صورت مہر نیمروز　　آپ ہی ہو نظارہ سوز پردہ میں منہ چھپائے کیوں

محبوب حقیقی کی شان تو کہیں ارفع ہے، آفتاب ہی کو دیکھ لو کہ جب نصف النہار ہوتا ہے تو کوئی آنکھ بھر کے دیکھے تو بامرہ سوخت ہو جائے، اس لئے کہ سکتے ہیں کہ شدت ظہور باعث خفا ہوتی ہے۔

اسی طرح جمال یار ہر گل و خار، ہر در و دیوار سے عیاں ہے، لیکن چونکہ وہ اظہر و اجلی ہے اس لئے بصارت اس کے ادراک سے قاصر ہے اور یہ شدت ظہور باعث بطون ہے ہو الظاہر ہو الباطن،

ہاں! وہ محبوب نہیں کہ پردہ میں منہ چھپائے، وہ محتجب ہے ردائے کبریا میں، جلّت عظمتہٗ بصارت اس سے محروم، بصیرت اُس سے روشن۔

۵۲ کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی　　آئینہ داربن گئی حیرت نقش پا کہ یوں

کوئے یار میں نقش پا کی طرح رہنا چاہئے، خاک نشیں اور حیرت زدہ، مقربان الٰہی متواضع اور حیرت زدہ رہتے ہیں اس کوچہ کی دیواریں سرکشوں کی سرکوبی کرتی ہیں۔

حافظ　　اے کہ از کوچۂ محبوبۂ ما می گذری　　با خبر باش کہ سر می شکند دیوارش

۵۳ حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرم تماشا ہو　　کہ چشم تنگ شاید کثرت نظارہ سے وا ہو

حسد معاریف پہ ہوتا ہے، مجاہیل پہ نہیں، اپنے یاروں پہ ہوتا ہے، اغیار پہ نہیں، حسد میں انقباض کی کیفیت ہوتی ہے جسے دل افسردہ کہا ہے (فارسی میں افسردگی اور سردی سے برائی اور نقص کا مطلب ادا ہوتا ہے اور گرمی سے خوبی کا مثلاً سرو بازاری، گرم بازاری) شعر میں حسد کا علاج بتایا گیا ہے کہ چشم تنگ جس کو محسود کی خوبی پسند نہیں آتی اس کو وا کردو، یعنی کائنات کا خوب مطالعہ اور مشاہدہ کرو تو دیکھو گے کہ ہر انسان، ہر حیوان، بلکہ ہر شجر و حجر کو بھی فیاض مطلق سے کچھ نہ کچھ خاص فیض حاصل ہے حتیٰ کہ حاسد بھی اس سے محروم نہیں، پس اس صورت میں افسردہ دلی دور ہو جائے گی اور سرگرمی و خلوص کامل سے معطی حقیقی کا شکریہ ادا ہوگا۔

۵۴ طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ　　دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

اخلاص کا تقاضا یہ ہے کہ طاعت الٰہی محض رضائے الٰہی کے لئے ہو نہ جنت کی نہروں کی طمع کی وجہ سے نہ دوزخ کے شعلوں کے خوف کے سبب سے اور یہ یوں بھی صحیح ہے کہ دوزخ و بہشت سب ماسوا میں داخل ہیں اور طالب مرضاۃ اللہ کی نظر تو محض اللہ پر ہے غیر پر نہیں[1] (مخلصین لہ الدین - قرآن)

---

[1] جنت محل فضل الٰہی ہے اس لئے اس کی طمع کرنی چاہئے اور دوزخ محل قہر الٰہی ہے اس لئے اُس سے بچنے کی کوشش کرنی چاہئے (م۔ق)

۵۵ ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال — ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

خلوت سے اگر کچھ نفع ہے تو اسی واسطے کہ یکسوئی و حضورِ قلب حاصل ہوتا ہے لیکن خلوت میں بھی اگر خیالات کی ہنگامہ آرائی ہے تو اس خلوت سے کیا خاک نفع ہوگا، اصل یہ ہے کہ دل بیار دست بکار پر عامل ہو جاؤ تو خلوت در انجمن حاصل ہو جاتی ہے۔

۵۶ وارستگی بہانۂ بیگانگی نہیں — اپنے سے کر نہ غیر سے وحشت ہی کیوں نہ ہو

ترک دنیا کے معنی یہ نہیں ہیں کہ حقوق العباد کا خیال نہ رکھا جائے ہاں اپنے حظوظِ نفس کا چھوڑنا لازم ہے اور اس کا نتیجہ س

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو — آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

۵۷ نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا — رہا کھٹکا نہ چوری کا، دعا دیتا ہوں رہزن کو

فقر و بے سر و سامانی میں بھی کوئی نہ کوئی پہلو خوبی و راحت کا نکلتا ہے، دن کو لٹ گیا تو رات کو خوب سویا، مال و دولت کا کوئی اندیشہ نہ رہا "ان مع العسر یسراً ان مع العسر یسراً"

۵۸ کسی کو دے کے دل کوئی نواسنجِ فغاں کیوں ہو — نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

یعنی عاشق بے دل کو بے زباں ہو جانا چاہئے، شکوہ و شکایت یا داد و فریاد شانِ عشق کے منافی ہے۔

من عرف اللہ کلّ لسانہ،

۵۹ یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ — کہ جب دل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

یعنی طالبِ صادق سے حجاب! عجیب بات ہے، دیدارِ یار کے لئے حسنِ طلب ہے،

۶۰ صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اُٹھائیے — طاقت کہاں کہ دید کا احساں اُٹھائیے

حق تعالیٰ کے جمالِ کمال اور کمالِ جمال کو دیکھنے کی طاقت کسے ہے؟ یرجع البصر خاسئاً وھو حسیر (قرآن)

۶۱ ہے سنگ پر براتِ معاشِ جنونِ عشق — یعنی ہنوز منتِ طفلاں اُٹھائیے

میں لڑکپن سے سنا کرتا تھا کہ براتِ عاشقاں بر شاخِ آہو، یعنی عشاق کے حصے میں محرومی ہے اور خصوصاً معاش سے مرزا نے اس غریب گروہ کے لئے ایک غذا ضرور بتائی ہے یعنی پتھر کھانا اور اس لئے لڑکوں کا احسان اُٹھانا،

جس طرح مجانینِ عشق لڑکوں کے ہاتھ سے پتھر کھاتے ہیں اسی طرح عشاقِ الٰہی بھی بعض اہلِ ظاہر کے ہاتھوں جو بمنزلۂ طفلِ مکتب سنگِ ملامت کا نشانہ بنائے جاتے ہیں وہ نابالغ لڑکے ایک حد تک عدمِ شعور کی وجہ سے اتنے خطاوار نہیں جتنے یہ صاحب بزرگ مدعیانِ علم وعمل ہیں۔

۶۲ ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا — ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہئے

لالہ اور گلاب اور سیوتی اگرچہ مختلف رنگ و بو کے ہوتے ہیں لیکن ہیں سب مظہرِ بہار، اسی طرح سے

حسنِ ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے — انساں میں وہ سخن ہے، غنچے میں وہ چٹک ہے

۶۳ سر پائے خم پہ چاہئے ہنگامِ بے خودی — رو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہئے

اہل اللہ ہمہ وقت با خدا رہتے ہیں، سُکر ہو تو اور صحو ہو تو ہر حال میں اُن کا قبلۂ توجہات وہی ذاتِ واحد ہے۔

۶۴ نشوونما ہے اصل سے غالبؔ فروع کو — خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہئے

پہلا مصرع کلیہ ہے یعنی اصل اور دوسرا جزئیہ ہے یعنی فرع، اصل سے فرع کو نشوونما حاصل ہوتی ہے اور خاموشی اصل

لئے کہ مقدم ہے اور غور و خوض کا محل بھی ہے اور بات یعنی گفتگو فرع ہے اس لئے کہ موخر ہے اور غور و خوض سے پیدا ہوتی ہے، پس ثابت ہوا کہ جس قدر خاموشی ہوگی اور غور و خوض اسی قدر گفتگو کو فروغ ہوگا۔

۲۶۵　خیالِ مرگ کب تسکیں دلِ آزردہ کو بخشے　　　مرے دامِ تمنا میں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی

موت کی تمنا تو ہے لیکن اس سے بھی چنداں تسکینِ قلب نہیں ہوتی کیونکہ ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے　　　مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

اور ؎　قصۂ کتابِ عمر کا کیا مختصر ہوا　　　رنج داستانِ غم کا اِدھر سے اُدھر ہوا

۲۶۶　مئے عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجے　　　لئے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

۱+۲+۴ ۵ ۷، اہلِ تنجیم حوادث و وقائعِ عالم کو گردوں کی جانب منسوب کرتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ خاص خاص تدابیر سے نحست کا ستارہ گردش میں نہ آنے پائے، اور آگیا ہے تو نحوست سعادت سے بدل جائے،

مرزا اس عقیدے کی تردید کرتے ہیں کہ آسمانوں کے پاس ہے ہی کیا، بس سات پیالے اور وہ بھی اوندھے، اس لئے خالی۔ مئے عشرت جب خود نہیں رکھتے تو دوسرے کو کیا دیں گے، ان کی اور اُن کے ستاروں کی گردش، عروج کے بعد ہبوط، کمال کے بعد زوال، خمسۂ متحیرہ کا تحیر، وغیرہ دلیل ہے اُن کی عاجزی کی ؎

سیرِ سپہر و دورِ قمر را چہ اختیار　　　در گردش اند بر حسبِ اختیارِ دوست　　　(حافظؔ)

۲۶۷　ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے　　　پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

خالق : کائنات :: آفتاب : ذرہ (یعنی حیاتِ عالم وابستہ ہے حق تعالیٰ کی ربوبیت اور شانِ قیومیت سے)

۲۶۸　حالانکہ ہے یہ سیلیِ خارا سے لالہ رنگ　　　غافل کو میرے شیشے پہ مے کا گمان ہے

شیشۂ دل کو تو خارا نے خونیں بنا دیا ہے، غافل یہ سمجھتا ہے کہ شراب لعلیں سے بھرا ہوا ہے، غمِ دنیا، غمِ عقبیٰ اور غمِ مولیٰ ان سب میں فرق ہے، خواہ بادی النظر میں کسی کسی کو دھوکا ہو جائے،

۲۶۹　کیجئے بیاں سرورِ تپِ غم کہاں تک　　　ہر مو مرے بدن پہ زبانِ سپاس ہے

مقامِ رضا کا بیان ہے جب دل راضی تو زبان بھی شاکر اور سرِ بن مو بھی ذاکر،

افادتکم النعماء منی ثلاثۃ　　　یدی ولسانی والضمیر المحجبا

۲۷۰　گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے　　　خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

بعض اہل اللہ کا کلام بھی عوام کو جس میں نام کے علماء بھی داخل ہیں غلط معانی، یا سرسری نظر میں شریعت کے خلاف معلوم ہوتا ہے، اصل یہ ہے کہ یہ لوگ اُن کے مخاطب ہی نہیں ہیں یہ تو سامع ہیں، مستمع نہیں، جو اُن کے مخاطب اور مستمع ہیں وہ مغز سخن کو پہنچتے ہیں یہ لوگ تو قشر (چھلکے) تک رہ جاتے ہیں، ایسے متشابہ کلام میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ محرم مستفید ہو اور نامحرم محروم رہے۔

۲۷۱　کس پردہ میں ہے آئینہ پرداز اے خدا　　　رحمت کہ عذر خواہ لبِ بے سوال ہے

۲۷۲　رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے　　　شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

۲۷۳　ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ　　　عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

ہستیِ عالم خیال ہی خیال ہے، اس کو نیست ہی سمجھتے رہو، راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ اگر اسے نیست اس اعتبار سے کہا

جائے کہ ناقص ہے، اور حادث ہے اور حق تعالیٰ کی ہستی کے مقابلہ میں نیست ہے' تو بالکل درست ہے اور اگر سوفسطائیہ کے مذہب کے مطابق نیست مانا جائے تو یہ سراسر غلط ہے، کیونکہ حقائق الاشیا ثابتۃ اہلِ حق کا مذہب ہے اور ایک چلتی ہوئی دلیل یہاں یہ بھی ہے کہ جب تمام عالم حلقۂ دامِ خیال ہے تو اس مقولہ کا قائل اور یہ مقولہ بھی ایک خیال ہی خیال ہوا لہٰذا یہ باطل ہوا (دہذا خلف)

شعر
اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو — آگہی گر نہیں، غفلت ہی سہی

عرفانِ نفس سے عرفانِ حق حاصل ہوتا ہے (من عرف نفسہ فقد عرف ربہ) اور یہ طریقہ سلوک کا ہے اور اگر یہ حاصل نہیں تو عشق کی بدولت محبوب تک پہونچو، اور یہ طریقہ جذب کا ہے،

طریقِ عشق میں گم ہو کے پہنچے منزل پر — نیا یہ راستہ سوجھا ہمیں رسائی کا

خوبی یہ ہے کہ آگہی اور غفلت اگرچہ قریب قریب متضاد ہیں لیکن تاہم ان کا مآل واحد ہے،

شعر
نظارہ کیا حریف ہو اُس برقِ حسن کا — جوشِ بہار جلوہ کو جس کے نقاب ہے

کیا کہنا حسنِ مطلق کا جو نظارگی پر بجلی کی طرح گرتا ہے، اور بہار کی نقاب رخ انور پر ڈالے ہوئے ہے

شعر
آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں — سوزِ غمہائے نہانی اور ہے

متنبی کہتا ہے
وفی فؤاد المحب نار جوی — احر نار الجحیم، ابردھا

اسی واسطے دوزخ سے یہ آواز بلند ہوگی جز یا مومن فان نورک اطفأ لھبی

شبیر احمد خاں غوری

مُسلمانوں کا اُقلیدس کے ساتھ اعتناء

ایک گزشتہ میتھمیٹیکل کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے اُس کے صدر منتخب نے فرمایا تھا :-

"ریاضیاتی علوم میں کسی قوم کا درجۂ کمال اُس کی ثقافتی ترقی کا صحیح اشاریہ (index) ہوتا ہے۔"

یہ بھی واقعہ ہے کہ یونان قدیم کی تہذیبی عظمت کا راز اُن کی فکر صحیح میں مضمر تھا، جو نتیجہ تھی ریاضیات میں اُن کی دستگاہ عالی کا اسی طرح جدید یورپ کی تمدنی ترقی علوم ریاضیہ (MATHEMATICAL SCIENCES) میں اُن کے تبحر کی مرہون منت ہے۔

اگر اس "اشاریہ" کی مدد سے اسلامی تہذیب و ثقافت کا جائزہ لیا جائے تو اس کی عظمت پارینہ کا اعتراف کئے بغیر چارہ نہیں رہتا۔

لہٰذا سطور ذیل میں صرف اقلیدس کے "اصول ہندسہ" (ELEMENTS OF GEAMETRY) کے ساتھ مسلمانوں کے اعتنا کی ایک مختصر داستان پیش کی جا رہی ہے۔ اُمید ہے کہ اُن کے اخلاف اسے بنظر عبرت ملاحظہ فرمائیں گے۔ اگرچہ

وہ فریب خوردہ شاہیں جو پلا ہو کرگسوں میں
اُسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی

وباللہ التوفیق

دیگر علوم کی طرح مسلمانوں نے اُقلیدسی ہندسہ کو بھی غیر معمولی سرعت کے ساتھ سیکھا اور قلیل عرصے میں اس کے اندر مجتہدانہ شان پیدا کر لی۔ اس سلسلے میں اُن کی مساعی علمیہ کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اُن کی پیشرو اقوام نے "اصول اُقلیدس" کے ساتھ کتنا اعتنا کیا تھا۔

نبی عربیؐ کی بعثت سے قبل دنیا کی عظیم الشان ثقافت رومی و بازنطینی تہذیب تھی۔ رومیوں نے ۱۴۶ ق م میں یونان کو اور ۳۰ ق م میں مصر کو (جو یونانی ثقافت کا گہوارہ بن چکا تھا) فتح کر کے رومن امپائر میں مدغم کر لیا تھا۔ پھر فتح یونان کے وقت رومی فاتحین ایک عظیم الشان سلطنت کے مالک اور ایک ترقی یافتہ تہذیب کے علمبردار تھے۔ بایں ہمہ "اصول اُقلیدس" کا اُنہوں نے کوئی اعتنا نہیں کیا۔ "اصول اُقلیدس" کا واحد ترجمہ جو رومن امپائر میں مروج رہا، بوئیتھیس (BOETHIUS) کا کیا ہوا تھا۔ مگر یہ صرف "اصول اُقلیدس" کے ابتدائی مقالوں کی تلخیص تھی۔ لاطینی زبان میں کامل "اُقلیدس" کا ترجمہ پہلی مرتبہ ۱۱۲۰ء میں ہوا۔ مگر اسے

بھی یونانی سے نہیں، بلکہ عربی سے کیا گیا تھا۔ نیز یہ ترجمہ رومن امپائر کی علمی سرپرستی کے بجائے قرون وسطی کے یورپ کی ثقافتی مساعی میں محسوب ہوتا ہے۔

غرض ۱۴۶ ق م سے جبکہ رومیوں نے یونان کو فتح کیا تھا ۱۱۲۰ء تک جب کہ عربی سے لاطینی میں "اصول اقلیدس" کا ترجمہ کیا گیا۔ علم ہندسہ کی ترقی میں رومن ثقافت کی ساڑھے بارہ سو سال کی کوششوں کا ماحصل صرف "اصول اقلیدس" کے کچھ ابتدائی مقالوں کی تلخیص ہے اور بس۔

اس کے مقابلے میں اسلام کی علمی و ثقافتی ترقی کا یہ عالم ہے کہ ابھی دو سو سال بھی نہ گزرے تھے کہ اس نے اس فن میں مجتہدانہ مرتبہ حاصل کر لیا۔ اس کی تفصیل یہ ہے:-

اسلام ساتویں صدی عیسوی میں مبعوث ہوا۔ ۶۲۲ء میں مدینہ منورہ کے اندر اسلامی مملکت کی بنیاد پڑی۔ ۶۳۲ء میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلافت راشدہ کا آغاز ہوا اور اس کے تقریباً ایک سو بیس برس بعد عباسی خلافت کی بنیاد پڑی (۷۵۰ء) چار سال بعد ابوجعفر منصور خلیفہ ہوا اور اس کے عہد میں پہلی مرتبہ عربی زبان کے اندر "اصول اقلیدس" کا ترجمہ ہوا۔ چنانچہ ابن خلدون لکھتا ہے:-

".. کتاب اقلیدس ویسمیٰ کتاب الاصول .... اول ما ترجم من کتب الیونانیین فی الملۃ ایام ابی جعفر المنصور"

کتاب اقلیدس جس کا دوسرا نام "کتاب الاصول" (ELEMENTS) ہے..... یہ یونانی زبان کی پہلی کتاب ہے جو مسلمانوں میں بعہد ابی جعفر منصور ترجمہ ہوئی۔

یہ ترجمہ ۷۶۵ء کے قریب ہوا، یعنی ابھی اسلامی مملکت کو قائم ہوئے ڈیڑھ سو سال بھی نہیں ہوئے تھے کہ مسلمانوں نے "اصول اقلیدس" کے ساتھ باقاعدہ اعتنا شروع کر دیا۔

منصور کے بعد مہدی اور مہدی کے بعد ہادی خلیفہ ہوا۔ ہادی کے مرنے پر ۷۸۶ء میں ہارون الرشید سریر آرائے خلافت ہوا۔ اس کے عہد خلافت میں حجاج بن یوسف بن مطر نے "اصول اقلیدس" کا پھر ترجمہ کیا۔ چنانچہ ابن الندیم (المتوفی ۳۸۵ھ) "کتاب الفہرست" میں لکھتا ہے:-

لقد نقلہ الحجاج بن یوسف بن مطر نقلین:- احدھما یعرف بالہارونی وھو الاول ولفظہ ثانیاً ویعرف بالمامونی وعلیہ یعول۔

حجاج بن یوسف بن مطر نے اصول اقلیدس کے یونانی زبان سے عربی میں دو ترجمے کئے:- ایک نقل ہارونی کے نام سے مشہور ہے اور اسی موخر الذکر پر اعتماد کیا جاتا ہے

اس طرح ۸۰۰ء کے قریب مسلمان اہل علم میں "اصول اقلیدس" کا عام رواج ہوا، یعنی بعثت اسلام کے صرف پونے دو سو سال کے بعد۔

ہارون کے بعد اس کا جانشین اس کا بڑا بیٹا امین ہوا، مگر وہ برادرانہ خانہ جنگی میں مارا گیا اور ۸۱۳ء میں مامون الرشید تخت خلافت پر بیٹھا۔ اس کے عہد میں جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، حجاج بن یوسف بن مطر نے دوسری مرتبہ "اصول اقلیدس" کا ترجمہ کیا۔ اس طرح دو سو سال کے اندر مسلمانوں میں اصول اقلیدس کے تین ترجمے ہو گئے:- نقل منصوری، نقل ہارونی اور نقل مامونی۔

اگلی صدی میں اور لوگوں نے ترجمے کئے جن میں اسحاق بن حنین، ثابت بن قرہ اور ابو عثمان دمشقی کے تراجم خاص طور سے مشہور ہیں۔

مگر اس فرط اعتبار سے زیادہ قابل غور یہ چیز ہے کہ صرف تیس سال کے عرصہ میں (یعنی سنہ ۱۸۰ھ سے جب کہ نقل اردو کو رواج ہوا، مامون الرشید کی تخت نشینی سنہ ۱۹۸ھ تک) مسلمان فضلاء نے اقلیدسی ہندسہ میں مجتہدانہ شان حاصل کر لی۔ انہوں نے

(الف) "اصول اقلیدس" کی شرحیں لکھیں،

(ب) اس کی کوتاہیوں کی اصلاح کی، اور

(ج) ان اہم مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی جن سے تعرض کی جرأت خود یونانی مہندسین میں سے بھی بہت کم لوگوں نے کی تھی۔

(الف) اصول اقلیدس کے قدیم مسلمان شراح

ابن الندیم "کتاب الفہرست" کے اندر "اصول اقلیدس" کے شارحین کا تذکرہ عباس بن سعید الجوہری اور سند بن علی کے نام سے شروع کرتا ہے:۔

"وللجوهري شرح هذا الكتاب من اوله الى آخره وتمر اخبار الجوهري... وكان سند بن علي قد نسره وفري البوعلي منه نسخ مقالات وبعض العاشرة۔" (كتاب الفهرست ص۳۷۲)	اور اقلیدس کی شرح... الجوہری نے... از اول تا آخر لکھی۔ الجوہری کا ذکر آگے آئے گا... ...سند بن علی نے اس کتاب کی تفسیر لکھی تھی اور ابو علی نے اس کے کو مقالے اور کچھ دسواں مقالہ دیکھا تھا۔

الجوہری (عباس بن سعید الجوہری) اور سند بن علی رصدگاہ مامونی کے خصوصی ہیئت داں تھے۔ مامون الرشید کا عہد خلافت ۱۹۸ھ لغایت ۲۱۸ھ ہے اس لئے ان دونوں کے نبوغ اور شہرت کا یہی زمانہ ہے اور چونکہ انہوں نے ہیئت میں کمال حاصل کرنے سے پہلے علم ہندسہ میں دستگاہ عالی حاصل کی ہوگی، اس لئے ان کی ہندسی سرگرمیوں، نیز ان کی شرح وتفسیر اصول اقلیدس کا زمانہ دوسری صدی ہجری کے سرے پر فرض کیا جا سکتا ہے۔

آگے چل کر ابن الندیم الجوہری (عباس بن سعید الجوہری) کی تصانیف میں ایک اور کتاب بتاتا ہے، جس کا عنوان۔

"کتاب الاشکال التی زادھا فی المقالۃ الاولی من اقلیدس"

ہے۔ اس کتاب میں حسب تصریح محقق طوسی پچاس شکلیں تھیں۔

الجوہری کی "شرح کتاب اصول اقلیدس" تو دستبرد زمانہ کی نذر ہو گئی، مگر اس کی دوسری تصنیف "کتاب الاشکال التی زادہ فی المقالۃ الاولی من کتاب اقلیدس" کا ایک نسخہ نفیض کی لائبریری میں اور دوسرا انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہے۔ ان میں سے دس شکلوں کو محقق طوسی نے "الرسالۃ الشافیۃ" میں نقل کیا ہے۔

(ب) مسلمان مہندسین اور اصول اقلیدس کی اصلاح

ان میں سب سے اہم الجوہری کی "اصلاح کتاب الاصول" تھی۔ چنانچہ محقق طوسی نے ان کی ہندسی خدمات کے سلسلے میں لکھا ہے

واما الجوهري رحمه الله عليه فله اصلاح	"رہا الجوہری رحمہ اللہ تو انہوں نے اصلاح کتاب الاصول

لکتاب الاصول وقد زاد فی مبادی کل فن مقدمات و مصطلحات و فی اشکال الکتاب قریباً من خمسین شکلاً۔	لکھی، جس کے اندر اس نے ہر فن کے مبادی میں مقدمات و مصطلحات کا اضافہ کیا ہے، نیز اشکال کتاب میں تقریباً پچاس شکلیں بڑھائی ہیں۔

(الرسالۃ الشافیۃ مشمولہ رسائل الطوسی المجلد الثانی دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن)

یعنی ابھی مسلمانوں کو اصول اقلیدس سے باقاعدہ طور پر آشنا ہوئے صرف تیس سال ہوئے تھے کہ انہوں نے اس فن میں مجتہدانہ شان حاصل کرلی اور اس قابل ہوگئے کہ اقلیدس کی کتاب الاصول جو نہ صرف یونانی علم الہندسہ کا شاہکار ہے، بلکہ جو علم ہندسہ میں ادبیات عالیہ (CLASSICS) کی حیثیت رکھتی ہے، اس "اصول اقلیدس" کی کوتاہیوں کی نشاندہی کرکے ان کی (اصلاح) کرنے لگے۔

(ج) مسلمان ہندسہ دان اور خطوط متوازی کا مصادرہ

"اصول اقلیدس" کا سب سے اہم مسئلہ "خطوط متوازی کا مصادرہ" (PARALLEL POSTULATE) تھا۔ اقلیدس اُسے بدیہی اور بے نیاز ثبوت سمجھتا تھا۔ مگر بعد کے مہندسین کو ہمیشہ اس سے اختلاف رہا۔ بایںہمہ یونانی ہندسہ کی تاریخ میں بطلیموس (PTOLEMY = ۱۶۵ - ۸۷ء) سے قبل کسی ہندسہ دان کا ذکر نہیں ملتا، جس نے اس مصادرہ (POSTULATE) کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہو۔ یعنی یونانی عبقریت کو اقلیدس کی رائے سے صاف صاف اختلاف کرنے اور اپنے وجوہ اختلاف قلمبند کرنے میں چار سو سال سے زیادہ عرصہ لگا۔

مگر مسلمان ہندسہ دانوں نے اصول اقلیدس سے آگاہی حاصل کرنے کے ایک چوتھائی صدی بعد ہی اس مصادرہ کو ثابت کرنے کی کوشش شروع کردی۔ ان میں سب سے اہم شخصیت عباس بن سعید الجوہری کی ہے۔ چنانچہ محقق طوسی نے "الرسالۃ الشافیہ" میں عباس بن سعید الجوہری کی اس کاوش کے بارے میں لکھا ہے:۔

"ثم ان جماعۃ تاخر زمانهم عن المبرزین فی هذا العلم لما نظروا بعین الانصاف وخلوا ربقۃ الاعتساف اتضح لهم الحال فطلبوا لها حجۃ وانتهجوا الحجۃ . . . . منهم من بناها علی مقدمۃ مغالطیۃ . . . . . . وهو الفاضل العباس بن سعید الجوهری۔"	اور اس علم کے متبحرین کے بعد متاخرین کا زمانہ آیا، انہوں نے جب تقلید اسلاف سے بالاہوکر دیدۂ انصاف سے اس مسئلہ کو دیکھا تو معاملہ اُن پر کھل گیا اور انہوں نے اس مقدمہ کی دلیل و حجت پر اصرار کیا . . . . تو ان میں سے بعض افاضل نے اس کی دلیل (بقول محقق طوسی) ایک مغالطہ آمیز مقدمہ پر قائم کی . . . اور وہ فاضل عباس بن سعید الجوہری ہے۔ (الرسالۃ الشافیہ للطوسی ص۲)

"اصول اقلیدس" کا دوسرا اہم مسئلہ "اعداد اصم کا نظریہ" (THEORY OF IRRATIONAL NUMBERS) جس پر اس کتاب کے دسویں مقالے کا بڑا حصہ مشتمل ہے۔ الجوہری کے رفیق کار سند بن علی نے اس متعلق اور پیچیدہ مسئلہ کی وضاحت کیلئے دو مستقل (۱) "کتاب المنفصلات والمتوسطات" اور (۲) "کتاب القواطع" لکھے۔

اس تفصیل سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ مسلمان فضلاء نے اپنے عہد ترقی کے اندر اقلیدسی ہندسہ کے باب میں نہایت ہی قلیل عرصہ میں مجتہدانہ شان حاصل کرلی اور یہ ایسا امتیاز ہے جس کی نظیر دنیا کی کوئی قوم پیش نہیں کرسکتی۔

ماہرالقادری

یادِ رفتگاں

پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی مرحوم

سا لہا سال پہلے کے سنہ اور تاریخیں کسے یاد رہتی ہیں، حافظہ پر زور ڈالنے کے بعد بھی یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ سید نجیب اشرف
ی صاحب سے پہلی ملاقات کس سنہ میں ہوئی، غالباً ۱۹۴۲ء کی بات ہے، ایک مشاعرے کے سلسلہ میں میرا بمبئی جانا ہوا وہیں ایک صاحب
ان کا پیغام پہونچا کہ اسمٰعیلیہ کالج اندھیری میں فلاں تاریخ کو محفل شعر و سخن برپا ہو رہی ہے، آپ کو تقریر بھی کرنی ہے اور کلام بھی
نا ہے، اُن کی دعوت میرے لئے مژدۂ فخر و مسرت تھی، دل نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اتنی معروف، نامور اور قابل احترام
فیتیں اس ہیچمداں سے تعلقِ خاطر رکھتی ہیں؛ اور ملنے ملانے میں پہل اُدھر سے ہو رہی ہے۔

وقتِ مقررہ پر اسمٰعیلیہ کالج کے ایک طالب علم آ گئے، وکٹوریہ میں سوار ہو کر ریلوے اسٹیشن پہونچے اور وہاں سے الیکٹرک
ن کے ذریعہ اندھیری تک سفر کیا، برقی ٹرین سے پہلا سفر، راستے کے مناظر بھی دلچسپ ہر اسٹیشن پر مسافروں کی گہما گہمی مگر بھڑ بازی
ب، ریل گاڑی بیچ بیچ صبا رفتار اور برق خرام، ڈبے صاف ستھرے، ریلوے ٹائم ٹیبل کے مطابق وقت کی سختی کے ساتھ پابندی، گھنٹہ
ن گھنٹہ کا یہ سفر ہر اعتبار سے خوشگوار اور دلچسپ رہا، جس اسٹیشن پر ہم اُترے وہاں پہلے سے موٹر کار موجود تھی، چند منٹوں میں
لج پہونچ گئے! سید نجیب اشرف ندوی مرحوم نے بڑی محبت کے ساتھ مصافحہ اور معانقہ کیا، کالج کے اسٹاف سے ملایا، کالج کا
، طلبار سے کھچا کھچ بھرا تھا، میں نے اردو زبان و ادب پر پہلے تقریر کی، پھر اپنا کلام سنایا ہر غزل کے بعد دوسری غزل کی فرمائش
جوانوں کی ہتھیلیاں جب پوری قوت کے ساتھ تالیاں بجا رہی ہوں تو اُس کی گونج کا کیا پوچھنا! وہ جو کسی تجربہ کار شاعر نے کہا ہے کہ

آدمی فربہ شود از راہِ گوش

یں بھی دادو تحسین کے اس ہنگامہ میں اپنے جسم کو پھیلتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

بزمِ شعر و سخن کے بعد چائے نوشی ہوئی، سید نجیب اشرف ندوی مرحوم کی دلچسپ باتوں نے چائے اور اُس کے لوازم کو اور
ادہ لذیذ بنا دیا ـــــ پھر تو یہ رسم پڑ گئی کہ جب بھی میرا بمبئی جانا ہوتا، اسمٰعیلیہ کالج میں مجھے ضرور بلایا جاتا، ایک بار ریلوے
ٹیشن سے کالج تک پیدل بھی جانا ہوا، راستے میں جگہ جگہ ناریل کے درخت، ہریالی، پیڑوں کے جھنڈ میں کالج کے دروازے
ں پڑ جاتی، اُس دن احساس ہوا کہ اس راستہ کا لطف تو پیدل چلنے ہی میں ہے! اسمٰعیلیہ کالج کا محل وقوع اور زیادہ نظر افروز
رختوں کا کنج، پہاڑی پر سطح میدان، سبزہ پھلواری اور اُن کے جھرمٹ میں کالج کی عمارت! سید نجیب اشرف مرحوم کی محبت کے

طفیل سیر کوہسار کا یہ لطف سال میں ایک دو بار راقم الحروف کو ضرور میسر آ جاتا۔

مرحوم سے زبان و ادب کے مسائل پر بھی بارہا گفتگو ہوئی، وہ خاصے محتاط انداز میں اظہارِ رائے فرماتے تھے، جذباتیت کم اور سنجیدگی زیادہ! علامہ سید سلیمان ندوی کی طرح وہ خوش رنگ اور خوبرو نہ تھے جو عام طور پر سادات کا طغرائے امتیاز ہے مگر اُن کی تحریر کا حسن اس کمی کی پوری طرح تلافی کر دیتا۔

"رقعات عالمگیری" کی تدوین و ترتیب اور تحقیق کا جو کام انھوں نے انجام دیا ہے وہ اُن کا "عظیم کارنامہ" ہے جس کی بدولت اُن کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا، بمبئی میں اُردو زبان و ادب کو اُن کی ذات سے جو فروغ ہوا، اُس کا ذکر تاریخ میں آنا چاہئے، سید نجیب اشرف ندوی مرحوم اپنی ذات سے خود ایک "درس گاہ" تھے، علم و تحقیق کے شیدائی، اُردو کے سچے عاشق اور اسلام سے محبت کرنے والے! ساری عمر لکھنے پڑھنے، سیکھنے سکھانے اور علمی تحقیق کے کاموں ہی میں گزری، معاش و روزگار کی بے فکری کے ساتھ کام کرنے کے انہیں مواقع بھی ملے، اور ان مواقعوں کو مرحوم نے ضائع نہیں ہونے دیا ——— اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے (آمین)

رئیس احمد جعفری ندوی مرحوم

رئیس احمد جعفری مرحوم سے بمبئی میں پہلی بار ملاقات ہوئی، ان دنوں وہ روزنامہ "خلافت" کے ایڈیٹر تھے، بمبئی میرا آنا جانا ہوتا رہتا تھا اور وہاں کے قیام میں کسی نہ کسی دعوت یا جلسہ میں مرحوم سے ملاقات ضرور ہو جاتی، ۱۹۴۵ء میں راقم الحروف نے "کل ہند پیمانے" پر "حلقۂ فکر و نظر" قائم کیا تھا، مقصد نام نہاد ترقی پسند ادب کی بے راہ رویوں کی روک تھام تھی، بمبئی کی شاخ کا صدر رئیس احمد جعفری مرحوم کو مقرر کیا گیا، وہ مجھے دہلی، بمبئی سے خط لکھتے رہتے کہ آپ نے میرے ساتھ جن کام کرنے والوں کو منتخب کیا ہے وہ زیادہ فعال نہیں ہیں اس لئے حلقہ کے کام میں سستی پائی جاتی ہے۔

پاکستان بننے کے بعد وہ بھی کراچی آ گئے اور میں نے بھی اسی شہر کو اپنا مستقر بنایا، حکیم نصیر الدین صاحب ندوی[1] جو ندوہ میں برسوں مرحوم کے ہم درس رہے ہیں، اُن کے یہاں (نظامی دواخانہ" میں) جعفری صاحب مرحوم سے ملنا جلنا رہتا، پھر وہ لاہور چلے گئے، وہاں ادارۂ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ ہوئے اور مرتے دم تک اس ادارہ سے ملازمت کا تعلق رہا، ادارہ مذکور کے آرگن "المعارف" کے علاوہ ماہنامہ "تہذیب الاخلاق" اور لاہور کے ایک دو رسالوں پر بھی اُن کا نام اعزازی مدیر یا معاون کی حیثیت سے لکھا ہوا دیکھا گیا، ہر ادبی حلقہ، علمی ادارہ اور رسالہ رئیس احمد جعفری مرحوم سے ربط و انتساب کو اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتا تھا۔ دو ڈھائی سال ہوئے انہوں نے مولانا محمد علی جوہر کے نام پر ایک اکیڈمی قائم کی تھی، جس کی غالباً پہلی اور آخری کتاب "اوراقِ گم شدہ" تھی!

سیرت، تذکرہ، تاریخ، اخلاق، ناول، افسانہ، ترجمہ، کتابوں کی تلخیص و تالیف ——— ان متنوع موضوعات پر اُن کی کتابوں کی مجموعی تعداد دو سو سے بھی متجاوز ہے، اور ان میں سے بعض کتابیں تو ہزار ہزار اور بارہ بارہ سو صفحات سے بھی زیادہ

---

[1] حکیم حبیب احمد ندوی صاحب بھی مرحوم کے خاص دوستوں میں ہیں ندوہ کے ہوسٹل میں سات آٹھ سال ایک ہی کمرے میں رہے، اُس کے بعد برسوں بے تکلفانہ خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا، حکیم صاحب موصوف نے بمبئی کے دورانِ قیام میں قومی تحریکوں میں بڑی سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا افسوس ہے کہ فالج کا حملہ ہونے کے بعد ٹھیک طور پر چلنے پھرنے کے قابل بھی نہیں رہے۔

نیم ہیں، سچ مچ لکھنے کی مشین رہیں چار مہینہ میں پانسو چھ سو صفحوں کی کتاب کی تصنیف و تالیف یا ترجمہ تو اُن کے بائیں ہاتھ کا
یل تھا۔ زود نویسی اور مشاقی کی کوئی حد و نہایت ہی نہیں! اپنے زورِ قلم سے لاکھوں روپیہ انہوں نے پیدا کیا اور اُن سے زیادہ
اِن ناشرین نے کی۔

رئیس احمد جعفری مرحوم اہلِ قلم ہی نہیں اہلِ علم بھی تھے، مطالعہ وسیع، تجربہ و مشاہدہ وسیع تر، فلسفہ و کلام کے نازک
سے نازک مضامین بھی انہوں نے بڑے سلیقہ اور سلجھاؤ کے ساتھ اُردو میں منتقل کئے ہیں، قدیم مضامین کی تدوین و ترتیب میں اُن
کا قلم بڑی تیزی اور مشاقی دکھاتی تھی! اُن کے بعض دوستوں اور جاننے والوں کی زبانی یہ بھی سننے میں آیا کہ ناشرین کی
فرمائشوں کے ہجوم میں عربی کی بعض کتابوں کے تراجم اُجرت پہ دوسروں سے بھی انہیں کرانے پڑے!

پاکستان کے جس علمی و ثقافتی ادارے سے اُن کا تعلق تھا۔ وہ حکومت پاکستان کی مالی امداد کے سہارے چل رہا ہے اس وابستگی
کے جو تقاضے تھے، اُس کے پیش نظر رئیس احمد جعفری مرحوم کا قلم جرأت و عزیمت کا کوئی نقش نہ چھوڑ سکا، یہاں تک کہ جماعتِ
اسلامی اور مولانا مودودی کے خلاف انہوں نے ایک کتاب لکھی، اللہ تعالیٰ اُن کے تسامحات کو معاف فرمائے (آمین)

رئیس احمد جعفری مرحوم گرمیوں میں ہر سال کوئٹہ جایا کرتے تھے، اس مرتبہ کوئٹہ میں معمول سے کم قیام رہا، کراچی میں اُن سے دو
تین بار ملاقات ہوئی، ہمدرد دواخانہ کے مالک حکیم محمد سعید صاحب نے ایران کے صحافتی وفد کے اعزاز میں ایک استقبالیہ دیا تھا
اسی میں جعفری صاحب مرحوم سے نیاز حاصل ہوا، میں اُنہی کے قریب کرسی پر بیٹھا تھا کہ وزیر صاحبان تہران کے سب سے زیادہ چھپنے
والے اخبارات —— کیہان اور اطلاعات —— کے نمائندوں کو راقم الحروف کے پاس لے کر آئے، اچھے الفاظ میں میرا
تعارف کرایا، یہ بھی کہا کہ یہ فارسی میں بھی شعر کہتے ہیں، اُن کی فرمائش پہ میں نے اپنی غزل کے دو شعر سنائے ۔

تا آں بتِ گلفام بہ گلشن نہ رسیدہ

بلبل نہ سرائیدہ نسیمے نہ وزیدہ

گیسو بکشا، دام بنہ، ناز بفرما

اے دوست کرم کن بہ غزالانِ رمیدہ

اس مختصر سفر کے چند دن بعد میجر ڈاکٹر خلیل الرحمٰن صاحب کی صاحبزادی کی شادی میں جعفری صاحب مرحوم سے ملاقات
ہوئی، جسٹس غمیسانی صاحب جج ہائیکورٹ جو مرحوم کے بڑے قدرشناس ہیں، اُن کے ہمراہ تھے، اس صحبت میں مرحوم نے مجھ سے
فرمایا کہ تم سے سب سے پہلی ملاقات خلافت ہاؤس (بمبئی) میں ہوئی تھی، صبح کے ناشتہ میں مولانا شوکت علی مرحوم اور مولانا عرفان
مرحوم کے ساتھ میں بھی شریک تھا —— یہ ۱۹۳۳ء کا قصہ ہے راقم الحروف نے سفرِ عراق سے واپسی کے بعد ایک مضمون روزنامہ
"خلافت" کے لئے لکھا تھا، اس میں برطانیہ کی سیاست پہ بڑی سخت گرفت کی تھی، مولانا شوکت علی مرحوم نے مجھے ناشتہ پر
بلایا تھا۔

میں سفر میں تھا اور لاہور سے صبح کی ٹرین سے کوئٹہ کے لئے روانہ ہو رہا تھا کہ روزنامہ "مشرق" میں جناب رئیس احمد جعفری
کے انتقال کی خبر پڑھی، ریلوے اسٹیشن پہ دل کا دورہ پڑا اور ذرا سی دیر میں چلتا پھرتا جسم لاش بن کر رہ گیا ——
علامہ شبلی نعمانی کے لگ بھگ عمر پائی، تیس بتیس سال کی مدت میں دفتر کے دفتر لکھ ڈالے، قلم میں روانی، اسلوبِ نگارش
دلکش، رئیس احمد جعفری کی موت ایک عظیم ادیب کی موت ہے، اُردو تاریخ و ادب میں اُن کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا ——

ھتآنے والی نسلیں اُن کی اور زیادہ قدر کریں گی ________

استاد قمر جلالوی مرحوم

میں ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا، جب اُن کی غزل کا یہ مطلع ۔

کچھ تو منہ سے بول مجھ کو دیکھ دل بھر ہو گیا
اے بت خاموش کیا سچ مچ کا پتھر ہو گیا

یک صاحب کی زبانی سنا اور سنتے ہی ازبر ہو گیا، ان کے تقریباً دو سال بعد قصبہ گنور ضلع بدایون کے مشاعرے میں قمر صاحب کو دیکھا، ن کی کئی غزلیں سنیں، اُن کے اس شعر ___

بس آج چین سے تیمار دار سو جائیں
مریض اب نہ کہے گا، سحر نہیں ہوتی

نے بہت متاثر کیا ۔

۱۹۲۶ء میں راقم الحروف نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے میٹرک کا امتحان دیا، علی گڑھ کے قیام کے زمانے میں قمر جلالوی مرحوم کو بار بار مشاعروں میں سنا !

ایک بزرگ تھے محمد داؤد خاں، نوّاں تخلص کرتے تھے ۔ علی گڑھ کے پٹھان محلہ میں سکونت تھی، شہر کے سب سے زیادہ معمر شاعر بلکہ استاذ الاساتذہ، شاعری کا رنگ امیر مینائی سے ملتا جلتا، اُن کے صاحبزادے سلیمان خاں آزاد کے اہتمام سے مہینے میں یک دو مشاعرے ہوتے ___ طرحی بھی اور غیر طرحی بھی ! اُن مشاعروں میں اُستاد قمر جلالوی سب پر چھائے رہتے اور جتنی داد تمام شاعروں کو ملتی اُس سے زیادہ داد تنہا قمر صاحب کے حصہ میں آتی ۔ مرحوم اُن دنوں غزل سنانے سے پہلے، قطعہ پڑھتے، قطعوں سے جب رنگ جم جاتا تو غزل شروع فرماتے اور مشاعرے کو سچ مچ لوٹ لیتے، ایک قطعہ کے تین مصرعے یاد رہ گئے ہیں ________

بہ رنگ سبزہ مجھے پائمال کردو گے بعینہ مرا نرگس کا حال کردو گے
. . . . گھٹا گھٹا کے قمر کو ہلال کردو گے

میں بھی ان مشاعروں میں ایک نو مشق شاعر کی حیثیت سے شریک ہوتا تھا !

قمر جلالوی کی عمر اُس وقت چالیس بیالیس سال کی تھی، شہر کے بیسیوں نوجوان اُن کے شاگرد تھے، اُن میں نمایاں اور ممتاز یک ہندو شاگرد بہار تھا، فیض محمد فیض بھی قمر صاحب کے خاص شاگردوں میں شمار ہوتے تھے، پیشے کے لحاظ سے حجام مگر شرافت میں سیدوں اور شیخوں سے بڑھ کر شریف اور عالی ظرف، اُن کا ایک شعر یاد رہ گیا ہے ۔

یوں تو وہ مالک ہے چاہے ڈال دے تنکے میں جان
ورنہ اب حالت ترے بیمار کی اچھی نہیں

سکندرہ راؤ ضلع علی گڑھ کا مشہور قصبہ ہے، وہاں یوسف ڈبائی مرحوم میونسپلٹی کے سکتر تھے، اُن کے زیر اہتمام بڑے دھوم کا سالانہ مشاعرہ ہوا کرتا تھا، یہ وہ زمانہ تھا جب شعراء صاحبان اپنے کرایہ سے مشاعروں میں جاتے تھے، اتنے بڑے مشاعرے میں

الوف کو طرحی غزل پڑھنے کا پہلا موقعہ میسر آیا۔ قمر جلالوی کی غزل خاصی کامیاب رہی اسی مشاعرے میں حضرت دلگیر ماہروی مرحوم کو سُنا ستر سال سے بھی متجاوز، جوان بیٹے کی موت نے کمر جھکا دی تھی۔ مگر ترنم کس قدر جاندار اور پُرسوز تھا۔ اور کلام غزل کی آبرو!

جو خون دل میں تھا وہ مری چشمِ تر میں ہے — اے ضبط! روک تا کہ ابھی گھر کے گھر میں ہے
پہلے ہی خاک دل تھی مری مختصر کائنات — اب پوچھنا ہی کیا کہ تری رہگزر میں ہے

گھبرائے کیوں نہ کشمکشِ نزع سے دلگیر
پہلا یہ اتفاق اُسے عمر بھر میں ہے

قمر جلالوی کا اُس زمانے میں رنگِ شاعری یہ تھا۔

عدو رقابا کے کلیاں چن رہے ہیں اُن کے داماں پر — اب ایسے میں کوئی بجلی نہیں گرتی گلستاں پر
روکتا تھا ناخدا کشتی کو طوفاں آ گیا — تم جہاں پر ہو بس اتنی دور تھے ساحل سے ہم
شکریہ! اے قبر تک پہنچانے والو شکریہ — اب اکیلے ہی چلے جائیں گے اس منزل سے ہم

پاکستان آنے کے بعد اُن کی شاعری میں اور زیادہ نکھار پیدا ہو گیا، فرماتے ہیں۔

اس ترے سر کی قسم فرق سر مو بھی نہیں — جس قدر میں ہوں پریشاں تیرے گیسو بھی نہیں
بزم میں اُس جگہ ساقی نے بٹھایا ہے مجھے — ہاتھ پھیلاؤں تو جاتا نہیں پیمانے تک
ماتھے بند کئے دیتے ہو دیوانوں کے — ڈھیر لگ جائیں گے بستی میں گریبانوں کے
کسی کا نام لو بے نام افسانے بہت سے ہیں — نہ جانے کس کو تم کہتے ہو دیوانے بہت سے ہیں
بنائے دے رہی ہیں اجنبی نادانیاں مجھ کو — تری محفل میں ورنہ جانے پہچانے بہت سے ہیں
لکھی ہے خاک اُڑانی ہی اگر اپنے مقدر میں — ترے کوچے پہ کیا موقوف ویرانے بہت سے ہیں
مریض سے ضرور آج کوئی بات ہوئی ہے — جاتے ہیں قدم اور تھے آتے ہیں قدم اور
کہا کسی سے نہ میں نے ترے فسانے کو — نہ جانے کیسے خبر ہو گئی زمانے کو
دعا بہار کی مانگی تھی اتنے پھول کھلے — کہیں جگہ نہ رہی میرے آشیانے کو

تخلص (قمر) کی معنویت سے مقطع میں خوب کام لیتے، ایک مصرعہ یاد رہ گیا ہے۔

؎ گنواؤں نہ تارے تو قمر نام نہیں ہے

جلالی ضلع علی گڑھ کا مشہور قصبہ ہے، شیعہ سادات وہاں کے زمیندار اور رؤسا ہیں۔ قمر صاحب اسی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے کہ مرنے کے ہیں۔ جو جائداد ورثہ میں ملی وہ جوانی کی ترنگ میں بہت جلد ٹھکانے لگا دی یہاں تک کہ وطن چھوڑ کر علی گڑھ میں سکونت اختیار کرنی پڑی، علی گڑھ میں تیس پینتیس سال تک سائیکلوں کی دکان کی، سائیکلوں کی مرمت اور اُن کو کرائے پر چلانا یہی ان کا ذریعہ معاش تھا، اس فن میں بھی شہر بھر میں کوئی ان کا مدمقابل نہ تھا، جس سائیکل کا عیب کوئی نہ نکال سکتا اس کو قمر صاحب اپنی چابک دستی سے ٹھیک کر دیتے، وہ مجھ سے فرماتے تھے، کہ مشینوں کے کل پرزوں میں میرا دماغ خوب چلتا ہے، کوئی انجینئر ہوائی جہاز کے پرزے میرے سامنے کھول دے تو میں پرزوں کو اُن کی جگہ پر ٹھیک بٹھا دوں گا۔ وہ جو ابتدائی شاعروں نے مجبوروں کے "سبزۂ خط" کی تعریفیں کی ہیں قمر جلالوی رفیق سارے شہر میں اُن کی شاعری کی طرح مشہور تھا۔

پاکستان بننے سے پہلے ہندوستان میں وہ غیر معروف رہے کسی اخبار یا رسالے میں ان کی غزل دیکھنے میں نہیں آئی اور نہ ریڈیو سے ان کی آواز سنی گئی۔ علی گڑھ اور اس کے نواح کے مشاعروں میں وہ بلائے جاتے تھے، ۱۹۴۵ء میں میرٹھ کے آل انڈیا مشاعرے میں وہ پہلی بار شریک ہوئے اور ان کی غزل اور خاص طور سے مطلع خوب چمکا۔

گلستاں سے مجھ کو گیا جب زیر دام آ ہی گیا
اک نشیمن تھا سو وہ بجلی کے کام آ ہی گیا

علی گڑھ میں رہتے تھے مگر مسلم یونیورسٹی کی علمی فضا سے غیر متعلق ——— شہر کی اونچی سوسائٹی میں ان کا اٹھنا بیٹھنا کم ہی ہوتا تھا۔ علی گڑھ میں ایک ہندو ڈپٹی کلکٹر استاد قمر کی شاعری سے بہت متاثر تھا، وہ بعد میں ریاست الور میں وزیر ہو گیا، وہاں اس نے استاد صاحب کو بلایا، ریاستوں میں کامیابی اور فتوحات کے لئے خاصی امیدواری کرنی پڑتی ہے، استاد قمر اس مدت انتظار کی تاب نہ لاکر الور سے چلے آئے۔ ان کی پرورش امیرانہ ماحول میں ہوئی تھی، مگر جب ان کی رنگ رلیوں کے ہاتھوں حالات ناساز گار ہو گئے تو انہوں نے قوت بازو سے کما کر زندگی بسر کی، کسی کے دست نگر نہیں رہے۔

پاکستان بننے کے بعد وہ کراچی آئے اور گاندھی گارڈن کے قریب لکڑی کا ایک کیبن لگا کر سائیکلوں کی دکان قائم کی، ان دنوں سائیکل رکشا کا رواج تھا۔ انہوں نے دو رکشا بھی خرید لیں جو کرایہ پر چلتی تھیں، پاکستان ریڈیو پر مشاعروں کا جو سلسلہ شروع ہوا تو استاد قمر جلالوی کے کلام کی بڑی پذیرائی ہوئی، ان کا نمبر سب کے بعد آتا اور ان سے بعض اوقات دو دو تین تین غزلیں پڑھوائی جاتیں اس سے ان کی شہرت ہوئی۔ پھر انہیں باہر کے مشاعروں میں بھی بلایا جانے لگا اور وہ مشہور اور مقبول ہوتے چلے گئے۔ کلام میں استادانہ پختگی و مشاقی کے ساتھ شوخی اور سادگی و پرکاری بھی اور نغم میں سوز و درد، دلکشی اور انفرادیت، داد و تحسین کی کوئی حد و نہایت ہی نہ رہی۔

استاد قمر کی زندگی کے آخری بارہ تیرہ سال شہرت، قدردانی اور راحت و بےفکری کے ماحول میں بسر ہوئے، حکومت پاکستان سے ماہانہ وظیفہ مقرر ہوا، مشاعروں کی آمدنی چھ سو روپیہ ماہوار سے کچھ زیادہ ہی ہوگی، کئی سال سے وہ شیعہ فرقہ کے مشہور خطیب جناب رشید ترابی کے بنگلہ میں رہتے تھے اور وہاں کی پذیرائی اور خاطر داری کی تعریف کرتے تھے۔ ہل خانہ کے لئے انہوں نے لالوکھیت لیاقت آباد میں بیس بائیس ہزار روپیہ کی لاگت کا مکان بنوا دیا تھا۔

درجنوں بیسیوں مشاعروں میں ان کے ساتھ سفر کرنے اور ساتھ ٹھہرنے کا موقعہ ملا کسی سفر میں ذرا سی بھی بدمزگی نہیں ہوئی، حساب کتاب کے معاملے میں کھرے۔ اسی بیاسی سال کی عمر میں جوانوں کی طرح شوخ مزاج، ڈیڑھ دو سال سے بڑھاپے کے سبب آواز میں ضعف پیدا ہو گیا تھا۔ دو چار طرحی غزلوں میں بھی صحت کی کمزوری پائی گئی۔ اس لئے بعض مشاعروں میں داد و تحسین کے مد میں جزر بھی محسوس کیا گیا۔ مگر اسی سال ماہ صفر میں ڈاکٹر یاور عباس صاحب کی مجلس کے لئے ستر اسی بند کا زوردار مرثیہ کہا، اور اس قوت اور آن بان کے ساتھ پڑھا کہ دھوم مچ گئی۔ مرثیہ کا یہ رنگ تھا۔

؎ تارے تمام رات نہ سوئے فراق میں

ہم ان کے خورد، ان سے مذاق بھی کر لیا کرتے تھے تین سال ہوتے ایک صاحب کے یہاں دعوت تھی، استاد قمر اور دوسرے شعرا کو لیکر موٹر کا روانہ ہوئی تو مجھے شوخی سوجھی میں نے کہا۔

"استاد، کیا آپ وہاں پہلی بار جا رہے ہیں"

اس پر وہ قدرے چونک کر بولے۔

"پہلی بار جانے میں کیا بات ہے ؟"

میں نے بات کاٹتے ہوئے عرض کیا۔

"وہاں جا کر قدرے محنت کرنی پڑتی ہے"

استاد نے اس پر فرمایا ——

"محنت کیسی —— ایں !"

میں سنجیدہ بن کر بولا ——

"اُن صاحب کے یہاں چمڑے کا کارخانہ ہے۔ جو شخص پہلی مرتبہ اُن کے یہاں جاتا ہے اُسے چمڑے کا پاجامہ پہنایا جاتا ہے"

یہ بات ختم ہوتے ہی اقبال صفی پوری بول پڑے ——

"پاجامہ پہننا تو آسان ہے مگر استاد! جب وہ اُتروایا جاتا ہے اُس وقت بڑی تکلیف ہوتی ہے۔"

مشاعروں میں شعراء سے جو آٹو گراف لئے جاتے ہیں۔ تو استاد قمر کا یہ معمول تھا کہ شعر، اپنا نام اور تاریخ تحریر کرنے کے علاوہ اپنے مکان کا نمبر اور محلہ (لالو کھیت) کا نام بھی لکھ دیتے۔ ایک بار ڈھاکہ ریڈیو اسٹیشن میں کنٹریکٹ فارم پر دستخط کر رہے تھے۔ میں نے کہا استاد! اس پر کہیں اپنے مکان کا نمبر اور لالو کھیت نہ لکھ دیجئے گا، ورنہ یہ فارم بے کار ہو جائے گا۔

اب سے تیرہ چودہ سال پہلے (غالباً ۱۹۵۶ء) کی بات ہے۔ جامعہ اسلامیہ عارف والا میں مشاعرہ تھا۔ استاد قمر اور راقم الحروف کو پاک پتن شریف کے ایس ڈی ایم صاحب کے ساتھ ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا گیا تھا۔ شام کو استاد قمر اور میں ٹہلنے کے لئے نکلے اور نہر کے پل پر جا کر بیٹھ گئے۔ میں نے کہا استاد! آپ کا بچپن اور جوانی تو بڑی آسودگی میں گزری ہے۔ بس میرا یہ کہنا تھا کہ استاد ترنگ میں آ گئے، فرمانے لگے —— جب تم! مجھے میری پھوپھی نے پالا تھا، ہماری حویلی میں گھڑوں اور مشکوں میں اشرفیاں بھری رہتیں، میں ہاتھ ڈال کر اشرفیاں مٹھی میں بھر لیتا اور بنیئے کی دکان پر جا کر ان اشرفیوں کے چنے، مرمرے اور مونگ پھلی مول لے آتا! —— میں نے یہ بات دوستوں کو محمد صاحب کی۔ یہاں سے یہ گفتگو "شہزادی"! ہم بے تکلف احباب اس لطیفے کو دہرا کر خوب لطف لیا کرتے ہیں۔

دو سال ہوئے مرحوم اور راقم الحروف مظفر آباد (آزاد کشمیر) کے مشاعرے سے واپسی میں اسلام آباد ٹھہرے، پاکستان کے نو تعمیر دار الخلافہ کی سیر کو جو نکلے تو ہمارے میزبان نے اشارہ کر کے بتایا کہ یہاں پریسیڈنٹ ہاؤس بنے گا۔ استاد قمر نے اس پر فرمایا، صدر ایوب صاحب کا مکان؟ میں نے عرض کیا کہ یہ صدر ایوب خاں صاحب کا ذاتی مکان نہیں ہوگا، جو کوئی بھی پاکستان کا صدر بنے گا وہ اس میں رہا کرے گا۔

قمر جلالوی مرحوم نے مکتب کے ابتدائی درجوں میں تعلیم پائی تھی، کتابوں کے مطالعہ کا بھی انہیں شوق نہ تھا۔ عرب کے جاہلی شعراء کی طرح اُن کی شاعری فطرت اور ذوق و وجدان کے سہارے پروان چڑھی، شاعری میں وہ کسی کے شاگرد بھی نہ تھے۔ فرماتے تھے کہ میر مینائی کا دیوان آغازِ شباب میں پڑھا اور اُن کو اپنا روحانی استاد مان لیا، وہ بہت جلد شعر کہتے تھے۔ زود گوئی اور خوش گوئی کا اجتماع کم ہی دیکھنے میں آیا ہے۔ طرحی غزلوں کی تکمیل مشاعرے میں بیٹھ کر کرتے، شعراء کو داد بھی دیتے رہتے ہیں اور شعر بھی کہتے جا رہے ہیں۔ انہوں نے اپنا کلام جمع ہی نہیں کیا، غزل کہی، کاغذ پر لکھی اور کاغذ پرانے کاغذوں کے ساتھ کہیں ڈال دیا، ہزاروں شعر دوسروں کو دے دیئے۔ ان کے کلام کا بہت کم حصہ بیاضوں اور کاغذ کے تراشوں میں محفوظ رہ سکا ہے۔ نقاش علی گڑھی ان کے محبوب شاگرد ہیں، ان کی غزل کے مطلع میں ـــ

دشوار سرِ شام سے ایک ایک گھڑی ہے

بیمار کا یہ حال ہے اور رات پڑی ہے

استاد کا فیض، وہ تصرف کس قدر نمایاں ہے۔

چار مہینے ہوئے ریڈیو پاکستان کراچی کے مشاعرے میں شریک ہوئے تو بہت زیادہ مضمحل نظر آئے ستا ہوا چہرہ زبانِ حال سے کہہ رہا تھا۔

چراغِ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں

چند دن کے بعد معلوم ہوا کہ وہ شدید یرقان میں مبتلا ہو گئے، اخباروں میں اُن کی خبریں شائع ہونے لگیں، میں کئی بار عیادت کے لئے گیا دو چار لفظ دھیمی آواز میں مشکل سے بول پائے، پھر انہیں افاقہ ہو گیا، مگر یہ موت کا سنبھالا تھا ۱۵ اکتوبر کو مجھے باہر سفر پر جانا تھا۔ اس سے ایک دن پہلے دو بجے کے قریب تابش دہلوی صاحب نے ٹیلی فون پر یہ غمناک خبر سنائی کہ استاد قمر کا انتقال ہو گیا، ہم ساڑھے تین بجے کے قریب لیاقت آباد پہنچے تو جنازہ تیار تھا مولانا خورشید ترابی سوگواروں کے آگے آگے چل رہے تھے! ہائے! خود اُن کا یہ شعر۔

موت نے کتنا بااخلاق بنایا ہے مجھے
لوگ روتے ہیں مری آنکھ میں آنسو بھی نہیں

مرزا محمود سرحدی مرحوم

"یادِ رفتگاں" کے یہ اوراق لکھ کر ختم ہی کئے تھے کہ روزنامہ "جنگ" میں محمود سرحدی کے انتقال کی خبر پڑھی، ہائے! سوگواری اور تعزیت کا یہ نہ ختم ہونے والا سلسلہ! مگر کیا کیا جائے، موت سے آخر کسی کو بھی مفر نہیں، یہ دن تو ہر کسی کو دیکھنا ہے،

محمود سرحدی مرحوم سے پاکستان بننے کے بعد تعارف ہوا، مشاعروں میں اُن سے ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں، دو سال ہوئے آخری بار اُن سے ملاقات کسٹم کے کل پاکستان مشاعرے میں ہوئی، بیماری کی حالت میں انہوں نے پشاور سے کراچی کا طویل سفر برداشت کیا اور کلیجہ تھام تھام کر مشاعرے میں اپنا کلام سنایا!

حکومتِ پاکستان سے انہیں وظیفہ ملتا تھا، مگر شاعری میں حکومت اور معاشرے پر طنز کرنے سے نہ چوکتے "رویتِ ہلال" کے سلسلہ میں انہوں نے ایک قطعہ کہا تھا جس کا چوتھا مصرعہ یاد رہ گیا ہے۔

ہمارے ڈپٹی کمشنر نے چاند دیکھا ہے

طنز و مزاح میں ان کے قطعے زبان و بیان اور خیال و اظہار کی خوبیوں کے اعتبار سے اپنی آپ مثال ہیں، یہ اردو زبان کا کمال بلکہ اُس کی کرامت ہے کہ سرحد میں ایک شخص نشو و نما پاتا ہے اور اُس کی زبان پر میر، انیس اور داغ کی زبان اور روزمرہ کا گمان ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں —

چمکانے کا قرینہ میں سوچتا ہی رہا — حسین ہے کہ حسینہ میں سوچتا ہی رہا
دمِ وداع نمی تھی جو اُس کے دامن پر — یہ اشک ہیں کہ پسینہ میں سوچتا ہی رہا

اخبار میں اُن کی عمر ۶۵ سال کی بتائی گئی ہے، مگر چہرے مہرے سے اس عمر سے تھوڑے دس برس کم کے لگتے تھے، مشاعروں میں خوابیدہ کلام سناتے، تمھیں آنکھوں ہی آنکھوں میں بہت کچھ کہہ جاتے، لباس اور وضع قطع سادہ، اور سب سے بڑی بات یہ کہ اپنے کمالِ فن کا کوئی احساس نہیں، موت نے اس چہکتے ہوئے بلبل کو بھی ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا —— اللہ تعالیٰ اس اہلِ کمال کی مغفرت فرمائے۔ (آمین)

بہارِ تغزل

شفقت کاظمی

اُن کے کسی ستم کی شکایت نہ کرسکے　اظہارِ حال کی بھی جسارت نہ کرسکے
دل ہے کہ اُن کی یاد میں اب تک ہے بیقرار　دو روز بھی جو ہم سے رفاقت نہ کرسکے
ہم نے تجھے سنا تو دیا حرفِ آرزو　یہ اور بات ہے کہ وضاحت نہ کرسکے
ہر زخمِ دل کو تیری عنایت سمجھ کے ہم　تدبیرِ اندمالِ جراحت نہ کرسکے
ہم کو تو خیر اُن کا بھلانا محال تھا　وہ بھی خیالِ ترکِ محبت نہ کرسکے

اس یارِ سنگدل سے ہمیں آپڑا ہے کام
شفقت جو فرقِ شکر و شکایت نہ کرسکے

رائخ عرفانی :—

دلوں کی آس، امنگوں کا آسرا ہوں میں　کسی شکستہ سفینہ کا ناخدا ہوں میں
نہیں جواب چمن میں مرے تلون کا　کہیں سموم خزاں، کہیں صبا ہوں میں
سینۂ مہتاب کے داغوں سے جل جائیگی رات　چند لمحوں میں شفق بن کے پگھل جائیگی رات
یاس کی ظلمت سے پھوٹے گی کرن اُمید کی　شامِ راحت کی طرح غم کی بھی ڈھل جائیگی رات

سرفراز اورنگ زیب آزردہ :—

کچھ ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے بدل گیا　افسانۂ حیات کا عنواں ترے بغیر

عابد نظامی :—

پژمردہ ہر اک پھول ہے، مغموم کلی ہے　یہ کیسی ہوا صحنِ گلستاں میں چلی ہے

ماہر القادری :—

جھوٹے وعدے سے بھی دل بہل جائے گا　بات رہ جائے گی وقت ٹل جائے گا
گر توجہ نہیں ہے، تغافل سہی　اب تغافل سے بھی کام چل جائے گا
ان دنوں میکدہ اپنی گرمی پہ ہے　جام چھونے سے بھی ہاتھ جل جائے گا
دوستو! ذکرِ مہر و وفا مت کرو　جانے کیا میرے منہ سے نکل جائے گا

غم کی دھوپ اور بھی تیز تر ہو تو کیا
دل کوئی برف ہے جو پگھل جائے گا

ہماری نظر میں

کتاب الرسالہ

از :- امام محمد ابن ادریس شافعی رحمۃ اللہ علیہ (م ۲۰۴ھ) - ترجمہ :- مولانا مفتی محمد امین ضخامت ۴۸۴ صفحات، مجلد رنگین گردپوش، قیمت دس روپے پچاس پیسے

ملنے کا پتہ :- قرآن محل، مقابل مولوی مسافر خانہ، کراچی۔

اصول فقہ و حدیث میں حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑے معرکہ کی کتاب لکھی ہے اس موضوع پر "کتاب الرسالہ" امام موصوف کے علم و فضل کا خلاصہ اور نچوڑ ہے! "اطاعت رسول ؐ کے "فرض و منصوص" ہونے پر اس کتاب میں جو دلیلیں دی گئی ہیں وہ "فتنہ انکار حدیث" کو باطل ٹھہراتی ہیں! "اختلاف حدیث" میں جس دیدہ ریزی کے ساتھ امام شافعیؒ نے مطابقت پیدا کی ہے، وہ ان کی ذہانت و بصیرت اور دینی تفقہ کی روشن دلیل ہے۔

ترجمہ آسان اور عام فہم ہے، کہیں کہیں کھٹک بھی محسوس ہوتی ہے :-

"اس کی خبر اس حالت میں قابل بھروسہ ہونا چاہئے" (صفحہ ۲۳۵) "قابل اعتماد" یا "بھروسہ کے قابل" لکھنا تھا، اس لئے کہ عربی اور یا فارسی اور اردو الفاظ کے درمیان نہ تو اضافت آتی ہے اور نہ واؤ عطف استعمال کیا جاتا ہے ——

"جو گسمد پختہ کھجور سے تیار کی گئی تھی" (صفحہ ۲۴۱) "گدر اور پختہ" بولتے اور لکھتے ہیں۔

کتاب کے مقدمہ میں "گوارا" کا املا "گوارہ" (صفحہ ۹) کیا گیا ہے —— اور "موطا" کو مذکر لکھا ہے "ایک شخص سے موطا (مالکؒ) عاریتہً حاصل کیا" (صفحہ ۱۹) "موطا" اردو میں مونث بولی جاتی ہے!

فاضل مترجم نے بعض مقامات پر ترجمہ کے علاوہ بعض مفید حواشی بھی درج کئے ہیں مثلاً صفحہ ۲۶۷ پر وہ بتاتے ہیں کہ "امام شافعیؒ کے نزدیک منقطع اور مرسل باہم متحد المعنیٰ ہیں، لیکن بعد کے محدثین نے ان دونوں قسموں میں تفریق پیدا کر دی ہے"

یہ بڑے کام کی کتاب اردو میں منتقل ہوئی ہے، علماء احناف کو اس کتاب سے ضرور استفادہ کرنا چاہئے، بعض مسائل میں امام شافعیؒ کی دینی بصیرت علماء کرام کو تزئین کر عطا کرے گی۔

مکاتیب ابوالکلام آزاد

ترتیب و مقدمہ :- ابوسلمان شاہ جہاں پوری، ضخامت ۴۰۸ صفحات (سپید دبیز دیدہ زیب)، قیمت اکیڈمی لائبریری ایڈیشن ۷ روپے، مجلد دس روپے

ملنے کا پتہ :- اردو اکیڈمی سندھ، کراچی

جناب ابوسلمان شاہ جہاں پوری مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے بڑے مداح اور عقیدت مند ہیں، صاحب موصوف اپنی تحریروں کے

ذریعہ اس عقیدت کا حق ادا کرتے رہتے ہیں، انہوں نے مولانا آزاد کی شخصیت اور ان کی عبقریت اور علمی فضیلت پر بہت سے
مضامین لکھے ہیں، ابو سلمان صاحب کی تحریریں سنجیدہ ہوتی ہیں اور اختلافی مباحث میں بھی اُن کا قلم تہذیب و شرافت کے
مضمون کا پابند رہتا ہے۔

صاحب موصوف نے مولانا آزاد کے خطوط اور بعض تحریریں جمع کرنے میں بڑی کاوش و جستجو اور محنت سے کام لیا ہے۔
کی یا فت اور عرق ریزی قابل داد ہے، یہ خطوط انہوں نے بڑے سلیقہ کے ساتھ مرتب فرمائے ہیں اور ان پر جو مقدمہ لکھا ہے
بڑا زرفی اور معلومات آفریں ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم سے غیر معمولی عقیدت رکھنے کے باوصف انہوں نے مولانا آزاد کے ایک تاریخی تسامح کی گرفت کی ہے
مولانا مرحوم نے خواجہ عبدالوحید صاحب کو اپنے خط (ص ۱۹۶) میں تحریر فرمایا تھا۔

"شاہ صاحب نے یہ ترجمہ سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی فرمائش سے کیا، سید صاحب کو
تحصیل علم کا موقع نہیں ملا تھا، انہوں نے چاہا تھا کہ قرآن مجید کے مطالب اُردو میں معلوم کریں۔"

اس پر ابو سلمان شاہجہان پوری نے حاشیہ میں نقد و احتساب کیا ہے۔

"حالانکہ صحیح نہیں۔ سید احمد شہید کی پیدائش ۶ صفر ۱۲۰۱ھ کو ہوئی اور شاہ صاحب کا ترجمہ ۱۲۰۵ھ
میں مکمل ہو چکا تھا، جب سید صاحب زیادہ سے زیادہ چار ساڑھے چار برس کے ہوں گے، پھر اُن کی
فرمائش کا کیا موقع تھا؟ شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت میں سید صاحب پہلی مرتبہ اس وقت پہونچے جب
اُن کی عمر کم و بیش اٹھارہ سال کی تھی۔ یہ بیان مولانا کی سنی سنائی باتوں پر مبنی ہے، خود انہوں نے
تاریخوں کی تحقیق نہیں فرمائی تھی۔"

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے خود اپنی ذات اور خاندان کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اُس کی تحقیق میں اُن کے عقیدت مند
ابو سلمان صاحب کی طرح انصاف پسندی اور حق گوئی کے تقاضوں کا خیال رکھیں تو اس نزاع کا بہت کچھ دھندلکا چھٹ
سکتا ہے۔

اس مجموعہ مکاتیب کا پہلا خط مولانا عبدالرزاق کانپوری مرحوم کے نام ہے، جس میں مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں۔

"گزشتہ کانفرنس میں کہ جو کلکتہ میں جلسہ ہوا تھا، مولانا شبلی صاحب سے نیاز حاصل ہوا۔" ... (۱)

اور

"پٹنہ کی بابت جو کچھ آنجناب نے تحریر کیا ہے، بجا ہے۔ ۱۱ رجب المرجب کو میں پٹنہ جاؤں گا
کیونکہ ندوۃ العلماء کا سالانہ جلسہ ہے۔" (۲)

اس پر ابو سلمان صاحب نے حاشیہ میں لکھا ہے۔

"(۱) آل انڈیا محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس سیزدہم منعقدہ کلکتہ ۱۸۹۹ء دسمبر
(۲) ۴ اگست ۱۹۰۰ء کو ندوہ کے جلسہ انتظامیہ میں طے کیا گیا تھا، کہ ۱۱ رجب المرجب ۱۳۱۸ھ
مطابق ۴ نومبر ۱۹۰۰ء کو پٹنہ میں سالانہ جلسہ ہو۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت مولانا آزاد
کا یہ خط ۴ اگست اور ۴ نومبر ۱۹۰۰ء کی درمیانی مدت کا ہے، مولانا کا یہ سب سے پہلا خط ہے

جو اب تک دستیاب ہوا ہے ؟

مولانا ابوالکلام آزاد کی پیدائش کے بارے میں ہم نے ابوسلمان شاہ جہانپوری صاحب سے دریافت کیا، انہوں نے جواب دیا
"مولانا مہر صاحب کے حساب سے یہ عیسوی تقویم کے مطابق ۱۶ / یا ۱۷ / اگست ۱۸۸۸ء ہوتی ہے۔"

اس حساب سے مولانا آزاد گیارہ برس کی عمر میں پہلی بار اور دوسری بار جب وہ بارہ برس کے تھے، ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں شریک ہوئے۔ گیارہ بارہ سال کی عمر بلوغ سے قبل کی عمر ہے، اس کمسنی میں ان کا تعلیمی کانفرنسوں میں شریک ہونا بہت عجیب لگتا ہے اس کی تاویل بس یہی ہو سکتی ہے کہ مولانا آزاد کے جسم و عقل کی نشوونما کو معجزہ یا کرامت سمجھا جائے۔

اس کتاب کے مقدمہ میں فرانسیسی مستشرق لوئی میسنو کے مضمون کا ایک اقتباس صفحہ ۲۹ پر دیا گیا ہے۔

"آج سے ٹھیک پچاس برس پہلے کی بات ہے کہ ۱۹۰۸ء میں پہلے پہل میری ملاقات بغداد میں ہوئی تھی۔ رفیق و شفیق استاد حاجی علی آلوسی کے حضور دونوں نے زانوئے تلمذ تہہ کیا تھا اور مسجد مرجان میں ہم پہلو بہ پہلو تعلیم پاتے تھے۔"

اس پر فاضل مرتب لکھتے ہیں ـــــــ

"فرانسیسی مستشرق کی اس شہادت نے تمام شبہات کو دور کر دیا، اس مسئلہ میں اب کوئی اختلاف باقی نہیں رہا۔"

سب سے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد کے سفرِ مصر کے بارے میں اختلافی بحث کا آغاز ہوا تھا، مسٹر مہا دیو ڈیسائی کو مولانا آزاد کے خاندانی حالات اور ان کے سفر وغیرہ کا علم مولانا کے بتانے سے ہوا، مسٹر ڈیسائی نے مولانا کے حوالہ سے اپنی کتاب میں لکھا کہ مولانا ابوالکلام نے جامعہ ازہر میں تعلیم حاصل کی، ان کے والد کی بھی یہی تمنا تھی، اس پر بحث چھڑی تو عبدالشاہد شیروانی صاحب نے اس واقعہ کی یوں تصحیح کی کہ مہا دیو ڈیسائی کو غلط فہمی ہو گئی تھی، مولانا نے تو یہ فرمایا تھا کہ انہوں نے مصر کے سفر میں ازہر کے اکابر علماء سے استفادہ کیا تھا (مفہوم کی ترجمانی، متن کے الفاظ ذہن میں محفوظ نہیں رہے)

مولانا آزاد نے اپنے سفرِ عراق کا جو ذکر "کاروانِ خیال" میں فرمایا ہے اور جس کے بارے میں "مکاتیب ابوالکلام" کے مرتب نے لکھا ہے ـــ

"۔ ۔ ۔ ۔ دنوں تک یہ بات موضوع بنی رہی کہ آیا یہ واقعہ ہے یا محض افسانہ سرائی! یہ غلط فہمی حضرت علامہ سید سلیمان ندوی نور اللہ مرقدہٗ کے بعض جملوں سے پیدا ہوئی (صفحہ ۶۶)

ـــ تو ـــ

فرانسیسی مستشرق لوئی میسنو کی جو شہادت مہیا کی گئی ہے اس نے "شبہات" کو دور کہاں کیا؟ بلکہ اور الجھا دیا "کاروانِ خیال" میں مولانا ابوالکلام آزاد کا جو خط (۱۹) ـــ اے بالی گنج کلکتہ ۹ دسمبر ۱۹۴۲ء بنام مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی صدر یار جنگ مرحوم شائع ہوا ہے، اس میں اول تو نام ہی کا اختلاف پایا جاتا ہے، مولانا آزاد نے "شیخ آلوسی زادہ" لکھا ہے، موسیو میسنو ان بزرگ کا نام استاد حاجی علی آلوسی بتاتے ہیں، حالانکہ مولانا آزاد نے ان کے بھائی کا نام ـــ شیخ نعمان ـــ لکھا ہے، مولانا موصوف نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ یہ بزرگ (شیخ آلوسی زادہ) تفسیر روح المعانی کے مصنف شہاب الدین دی مفتی بغداد کے صاحبزادے تھے! یہ بات بھی خاصی غور طلب ہے۔ کہ بغداد کی عام زبان عربی ہے، ان صاحب کو

ابن آلوسی" کے نام سے مشہور ہوتا تھا، "آلوسی زادہ" ترکاری ترکیب ہے جس طرح ایران کے مشہور تنقید نگار "ڈاکٹر رضا زادہ" کے نام
ترکیب! پھر مولانا آزاد نے ان "آلوسی زادہ" یا بقول لوئی مسینو" استاد حاجی علی آلوسی سے شرف تلمذ اور تعلیم حاصل کرنے کا اپنے خط
کہیں ذکر نہیں فرمایا مگر مولانا آزاد کے سفر عراق کے شاہد اور مصدق لوئی مسینو صاحب نے تو یہاں تک لکھ دیا۔

"کہ مسجد مرجان میں ہم پہلو بہ پہلو تعلیم پاتے تھے۔"

مستشرق لوئی مسینو صاحب کی شہادت نے اس شبہ اور غلط فہمی کو، جسے علامہ سلیمان ندوی سے منسوب کیا گیا ہے دُور کرنے کے بجائے اور
زیادہ قوی بنا دیا۔

"کاروانِ خیال" میں مولانا آزاد کے خط کے اس جملہ ــــ

"اس کے ابتدائی دو شعر بھی آپ کو یاد دلا دوں کہ کسی نے نوکِ نشتر سے صفحہ دل پر لکھ دیئے ہیں (ص ۸۴)

میں "صفحہ دل" کے بجائے "لوحِ دل" ہوتا تو "لکھ دیئے" کا استعمال صحیح سمجھا جاتا۔

علامہ شبلی نعمانی کو مولانا آزاد نے "آقائے من" اور "یا مولی الجلیس" کے القاب سے جو خطاب کیا ہے یہ اُن کی وسعت ظرف
اور اکابر کے احترام و قدر شناسی کی دلیل ہے۔

"حسرت صاحب سے بمبئی میں ملاقات ہوئی تھی وہ رائے و فکر کے آدمی نہیں ہیں ان کا اصلی جوہر
استقامت عمل ہے، پس اُن امور میں ان کی رائے پر اعتماد بے سود ہوگا" (ص ۱۰۷)

مولانا ابوالکلام آزاد نے مولانا حسرت موہانی کے بارے میں بڑی جچی تلی رائے دی ہے اُن کا اخلاص اور جوش اپنی جگہ مسلم تھا
مگر وہ صاحب الرائے نہ تھے۔

شاہ عبدالقادر صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے ترجمہ قرآن اور حواشی پر مولانا آزاد نے بڑی جرأت کے ساتھ تنقید کی ہے ــــ
فرماتے ہیں ــــ

"شاہ صاحبؒ کی سب سے بڑی خدمت جس کی اردو زبان ہمیشہ ہمیشہ اُن کی احسان مند رہے گی
یہ ہے کہ انہوں نے اس وقت قرآن کا ترجمہ کیا، جب زبان بالکل طفولیت کی حالت میں تھی اور
نثر نویسی بھی پوری طرح شروع نہیں ہوئی تھی، ایسا کام صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو زبان کے
ڈھالنے والے ہوتے ہیں۔

باقی رہا مطالب قرآن اور اس کی تعبیرات کا معاملہ تو اہل نظر سے مخفی نہیں کہ اس باب میں
ان کے سامنے عام سطح سے کوئی بلند تر مقام موجود نہ تھا، انہوں نے کہیں بھی جلالین و بیضاوی سے
آگے قدم نہیں بڑھایا اس لئے وہ تمام کمزوریاں اُن کے تفسیری اختیارات میں موجود ہیں، جو عام طور
پر متداول تفاسیر میں پائی جاتی ہیں،

یہی حال حواشی موضح القرآن کا ہے کہ ضعیف قصوں اور اسرائیلی روایات سے بھی انہوں نے احتراز
نہیں کیا ــــ" (صفحہ ۱۹۷)

"زمانہ کی قدر ناشناسی" پر مولانا آزاد کا تبصرہ ـــ

"زمانے کی حالت کا آپ نے جو اندازہ کیا ہے صحیح ہے، لیکن زمانہ نے خدمت گذارانِ حق سے

کب موافقت کی ہے کہ آج کرے گا، اس کی توقع نہ رکھئے اور صرف ادائے فرض کی کوشش
کیجئے، سعی و عمل کا میدان وسیع ہے ۔"

یہ جملے کتنے بلیغ اور حکمت آمیز ہیں ـــــ اس عبارت میں "کہ" کے بجائے وجدان "جو" کا تقاضا کرتا ہے ۔

"الحمد للہ میں نے اس بارے میں مجتہدانہ بصیرت پائی ہے۔" (ص ۹۷)

اپنے قلم سے "مجتہدانہ بصیرت" کا اعلان و اعتراف ....!؟

"اخویم مولوی عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی جنھے فقیر کے ہاتھ پر بیعت کی ہے، وہ بیعت لینے اور
تعلیم و ارشاد و سلوک سنت میں فقیر کی جانب سے ماذون و مجاز ہیں، جو طالب صادق اُن کے ہاتھ
پہ بیعت کریں گے، انہوں نے خود فقیر سے بیعت کی ۔ والعاقبۃ للمتقین ـــــ فقیر ابوالکلام
کان اللہ لہ ۱۸ شعبان ۱۳۳۸ھ" (صفحہ ۱۰۴)

قیام نظام جماعت اور مسلمانانِ ہند کی امامت کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کی امامت پر مسلمانانِ ہند کا کب اجماع ہوا تھا؟ اور اس "سندِ خلافت" میں مولانا نے "نظام جماعت و شریعت" کے بجائے "تعلیم ارشاد و سلوک سنت" کا ذکر فرمایا ہے، حالانکہ معلم ارشاد و سلوک اور شیخ طریقت کی حیثیت سے وہ کبھی معروف نہیں ہے، اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس مقدس و جلیل منصب کے لیے مولانا کی نگاہ نے عبدالرزاق ملیح آبادی کو منتخب فرمایا ۔ ان ملیح آبادی صاحب کے بارے میں سننے میں آیا ہے کہ انہوں نے علمار دین کی ضد میں ڈاڑھی منڈا دی تھی اور ان کی زندگی حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن اور مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد امیر شریعت کی دینی زندگی کی طرح نہ تھی، "خلیفہ" کا یہ حال اور امام و شیخ طریقت نے ہند دراج میں وزارتِ تعلیمات کا عہدہ قبول فرماکر، دعوتِ خلافت الٰہی اور تعلیم ارشاد و سلوک کی بساط ہی لپیٹ کر رکھ دی ۱۹۲۰ء کا معلم ارشاد و سلوک اور "امام الہند" ۱۹۴۷ء میں لادینی حکومت کا "وزیر منتری" اور انگریز کے دورِ حکومت کا حق گو مجاہد ہند دراج میں مہر بلب اور مسلمانوں کے قتل و غارت گری کا چودہ سال تک خاموش تماشائی ۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے مکاتیب انشا پردازی کا اعلیٰ نمونہ ہیں اُردو ادب میں وہ طرز خاص کے موجد ہیں، مگر کہیں کہیں اُن کی عبارتیں کھٹکتی بھی :-

"میرے علم میں آپ کی جو تکلیفیں آئیں، میں اُنہیں دُور کرنا اپنا فرض سمجھوں گا، بشرطیکہ میرے
علم میں آئیں، لیکن اگر آپ مجھے نہ کہیں تو کیا کرسکتا ہوں۔" (ص ۱۸۱)

"مجھے" نہیں "مجھ سے" کا محل تھا ـــــ

"جب چھاپی دفعہ کاغذ کی نسبت پریس سے اطلاع ملی تو میں نے اُسی وقت لاہور تار بھیج دیا تھا
کہ حسب معمول سو ریم اور بھیج دیں اور خیال یہ تھا کہ انہوں نے بھیج دیا ہوگا۔" (ص ۱۸۹)

"ریم" تو یورپ کو کہتے ہیں، کورے کاغذوں کے دستوں کے بنڈل کو اُردو میں "رِم" بروزن "علم" لکھتے اور بولتے ہیں ـــــ اس عبارت کا آخری ٹکڑا یوں ہونا چاہئے تھا ـــــ

اور خیال تھا کہ انہوں نے رم بھیج دئیے ہوں گے

یا

اور خیال تھا کہ انہوں نے کاغذ بھیج دیا ہوگا

"بھیج دیں" کے بعد "رہ" یا "کاغذ" کا لانا عبارت کے سیاق و سباق اور دروبست کے لحاظ سے ضروری تھا۔

"اور باقی معاملات صدر (کانگریس) پر چھوڑ دینا چاہئے" (ص ۲۶۱)

"معاملات" تو جمع ہے "چھوڑ دینے چاہئیں" لکھنا تھا ——— یا پھر یوں ———

"اور باقی معاملات کو صدر پر چھوڑ دینا چاہئے"

ہو سکتا ہے کہ "کو" کا چھوٹ جانا سہو کتابت ہو ــــ

"ہندوستان میں ڈیڑھ سو برس سے برٹش حکومت قائم ہے، لوگ اس کی موالات کرتے ہیں" (ص ۲۹۱)

اس موقع پر "کی" نہیں "سے" بولتے ہیں۔

"آپ کے کلام میں تخیل کی وسعت اور الفاظ و تراکیب کی ثقاہت دونوں خوبیاں ہیں اور انہی دو عنصروں کی ترکیب کا نام شاعری ہے" (ص ۲۵۲)

مولانا ابوالکلام آزاد شعر و سخن کا نہایت پاکیزہ اور بلند ذوق رکھتے ہیں، یہ خط انہوں نے روا روی میں لکھا ہے ——— "تخیل" وسیع ہونے کی بجائے "نازک" ہو اور الفاظ و تراکیب میں ثقاہت کی جگہ شوخی اور رنگینی پائی جائے تو کیا اس پر شاعری کا اطلاق نہ ہوگا؟ مولانا نے شاعری کی جو تعریف بیان کی ہے وہ جامع نہیں یک رخی ہے!

"رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی" (ص ۲۳۲) ابوسلمان شاہجہانپوری صاحب کو کیا اس کا علم نہیں ہے کہ ملت نے یہ خطاب صرف مولانا محمد علی جوہر کو دیا تھا۔ یہ خطاب عام شہرت اور قبولیت حاصل کر چکا ہے۔

"منشی سید انتظار عالم ضلع ایٹہ کے ایک مشہور موضع مارہرہ میں پیدا ہوئے" (ص ۳۱۵ ــ مرتب)

مارہرہ موضع نہیں مشہور قصبہ ہے!

"آپ کے والد ڈاکٹر احمد یار خاں علی گڑھ کے ایک مشہور طبیب تھے" (ص ۳۳۴ ــ مرتب)

ساغر نظامی صاحب کے والد نہ ڈاکٹر تھے اور نہ طبیب! وہ تو "ویکسینیٹر" تھے!

"ملک کے تمام چوٹی کے لیڈروں سے ان کے (یعنی بیگم حسرت موہانی کے) تعلقات تھے" (ص ۳۸۰)

اس کتاب کے مرتب نے مولانا حسرت موہانی کی بیگم صاحبہ (نشاط النساء مرحومہ) کے حالات کے ضمن میں یہ جملہ لکھا ہے، اس میں "تعلقات" کا لفظ کس قدر نامناسب ہے!

فاضل مرتب نے بہت سے زندہ اکابر کا ذکر کیا ہے مگر "مدظلہ" تنہا عبدالوحید صاحب کے نام (ص ۱۹۵) کے ساتھ لکھا ہے۔ ابوسلمان صاحب انجمن ترقی اردو پاکستان سے ملازمت کا تعلق رکھتے ہیں اور خواجہ عبدالوحید صاحب کے صاحبزادے مشفق خواجہ صاحب انجمن مذکور کے نائب معتمد ہیں اس نسبت سے یہ احترام ضروری سمجھا گیا ـــ

"۔ ۔ ۔ ۔ یہ عہد صرف تخم ریزی کا ہے، جو کاشتکاری کے کاموں میں سب سے زیادہ محنت طلب اور مشکل وقت ہے، فصل کاٹنے کا وقت نہیں ہے جب وہ وقت آئے گا تو دنیا ان لوگوں کو یاد کرے گی جنہوں نے بیج بونے کی محنت اپنے ذمہ لی تھی اور پھل کھانے کی لذت آنے والوں کے لئے چھوڑ دی تھی"

مولانا ابوالکلام آزاد کے یہ شہ پارے موتیوں میں تولنے کے قابل ہیں۔

جناب ابوسلمان شاہ جہاں پوری نے اس کتاب کو بڑے سلیقہ سے مرتب کیا ہے، جس کی علمی و ادبی حلقوں سے تحسین کی جانی
ے، کتاب کے آخر میں جو "اشاریہ" دیا ہے وہ بھی فاضل مرتب کی محنت اور سلیقہ کا آئینہ دار ہے۔

فات

مجلس ادارت :- قاضی عبدالقادر، حشمت حبیب، پی' ری مصطفیٰ اور محمد صابر - ضخامت ڈھائی سو صفحات۔
ملنے کا پتہ :- پاکستان نیشنل آئلز لمیٹڈ کا نشا دالا بلڈنگ، گارڈن روڈ، کراچی

نزول قرآن مجید کے جشن چودہ سو سالہ کے سلسلہ میں سیرت کمیٹی پاکستان نیشنل آئلز کی قرآنی تعلیمات پر یہ حسین و جمیل دینی
ی پیشکش زیادہ سے زیادہ تحسین و پذیرائی کی مستحق ہے۔ انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں کے مضامین بصیرت افروز اور یقین آفریں ہیں
والوں میں بیشتر تعداد مشاہیر ارباب فکر کی ہے! "عرفات" کا سرورق دیدہ و زیب اور جاذب نظر ہے، کتابت، کاغذ اور
ت اعلیٰ اور معیاری! افادہ عام کی غرض سے اس کتاب کی قیمت نہیں رکھی گئی، اللہ تعالیٰ اس کے مرتبین اور ناشرین کو دارین میں
بہیں عطا فرمائے۔

اقِ ہنر

جناب حسنین کاظمی ان دنوں ریڈیو پاکستان کے شعبہ فارسی کے نگراں ہیں، صاحب موصوف کئی برس تہران میں پاکستان
کے سفارت خانہ سے وابستہ رہے ہیں، اس زمانے میں انہوں نے ادبیات ایرانی سے مناسبت اور واقفیت
حاصل کی، یہاں تک کہ اُن کی غزلیں اور مضامین ایران کے رسالوں اور اخباروں میں شائع ہونے لگے۔

"رواقِ ہنر" میں حسنین کاظمی کے اُن اردو اور فارسی غزلیات و مضامین کی فہرست دی گئی ہے، جو وقتاً فوقتاً ایران،
نان اور ہندوستان کے رسائل و جرائد میں چھپتے رہے ہیں۔ اس فہرست کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کاظمی صاحب کسی
ند نہیں ہیں، انہوں نے گوناگوں موضوعات پر ادبی مضامین اور افسانے لکھے ہیں!

کتاب میں دو تصویریں بھی ہیں، ایک تصویر میں کاظمی صاحب استاد سعید نفیسی کے ساتھ اور دوسرے فوٹو گروپ میں صادق
کے ساتھ محوِ کلام ہیں --- ڈاکٹر سید آل یاسین رضوی نے اس کتابچہ پر دلچسپ مقدمہ لکھا ہے --- کاظمی صاحب کو اپنے مضامین
تاب بھی چھپوانا چاہیئے!

ن اور انسان

از :- میر ولایت علی، ضخامت ۱۸۴ صفحات، قیمت تین روپے،
ملنے کا پتہ :- ادارۂ علمیہ ۱۳۲۱- جدید ملک پیٹ حیدرآباد ۳۶، اے' پی' انڈیا۔

جناب میر ولایت علی اسلام اور ملت اسلامیہ بلکہ انسانیت عامہ کی خیر خواہی کا جذبہ رکھتے ہیں اور اس کی برسوں سے
دے رہے ہیں کہ اہل ایمان صرف عقیدہ ہی پر کفایت نہ کریں، عقیدہ کے ساتھ "عمل" لازمی شے ہے یعنی حق پسندوں کے قول و عمل
تیہ و کردار میں پوری ہم آہنگی ہونی چاہیئے، صاحب موصوف نے اس مقصد کے لئے کتابیں لکھی ہیں، جن میں کوئی شک نہیں تفکر و تعقل
ی نظر آتی ہے، مگر اس آجانے میں خاصہ اندھیرا بھی مل گیا ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ میر صاحب موصوف نے اپنے چالیس سال
جب انہوں نے دینی مسائل پر غور و فکر کا آغاز فرمایا تو وہ علامہ مشرقی کے فکر و خیال سے متاثر ہوئے، مشرقی صاحب کا علم و
اور دیانت اپنی جگہ مسلّم ہے مگر ان کی غیر محتاط حریت فکر نے دین و شریعت کی اقدار بلکہ بعض مسلمات تک کو مجروح کر دیا
میر ولایت علی صاحب نے اُن لوگوں کی کتابوں سے استفادہ کیا جن کی گمراہی پر پوری امت کا اتفاق ہے، محمد علی لاہوری
غلام احمد پرویز کی کتابیں اور تحریریں جن مسلمان کے افکار و عقائد کا ماخذ ہوں گی۔ اُس کے زبان و قلم اور غور و تفکر کے نتائج
ہ روی کے نمونے نمایاں طور پر نظر آنے چاہئیں، وہ لکھتے ہیں ---

"مسئلہ ارتقائے عالم آراء و مسائل کے من جملہ ہے جس کی تصدیق میں مختلف قرون کے علماء نے بحثیں کیں اور ہر بار متعدد اضافے ہوتے رہے" (ص ۷۷)

اس سلسلہ میں انہوں نے فارابی، ابن سینا، ابن باجہ اور ابن مسکویہ کے نام لئے ہیں اور انہیں حکمائے اسلام بتایا ہے، حالانکہ یہ دانشور "مسلم حکماء" تھے "حکمائے اسلام" نہ تھے، ان حکماء پر یونانی فلسفہ غالب تھا، خاص طور سے ابن سینا اور فارابی نے بعض ایسے خیالات پیش کئے ہیں جو نہ صرف غیر اسلامی ہیں بلکہ اُن سے زندقہ و الحاد کی بو آتی ہے، مثلاً ان کا یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ کو "جزئیات" کا علم نہیں ہوتا، یہ عقیدہ کفریہ عقیدہ ہے!

قرآن کریم میں "آدم" کی پیدائش کا جن لفظوں میں ذکر کیا ہے ہم اُس کو درست سمجھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی قدرت "کن فیکون" پر یقین رکھتے ہیں، قرآن میں انسان کی نباتی اور حیوانی زندگی کا کہیں اشارہ تک نہیں آتا، قرآن کریم کے مقابلہ میں مولانا روم کے صوفیانہ افکار کو ترجیح نہیں دی جاسکتی اُن کی یا تو توجیہہ کی جائے گی یا پھر انہیں رد کردیا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کسی کا قول سچا یقینی اور معتبر نہیں ہوسکتا۔

میر صاحب نے بعض احادیث بھی اپنی کتاب میں درج کی ہیں، جن کو نقل کرکے وہ یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ (معاذاللہ) قرآن کریم کے مضامین سے ان کی مطابقت نہیں ہوتی ــــ یہ ان کی قلت فکر کا نتیجہ ہے اور "فن حدیث" کے بارے میں وہ "منکر سنت" غلام احمد پرویز سے جسے بجا طور پر "منکر نبوت" کہا جاسکتا ہے، متاثر ہوگئے ہیں۔

"مسلم کی ایک حدیث ہے کہ جو شخص علاوہ فرض کے دن رات میں بارہ رکعتیں پڑھ لے، اُس کے لئے جنت میں ایک گھر بنا دیا جاتا ہے" (ص ۱۰۱)

میر صاحب نے اس پر غور و فکر نہیں کیا کہ قرآن کریم "صلوٰۃ" کی یہ تعریف کرتا ہے کہ وہ "فحش و منکر" سے روکتی ہے، جو مسلمان فرض رکعتوں کے علاوہ بارہ رکعتیں مزید پڑھ لے اُس میں اور زیادہ "تقویٰ" کی صفت پیدا ہو جائے گی اور اس مداومت کے بعد وہ برائیوں سے رُکا رہے گا۔ اور نیکیوں کے تقاضوں کو پورا کرے گا ــ اس کو حدیث میں "جنت میں گھر بن جانے" سے تعبیر کیا گیا ہے اس میں یہ کہاں فرمایا گیا ہے کہ ایسا مسلمان جہاد نہیں کرے گا! کسی ایک نیک عمل پر ثواب دئے جانے یا "جنت میں گھر بنانے" یا "مغفرت ہو جانے" کے یہ معنی نہیں ہیں کہ دوسرے نیک اعمال بجا لانے کی پھر ضرورت ہی نہیں رہتی! جب کوئی طبیب کسی مریض سے یہ کہتا ہے کہ تمہارے لئے دونوں وقت دہی کھانا، تمہاری صحت کا ضامن ہے" ــــ طبیب کے اس کہنے سے یہ نہیں سمجھا جاسکتا کہ وہ مریض "دہی" کھا کر ہر قسم کی بد پرہیزی کرسکتا ہے اور صحت جسمانی کے اصول کی خلاف ورزی اُسے نقصان ہی نہیں پہونچا سکتی!

شفاعت، آخرت، قیامت، بعث بعد الموت ــــ کی اس کتاب میں جو توجیہیں کی گئی ہیں، وہ تجدد اور آزاد خیالی کا بڑا نمونہ ہیں۔ اور سب سے زیادہ افسوسناک بات تو یہ ہے کہ میر ولایت علی صاحب مسٹر غلام احمد پرویز کے اس کفریہ عقیدہ سے متفق ہیں کہ:-

"عربی زبان اطاعت کا لفظ زندہ و موجود سردار کے موقت احکام کی تعمیل کے لئے ہی استعمال ہوتا ہے" (ص ۱۷۲)

"اطیعوا الرسول" سے مراد موجود الوقت امیر جماعت کے موقتی احکام کی تعمیل کرنا ہے...... حضور اکرم اپنی حیات طیبہ میں صدر مملکت اسلامی یعنی مرکز ملت خود تھے...." (ص ۱۷۳)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "اطیعوا الرسول" اور مسٹر پرویز اور اُن کے مقلد و متبع میر ولایت علی صاحب کہتے ہیں کہ "الرسول" سے ہر دور کا مرکز

(بقیہ صفحہ ۴۳ پر)

جنوری سنہ ۱۹۶۹ء

ماہنامہ

فاران کراچی

شمارہ ۱۰ - جلد ۲۰

ایڈیٹر :- ماہر القادری

ترتیب

سالانہ چندہ ۷ روپے — قیمت فی پرچہ ۶۲ پیسے

پبلشر :- ماہر القادری

دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱ تغیر زمانہ کی سرشت اور انقلاب وقت کا مزاج ہے۔ فرد ہو، جماعت ہو یا حکومت ہو، یہ جیسے حالات سدا کسی کے نہیں رہے۔ تاریخ دراصل واقعات و احوال کے اسی مدوجزر کا نام ہے۔ کبھی کے دن بڑے، کبھی کی راتیں، دنیا میں یہی ہوتا رہتا ہے۔

ہمیں است رسمے سرائے فریب
گہے بر فراز و گہے بر نشیب

گردش ایام کی دھوپ چھاؤں سے نہ جھونپڑیوں کو مفر ہے اور نہ قصر والوان اس کی زد سے بچ سکتے ہیں۔

کم کُن ز کبر و ناز کہ دیدہ است روزگار
چین قبائے قیصر و طرفِ کلاہ کے

— اور —

زمانہ جام بدست و جنازہ بردوش است

اس دنیائے آب و گل کو فلسفہ کی زبان میں اسی لئے تو "عالم کون و فساد" کہا جاتا ہے، زمانہ کے سمندر میں واقعات و حالات کے بلبلے ابھرتے ٹوٹتے رہتے ہیں!

جس کسی نے تاریخ کو قصے کہانیوں کی طرح پڑھا اس نے تاریخ کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا، تاریخ دراصل عبرت کا مرقع اور قوموں کے عروج و زوال کا ٹیلی ویژن ہے۔ اس ٹیلی ویژن کی رنگا رنگی، حیرت انگیزی اور عبرت آفرینی کا یہ عالم ہے کہ واقعات کے ایک ہی ڈرامہ میں نادر خاں، ملا شور بازار اور بچہ سقہ کے کردار نظر آتے ہیں۔

اس کائنات میں تخلیق آدم ہی کے وقت سے نور و ظلمت اور خیر و شر کے درمیان معرکہ آرائی رہی ہے، دنیا کے پردے پر مختلف اور متضاد قسم کے کردار اور شخصیتیں ابھرتی رہی ہیں، حجاج ثقفی تاریخ کی مشہور شخصیت ہے، جس کے ظلم سے رعایا پناہ مانگتی تھی اور حضرت عمر ابن عبدالعزیز بھی تاریخ کے سینہ میں جن کے عدل و انصاف کی مثال دی جاتی ہے۔

دنیا میں یہ سب کچھ آپ ہی آپ نہیں ہو رہا ہے، ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر ایک ذرہ بھی حرکت نہیں کر سکتا، ہر چیز کی چوٹی اللہ تعالیٰ کے دستِ قدرت میں ہے، ارشاد باری ہے۔

وتلک الایام نداولہا بین الناس (آل عمران رکوع ۱۴)

(یہ تو زمانہ کے نشیب و فراز ہیں، جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں) (تفہیم القرآن)

فلاسفہ کے نزدیک زمانہ مقدارِ حرکت کا نام ہے، مگر زمانہ خود تو اپنے کو حرکت نہیں دے سکتا، یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے جو زمانہ کو حرکت دیتی اور وقت کو گردش میں رکھتی ہے، انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار جوابدہ اور مکلف ہونے کے باوجود تقدیر کے آگے بے بس ہے، تقدیرِ مُبرم کو انبیاء کرام نہیں بدل سکے، یہ قضاء و قدر کا ظہور تھا کہ صحابہ کرام جیسے نفوسِ قدسیہ کے درمیان جمل و صفین کے خونریز معرکے واقع ہو کر رہے۔

قرآن کریم کی جس آیت کا ابتدائی حصہ اوپر درج کیا گیا ہے، اس کے بعد کی عبارت یہ ہے:-

وليعلم الله الذين آمنوا ويتخذ منكم شهداء ط والله لا يحب الظلمين

(تم پر یہ وقت اس لئے لایا گیا کہ اللہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم میں سچے مومن کون ہیں؟ اور ان لوگوں کو چھانٹ لینا چاہتا تھا جو واقعی (راستی کے) گواہ ہوں کیونکہ ظالم لوگ اللہ کو پسند نہیں ہیں)

قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ حالات کے الٹ پھیر اور زمانہ کے انقلابات میں اللہ تعالیٰ کی حکمت نہاں ہے، اس طرح اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کا امتحان لینا چاہتا ہے کہ زمانہ کے انقلابات میں کون کیا پارٹ ادا کرتا ہے؟ اور کون کس کا ساتھ دیتا ہے! —————— زمانہ کا الٹ پھیر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش ہے، جو اس آزمائش میں ـــ پورا اترا وہی دراصل کامیاب ہے۔

یہ دنیا آزمائش گاہ ہے، یہاں ہر لحظہ ہر انسان کا امتحان لیا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فرشتے ہر انسان کے اعمال لکھ رہے ہیں۔ قیامت کے دن یہ ریکارڈ پیش کیا جائے گا اور اسی کے اعتبار سے جزا اور سزا دی جائے گی!

اضطراب؟

پاکستان میں بھی کچھ دنوں سے بے چینی اور اضطراب کی پرشور لہریں اٹھ رہی ہیں اور پوری قوم مجسم فریاد احتجاج بنی ہوئی ہے۔ علماء، وکلاء، صحافی، طلباء غرض ہر طبقہ کے لوگ "جمہوریت زندہ باد" کہتے ہوئے گھروں سے نکل آئے ہیں، احتجاجی جلوسوں کا کوئی شمار و حساب نہیں! ملک کے گوشہ گوشہ سے ایک ہی جیسے اضطراب و احتجاج کی خبریں آرہی ہیں! اور یہ سب کچھ ترقی و اصلاح کے دس سالہ جشن کے فوراً بعد ہوا ہے! ریڈیو، ٹیلی ویژن اور پریس کے ذریعہ وہ طوفانی پروپیگنڈا ہوا کہ "ترقی و اصلاح" کے علاوہ اور کوئی آواز ہی سُنائی نہیں دیتی تھی، حکومت کے ایک ایک شعبہ اور محکمہ کی ترقی کے اعداد و شمار پیش کئے گئے، اس کے لئے نمائشیں ہوئیں، میلے لگے، اخباروں کے خاص نمبر نکلے —————— مگر حزبِ مخالف کے دو تین مظاہروں اور پریس کانفرنسوں ہی نے ترقی و اصلاح کی اس دھوم اور غلغلے کو "طوطی کی آواز" بنا دیا۔ اور پھر ایسا محسوس ہونے لگا جیسے قوم ترقی و اصلاح کا شور سن تو رہی تھی، مگر اس کے دل میں یہ باتیں اتر نہیں رہی تھیں ——— !

ملک کی اصل طاقت اُس کے عوام ہی ہوتے ہیں، عوام کا احتجاج طاقتور سے طاقتور حکومت کو ہلا دیتا ہے، پاکستانی عوام کے متحدہ احتجاج کا یہ اثر ہوا کہ وہ بڑے آدمی جو یہ فرماتے تھے کہ "انتشار پسندوں کو کچل دیا جائے گا، پرانے سیاستدانوں کو ہم حکومت میں نہیں آنے دیں گے، پارلیمانی نظام کے حامی ملک کے دشمن ہیں —————— اللہ کی شان اُن کی زبانوں سے یہ الفاظ نکل رہے ہیں کہ —————— "آئینی طور پر حکومت کو بدلا جا سکتا ہے"

دس سال کی مدت میں جس نہج پر حکومت کی گئی ہے اور جس انداز پہ قانون بنے ہیں اور طرح طرح کے آرڈیننس نافذ ہوئے ہیں۔ اُن کا خلاصہ اور لب لباب یہ ہے کہ عوام کو زیادہ سے زیادہ بے اختیار اور بے اثر بنا دیا جائے۔

عائلی قوانین، خاندانی منصوبہ بندی، تعلیمی نظام، زبان، ثقافت، محکمہ اوقاف، صحافت اور پریس پر پابندیاں اس قسم کے تمام مسائل پر گفتگو کی جائے، تو مضمون پھیلتے پھیلتے ایک کتاب بن جائے گا، سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ ان قوانین، آرڈیننسوں اور طرزِ حکومت و سیاست نے ملک کے کسی طبقہ کو بھی مطمئن نہیں کیا، عوام کو خاص طور پر۔ جذبات کا جو موقعہ ملا ہے اور تحریر و تقریر کی پابندیوں کے بند ڈھیلے ہوئے ہیں اُس سے پوری طرح ظاہر ہو گیا ہے کہ بنیادی جمہوریت کے سلسلہ کا فیصلہ چاہے جو کچھ بھی ہو مگر عوام نے اپنا فیصلہ دے دیا۔

ابھی ابھی اوپر عرض کیا گیا تھا کہ ملک کے تمام مسائل پر گفتگو کی جائے تو ۔۔۔

؎ ایں رشتہ بانگشت نہ پیچی کہ دراز است

اس لئے ہم صرف مسئلہ دستور کو لیتے ہیں! پاکستان کے موجودہ دستور کے بارے میں حکومت کی طرف سے بار بار کہا گیا ہے کہ یہ عوام کا تیار کیا ہوا دستور ہے اور عوام کی پسند کے مطابق ہے، مگر دستور کمیشن کے صدر جناب جسٹس ایم شہاب الدین نے اپنے بیان میں یہ کہا ہے :-

"یہ بات حقیقت کے منافی ہے کہ موجودہ دستور کی بنیاد دستور کمیشن کی سفارشات ہیں، موجودہ دستور ہماری سفارشات سے جوہری طور پر مختلف ہے ۔ جب موجودہ دستور نافذ کیا گیا تھا تو میں نے ایک بیان کے ذریعے اپنے دوسرے ارکان کی پوزیشن واضح کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن بدقسمتی سے میرے اس بیان کو اخبارات میں شائع ہونے کی اجازت نہ مل سکی۔"

اس کے بعد محکمہ قانون کے سکریٹری جناب جسٹس عبدالحمید کا بیان ملاحظہ ہو ۔

"موجودہ آئین ان سفارشات میں قطع و برید اور تبدیلی کے عمل کا نتیجہ ہے، جو آئینی کمیشن نے کی تھیں ۔۔۔ موجودہ آئین تضادات کا مجموعہ ہے جبکہ بعض لوگ اسے اب بھی جمہوری قرار دے رہے ہیں۔"

مقامِ حیرت و افسوس ہے کہ حکومت نے خود اپنے مقرر کئے ہوئے دستوری کمیشن کی سفارشات کو رد کر دیا اور جو سفارشات بھی قبول کی گئیں، ان میں بھی قطع و برید فرمائی گئی، اور ستم ظریفی یہ کہ "بنیادی جمہوریت" کا جو نسخہ ایجاد کیا گیا، اس کو "عوامی دستور" کا نام دیا گیا۔ جن اہلِ دانش اور اربابِ بصیرت نے "بنیادی جمہوریت" کے نقائص کی نشاندہی کی، ان کے بارے میں فرمایا گیا کہ یہ انتشار پسند ہیں اور ملک میں بددلی اور بے اطمینانی کی فضا پیدا کرنا چاہتے ہیں ۔

"بنیادی جمہوریت" نے عوام کو کیا دیا ؟ اس کا اندازہ صدرِ دستور کمیشن کے اس حیرت انگیز انکشاف سے ہوسکتا ہے کہ ان کے بیان تک کو اخبارات میں آنے کی اجازت نہیں دی گئی ! گزشتہ صدارتی انتخاب کے موقعہ پر بھی یہی صورت پیش آئی کہ اس انتخاب کی روداد کو آرڈی ننس کے ذریعہ منظرِ عام پر آنے سے روک دیا گیا ۔

جمہوری حکومتوں کو آئینی ذرائع سے بدلنے کی جدوجہد کوئی جرم نہیں ہے، اس جدوجہد کے جو اکابر داعی ہیں، وہ ملک کے دشمن نہیں بلکہ بہی خواہ ہیں، ملک کے حالات کی ابتری ہی نے انہیں اس انقلابی مگر آئینی جدوجہد کے لئے آمادہ کیا ہے، اب رہا "اقتدار" کا مسئلہ تو جو لوگ برسرِ اقتدار رہنا چاہتے ہیں ان کی یہ خواہش جرم نہیں ہے تو جو لوگ اقتدار میں آنا چاہتے ہیں ان کی یہ خواہش کس طرح موردِ الزام بن سکتی ہے ۔

نزاکتیں ان معروضات کے بعد "تحریک جمہوریت" کے اکابر کی خدمت میں ہماری یہ گزارش ہے کہ صوبوں کی خود مختاری کا مسئلہ خاصہ نازک اور پیچیدہ ہے، مرکز کو بہرعنوان مضبوط، طاقتور اور بااختیار ہونا چاہئے : اسلامی نقطۂ نگاہ سے اسلامی حکومت "کل" کی حیثیت رکھتی ہے اس "کل" کا مظہر "مرکز" ہی ہوتا ہے، ایسی صوبائی خود مختاری جس سے مرکز کے اختیار و طاقت میں ضعف واقع ہوتا ہو، ملک کے لئے مضرت رساں ہی ثابت ہوگی ! صوبائی خود مختاری کے بھی کچھ حدود ہیں ! ان حدود سے تجاوز نہیں ہونا چاہئے ۔ آزادی اور جمہوریت کا جذبہ اور جوش مبارک مگر اس جوش میں اس طرح سوچنا کہ "مرکز" صدر ایوب خاں کا نام ہے، درست نہیں ہے مرکز دراصل عوام کی اس پسندیدہ اور نمائندہ ہیئت اجتماعی کا نام ہے جو ملک کے نظم و نسق کو چلاتی اور ملک کی حفاظت کرتی

ہے، اس لئے مرکز کو زیادہ سے زیادہ مضبوط اور بااختیار ہونا چاہئے! صوبوں کی خود مختاری کا مسئلہ بڑھتے بڑھتے "علیحدگی" تک پہونچ گیا ہے۔ خاص طور سے مشرقی پاکستان کے بعض رہنماؤں کی تائید حاصل کرنے کے لئے اس نزاکت کو ضرور ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے۔

کوئی شک نہیں ملک میں جمہوریت قائم ہوگی تو اس کے سبب "اقامت دین" کے لئے بھی راہیں کھلیں گی، مسلمانوں کی رائے عامہ کو فضا میں اسلامی نظام حکومت کے قیام کے لئے تیار کیا جاسکتا ہے ــــــــ مگر موجودہ حالات میں جماعت اسلامی کی ذمہ داریاں سب سے زیادہ نازک اور اہم ہیں! "تحریک جمہوریت" میں جو جماعتیں شامل ہیں ان میں بعض پارٹیاں سوشلزم اور وطنیت کے رجحانات بھی رکھتی ہیں، لیڈروں کے ذہن اسلامی معاشرے اور اخلاقی اقدار کے بارے میں صاف نہیں ہیں، اس لئے بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ جماعت اسلامی "کاریشہ دامن" سے سابقہ پڑا ہے، اسے ان مفاسد سے بچاتے ہوئے جمہوریت کے سفینہ کو ساحل مراد تک پہونچانا ہے!

جمہوریت اصل مقصود نہیں ہے پاکستان میں مسلمانوں کی چونکہ اکثریت ہے اس لئے "جمہوریت" اقامت دین کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ اس توقع پر دین پسند جماعتیں اور عوام "تحریک جمہوریت" کا ساتھ دے رہے ہیں! اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین پر چلنے، دین پر قائم رہنے اور دین کو قائم کرنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ بھی سننے اور پڑھنے میں آرہا ہے کہ بعض علماء "سوشلزم" یا "اسلامی سوشلزم" کے نعرے لگا رہے ہیں، یہ صورت حال پاک کے دینی مستقبل کے لئے حد درجہ خطرناک اور مضرت رساں ہے، اسلام اپنی جگہ خود مکمل ترین ضابطۂ حیات ہے اور اس میں اقتصادی نظام بھی شامل ہے! پاکستان کے علماء تمام اختلافات کے باوجود "اسلامی نظام" کے بارے میں اب تک متحد رہے ہیں اور سب کا یہی متفقہ مطالبہ کہ خالص اسلام کو پاکستان میں نافذ کیا جائے جس کا ماخذ اللہ کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مطہرہ ہے، "اسلامی سوشلزم" کا نعرہ اس پر کاری ضرب لگتا ہے۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے جذبۂ آزادی و جمہوریت کی ہم قدر کرتے ہیں مگر اُن کے "سوشلزم" کے عقیدے سے متفق نہیں ہیں، متحدہ ہندوستان میں ہندوؤں کے ساتھ مل جل کر انگریزی حکومت سے آزادی کی آئینی جنگ لڑی تھی مگر گاندھی جی اور جواہر لال نہرو کے کسی عقیدے کو قبول نہیں کیا، "تحریک جمہوریت" میں بھی دین پسند جماعتوں کو اپنے دینی موقف پر قائم رہنا چاہئے۔

جماعت اسلامی کی دشمنی میں اس سطح تک اترانا کسی طرح مناسب نہیں ہے کہ یہ جماعت "اخوان المسلمون" کی حمایت کرے تو ان کی مظلومیت پر طنز کی جائے، جماعت اسلامی ناصر کے دینی مفاسد اور واقعی مظالم کو سامنے لائے تو اُسے عرب کا نجات دہندہ ثابت کیا جائے، "سوشلزم" کی جماعت کی طرف سے مخالفت ہو تو "سوشلزم" کو قومی نعرہ بنا لیا جائے۔ ایسی باتیں علماء دین کو کسی عنوان زیب نہیں دیتیں۔

"تحریک جمہوریت" میں اسلامی قدروں کا تحفظ ضروری ہے، تمام دین پسند جماعتوں کو اس طرح مل کر اور دینی معاملات میں ہم فکر ہو کر جدوجہد کرنی ہے کہ اس تحریک کے کامیاب ہونے پر "اسلامی نظام" کے قیام کے زیادہ سے زیادہ امکانات پیدا ہو جائیں! اور دین پسند عناصر ہی غالب نظر آئیں!

ماہر القادری

۲۷ دسمبر ۶۹ء

تسکین قریشی

جگر مرادآبادی ـــــ (حیات اور شاعری) (ایک سرسری جائزہ)

ڈاکٹر محمد اسلام کا یہ طویل و عریض تحقیقی مقالہ جس پر اُن کو لکھنؤ یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری مل چکی ہے بڑے کتابی سائز میں
۵۹۴ صفحات پر پھیلا ہوا ہے، کاغذ سفید معمولی، کتابت و طباعت کہیں ناقص اور کہیں کہیں بہت ناقص ہے مگر ان خرابیوں کے باوجود کتاب کی
ت سی معنوی خوبیاں بڑی حد تک نمایاں ہیں۔

یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں جگر مرادآبادی کے عہد اور ادبی پس منظر کو خاص تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، دوسرے
تیسرے ابواب میں جگر کی زندگی شخصیت و کردار کے تمام خصوصی پہلوؤں پر بہت شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور بقیہ صفحات میں جگر
شاعری کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر عبدالسلام نے جہاں تک "ریسرچ" کا تعلق ہے، نہایت سنجیدگی اور جانفشانی سے کام کیا ہے وہ جگر مرحوم
مخصوص احباب و معاصرین سے خود جاکر ملے ہیں، اس سلسلہ میں انہوں نے بہت سی صعوبات سفر بھی برداشت کی ہیں۔ اور زرِ کثیر صرف کیا ہے۔ وہ
نڈہ، مرادآباد، آگرہ وغیرہ کے علاوہ پاکستان بھی گئے اور ہر جگہ جگر صاحب کے احباب و معاصرین سے مل کر ضروری معلومات حاصل کیں
ایک بہت بڑا ذخیرۂ معلومات فراہم کرلیا اور اس سے استفادہ کیا۔ چنانچہ وہ زیرِ تنقید مقالہ لکھنے سے پہلے کئی اور کتابیں مثلاً جگر مخلصین اور
معاصرین کی نظر میں۔ نگارشاتِ جگر، خطوطِ جگر وغیرہ بھی شائع کرچکے ہیں۔

لیکن "ریسرچ" کا مقصد صرف اتنا ہی نہیں کہ تمام رطب و یابس اور مستند و غیر مستند روایات کو فراہم کرکے یکجا کر دیا جائے۔
جگر صاحب اپنے دور کے بہترین غزل گو شاعر تھے، اُن کی شخصیت بھی بہت دلکش تھی اور ان کو برصغیر ہند و پاکستان میں قابلِ رشک
ل تمام حاصل تھا۔ مگر جہاں ان کے معاصرین میں احباب و مخلصین کا دائرہ بہت وسیع تھا، وہاں حاسدوں اور منافقوں کی تعداد بھی کم نہ تھی
لئے ایسی شخصیت کے حالات قلم بند کرنے میں بہت احتیاط برتنی چاہیے تھی۔ اور ہر قسم کی روایات قبول کرنے سے پہلے "راوی" سے جگر مرحوم کے
ی تعلقات کی تحقیق لازمی تھی۔ اخباروں اور رسالوں کے اقتباسات نقل کرنے میں یہی اصول پیشِ نظر رکھنا چاہیے تھا خود میرے علم
، جگر صاحب کے چند نام نہاد مخلصین ہیں جن کے متعلق ان کے خیالات اچھے نہ تھے۔ مگر محمد اسلام صاحب نے ان میں سے بعض حضرات کی ملاقاتوں
ایت و حدیث" سمجھ کر بلا تحقیق و تصدیق اپنے مقالے میں لکھ دیا ہے مختصر یہ ہے کہ اُن کو روایت سے قطع نظر درایت و تنقیح، تحقیق و

تصدیق کے معیار کو بھی ضرور پیش نظر رکھنا چاہیے تھا۔

اس لحاظ سے میری رائے میں مصنف کے اس مقالہ کو وہ درجہ استناد حاصل نہیں جس کا دعویٰ اس کتاب کے انہوں نے شروع میں صاف یہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> "راقم الحروف نے اپنے حتی الامکان اس بات کی کوشش کی کہ وہ غیر جانب دار رہے اور جگر کی حیات اور شاعری کے سلسلہ میں جو بات حقیقت اور صداقت پر مبنی ہو اس کی تصدیق کرے۔ ناقص یا غلط باتوں کی تردید کردے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

مگر وہ اپنے اس معیار پر بہت کم قائم رہ سکے ہیں۔ جگر صاحب کے اسلاف، سلسلہ نسب وغیرہ کے بارے میں البتہ ان کی تحقیق درجہ استناد رکھتی۔ مگر اس میں بھی ایک جگہ ابہام پایا جاتا ہے انہوں نے صفحہ ۵ پر فٹ نوٹ میں لکھا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ "ان کے دادا مولوی محمد سمیع فرخ سیر بادشاہ کو حدیث تعلیم دیتے تھے۔ اور جب وہ مرادآباد چلے آئے تو یہاں بھی درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان کے بعد مولوی محمد قاسم تک درس و تدریس کا سلسلہ قائم رہا۔"

مگر اس نوٹ سے یہ معلوم نہ ہوسکا کہ مولوی محمد قاسم کون بزرگ تھے اور جگر مرحوم سے ان کا کیا رشتہ تھا، شجرہ نسب میں مولوی محمد سمیع سے پہلے مولوی محمد قاسم کا نام ملنا چاہیے۔ مگر جو شجرہ نسب صفحہ ۵ پر نقل کیا گیا ہے اس میں یہ نام نہیں ملتا۔ جگر صاحب کے پردادا کا نام نور محمد تھا اور ان کے دادا محمد سمیع تھے۔ مولوی محمد قاسم کا نام کہیں نہیں ہے، محمد اسلام صاحب کو اس کے متعلق ضروری تحقیق و تصحیح کرنی چاہیے تھی۔ یا پھر انہوں نے یہ نام غلط لکھ دیا ہے۔

روایات کو بلا تحقیق و تصدیق نقل کردینے کے سلسلے میں ایک واقعہ مثالاً لکھتا ہوں جو اس کتاب کے صفحہ ۱۴۸ پر درج ہے۔

> "علی گڑھ میں ایک مشاعرہ ہوا۔ جس میں جگر بھی شریک تھے، مشاعرے میں کسی لڑکے نے جگر سے متعلق ایک ہتک آمیز نظم پڑھی۔ جگر خاموشی سے اس کی نظم سنتے رہے۔ اس کے ختم ہونے پر انہوں نے اس کے جواب میں فی البدیہہ یہ شعر کہہ کر پڑھ دیا۔
>
> دیکھوں ادھر منہ موڑنا، گھنگرو ہے یا کچھ چھوڑنا
> ہاں دم نہ اس کی چھوڑنا، اڑ جائیگا۔ پر دار ہے

مگر کیا عقل سلیم اس کو تسلیم کرسکتی ہے کہ جگر جیسے ہر دلعزیز اور نغز گو شاعر کے خلاف کوئی لڑکا ہتک آمیز نظم بھرے مشاعرہ پڑھتا رہے اور حاضرین مشاعرہ چپ چاپ سنتے رہیں اور ایسا رکیک و مبتذل شعر جگر جیسا پاکیزہ ذوق رہیں فی البدیہہ کہہ کر جوابا پڑھ کر سنائے ایسے شعر کو جگر سے منسوب کرنا بھی ان کی بڑی توہین ہے جس کا پہلا مصرع خصوصاً لفظ "دیکھوں" نہ صرف بے کلانہ بلکہ بے محل ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ محمد اسلام صاحب نے اس روایت کو قبول کرنے سے پہلے اس کی تصدیق و تحقیق کیوں نہیں کی۔ صرف ایک راوی کی روایت ہی کو کیوں قابل اعتنا سمجھا۔ آخر اس مشاعرہ میں اور حضرات بھی تو شریک ہوئے ہونگے۔

اس قسم کی بے سر و پا روایات کی کچھ اور مثالیں بھی اس کتاب میں پائی جاتی ہیں۔

دوسری بڑی کوتاہی ڈاکٹر محمد اسلام سے یہ ہوئی کہ انہوں نے تحقیق حالات میں اپنی یادداشت و حافظہ پر ہی اعتماد کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ راوی کے اصل الفاظ و مطالب ہی بدل گئے۔ اصولاً ان کو ہر "راوی" کی روایات کو قلمبند کرنے کے بعد ان کی تصحیح و تصدیق کرا لینی چاہیے تھی۔ مگر انہوں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی نتیجہ یہ ہوا کہ جب ان کی کتاب "جگر مخلصین و معاصرین کی نظر میں" شائع ہوئی تو پاکستان اور کئی اور مقامات سے

…ے چند مخلصین نے مجھے لکھا کہ اسلام صاحب نے ان کے بیان کردہ واقعات کو بہت توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے اور تعرف بے جا سے کام لیا ہے۔
اس سلسلے میں کئی مہینے ہوئے محترمی حضرت تمکین اکبر آبادی کا ایک مضمون "شاعر" بمبئی میں شائع ہوا تھا جس کا ضروری اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

"ایسے اور بھی واقعات ہیں۔ جگر صاحب کا ایک واقعہ جو میرے قلم سے "تحریک" دہلی کے جگر نمبر میں شائع ہو
چکا ہے وہ بھی اس مجموعے میں بہت ہی غلط اور قبیح الفاظ کے ساتھ مجھ سے منسوب کیا گیا ہے۔ مثلاً یہ کہ
جگر صاحب کسی طوائف کے کوٹھے پر جا رہے تھے۔ جگر صاحب کو میں نے کبھی کسی طوائف کے یہاں آتے جاتے نہیں
دیکھا۔ اسی طرح فانی اور یاس کا واقعہ، تاج محل کا واقعہ، علیبیہ کالج کا واقعہ۔ کس کس کی تردید و تصحیح کی جائے"

خود میرے حوالے سے بھی ڈاکٹر محمد اسلام نے اپنے اس مقالے میں کئی غلط بیانیاں کی ہیں۔ ان کو بلا تعصب کے ساتھ لکھتا ہوں
(۱) جگر صاحب سے میرے تعلقات کی ابتدا اس زمانے میں ہوئی تھی، جب وہ شراب سے تائب ہو چکے تھے۔ میں ان کا ذکر "مکاتیب جگر" کے دیباچہ میں بھی
… کر چکا ہوں اور میرے اور جگر صاحب مرحوم کے احباب و مخلصین بھی اس بات سے خوب واقف ہیں۔ مصنف کی تحقیق کے مطابق جگر صاحب نے
۱۹۴۳ء میں شراب نوشی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ترک کر دی تھی۔ بہرحال اس کے بعد ہی میرے تعلقات جگر صاحب سے ہوئے اور مسلسل ۲۰-۲۲ سال ان
… تک قائم رہے۔ اس عرصے میں پوری دیانت داری کے ساتھ کہتا ہوں کہ میری موجودگی تو دور کی بات ہے میرے علم و یقین میں بھی کبھی جگر صاحب نے
شراب نہیں پی۔

اب ذرا ڈاکٹر محمد اسلام کے "تحقیقی مقالہ" کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

"ایک ملاقات میں تمکین قریشی نے بتایا کہ ایک دفعہ جگر صاحب نے شراب ترک کر دی اور نماز بڑے خشوع و خضوع
کے ساتھ شروع کی، جہاں جاتے، جانماز ساتھ ہوتی تھی۔ مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد وہ کراچی یا کسی اور مقام
پر ایک مشاعرہ میں شرکت کے لئے گئے تو واپسی میں تمکین صاحب نے ان کو دیکھا کہ جانماز وغیرہ کچھ نہیں ہے
اور نماز پڑھنے کے بجائے وہ شراب کے نشے میں مخمور رہتے ہیں" (صفحہ ۹۱)

دراصل یہ واقعہ ۱۹۴۹ء کا ہے، جب پاکستان قائم ہونے کے بعد جگر صاحب پہلی بار کراچی گئے تھے۔ وہاں جانے سے کچھ عرصہ پہلے اُن پر
دینداری کا کچھ اتنا غلبہ تھا۔ کہ وہ "سگریٹ" تک ترک کر چکے تھے۔ مگر جب وہ چند ماہ بعد کراچی سے واپس آئے تو یہ صورت باقی نہیں رہی۔
اور وہ اسی تسلسل و تواتر کے ساتھ سگریٹ پینے لگے تھے۔ جس کے وہ پہلے عادی تھے۔
اب ڈاکٹر محمد اسلام کا یہ قلمی کارنامہ ملاحظہ فرمائیے کہ انہوں نے سگریٹ کو شراب بنا کر مجھے جگر صاحب کی شراب نوشی کا عینی شاہد بنا دیا۔
یہ محض غلط بیانی ہی نہیں بلکہ مجھ پر اور خود جگر صاحب پر سخت الزام ہے۔
(۲) اس کتاب کے صفحہ ۱۵۵ پر ایک اور غلط بیانی میرے حوالے سے کی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"ایک دفعہ میرٹھ کے ایک مشاعرے میں جب وہ اپنی غزل پڑھ چکے تو ایک منسٹر صاحب نے جو اس وقت وزیر
انصاف تھے اُن سے غزل سنانے کی فرمائش کی لیکن انہوں نے (جگر صاحب نے) ان کے کہنے پر غزل نہیں سنائی"

اصل واقعہ صرف اتنا ہے کہ اس مشاعرے کے صدر منسٹر تھے اور کسی وجہ سے وہ جلد جانا چاہتے تھے، بانیان مشاعرہ نے ان کی خوشنودی خاطر
کے لئے جگر صاحب سے اس وقت غزل پڑھنے کی فرمائش کی، جب مشاعرہ ابتدائی دور میں تھا۔ اس لئے جگر صاحب نے غزل پڑھنے سے انکار کر دیا تھا۔

لہ جگر صاحب سے اس واقعہ کی نسبت غلط نہیں ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ تمکین صاحب کو دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ (مدیر)

بہرحال یہ غلط ہے کہ "جب وہ اپنی غزل پڑھ چکے تو ان سے فرمائش کی گئی" اور یہ بھی غلط ہے کہ وزیر موصوف نے خود فرمائش کی تھی۔

(۳) یہ بھی خلاف واقعہ ہے کہ "ایک دفعہ نواب صاحب رام پور کے مشاعرے میں جگر صاحب غزل پڑھ کر چل دئے تو نواب صاحب نے خود ہی کہا کہ جگر صاحب ہاتھ تو ملا لیجئے تب جگر صاحب نے اُن سے ہاتھ ملایا" (ص ۱۵۸)٭

(۴) اسلام صاحب نے اس مقالے میں ص ۱۵۸ پر میرے حوالے سے لکھا ہے۔

"جب جگر کو ساہتیہ اکاڈمی سے پانچ ہزار روپیوں کا انعام ملا تو انہوں نے وہیں اپنے ایک دیرینہ دوست کی شادی کے لئے کئی سونے کے زیورات اور بیش قیمت کپڑے خریدے اور شادی میں ان کو بطور تحفہ پیش کئے ؟

اول تو یہی غلط ہے کہ اس زمانے میں جگر صاحب کے ان دیرینہ دوست کی لڑکی کی شادی ہوتی تھی اور یہ تحفہ اس میں پیش کیا گیا تھا۔ پھر کئی سونے کے زیورات اور بیش قیمت کپڑے۔ یہ سب اضافہ ہے جگر صاحب صرف ایک بیش قیمت زیور غالباً "دست بند" دہلی سے خرید کر لائے تھے اور تحفۃً پیش کیا تھا۔ خود میں نے وہ زیور دیکھا تھا۔ تقریب شادی تو اس واقعہ سے غالباً دو سال بعد عمل میں آئی تھی۔

یہ تو وہ غلط باتیں ہیں جو میرے نام سے منسوب کی گئی ہیں۔ جگر صاحب کے دوسرے احباب کے حوالے سے جو بیانات اس کتاب میں دئے گئے ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ان میں کس حد تک صداقت پائی جاتی ہے۔

ڈاکٹر محمد اسلام نے اس قسم کے تصرفات بے جا صرف روایات و حالات کے سلسلے ہی میں نہیں کئے ہیں بلکہ ان کی مثالیں ان کے اُس محاکمہ میں بھی ملتی ہیں جو انہوں نے جگر مرحوم کی شاعری پر کیا ہے۔ مثلاً ص ۲۰۹ پر "آتش گل میں محبوب کا تصور" کے زیر عنوان جتنے اشعار نقل کئے ہیں وہ تقریباً سب کے سب "شعلۂ طور" سے ماخوذ ہیں۔ مگر اس کا حوالہ کہیں نہیں دیا ہے۔ اگر اس کو "سہو قلم" پر بھی محمول کر لیا جائے تو اس کی کیا تاویل کی جائے کہ ص ۲۱۲ پر "عشق کا اعلیٰ تصور" کے تحت جو اشعار "آتش گل" کے حوالے سے اسلام صاحب نے نقل کئے ہیں ان میں بھی یہ دو شعر ملتے ہیں۔

تری خوشی سے اگر غم میں بھی خوشی نہ ہوئی
وہ زندگی تو محبت کی زندگی نہ ہوئی

میں رہین درد سہی مگر مجھے اور چاہئے کیا جگر
غم یار ہے مرا شیفتہ میں فریفتۂ غم یار ہوں

اور یہ دونوں شعر "شعلۂ طور" سے ماخوذ ہیں۔

"تقسیم ہند کے بعد کے اثرات رمزی اور علامتی بیان" اس عنوان کے تحت کلام جگر سے مثالیں دے کر مصنف نے یہ ثابت کیا ہے کہ "انہیں واقعات و حادثات سے متاثر ہو کر جگر کا حاسّہ دل بالکل بجھ گیا اور وہ کہنے لگے" (ص ۳۰۵)

بے کیف دل ہے اور جئے جا رہا ہوں میں
خالی ہے شیشہ اور پئے جا رہا ہوں میں

وہ دل کہاں ہے اب کہ جسے پیار کیجئے
مجبوریاں ہیں ساتھ دئے جا رہا ہوں میں

اس سلسلہ میں حسب ذیل اشعار بھی نقل کئے گئے ہیں۔

مرا نالہ ہوش رُبا ہو گیا مرا نغمہ روح فزا ہو گیا
کہ چمن میں پھول تو ہیں مگر ان میں بوئے وفا نہیں

معاذ اللہ اس کی واردات غم معاذ اللہ
چمن جس کا وطن ہو اور چمن بیزار ہو جائے

٭ ہز ہائی نس نواب سعادت علی خاں مرحوم والی ٹونک نے اپنے محل میں مشاعرے کے بعد خود مسند سے اُٹھ کر اور حضرت جگر کے پاس جا کر یہ کہتے ہوئے مصافحہ کیا تھا۔ "جگر صاحب ہاتھ تو ملا لیجئے" میں بھی اس مشاعرے میں شریک ہوا تھا۔ (ماہر القادری)

قیامت کیا یہ اے حُسنِ دو عالم ہوتی جاتی ہے   کہ محفل تو وہی ہے دلکشی کم ہوتی جاتی ہے

اس غزل کے دو اور شعر لکھنے کے بعد۔

حسنِ صورت کے نہ حسرت کے نہ ارمانوں کے   اُف کہ انسان ہیں مارے ہوئے انسانوں کے

پھر اس غزل کے کئی شعر اور نقل کئے ہیں اور آگے آتشِ گل کے متعدد اشعار محمد اسلام صاحب نے یہ ثابت کرنے کے لئے درج کئے ہیں کہ ان سب شعروں میں "تقسیمِ ہند کے بعد کے اثرات کا رمزی اور علامتی بیان" پایا جاتا ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اشعار اُن غزلوں سے ماخوذ ہیں جو تقسیمِ ہند سے سالہا سال پہلے جگر صاحب نے کہی تھیں اور جب میں نے ۱۹۴۶ء میں "آتشِ گل" کا پہلا مسودہ مرتب کیا تھا تو جگر صاحب کی متعدد بیاضوں سے یہ غزلیں نقل کرکے ترتیب وار یکجا جمع کر دی تھیں یہ بیاضیں اب بھی گوشۂ جگر جامعہ ملیہ دہلی میں محفوظ ہیں۔

"آتشِ گل" کا پہلا ایڈیشن تقسیمِ ہند (۱۹۴۷ء) کے دو تین سال بعد شائع ہوا تھا اس لئے غالباً ڈاکٹر محمد اسلام یہ سمجھے کہ جگر صاحب نے یہ سب غزلیں تقسیمِ ہند کے بعد کہی ہیں۔ میرا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ جگر صاحب کو قومی اور ملکی ابتری کا احساس نہ تھا صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ مصنف کی تحقیق کس قدر کمزور بلکہ غیر صحیح ہے۔

کلامِ جگر پر جو تنقیدیں شائع ہوئی ہیں۔ مصنف نے ان کا بھی جائزہ لیا ہے، بعض اعتراضات کو صحیح تسلیم کیا ہے اور بعض کی تردید بھی کی ہے اور "نقادوں کی لغزشیں" بھی بتائی ہیں (صفحہ ۲۲۶ تا صفحہ ۲۹۵) لیکن اس کے ساتھ ساتھ خود بھی کلامِ جگر پر چند اعتراضات کئے ہیں۔

ڈاکٹر محمد اسلام کو اردو زبان و محاورہ پر کہاں تک دسترس حاصل ہے اس کا اندازہ ان کی تصنیف کا مطالعہ کرنے سے بخوبی ہو سکتا ہے اور اب جو اعتراضات انہوں نے کلامِ جگر پر کئے ہیں ان کو پڑھئے اور مصنف کی "زباندانی" اور "ذوقِ شعری" کی داد دیجئے۔

چند اعتراضات بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔

(۱) لے چلا ہوں میں بھی نذرِ حسنِ جاناں کو جگر   ساتھ دل کے ایک سازِ آرزو ٹوٹا ہوا   (صفحہ ۲۹۶)

محمد اسلام صاحب کو دوسرے مصرع میں "سازِ آرزو" پر اعتراض ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "یہ ترکیب غلط ہے کیونکہ آرزو کا کوئی ساز نہیں ہوتا جو ٹوٹ جائے۔ قطع نظر اس کے کہ انہوں نے ساز کی معنویت اور جامعیت پر غور نہیں کیا، سازِ دل، سازِ تمنا وغیرہ تراکیب کے جواز میں دوسرے اساتذہ کے اشعار بھی سنداً پیش کئے جا سکتے ہیں۔

(۲) دل ہوا خاک اب غم سے مگر دل کی جگہ   اک خلش سی مجھے معلوم ہوئی جاتی ہے   (صفحہ ۲۹۸)

دل دھڑکنا بھی غنیمت ہے تری فرقت میں   کہ خبر تو مجھے معلوم ہوئی جاتی ہے

محمد اسلام صاحب کو "ہوئی جاتی ہے" پر اعتراض ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "ہوئی" کی بجائے یائے مجہول یعنی "ہوئے" کا استعمال ہونا چاہئے تھا۔ گویا ان کے نزدیک دونوں آخری مصرعے یوں ہوتے تو زبان و محاورہ کے لحاظ سے ان کو صحیح کہا جا سکتا تھا۔

اک خلش سی مجھے معلوم ہوئے جاتی ہے

کہ خبر تو مجھے معلوم ہوئے جاتی ہے

شاید ان کو معلوم نہیں کہ فعل اردو زبان میں فاعل کے تابع ہوتا ہے اگر فاعل مذکر ہے تو فعل بھی مذکر آئے گا۔ اور اگر فاعل مؤنث ہے تو فعل کو مؤنث ہی لکھا جائے گا۔ ان دونوں شعروں میں "خلش اور خبر" دونوں مؤنث ہیں اس لئے دونوں جگہ "ہوئی" کا استعمال ہوا ہے، "ہوئے" کسی طرح صحیح نہیں، بلکہ بالکل غلط ہے۔

(۳) غیر اس کو نظر آئی، شتر اُس کو نظر آیا آئینہ میں خود عکسِ آئینہ نگر آیا ؟

اعتراض ہے کہ "غیر یہاں مذکر ہے۔ جگر صاحب نے مونث غلط استعمال کیا ہے"
یہ مصرعہ ہی محمد اسلام صاحب نے غلط نقل کیا ہے۔ آتش گل کے دونوں ایڈیشنوں میں یہ مصرعہ یوں لکھا ہے۔

غیر اس کو نظر آیا، شتر اُس کو نظر آیا

بہر حال یہ مصرعہ اور اعتراض دونوں غلط در غلط ہیں۔

(۴) اعتراض ہے کہ جگر صاحب نے "چشم جام بہ جام" اور شوق نام بہ نام کی بھی غلط ترکیب استعمال کی ہے اور بعض فارسی ترکیبیں بھدی اور غلط استعمال کی ہیں، مثلاً خطرہ، التفات، جوشِ عشق، ستارۂ اقبال وغیرہ (ص ۲۹۸)

مگر مصنف نے کوئی توجیہ پیش نہیں کی کہ وہ ان کو کیوں غلط سمجھتے ہیں اس لئے یہ اعتراضات کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ باقی دوسرے اعتراضات بھی اسی قسم کے پوچ اور پادر ہوا ہیں اور زیادہ تر مصنف کے ذوقِ شعری کے آئینہ دار ہیں، یہ سب اعتراضات غالباً اس لئے کئے گئے ہیں کہ ڈاکٹر محمد اسلام کو اپنی زبان دانی کا اظہار مقصود تھا اور وہ ان کو اپنے مقالے کی تکمیل کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔

یہ ضخیم کتاب نومبر ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی مگر اب تک اس پر کوئی تفصیلی تنقید یا تبصرہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ بہر حال میں نے اپنے اس فرض کفایہ ادا کرنے کی کوشش کی ہے مگر اس تفصیل و تطویل کے باوجود میرا مضمون بھی محض ایک سرسری جائزہ ہے اگرچہ اس میں کتاب کے چند خاص خاص نقائص بیان کئے گئے ہیں مگر اس کو "تنقیص محض" نہ تصور کیا جائے، کیونکہ میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ صداقت و دیانت پر مبنی ہے۔ اس کے علاوہ مجھے کتاب کے بہت سے محاسن سے ہرگز انکار نہیں۔

پچھلے دور کے شعرائے کرام کی صف میں جگر کو جو مرتبہ و مقام حاصل ہے اس کے پیش نظر ان کی ہر دلعزیز شخصیت و شاعری حقیقتہً اسی کی مستحق تھی کہ اس پر خاطر خواہ "ریسرچ" کی جائے۔ اسی لحاظ سے ڈاکٹر محمد اسلام بھی داد و ستائش کے مستحق ہیں۔ اور ان کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ جگر صاحب سے متعلق اپنی کثیر معلومات کا ذخیرہ فراہم کر لیا۔ لیکن اسی کے ساتھ مجھے یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ ان کے مقالے میں وہ "محققانہ" شان نہیں پائی جاتی جو ایک بالغ نظر ریسرچ اسکالر کا طرۂ امتیاز ہے۔

ملک کے مشہور و ممتاز ادیب و نقاد پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی نے اس کو بہت سراہا ہے، مجھے موصوف کے اس خیال سے تو اتفاق نہیں کہ یہ مقالہ "مستند اور معیاری" ہے لیکن موصوف کی اس رائے کی میں لفظ بہ لفظ تائید کرتا ہوں کہ:-

"ابھی تک اس موضوع پر اتنا مفید مواد کہیں اور یکجا نہ ملے گا۔ جگر پر آئندہ کام کرنے والوں کو اس ذخیرہ معلومات سے بہت فائدہ پہونچے گا اور ان کے تحقیقی کاموں میں سہولت پیدا ہو گی۔ . . . ."

محمد عمر سیفی (ٹونک)

نیاز فتحپوری کی تنقیدیں

نیاز فتحپوری کی تنقیدوں کے متعلق ایک شہرت یہ بھی ہے کہ وہ غیر معتبر ہوتی ہیں۔ جہاں تک نیاز صاحب کی معلومات، واقفیت اور عمیق نگاہی کا تعلق ہے۔ نیاز صاحب کی تنقیدیں جاندار بھی ملیں گی۔ البتہ کہیں کہیں اُن کے فیصلے غلط ملتے ہیں تو میں نے یہ جانا ہے کہ ان کے یہاں احتیاط کی کمی ہے۔ لیکن نگار کے جگر نمبر کے بعد اکثر اہل نظر نے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ نیاز صاحب کی تنقیدوں میں شخصی تعلقات کا رنگ بھی پایا جاتا ہے۔

علی ہٰذا نگار کے جگر نمبر کے بعد سے میں نے بھی نیاز صاحب کی تنقیدوں کو احتیاط اور غور و تامل سے بعد ہی قبول کرنا ضروری سمجھا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں جبکہ میں ان کی مشہور تصنیف "مالۂ وما علیہ" دیکھ رہا تھا تو صفحہ ۱۲۳ پر یہ عبارت نظر سے گذری۔

"بات یہ ہے کہ میں نے یہ سلسلہ (تنقید ہی) صرف اس لئے شروع قائم کیا ہے کہ لوگ اشعار کے حسن و قبح کو خود سمجھنے کی کوشش کریں اور محض اس لئے کہ کسی بڑے شاعر نے ایسا لکھ دیا ہے غلط کو صحیح اور قبیح کو حسن نہ قرار دیں اور میرا یہ مدعا اسی وقت پورا ہو سکتا ہے جب اساتذہ یا ایسے شعرا کے کلام کو سامنے رکھوں جن کے اشعار کو استناداً پیش کیا جا سکتا ہے۔"

اتنے واضح اور حتمی بیان کے بعد ظاہر ہے کہ نیاز صاحب نے جس کسی پر جو بھی کچھ لکھا ہوگا ان کی نظر میں وہ حرف آخر ہی ہوگا۔ مگر دوران مطالعہ اکثر مقامات پر ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ ان کی تنقید عام شہرت کے مطابق بجائے "حرف آخر" کے غیر معتبر ہو کر رہ گئی ہے۔ مثلاً اسی کتاب کے صفحہ ۱۲۰ پر ثاقب کانپوری کی غزل کے اس آخری شعر پر کہ

جو باتیں رہ گئیں دل میں مگر خوف طوالت سے ۔۔۔ یہ میں کیسے کہوں تم سے کہ تھیں تو مدعا وہ بھی

اس طرح تنقید فرمائی ہے کہ "خوف طوالت" غزل کی زبان نہیں ہے۔ علاوہ اس کے "طوالت" ہندی لفظ ہے اور اس کا مضاف یا مضاف الیہ بنانا درست نہیں اس معنی میں صحیح لفظ اطالت اور طول ہے۔ فارسی شعرا نے بھی طوالت کا استعمال کبھی نہیں کیا۔ مجھے اس تنقید کے آخری جملے سے بحث ہے نیاز صاحب فرماتے ہیں کہ "فارسی شعرا نے "طوالت" کا استعمال کبھی نہیں کیا" اور اس قدر وثوق کے ساتھ فرماتے ہیں کہ ان پر شبہ کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے مگر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ فارسی شاعری میں یہ لفظ موجود ہے مثلاً

بہ بینیم تا چہا تعبیر دارد ۔ خواب دوشینم ۔۔۔ طوالت تا کجا، دامان خاموشی فراچینیم

(منقول از نیرنگ خیال لاہور ستمبر و اکتوبر ۱۹۳۲ء (اقبال نمبر) صفحہ ۳۵۹)

تو نیاز صاحب کا پورا اعتراض رد ہو جاتا ہے۔ یعنی یہ کہ فارسی زبان میں اس لفظ کا استعمال مل جاتا ہے۔ ہندی الاصل نہیں رہتا اور اس کی ترکیب اضافی بھی جائز ہو جاتی ہے۔

ایسی صورت میں نیاز صاحب کی تنقید کے متعلق کیا کہا جا سکتا ہے؟

اگر نیاز صاحب کے بارے میں کم علمی، کم نگاہی، یا پھر تعصب و تنگ نظری کی رائے قائم کی جائے تو اس سے اندیشہ ہے کہ ان کے وہ معتقدین جو انہیں علامہ کہتے اور سمجھتے آتے ہیں برا مانیں گے۔ اور اگر احتیاط و تحقیق کی کمی کہا جائے تو یہ بات خود ان کی تمہیدی عبارت

اور اُن کے علامہ ہونے پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں یہی مناسب ہوگا کہ عام شہرت کے مطابق نیاز صاحب کی تنقیدوں کے قبول میں احتیاط برتی جائے۔

فاران :- "طوالت" پر بحث و تحقیق کا مزید سلسلہ جاری رہ سکتا ہے ——— مگر فاضل مضمون نگار کی یہ رائے درست ہے کہ نیاز فتحپوری کی تنقیدوں پر پوری طرح اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ اس باب میں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اُن کی شعر فہمی کا یہ عالم، وہ تنقید کے سلسلہ میں بڑی نازک دقیق باتیں کہہ جاتے ہیں اور بعض اوقات ایسے سطحی اعتراضات وارد کرتے ہیں جیسے وہ شعر کا صحیح ذوق؛
پاکستان بننے سے کئی سال پہلے کی بات ہے کہ راقم الحروف کی نظم کے اس مصرعہ ؛—

خاک بر سر میں بادہ ہائے ناب

پر نیاز فتحپوری نے اعتراض وارد کیا کہ "بادہ ناب" کی جمع ہی نہیں آتی۔ میں نے جواب میں انہیں لکھا کہ غالب فرماتے ہیں—

؎ وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

میرے خط کا نہ انہوں نے جواب دیا اور نہ "نگار" (لکھنؤ) میں اسے شائع کیا۔

نیاز صاحب کی ذہانت اور انشا پردازی اپنی جگہ مسلّم ہے مگر وہ نہ "علامہ" تھے اور نہ "محقق" ؛ دوسروں کی کتابوں کے ترجمہ نقل و استفادہ کو بھی وہ اپنے نام سے حوالہ کے بغیر پیش کر دیا کرتے تھے، نگار کے "خدا نمبر" پر "فاران" میں ایک مقالہ چھپ چکا ہے محنت کسی نے کی اور نام ہوا نیاز صاحب کا!

مولانا ابو علی (اعظم گڑھ)

میرا سفرِ بنارس

شعرائے متاخرین میں ہونے کی وجہ سے اگرچہ مولانا شبلی نے اپنی مایہ ناز کتاب شعر العجم میں علی حزیں کا ذکر نہیں کیا ہے، لیکن اس کے شاعرانہ کمال کے معترف تھے اور کبھی کبھی اس کے تتبع میں غزلیں بھی کہتے تھے۔ ایک مرتبہ علی حزیں کی ایک غزل کے تتبع میں غزل کہی اور قافیہ و ردیف بھی وہی رکھا۔ اور دونوں غزلیں یعنی مولانا شبلی کی اور علی حزیں کی غزلیں خواجہ عزیز الدین صاحب عزیز مصنف قیصر نامہ اور نیر دہلوی کے پاس بغرض محاکمہ ارسال کی گئیں۔ یہ وہی نیر ہیں جن کے متعلق غالب نے لکھا ہے۔

مجھ سے تمہیں نفرت سہی نیر سے لڑائی

نیر نے مولانا شبلی کی غزل کی بہت تعریف کی اور لکھا کہ سلف کے کلام کے ہم پایہ ہے، خط میں یہ ظاہر نہیں کیا گیا تھا کہ یہ دونوں غزلیں کس کی تصنیف ہیں، دونوں کے مقطعے بھی اڑا دئے گئے تھے۔ مولانا شبلی کی غزل کا مطلع یہ ہے۔

من کہ عشق نہ گیرم من حیران چہ کنم\
می زہد جنبش ام بادہ عراراں چہ کنم

مولانا شبلی، علی حزیں کے طرز پر غزل کہنا باعثِ فخر سمجھتے تھے، خصوصاً اردو غزل گوئی میں علی حزیں ہی کی تقلید پسند کرتے تھے، اپنی اردو غزل کے ایک مقطع میں کہتے ہیں۔

یہ نظم آئیں یہ طرزِ بندش سخنوری کیا فسوں گری ہے\
کہ ریختہ میں بھی میرے شبلی مزا ہے طرزِ علی حزیں کا

کچھ تو مولانا شبلی کے اس علانیہ اعتراف کمال اور زیادہ تر اس کی ایک مناجات کی بنا پر جو حمایت اسلام لاہور کے فارسی نصاب کے سلسلہ کی تیسری جلد میں میں نے پڑھی تھی، جس کا ایک شعر یہ ہے۔

اے بسرا پردۂ یثرب بخواب خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب

علی حزیں سے مجھے شروع ہی سے بڑا شغف پیدا ہو گیا تھا اور اس کا کلام کہیں نظر آتا تھا تو بڑی دلچسپی اور شوق سے پڑھتا تھا کہ جس کی شاعرانہ عظمت کے مولانا شبلی جیسے وقت کے عظیم نقاد اور فارسی شعرا کے تذکرہ نگار مداح ہوں اس کا کلام اس کا مستحق تھا، کہ جہاں ملے ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر لذت لے لے کر پڑھا جائے اور لطف اندوز ہوا جائے، معلوم نہیں اس کا یہ مشہور و معروف شعر کیسے میری زبان پر چڑھا ہوا ہے اور خوب لطف لے لے کر پڑھتا ہوں۔

از بنارس نہ روم معبد عام است اینجا\
ہر برہمن بچۂ لچھمن و رام است اینجا

رس کا جب ذکر آتا ہے تو بے اختیار یہ شعر زبان پر آ جاتا ہے اور میں خوب جھوم جھوم کر پڑھتا ہوں اور وجد کرتا ہوں، کہتے ہیں کہ وہ اصلاً ایرانی
رسالکا شیعہ تھا، ہندوستان کی قدردانی اور علم پروری کی شہرت سن کر ہندوستان کی سیاحت کے لئے آیا۔ پہلے حیدرآباد گیا اور وہاں سے
یلم آباد پٹنہ آیا اور پھر پٹنہ سے سیدھا بنارس پہونچا۔ وہاں کے تاریخی گھاٹوں کے دلچسپ مناظر اور صبح کے وقت ہندو دیویوں کے عقیدت مند
شنان اور وہاں کے برہمن زادوں کے حسن و جمال سے اتنا متاثر ہوا کہ ہمیشہ کے لئے وہیں رہ پڑا۔ اور پھر وہیں پیوند زمین ہو گیا۔ بنارس اور
ن علی حزیں کا یہ حسین شعر اس قدر لازم و ملزوم ہیں کہ جہاں ایک کا ذکر آیا معاً دوسرے کا بھی آ جاتا ہے، بنارس کی شہرت کے بہاں بہت سے اسباب
ماس کے لئے لوگ شدّ رحال کرتے ہیں، ایک بڑا سبب علی حزیں جیسے باکمال ایرانی النفس شاعر کا مدفن ہونا بھی ہے، میں نے جب بھی بنارس کا ذکر کیا
اور کیا اس کا یہ شعر زبان پر فر وآیا۔ لیکن جب بھی بنارس گیا اس کے مزار کی زیارت نہ کر سکا۔

میرا پہلا سفر میرے چچا مولوی محمد احمد صاحب کلکتہ میں سویڈن کے ایک شریف النفس خشک چمڑوں کے تاجر مسٹر مولر کے چمڑے کے گودا
کے انچارج تھے اور بیش قرار تنخواہ پاتے تھے، پہلی مرتبہ انہی کو پہونچانے کیلئے بنارس تک گیا تھا۔ اور اس سفر میں اورنگزیب
لمگیر کی بنوائی ہوئی شاندار مسجد کی جس میں وہاں کا سب سے بڑا جمعہ ہوتا ہے زیارت کی، اسی کے بغل میں بنارس کا وہ مشہور مندر ہے جس کے کلس پر سونا
چڑھا ہوا ہے، اس کے بعد وہیں سے بنارس کی صد بہ تنگ و تاریک پُر پیچ پختہ گلیوں سے ہوتا ہوا، دھرہرہ کی مسجد گیا، جو بالکل لب دریا ہے
ں کے دونوں بلند مینارے جو آسمان سے باتیں کر رہے تھے، اس وقت بالکل صحیح و سالم موجود تھے[1] لیکن مسجد ویران تھی۔ صحن خراب و خستہ اور
ں میں جا بجا سبزہ اُگا ہوا تھا، اس سے لگا ہوا دکھن جانب ایک حجرہ تھا۔ جس میں غالباً اس مسجد کا تنخواہ دار موذن اور مصلی رہتا تھا، ان میناروں
متعلق مجھے بتایا گیا کہ یہ اتنے اونچے تھے کہ ان کی بلندی سے دلّی نظر آتی تھی۔ بعد میں اس کی اونچائی کم کر دی گئی۔ اس میں اتنا مبالغہ تھا کہ
کسی طرح اس کا یقین نہ کر سکا، دونوں میناروں میں آخر تک سیڑھیاں تھیں، جن پر چڑھنے اور اترنے سے آدمی کا سانس پھول جاتا تھا، میرا اس
نت عنفوان شباب تھا، میں ایک مینارے پر چڑھنے کے لئے تیار ہو گیا، اوپر پہونچا تو لاتعداد سر بفلک مکانوں اور کوٹھیوں کا یہ عظیم الشان شہر
نکل پست نظر آیا، آدمی، مکانات، گاڑیاں، سب چھوٹے چھوٹے کھلونوں کی طرح دکھائی دیں، دو چار منٹ کے بعد میں فوراً ہی اتر آیا،
الحمد للہ میرا سانس نہیں پھولا نہ ذرہ برابر تکان ہی محسوس ہوئی۔

سارناتھ پھر میں سارناتھ گیا، جو شہر بنارس سے ۸ میل کے فاصلہ پر ہے اس کی اس زمانہ میں بڑی شہرت تھی۔ آثار قدیمہ کی کھدائی ہو
رہی تھی۔ اور بودھ کے زمانہ کی جو چیزیں اس وقت تک برآمد ہوئی تھیں ایک میوزیم ہال میں بہت سجا کر رکھی ہوئی تھیں جن کو
دیکھنے کی ہر شخص کو اجازت تھی۔ میں نے بھی ایک ایک چیز کو غور سے دیکھا ان میں مہاتما بدھ کے مختلف حالتوں کے بہت سے سنگی بت بھی تھے، دو معبد
ہ اور منڈپ دیکھے جہاں بدھ جی گیا سے آکر گیان اور دھیان میں مصروف ہو جاتے تھے، اب سارناتھ گیا کے بگھوڑے کی طرح بودھوں کا بہت
ا مرکز ہو گیا ہے۔ اس کا میوزیم بھی بہت وسیع ہو گیا ہے۔ ان کے علاوہ مختلف ضرورتوں کے لئے بہت سی عمارتیں بن گئی ہیں۔ گویا پورا ایک شہر آباد ہو
گیا ہے، اس میں بدھ ازم کی تعلیم کی ایک درس گاہ بھی ہے جس کے باعث سارناتھ کی اہمیت اور مرکزیت بڑھتی جاتی ہے۔

مولانا عبدالمجید حریری اس وقت مولانا عبدالمجید کا غالباً شباب تھا، وہ ایک زبان آور خطیب، ایک کامیاب وکیل، اور بنارس میونسپل بورڈ
کے ایک ممتاز اور نمایاں رکن تھے۔ اور اپنی گوناگوں قومی و ملی اور سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے پورے بنارس پر
چھائے ہوئے تھے ہر طرف انہی کا ذکر، انہی کی قیادت اصلیت اور ہی کا چرچا تھا۔ مجھے دور سے دکھایا گیا کہ مولانا حریری یہی صاحب ہیں۔ ان سے

---

[1] اب ان میں سے ایک یا دونوں گنگا کے سیلاب میں گر گئے جس کی دوبارہ تعمیر کی طرف ہندوستان کے محکمہ آثار قدیمہ نے جہاں تک ہم کو معلوم ہے کوئی توجہ
نہیں کی ہے۔

بادہ بنارس میں کوئی مشہور و مقبول نہیں، ہندو مسلمان دونوں طبقوں میں یکساں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں اور بنارس ہیلسپن لمیٹڈ
ٹر روح رواں ہیں ان کے جلوۂ دیدار سے میں نے آنکھیں تو منور و روشن کیں۔ لیکن ان سے ملاقات کی کوئی صورت نہیں پیدا ہو سکی۔ بعد میں
ن کا آوازۂ شہرت بنارس کے حدود سے گذر کر پورے ہندوستان میں پہنچ گیا۔ اور ان کا شمار ہندوستان کی قومی و ملی زندگی کی اہم اور باوقار
شخصیتوں میں ہونے لگا۔ ان کی علمی و ادبی صلاحیتوں کی خبریں سن سن کر ان سے میری عقیدت بڑھتی چلی گئی۔ اور میں ان کی ذات پر فخر کرنے لگا
لانا شبلی کی زندگی میں ندوہ کا ایک شاندار جلسہ بنارس میں ہو چکا تھا۔ جس کے ساتھ ایک علمی نمائش بھی تھی۔ جس میں عربی و فارسی کے بہت سے
.. وصلیاں اور شعراء کے قطعات وغیرہ بڑی تعداد میں رکھے گئے تھے، اس علمی نمائش[1] سے بنارس میں ندوہ کا یہ اجلاس ایک تاریخی اور
گار اجلاس ہو گیا۔ اور اس کی روداد خود مولانا شبلی نے لکھی، اس طرح کا ایک جلسہ ان کے لائق تلامذہ مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا
ور علی ندوی انہی مولانا عبد المجید حریری کے اہتمام میں جن کا بنارس کے ہر طبقہ پر اثر تھا دوبارہ بنارس میں کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلہ میں
کی اعظم گڑھ میں بڑی آمد و رفت رہتی تھی اور اسی تقریب سے میں دور سے ان کی زیارت کرتا تھا۔ لیکن مولانا شبلی کے ان دونوں جلیل القدر
مذہ کو حسرت ہی رہ گئی اور مولانا عبد المجید حریری ندوہ کا جلسہ بنارس میں نہیں کرا سکے، اس ناکامی کے باوجود ان لوگوں کے دوستانہ تعلقات
کوئی فرق نہیں آیا۔ جب بھی حریری صاحب کسی تقریب سے اعظم گڑھ آتے تھے، تو ان بزرگوں سے ضرور ملتے تھے، اور وہ لوگ بھی ان کا بڑے
ک سے خیر مقدم کرتے تھے۔

ایک مرتبہ تو اعظم گڈھ کے پوربی حلقہ سے جس میں ان کی برادری (نور بافوں) کی بڑی زبردست اکثریت ہے اور جس میں کوپا گنج، گھوسی
ری گھاٹ، چین پور، منو، محمد آباد اور مبارک پور جیسے عظیم الشہرت صنعتگاہ قصبات ہیں۔ جمعیۃ العلماء کے ٹکٹ پر لکھنؤ اسمبلی کے لئے
ڑے ہوئے تھے، اور جمعیۃ کے حلقہ کا عام طور سے خیال تھا کہ یہ اگر کامیاب ہو جائیں گے تو کانگریس کی بننے والی کیبنٹ میں اپنی علمی قابلیت اور
باوقاری و زندگی اور سالگیزی پر یکساں قدرت کی بنا پر وزیر تعلیم ہو جائیں گے، وہ بدقسمتی سے ناکامیاب ہو گئے اور جمعیۃ والوں کا یہ خواب شرمندہ تعبیر
نہ ہو سکا، جس کا انہوں نے بے حد غم منایا۔ مجھ کو عملی سیاست سے کبھی دلچسپی نہیں رہی لیکن اس وقت میرا رجحان مسلمانوں کے سوادِ اعظم کی طرف
تھا۔ اور انہی کے امیدوار کا ہمدرد اور مددگار تھا۔ اسی زمانہ میں حریری صاحب پہلے انتخاب کے سلسلہ میں اعظم گڈھ آئے، میں دار المصنفین کے
کتب خانہ کے برآمدے میں ایک کپڑے کی کرسی پر بیٹھا دھوپ کھا رہا تھا کہ مولانا عبد المجید حریری اور مولانا ریاست علی ندوی مولف تاریخ صقلیہ
رفیق دار المصنفین میرے پاس سے گذرے، مولانا ندوی نے یہ کہہ کر میرا تعارف کرایا کہ یہ وہ صاحب ہیں جو جمعیۃ العلماء کی مخالفت میں خوب خوب اخبارات
میں مضمون لکھتے ہیں، اس تعارف کے بعد بھلا وہ میری طرف کیا متوجہ ہو سکتے تھے، آگے بڑھ گئے اس وقت مولانا عبد المجید صاحب حریری کو مئو کے

---

[1] اس میں بہت سے شاہی فرامین، قطعات اسناد، قلمی نسخے، تصاویر، آلات ہیئت وغیرہ بہت سی اسلامی علمی یادگاریں جمع کی گئی تھیں، ایک قابل توجہ
بات اس نمائش کی یہ تھی کہ فارسی کے دواوین اور بعض دوسرے علوم و فنون کی کتابیں اس ترتیب کے ساتھ رکھی گئی تھیں کہ ایک نظر میں فارسی شاعری
کا ارتقا اور ہر فن کی ترقی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا تھا اس نمائش کے نوادر پر مولانا شبلی نے ایک عالمانہ اور محققانہ تقریر بھی کی تھی جس
میں ان نوادر کی اہمیت اور علوم کی تاریخی ترقی پر روشنی ڈالی تھی اس کی روداد خود مولانا شبلی نے ——— اپنے قلم سے لکھی تھی۔ جو الندوہ لکھنؤ کے
ربیع الاول، اپریل، مئی [illegible] کے پرچوں میں باحتیاط شائع ہوئی تھی، اس نمائش کے بیشتر نوادر اور شاہی فرامین وغیرہ خود بنارس ہی سے متعلق
تھے، جہاں شہنشاہ ہندوستان اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ اپنی حکومت کے خلاف ایک سازش کی اطلاع پا کر راتوں رات گھوڑے پر سوار دلی سے
پہنچ گئے تھے، اور سازش کا قلع قمع کر دیا تھا، اس کا ذکر آج تک بنارس کے ایک ایک بچہ کی زبان پر ہے، بنارس کی گیان باپی کی مسجد جو مغل طرز
تعمیر کا بہترین نمونہ ہے، اس سفر کی یادگار ہے، یہ مسجد اب تک آباد ہے اس میں جمعہ بھی ہوتا ہے۔ فرش فروش اور روشنی کا بہترین انتظام ہے

لمانا حبیب الرحمٰن اعظمی جیسے حنفیت کے داعی اور مئو کی جماعت اہل حدیث کے سب سے بڑے حریف کی ہمدردی بھی حاصل تھی۔ اور وہ ان
ان کے حلقہ کا دورہ بھی کرتے تھے۔ اس اجتماع ضدین یعنی آگ اور پانی کو اکٹھا دیکھ کر لوگوں کو بڑا تعجب ہوتا تھا، مولانا حریری غیر مقلد
حدیث ہیں اس وقت مئو کی جماعت اہل حدیث کا رجحان مسلمانوں کے سواد اعظم ہی کی طرف تھا۔ ایک دن اپنے وطن اعظم گڑھ ہی میں
یک دکان پر بیٹھا ہوا تھا کہ مجھے خبر دی گئی کہ فلاں ہوٹل کے سامنے مولانا عبدالمجید صاحب حریری کی کار کھڑی ہوئی ہے اور اس میں مولانا
حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی بھی تشریف فرما ہیں، جن سے میرے بڑے قدیم تعلقات تھے اور جن کے علم و فضل اور فن حدیث و رجال میں ان کے تبحر کا میں
وہ معترف تھا، میں ان سے ملنے کے لئے کار تک گیا، ان سے مصافحہ کیا، لیکن مولانا حریری نے میری طرف باوجود میرے سلام پیش کرنے کے بھی
نا نہیں کیا، پھر اس کے بعد ان سے نیاز حاصل نہیں ہوا، بہت عرصہ کے بعد ان کے متعلق معلوم ہوا کہ سعودی عربیہ میں ہندوستان کے قونصل
یثیت سے ان کا تقرر ہو گیا ہے جس کے وہ اپنی قابلیت عربی زبان دانی، علم و فضل، شہرت و ہر دلعزیزی کے اعتبار سے بجا طور پر مستحق
تک وہ اس عہدہ جلیلہ پر رہے، ہندوستانی حاجیوں کو ان کی ذات سے بہت فائدہ پہنچا۔ وہ ہر حاجی کے ساتھ خواہ وہ کسی حیثیت و مرتبہ
ے اخلاق و محبت سے پیش آتے اور اس کی مشکلات کے حل میں صدق دل سے اس کی مدد کرتے اور ہر حاجی سے اس کی علاقائی و مقامی زبان
و زبان میں بات چیت کرتے تھے۔ ابھی اس عہدہ جلیلہ پر سرفراز ہوئے چند ہی سال گزرے تھے اور وہ اپنے متعلقہ فرائض نہایت خوش اسلوبی سے ادا
کر جمہوریہ ہندوستان کو اس عہدہ سے اچانک سبکدوش کر دیا، لیکن فوراً ہی سعودی حکومت نے ان کو نجد و حجاز کے کتب خانوں کے ناظم اعلیٰ کے
سر کر دیا۔ اس عہدہ کے فرائض انجام دے ہی رہے تھے اور کتب خانوں کی تنظیم و اصلاح میں بدل و جان مصروف تھے کہ ذیابیطس جیسے موذی
ض میں مبتلا ہو گئے، سعودی حکومت نے لائق سے لائق ڈاکٹروں سے ان کا علاج کرایا، لیکن ان کو کوئی افاقہ نہیں ہوا اور وہ مجبوراً اپنے وطن بنارس
در ہمیشہ کے لئے گوشہ نشین ہو گئے۔[1]

دوسرا سفر

دوسری مرتبہ میں اپنے بزرگ دوست جناب حکیم اسحاق صاحب [illegible] کو جو سفر حج کو جا رہے تھے، پہونچانے کے لئے بنارس تک گیا تھا
وہ کاشی ایکسپریس سے ایک بجے دن میں روانہ ہو گئے تو ہم چند مشایعت کرنے والوں کو خیال ہوا کہ بنارس کی بھی کچھ سیر کر لیں
مدن پورہ کا نام بہت سنا تھا لیکن وہاں جانے کا اب تک اتفاق نہیں ہوا تھا، پہلے وہیں کا پروگرام بنا، اور ہم تین آدمی جن میں شبلی کے ایک لائق
کے مشہور شاعر یحییٰ اعظمی بھی تھے۔ ایک شکرم گاڑی پر بیٹھ کر مدن پورہ روانہ ہو گئے جو بنارس کنٹونمنٹ سے تقریباً دو کوس کے فاصلہ پر تھا، پہلے
تھا کہ مدن پورہ شہر سے الگ تھلگ کوئی آبادی ہو گی جو چہار دیواری میں گھری ہو گی اور ہر چہار طرف اس میں جانے کے لئے بڑے بڑے پھاٹک
ور اسی چہار دیواری کے اندر امراء و رؤسا و ملوک التجار جن کی سارے ہندوستان و پاکستان میں کیا پوری دنیا میں ان کی عالمی تجارت و کاروبار
سے شہرت ہے اور جن کے یہاں شہنشاہ وقت جارج پنجم [illegible] آ چکے ہیں، ان کے بڑے بڑے عالیشان قصور و محلات ہوں گے جو آسمان سے باتیں
گے۔ لیکن جب ہمارا مختصر قافلہ مدن پورہ پہونچا تو میں نے اس کو اپنے مدت کے خیالات و تصورات سے بالکل مختلف پایا، وہ کوئی الگ محلہ یا آبادی
بنارس کے اور محلوں کی طرح ایک ملا ہوا محلہ ہے، بیچ میں سڑک ہے اس کے مشرقی جانب وہاں کے ملک التجار تاجا بیوپاری کے خاندان کے کچھ مختلف شاندار
ہو گیا ہے، شاندار اور خوبصورت مکانات ہیں، اس کے دو چار قدم کے فاصلے پر سڑک کے مغرب جانب مولانا عبدالمجید حریری کا مکان ہے، ہم پہلے
یہاں گئے، مولانا کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ موجود تو ہیں لیکن بیمار ہیں، ان سے ملاقات نہیں ہو سکتی، ہم نے ہر چند ان سے ملنے کی
اظہار کیا لیکن ان کے گھر کے آدمی نفی ہی میں جواب دیتے رہے، مگر مدن پورہ آنے کا مقصد صرف اتنا ہی سے اور ان کے نسبتی بھائی اور تاجا

---

(1) میں جب مجھے زیارت حرمین شریفین کی سعادت حاصل ہوئی تھی تو شیخ عبدالوہاب صاحب مرحوم دہلی جان والے کے یہاں دعوت میں مولانا
حریری سے ملاقات ہوئی تھی وہ اپنے عہدے سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ (ڈاکٹر القادری)

خاندان کے چشم و چراغ مولانا عبدالمتین صاحب ہی ملنے سے جو مولانا حریری ہی کی طرح بنارس میں غیر معمولی شخصیت کے مالک تھے اور اس وقت بحمداللہ بقید حیات تھے ملاقات کرنا تھا۔ جب کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی تو ہم نے ان کے آدمیوں سے کہا کہ مولانا کی خدمت میں جا کر عرض کر دو کہ ہم میں سے بعض کا تعلق دارالمصنفین اعظم گڈھ سے ہے اور وہ آپ سے ملنے کے بے حد مشتاق ہیں ہماری یہ آواز مولانا تک پہونچ گئی۔ لیکن اس کے ہمارا پیام لے کر ان کی خدمت میں جاتا وہ معمول سا دیکھیرشے کی مزدوری اور تہ بند پہنے ہوئے ہماری پذیرائی کے لئے باہر نکل آئے اور ہم کو اپنے کتب خانہ میں لے گئے اور بانداز کمال آو خاطر ہماری تواضع فرمائی۔ اس وقت وہ جواہر لال نہرو کے انگریزی خطوط کا جامعہ ملیہ دہلی کی فرمائش سے اردو میں ترجمہ کر رہے تھے۔ اس کا انہوں نے خاص طور سے ہم لوگوں سے ذکر کیا۔ اگرچہ یہ کام ان کے علمی مرتبہ سے بہت فروتر تھا۔ پھر بھی ہم نے ان کی حوصلہ افزائی کی اور عرض کیا، آپ کے قلم سے یہ ترجمہ اگر مکمل ہو گیا، تو اردو ادب کی صنف خطوط نگاری کے خزانہ میں ایک بڑا قیمتی اضافہ ہوگا، بنارس کی قومی و ملی و سیاسی زندگی کے سوال پر جس کے وہ ایک زمانہ میں روح رواں تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ میں سیاسی سرگرمیوں سے کنارہ کش ہو گیا ہوں، بنارس پہلے سے اب بہت بدل گیا ہے اسباب مجھ جیسے غیر فرقہ پرست اور خالص نیشنلسٹ مسلمانوں کی یہاں قطعی گنجائش نہیں ہے نہ ان کی کوئی قدر ہے، ہم کبھی یقین بھی نہ کر سکتے تھے کہ ہندوستان آزاد ہوگا تو یہاں کا مسلمان اتنا بے بس ہو جائے گا ہم ہندوستان کی آزادی کے متعلق کیا تصورات رکھتے تھے۔ اور کیا ہو رہا ہے۔

یہ بنارس کے اُس شخص کے خیالات تھے جو اپنے شباب کے زمانہ میں بنارس کی قومی و سیاسی و ملی زندگی کا ہیرو تھا۔ اور اپنے قوم پرورانہ خیالات و افکار و نظریات کی بنا پر لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتا تھا۔ اور وہاں کا ہر کہ و مہ اُس کے اشاروں پر چلنا اور اٹھنا بیٹھنا تھا۔

ہم کو ابھی اُن کے نسبتی بھائی اور اس خاندان کے گل سرسبد مولانا عبدالمتین صاحب سے بھی ملنا تھا۔ ہم ان سے رخصت ہو کر مولانا عبدالمتین کے دولت کدہ پر پہونچے۔ ایک صاف ستھری اور فرش و فروش سے آراستہ و پیراستہ دکان میں چند خوب صورت نوجوان گاؤ تکیہ لگائے بیٹھے تھے گویا کہ وہ کسی جلیل القدر مہمان کی آمد کا انتظار کر رہے ہیں ہم نے سلام عرض کیا اور پوچھا کہ کیا مولانا متین صاحب سے ملاقات ہو سکتی ہے ان دو نوں نے بغیر کسی تکلف اور مروت کے کہا کہ وہ عصر کے وقت بالا خانہ سے اترتے ہیں۔ اس سے پہلے اُن سے ملاقات کا کوئی امکان نہیں ہے ہم کو چونکہ دوپہر کے بعد بنارس سے واپس ہونا تھا۔ اس لئے ہم انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ اور واپس چلے آئے ان نوجوانوں نے جو یقیناً مولانا کے لڑکے اور پوتے رہے ہونگے حیرت انگیز طور پر معمولی اخلاق بھی ہمارے ساتھ نہیں برتا نہ انہوں نے اخلاقاً ہمیں اپنی دکان میں بٹھایا۔ نہ کوئی خاطر مدارات کی۔

بنارس کی اس مختصر ترین سیر میں علی حزیں کا یہ شعر برابر ہماری زبان پر تھا۔

از بنارس نروم معبد عام است اینجا　　　　ہر برہمن پسرے لچھمن و رام است اینجا

بنارس کی ہر چیز اس شعر کی روشنی میں دیکھتے تھے اور محظوظ ہوتے تھے ہماری نگاہ میں اس کا ہر گوشہ دامان باغبان و کف گل فروش تھا اور ہر طرف ہجوم دلبران دیکھ کر بے اختیار مولانا شبلی کی ایک غزل کے یہ شعر زبان پر رواں ہو جاتے تھے۔

بہ ہر سو از ہجوم دلبران شوخ بے پروا　　　　گذشتن از سر رہ مشکل افتاد است رہرو را

فغان از گرمی ہنگامۂ خوبان ندر دشتی　　　　بہم آمیختہ از زلف و عارض ظلمت و ضو را

لیکن ہمارا جذبہ شوق اس مرتبہ بھی علی حزیں کے مزار تک ہم کو نہ پہونچا سکا، بلکہ اس کا خیال ہی نہیں آیا کہ بنارس کے اس سفر کی ایک غایت مزار علی حزیں کی زیارت بھی ہے۔

اسی محلہ مدن پورہ میں اہل حدیثوں کی مشہور عربی درسگاہ جامعہ رحمانیہ بھی تھی، جس کے شیخ الحدیث اس زمانہ میں میرے اسکول فیلو اور ہم وطن مولانا نذیر احمد رحمانی املوی تھے۔ اس درسگاہ کے دیکھنے اور شیخ الحدیث سے ملنے کی خواہش بھی اعظم گڈھ سے لے کر ہم چلے تھے۔ لیکن خیال ہوا کہ مولانا عبدالمجید حریری کے مکان کے بالکل ہی قریب ہی یہ درسگاہ اور دارالاقامہ تھا، اگر کسی نے ذرا بھی رہنمائی کی ہوتی تو ہماری

یہ دیرینہ خواہش بھی بنارس کے اس دوسرے سفر میں پوری ہو جاتی، لیکن ؎

تہی دستانِ قسمت را چہ سود از رہبرِ کامل
کہ خضر از آبِ حیواں تشنہ می آرد سکندر را

آب حیواں پہونچ کر تشنہ کام واپس آنے پر ہم کو پورے سفر میں افسوس اور ماتم رہا پھر بعد میں اپنے دلِ نادان کو یہ کہہ کر تسلی دے لی کہ عنقریب پھر بنارس آنے کا اتفاق ہوگا۔ تو اس سر چشمۂ علم و فن سے انشاء اللہ ضرور شاد کام ہوں گے۔

گیان رانی کی جامع مسجد

واپسی میں ہم نے گیان وانی کی مسجد کی اس مرتبہ بھی زیارت کی۔ بلکہ اس کے حوض میں جو صحن کے ایک کنارے ہے وضو کر کے ظہر کی نماز بھی پڑھی اور اس کے ایک ایک گوشہ کو خوب گھوم پھر کے دیکھا۔ ہندوؤں کو توڑ کر جہاں جہاں مسجدیں بنی ہیں ان کے دوبارہ مندروں میں تبدیل کئے جانے کی تحریک جب سے ہندوؤں کے ایک خاص طبقہ میں چلی ہے اس وقت سے گیان وانی کی اس مسجد پر تینوں طرف سے سنتریوں کے گھیری ہوئی ہے ۲۴ گھنٹے پہرہ رہتا ہے۔ اس وقت بھی بندوق اور تلوار سے مسلح ایک مسلمان سنتری حوض کے کنارے سرو قد کھڑا پہرہ دے رہا تھا، جیسی اس سنتری پر نظر پڑی ہم نے دریافت کیا کہ بے چارا کھڑا کھڑا بالکل تھک جاتا ہوگا لیکن اس نے بتایا کہ ہماری ڈیوٹی بدلتی رہتی ہے اور ہم پہرہ دینے والے گھنٹوں اس طرح کھڑے رہنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ہم کو ذرا بھی تعب اور مشقت محسوس نہیں ہوتی، پھر یہ تو خانۂ خدا کی خدمت بھی ہے، جس کا آخرت میں انشاء اللہ ہم کو ثواب بھی ملے گا۔ اگرچہ یہاں زیادہ تر سناٹا رہتا ہے اور خال خال لوگ نماز پڑھنے آتے ہیں، ہم بیٹھ کر بھی اس کی پہرہ داری کر سکتے ہیں لیکن ہم اس کو دیانت کے خلاف سمجھتے ہیں جس طرح ہم کو حکم دیا گیا ہے اس کی تعمیل کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں، ہم کو بیٹھ کر پہرہ دینے کی بالکل اجازت نہیں ہے۔ میں جب پہلی مرتبہ بنارس گیا تھا، تو مسجد کی پشت کا وسیع و عریض چبوترہ جو درحقیقت اس پرشکوہ مسجد کا پشتہ ہے مسجد سے متعلق تھا۔ اس پر جنازہ کی نماز ہوتی تھی اب ہندوؤں کے قبضہ میں چلا گیا ہے، مسجد یہ بھی جو بالکل ہندو آبادی کے اندر ہے حسرت برس رہی تھی خدا سے دعا ہے کہ اس کو محفوظ رکھے اور اس کے تقدس و حرمت میں کوئی فرق نہ آنے۔

میرا تیسرا سفر

اس کے کئی سال بعد مارچ ۱۹۶۶ء میں تیسری مرتبہ پھر مجھے بنارس کے سفر کا اتفاق ہوا فرقۂ اہل حدیث کے مرکزی دارالعلوم کی شاندار اور پرشکوہ عمارت کے افتتاح کی جس کی ابھی ایک ہی منزل بنی تھی، تقریب تھی، میں اعظم گڈھ سے بس میں سوار ہو کر بنارس روانہ ہوا، قریب پہونچ کر جب سواد بنارس نظر آیا تو بے اختیار علی حزیں کا وہ پرکیف و دلآویز شعر جو اس کے بنارس سے عشق و محبت کے جذبات کا پورا مظہر ہے اور جو اوپر نقل کیا جا چکا ہے جس میں ہر برہمن زادے کو رام اور لچھمن سے تشبیہ دی گئی ہے میری زبان پر آ گیا اور گنگنانے لگا، کچھ صاحب ذوق ہندو بھی میرے ہم سفر تھے۔ انہوں نے میری زبان سے لچھمن و رام کا نام سنا، تو ان کو مجھ سے بڑی دلچسپی پیدا ہوئی اور اس شعر کے پڑھنے کی فرمائش کی۔ میں نے شعر پڑھ کر اس کا تفصیل سے ان کو مطلب بتایا تو سن کر بہت محظوظ ہوئے اور دیر تک شعر کی داد دیتے رہے میں نے کہا کہ بنارس کی کشش کے جہاں بہت سے اسباب ہیں جن کے لئے لوگ شد رحال کرتے ہیں ایک سبب اس ایران نژاد شاعر کا مزار بھی ہے جو آج تک مرجع خلائق ہے، بنارس سے اس کا نام اس طرح وابستہ ہے کہ کسی طرح جدا نہیں کیا جا سکتا، جب بھی بنارس کا نام زبان پر آئے گا۔ معاً اس کا نام بھی ضرور آئے گا۔

مرکزی دارالعلوم اہل حدیث کی نئی عمارت کا افتتاح نجد کے مشہور نابینا عالم اور مدینہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز کے مبارک ہاتھوں سے ہونے والا تھا۔ بنارس کا یہ میرا تیسرا سفر درحقیقت انہیں کے شوق دید میں ہوا تھا۔ لیکن عین وقت پر ان کو کچھ ایسی ضرورت پیش آ گئی کہ وہ تشریف نہ لا سکے اور اسی یونیورسٹی کے ایک لائق پروفیسر شیخ عبدالقادر شیبۃ الحمد کو اپنا قائم مقام بنا کر بھیجا۔ وہ فضیلت مآب شیخ احمد الشبیلی سفیر سعودی عربیہ اور ان کے فرسٹ سکریٹری کے ساتھ اس مقدس تقریب میں شرکت کے لئے دہلی ہوتے ہوئے آئے سعودی حکومت سے مجھ کو بڑا تعجب ہوا کہ سر پر آمدہ عرب حاکموں اور افسروں کے خلاف ان کے گورے چٹے چہرے پر گھنی سیاہ ڈاڑھی دیکھ کر بڑی

فراغت ہوئی، ظہر کی نماز انہی کی اقتداء میں ہوئی، انہوں نے تو قصر کیا لیکن سارے مقتدیوں نے جن سے طویل و عریض مسجد بھری ہوئی تھی، بعد میں اپنی دو رکعت پوری کی، لوگوں کے سنتوں سے فارغ ہونے کے بعد شیخ عبدالقادر شیبۃ الحمد نے بغیر کسی طے شدہ پروگرام کے تقریر شروع کر دی جس میں انہوں نے بنارس کے تمام لوگوں کا جنہوں نے سڑکوں پر دو رویہ کھڑے ہو کر ان کا خیر مقدم کیا تھا۔ بہت پر جوش الفاظ میں شکریہ ادا کیا، اصل تقریب ڈھائی بجے دن کے شروع ہونی چاہئے تھی لیکن ان محترم مہمانوں کو جلسہ گاہ میں جو مہمان خانہ سے کافی فاصلہ پر تھی، کسی وجہ سے پہونچنے میں غیر معمولی تاخیر ہوگئی۔ وہ مقررہ پروگرام کی بجائے چار بجے پہونچے جب کہ پورا مجمع انتظار کرتے کرتے تھک چکا تھا۔ نماز عصر کے بعد جلسہ شروع ہوا۔ پہلے مرکزی دارالعلوم اہل حدیث بنارس اور آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس دہلی کی طرف سے ان دونوں عرب مہمانوں کی خدمت میں علی الترتیب مولوی عبدالوحید صاحب رحمانی ناظم دارالعلوم اور مولانا عبدالوہاب آروی صدر کانفرنس نے الگ الگ عربی میں سپاسنامے پیش کئے، اس کے بعد شیخ عبدالقادر شیبۃ الحمد نے ۱۰۔۱۲ لمبے ورقوں میں لکھی ہوئی تقریر جس کو وہ پہلے سے موقع کی مناسبت سے ملبند کرکے لائے تھے پڑھ کر سنائی اس کے بعد جلالت مآب سفیر سعودی عربیہ نے بھی قریب قریب اسی قدر لمبی لکھی ہوئی تقریر پڑھ کر سنائی اور سپاسناموں کا شکریہ ادا کیا۔ شیخ عبدالقادر شیبۃ الحمد کی فاضلانہ تقریر سے مجمع کے عربی داں حضرات جن کی اچھی خاصی تعداد تھی بہت محظوظ ہوئے۔ اس کے بعد اصل پروگرام شروع ہوا مرکزی دارالعلوم کے دس بارہ طلبہ بخاری شریف کے جلدیں اپنے ہاتھوں میں لئے ہوئے آئے اور شیخ عبدالقادر کے سامنے حلقہ باندھ کر بیٹھ گئے، اعلان کیا گیا کہ بیننظر لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھ کر دیکھیں، کوئی صاحب اٹھنے کی کوشش نہ کریں، چنانچہ اس ہدایت پر پورا عمل ہوا اور ایک متنفس بھی شروع سے آخر تک اپنی جگہ سے نہیں اٹھا۔ پہلے ایک طالب علم نے بخاری شریف کے پہلے باب کی پہلی حدیث انما الاعمال بالنیات پڑھی اس پر شیخ عبدالقادر شیبۃ الحمد نے تقریباً پون گھنٹہ نہایت فصیح و بلیغ تقریر کی جس میں انہوں نے پہلے اس حدیث سے متعلق تمام آئمہ کے اختلافات اور ہر ایک کے دلائل تفصیل سے بیان کئے، پھر اپنا مسلک اور اس کے وجوہ ترجیح پیش کئے یہ مدرسانہ اور فاضلانہ تقریر اتنی دلچسپ، اتنی دلآویز اور پر معلومات تھی کہ جی چاہتا تھا کہ کاش وہ کچھ دیر اور اس موضوع پر گل افشانی فرماتے، مولانا عبدالمجید حریری نے جن کا ابھی اوپر کی سطروں میں تفصیل کے ساتھ ذکر آیا ہے جو خود بھی ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک کے سعودی عربیہ میں قونصل جنرل رہ چکے تھے۔ اور نہ صرف عربی زبان بلکہ متعدد ایشیائی اور مغربی زبانوں کے ادا شناس ہیں وقت کی تنگی کے پیش نظر نہایت مختصر الفاظ میں عربی لب و لہجہ میں عرب مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اتنے میں مغرب کا وقت ہوگیا اور اس پر اس وقت کی یہ نشست ختم ہوگئی۔

میں شیخ عبدالقادر شیبۃ الحمد کی فاضلانہ درسی تقریر سے بہت متاثر تھا اور فوراً اپنے فاضل دوست افضل العلماء مولانا محمد یوسف کوکن ناظمی مصنف ابن تیمیہ (ریڈر السنہ مشرقیہ مدراس یونیورسٹی) سے جو خاص اس تقریب میں شرکت کے لئے مدراس جیسے دور دراز صوبہ سے آئے ہوئے تھے اپنے تاثر کا اظہار کیا تو انہوں نے فرمایا کہ شیخ کی تقریر چونکہ عربی میں تھی اس لئے آپ کو بہت اچھی لگی، لیکن اس تقریر میں کوئی ندرت نہیں تھی۔ عربی مدرسوں میں شیوخ حدیث اس حدیث پر ایسی ہی عالمانہ و فاضلانہ تقریر کرتے ہیں لیکن ان کی اس رائے سے میرے تاثر میں کوئی فرق نہیں آیا اور رات بھر میں اس کے مزے لیتا رہا، شارح مشکوٰۃ مولانا عبیداللہ رحمانی محدث کبیر کی خدمت میں حاضر ہوا جو تاجا پیاری کے عالیشان محل کے ایک تنگ کمرے میں مقیم تھے میں نے نہایت موثر اور پر جوش الفاظ میں شیبۃ الحمد کی درسی تقریر پر اپنے تاثر کا اظہار کیا تو انہوں نے بھی میری توقع کے خلاف رائے ظاہر فرمائی اور اس میں کوئی نئی بات تو نہیں تھی، تم نے ابھی عرب علماء و فضلاء کی تقریریں سنی کہاں ہیں خود مدینہ یونیورسٹی کے تعلیمی اسٹاف میں ان سے بڑھ بڑھ کر خطیب اور بولنے والے ہیں یہ تو ان کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں ہیں۔ لیکن مجھ پر شیخ کی محدثانہ و فقیہانہ تقریر کا اتنا اثر تھا کہ میں فاضل شارح مشکوٰۃ سے ہم آہنگ نہ ہو سکا اور خاموش ہوگیا۔

بعد میں قاضی اطہر مبارک پوری ایڈیٹر البلاغ سے معلوم ہوا کہ شیخ عبدالقادر شیبۃ الحمد عبدالعزیز ابن باز کے بعد یونیورسٹی میں سب سے زیادہ با اختیار اور بڑی حیثیت کے مالک بہت لائق استاد اور بہت اچھے خطیب ہیں مصری النسل ہیں۔ نجد میں انہوں نے شادی کی ہے اور اب وہیں کے شہری ہوگئے ہیں، حکومت میں ان کو بڑا رسوخ حاصل ہے وائس چانسلر شیخ ابن باز کے دست و بازو ہیں۔

اس پروگرام میں جن کا میں نے ابھی اوپر ذکر کیا۔ اردو کے لئے کوئی جگہ نہیں رکھی گئی تھی۔ اچھے خاصے عربی پڑھے لکھے لوگ جن کو عربی سمجھنے اور بولنے کی مزاولت نہیں ہے، خاطر خواہ لطف اندوز نہ ہوسکے اور اردو داں بے چارے تو اس نشست کی پوری کارروائی سے جو عربی میں ہوئی محروم رہ گئے اگر فاضل عربوں کی رعایت سے عربی ہی میں ساری کارروائی طے پا گئی تھی۔ تو اردو دانوں کے لئے جن کو اشتہارات، دعوتی کارڈوں اور خطوط کے ذریعہ ایک ایک گوشہ سے بلائے گئے اور وہ اپنا کثیر سرمایہ خرچ کرکے اس بابرکت تقریب میں شرکت کے لئے آئے تھے، کم سے کم ان عرب معززین کی عربی تقریروں کا اردو ترجمہ یا تو پہلے سے چھپا کر تقسیم کر دیا جاتا یا اگر یہ ممکن نہ تھا تو زبانی ان کا اردو ترجمہ سنا دیا جاتا تاکہ وہ بھی اس پروگرام سے لطف اندوز ہوسکتے۔ دارالمصنفین کی تاریخی پچاس سالہ گولڈن جوبلی کے موقع پر یہی طریقہ اختیار کیا گیا تھا۔ انہی احمد الشیبلی سفیر سعودی عربیہ نے اس میں بھی شرکت کی تھی اور جوبلی کے تقریروں کے پروگرام میں جس میں مولانا محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند، مولانا عتیق الرحمٰن ناظم ندوۃ المصنفین، مولانا سعید احمد اکبرآبادی ایڈیٹر برہان، جناب یوسف حسین خاں مصنف روح اقبال اور ہندوستان میں پاکستان کے نائب سفیر افضل اقبال، پروفیسر مجیب وغیرہ جیسے مشاہیر علم و فن نے حصہ لیا تھا، احمد الشیبلی نے بڑی پر وقت، ایک بہت مختصر تقریر لکھ کر پڑھی تھی جس کا مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے نہایت فصیح و بلیغ اردو میں بلکہ اصل عربی تقریر سے کہیں بڑھ کر ترجمہ کیا تھا۔ جس سے اردو داں بھی بہت لطف اندوز ہوئے اور دونوں فاضل مقرروں کو بہت داد دی، یہی طریقہ یہاں بھی اختیار کرنا چاہئے تھا، معلوم نہیں تقریب کے منتظمین نے جو زیادہ تر جامعہ کے فاضل، عربی کے استاد اور عربی و اردو دونوں زبانوں کے بولنے پر قادر تھے، اس طرف کیوں نہیں توجہ کی۔

اس تقریب کا اردو میں پروگرام بھی تھا، بعد کے پروگراموں میں جو محض رسمی تھے میں اپنی اچانک علالت سے شریک نہ ہوسکا، جس کا مجھے کوئی افسوس نہیں ہے۔

اس تیسرے سفر میں بھی علی حزیں کی قبر کی زیارت سے محروم رہ گیا، جن کا مذکورہ بالا شعر مدتہ العمر گنگناتا اور اپنے ہم سفروں کو اس سے محظوظ کرتا چلا آرہا تھا لیکن موسموں کے اس جلسہ کی مشغولیت میں اس کو ایسا بھولا کہ دو تین روز کے قیام میں کسی آن اس کا خیال ہی نہیں آیا۔ یہاں پنڈت مدن موہن مالویہ کی قائم کردہ ہندو یونیورسٹی کو اس مرتبہ بھی نہ دیکھنے کا بہت افسوس ہوا جس کے دیکھنے کا مجھے مدت سے اشتیاق ہے اور پورا نہیں ہو رہا ہے اس کے ٹیچنگ کالج کے پروفیسر رام کمار چوبے جو بنارس ہی کے رہنے والے ہیں اور ہندوستان میں کالج اور یونیورسٹی کی ڈگریوں کے سب سے بڑے سرمایہ دار ہیں یعنی اٹھارہ مضامین میں جن میں اردو فارسی و عربی کے مضامین بھی شامل ہیں، ایم اے ہیں اور ہر سال دارالمصنفین کے کتب خانہ سے استفادہ کے لئے اعظم گڈھ آیا کرتے تھے، انہوں نے فرطِ شفقت سے بارہا مجھ کو بنارس آنے اور یونیورسٹی دیکھنے کی دعوت دی لیکن آج تک ان کی دعوت قبول کرنے کا موقع نہیں ملا میری یہ تمنا اب پوری ہوئی ہے ان رام کمار چوبے سے جو اپنی تعلیمی سند اور ڈگریوں کے لحاظ سے اعجوبہ روزگار ہیں، سید صاحب کے بڑے تعلقات تھے اور ان کی بڑی قدر کرتے تھے۔ ان سے سلسلۂ مراسلت بھی قائم تھا۔ ایک مرتبہ ان کا اردو خط "معارف" میں شائع کیا، ایک بار انہوں نے مجھ کو بھی بنارس سے اردو میں خط لکھا، جس کو میں اب تک حرزِ جاں بنائے ہوئے ہوں۔ جسے میں ناظرین کی دلچسپی کے لئے ذیل میں نقل کرتا ہوں۔

محترمی! عید کی مبارک قبول ہو۔ خدا ہمارے سب دوستوں کو مع عیال و اطفال جو دارالمصنفین میں ہیں خوش و خرم رکھے۔ آپ کی یاد اکثر آتی رہی ہے۔ میں ایک سال کے لئے بمبئی چلا گیا تھا۔ کیونکہ یہاں سے ریٹائر ہوگیا تھا۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ ہمارے استاد مولانا عبدالسلام صاحب (مصنف اسوۂ صحابہ و شعر الہند) اب اس دنیا میں نہیں ہیں ان کی یاد برابر آتی ہے، معلوم نہیں میرے کرم فرما سید صباح الدین صاحب کہاں ہیں اگر ملا ہوں تو میرا سلام ادا

مبارکباد میں ہے ، نہیں تو آپ کو تکلیف دیتا ہوں کہ آپ ، ان کو میری طرف سے مبارکباد لکھ دیں ۔ امید ہے کہ وہ مع عیال و اطفال کے خوش ہوں گے ۔ شاہ معین الدین صاحب اور مجیب اللہ صاحب (مولف اہل کتاب صحابہ و تابعین و تبع تابعین) کو میرا آداب عرض اور عید کی مبارکباد ۔ مولانا مسعود علی صاحب بھی اگر وہاں ہوں تو میری یاد کرو دیجئے ۔ ہو سکا تو میں ایک ہفتہ بعد آپ سے ملنے آؤں گا ، براہ مہربانی بواپسی ڈاک لکھیئے کہ وہاں کون کون صاحب موجود ہیں ، بمبئی میں سید نجیب اشرف صاحب سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی وہ اچھی طرح ہیں ۔

اپنے صاحبزادے ارشد کا بھی حال لکھئے ۔

رام کمار چوبے

لطیفہ ایک مرتبہ دارالمصنفین میں انہی رام کمار چوبے کے زمانۂ قیام میں پنڈت جواہر لال نہرو ، اپنے دورہ کے سلسلہ میں اعظم گڑھ تشریف لائے جن سے مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی سے بڑے دوستانہ تعلقات تھے اور اس سے پہلے وہ دارالمصنفین ہی میں ٹھہرا کرتے تھے لیکن اب کی مرتبہ ان کے میزبانوں نے دارالمصنفین کے بالکل قریب ہی ایک ہندو وکیل کے بنگلہ میں ان کو ٹھہرایا تھا ، مولانا مسعود علی ان کی ملاقات کے لئے جانے لگے تو اپنے ساتھ ان اجرے روزگار رام کمار چوبے کو بھی لے لیا جنہوں نے کبھی بنارس میں رہنے اور ہندو یونیورسٹی سے تعلق رکھنے کے باوجود پنڈت جی موصوف سے نیاز حاصل نہیں کیا تھا ، مولانا نے پنڈت جی سے ان کا تعارف کرایا ، تو بجائے داد دینے کے انہوں نے بے ساختہ فرمایا کہ اب ان کے پاس تو کچھ باقی نہ رہ گیا ہوگا ۔ جن کو سن کر ہمارے مخدوم چوبے جی کو بہت ملال ہوا اور وہاں سے جب ملکر لوٹے اور اس کے بعد پھر کبھی جواہر لال جی کا نام نہیں لیا ۔

دارالمصنفین کی تاریخی جوبلی میں شرکت کے لئے مشاہیر اہل علم ہندو حضرات کو بھی دعوت نامے بھیجے گئے تھے ۔ لیکن شریک کل تین ہوئے ۔ ایک عورت اور اسلام کے مصنف اور غالبیات کے ماہر جناب مالک رام ایم اے ، دوسرے اردو کے مشہور شاعر تلوک چند محروم کے صاحبزادے جگن ناتھ آزاد اور تیسرے ہمارے مخدوم یہی جناب رام کمار چوبے ، جن کے ساتھ ان کی اہلیہ بھی تھیں ، ان کو جب معلوم ہوا کہ اتنی بڑی عظیم جوبلی میں جس میں شرکت کے لئے پورا علی گڑھ ، پورا جامعہ ملیہ اور پورا ندوہ اٹھ کر چلا آیا ہے ۔ ہندو اہل علم صرف ہم تین آدمی شریک ہیں ۔ تو ہندو حضرات کے اس جوبلی سے دلچسپی نہ لینے پر ان کو بہت افسوس ہوا اور فرمایا کہ یہ تنگ نظری اور تعصب کی انتہا ہے ، علم و ادب کسی قوم کی میراث نہیں ہے اس خالص علمی و ادبی ادارہ کی گولڈن جوبلی سے مسلمان اہل علم کی طرح ہندو اہل علم کو بھی دلچسپی لینی چاہیے تھی ۔ جوبلی کی مجلس شاعرہ کی صدارت آنند نرائن ملا نے کی تھی جو اردو زبان کے بہت بڑے شاعر اور اردو کو ہندوستان کی دوسری قومی و ملکی زبان بنانے کے بڑے زبردست حامی ہیں اور اردو کی حق تلفی پر ہر وقت دل گرفتہ رہتے ہیں ۔

رام نگر بنارس میں کتنے قصبے ہیں اس کا مجھ کو علم نہیں لیکن اس کے تین قصبوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے ، ایک رام نگر ہے جہاں کے رہنے والے اردو زبان کے مشہور اہل علم ، شاعر اور مصنف مولانا امام الدین رام نگری ہیں ۔ اور چھوٹے سائز کا ایک دینی ماہنامہ انوار الاسلام نکالتے ہیں ان کا خاص موضوع رد فرق باطلہ ہے جن میں خاص طور سے آریہ داخل ہیں ، ان کے اس مختصر سے پرچہ میں زیادہ تر انہیں کے رد میں مضامین ہوتے ہیں ۔ اور وہ ان میں خوب خوب داد تحقیق دیتے اور اسلام کی حمایت کا حق ادا کرتے ہیں ۔ اور ان کے صاحبزادے شاہد رام نگری اردو کے ایک اچھے صحافی ہیں اور ہفتہ وار نقیب پھلواری شریف پٹنہ کے ایڈیٹر ہیں ۔ رام نگر سابق وزیر اعظم ہند لال بہادر شاستری آنجہانی کا بھی وطن ہے ۔ یہ بچپن میں یتیم ہو گئے تھے انتہائی عسرت اور فلاکت کی زندگی تھی ، گنگا پار کرکے روزانہ رام نگر سے بنارس پڑھنے آتے تھے جس دن بد قسمتی سے کشتی کا کرایہ ان کے پاس نہیں ہوتا تھا تو دریائے گنگا کا لمبا چوڑا پاٹ تیر کر آتے تھے ۔ یہی روزانہ کا معمول تھا ، اس وقت کون پیشین گوئی کر سکتا تھا کہ یہی غریب اور فلاکت زدہ لڑکا جواہر لال نہرو کا جانشین اور ہندوستان جیسے لق و دق ملک کا وزیر اعظم ہو جائے گا ۔

بھدوہی دوسرا بھدوہی ہے جو اس دیار میں قالین سازی کا بہت بڑا مرکز ہے اور اس کا کاروبار زیادہ تر مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے اور ان کے بڑے بڑے کارخانے ہیں جن میں کروڑوں کا مال ہر سال تیار ہوتا ہے ۔ اور یورپ ، امریکہ اور آسٹریلیا کی منڈیوں میں جا کر بکتا ہے اس سفر

میں مجھے وہاں بھی جانے کا اتفاق ہوا اور میں صنعت کاروں کے قالین سازی کے بڑے کارخانوں اور گوداموں کو دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔

گیان پور بھدوہی سے ۱۰ میل کے فاصلہ پر بنارس کا تیسرا قصبہ گیان پور ہے جہاں ہر قسم کے سرکاری دفاتر اور عدالتوں کے ساتھ ایک عظیم الشان ڈگری کالج بھی ہے جس میں مختلف فنون کی ایم اے تک تعلیم ہوتی ہے ہر شعبہ اور فیکلٹی کی الگ الگ عمارتیں ہیں ان میں سائنس کالج اور کامرس کی عمارتیں بہت شاندار ہیں، اسی سفر میں میں جب وہاں گیا تو سالانہ امتحانات ہو رہے تھے۔ اس لئے میں ان کالجوں کے اندرونی حصوں کو نہ دیکھ سکا۔ اس کالج سے متعلق ایک لائبریری بھی ہے جس کی عمارت سطح زمین سے کچھ زیادہ بلندی پر ہے اندر جانے کے لئے ہر چہار طرف سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں وہیں کے ایم کام کے ایک طالب علم کے ذریعہ اس لائبریری کو جو ایک وسیع ہال، متعدد بڑے بڑے کمروں اور کھلی ہوئی چھتوں پر مشتمل ہے بہت تفصیل سے دیکھنے کا موقع ملا۔ میں جب لائبریری کے اندر داخل ہوا تو لائبریرین نے میرا خلاف توقع بہت پرتپاک خیر مقدم کیا اور لائبریری کے ایک ایک شعبہ کو بڑے اطمینان سے دکھایا تمام کمروں اور ہال میں بھی گز ڈیڑھ گز کی تعداد میں سینکڑوں الماریاں ہیں جو کتابوں سے بھری ہوئی ہیں۔ ہال میں دیوار سے لگی ہوئی الماریوں کے ساتھ مطالعہ کی دو بڑی بڑی میزیں ہیں جن پر انگریزی و ہندی کے تقریباً تمام موقت الشیوع رسائل و اخبارات جو ملک کے مختلف حصوں سے نکلتے ہیں، رکھے ہوئے تھے۔ میں انگریزی اور خصوصاً ہندی کا اتنا بڑا خزانہ دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔ میں نے لائبریرین سے کہا کہ آپ نے پوری لائبریری تو دکھا دی لیکن وہ کمرہ کہاں ہے جہاں اردو کتابیں رکھی ہوئی ہیں۔ اس نے ایک سرد آہ کھینچی اور کہا کہ میں اردو کا اسکالر ہوں اور وہ میری مادری زبان ہے اور اردو سے مجھ کو دلچسپی ہے افسوس ہے اردو کے لئے اس وسیع لائبریری میں کوئی جگہ نہیں ہے نہ اردو کتابیں اور اخبارات و رسائل لائبریری کی طرف سے خریدے جاتے ہیں نہ لوگ تبرعاً ہماری لائبریری میں اپنی طرف سے بھیجتے ہیں اتنی بڑی لائبریری میں اردو کی صرف ایک کتاب ہے جس کو میں ابھی آپ کو دکھاتا ہوں میں نے سمجھا کہ وہ اردو کی کوئی نایاب اور نادر قلمی کتاب کسی باکمال کاتب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہوگی۔ جو یہاں اتنی حفاظت سے رکھی ہے وہ گھڑ دیڑھ گز کی ایک مقفل الماری سے کتاب نکال کر میرے پاس لایا تو مجھے دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ اردو کا کوئی بیش قیمت بیش قیمت نادر مخطوطہ نہیں جیسا کہ میرا گمان تھا،

ناقابلِ فراموش بلکہ غیر منقسم ہندوستان کے مشہور صحافی اور جرنلسٹ اور ہفتہ وار ریاست دہلی کے شہرہ آفاق ایڈیٹر جناب دیوان سنگھ مفتون کی ڈائری "ناقابلِ فراموش" ہے جن کی اخبار ریاست میں تنقیدوں سے ہندوستان کے بڑے بڑے راجے مہاراجے اور نوابان لرزہ براندام رہتے تھے اور جن کے قلم کے چرکوں سے بڑے بڑے سرمایہ داروں کے قلب و جگر بھی جاتے تھے۔ مجھے اس کتاب کی زیارت کا مدت سے اشتیاق تھا۔ اس کی کئی قسطیں چمنستان لاہور میں بھی میری نظر سے گزر چکی تھیں۔ اس لئے میں اور زیادہ اس کا دلدادہ تھا۔ اس کو یہاں دیکھ کر میں اتنا خوش ہوا کہ عرض نہیں کر سکتا۔ بڑی تقطیع پر اتنی صاف روشن اور پاکیزہ چھپی ہوئی ہے کہ اس کو دیکھ کر آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں۔

ملا واحدی

تاثرات

انگریزوں کے زمانے میں بے پردگی کا اتنا زور نہیں تھا جتنا کہ انگریزوں کے جانے اور آزادی ملنے کے بعد سے ہوا ہے۔ انگریزوں کے زمانے میں مغلئی تمدن آہستہ آہستہ بدل رہا تھا۔ مگر اب بدلنے کی رفتار کے پر لگ گئے ہیں۔ میں نے چونکہ مغلئی تمدن کا عروج دیکھا ہے، میری آنکھوں کو اور میرے دل و دماغ کو یہ تبدیلی بے حد کھٹکتی ہے۔ میں جن کے لئے روزانہ دعا مانگا کرتا ہوں۔ اُن کی ذرا سی تبدیلی مجھ سے دعا کا جذبہ چھین لیتی ہے۔

۱۸۵۸ء میں جب دلی والے دلی واپس آکر دوبارہ بسے تو اُن کے پاس مغلئی تمدن کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ایک آدھ خاندان کو مستثنیٰ کر دیجئے، باقی سارے مسلمان خاندان تباہ اور پریشان حال تھے۔ لیکن اُنہوں نے اپنے تمدن کا دامن نہیں چھوڑا اُسے سینے سے تھامے رکھا۔

جو تمدن صدیوں میں بنا تھا وہ میری پیدائش کے وقت یعنی ۱۸۸۸ء میں درجہ کمال کو پہونچ چکا تھا اور پھر دلی کے دارالسلطنت بننے ۱۹۱۱ء تک اُسے خاصہ فروغ ہی رہا۔ ۱۹۱۱ء سے قبل کوئی طوائف بھی اس طرح عریانہ نہیں پھرتی تھی۔ جس طرح آج ہم شرفا کی بہو بیٹیاں دلی میں۔

انگریزوں کو ہم غیر جانتے تھے۔ لہذا ان کا عمل ہمارے واسطے نمونہ نہیں تھا۔ لیکن اب حکومت غیروں کی نہیں ہے اپنوں کی ہے موجودہ حکام کا عمل ہمارے واسطے نمونہ ہے۔ اب الناس علیٰ دین ملوکھم کے ہم صحیح مصداق ہیں۔

لیاقت علی خاں کی زندگی کی بات ہے ایک بڑی بی سے میں نے پوچھا، تم تو تعلیم یافتہ نہیں ہو تم نے کس حق سے پردہ اُٹھا دیا۔ بولیں۔ لیاقت علی وزیر اعظم کی بیوی بھی تو پردہ نہیں کرتیں۔ کیا بیگم لیاقت علی خاں ہم سے کم شریف ہیں۔ میں اُنہیں کیا جواب دیتا۔ واقعی بے پردگی مسلم قوم کی بیویوں کی وجہ سے بڑھی ہے۔ لیڈی ولنگڈن اور لیڈی لنلتھگو سے ہماری عورتیں واقف نہیں تھیں، مگر بیگم لیاقت علی اور اُن کی ساتھنوں کے بلند مراتب سے واقف ہیں اور انہیں نمونہ سمجھتی ہیں

کاش غریب شرفا کی عورتیں ایک بات سوچیں کہ بیگم لیاقت علی کے مرتبے والیاں سڑکوں پر اور بسوں میں ماری ماری نہیں پھرتیں۔ تمہارا بے برقع پھرنا تو شاہ بڑے کا اجتماع یاد دلا دیتا ہے۔ دلی میں جمنا کے کنارے شاہ بڑے کا مزار ہے۔ وہاں خدا معلوم کب سے چرسے اور بھنگڑ دن بھر جمع رہتے ہیں۔ میں نے تو گھٹیا قسم کی عورتوں کو اتنا بے پردہ صرف وہاں دیکھا ہے ۱۹۴۷ء میں برقعے سے فقط منہ باہر نکلا تھا۔ پورا جسم باہر نکل آیا ہے۔ اور جسم پر لباس ایسا پہنا جاتا ہے۔ ویسا لباس شاہ بڑے جانے والی گھٹیا عورتیں بھی نہیں پہنتی تھیں۔

مغلئی پردہ ترک کر دو، لیکن اسلامی پردہ تو ترک نہ کرو۔ پردے کا جو حکم قرآن میں ہے اور تمہاری طرح بازاروں میں پھرنے کو قرآن نے منع فرمایا ہے۔ اسے تبرج جاہلیہ کہا ہے تم ترقی کر رہی ہو یا اسلام سے قبل کے دور کی طرف جا رہی ہو، دور جاہلیت کی طرف؟

حضرت فضیل بن عیاض رحمتہ اللہ علیہ ہمارے ایسے بزرگ ہیں جو اوائل اسلام میں پیدا ہوئے تھے اور جنہوں نے ۱۸۷ ہجری میں وفات پائی تھی، جن کی بابت ہمیں یقین ہے کہ اسلام کے منشا کو خوب سمجھتے تھے۔ وہ فرماتے ہیں "دنیا ایک بیمارستان ہے اور لوگ اس میں دیوانوں کی مانند ہیں اور دیوانوں کے لئے بیمارستان میں قید و زنجیر ہوتی ہے"۔

اس کا یہ مطلب نہیں لینا چاہئے کہ حضرت فضیل ترک دنیا کی تعلیم دے رہے ہیں۔ حضرت فضیل صرف یہ فرماتے ہیں کہ یہاں شریعت کی پابندی ضروری ہے قید و زنجیر سے مراد شریعت ہے۔ شریعت کا عمل دخل دیوانوں کا دیوانہ پن دبائے رکھتا ہے اور شریعت کا عمل دخل نہ ہو تو دیوانگی ابھر آتی ہے اور انسان باؤلے کتوں کی طرح کاٹنے لگتا ہے اور باؤلا پن پھیلاتا ہے۔

حضرت فضیل کے قول کی صداقت میں آج سے پہلے بھی شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا، لیکن آج تو قید و زنجیر یعنی شریعت کے فقدان کا اثر اور نتیجہ بالکل عیاں ہے۔ مسلمانوں کے گھروں میں آب حیات (قرآن مجید) موجود ہے، لیکن جس طرح سگ گزیدہ پانی سے ڈرتا ہے اور پانی نہیں پیتا اور پیاس نہ بجھنے کی وجہ سے مر جاتا ہے اسی طرح مغرب زدہ مسلمان آب حیات (قرآن مجید) سے بھاگتے ہیں اور اس کے قریب نہیں آتے اور روز بروز موت کے قریب پہونچتے جاتے ہیں۔ تعلیم یافتہ مسلمانوں کو مغرب زدگی نے اسلامی پابندیوں سے آزاد کر دیا ہے اور غیر تعلیم یافتہ کو جہالت نے۔ پوری ملت اسلامی پر بے راہ روی مسلط ہے ـــ گھر کے رہے ہیں نہ گھاٹ کے۔ بقول ایک بزرگ کے دنیا نے ان کے ایمان کو اس طرح کھا لیا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا لیتی ہے اور ایمان کو کھا کر دنیا نے ان سے اپنا منہ چھپا لیا ہے انہیں دنیا ملی نہیں رہی ہے ؎

چیست دنیا از خدا غافل شدن

نے قماش و نقرہ و فرزند و زن (مولانا روم)

جتنے اقوال بزرگان سلف کے دنیا کی مذمت میں ہیں وہ سب اس دنیا کے متعلق ہیں جو خدا سے غافل کر دیتی ہے جو دنیا خدا سے غافل نہ کرے وہ ایمان کو کیا کھائے گی وہ تو عین ایمان ہے، عین دین ہے، عین اسلام ہے اسے کون برا کہہ سکتا ہے۔

حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں "زندگی میں اپنے نفس کو مردہ بنا لو تاکہ موت کے بعد مردوں میں تم زندہ نظر آؤ"

حضرت شیخ احمد خضرویہ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں "اپنے نفس کو مار ڈال تاکہ خود زندہ ہو جائے"

نفس کو مارے بغیر خدا کو پانا مشکل ہے۔ نفس مارنے کے معنی خودکشی نہیں ہیں۔ نفس کو مارنے کے معنی ہیں نفس کو خدا کا بندہ بنانا ـــ دنیا کا بندہ نہ بنانا۔ دنیا کا حاکم ہونا اور دنیا کا محکوم نہ ہونا۔ ان الدنیا خلقت لکم وانکم خلقتم للآخرۃ "دنیا تمہارے واسطے ہے (تم دنیا کے واسطے نہیں ہو) تم اس کے واسطے ہو جس سے دائمی سابقہ پڑتا ہے۔ بالکل صاف بات ہے۔ گلے اترنی چاہئے یہ دنیا کی مذمت کرنے والے اور نفس کو مار ڈالنے والے یعنی نفس کو قابو میں رکھنے والے ہی تو تھے جو خلاف اسلام حکم دینے والے بادشاہوں کے ساتھ پورے جوش و خلوص کے ساتھ جہاد کیا کرتے تھے۔ دونوں صورتوں میں انہیں جان کی پرواہ نہیں ہوتی تھی۔ اللہ کی خوشنودی کے مقابلے میں مال کی اور جان کی پرواہ کی جائے تو کیا ایسی دنیا مدح و ثنا کے لائق ہے؟ ایسی دنیا کی مذمت سے ہرگز خیال نہ کیجئے کہ مذمت کرنے والے مسلمانوں کو رہبانیت کی طرف لا رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ مسلمان دنیا کی جاذبیتوں سے نفرت کریں اور دنیا سے دور بھاگیں ان کا عقیدہ وہی ہے کہ "لا رھبانیۃ فی الاسلام" یعنی اسلام دنیا کو ترک کرنے کا حکم نہیں دیتا، دنیا کو مسخر کرنے کا حکم دیتا ہے۔ مگر حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ان کے سامنے یہ ہے کہ حضورؐ ملت کو مالا مال کر گئے اور اپنے لئے دعا مانگتے تھے کہ مجھے زندگی بھر مسکین رکھیو، موت مجھے حالت مسکینی میں آئے اور میرا حشر مسکینوں کے ساتھ ہو۔ اللّٰھم احینی مسکیناً و امتنی مسکیناً واحشرنی فی زمرۃ المساکین۔ اسی اسوۂ حسنہ کی خلفائے راشدین نے پیروی کی۔ خلفائے راشدین کے پیروی کرنے

[...]ے ظاہر ہے کہ یہ اسوۂ حسنہ پیروی کے واسطے ہے محض ریکارڈ کر لینے کے واسطے نہیں ہے۔

[...]ذرا یہ حدیث بھی ملاحظہ کر لیجئے جو مولانا محمد عاشق الٰہی صاحب بلند شہری کے ایک مضمون مندرجہ البلاغ میں چھپی ہے :-

[...]ان قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صنفان من اھل النار لم ارھما قوم معھم سیاط کاذناب البقر یضربون بھا الناس و نساء کاسیات عاریات ممیلات مائلات رؤسھن کاسنمۃ البخت المائلۃ لا یدخلن الجنۃ ولا یجدن ریحھا۔ یعنی فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ دوزخیوں کے دو گروہ ایسے ہیں جنہیں [م]یں نے نہیں دیکھا (کیونکہ ابھی اُن کا ظہور نہیں ہوا، وہ میرے بعد کبھی ظاہر ہونگے) ایک گروہ ان لوگوں کا، جن کے پاس اس قسم کے کوڑے [ہ]وں گے گویا بیل کی دُمیں ہیں۔ کوڑوں سے وہ (ظالم) ان لوگوں کو ماریں گے دوسرا گروہ اُن عورتوں کا جو لباس پہن کر بھی برہنہ ہوں گی وہ (شوہر نہیں غیر مردوں کو اپنی طرف) مائل کریں گی اور خود (غیر مردوں کی طرف) مائل رہیں گی (سر کے بال اس طرح پھلا کر گوندھیں گی) اُن کے پھلائے ہوئے سر بڑے بڑے اونٹوں کے کوہان جیسے معلوم دیں گے۔ اس گروہ کی عورتیں جنت میں گھسنے نہیں پائیں گی اور انہیں جنت کی ہوا تک نہیں لگے گی۔

غور کیجئے اور تمام ممالک اسلامیہ پر نظر دوڑائیے، کہیں یہ حدیث آج کل کی مسلمان عورتوں ہی کے متعلق تو نہیں!

۵
آزمودہ دواؤں کا مرکب
انالجین
سر درد ۔ کمر کا درد ۔ دانت کا درد
ایام ۔ انفلوئنزا اور ہر قسم کے دوسرے درد کے لئے
یقینی زود اثر اور بے ضرر علاج ہے
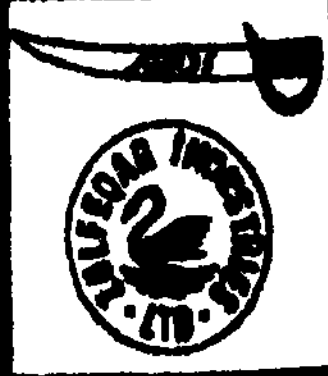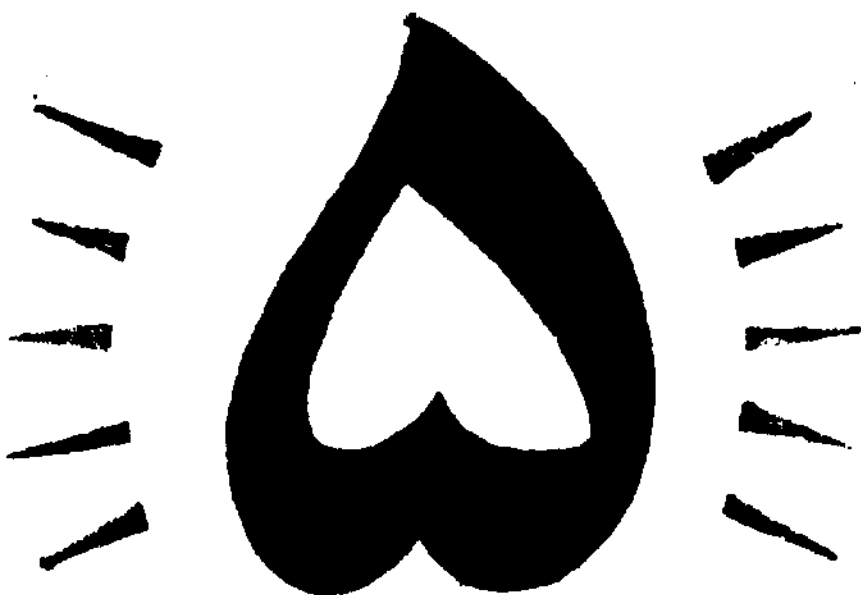
ماہر القادری

غریبوں کے والی غلاموں کے مولا

"فاران" کو نکلے ہوئے بیس برس ہو رہے ہیں، اس مدت میں سینکڑوں خطوط "مدیر فاران" اور "فاران" کی مدح و ستائش میں آئے ہیں ان مکتوب نگاروں میں بعض اونچے درجہ کی شخصیتیں بھی شامل ہیں، جن کے کرم نامے ہمیں علمی و ادبی یادگار کے طور پر محفوظ رکھنے چاہئے تھے۔ مگر دوسرے خطوں کے ساتھ یہ نامہ ہائے گرامی بھی ہم نے ضائع کر دیئے! مثلاً حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم کے کئی کئی صفحے کے خط اور سید عبدالرؤف شاہ مرحوم رکن کل پاکستان مجلس عاملہ پاکستان کے منظوم مکاتیب چاک کر دینے کے قابل نہ تھے۔ ہم ایسے شاعروں اور ادیبوں سے واقف ہیں جو اپنے بارے میں اخبار کا ایک ایک تراشہ اور ایک ایک فوٹو سینت سینت کر رکھتے ہیں۔

ایک صاحب راقم الحروف کے پاس "فوٹو گروپ" بنانے آئے۔ میں نے عرض کیا آپ کی اس نوازش کا شکریہ مگر یہ تو بتایئے کہ میرے پاس اس قسم کے کتنے فوٹو اور تصویریں ہونی چاہئیں، بولے سینکڑوں! اس پر میں نے کہا کہ میرے پاس ایک فوٹو بھی محفوظ نہیں رہا، آپ کا یہ فوٹو گروپ بھی ضائع ہو جائے گا، اس لئے اس کے حفاظت سے رکھنے کی دو ہی صورتیں ہیں کہ یا تو آپ کے پاس رہے یا آپ کسی ایسے شخص کو دے دیں جو اس قسم کی چیزوں کا قدر دان ہو!

یہ جو کچھ عرض کیا گیا ہے، اس کی غرض یہ نہیں ہے کہ ہم اس طرح اپنی بے نفسی کا اعلان کرنا چاہتے ہیں، ہر شاعر اور ادیب مشہور ہونے کا جذبہ اور داعیہ رکھتا ہے۔ اور ہم بھی اس جذبہ اور داعیہ سے بے نیاز نہیں ہیں' دل و نگاہ کی کتنی چوریاں اور نفس کے کیسے کیسے چھنارے ہیں جن سے ہم ابھی تک دامن نہیں چھڑا سکے!

ان تمام کمزوریوں کے باوجود اپنی تعریف سن کر یا پڑھ کر خدا جانتا ہے مسرت کے ساتھ ساتھ انفعالی کیفیت بھی پیدا ہوتی ہے، یہی جذبہ تقاضا ہے کہ "فاران" میں وہ خطوط شائع نہیں ہونے دیئے، جن میں راقم الحروف کی مدح و منقبت کی گئی تھی۔

اب سے کئی سال پہلے کی بات ہے بھساول (صوبہ بمبئی) میں کل ہند مشاعرہ تھا، جس کی صدارت مجھ سے متعلق تھی، مشاعرے کے منتظم صاحب نے شعراء کی فہرست مجھے پڑھنے کے لئے دی تو اس میں کئی شاعروں کے ناموں کے ساتھ "تلمیذ ماہر القادری" لکھا ہوا تھا۔ میں نے یہ الفاظ قلمزد کر دئے، اور تاکید کی کہ کسی شاعر کے نام کے ساتھ "تلمیذ ماہر القادری" نہ پکارا جائے، وہ صاحب کہنے لگے کہ بعض اساتذہ تو اصرار کر کے اپنے تلمذ کی نسبت لکھواتے ہیں، میں نے عرض کیا... مگر میں اسے پسند نہیں کرتا۔

چھ سات مہینے ہوئے ملیر (کراچی) میں راقم الحروف کے ساتھ ایک "شام" منائی گئی، اس تقریب کے منتظمین دعوت دینے کے لئے غریب خانہ پر تشریف لائے، تو میں نے عرض کیا کہ میری ایک شرط آپ حضرات مان لیں' وہ یہ کہ جب مجھ پر مضامین پڑھے جائیں گے، اس وقت میں جلسہ گاہ میں نہیں رہوں گا، ان مضامین کے بعد میں نعت پڑھوں گا بھی کروں گا اور جتنی دیر تک آپ چاہیں گے شعر بھی سناؤں گا لیکن

ان حضرات نے میری اس گزارش کو قبول نہیں کیا اور مجھ پہ گھنٹہ سوا گھنٹہ ایسا عالم گزرا جیسے میں گرم بھوبل پر بیٹھا ہوا ہوں۔

مگر

اب جو میں عرض کرنے والا ہوں اُس کی نوعیت "تحدیثِ نعمت" کی ہے، اور مجھ گنہگار کے لئے فخر و مسرت کی معراج!

گزشتہ سال حج سے دو ڈھائی مہینہ قبل پیر محمد اشرف صاحب ساہیوال (سابق منٹگمری) سے کراچی آئے اور محمد صادق صاحب کو ہمراہ لے کر غریب خانہ پر تشریف لائے، علیک سلیک اور مزاج پرسی کے بعد انہوں نے فرمایا ——— میں نے ایک خواب دیکھا ہے کہ ——— حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جلوہ فرما ہیں، حضور کے قریب مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ایستادہ ہیں اور اُن کے بعد آپ با ادب ہاتھ باندھے کھڑے ہیں اور حضور کی طرف سے مجھے ایسا اشارہ ہو رہا ہے کہ ان (ماہر) کے ذریعہ تمہارا حج کے لئے جانے کا انتظام ہو جائے گا۔

میں اس خواب کا حال سُن کر فرطِ مسرت سے بے قابو سا ہو گیا، میں نے پیر صاحب موصوف سے عرض کیا کہ حج کے لئے جا رہے کتنے ہی موانع پیش آئیں مگر آپ اس سعادت سے مشرف ہو کر رہیں گے! چنانچہ یہی ہوا کہ تمام موانع اور پابندیاں دھری رہ گئیں اور پیر صاحب آخری جہاز سے حجاز مقدس کے لئے روانہ ہو گئے!

پارسال اسی مہینہ میں اس گنہگار کو اس مقدس خواب کے سُننے کی سعادت حاصل ہوئی تھی، اب جناب ڈاکٹر غلام مصطفےٰ صاحب (پی، ایچ، ڈی) صدر شعبہ فارسی سندھ یونیورسٹی (حیدرآباد) کے نام جبل پور (بھارت) سے جو خط آیا ہے، وہ بلفظہٖ درج ذیل کرتا ہوں، ڈاکٹر صاحب موصوف کو اللہ تعالیٰ دارین میں جزائے خیر عطا فرمائے کہ انہوں نے یہ خط جو میرے لئے نجات کا پروانہ اور مغفرت کا وثیقہ ہے بھیجنے کی زحمت گوارا فرمائی ہے۔

"۱۴ ردسمبر

اخی گرامی السلام علیکم

بفضلہٖ خیریت ہے، جناب کا کارڈ موصول ہو کر باعثِ مسرت ہوا، حفیظ میاں کو حسب ہدایت مطلع کر دیا گیا، آپ بزرگوں سے فی الحقیقت تمام اعزا ملنے کے لئے جس قدر بے چین ہیں اس کا اظہار ناممکن ہے اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ جلد کوئی صورت پیدا کر دیں۔ آمین۔

۲ر دسمبر بروز پیر میں نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا ہے، وہ آپ کو تحریر کر رہا ہوں، اور چونکہ یہ ایک زبردست پیغام ہے لہٰذا اس کی تکمیل ازبس ضروری و لازمی ہے، لہٰذا آپ کے توسل سے یہ پیغام جناب حضرت ماہر القادری تک پہونچ جائے گا۔

روزہ کی حالت میں دوپہر کو قدرے آرام کرنے کے لئے لیٹ گیا اتفاق سے اس روز گھر میں بچوں کا شور و غل نہ تھا، نیند لگ گئی، تقریباً ۲ بجے دوپہر کا وقت تھا۔ میں نے یہ دیکھا کہ حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوں اور ایک بزرگ اور ہیں، جن کو میں پہچان نہ سکا، حضور پر نور نے ہماری جانب مخاطب ہو کر یہ دریافت فرمایا۔ "کہ کچھ دن سے ماہر القادری نظر نہیں آئے، ان سے کہہ دینا کہ کیا وہ ہمارے ساتھ حوضِ کوثر پر نہیں چلیں گے؟" بس یہ جملہ فرما کر مسجد میں اندر تشریف لے گئے۔ اور اس کے بعد ہی میں بیدار ہو گیا، قلب و دماغ کے جو تاثرات تھے اُس کا اظہار کس طرح کیا جاوے۔ اس سے قلم عاجز ہے۔

"پہلے تو مجھے یکایک یہ خیال ہوا کہ کہیں معدہ کی خرابی کی وجہ سے دن کو اس قسم کا خواب تو نہیں دیکھا" لیکن جب اچھی طرح اطمینان ہوگیا کہ معدہ میں ذرا سی بھی گرانی نہ تھی تو پھر یقین ہوگیا کہ خواب صحیح تھا آپ اس پر غور فرمالیں "

میں جس وقت [illegible] میں حیدرآباد میں تھا، انجمن ترقی اُردو کے دفتر میں جناب ماہرؔ القادری سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے بعد دو تین مرتبہ اور بھی ملاقات ہوئی، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ ایک صاحب کے یہاں کھانے کی دعوت میں شریک تھے اور کھانے کے بعد جناب ماہرؔ القادری نے اپنا مشہور "سلام" سنایا، چونکہ اس وقت عالم شباب میں تھے اور آواز بہت شیریں تھی اس لئے سامعین بہت مسرور ہوئے تھے۔ پھر اس کے بعد ۵۵ء میں کراچی آیا تھا تو میرے ناگپور کے عزیز جس فلیٹ میں تھے، اس کے بازو والے کمرے میں جناب ماہرؔ بھی تھے۔ میں خاص طور پر ملنے گیا لیکن اتفاق سے وہ مکان میں موجود نہ تھے۔ بہرحال میں ان سے خوب واقف ہوں، ہوسکتا ہے کہ وہ مجھے نہ پہچانیں، بہرحال میرا سلام اور یہ پیغام خصوصیت سے اُن تک پہونچا دیں، آپ کو ان کی رہائش گاہ کا پتہ ہوگا، جملہ احباب اور بچوں کو حسب مراتب دعا و سلام قبول ہو۔ کبھی کبھی یاد فرماتے رہیں اور دعاؤں میں خصوصاً۔

فقط ـــــ احقر اعجاز"

اللہ تعالیٰ کے فضل، حضور پُرنور کی توجہ اور اپنی قسمت پر جتنا فخر و ناز کروں کم ہے، یہ گنہگار تو اس کرم خاص کے ہرگز قابل نہ تھا مگر حضور رحمۃ للعالمین کی رحمت بے حد و بیکراں ہے، اس ابر کرم کے چھینٹے مجھ جیسے عاصی اور کمینہ غلام پر بھی پڑ گئے۔

قاصد رسید و نامہ رسید و خبر رسید
اے دل بگو ترا بکدامیں کنم نثار

وصال شیرازی نے شاید اس گنہگار کے جذبات و احوال اور خوش گمانی کی ترجمانی کی ہے۔

پیادگانِ رہِ عشق شہسوارانند
بہشتیند اگرچہ سیاہ کارانند

خدا کرے اس غلام بارگاہ کی ایسی حالت ہوجائے۔

ہر شام کہ می خوابم بریادِ تو می خوابم
ہر صبح کہ برخیزم از عشقِ تو برخیزم

اور

من جان و زندگی خود اے جان و زندگی
گر دوست داشتم ز برائے تو داشتم

ان مقدس بشارتوں کے طفیل ایسا محسوس ہونے لگا ہے۔

من اگرچہ خود گدایم دلِ بادشاہ دارم

حضورؐ رحمت اللعٰلمین ہیں، سراج منیر ہیں، بشیر و نذیر ہیں، مصطفےٰ و مجتبیٰ ہیں، شافع روز محشر اور ساقی کوثر، صاحب تاج زمین اور صاحب خیر کثیر ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم و امہاتنا و آبائنا الفداءہم) جس دل میں حضورؐ کی محبت نہیں، اس دل کو خدا کا اقرار بھی کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔

رسول مجتبیٰ کہئے، محمد مصطفےٰ کہئے

خدا کے بعد بس وہ ہیں پھر اس کے بعد کیا کہئے

اقبال سہیل مرحوم نے کیا خوب کہا ہے۔

محمد یعنی وہ حرفِ نخستین کلکِ فطرت کا

محمد یعنی وہ اعضائے توقیعات ربانی

وہ رابطِ عقل و مذہب کیا شیر و شکر جس نے

وہ فارق زہد سے جس نے مٹایا داغ رہبانی

خدا جانے ! خود اس سرکار کا کیا مرتبہ ہوگا

غلام بارگہ جس کے کہیں " ما اعظم شانی "

حضورؐ احمد و محمد ہیں کہ زمین و آسمان میں میرے آقا، و مولا کی مدح و ثنا کی جاتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہی عین دین اور اصل دین ہے۔

کسیکہ خاک درش نیست خاک برسر او

شاہراہِ مغفرت، منزلِ نجات، جادۂ سعادت، راہِ راست اور صراطِ مستقیم اسی کا نام ہے، جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم نظر آتے ہیں۔ حضورؐ خاتم النبیین ہیں، آپؐ کی ذات پر اللہ تعالیٰ نے دین کا اتمام فرما کر انبیاء و رسل کے سلسلہ بعثت کو ختم کر دیا، اب قیامت تک کسی قسم کا کوئی نیا نبی نہیں آئے گا، حضورؐ کے بعد کسی قسم کی بھی نبوت کا دعویٰ وہ ضلالت ہے جو کفر تک پہنچتی ہے، حضور ہی کی محبت و اطاعت کا یہ تقاضا ہے کہ ایک مسلمان کو دنیا میں سب سے زیادہ نفرت جھوٹے مدعیانِ نبوت سے ہونی چاہئے! جس دل میں کسی نبی کاذب اور مدعی نبوت کے لئے ذرا سا بھی نرم گوشہ پایا جاتا ہے اس دل کا ایمان و یقین نامعتبر ہے۔ ایک مسلمان حضورؐ کے بعد کسی نئے نبی کی بعثت کے بارے میں سوچ ہی نہیں سکتا :

عشق رسول مسلمان کی سب سے بڑی متاع اور طاقت ہے یہی طاقت و توانائی ملت کی زندگی اور بیداری اور حرکت کا باعث ہے :

تری ذات سے محبت، ترے حکم کی اطاعت

یہی زندگی کا مقصد، یہی اصل دین و ایماں

حضور صاحبِ خلق عظیم ہیں۔ سرکار کا اسوۂ حسنہ انسانیت کے لئے آخری معیار ہے۔ جس زندگی میں خلق رسولؐ کی جتنی جھلک پائی جاتی ہے وہ زندگی اتنی ہی کامیاب و بامراد اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک عزیز ہے! حضورؐ کی اطاعت ہی سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا حاصل ہوتی ہے ——— :

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس زندگی قرآن کی عملی تفسیر ہے (کما قال سیدتنا عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا — کان خلقہ القرآن) دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ حضورؐ "قرآن ناطق" تھے۔ جو کم بخت اور جاہل یہ کہتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت "حضورؐ کی زندگی کے بعد ختم ہو گئی" وہ دراصل کفر بکتا ہے، حضورؐ کی اطاعت قیامت تک منصوص ہے، حضورؐ کی اطاعت کا منصب کسی حاکم، بادشاہ، امام، شیخ و مرشد اور مرکز ملت کو نہیں دیا جا سکتا۔ حضورؐ کی اطاعت سے روگردانی اور سنت کے دین میں حجت ہونے کا انکار، کافرانہ روش ہے، حضورؐ کی ذات گرامی کو دین سے خارج کر دینے کے بعد دین میں باقی ہی کیا رہ جاتا ہے۔

> بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
> اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی تمام کمالات و صفات کی جامع ہے۔

> آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

حضورؐ سے بے نیاز ہو کر خدا رسی کا تصور اور بخشش و نجات کی اُمید خام خیالی اور غلط اندیشی ہے، قیامت میں جب تمام انبیاء کرام اور اولیاء عظام "نفسی نفسی" کہتے ہوں گے اور بڑے سے بڑے مقرب بارگاہ خداوندی کو اپنی جان کی پڑی ہوگی، حضورؐ کو شفاعت کا اذن دیا جائیگا اللہ تعالیٰ شفیع المذنبین کی سفارش پر اتنے گنہگاروں کی مغفرت فرمائے گا یہاں تک کہ آپ راضی ہو جائیں۔ اس دن لواء الحمد سرکار ہی کے مقدس ہاتھ میں ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا آپ ہی بیان کریں گے، مقام محمود کی یہ ذرا سی جھلک ہے:

حضورؐ صاحب جوامع الکلم ہیں، نطق مبارک سے حق کے سوا اور کوئی بات ہی نہیں نکلی، فصاحت و بلاغت اور معانی و بیان تو حضورؐ کے [illegible] لیتے تھے، شجاعت کا وہ عالم کہ اشجع الناس فاتح خیبر حضرت سیدنا مولا علی کرم اللہ وجہہٗ کا بیان ہے کہ جب گھمسان کا [illegible] حضورؐ کے دامن میں پناہ لیتے تھے، سخاوت کی یہ کیفیت کہ ایک سائل نے سوال کیا، اُس وقت حضورؐ کے پاس دینے کو کچھ نہ تھا [illegible] یا کہ تم کسی سے میرے نام پہ قرض لے لینا (یعنی اُس قرض کی ادائیگی کا ذمہ دار میں ہوں) حاتم بے چارہ جس کی سخاوت کی [illegible] سخاوت کے اس عنوان اور داد و دہش کی اس نزاکت کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اس تمام صفات و کمالات اور عظمت و جلالت کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی ایسا حرف زبان سے نہیں [illegible] جس سے "توحید" ذرہ برابر مشتبہ ہوتی ہو، ہر لمحہ "عبد شکور" کا عالم، اسی کی تعلیم کہ جو کچھ مانگنا ہے خدا سے مانگو، میں نہ تو عالم الغیب ہوں اور نہ خدا کے دیئے ہوئے خزانے میرے پاس ہیں، ہر اُس اختیار کی نفی جس کا تعلق الوہیت سے ہے، خشیت الٰہی کی وہ کیفیت کہ تیز ہوائیں چلتیں تو چہرہ مبارک کا رنگ متغیر ہو جاتا، اللہ تعالیٰ کے حضور جتنا نیاز عبدیت اور خضوع و خشوع حضورؐ نے پیش کیا ہے، دنیا میں اور کسی نے نہیں کیا، حضورؐ کی ذات بشریت اور عبدیت کی معراج اور انسانیت و عبدیت کا منتہائے کمال ہے۔

> غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم
> کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمد است

سید محمد عبدالرشید فاضل
(ایم۔اے)

مقدمہ شرح بالِ جبریل

(یہ گرانقدر کتاب عنقریب چھپ کر منظرِ عام پہ آرہی ہے)

بالِ جبریل کی متعدد شروح ہو چکی ہیں۔ چنانچہ تین شرحوں کے دیکھنے کا مجھے بھی اتفاق ہوا ہے۔ ایک بہت ضخیم ہے جس میں دینی، اخلاقی، علمی، ادبی، تاریخی بلکہ اور بھی ہر قسم کا مواد تو خوب جمع کیا ہے: جس میں سے بعض اجزاء کار آمد بھی ہیں، مگر اشعار کی شرح بہت کم ہے۔ دوسری بھی کسی قدر مفصل ہے مگر پہلی شرح جیسے معلوماتی مواد سے خالی ہے نیز اشعار کی شرح اس میں بھی کم ہے اور جو ہے اُس میں بھی غیر ضروری طوالت کے ساتھ جو مطلب لکھا ہے وہ ایک عام طالب علم کے لئے بالکل ناکافی ہے۔ تیسری شرح بہت مختصر ہے، بعض جگہ تو ایسی مختصر جیسے ایک زبان کے الفاظ کا دوسری زبان میں ترجمہ کر دیا جاتا ہے مطلب سے کوئی بحث نہیں ہوتی۔

ان شرحوں کو دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی۔ یہ نہ ایک عام ناظر کے لئے مفید ہیں نہ ایک طالب علم کے لئے۔ بلکہ پہلی ضخیم شرح سے تو یہ بھی عجیب و غریب انکشاف ہوا کہ بالِ جبریل میں شروع سے آخر تک تصوف ہی کے معانی و مطالب کو مختلف پیرایوں میں بیان کیا گیا ہے اور تصوف بھی وہ تصوف جس پر اقبال نے سخت تنقید کی ہے۔ غرضکہ یہ شرحیں اگر پچیس۲۵ فی صد کام کی ہیں تو پچھتر فیصد بے کار بلکہ اقبال کی شہرت پر حرف لانے اور غلط فہمی پیدا کرنے والی:

بہرحال یہ ہیں وہ اسباب جو میرے لئے بالِ جبریل کی شرح لکھنے کا باعث ہوئے کہ اس سے ایک ضرورت کی تکمیل بھی پیشِ نظر تھی اور مذکورہ بالا شروح نے جو نقصان یا غلط فہمیاں پھیل رہی ہیں اُن کا سدِ باب بھی مطلوب تھا۔ ضرورت کی تکمیل سے میری مراد یہ ہے۔ چونکہ اقبال نے بڑی عمدگی کے ساتھ اس کتاب میں اپنے اُن تمام افکار کو ایک حد تک جمع کر دیا ہے جو ان کی مختلف فارسی تصانیف میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس لئے اگر اس کتاب کی شرح ڈھنگ سے ہو گی تو جو لوگ فارسی زبان سے ناآشنا ہیں وہ اس شرح سے بیک وقت اُن افکار سے بھی کسی حد تک استفادہ کر سکیں گے جو فارسی میں بیان ہوئے ہیں۔

خیام لندن کے زمانے میں ایک معمولی سے واقعہ سے متاثر ہو کر اقبال نے اُردو کے بجائے فارسی کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنا لیا تھا۔ چنانچہ ایک مدت تک ان کا اردو کلام کسی اخبار یا رسالے میں نظر نہیں آیا تو شیدایانِ اردو میں بے چینی پیدا ہو گئی کیونکہ اس سے اُنہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ شاید اب اقبال نے اُردو میں شعر کہنا بالکل ترک کر دیا ہے۔ جیسا کہ مولوی عبدالسلام مرحوم فرماتے ہیں۔

"اس کے بعد اُن کی توجہ زیادہ تر فارسی شاعری پہ مبذول رہی اور اب وہ فارسی شاعری میں اس قدر منہمک

> ہو گئے کہ اُن کے احباب کو خطرہ پیدا ہوا کہ مبادا اُردو اُن کے فیض سے بالکل محروم ہو جائے اس لئے شیخ عبدالقادر نے مقدمہ بانگِ درا میں ڈاکٹر صاحب سے یہ درخواست کی کہ "وہ پھر کچھ عرصہ کے لئے گیسوئے اُردو کے سنوارنے کی طرف متوجہ ہوں اور ہمیں موقع دیں کہ ہم اس مجموعۂ اُردو کو جو اس قدر دیر کے بعد چھپا ہے ایک دوسرے کلیاتِ اُردو کا پیش خیمہ سمجھیں" (اقبال کامل)

یہی وجہ ہے کہ جب بالِ جبریل منظرِ عام پر آئی تو اس کا نہایت پُرجوش خیر مقدم کیا گیا اور دلدادگانِ اردو کے حلقوں میں اس سرے سے اُس سرے تک مسرت کی لہر دوڑ گئی اور ایسا ہونا لازمی امر تھا۔ کہ ایک مدت کے بعد ان کو اقبال کا اردو کلام ملا تھا اور پھر وہ بھی ایسا نادر، پاکیزہ اور بلند کلام کہ اپنی مثال آپ !

بالِ جبریل جنوری ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی اس کے پہلے حصے میں زبورِ عجم کے طرز کی کچھ غزلیں اور پیامِ مشرق کے طرز کی کچھ رباعیاں یا قطعات ہیں اس لئے اس حصے کو زبورِ عجم کا جواب سمجھنا چاہئے کہ اس میں تقریباً وہی باتیں جو فارسی میں کہی تھیں اردو میں کہی گئی ہیں اور ان میں وہ تمام خصوصیات یعنی جوشِ بیان، بلندیٔ خیال اور متانت و پختگی موجود ہیں جو زبورِ عجم میں پائی جاتی ہیں۔ دوسرے حصے میں مختلف موضوعات پر نظمیں ہیں۔ کچھ نظمیں اندلس کی مشہور عمارات و مقامات پر ہیں۔ اقبال نے دوسری گول میز کانفرنس کی شرکت کے بعد اسپین کی سیر کی تھی اور ان عمارات و مقامات کا ذاتی طور پر مشاہدہ کیا تھا۔ یہ نظمیں انہی تاثرات کا نتیجہ ہیں۔

بقول ایک نقاد کے "یہ کتاب اقبال کے ارتقاءِ تخیل کی چوتھی منزل کو پیش کرتی ہے" مگر ہمارے خیال میں ان کی اردو شاعری کے اعتبار سے اس کتاب کو ان کے فکری ارتقاء کی آخری منزل کہنا زیادہ مناسب ہوگا اس لئے کہ اس کے بعد ان کی دو کتابیں ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز اردو حصہ اشاعت پذیر ہوئیں مگر ضربِ کلیم میں فلسفیت زیادہ اور شعریت کم ہے اور رفعتِ تخیل میں اس کو بالِ جبریل سے کوئی نسبت نہیں اسی طرح ارمغانِ حجاز میں جذبات کی فراوانی فروتر ہے مگر رفعتِ تخیل میں یہ بھی بالِ جبریل کو نہیں پہونچتی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس انداز کا بلند، لطیف اور پاکیزہ کلام اس سے پہلے اردو زبان میں موجود نہ تھا۔ تمام کتاب دینی اور اخلاقی تعلیمات سے بھری ہوئی ہے۔ نوجوانوں کو دماغ روشن بننے کے بجائے شاہین بننے، سستی، کاہلی، تن آسانی اور آرام طلبی سے اجتناب اور کوشش اور محنت کو شعار بنانے اور طلسمِ مغرب میں گرفتار نہ ہونے کی ہدایت ہے تو رہنمایانِ قوم کو خود غرضی، خودنمائی ترک کرنے اور خلوص و دلسوزی کے ساتھ باہمی اختلافات ختم کرکے ایک متفقہ ملی نصب العین کے حصول کے لئے قوم کی صحیح خطوط پر رہنمائی کرنے کی تلقین ہے۔ اہلِ جاہ و ثروت کو منصب و دولت سے محبت کرنے کے بجائے دینی و اخلاقی اقدار سے محبت کرنے کی نصیحت ہے تو عام مسلمانوں کو صحیح معنی میں مردِ مومن بننے اور عرفانِ خودی کے ذریعہ اپنے کھوئے ہوئے مقام کو پھر سے حاصل کرنے کی تعلیم ہے، پھر یہ نصائح اس خشک طریقہ پر نہیں کی ہیں جو ہمارے واعظوں کا عام انداز ہے۔ بلکہ ان کی شیریں گفتار نے اخلاقی موضوعات کو ایسے لطیف اور دلکش انداز میں پیش کیا ہے کہ سامع کے دل کو اُن کے سننے سے سیری نہیں ہوتی اور بلاغتِ کلام کا یہ حال ہے کہ علم و حکمت کے وہ جواہر جو گنجینۂ دل و دماغ میں محفوظ تھے۔ ایسے عام فہم اور دلنشین انداز میں بیان ہوئے ہیں کہ شربت کے گھونٹ کی طرح دل میں اترتے چلے جاتے ہیں اور پھر ایک ایک لفظ حقائق و معانی کی ایک دنیا اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اقبال کے پختہ اور منظم خیالات زیادہ تر ان کی فارسی تصانیف میں ملتے ہیں مگر جیسا کہ ہم اس سے پہلے عرض کر چکے ہیں، بالِ جبریل میں بھی بیشتر وہی خیالات اُسی جزالت و متانت کے ساتھ بیان ہوئے ہیں جو ان کی فارسی تصانیف کی خصوصیت ہے۔ اس لئے کہنا چاہئے کہ اس اعتبار سے بھی اس کتاب میں ان کی اردو شاعری انتہائی بلند مقام پر پہونچ گئی ہے اور ساتھ ہی ان کی فکر نے فلسفہ و منطق کے بجائے شعر کی زبان اختیار کر لی ہے۔

اقبال کے نزدیک وہ شاعری جس سے انسان کی خودی باقی نہ رہے قوم کے حق میں سمِّ قاتل کا حکم رکھتی ہے اس لئے ان کی شاعری کا مقصد

قوم کی خفتہ و مردہ قوتوں کو زندہ کرکے سرگرم عمل بناتا ہے۔ وہ جمود اور بے عملی کو موت سے تعبیر کرتے ہیں۔ بلکہ اُن کے نزدیک تو ورود بھی ایک حالت پر قائم رہنا زندگی کے فقدان کا پتہ دیتا ہے ؎

اگر امروز تو تصویرِ دوش است | بخاکِ تو شرارِ زندگی نیست

ان کے نزدیک آدم کی فضیلت بھی اسی میں ہے کہ روز نئے نئے جہان پیدا کرے۔ ستاروں کے موجودہ نظام سے وہ اس لئے ناخوش ہیں کہ یہ ہزاروں برس سے ایک ہی لگے بندھے آئین پر چل رہا ہے ؎

پرانے ہیں یہ ستارے فلک بھی فرسودہ | جہاں وہ چاہیئے مجھ کو کہ ہو ابھی نوخیز!

مگر یہ بات انسان کو اُس وقت حاصل ہوتی ہے کہ جب وہ اپنی ذات کی معرفت حاصل کرنے کے بعد اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا ہے۔ جب تک انسان اپنے آپ کو نہیں پہچانتا جذبۂ عمل سے محروم رہتا ہے اور اس کی زندگی کاہلی، بے عملی اور بے حسی کی نذر ہو کر رہ جاتی ہے۔ اور ایسا شخص آرام و آسائش کے حصول ہی کو مقصدِ زندگی سمجھ لیتا ہے۔ حالانکہ آرام پسندی انسان کی ترقی کے راستے کا وہ سنگِ گراں ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے وہ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا ؎

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر | یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

غرض اس کتاب میں خود شناسی کی طرف متوجہ کرنے کے لئے اس موضوع پر اس قدر ملتی ہے کہ اس کے کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا ہے۔ اور ہر پہلو کو نادر اسلوب میں بیان کیا ہے۔ ایسے نادر اسلوب میں کہ اس پر مزید اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً ؎

خودی سے اس طلسمِ رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں | یہی توحید تھی جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا

عجب مزا ہے مجھے لذتِ خودی دے کر | وہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے آپ میں نہ رہوں!

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں | تو آبجو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبح گاہی | کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی

تری زندگی اسی سے تری آبرو اسی سے | جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی

نہ ہے ستارے کی گردش نہ بازیٔ افلاک | خودی کی موت ہے تیرا زوالِ نعمت و جاہ

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے | خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے؟

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی | خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش | خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

حکیمی، نامسلمانی خودی کی — کلیمی، رمزِ پنہانی خودی کی
تجھے گُر فقر و شاہی کا بتا دوں — غریبی میں نگہبانی خودی کی

یہ موجِ نفس کیا ہے؟ تلوار ہے — خودی کیا ہے؟ تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے؟ رازِ درونِ حیات — خودی کیا ہے؟ بیداریِ کائنات
سبک اس کے ہاتھوں میں سنگِ گراں — پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگِ رواں
سفر اس کا انجام و آغاز ہے — یہی اس کی تقویم کا راز ہے
خودی کے نگہباں کو ہے زہرِ ناب — وہ ناں جس سے جاتی رہے اس کی آب
وہی ناں ہے اس کے لئے ارجمند — رہے جس سے دنیا میں گردن بلند
خودی شیرِ مولا جہاں اس کا صید — زمیں اس کی صید آسماں اس کا صید

نیز اس فلسفے کے جتنے اجزا ہیں وہ سب بھی اس کتاب میں موجود ہیں۔ مثلاً فضیلتِ آدم جو اس فلسفہ کا ایک اہم جزو ہے اس ک میں اس پر بڑے موثر اشعار ملتے ہیں۔ مثلاً ؎

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں — کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن — زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا؟

ایک پوری غزل میں اس جہانِ آب و گِل سے خطاب کیا ہے اور اس کے مقابلے میں فضیلتِ آدم ثابت کی ہے ؎

عالمِ آب و خاک و باد! سرِّ عیاں ہے تو کہ میں؟ — وہ جو نظر سے ہے نہاں اس کا جہاں ہے تو کہ میں؟
وہ شبِ درد و سوز و غم کہتے ہیں زندگی جسے — اس کی سحر ہے تو کہ میں؟ اس کی اذاں ہے تو کہ میں؟
کس کی نمود کے لئے شام و سحر ہیں گرمِ سیر — شانۂ روزگار پر بارِ گراں ہے تو کہ میں؟

دوسرا جزو عشق و عقل کی پیکار ہے۔ چنانچہ اس موضوع پر بھی اس کتاب میں بہت کچھ لکھا ہے اور ہر جگہ ایک ادبی اسلوب کے ساتھ۔ مگر لفظِ عشق کو اقبال نے بڑے وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے۔ عشق ان کے ہاں مجاز و حقیقت دونوں کا ترجمان اور خودی کو مستحکم کرنے کا ذریعہ ہے۔ عشق سے ان کی مراد وہ جوش و وجدان ہے جو کسی اعلیٰ درجے کے مقصد کے حصول کے لئے دل کی گہرائیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ جس کی بدولت انسان تکمیلِ ذات کے لئے جذبِ تسخیر سے عمل پیرا ہوتا اور ہر قسم کے موانع پر قابو پاتے ہوئے لامتناہی طور پر ارتقا کی منزلیں طے کرنے کا متمنی رہتا ہے۔ اسی کے ذریعہ انسان زمان و مکاں کی قید سے نکل کر حقیقی آزادی سے ہم کنار ہوتا ہے۔ اسی سے اس کے اندر تولیدِ آرزو ہوتی ہے جو قوائے عمل کو سرگرم رکھتی ہے ورنہ بغیر آرزو کے انسان عمل کی طرف ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔ عشق ہی سے انسان کے اندر پاکیزہ جذبات پیدا ہوتے ہیں جو مکارمِ اخلاق کی طرف راغب اور رذائل سے مجتنب رکھتے ہیں۔ غرضکہ اقبال کا تصورِ عشق دوسرے شعرا کے تصورِ عشق سے بالکل مختلف ہے۔ ان کے یہاں عشق سراپا عمل، حرکت بلکہ زندگی ہے۔ جس کی بدولت انسان کی نظر اتنی بلند ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی ہمتِ مردانہ کے آگے جبریل کو بھی "صید زبوں" سمجھنے لگتا ہے اور یزداں پر کمند ڈالنے کی کوشش کرتا ہے ؎

ع در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ !

اقبال عشق کو عقل پر ترجیح دیتے ہیں اس لئے کہ اس کے ذریعہ حقیقتِ اشیا کا علم حاصل ہوتا بلکہ انسان کی بصیرت پر مابعد الطبیعی حقائق یاں ہوجاتا ہے اسی کی وجہ سے دنیا میں چہل پہل اور ہماہمی نظر آتی ہے ورنہ اگر دل بھی عقل کی طرح فرزانہ ہوتا تو جینے کا سارا لطف جاتا رہتا ع

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوزِ دم بدم :
آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحرگاہی کا نم

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزومندی مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی !

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

کھول کے کیا بیاں کروں سرِ مقامِ مرگ و عشق عشق ہے مرگِ باشرف مرگِ حیاتِ بے شرف !

نہ ہو طغیانِ مشتاقی تو میں رہتا نہیں باقی کہ میری زندگی کیا ہے ؟ یہی طغیانِ مشتاقی !

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام
عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفےٰ عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام
عشق فقیہِ حرم، عشق امیرِ جنود عشق ہے ابن السبیل، اس کے ہزاروں مقام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات عشق سے نارِ حیات

لیکن یہ خیال غلط ہے کہ وہ عقل کو بالکل بیکار اور ہر حال میں اس کی مخالفت ضروری سمجھتے ہیں۔ اول تو وہ مطلق عقل کے مخالف نہیں بلکہ غل کے مخالف ہیں جس کا دوسرا نام گریز پائی ہے اور جس کا سلسلہ شیطان کی زیرکی سے ملتا ہے۔ جو ہر چیز کو استدلال کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھتی ہے، پہ فرماتے ہیں ع

اک دانشِ نورانی، اک دانشِ برہانی ہے دانشِ برہانی حیرت کی فراوانی

دوسرے ان کا خیال ہے کہ عقل کی ایک حد ہے اگر وہ اپنی حد میں رہ کر کام کرے تو اس سے یقیناً اچھے نتائج نکلیں گے۔ مگر جب وہ اپنی حد سے کرتی ہے تو ناقابلِ تلافی نقصان کا موجب بنتی ہے اگر اپنی حد میں رہتے ہوئے عشق کے رفیقِ کار کی حیثیت سے کام کرے تو وہ انسان کی بہترین خادم

ثابت ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں انسان کی صلاحیتیں بروئے کار آتی ہیں جن سے وہ فطرت کی تسخیر بھی کرتا ہے اور عجیب و غریب مگر مفید ایجادات کرکے نوعِ انسانی کے لئے فلاح و سعادت کے سامان بھی فراہم کرتا ہے۔

اقبال فرماتے ہیں کہ جب عقل اس مادّی دنیا کے معاملات کو درست کرنے کے بجائے حقائق مابعد الطبیعی کے متعلق حکم لگانے لگتی ہے تو انسانی سوسائٹی کے لئے فساد کے اسباب پیدا کرتی ہے کیونکہ یہ کام عشق اور محض عشق کا ہے عقل کا نہیں ہے۔ وہ شکایت کرتے ہیں کہ زمانہ عقل ہی کو رہنما سمجھ بیٹھا ہے اور عشق کو بے کار۔ بلکہ دیوانگی سے تعبیر کرتا ہے۔ حالانکہ جو قوت اور بصیرت عشق کو حاصل ہے عقل اس کی گرد کو بھی نہیں پہونچ سکتی ؎

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعلِ راہ　　　کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحبِ ادراک

ایک مستقل نظم "عقل و دل" کے عنوان سے لکھی ہے اور اس میں دونوں نے مناظرانہ انداز میں اپنی اپنی فضیلت کی وجوہ بیان کی ہیں ؎

عقل نے ایک دن یہ دل سے کہا　　　بھولے بھٹکے کی رہنما ہوں میں
ہوں زمیں پر، گذر فلک پہ مرا　　　دیکھ تو کس قدر رسا ہوں میں
کام دنیا میں رہبری ہے مرا　　　مثلِ خضرِ خجستہ پا ہوں میں
ہوں مفسّر کتابِ ہستی کی　　　مظہرِ شانِ کبریا ہوں میں
بوند اک خون کی ہے تو لیکن　　　غیرتِ لعلِ بے بہا ہوں میں
دل نے سن کر کہا یہ سب سچ ہے　　　پر مجھے بھی تو دیکھ کیا ہوں میں
رازِ ہستی کو تو سمجھتی ہے　　　اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں
ہے تجھے واسطہ مظاہر سے　　　اور باطن سے آشنا ہوں میں
علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے　　　تو خدا جُو، خدا نما ہوں میں
علم کی انتہا ہے بے تابی　　　اس مرض کی مگر دوا ہوں میں
شمع تو محفلِ صداقت کی　　　حسن کی بزم کا دیا ہوں میں
کس بلندی پہ ہے مقام مرا　　　عرشِ ربِّ جلیل کا ہوں میں

اس نظم میں عشق کے بجائے دل کو لاتے ہیں جو مصدرِ عشق ہے۔

فلسفۂ خودی کا تیسرا جزو خیر و شر کا امتزاج یا خیر و شر کی جنگ ہے اور اس کی بھی بہت سی نمایاں نہ سہی مگر بہرحال اس کتاب میں جابجا مثالیں ملتی ہیں۔ ایک نظم لکھی ہے جس کا عنوان ہے "جبریل و ابلیس" اس میں جبریل و ابلیس کا مکالمہ نظم کیا ہے۔ ہم اس مکالمے کو ذیل میں درج کرتے ہیں ؎

جبریل

ہمدمِ دیرینہ! کیسا ہے جہانِ رنگ و بو؟

ابلیس

سوز و ساز و درد و داغ و جستجو ئے آرزو!

جبریل

ہر گھڑی افلاک پہ رہتی ہے تیری گفتگو
کیا نہیں ممکن کہ تیرا [illegible]

ابلیس

آہ اے جبریل! تو واقف نہیں اس راز سے　　　کر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سبو!

اب یہاں میری گزر ممکن نہیں ممکن نہیں　　　کس قدر خاموش ہے یہ عالمِ بے کاخ و کو!

جس کی نومیدی سے ہو سوزِ درونِ کائنات　　　اس کے حق میں تقنطوا اچھا ہے یا لاتقنطوا؟

جبریل

کھو دیے انکار سے تو نے مقاماتِ بلند　　　چشمِ یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو!

ابلیس

ہے مری جرأت سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو　　　میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پو!

دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزمِ خیر و شر　　　کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے میں کہ تو؟

خضر بھی بے دست و پا، الیاس بھی بے دست و پا　　　میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جو بہ جو!

گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے　　　قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو!

میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح!　　　تو فقط اللہ ھو، اللہ ھو، اللہ ھو!

فلسفۂ خودی کا جو تقاضا جزو بقائے دوام اور حیاتِ جاوداں ہے۔ اسکو بھی اقبال نے بڑے دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

یہ نکتہ میں نے سیکھا بوالحسن سے　　　کہ جاں مرتی نہیں مرگِ بدن سے

چمک سورج میں کیا باقی رہے گی　　　اگر بیزار ہو اپنی کرن سے

ہر نقش اگر باطل تکرار سے کیا حاصل　　　کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ ارزانی؟

اک تو ہے کہ حق ہے اس جہاں میں　　　باقی ہے نمودِ سیمیائی!

تو زندگی ہے، پائندگی ہے　　　باقی ہے جو کچھ سب خاکبازی

خودی کے ساز میں ہے عمرِ جاوداں کا سراغ　　　خودی کے سوز سے روشن ہیں اُمتوں کے چراغ

اقبال نے مختلف موقعوں پر جو اس بات کا اظہار کیا ہے کہ ان کو شاعر نہیں سمجھنا چاہئے تو اس سے اُن کا منشا یہ ہے کہ انہوں نے شاعری بطور فن کی حیثیت سے اختیار کیا ہے نہ پیشہ بنایا ہے اور نہ ان کی شاعری "ادب برائے ادب" کے بے جان نظریے کا مصداق ہے بلکہ قدرت نے جو موزوں طبع عطا فرمائی تھی اور ساتھ ہی دردآشنا دل بھی دیا تھا تو ان کی شاعری کو ان دونوں کا قدرتی نتیجہ سمجھنا چاہئے۔ یعنی قوم کی تباہی اور زبوں حالی پر اُن کا دل دکھا ہے تو بے ساختہ یہ پُرسوز نالے نکل گئے ہیں بالکل اسی طرح جیسے ساز کے تاروں پر مضراب کے لگنے سے نغمے نکلنے شروع ہو جاتے ہیں وہ ان پُرسوز نالوں سے اپنی خوابِ غفلت میں سوئی ہوئی قوم کو بیدار کرکے منزل کی طرف گامزن کرنا چاہتے ہیں۔ شاعری ان کے لئے مقصود بالذات نہیں ہے۔ پھر انہوں نے دینی و اخلاقی اقدار ہی کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے اس لئے کہ وہ ایک ایسا اعلیٰ درجہ کا

پاکیزہ معاشرہ وجود میں لانا چاہتے ہیں جس کو ان کی چشمِ بصیرت نے قرآن کے اوراق میں دیکھا ہے مگر عالمِ مشہود میں اس کا کہیں نشان نہ پایا۔ چنانچہ اس معاشرے کو اپنے تصور کے آئینے میں دیکھ کر کبھی کبھی فرطِ مسرت سے پکار اُٹھتے ہیں ؎

مرے خاک و خوں سے تو نے یہ جہاں کیا ہے پیدا   صلۂ شہید کیا ہے؟ تب و تابِ جاودانہ!

مری یہ بات کہ اُن کے ہاں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک اعلیٰ درجے کے شاعر کے کلام میں پائی جاتی ہیں اور جن کو مختصراً ہم بالِ جبریل کی بعض اہم خصوصیات کے عنوان سے اس کتاب کے آخر میں لکھ رہے ہیں۔ اس کو موہبتِ کبریٰ سمجھنا چاہئے ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَاءُ۔ اردو شاعری کی تاریخ میں بھی ایسی مثالیں، شاذ و نادر سہی، بہرحال ملتی ہیں۔ مولانا روم نے بھی یہ فرمایا تھا کہ من ندانم فاعلاتن فاعلات۔ مگر اس کے باوجود ان کے کلام میں شعر کی وہ کون سی خوبی ہے جو موجود نہیں۔ غرضیکہ بالِ جبریل شاعری کے اعتبار سے بھی ایک اعلیٰ درجہ کا شاہکار ہے۔ کچھ لوگ زبان اور فن کے اعتبار سے اقبال کی شاعری کے قائل نہ تھے۔ انہوں نے بھی جب بالِ جبریل کو دیکھا تو اپنے سابقہ خیالات سے رجوع کر کے اقبال کو خراجِ تحسین ادا کرنے پر مجبور ہو گئے۔ بالِ جبریل کی بعض اہم خصوصیات :۔

۱۔ طنز نگاری کی بہترین مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً ؎

مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی   اس دور کے مُلا ہیں کیوں ننگِ مسلمانی!

مرے لئے تو ہے اقرار باللساں بھی بہت   ہزار شکر کہ مُلا ہیں صاحبِ تصدیق

نہ خود بیں نے خدا بیں نے جہاں بیں   یہی شہکار ہے تیرے ہنر کا!

۲۔ رمز و ایما سے بھی جا بجا کام لیا ہے۔ اور اُن کے رمز و ایما میں لطافت کے ساتھ دلسوزی کا بھی بڑا دلکش امتزاج پایا جاتا ہے۔ مثلاً ؎

متاعِ دین و دانش لُٹ گئی اللہ والوں کی   یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خونریز ہے ساقی!

مجھے آہ و فغانِ نیم شب کا پھر پیام آیا   تھم اے رہرو کہ شاید پھر کوئی مشکل مقام آیا

اس پیکرِ خاکی میں اک شے ہے سو وہ تیری   میرے لئے مشکل ہے اُس شے کی نگہبانی

۳۔ اس کتاب کے اکثر اشعار سے اُن کے اُس والہانہ تعلق خاطر کا پتہ چلتا ہے جو ان کو قوم کے ساتھ تھا اور یہ اشعار ایسے گہرے اور شدید جذبات کے حامل ہیں کہ دلوں میں تیر و نشتر کی طرح اُترتے چلے جاتے ہیں۔ مثلاً ؎

نغمۂ نوبہار اگر میرے نصیب میں نہیں   اس دمِ نیم سوز کو طائرکِ بہار کر

وہی میری کم نصیبی، وہی تیری بے نیازی   مرے کام کچھ نہ آیا یہ کمالِ نے نوازی

ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر!　　زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر!

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے　　مرا عشق میری نظر بخش دے

مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں!　　مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں!

مرے نالۂ نیم شب کا نیاز!　　مری خلوت و انجمن کا گداز!

امنگیں مری آرزوئیں مری　　امیدیں مری جستجوئیں مری!

مری فطرت آئینۂ روزگار!　　غزالانِ افکار کا مرغزار!

مرا دل مری رزمگاہِ حیات؛　　گمانوں کے لشکر یقیں کا ثبات!

یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر!　　اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر!

مرے قافلے میں لٹا دے اسے!

لٹا دے! ٹھکانے لگا دے اسے!

۴۔ بالِ جبریل میں اقبال نے جو اسلوبِ بیان اختیار کیا ہے وہ نہایت شگفتہ بھی ہے اور دلکش بھی اور سب سے الگ بھی۔ مثلاً ؎

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا؟　　مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا؟

عشق کی تیغِ جگر دار اڑا لی کس نے　　علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی!

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا　　یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی!

۵۔ بالِ جبریل میں جدید و قدیم شاعری کا بہترین امتزاج بھی پایا جاتا ہے۔ اس میں تغزل اور تصوف بھی ہے اور فلسفیانہ اور سیاسی خیالات بھی ہیں۔

۶۔ اس کتاب میں اقبال نے زندگی کے بعض اہم مسائل کو پیرِ رومی کے اشعار کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کی ہے اور ساتھ ہی بڑی عقیدتمندی کے ساتھ رومی کی عظمت کا بیان بھی کیا ہے اور ان کی تعلیمات سے استفادہ کرنے کی تلقین بھی کی ہے۔ مثلاً ؎

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے　　وہی آب و گلِ ایراں وہی تبریز ہے ساقی!

علاج آتشِ رومی کے سوز میں ہے ترا　　تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں!

صحبتِ پیرِ روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش　　لاکھ حکیم سر بجیب، ایک کلیم سربکف!

۷۔ سیاسی موضوعات پر بھی اس کتاب میں بعض عمدہ نظمیں ملتی ہیں۔ مثلاً نظم "فرمانِ خدا" "لینن" وغیرہ اور اس مجموعے کی سب سے زیادہ پُرجوش نظم "ساقی نامہ" ہے۔ اس نظم میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پُرجوش الفاظ اور مست خیالات کا ایک سیلاب امڈتا چلا آتا ہے۔

اس نظم میں قوم کی پستی و زبوں حالی کے اسباب بڑی تفصیل سے بیان کیے ہیں اور نہایت دلسوزی کے انداز میں اُن کے درماں کی تدبیر بھی بتائی ہے

۸ - فارسی تراکیب کے ضمن میں اُردو شاعری میں مرزا غالب کو ایک آئیڈیل کی حیثیت حاصل ہے۔ فارسی تراکیب سے کلام میں زور، بلندی اور شکوہ پیدا ہوتا ہے اور ساتھ ہی ایک بڑا مضمون کبھی کبھی چند الفاظ میں بڑی خوبی سے ادا ہو جاتا ہے۔ اقبال بھی شروع ہی سے اس معاملے میں غالب کے پیرو نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ان کی فارسی ترکیبوں میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو غالب کی تراکیب کا امتیازی وصف ہیں۔ مثلاً ؎

کہیں اُس عالمِ بے رنگ و بو میں بھی طلب میری
وہی افسانۂ دنبالۂ محمل نہ ہو جائے !

وہ دانائے سبل ختم الرسل، مولائے کُل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا

یہ حوریانِ فرنگی دل و نظر کا حجاب
بہشتِ مغربیاں جلوہ ہائے پا بہ رکاب

مجھ سے محبت کا قصہ نہیں طولانی
لطفِ خلشِ پیکاں، آسودگیِ فتراک

۹ - بعض اشعار سلاست، رعانی اور مبنی بر حقیقت ہونے کی وجہ سے ضرب المثل کی طرح زبان زدِ خاص و عام ہو گئے ہیں یہ اس بات کی بھی دلیل ہے کہ کلام کو قبولِ خاطر و لطفِ سخن کا مقام حاصل ہے۔ مثلاً ؎

جلالِ بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشہ ہو
جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی !

اے طائرِ لاہوتی اُس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے !
شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رباب آخر !

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
"تو جھکا جب غیر کے آگے نہ تن تیرا نہ من"

---

۱۰ - کلام میں زورِ بیان یوں تو ہر جگہ موجود ہے مگر بعض اشعار میں کمال پر پہنچ گیا ہے۔ مثلاً ؎

یہ مصرعہ لکھ دیا کس شوخ نے دیوارِ مسجد پر؟
یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقتِ قیام آیا

یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہرِ یک دانہ
یک رنگی و آزادی اے ہمتِ مردانہ !

سما سکتا نہیں پہنائے فطرت میں مرا سودا
غلط تھا اے جنوں شاید ترا اندازۂ صحرا

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
پھر مجھے نغموں پہ اُکسانے لگا مرغِ چمن

۱۱۔ رفعتِ تخیل بھی درجۂ کمال پر پہونچ گئی ہے۔ مثلاً ؎

عقابی شان سے جھپٹے تھے جو بے بال و پر نکلے ستارے شام کے خونِ جگر میں ڈوب کر نکلے

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

وہی جہاں ہے ترا جس کو تو کرے پیدا یہ سنگ و خشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے

۱۲۔ اکثر غزلوں اور نظموں میں شاعری کے ساتھ ساتھ موسیقی کا بھی بڑا لطیف امتزاج پایا جاتا ہے۔ مثلاً ؎

غزل .... گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر

" .... وہی میری کم نصیبی وہی تیری بے نیازی

" .... عالمِ آب و خاک و باد سرِّ عیاں ہے تو کہ میں ؟

" .... دل سوز سے خالی ہے نگہ پاک نہیں ہے۔

" .... جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی۔

۱۳۔ اس کتاب میں بعض جگہ خدا کے ساتھ شاعرانہ شوخیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ جو اگرچہ سنجیدہ طبائع پر گراں گزرتی ہیں اور ہمارے نزدیک بھی ایسی باتوں سے اجتناب کرنا ہی اچھا ہے تاہم اس کو نازِ عبدیت پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ؎

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم ! بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے !

بہرحال کتاب کا نام بتا رہا ہے کہ یہ بلند اور پاکیزہ مضامین کا مجموعہ ہے ایسے بلند و پاکیزہ مضامین کا جن کی اس سے پہلے اردو شاعری میں مثال نہیں ملتی۔ ممکن ہے پوری کتاب میں سے سوشلزم کے دیوانوں کو وہی دو ایک نظمیں پسند آئیں جن کو وہ اپنے نظریے کی تائید سمجھتے ہیں یا مغرب زدہ دین باختہ اشخاص انہی اشعار کو پڑھ کر اور سنا تے رہیں جن میں اقبال نے ملّا یا دوسرے پیا کار مذہبی لوگوں کی مذمت کی ہے۔ لیکن اس کے برخلاف جو لوگ نہ محض یہ کہ دین پسند ہیں بلکہ دینی و اخلاقی اقدار کے لذت آشنا بھی ہیں وہ اس کتاب کو عینک کی طرح آنکھوں سے لگاتے پھریں یا مصحف کی طرح سینے میں محفوظ کرنا چاہیں تو بالکل حق بجانب ہیں کہ ہر شخص اسی چیز کو پسند کرتا ہے جس کو اس نے مقصدِ زندگی سمجھ لیا ہے اور یہ بات ہم اپنے مشاہدے کی بنا پر کہہ رہے ہیں۔ ہم نے ایسے دنی الطبع کور ذوق اشخاص کو بھی دیکھا ہے جو بالِ جبریل کے ان اشعار کو جو آبِ زر سے لکھنے اور موتیوں میں تولنے کے قابل ہیں تمسخرانہ انداز میں پڑھتے اور اقبال کی شان میں گستاخانہ کلمات بھی استعمال کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کو بھی دیکھا ہے جو بالِ جبریل کے ایک ایک شعر پر سر دھنتے اور اس کی خوبیاں بیان کرنے سے سیر نہیں ہوتے۔ فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست ! ؎

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں شاہیں کا جہاں اور ہے کرگس کا جہاں اور !

مظہر جبیں شوق:

محبت اور مشکل ہوتی جاتی ہے
غم دل میں تری مرضی بھی شامل ہوتی جاتی ہے

رخ روشن سے پردے جسقدر بھی اٹھتے جاتے ہیں
نگاہِ شوق خود اٹھ اٹھ کے حائل ہوتی جاتی ہے

مجھ کو اپنی خبر نہیں اب تک
آپ کی جستجو کروں نہ کروں

ہو چکی اب تو دل کی بربادی
دیکھ اندازہ کروں نہ کروں

کر لیا عزم ہر چہ بادا باد
جنبش چشم دوست! تیری عمر دراز

ہر جفا آپ کی سر آنکھوں پہ
سی لئے میں نے اب لب فریاد

شوق کا جبر و اختیار نہ پوچھ
خود گرفتار، خود بخود آزاد

رشید کوثر فاروقی:

نہ وہ شب تابیِ انجم، نہ جشنِ خاوری باقی
گھنے جنگل میں ہے کچھ جگنوؤں کی روشنی باقی

صنم پوجو تو پوجو شوق سے پر کیا قیامت ہے
با علانِ برہمی مذاقِ آذری باقی

یہ لے پر غستاں بددعا ہے تشنہ کاموں کی
کہ ہر مے خوار دریا نوش پھر بھی تشنگی باقی

یہ کہ کر پھر سے چ . . . . ان بدنصیبوں نے
سر دیوار ہے پچھلے پہر کی چاندنی باقی

یہاں سنگ گراں ہر گام پر سجدوں کے طالب ہیں
غنیمت ہے کہ ہے میرا غرورِ بندگی باقی

نئے غنچو! تمہیں عنوانِ فردائے گلستاں ہو
کہ ہے پھولوں کے حصہ میں فقط افسردگی باقی

حوادث کا قلم چلتا رہا چلتا رہا لیکن
ابھی تک ہے مرے اوراقِ دل کی سادگی باقی

سرور نگینوی:

کچھ اور مرے دل کی وحشت کو ابھارا ہے
اے فصلِ بہار اس میں کیا تیرا اشارا ہے

میں ہی نہیں ہوں ایک تری زلف کا اسیر
جس کی نظر پڑی وہ تہِ دام آ گیا

عظمت کعبہ مجھے تسلیم لیکن گاہ گاہ
آستانِ حسن پر بھی سر جھکانا چاہئے

ماہر القادری:

اُس چشم التفات میں رنگِ عتاب ہے
میری گزارشوں کا یہ پہلا جواب ہے

ہے رند کشمکش میں عجب پیچ و تاب ہے
توبہ ہے لب پہ ہاتھ میں جام شراب ہے

چونکے ہیں نیند سے ابھی آنکھوں میں خواب ہے
سمٹا ہوا نشہ ہے چھلکتی شراب ہے

حُسن اور عشق کا بھی یہی ہے معاملہ　　شبنم کے ساتھ جو روشِ آفتاب ہے
باقی ہے رات صبح کے آثار ابھی کہاں　　اے محتسب! یہ پرتوِ جامِ شراب ہے
بڑھتی ہے جتنی عمر نکھرتا ہے اور رنگ　　میری حیاتِ شعر کا دورِ شباب ہے
موجوں سے آندھیوں سے اُلجھتی ہے بار بار　　انساں کی زندگی کہ نمودِ حباب ہے
دیکھا مری طرف تو وہ شرما کے رہ گئے　　گویا مرا سکوت بھی حاضر جواب ہے
اُن کا خیال اُن کا تصور، اُنہی کی یاد　　میری شبِ فراق شبِ ماہتاب ہے
ناصح! تمہیں بھی بزمِ نگاراں میں لے چلوں　　لیکن تمہارے شہر میں شہرت خراب ہے

ماہر نفس نفس میں ہے بوئے نیازِ دوست
میرا ہر ایک شعر مہکتا گلاب ہے

رازِ ہستی

ابوالاسرار رمزی اٹاوی (جودھپور)

روشن جو ہو چکی ہے اندھیرے کی بات ہے　　سمجھا ہے جس کو دن وہ حقیقت میں رات ہے
تحقیق و انکشاف سے یہ راز کھل گیا　　ہر ذرہ کائنات کا اک کائنات ہے

فریبِ حُسن

فریبِ حُسن سے مسرور نظارے بھی ہوتے ہیں
کبھی شعلہ بداماں صبح کے تارے بھی ہوتے ہیں
بہشت آنکھوں کی کہتے ہیں جسے ہے روح کی دوزخ
ہری شاخوں کے اندر سرخ انگارے بھی ہوتے ہیں

فضل احمد کریم فضلی :—

آ گئی کام تباہی میری　　اس نے کی سب سے وفا میرے بعد
قصرِ اُمید اور سربفلک　　ایسی تعمیر اور بے بنیاد

عابد عشری :—

زندگی کا رخ بدلنے کے لئے　　ایک مدت کم ہے اک لمحہ بہت

قابل اجمیری :—

ہوس کے دور میں قابل سے عظمتِ فن ہے
غزل سرا بھی رہا، ذکرِ یار بھی نہ کیا

عبدالحمید صدیقی (ایم اے)

روحِ انتخاب

سرمایہ داری اور اشتراکیت اصل کے اعتبار سے ایک دوسرے کے کس قدر قریب ہیں اس کا اندازہ کرنے کے لئے صرف یہ دیکھئے کہ ان دونوں نے جن تہذیبوں کو جنم دیا ہے اُن میں کتنی یگانگت اور مماثلت پائی جاتی ہے سرمایہ دارانہ تہذیب اور اشتراکی تہذیب میں کسی قسم کا کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ مذہب بیزاری، پیدائشِ دولت کے لئے اندھا جنون، کمزوروں کے حقوق پر ڈاکے، بین الاقوامی تعلقات میں بے اصولی اور مادی مفادات کی خاطر ہر دوسرے مفاد کی قربانی، دونوں کی نمایاں خصوصیت ہیں۔ آپ گذشتہ دس سال کے واقعات پر نگاہ ڈالئے اور دیکھئے کہ سرمایہ پرست امریکہ اور برطانیہ اور اشتراکیت پرست رُوس کے طرزِ عمل میں کوئی معمولی سا فرق بھی پایا جاتا ہے؟ مفادات کا جنون ان سب کو ایک سا طرزِ عمل اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ امریکہ جب اپنے مادی مفادات پر کوئی آنچ آتے دیکھتا ہے تو کوریا اور ویٹ نام میں انسانی خون سے ہولی کھیلنے لگتا ہے اور لاکھوں معصوم انسانوں کو تباہ و برباد کرکے رکھ دیتا ہے اور رُوس پر جب یہ جنون سوار ہوتا ہے تو وہ ہنگری اور چیکوسلاواکیہ پر بڑی بے تکلفی کے ساتھ دستِ ظلم دراز کرتا ہے۔ ان میں سے کوئی ایک بھی کسی اخلاقی ضابطے کا پابند دکھائی نہیں دیتا انسان اپنے عمل سے، درخت اپنے ثمر سے اور نظامِ حیات اُس اجتماعی اخلاق سے پہچانا جاتا ہے جس کا مظاہرہ وہ زندگی کے مختلف معاملات میں کرتا ہے۔ جس طرح ایک خود غرض فرد ناقابلِ اعتماد رہے بالکل اسی طرح سرمایہ داری اور اشتراکیت کے اجتماعی اخلاق پر کسی طرح بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ پاکستان اور دنیائے اسلام کو ان ممالک نے نہایت فیصلہ کن مراحل پر جو دھوکے دیئے ہیں انہیں دیکھتے ہوئے یہ اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں کہ ان کے فکر و عمل کے سوتے ایک ہی جگہ سے پھوٹتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ اور اشتراکی ممالک کے درمیان بقائے باہم کا جو اصول طے کیا گیا ہے یہ کسی انسانیت دوستی کا نتیجہ نہیں بلکہ چوروں کے مابین اُس اتفاق و اتحاد کا مظاہرہ ہے جس کے تحت وہ یہ طے کرتے ہیں کہ تم ایک خاص حدود کے اندر لوگوں کو اپنے ظلم و ستم کا تختۂ مشق بناؤ اور ہم تم سے تعرض نہیں کریں گے اور ہم دوسری حدود میں جب لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کریں تو تم ہمارے معاملات میں دخل نہ دو گے۔ مفادات کی پرستش نے ان دونوں نظاموں کے علمبرداروں کو ایک دوسرے کا ہم عنان بنا دیا ہے اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر انسانیت کو برباد کرنے پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں۔ ان کے درمیان تعاون کی راہیں اب اس قدر کشادہ ہو گئی ہیں کہ مشرقی ممالک اور خاص طور پر اسلامی ممالک کے معاملے میں تو ان کا طرزِ عمل بالکل ایک جیسا ہے اشتراکیت اس بات سے خوش ہے کہ یہاں لوگوں کے اندر سرمایہ پرستی کا جنون پیدا ہو رہا ہے اور یہ اس حقیقت کا کھلا ثبوت ہے کہ اُن کے دلوں سے خدا اور اس کے رسولؐ کی محبت ختم ہو رہی ہے اور اس کی جگہ دنیا پرستی لے رہی ہے یہ تبدیلی اشتراکیت کے لئے نہایت خوش آئند ہے۔ دولت کی محبت سے معاشرے میں ذہنی اور اخلاقی خلفشار پیدا ہوتا ہے جسے دُور کرنے کے لئے ریاست کا عمل دخل ناگزیر طور پر بڑھ جاتا ہے اور یہ سب چیزیں اشتراکیت کی راہ ہموار کرتی ہیں۔ جب یہاں اشتراکیت کو پروان چڑھنے کا موقع ملتا ہے تو سرمایہ دار ممالک کو بے حد خوشی ہوتی ہے کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے کسی دینی معاشرے کی بنیاد منہدم ہو رہی ہے۔

ہماری نظر میں

بائبل سے قرآن تک

اردو ترجمہ "اظہار الحق" از حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ، مترجم:- مولانا اکبر علی، شرح و تحقیق:- مولانا محمد تقی عثمانی، ضخامت ۶۱۲ صفحات، مجلد، کتابت، طباعت اور کاغذ دیدہ زیب) قیمت پندرہ روپے، ملنے کا پتہ:- مکتبہ دار العلوم کراچی ۱۴

(جلد اول)

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے مجاہد ہیں اس شرف جہاد کے ساتھ آپ کو ہجرت کی سعادت بھی میسر آئی، یہیں مکہ مکرمہ میں قیام کیا، وہاں ایک دینی مدرسہ (صولتیہ) کی بنا ڈالی اور بالآخر اسی مقدس سرزمین میں دفن ہونے کی سعادت حاصل ہوئی، علم کے ساتھ تقویٰ اور ساتھ ہی ایمانی جرأت و عزیمت، دین کی لگن اور اسلام کا دفاع یہ حضرت موصوف کی زندگی کے روشن عنوانات ہیں! مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ جس کی بدولت آن کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا؛ فتنۂ عیسائیت کی تردید ہے

اب سے تقریباً سوا سو سال پہلے ہندوستان میں عیسائی مشنریوں کا بڑا زور تھا، عیسائی لٹریچر مفت تقسیم کیا جاتا، پادری شہروں، قصبوں اور گاؤں میں جا جا کر اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے، آن کی ان سرگرمیوں کا خاص طور سے ہدف مسلمان تھے، ان مشنریوں کا سرغنہ فانڈر (C. C. P. FONDER) تھا جس نے "میزان الحق" نام کی ایک کتاب لکھی تھی، جس میں اسلام کے خلاف شبہات و تلبیسات اور اوہام و شکوک کا زہر بھر دیا تھا۔ پادری فانڈر انگریزی اقتدار کے زیر سایہ اسلام کے خلاف دھواں دھار تقریریں کرتا، اور اسلام پر طرح طرح کے جھوٹے الزام لگاتا، اس صورتِ حال نے ہندوستان کے مسلمانوں میں خوف و ہراس پیدا کر دیا تھا۔

اس ماحول میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ کی دینی غیرت کو حرکت ہوئی۔ انہوں نے پادری فانڈر سے مناظرے کئے اور بحث و مناظرہ میں اتنی سخت گرفت کی کہ فانڈر چیں بول گیا۔ دین اسلام کی اس فتح مبین اور عیسائیت کی شکست فاش نے خوف و مرعوبیت کے دھندلکے کو بہت کچھ صاف کر دیا، تقریر کے میدان میں عیسائیوں کو شکست دینے کے بعد مولانا کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ نے عیسائیت کی تردید میں متعدد کتابیں لکھیں جن میں سب سے زیادہ مدلل، مبسوط اور شاہکار کتاب "اظہار الحق" ہے۔ یہ کتاب عربی زبان میں ہے۔

"اظہار الحق" بار بار استنبول اور مصر میں چھپی ہے، ترکی، فرانسیسی، گجراتی اور انگریزی میں اس کے ترجمے ہوئے ہیں۔ عیسائیت کے سد میں یہ کتاب برہان قاطع بلکہ حرف آخر ہے اس کے انگریزی ترجمہ کو پڑھ کر لندن ٹائمز کا انگریز ناقد و مبصر چیخ اٹھا۔

"لوگ اگر اس کتاب کو پڑھتے رہیں گے، تو دنیا میں مذہب عیسوی کی ترقی بند ہو جائے گی" [1]

اس معرکہ آرا کتاب کا اردو ترجمہ مولانا اکبر علی صاحب (استاذ حدیث دار العلوم کراچی) نے کیا ہے، ترجمہ عام فہم اور آسان و سلیس ہونے

---

[1] "حضرت مولانا رحمۃ اللہ کیرانوی نے اظہار الحق میں اس قصے کے غیر مستند اور متضاد ہونے کو کسی جگہ تفصیل سے ثابت کر دیا ہے، دیں اس

(بقیہ صـ ۴۹)

کے علاوہ دلکش اور باادب ترجمہ بھی ہے، اللہ تعالیٰ فاضل مترجم کو دارین میں اس کا اجر غیر ممنون عطا فرمائے ۔

"اظہار الحق" کے اردو ترجمہ کی تحریک مولانا نور احمد صاحب سابق ناظم اعلیٰ دارالعلوم نے فرمائی تھی۔ اس تحریک کے کئی سال بعد حضرت مفتی مولانا محمد شفیع مدظلہ العالی کی نگرانی میں ترجمہ کا کام شروع ہوا۔ ترجمہ کی تکمیل میں زیادہ مدت صرف نہیں ہوئی، یہ کام پانچ چھ ماہ میں پورا ہو گیا مگر اس کی شرح و تحقیق کا جو عظیم الشان کارنامہ فخر اسلاف مولانا محمد تقی عثمانی (دامت برکاتہم) نے انجام دیا ہے، اس کی جتنی بھی تحسین کی جائے کم ہے۔

مولانا محمد تقی عثمانی نے ساڑھے تین سال اس کتاب کی شرح و تحقیق میں صرف کئے ہیں اور انتہائی جانفشانی، شدید ریاضت و محنت، بصیرانہ تحقیق اور کمال اخلاص کے ساتھ اس کارنامے کو پایۂ تکمیل تک پہونچایا ہے، حضرت مصنف کے سوانح حالات کے علاوہ اس عظیم الشان تصنیف پر مبسوط تحقیقی مقدمہ لکھ کر، مولانا تقی نے علم و تحقیق کی دنیا میں اپنے لئے مقام پیدا کر لیا ہے! اس میں عیسائیت کے تمام خدوخال واضح کئے گئے ہیں اور مستند اقتباسات اور تاریخی حوالوں کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے کہ :-

"خود عیسائی علماء میں سے بھی بے شمار لوگ اس بات کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں کہ موجودہ عیسائیت کے اصل بانی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہیں ہیں بلکہ پولس ہے :

"... موجودہ عیسائی مذہب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اصل تعلیمات سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا، وہ تمام تر پولس کی ایجاد ہے اسی بنا پر اس مذہب کا صحیح نام "عیسائیت" کے بجائے "پولسیت" ہے" (صفحہ ۱۷۷۔ مقدمہ)

موجودہ عیسائیت کے عقائد و رسوم کا فاضل مقدمہ نگار نے بڑی تحقیق کے ساتھ تجزیہ کیا ہے۔ تاریخی حوالے دے کر یہ بھی بتایا ہے کہ عیسائی عقائد میں اصلاح و ترمیم کے لئے بارہا تحریکیں اٹھی ہیں اور اس مذہب کی خود اس کے امتی کاٹ چھانٹ کرتے رہے ہیں۔

مولانا محمد تقی عثمانی کے مقدمہ کے بعد اصل کتاب ۱۹۱ صفحہ سے شروع ہوتی ہے، حضرت مولانا کیرانوی نے خود اپنی کتاب پر مقدمہ تحریر فرمایا ہے اور اس میں اپنی تصنیف کے بارے میں ضرور باتیں لکھی ہیں اور پادریوں کے سرغنہ فانڈر کی کتاب "میزان الحق" کی غلط بیانیوں کی پول کھولی ہے !

اظہار الحق کی پہلی جلد میں فاضل مصنف نے ثابت کیا ہے کہ بائبل کی تمام کتابیں غیر مستند ہیں اور ان میں بہت کچھ اختلافات پائے جاتے ہیں! جس مذہب کے الہامی صحیفوں ہی میں اختلافات ملتے ہوں وہ مذہب کتنا کمزور اور نامعتبر ہے۔

"اظہار الحق" کی بقیہ جلدوں کا ترجمہ جلد آنا چاہئے اگرچہ پہلی جلد ہی فاضل محقق و شارح کے مقدمہ کے ساتھ، عیسائیت کو بے نقاب کرنے کے لئے کافی ہے، مکتبہ دارالعلوم کراچی نے اس کتاب کو چھاپ کر مبلغین اسلام کے ہاتھ میں ایسا کارگر ہتھیار دیدیا ہے جس کے حملہ کی "عیسائیت" تاب نہیں لا سکتی ۔

"بائبل سے قرآن تک" زیادہ سے زیادہ پذیرائی اور قدردانی کی مستحق ہے۔ مذہبی عقائد کے علاوہ جہاں تک علمی اور تاریخی تحقیق کا

(بقیہ حاشیہ ص ـــ) عقیدے کی تمام تفصیلات موجود ہیں یہاں اس عقیدے پر تفصیلی گفتگو بیکار ہے (صفحہ ۱، مقدمہ) "بیکار" کے بجائے "تحصیل حاصل" یا کوئی اور موزوں لفظ آنا چاہئے تھا۔ ـــ "حضرت مولانا محمد حیات صاحب نے ایک مدرسہ قائم کیا ہوا تھا (مقدمہ۔ صفحہ ۱۸۲) "ہوا" کھٹکتا ہے ـــ "اللہ کا ہزاراں ہزار شکر ہے" (صفحہ ۴۰۴۔ ترجمہ) "ہزار ہزار شکر" لکھنا تھا "ہزاراں ہزار شکر" قدیم انداز بیان ہے جو اب متروک ہے۔ ـــ حضرت مؤلف نے مکہ مکرمہ کے مشہور عالم سید احمد حِلوانی دحلان کا ذکر بڑی عقیدت کے ساتھ کیا ہے (بقیہ حاشیہ آگے

تعلق ہے۔ یہ کتاب اپنی جگہ بے مثال اور لاجواب ہے۔

اسلامی تعلیمات

از:- میر ولایت علی، ضخامت ۲۵۰ صفحات۔
ملنے کا پتہ:- پبلشرز دی ڈومی نین بک کنسرن بشیر باغ روڈ، حیدرآباد دکن۔

میر ولایت علی صاحب کی تصنیف (قرآن اور انسان) پر ماہ دسمبر کے شمارے میں تبصرہ ہو چکا ہے، اُن کی دوسری کتاب "اسلامی تعلیمات" ہمارے سامنے ہے، جس کا اصل موضوع "درستی کردار" ہے اور کوئی شک نہیں اس موضوع پر انہوں نے خیرخواہانہ انداز میں بڑی دلسوزی اور دردمندی کے ساتھ خاصی اچھی اور مفید باتیں کہی ہیں، یہ کتاب میر صاحب موصوف کے پندرہ مضامین کا مجموعہ ہے!

میر صاحب کا مشن یہ ہے کہ ملت اسلامیہ کو قرآن کریم کی تعلیمات کی پیروی کرنی چاہیے، قرآن سے دوری کے سبب ملت پر یہ وبال آیا ہے کہ وہ ذلت وانتشار میں مبتلا ہو گئی ہے، صاحب موصوف کی اس رائے سے کون ہوشمند انکار کرسکتا ہے ــــ مگر افسوس اس کا ہے کہ میر صاحب نے دین وقرآن کا مطالعہ اُن اہل قلم اور ارباب فکر کی کتابوں کی مدد سے کیا ہے جو اپنی عقل وفکر اور رائے کو معیار حق سمجھے ہوتے ہیں۔ اور اس غلط فہمی نے انہیں گمراہ کر دیا ہے۔

صفحہ ۲۵۰ پر وہ لکھتے ہیں:-

"اطیعوا الرسول کے معنی قرون اولیٰ میں صاف اطاعت امیر کے تھے اور یہ منصب رسول خدا کے بعد امیر جماعت کی طرف منتقل ہو جاتا تھا۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے "آخری نبی" ہیں اور حضور کی اطاعت جس طرح زندگی میں منصوص تھی اسی طرح "سنت رسول" حضور کے بعد بھی قیامت تک کے لئے منصوص ہے، اطاعت رسول کے بغیر "اطاعت اللہ" ممکن نہیں (کما قال اللہ تعالیٰ ــــ من یطع الرسول فقد اطاع اللہ) منصب رسالت کسی اُمتی، خلیفہ یا امیر جماعت کو منتقل نہیں ہو سکتا، خلفاء راشدین ہر دینی معاملہ میں قرآن کے بعد یا قرآن کے ساتھ سنت نبوی کی اطاعت کرتے تھے، اور حدیث رسول کے مل جانے پر اپنی رائے بدل دیا کرتے تھے۔ جو کوئی حضور کی وفات کے بعد، آپ کی اطاعت کو منصوص اور دین میں حجت نہیں سمجھتا، اُس کا ایمان ہی معتبر نہیں ہے، یہ جاہلانہ نکتہ اور کافرانہ فلسفہ جس کا اظہار میر ولایت علی صاحب نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ مسٹر پرویز کے ذہن شیطان زدہ کی خبیث اُپج ہے، جس سے ہر مسلمان کو بیزاری اور نفرت کا اظہار کرنا چاہیئے۔

صفحہ ۲۹۲ پر "نستعین" کا یہ ترجمہ "استعانت یعنی کامیاب ہونے کی دھن باندھو" سیاق وسباق اور سورۂ فاتحہ کے مرکزی مضمون غرض ہر اعتبار سے غلط ہے، "نستعین" کے معنی ہیں "اے اللہ! ہم تجھی سے مدد چاہتے ہیں" ــــــ "کامیاب ہونے کی دھن" تو ایک کافر اور مشرک بھی باندھ سکتا ہے اور باندھتا ہی ہے" اس سورہ میں عبادت، استعانت اور ہدایت کا تعلق صرف اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہے۔

"حدود تدبیر انسانی میں خدا اپنی قدرت کو دخیل نہیں کرتا" (صفحہ ۳۲۲)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۹) احمد ان کے نام کے ساتھ "حضرت الاستاذ سیدی: سندی و مولائی" لکھا ہے۔ مگر مولانا کیرانوی قدس سرہٗ کے حالات میں ان کے تلامذہ کی جو فہرست دی گئی ہے اس میں "شیخ عبداللہ دحلان من مشاہیر علماء حرم" کا نام بھی ملتا ہے۔ کیا یہ دحلان صاحب (شیخ عبداللہ) سید احمد بن زینی دحلان کے فرزند ہیں یا ان میں سے وہ کون سے "دحلان" ہیں جن کی رائے مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے اپنے مخصوص عقائد کی تائید میں پیش کی ہے! اور اہل بدعت ان کے مداح ہیں (م - ق م)

یہ "قدریئین" کا عقیدہ ہے جو سراسر لغو و باطل ہے، اس سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی نفی ہوتی ہے؛ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہر شئے کو محیط ہے انسان کی تدبیر، ارادہ اور نیت کوئی شئے اللہ تعالیٰ کی قدرت سے باہر نہیں۔ "جبر و قدر" کی بحث بڑی نازک ہے، سلامتی کی راہ یہی ہے کہ مسلمان اللہ تعالیٰ کے قادر و جبار ہونے پر عقیدہ رکھتے ہوئے کہ ایک ذرہ بھی اس کے حکم کے بغیر حرکت نہیں کر سکتا، اپنے اعمال کے لئے خود کو "مکلف" بھی سمجھے!

صفحہ ۲۳۱ پر اس حدیث۔

"لا تفضلونی علیٰ یونس بن متیٰ"

کی شرح و تفسیر میں مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کی مثنوی کے اشعار پیش فرما کر جو نتیجہ اور خلاصہ اخذ کیا گیا ہے۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ حضورؐ نے فرمایا مجھ کو بلندی کے راز بتلائے گئے ہیں اور یونس کو پستی کے راز بتلائے گئے تھے۔ اس سے مرتبۂ قرب میں کوئی فرق نہیں پڑتا لہٰذا مجھے یونسؑ پر فضیلت مت دو۔"

وہ درست نہیں ہے؛ قرآن کریم میں حضرت سیدنا یونس علیہ السلام کے بارے میں "مُلیم" جیسا سخت لفظ آیا ہے اس عتاب آمیز لفظ کو پڑھ کر، کوئی مسلمان حضرت یونس علیہ السلام کے بارے میں "سوءِ ظن" میں مبتلا نہ ہو جائے۔ اس کے ازالہ کے لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے ارشاد فرمایا ہے کہ "مجھے یونس بن متیٰ پر فضیلت نہ دو" قرآنی آیات کی صوفیانہ شرح و تفسیر میں بڑے مغالطات پائے جاتے ہیں!

حیرت ہے میر ولایت علی صاحب ایک طرف "قرآن فہمی" پر زور دیتے ہیں دوسری طرف آیات و احادیث کی صوفیانہ اور شاعرانہ شرح و تفسیر کو قبول کرنے میں تامل نہیں کرتے؛ انہوں نے "الشیخ فی احدہ، کالنبی فی امتہ" کو بھی اپنی کتاب میں درج کر دیا ہے (صفحہ ۲۴۶) حالانکہ یہ کسی صوفی کا قول ہے، حدیث نبوی نہیں ہے ــــ اور ایسی بے اصل روایتیں اور نکتے وہ اس لئے قبول کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے "اطاعت" کا منصب چھین کر ملت و جماعت کے شیوخ و امراء کو سونپ دیں! استغفر اللہ!

"اسلامی تعلیمات" کے مزقات پر اگر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی جائے تو یہ تبصرہ مستقل کتاب بن جائے گا، سامنے کی چند باتوں پر ہم نے گرفت کی ہے اور اہل بصیرت اور حق شناسوں کو یہ اشارے ہی بہت کچھ ہیں مگر جن کے دل و نگاہ پر پردے پڑے ہوتے ہیں ان کو قرآن کریم سے بھی ہدایت کے بجائے ضلالت ملتی ہے۔

عکس و شخص

از:- عنوان چشتی (ایم۔ اے) ضخامت ۲۴۸ صفحات، (مجلد) قیمت پانچ روپے

ملنے کا پتہ:- ادارۂ عارض، ۳۸۲ مادی پور، دہلی

جناب عنوان چشتی خوش فکر شاعر اور صاحب فکر نقاد ہیں۔ انہوں نے اپنی اس کتاب میں اردو شعر و ادب کے مندرجہ ذیل مشاہیر:- پروفیسر محمد مجیب، غلام ربانی تاباں، کوثر چاند پوری، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، ابر احسنی گنوری، شفا گوالیاری، میکش اکبر آبادی، تسکین قریشی، انور صابری اور نریش کمار شاد

پر اپنے تاثرات پیش کئے ہیں، یہ تاثرات بڑے دلچسپ ہیں، جن میں شخصیتوں کے سیرت و کردار اور کمالِ فن کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں، عنوان صاحب نے ان مشاہیر کی شخصیتوں کا نفسیاتی انداز میں تجزیہ کیا ہے اور ان کے فنی کمالات کا ست نکال کر رکھ دیا ہے اس تجزیہ کی اوٹ سے عنوان چشتی صاحب کا خود اپنا ذوق، فن، رجحان اور خیالات و افکار بھی جھلکتے ہیں۔ پروفیسر مجیب صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"مجیب صاحب کو نام و نمود سے سروکار نہیں وہ "خدمت برائے خدمت" اور "کام برائے کام" کے اصول پر گامزن ہیں، جنہیں پسند کرتے ہیں انہیں پیار کرتے ہیں جنہیں ناپسند کرتے ہیں انہیں گوارا کر لیتے ہیں"

غلام ربانی تاباں کیا ہیں ؟ اُن کی شاعری کی کیا خصوصیات ہیں ؟

"تاباں صاحب صنم ساز بھی ہیں اور بت شکن بھی، اُن کی غزلوں میں ان کی شخصیت کے دونوں

رُوپ جلوہ گر ہیں ...."

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی سحر بیانی پر :-

"سحر صاحب بولتے نہیں، موتی رولتے ہیں"

——— اور ———

"...وکٹ وہ دلوں سے ملتے اور تنگ دلوں سے بچھڑ جاتے ہیں۔ اس لئے ان کے گرد ہر طرح

کے لوگوں کا دائرہ بنتا اور ٹوٹتا رہتا ہے"

شمس قریشی :- "کم آمیز ہیں مگر خود پسند اور مغرور نہیں، کم سخن ہیں مگر اصابتِ رائے کے لئے مشہور ہیں

شاعر ہیں اور اچھے شاعر مگر کوئی شاعرانہ انداز نہیں یعنی بے اصولیاں اُن کا اصول نہیں"

حیرت ہے صفحہ ۹ پر "بجستہ سخنی" کے بجائے "بجستہ سہنی" پڑھنا پڑا، یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ "اُن (کوثر چاندپوری)

کا من جمود، سپاٹ پن اور سکڑن سے محفوظ ہے" (صفحہ ۱۱۰) یہ ترقی پسندوں کا وہ انداز بیان ہے جس میں ابہام سے زیادہ اہمال

برتا ہے ——— "وہ اپنے فن کے ذریعہ گمراہ کن اسباب جہل کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک چاہتے ہیں؛ اس کو اکھاڑنے کے لئے طنز کے

تیروں اور تنقید کے حربوں کا بے باکانہ استعمال کرتے ہیں (صفحہ ۱۶۳) اس قسم کے اندازِ نگارش اور اسلوب تحریر میں کس قدر

آورد اور بے تکلفی پائی جاتی ہے۔

فنزان چشتی صاحب جو اللہ کے فضل سے مسلمان ہیں، انہوں نے اپنے استاد آبر گنوری کے تبدیل مذہب کرنے یعنی بھائی بن

کر مرتد ہو جانے پر اظہار نفرت و بیزاری کے بجائے اس کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے۔

"وقتاً فوقتاً دوسرے مذہبوں اور مسلکوں کے مطالعہ کے بعد اپنے نقطۂ نظر میں وسعت پیدا کی" (ص ۱۶۲) استغفر اللہ:

یہ نقطۂ نظر کی وسعت نہیں، خیال و فکر کی گمراہی اور قلب و ضمیر کی اخلاقی موت ہے! آبر صاحب کے ارتداد میں لالچ اور مادی منفعتیں بھی

شریک ہیں!

"عکس و شخص" میں شعراء کرام کے منتخب اشعار درج کئے گئے ہیں، اس انتخاب سے ہم نے بھی کچھ اشعار چھانٹے ہیں۔

غلام ربانی تاباں :- بہار آئی گل افشانیوں کے دن آئے
اُٹھاؤ ساز غزل خوانیوں کے دن آئے

ظالم وہ تری پہلی نظر یاد رہے گی
میں بھولنا چاہوں بھی مگر یاد رہے گی

مقتل ناز سے گزرے تو گزرنے والے
پھول کچھ پھینک گئے دامنِ قاتل کی طرف

دلوں کا درد کبھی لب پر آ ہی جاتا ہے
کسی پکار کی صورت کسی صدا کی طرح

"پر" کی جگہ "پہ" ہوتا تو صوتی طور پر مصرعہ سبک تر ہو جاتا۔

دل وہ کافر کہ سدا عیش کے ساماں مانگے
زخم پا جائے تو کم بخت نمکداں مانگے

آئینہ خانہ میں حیرت کے سوا رکھا ہے کیا
جو نظر آتا ہے عکسِ آرزو ہے دوستو!

آوارگیٔ شوق نے رکھ لی جبیں کی لاج
ایک ایک آستاں سے گزرتے چلے گئے

ہزار سادگی و صد ہزار پرکاری — نہ کوئی دوست نہ دشمن تری نظر کی طرح
خلوص بچ گیا الزام سے گدائی کے — ہیں دستِ شوق پہ احسان نارسائی کے
نفس کی گرمیوں نے جان سی ڈالی ہے لفظوں میں — نظر کی شوخیوں نے فکر کو آئینہ بخشا ہے

تاباںؔ صاحب کے اس شعر :-

میکدے کی اصطلاحوں میں بہت کچھ کہہ گئے — ورنہ اس محفل میں دستورِ زباں بندی بھی ہے

میں "میکدے" کی جگہ "جامِ دمے" ہوتا ——— تو ؟

نصیب کچھ نہ ہوا دامنِ تہی کے سوا — ہزار بادِ صبا گلستاں نبرد رہی

"گلستاں نبرد" کی یہ ترکیب نئی ترکیب ہے مگر کتنی نامانوس اور واقعیت کی غلط ترجمان بادِ صبا "گلستاں" سے کب نا کارائی اور لڑائی کرتی ہے ! یہ "حسنِ تعلیل" نہیں "سوءِ تعلیل" ہے ۔

کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ :-

دل غمگیں خوشی سے ڈرتا ہے — اجنبی ، اجنبی سے ڈرتا ہے
وہ زلفِ پریشاں کا سنوارے نہ سنورنا — وہ اُن کے بگڑنے کی ادا یاد رہے گی

ہماری بزمِ مے نوشاں میں رات آتی نہیں واعظ
کہ چھپ جاتا ہے جب سورج تو پیمانہ نکلتا ہے

اس شعر میں "ہماری" کھٹکتا ہے ۔

آفت میں غم میں رنج میں مشکل میں آ گئے — ہم کیا سمجھ کے کوچۂ قاتل میں آ گئے

آبرؔ گنوری :-

پھر زمانہ کو آواز کیا دوں — میں جہاں ہوں زمانہ وہیں ہے
اُف یہ بھولا پن یہ شرم آگیں نظر یہ سادگی — دیکھ کر یہ کون کہہ دیگا کہ تو قاتل بھی ہے
جب بڑھا سوزِ فرقت تو نالے کئے — آگ کو آگ ہی سے بجھانا پڑا
میں شرابی ہوں ساقی نئے دَور کا — پی لئے اشکِ حسرت خمار آگیا
پھر کھلے پھول ، پھر گھٹا اُمڈی — ہم کہاں تھے اسی زمانے میں

شفاؔ گوالیاری :-

حقیقت کو زیادہ چھاننے سے — حقیقت بن نہ جائے خود فسانہ
ہمیشہ ہم نے ترتیبِ طلوعِ صبح یوں دیکھی — کہ پہلے وہ نظر آئے نظر پھر آفتاب آیا

مگر اُن کے یہ شعر عجیب ہیں :-

کھل کھل نہیں سکتے کہ ہیں آدابِ وفا یاد — ہر سانس پہ آتے ہیں ترے بندِ قبا یاد
نباہی دشمنوں سے بھی ہمیشہ دوستی میں نے — اندھیروں کے تھپیڑوں سے بچھڑی روشنی میں نے

پہلا شعر ایک معمہ ہے اور دوسرے شعر کا مصرعہ اولیٰ شاعری کے ساتھ مذاق ہے ۔

میکش اکبرآبادی :-

قائم ہے یہ جہاں تری عصمت ہی سے مگر — رونق جہاں کی ہے مرے ذوقِ گناہ سے
زمیں پہ پھول برساتے ہیں جب برسا کے بادل — ہزاروں روپ لیکر زندگی سونا اگلتی ہے

حیرت ہے کہ اُن کا یہ شعر —

پڑے گی کس پہ کہ تجھ پر ہی یہ نہیں پڑتی — تری نگاہ کا کافر و ماغ کیا کہئے

اس طرح انتخاب میں آگیا ۔ "نگاہ" جسے مصرعہ اولیٰ میں آنا چاہئے تھا وہ دوسرے مصرعہ میں نظم ہوئی ہے یہ کتنی قبیح تعقید ہے، پھر مصرعہ اولیٰ معنی و دولت کے اعتبار سے بھی سپاٹ ہے "کا کافر" میں تنافر — پایا جاتا ہے اور "نگاہ کا کافر دماغ" میں تکلف !

شکیبی قریشی :- طرح طرح سے بھلایا مگر یہ حال ہوا — کہ ہر خیال سے پیدا ترا خیال ہوا
بڑھ جائیں حوصلے نہ دلِ مبتلا کے دیکھ — اے دوست ! التفات کے پہلو بچا کے دیکھ
ملے تو کیسے ملے جلوہ گاہِ قلبِ حضور — نہ آرزو کا سلیقہ نہ جستجو کا شعور
زندگی میکدہ تشنہ لبی ہے ساقی — پیاس دل کی نہ بجھی ہے نہ بجھے گی ساقی
[illegible] :- تم اُسے شکوہ سمجھ کر کس لئے شرما گئے — مدتوں کے بعد دیکھا تھا تو آنسو آ گئے
دنیا کو ہو گئی ہیں غلط فہمیاں تو ہوں — میرا یہی خیال ہے ، تم بے وفا نہیں
[illegible] :- میسر ہے کسی کافر کی شرمیلی نگاہوں کو — تصور میں بھی جو پاکیزگی مشکل سے آتی ہے
کسی کے جور و ستم کا تو اک بہانہ تھا — ہمارے دل کو بہر حال ٹوٹ جانا تھا
چراغ بن کے جلے ہیں تمہاری محفل میں — وہ جن کے گھر میں کبھی روشنی نہیں ہوتی
اپنا دامن سنبھال کر چلیئے — زندگی رقص ہے شراروں کا
دشمنوں نے تو دشمنی کی ہے — دوستوں نے بھی کیا کمی کی ہے

"عکس و شخص" اپنے موضوع پر دلچسپ ادبی پیشکش ہے، توقع ہے کہ شعر و ادب کے حلقوں میں اسے پسند کیا جائے گا۔

دُور کا رشتہ

از :- انوار احمد زئی ، ضخامت ۲۰۸ صفحات (مجلد) قیمت دو روپے ۵۰ پیسے
ملنے کا پتہ :- مکتبہ تخلیق ، ۲۷ لطیف آباد نمبر ۹ حیدر آباد

انوار احمد زئی جواں سال بلکہ یوں کہنا چاہئے نوخیز افسانہ نگار ہیں ، اس لئے اُن کی تحریر میں جوش و گرمی کے ساتھ "نومشقی" بھی پائی جاتی ہے، ہر شاعر اور ادیب کو آغاز میں ٹھوکروں اور لغزشوں سے سابقہ پڑتا ہے ۔ اُن کے افسانے بہت مختصر ہیں اور کسی کسی افسانے میں تو "پلاٹ" برائے بیت ہے ، لیکن اُن کی کتاب پڑھ کر اندازہ ہوا کہ وہ فطری طور پر افسانہ نگار ہیں اور مشق و تجربہ کے بعد وہ اس فن میں نام پیدا کریں گے ۔

"اُس نے زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق اہم کتب کو کھنگول ڈالا تھا" (صفحہ ۱۸) ، کھنگال ڈالا" لکھنا تھا — "میں نے اُس کی جھیل سی آنکھوں میں اتر جانا چاہا" (صفحہ ۴۳) جس لڑکی کی آنکھیں "جھیل جیسی" ہوں گی ، وہ لڑکی کتنی خوفناک ہوگی "آنکھ کی صفت جھیل" جدت پسندوں کی اختراع ہے، جو بد مذاقی کی دلیل ہے — "سکوٹر کی آواز پہ کان دھرے کھڑی تھی" (صفحہ ۵۹) " کان لگائے کھڑی تھی" روزمرہ ہے — "بجلی کے قمقموں سے سجی ہوئی ہوٹل کو دیکھنے لگا" (صفحہ ۷۳) "ہوٹل" مذکر ہے ۔ وہ اپنی ہوٹل میں عیش سامانیاں پیدا

کرے" (صفحہ ۹۰) "عیش سامانیوں کے ساتھ پیدا کرنا" کون بولتا اور لکھتا ہے؟

"ہر چند اماں باوا نے قسمیں دلائیں، واسطے دئے، مسائل سمجھائے" (ص ۱۱۷) "مسائل سمجھانے" کا نئے کی یہاں کیا تک تھی — "ہم پہ رعب! ہماری تعلیم تمہیں معلوم نہیں" (ص ۱۴۲) اس قسم کا کچا پن افسانہ نگار کی تحریروں میں پایا جاتا ہے — "دوپہر کے سناٹوں میں" ("سناٹے" کی جمع (سناٹوں) لانے کی کیا ضرورت تھی — "نہ جانے یہ بہنیں کس وقفہ سے پیدا ہوئی تھیں کہ سب کی سب ایک ہی ساتھ نکال پڑیں" (ص ۱۹۷) یہ کس قدر بچکانہ انداز تحریر ہے! "ان لڑکیوں کی ماں تو اتنی بوڑھی تھی کہ پلنگڑی پہ پڑے پڑے گلی جا رہی تھی" "گلی جا رہی تھی" محاورے کا غلط استعمال!

"جس کا میزانیہ انہیں زنان خانہ میں پیش کرنا تھا" "میزانیہ" بجٹ (BUDGET) کا ترجمہ ہے اناپتی کرکے جو گوشوارہ بنا، اُسے "میزانیہ" نہیں کہتے۔

مشق و تجربہ کے بعد ہی اس قسم کی خامیاں رفتہ رفتہ دور ہوں گی۔

جناب انوار احمد زئی کو افسانہ نگاری میں ابھی بہت کچھ مشق اور ریاضت کرنی ہے، اس کے بعد ان کے افسانوں میں حسن پیدا ہوگا۔ نیز افسانوں کا دوسرا مجموعہ کم سے کم دو تین سال کے بعد منظر عام پر لانے کی جرأت کرنی چاہئے۔

شہر غزل

از:- جمیل یوسف، ضخامت ۱۲۰ صفحات (مجلد، رنگین گرد پوش) قیمت ۳ روپے ۵۰ پیسے۔
ملنے کا پتہ:- فیروز سنز لمیٹڈ کراچی و لاہور

جناب جمیل یوسف خوش گو شاعر ہیں، غزل کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں: "شہر غزل" موصوف کی غزلوں کا حسین مجموعہ ہے اپنی شاعری کے بارے میں اُن کی خود اعتمادی کی یہ سب سے بڑی دلیل ہے کہ انہوں نے کسی شاعر یا ادیب سے اپنی کتاب پر پیش لفظ، دیباچہ، تعارف یا مقدمہ نہیں لکھوایا۔ جمیل یوسف کے مزاج و طبیعت کو تغزل سے خاص مناسبت ہے، یہی مناسبت اور ذوق اُن کی غزلوں میں جھلکتا ہے — منتخب شعر:

تیری آہٹ کے تعاقب میں ہوں صدیوں سے رواں — راستوں کے پیچ و خم میں ٹھوکریں کھاتا ہوا

شعر اچھا ہے۔ مگر "صدیوں" کے بجائے "مدت" ہونا چاہئے۔

لذتِ دیدار کی اے ساعتِ رخشاں ٹھہر — پڑھ رہا ہوں میں ترے چہرے پہ کچھ لکھا ہوا
نہ یار لطف پہ مائل نہ شہر درد شناس — کہاں یہ ہم دلِ اُمید وار لے کے چلے
دنیائے رنگ و نور بہت بیکراں سہی — پیش نظر جو تو ہے تو پھر کیا دکھائی دے

"بہت" حشو زائد ہے۔ "بیکراں" کے بعد "بہت" لانے کی ضرورت نہ تھی۔

ہوا چلی تو نشہ چھا گیا فضاؤں میں — خیال ڈوب گیا دور کی صداؤں میں
قدم قدم پہ مجھے سجدہ گہ نظر آئے — گھرا ہوا ہیں بندوں میں یا خداؤں میں

"سجدہ گہ" مذکر نہیں، "مونث" ہے۔

ڈرتا ہوں کہیں سحر نہ ہو جائے — مجھ کو نہ سکوں ملا ہے شب سے
تو مری راہ میں کیوں حائل ہے — ایک اُمڈے ہوئے دریا کی طرح
مجھ کو معلوم نہیں تھا اے دوست — تو بھی بیگانہ ہے دنیا کی طرح

جلووں کی پھوار پڑ رہی ہے | دامانِ نظر بچھا ہے ہر سُو
یہ رُت کہ ابھی جواں ہوئی ہے | بکھری ہے بہار بن کے ہر سُو

ترے ہی نقش قدم تھے جدھر سے گزرے ہیں | تمام عمر تری رہگزر سے گزرے ہیں

مصلحت نے لاکھ پہنے لفظ و معنیٰ کے حجاب | دل پہ جو گزری بہر صورت بیاں ہو کر رہی
جس بتِ نوخیز کو پوجا وہ یزداں بن گیا | جس زمیں پہ پاؤں رکھا آسماں ہو کر رہی

ترے حضور جسے ایک پل قرار نہیں | ترے فراق میں اس دل کا حال کیا ہوگا

دل ترے ہجر میں بھی تنہا تھا | دل ترے قرب میں بھی تنہا ہے
تیری آہٹ پہ گجر بجتا ہے | پھول کھلتے ہیں نوا سے تیری

ابھی سے وقت کے ماتھے پہ کیوں شکن ابھری | بساطِ محفلِ یاراں ابھی بچھی بھی نہیں

مجھے خود اپنے ہی نقشِ قدم بلاتے ہیں | بھٹک رہا ہوں زمانے میں گمرہی کی طرح

ترا خیال ترا آرزو ترا پیکر | تمام نغمہ و مستی تمام زیبائی

حرفِ مطلب ہے تشنۂ معنی | حرفِ محروم گفتگو ہی نہیں
رقص ہے نغمگی ہے، مستی ہے | باغ میں صرف رنگ و بو ہی نہیں
زندگی کے ہیں سینکڑوں بہروپ | زندگی تیری جستجو ہی نہیں

ہم لوگ بہر حال ہیں سرمست و غزل خواں | پھولوں کی طلب ہے کہ کانٹوں پہ بسر ہو

عزم وہ برق و شرر کو بھی توڑ سکتے ہیں | لہو دیا ہے جنہوں نے شجر شجر کیلئے

چند پامالِ تمناؤں کو | حاصلِ عمر سدا ہی دیکھا ہے

چھپاتا پھر رہا ہوں میں عبث رازِ محبت کو
مجھے تو ساری دنیا رازداں معلوم ہوتی ہے

دوسرا رُخ :-

ہر قدم پہ تو مرے دستِ جنوں کی زد میں ہے | میں ہوں ترے راستے کی گرد میں بکھرا ہوا (ص ۲۴)

مصرع ثانی مہمل ہے۔ اگر شاعر زندہ ہے تو بہ قیدِ جسم و جاں محبوب کے راستے میں گرد کی مانند کس طرح بکھر سکتا ہے۔

سوچا تھا کہ لوٹوں تری فرقت کے خزینے | دیکھا نہ گیا تیرے بچھڑنے کا سماں بھی (ص ۲۵)

"فرقت کے خزانوں" کا لوٹنا، یہ اندازِ بیان ہی نامانوس ہے! اس کے علاوہ شعر کے مفہوم میں خاصہ ابہام پایا جاتا ہے۔ جب محبوب بچھڑ گیا تو "فرقت" کا زمانہ آپ ہی آپ شروع ہو گیا، محبوب کے بچھڑنے کا سماں نہ دیکھنے سے "فرقت" کی نفی کس طرح ہو سکتی ہے۔

تعلقات کے زخموں کا ہوں ستایا ہوا | جو شام آئی مرا سایہ بھی پرایا ہوا (ص ۲۹)

اس شعر میں بھی مفہوم کی ژولیدگی کا عیب پایا جاتا ہے۔ "زخموں کا ستایا ہوا" یہ اندازِ بیان بھی وجدان کو کھٹکتا ہے۔

ہر ایک لمحے کی آہٹ پہ دل لرزتا ہے | زمانے بھر کو ہو جیسے گلے لگایا ہوا (ص ۳۰)

مصرعہ ثانی زبان کے اعتبار سے کمزور بلکہ غلط ہے! پھر اس شعر میں یہ نہیں کھلتا کہ زمانہ بھر کو کون گلے لگائے ہوئے تھا: ——

ـــــــ اگر "لمحہ وقت" زمانہ کو گلے لگائے ہوئے ہے، تو اُس کی آہٹ پا کر شاعر کا دل کیوں لرزتا ہے! کوئی سبب!

وہ تیرگی ہے کہ آنکھوں میں اک کرن بھی نہیں　　　وہ خامشی ہے کہ لمحوں نے زہر کھایا ہوا

"لمحے" کب بولا کرتے ہیں، وقت تو بے آواز ہوتا ہے پھر لمحوں کی خامشی کا شکوہ کیوں؟ "زہر" کی بجائے یوں ہوتا کہ لمحے "سرمہ در گلو" ہیں تو خامشی کے لئے سبب جواز پیدا ہو سکتا تھا، "زہر" کھانے سے صرف خاموشی طاری ہو کر نہیں رہ جاتی، موت واقع ہو جاتی ہے! اس شعر میں "موت کی خاموشی" نہیں "عام خاموشی" بیان کی گئی ہے۔

نہ کوئی یار نہ ہمدم نہ کوئی ہمراہی　　　تمہاری زلف کا سایہ تو خیر سایہ ہوا　　　(ص۴۲)

محبوب کی زلفوں کا سایہ اگر کسی رہرو راہِ محبت کو میسر آ جائے، تو پھر اُسے اور کیا چاہئے۔

جنوں مستی کی آیت پڑھ رہا ہے　　　خود چُپ چاپ سُنتی جا رہی ہے　　　(ص۴۳)

جنوں کا مستی کی آیت پڑھنا ـــــــ اس میں تکلف و آورد کے سوا اور کیا دھرا ہے۔

مرے قریب ہو تو وہ گل بکھر بکھر جائے　　　مرا وجود بھی شامل ہے ان اداؤں میں　　　(ص۴۴)

یعنی!؟ مصرعہ اولیٰ نے شعر میں اہمال پیدا کر دیا۔

تری تحریر جبیں ہے اے دوست　　　زندگی کتنی حسیں ہے اے دوست　　　(ص۴۶)

مصرعہ اولیٰ ایک "معمہ" ہے!

تیرگی چھائی ہوئی ہے ہر سُو　　　کس نے بکھرائے ہیں اپنے گیسو　　　(ص۴۸)

محبوب کے زلف و گیسو کو گھٹا اور رات سے تشبیہ دیتے ہیں مگر تشبیہ و استعارہ میں پہلو تعریف کا ہوتا ہے، اس شعر میں "تیرگی" کا استعمال گیسو کے لئے قباحت پیدا کر رہا ہے۔

اب جو نکلا ہوں ترے خواب لئے　　　تا بہ امکان نظر جاؤں گا　　　(ص۵۰)

"شہرِ غزل" کے لئے اس قسم کے سطحی اور مہمل شعر وجہ ننگ و عار ہیں۔

ایک طرفہ بیخودی میں گم ہوا رہتا ہوں میں　　　بے محابا فاصلوں کو ناپتا رہتا ہوں میں　　　(ص۵۶)

زبان، مفہوم اور الفاظ کے استعمال ـــــــ ہر غرض اعتبار سے شعر ناقص۔

کسی ان دیکھے پرستاں سے چرا لائی ہیں
نکہت و رنگ کا انداز تمہاری آنکھیں　　　(ص۶۸)

آنکھوں کو "نکہت" سے کوئی دور کی مناسبت بھی ہے؟

کہاں وہ لے ہے جو تیری بدن سے اٹھے گی　　　کہاں وہ شعر ہے جو تیرا آئینہ ہوگا　　　(ص۵۵)

الجھا ہوا خیال و مفہوم! بدن سے لے اُٹھنا اور زیادہ قابلِ اعتراض!

دل کی دھڑکن پہ ہوتا ہے اکثر گماں کر رہا ہو کوئی جیسے سرگوشیاں
جو سمجھ پائے اس حُسنِ آہنگ کو ذہن کے پاس ایسی ترازو کہاں

"ترازو" میں تو محسوس و مشہود اشیاء تولی جاتی ہیں "حسنِ آہنگ" سے "ترازو" کا کیا تعلق ہے! پھر ترازو سے "سمجھ پائے" کی نسبت اور زیادہ کھٹکتی ہے۔

جب سے آنکھوں نے تجھ کو دیکھا ہے　　　میرے سینے میں چاند اُترا ہے　(ص ۸۱)

شعریت کا دُور دُور پتہ نہیں۔

ایک قطعہ جس کا پہلا شعر ہے۔

نقش بھی اُس کے سیدھے سادے ہیں　　　رنگ بھی اُس کا سانولا سا ہے

اور

اکثر اوقات سوچتا ہوں میں　　　وہ بہت ہی عجیب لڑکا ہے

جب کبھی اُس کا سامنا ہو جائے　　　بات کرتے ہیں وہ جھجکتا ہے

سب کی نظروں میں وہ کھٹکتا ہے　　　سب کے دل میں وہ چھپ کے بیٹھا ہے

"دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے

آخر اس درد کی دوا کیا ہے"

یہ قطعہ بھلا مجموعۂ غزل میں شامل کئے جانے کے قابل تھا؟ غالب کے مطلع کی تضمین دو لخت!

زندگی اپنی جفا سے تیری　　　ہم تو جیتے ہیں رضا سے تیری

نو مشقوں اور مبتدیوں جیسا اندازِ بیان

بھری محفل میں ہم کھوئے گئے ہیں　　　یہی ہم سے حماقت ہو گئی ہے　(ص ۹۳)

یہ کیا شاعری ہے!

دل سے کیا پوچھیں کہ یہ شہرِ جنوں کیسا ہے　　　دل تو دیوانہ ہے ہر موڑ پہ رُک جاتا ہے　(ص ۱۰۳)

"شہرِ جنوں" کہاں ہے: پھر دل کی دیوانگی کا یہ "لازمہ"

"ہر موڑ پہ رُک جاتا ہے"

ان خرابیوں نے شعر کو "بھول بھلیاں" بنا دیا۔

خبر نہیں ہے عدم میں سبیل کیا ہو گی　　　یہاں تو تیری نظر سے نجات بنتی ہے　(ص ۱۲۸)

"نظر سے نجات بنتی ہے" آخر یہ کیا مفہوم اور کہاں کی زبان ہے!

ڈوب جاؤں تیری آنکھوں کی نشیلی جھیل میں　　　اس طلسمِ کیف زا میں اپنا افسانہ کہوں　(ص ۱۳۲)

ترقی پسندوں نے محبوب کی آنکھوں سے "جھیل" کو تشبیہ دے کر بڑی بد مذاقی کا ثبوت دیا ہے، جو آنکھ "جھیل" یا "کنوئیں" کی مانند ہو گی وہ کتنی خوفناک ہو گی! اس شعر کا دوسرا مصرعہ مہمل ہے۔

شہر کی ہر رہگذر کو اک پری کا غم نہ کہوں　　　جی میں ہے دنیا کے سب لوگوں کو دیوانہ کہوں　(ص ۱۳۳)

مصرعۂ اولیٰ میں "اک" کس قدر اکھڑا اکھڑا لگتا ہے۔ شعر سپاٹ ہے۔ بے مزہ ہے، پھسپھسا ہے!

نکھرا ہوا تھا حُسنِ خیالات رات بھر　　　ہوتی رہی ہے بارشِ نغمات رات بھر　(ص ۱۴۰)

مصرعۂ اولیٰ کسی کام کا نہیں! زبان کے اعتبار سے بھی شعر غلط ہے۔ "رات بھر نکھرا رہا" کہنا چاہئے تھا۔

زمانہ اُس کی ہنسی کے فسوں میں ڈوب گیا　　　ہمارے نالے ترستے رہے اثر کے لئے

بزم ہستی میں جہاں دیکھا ہے ایک دل سوز سماں دیکھا ہے

اس قسم کے سطحی شعر "شہر غزل" میں کیسے شامل ہوگئے!

توقع ہے کہ جناب جمیل یوسف کے دوسرے "مجموعے" میں جو "نقش ثانی" ہوگا، اس قسم کی خامیاں باقی نہیں رہیں گی: مجموعی طور پر "شہر غزل" پذیرائی کے قابل ہے۔

چاند کا سلام از:- اسعد گیلانی، ضخامت ۲۸۴ صفحات (جاذب نظر سرورق) قیمت چار روپے
ملنے کا پتہ:- مکتبہ آمین ۱۲ نسیم مارکیٹ ریلوے روڈ، لاہور

جناب اسعد گیلانی کا نام ادب و افسانہ کی دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے صاحب موصوف کی چند کتابیں منظر عام پر آکر مقبول ہوچکی ہیں' اسعد گیلانی کا ادب اسلامی قدروں کا ترجمان ہے اس لئے اُن کی ہر تحریر مقصدیت کی آئینہ دار ہوتی ہے'

زیر تنقید کتاب اُن کے منتخب مضامین کا دلکش مجموعہ ہے' فروغ احمد' آباد شاہ پوری، غلام حسین اظہر اور رفیع الدین ہاشمی نے اس کتاب کو مرتب فرمایا ہے اور جناب فروغ احمد نے کتاب کے شایان شان مقدمہ لکھا ہے!

ان مضامین میں افسانے، رپورتاژ، شخصیات اور ذاتی تاثرات و مشاہدات سبھی کچھ شامل ہیں' لکھنے والے کے جذبات میں صداقت اور خیالات میں پاکیزگی پائی جاتی ہے!

"وہ اپنے ذہن میں کچھ گنگناتا رہا تھا" (ص ۳۰) یہ نہ محاورہ ہے اور نہ روزمرہ سا اس خیال کو دوسرے موزوں الفاظ میں ادا کرنا چاہئے تھا .... "بے جان سا اخلاقی قدروں کا ہیولا ہلہ بول کر میرے وجود معنوی پر بھی مسلط ہوگیا" (ص ۴۴) سادگی اور بیساختگی کی بجائے تکلف اور آورد ——— "دوسرے پانک فسادمیں لتھڑ گئے۔ (ص ۵۳) "ترقی پسندوں" کا انداز بیان، "اسلام پسند ادیبوں کو کسی عنوان زیب نہیں دیتا۔ " اور قیادت کسی فرد کا نام نہیں اور نہ ہی قیادت کوئی مقدس گروہ ہے" (صفحہ ۱۲۱) حیرت ہے کہ اسعد صاحب "نہ ہی" لکھتے ہیں۔

"چاند کا سلام" وقت کے ان تقاضوں کے عین مطابق ہے جن سے "اقامت دین" کی تحریک کو مدد ملتی ہے اور اخلاق و نیکی کو غذا بھی!

کفِ گلفروش جناب ایس۔ اے مہدی۔ دایم۔ اے علیگ، ضخامت ۱۴۴ صفحات (خوبصورت پائدار جلد، اعلیٰ کتاب رنگین) کتابت اور طباعت خوب سے خوب تر۔ ملنے کا پتہ:- سرفراز قومی پریس، نادان محل روڈ، لکھنؤ۔

جناب ایس' مہدی جس سال سے افریقہ میں مقیم ہیں' وہاں اُن کے دم سے اُردو شعروادب کی محفلیں بھی برپا ہوتی رہتی ہیں اور اس نواح میں اُن کی ذات اُردو کا مکتبہ و دبستان بنی ہوئی ہے، صاحب موصوف کی کوششوں سے "کل ایسٹ افریقہ" مشاعرہ منعقد ہوا لارڈ ہوک سابق گورنر کینیا نے اس مشاعرے کی صدارت فرمائی!

ایس۔ اے مہدی صاحب صرف موزوں طبع ہی نہیں ہیں بلکہ خوش فکر شاعر بھی ہیں' اپنے منصب عہدہ کی گوناگوں مصروفیات کے باوجود وہ شعروادب سے غیر متعلق نہیں ہونے پاتے' اس عالم میں بھی شعر گوئی کا سلسلہ جاری رہا، یہ کتاب (کفِ گلفروش) ان کے کلام کا مجموعہ ہے، جس میں غزلیں، نظمیں، سلام و منقبت اور رباعیات سبھی کچھ شامل ہیں۔

منتخب اشعار:-

حرف مطلب ہم زباں پر لائیں کیا وہ اگر پوچھیں بھی تو بتلائیں کیا
بند غم ہو یا ہو رہ قید حیات چار دن کی بات ہے گھبرائیں کیا

ان کی زلفیں روئے روشن پر پریشاں ہوگئیں بادلوں سے بجلیاں دست و گریباں ہوگئیں
وہ بھی شمعیں تھیں جو بزمِ عیش کی زینت بنیں وہ بھی شمعیں تھیں لحد پر جو فروزاں ہوگئیں
میں دیکھ چکا ہوں تری رفتار کا منظر کیا چیز ہے پھر فتنۂ دوراں مرے آگے
کون کسی کا جگ میں میت منہ دیکھے کی ساری پریت
سوزِ دروں ہے دل فروز، لذتِ درد جاں گداز آگ لگی لگی رہے کوئی اُسے بجھائے کیوں

اُسے سب علم ہے وہ حالِ دل سے خوب واقف ہے
اسی امید پر لب سے نہ حرفِ آرزو نکلا

ہر سو نگراں ہوں متجسس ہیں نگاہیں سائے تو بہت ہیں مگر انسان کہاں ہے
ہم کو تو چمن بندیٔ گلشن سے سروکار کیا اس سے غرض موسمِ گل ہے کہ خزاں ہے
اُن شہیدوں پہ میری جان نثار جن کو فکرِ حیات کچھ بھی نہ تھی
فصلِ گل میں کوئی دیوانوں کی حالت دیکھے دامن و جیب و گریباں پہ ہنسی آتی ہے
جنابِ شیخ تنہائی میں یوں پکڑے گئے پیتے لگایا تھا انہوں نے جام ہونٹوں کو ہم پہونچے

نہدی صاحب کی بعض نظمیں رواں اور شگفتہ ہیں، مذہب سے وہ خاص وابستگی رکھتے ہیں اُن کی نظموں میں مذہبی جذبہ نمایاں ہے۔

دوسرا رُخ :—

ایسے بھی اس جہاں میں گزرے ہیں کچھ شہید مقتول تا ابد رہا، قاتل نہیں رہا (ص ۱۹)

مصرعہ ثانی مبہم ہے۔

دیکھو تو اے نگاہِ شوق کیسا حجاب درمیاں جس کو شعورِ دید ہو رُخ سے نقاب اٹھائے کیوں (ص ۲۴)

"شعورِ دید" آخر کسے ہو؟ اس نے شعر میں ژولیدگی پیدا کر دی۔

ذرا اے میرے قسّامِ ازل انصاف فرمادے غمِ دنیا ہی آخر دل کا اپنے پاسباں کیوں ہو (ص ۲۸)

"میرے قسامِ ازل میں" "میرے" حشوِ قبیح ہے! مصرعہ ثانی میں جو بات کہی گئی ہے وہ عجیب ہے، "غمِ دنیا" دل کی پاسبانی کب کیا کرتا ہے؟

ان آنکھوں نے دیکھا ہے ترے حسن کا عالم کیا حور جناں ہوتی نازاں مرے آگے (ص ۳۵)

مصرعہ ثانی پھسپھسا اور بے مزہ!

اگر مقصود اس سے صرف خونِ دل رُلانا ہے تو پھر تصنیف ہی قلبِ بشر کی داستاں کیوں ہو (ص ۴۶)

"قلبِ بشر کی داستان" پھر اس کی "تصنیف" نری آورد اور غیر شاعرانہ اندازِ بیان!

حصارِ زہد کو ہاتھوں سے اپنے ڈھا ڈالیں یہ بھوکے بھیڑیئے عصمت کو بھی چبا ڈالیں (ص ۹۰)

"عصمت کا خون کیا جاتا ہے" —— "عصمت ریزی کی جاتی ہے" "عصمت کو چبا ڈالنا" نہ کانوں نے سنا اور نہ آنکھوں نے پڑھا۔

سینے میں دل میا پہلو میں رگ رگ میں جان ہے پہونچی ہے نیشِ ناز کی لذت کہاں کہاں (ص ۱۰۰)

"نیشِ ناز" کی ترکیب نامانوس و غریب ہے اور مصرعہ اولیٰ شعریت سے عاری ہے۔

تجھ کو اے کاش! پڑھے دلبر خط جاگ جائیں ترے مقدر، خط (ص ۱۰۶)

اس طرح لفظوں کے جوڑ دینے کو شاعری نہیں کہتے۔

دنیا ہے اگر جسم، محبت ہے روح ۔ اے روحِ محبت کے سڑانے والو (ص ۲۵)

رباعی کے چوتھے مصرعہ کو ذوقِ لطیف برداشت ہی نہیں کرسکتا! پھر "سڑنا" جسم کی صفت ہے، روح سے اس کا دور سے کا بھی کوئی تو اور واسطہ نہیں ہے۔

کم ظرف جو ہیں خود ہی چھلک جاتے ہیں ۔ توصیف خود اپنی ہی وہ بک جاتے ہیں (۵۵)

"توصیف بکنا" یہ کہاں کی زبان ہے!

اس رباعی کے یہ آخری دو مصرعے —

جلنا ہے تو شعلوں میں حسد کے نہ جلو ۔ دل شمع کا پیدا کرو جلنے کے لئے

کتنے حکمت آمیز ہیں۔

آہنگ ادب

از:- ناظر انصاری، ضخامت ۲۴۰ صفحات (مجلد) قیمت تین روپے پچاس پیسے

ملنے کا پتہ:- انصاری پبلیکیشنز متصل مسجد قمت پورہ جلگاؤں (مہاراشٹر)

جناب ناظر انصاری جلگانوی خوش گو شاعر اور مشاق ادیب و ناقد ہیں اُن کی پوری زندگی شعر و ادب کی خدمت میں گزری۔ اس کتاب میں اُن کے گیارہ مقالات شامل کئے گئے ہیں، صاحب موصوف نے نقد و تبصرہ میں اعتدال و توازن کا خاص خیال رکھا ہے اور جو بات کہی ہے سلیقہ سے کہی ہے۔

"سراج اورنگ آبادی" پر اُن کا مقالہ خاص طور سے پڑھنے کے قابل ہے، حیرت ہے کہ ڈھائی سو سال پہلے جب کہ اُردو زبان عالم طفولیت میں تھی، سراج نے اتنے صاف ستھرے شعر کہے ہیں۔

ہر ایک سرو ہے شیشہ ہر ایک گل ساغر	دیا بہار نے فرمائے اذنِ عام شراب
کہتے ہیں تری زلف کو دیکھ اہلِ شریعت	قربان ہے اس کفر پہ ایمان ہمارا
سب دیکھتے تھے چاند کو میں یار کی طرف	اس کی بھویں جدھر تھیں اُدھر کو ہلال تھا
سب پہ ہے کرم مجھ پہ ستم کیا ہے دو رنگی	دلدار کسی کا ہے، دل آزار کسی کا

حیرت ہے کہ صفحہ ۵۴ پر:—

بحرِ مواج فصاحت میں طلاطم کردوں

میں "تلاطم" کو "طلاطم" املا کیا گیا ہے — افسوس ہے یہ غلطی اب عام ہوتی جا رہی ہے۔

"آہنگ ادب" کوئی شک نہیں ایک دلچسپ کتاب ہے مضامین دقیق نہیں بلکے پھلکے ہیں اور فاضل ناقد نے اپنے خیالات کے اظہار میں سلجھاؤ کا خیال رکھا ہے۔

روحِ سخن

از:- پنڈت سوامی دیال بسوانی، ضخامت ۱۹۲ صفحات، قیمت تین روپے،

ملنے کا پتہ:- پنڈت سوامی دیال، کیتھی ٹولہ، نمبر ۵۲ بسواں، ضلع سیتاپور (یو۔پی۔انڈیا)

جناب پنڈت سوامی دیال بسوانی اردو زبان سے محبت کرتے ہیں اردو زبان کے معاملے میں متعصب نہیں حقیقت پسند اور انصاف دوست ہیں، پنڈت صاحب موصوف نے اس کتاب میں سینکڑوں مشاہیر شعرا کے ہم قافیہ اور ہم مضمون اشعار جمع کئے ہیں،

صیاد جذب یادِ وطن پر نظر نہ کر | تنکے قفس میں لپٹے ہوئے آشیاں کے ہیں (ص ۵۵)

چوری سے میں نے ے لیا بوسہ تو کیا کہیں | شرما کے مجھ سے کہتے ہیں تجھ پر کُچھ نہیں (ص ۷۷)

یہ سطحی اشعار بھی انتخاب میں آگئے ہیں۔

"زنداں ہونا" — میں عزیز لکھنوی کی غزل کا یہ مشہور مطلع —

دیکھ کر ہر در و دیوار کو حیراں ہونا | وہ مرا پہلے پہل داخل زنداں ہونا

"پشیماں ہونا" — میں جگر مرادآبادی کا یہ شعر —

حشر کے دن وہ گنہگار نہ بخشا جائے | جس نے دیکھا تری آنکھوں کا پشیماں ہونا

ضرور آنا چاہیے تھا۔

اونچے درجے کے اربابِ قلم نے اس گلدستہ (ردیف انتخاب) کی تعریف کی ہے دو ہزار سے زیادہ اشعار کا انتخاب اس کتاب میں شامل ہے پنڈت سوامی دیال صاحب کی محنت قابلِ داد ہے۔

لیل و نہار ایک نئی ڈائری

پیش کش:- اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، قیمت سات روپے ۵۰ پیسے

ملنے کا پتہ:- اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ۱۳-ای، شاہ عالم مارکیٹ لاہور (مغربی پاکستان)

۱۲- بیت المکرم (پہلی منزل) ڈھاکہ (مشرقی پاکستان)

اسلامک پبلیکیشنز کتابوں کی اشاعت کا ایک قابل اعتماد دینی ادارہ ہے، جو کئی سال سے دینی، اخلاقی اور علمی کتابوں کی اشاعت کا کاروبار اسلامی خدمت اور دینی فرض و ضرورت سمجھ کر انجام دے رہا ہے گزشتہ سال (۶۸ء) اس ادارے نے "لیل و نہار" کے نام سے ایک ڈائری مرتب و شائع کی تھی جو توقع سے زیادہ مقبول ہوئی ۱۹۶۹ء کے لئے ادارہ مذکور نے اللہ یاد حسین و بہتر انداز پر ڈائری مرتب کی ہے۔

شروع میں دنیائے اسلام کا رنگین نقشہ ہے پھر ۱۹۶۸ء، ۱۹۶۹ء، ۱۹۷۰ء کی جنتریاں اور ۸۹-۱۳۸۸ھ کی تقویم ہے اس کے بعد اوقات نماز سحر و افطار اور فہرست تعطیلات ہے پھر شرح ڈاک اور ضروری ہدایات۔ دیگر ممالک کے سکوں کی قیمت پاکستانی روپے سے شرح تبادلہ، شرح کورٹ فیس مغربی پاکستان۔ شرح کورٹ فیس مشرقی پاکستان۔ پوری تنخواہ معلوم کرنے کا جدول۔ دنیا میں مسلمانوں کی تعداد۔ آزاد مسلم ممالک۔ مسلم ممالک کے سربراہ۔ اسلامی ممالک کے بڑے بڑے شہر۔ ہماری تاریخ کے اہم واقعات ضروری پیمانے۔ اوقات جہاں مسنون دعائیں (عربی متن، ترجمہ کے ساتھ) درج ہیں؛ ڈائری کے ہر صفحہ کا سرنامہ قرآن کی کوئی آیت، حدیث شریف، اکابر دین کے کسی کلمۂ حکمت یا اخلاقی شعر سے مزین ہے۔ ہر صفحہ پر انگریزی، قمری اور ہندی تاریخیں دن کے نام کے ساتھ نمایاں طور پر درج کی گئی ہیں۔

"لیل و نہار" میں "عید الاضحیٰ" روزہ اور عید الفطر کا بیان بھی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ حجۃ الوداع۔ تذکار باطل امام حسین کی نظر میں، اکابر دین کی دعائیں بھی شامل کی گئی ہیں، پوری ڈائری صحیفۂ دین و اخلاق ہے — جہاں تک کتابت و طباعت اور کاغذ کا تعلق ہے ہر چیز انتہائی حسین اور جاذبِ نظر، ڈائری کا سرورق (COVER) دیکھ کر ہی آنکھوں میں روشنی آجاتی ہے۔

یہ ڈائری (لیل و نہار) دین پسندوں کے جمالیاتی ذوق، خوش سلیقگی، نفاستِ طبع اور دینی لگن کی عین شہادت ہے، زاویۂ نگاہ دینی اور اسلامی ہو تو تجارت بھی عبادت بن جاتی ہے!

قیمت چار روپے ۵۰ پیسے

(علاوہ محصولڈاک)

مکتبہ ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

رضوی برادرز لمیٹڈ

کراچی ـــــ لاہور ـــــ ڈھاکہ

COTTON YARN
CHEMICALS
COMPOUNDS
HOSIERY
SUGAR
TEXTILES
SILK & COTTON
QUALITY REIGNS
SUPREME WITH US

مارچ ۱۹۶۹ء

ماہنامہ فاران کراچی

شمارہ :- ۱۲ جلد :- ۲۰

ایڈیٹر :- ماہر القادری

ترتیب

سالانہ چندہ :- ۷ روپے ——— فی پرچہ :- ۶۲ پیسے

پبلشر :- ماہر القادری

دفتر :- ماہنامہ فاران ۔ کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

باہتمام مستفیض احمد صدیقی پبلشر ماہر القادری نے انٹرنیشنل پریس کراچی میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

پاکستان کے قیام کے بعد ہی سے جماعتِ اسلامی نے اس ملک میں "اسلامی نظام" برپا کرنے کے لئے جد وجہد کی ہے۔ جماعت کی تمام سرگرمیوں، کوششوں اور ایثار و قربانی کا یہی مرکز اور موضوع رہا ہے کہ پاکستان کا معاشرہ، اسلامی اخلاق کی بنیاد پر اور یہاں کا نظام حکومت کتاب وسنت کی مقدس اساس پر قائم و استوار ہو۔ جماعت کے اس مطالبہ، کوشش اور جد وجہد میں ذرہ برابر تبدیلی پیدا ہوئی اور نہ تعطل واقع ہوا، جماعت پر بڑے سخت اور نازک وقت آئے ہیں مگر وہ شدید سے شدید پابندیوں کے زمانے میں بھی کلمۂ حق بلند کرتی رہی ہے، وہ طلبا ہوں وکلا ہوں دفتر کے ملازمین ہوں، اہلِ قلم اور صنعت کار ہوں، جہاں جہاں جماعتِ اسلامی کی آواز پہونچی ہے وہاں عوام و خواص اللہ تعالیٰ کے فضل سے دین کے قریب ہوئے ہیں اور دینی احساسات میں کسی نہ کسی حد تک بیداری ہی پیدا ہوئی ہے۔

جماعت جتنی "دینی تنظیم" پاکستان بنتے وقت تھی اُتنی ہی "دینی تنظیم" اکیس سال کی مدت گزر جانے کے بعد بھی ہے اُس کے ارکان کی انفرادی زندگیوں اور اجتماعی کوششوں پر آج بھی دین کا غلبہ ہے! جس زمانہ میں جماعت اسلامی کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا تھا۔ اُس دورِ ابتلا میں بھی جماعت نے درسِ حدیث و قرآن کے ذریعہ حق کی تبلیغ کی ہے اور اپنی استطاعت کی حد تک معاشرے اور تعمیرِ اخلاق کی تبلیغ کے درمیان تعطل اور فترت پیدا نہیں ہونے دی۔

جماعتِ اسلامی "سیاست و حکومت" کو دنیا داری کا کام نہیں سمجھتی، وہ "دین بے سیاست" اور "سیاست بے دین" دونوں کو غلط سمجھتی ہے! جماعت کی نگاہ میں "حکومت" دین کے غلبہ کا موثر ذریعہ ہے اور حکومت ہی "امر بالمعروف" اور "نہی عن المنکر" کے اجتماعی فریضہ کو بہتر طور پر ادا کر سکتی ہے! یعنی جن چیزوں کو کتاب وسنت میں "منکر" کہا گیا ہے اُن کو حکومت کا قانون و دستور جرم قرار دے اور جن پر "معروف" کا اطلاق ہوتا ہے، اُن کو قائم کرنے کے لئے حکومت اپنے تمام وسائل و ذرائع کو کام میں لائے اس طرح ملک کے معاشرے کو زیادہ سے زیادہ پاکیزگی اور طہارت میسر آسکتی ہے۔

پاکستان میں غالب اکثریت مسلمانوں کی ہے اس لئے جماعتِ اسلامی نے اللہ کے دین کو عملاً برپا کرنے کے لئے "سیاست" میں حصہ لیا، اُسے اسمبلیوں کے انتخابات سے لے کر سیاسی پارٹیوں سے تعاون تک کے مراحل سے گزرنا پڑا، ان مراحل میں جلسے جلوس، پریس کانفرنسیں، استقبالئے، پوسٹر، جھنڈیاں، بینرز ان تمام مظاہر سے سابقہ پڑا، ان مظاہر کو کوئی چاہے تو "کرہات" اور "ہنگامے" کہہ سکتا ہے، لیکن اس راہ میں یہ سب کچھ ناگزیر تھا، کسی بڑے اور اچھے مقصد کے حصول کے لئے بعض اوقات بعض "کرہات"

کو بھی بادلِ ناخواستہ گوارا کرنا پڑتا ہے! جس طرح پاسپورٹ کے لئے "نذرانہ" اور بیت المال کی رقم "بنکوں" میں جمع کرنے کے "مکروہات" ہیں، جن سے مفر دشوار بلکہ ناممکن ہے۔

جماعتِ اسلامی کے ارکان سیاست کے ان ہنگاموں میں بھی اللہ تعالیٰ کے فضل سے دینی ارکان و فرائض کی پابندی اور نیک اعمال میں مستعد رہے ہیں، اور اخلاق و تقویٰ اور دیانت و صداقت کے تقاضوں سے غافل نہیں رہے، جماعت اسلامی کے لوگ انسان ہی ہیں فرشتے نہیں ہیں اور انسانوں سے غلطیاں بھی سرزد ہوتی رہتی ہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ جماعت اسلامی پر ہر دور میں تقویٰ کا غلبہ رہا ہے اور اس کی جدوجہد اور سرگرمیوں سے دین کو اور ملک و ملت کو فائدہ پہنچا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ جماعتِ اسلامی کے ارکان کو سیاسی سرگرمیوں نے "منکرات" میں مبتلا کر دیا ہے اُن کی روزی کے ذرائع پہلے کی طرح حلال و پاکیزہ نہیں رہے یا لالچ اور مالی منفعت نے اُن کے کردار میں لچک یا جھکاؤ پیدا کر دیا ہے۔ اُن کی زندگیوں میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے اخلاق و نیکی ہی جھلکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، اور اُن سے مل کر آدمی بدیہی طور پر محسوس کرتا ہے کہ ضعفِ ایمان اور ضعفِ عمل کے اس دور میں خدا کے یہ نیک بندے اپنے خونِ جگر سے اخلاق و صداقت کی شمع کو روشن کئے ہوئے ہیں۔

اس دور میں کچھ خاک نشینوں کی بدولت
باقی ابھی اسلام کی عظمت کے نشاں ہیں

اور انشاء اللہ قیامت تک باقی رہیں گے کہ اسلام ہی ازلی و ابدی حقیقت ہے اور اسی دینِ حق کے سہارے نظامِ کائنات اللہ تعالیٰ کے حکم سے قائم ہے۔

اس تمہید کی ضرورت اس لئے محسوس کی گئی کہ حلقہ "تدبرِ قرآن" کے ناظمِ اعلیٰ اور مجلہ "میثاق" (لاہور) کے فاضل مدیر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے "میثاق" میں پاکستان کے سیاسی حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "جماعتِ اسلامی" کی دینی حیثیت ختم ہو چکی ...... ! "جماعتِ اسلامی کی دشمنی اور بغض و عداوت نے اس شخص کے چہرے ـــــــ کی طرح اس کے دل کو بھی سیاہ بنا دیا ہے"! جماعت کے ساتھ ان صاحب کا برتاؤ غیر عادلانہ بلکہ ظالمانہ اور سفاکانہ ہے یہ بہانے جماعت اسلامی کی تخریب اور تباہی کے درپے ہیں۔

ہم اس قسم کے سخت جملے لکھنے کے عادی نہیں ہیں، مگر کیا کیا جائے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی روش نے ہمیں مجبور کر دیا۔

نسبت کلوخ انداز را پاداش سنگ است

جماعتِ اسلامی کے خلاف ایک کتاب چھپوا کر بھی ڈاکٹر صاحب کے بغض و عداوت کا جہنم سرد نہیں ہوا، جماعت کو نیچا دکھانے اور عوام کی نگاہ میں اُسے ذلیل و رسوا کرنے اور بے وقعت ٹھہرانے کی مہم ان صاحب نے جاری کر رکھی ہے، جماعت کو بدنام کرنے اور اس پر کیچڑ اچھالنے کا کوئی موقع ڈاکٹر صاحب ہاتھ سے نہیں جانے دیتے! جماعت کی مخالفت بلکہ تذلیل اور اس کے امیر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تحقیر کو صاحب موصوف نے اپنا "مشن" بنا لیا ہے، اس گھناؤنے کام کو وہ "ثواب" سمجھ کر انجام دے رہے ہیں!

ایک طرف ڈاکٹر صاحب تزکیہ اخلاق اور تطہیر نفس کے دعویدار ہیں۔ "تدبرِ قرآن" اُن کے فکر و خیال کا موضوع ہے، دوسری طرف جماعتِ اسلامی کی دشمنی نے ان کو اس گراوٹ تک پہنچا دیا ہے کہ اُن کے خوب و ناخوب اور حق و ناحق کا معیار "جماعت کی دشمنی" بن کر رہ گیا ہے۔ بغض و عداوت کی حد ہو گئی۔ "ترجمان القرآن" میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے متجددانہ بلکہ ملحدانہ افکار پر تنقید کی جاتی ہے۔ تو ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی "جماعت دشمنی" فضل الرحمٰن صاحب کی مدافعت و تائید بلکہ مدح و توصیف کا پارٹ ادا

رتی ہے !

ہم نے اوپر جو کچھ کہا ہے پوری ذمہ داری اور خدا خوفی کے ساتھ کہا ہے اس میں نہ کسی پر تہمت جوڑی ہے اور نہ واقعات بیان کرنے میں مبالغہ اور حاشیہ آرائی کی ہے! جماعتِ اسلامی کے پرچے اور ماہنامہ "میثاق" کے فائل ہم کسی ثالثی بورڈ کے امنے رکھنے کے لئے تیار ہیں تاکہ بورڈ فیصلہ دے سکے کہ زیادتی کس نے کی اور کس مقدار میں کی اور اس نزاع میں پہل کس کی طرف ے ہوئی! اور اب تک کون نیش زنی کئے جا رہا ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے یہ جو فرمایا ہے کہ جماعت اسلامی کی دینی حیثیت ختم ہو چکی ——— آخر اُن کے مشاہدہ تجربہ یا اطلاع کا ماخذ کیا ہے! جماعت اسلامی کے ارکان کیا مسجدوں میں امامت کیا کرتے تھے، جس سے اُن کو مسلمانوں نے ہٹا دیا ہے، جماعت کے یہاں کوئی دارالافتا قائم کیا تھا، جہاں اب عوام فتوی پوچھنے اور شرعی احکام معلوم کرنے کے لئے رجوع نہیں کرتے، جماعتِ اسلامی نے دینی لٹریچر کی بجائے کیا حسن و عشق کے افسانے اور رومانی ناول چھاپنا شروع کر دئے ہیں۔ اسلامی نظام کے قیام کے سلسلہ میں جماعتِ اسلامی نے کیا اپنی پالیسی بدل دی ہے! آخر جماعت کے کس رخ، پروگرام اور عمل کو دیکھ کر اسرار احمد صاحب نے یہ حکم لگایا کہ جماعت کی دینی حیثیت ختم ہو گئی ——— کوئی سبب! کوئی وجہ، کوئی قرینہ! اللہ تعالیٰ کے فضل سے جماعت کی دینی حیثیت بھی قائم ہے اور جماعت بھی زندہ و پائندہ ہے' ہاں! جماعت کی دشمنی نے ڈاکٹر صاحب کو آخرت کی جوابدہی سے غافل بنا دیا ہے' "حلقۂ تدبر قرآن" کے مشورہ سے جماعتِ اسلامی کے توڑ پر جس "جماعت" کی تشکیل کی گئی تھی، اس کے منشور تک میں جماعت اسلامی کی دشمنی نمایاں طور پر جھلک رہی تھی! پھر خود ہی معصوم بن کر بغض و عداوت کی اس سیاہی کو دھونے کا ا...ن بھی فرمایا گیا کاش! یہ بزرگوار جماعت کی دشمنی کی سیاہی اپنے دلوں سے دھو سکتے!

لفظوں میں بہت کچھ لچک اور جاذبیت ہوتی ہے' کسی کو بدنام کرنے کے لئے استدلال کی بازی گری بھی کی جا سکتی ہے، مگر اللہ تعالیٰ سے نیتوں کا حال نہیں چھپ سکتا۔ دین و اخلاق کے اس پُرآشوب دور میں جماعتِ اسلامی کی جدوجہد سے خیر ہی خیر ہو رہا ہے۔ اُس سے جو لوگ متاثر ہوتے ہیں وہ دین سے دور نہیں ہوتے دین کے قریب ہی آتے ہیں، ہزاروں نہیں لاکھوں نوجوانوں کی زندگیوں میں جماعت اسلامی نے دینی انقلاب پیدا کیا ہے' ایسی خیر پسند جماعت کی تباہی و بربادی اور ذلت و رسوائی کی جو ناپاک مہم ڈاکٹر اسرار احمد نے شروع کر رکھی ہے' کیا "تدبر قرآن" اس جرم کی تلافی کے لئے آخرت میں کافی ہوگا اور قرآن کریم پر ڈاکٹر صاحب کے "مواعظِ حسنہ" اُن کے اس گناہ کا کفارہ بن سکیں گے!

جمہوریت اور عوام

جہاں تک جماعتِ اسلامی کے سیاست میں حصہ لینے کا تعلق ہے' تو اس کی یہ سرگرمیاں بھی دین ہی کی خیر خواہی کے لئے ہیں۔ جماعت نے "اقامتِ دین" کی خاطر خود کو اس پریشانی اور خطرے میں ڈالا ہے اور ہر طرح کی قربانیاں دی ہیں' ورنہ وہ بھی اس ابتلاء سے بے تعلق رہ کر دینی مدارس کے قیام، مذہبی جلسوں میں وعظ و تبلیغ اور دینی کتابوں کی تصنیف و تالیف تک اپنی جدوجہد کو محدود رکھ سکتی تھی۔ اس روش پر کام کرنے سے جماعت کے لئے کسی پریشانی اور خطرے کی نوبت ہی نہ آتی! مگر جماعت نے "اقامتِ دین" کے لئے سکون و اطمینان اور بے خطر زندگی پر "عزیمت" کو ترجیح دی! جمہوریت کے بحال کرنے کی جدوجہد بھی اسی لئے ہے کہ اس سے "اقامتِ دین" کیلئے راہ کھلے گی، زبان و قلم کے ذریعہ آزادی کے ساتھ حق بات عوام تک پہونچائی جا سکے گی! پاکستان میں مسلمانوں کی اکثریت غالب ابھی تک اللہ تعالیٰ کے فضل سے "دین پسند" ہے۔ دینی جماعتیں اور دین پسند عناصر اگر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں تو تجدد، لادینیت اور اشتراکیت کی شورش پر غلبہ پایا جا سکتا ہے!

جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو وہاں "اسلامی حکومت" کے قیام کے لئے جدوجہد کرنا ہی چاہئے یعنی مسلمانوں کے ایسے نمائندوں کے ہاتھوں میں زمام حکومت آنے جو "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دے سکیں! اس مقدس مقصد کے حصول کے لئے جماعت ہر ممکنہ تدبیر سے کام لے رہی ہے! اگر کوئی شخص جماعت اسلامی کے بارے میں یہ سوءظن رکھتا ہے کہ جماعت اقتدار کی خواہش رکھتی ہے تو وہ جماعت کے مزاج ہی سے واقف نہیں ہے! جماعت اسلامی کی پوری تاریخ اس کی شاہد ہے کہ دوسری سیاسی پارٹیوں کی طرح جماعت اسلامی میں کسی رکن نے کسی عہدے کے لئے کبھی خواہش، کنویسنگ یا جدوجہد نہیں کی، "اقتدار" اگر جماعت کا مطمح نظر ہوتا تو پاکستان کی حکومتوں میں اُسے وزارتوں اور دوسرے بڑے عہدوں کا ملنا اور طرح طرح کے مالی مفاد حاصل کرنا نہ تھا۔ مگر جماعت اسلامی حق گوئی کی پاداش میں ہر دورِ حکومت میں معتوب ہی رہی ہے۔

سیاست وجمہوریت اور حکومت کے کارکن اگر خیر پسند اور انسانیت دوست ہوں تو جمہوریت اور حکومت عوام کے لئے رحمت ثابت ہوتی ہیں اور اگر اُن کے چلانے والے خود غرض، لالچی اور بے کردار ہوں تو جمہوریت اور حکومت ملک وملت کے لئے عذاب بھی بن جاتی ہیں، جماعت اسلامی کی یہی کوشش ہے کہ پاکستان میں جمہوریت عوام کے لئے خیر کا سبب بن سکے، آزادیٔ رائے کلمۂ باطل کے لئے نہیں، کلمۂ حق ہی کے لئے استعمال ہو۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ کلمۂ حق کہنے کے جرم میں جابر حکومتوں کے ظلم وستم ہی کا نشانہ نہیں بننا پڑتا بلکہ بعض اوقات کلمۂ حق بلند کرنے والوں کو عوام کی طرف سے بھی گالیاں، کالی جھنڈیاں، مردہ باد کے نعرے بلکہ پتھر تک ملتے ہیں خدا نہ کرے کہ پاکستان میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں اور انشاء اللہ نہیں ہوں گے! مگر کبھی ہو گئے تو جماعت اسلامی سے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ عوام کے سامنے بھی کسی خوف کے بغیر کلمۂ حق کہنے کا فریضہ انجام دے گی۔

عوام اپنی بھلائی کے دشمن نہیں ہوا کرتے، اُن کے فیصلہ اور رائے کے خلاف طاقت کا استعمال بڑا خطرناک ثابت ہوتا ہے اور تشدد کے عمل اور ردعمل کی شدت ملک کے امن وامان کو تباہ کر دیتی ہے! مگر اہل فہم ودانش اس پر بھی نگاہ رکھتے ہیں بلکہ پورے خلوص کے ساتھ سوچتے ہیں کہ عوام کے مطالبہ کی بنیاد اور اس کے محرکات کیا ہیں! مثلاً غیر منقسم ہندوستان میں عوام کا مطالبہ انگریزی حکومت کا خاتمہ اور ملک کی آزادی تھا اور یہ بالکل جائز مطالبہ تھا، اس کی ہر طرف سے تائید کی گئی! یہاں تک کہ انگریزوں کو بوریا بستر باندھ کر ہندوستان سے رخصت ہو جانا پڑا، مگر ہندوستان کی آزادی کے بعد اب جو وہاں کی خاصی بڑی تعداد میں ہندو آبادی مسلمانانِ ہند کے ہندو تہذیب میں جذب ہونے یعنی مرتد ہو جانے ورنہ پھر پاکستان چلے جانا کا مطالبہ کر رہی ہے یہ مطالبہ انسانیت کے تمام اخلاقی اصولوں کے بھی منافی ہے' یہ مطالبہ اسی کا مستحق ہے کہ اسے سختی کے ساتھ دبا دیا جائے! اگر ہندوستان میں حالات کا رخ یہ ہے کہ کوئی والکر جو علانیہ مسلمانوں کے قتل وغارت گری پر ہندوستان کے ہندو عوام کو اُبھارتا ہے اُسے وہاں کی حکومت ٹوکنے تک کی ہمت نہیں کر سکتی! پنڈت جواہر لال نہرو ہندوستان کی تحریک آزادی کے ہیرو تھے۔ انگریزی حکومت کے دور میں عوام اُن کی راہ میں پیچ پیچ آنکھیں بچھاتے تھے۔ مگر جب وہ وزیر اعظم ہوئے تو ایک ایسا دور بھی آیا کہ بعض مقامات پر عوام نے سیاہ جھنڈیوں اور "مردہ باد" کے نعروں سے اُن کا استقبال کیا، اور پٹنہ یونیورسٹی میں تو طلبا نے اُن کا کرتہ پھاڑ ڈالا تھا۔

حکومت وسیاست اور جمہوریت ہی نہیں مذہب کی تاریخ بتاتی ہے کہ فن حدیث کے امام (غالباً حضرت ترمذی رحمۃ اللہ علیہ) کا واقعہ ہے کہ انہوں نے جب یہ کہا کہ کوئی (نبی یا رسول) اللہ تعالیٰ کا ہم نشین نہیں ہو سکتا، تو لوگوں نے غصہ میں آکر

ی کی قیام گاہ کو اینٹ پتھروں سے بھر دیا۔

حکومت و سیاست اور عوام کے معاملات اور نفسیات کی بڑی نزاکتیں اور باریکیاں ہیں، مگر کیا کیا جائے رہنا تو
دنیا میں ہے، آدمی کے کردار اور سیرت و اخلاق اور بصیرت و فراست کا امتحان تو انہی نزاکتوں اور خطروں میں ہوتا ہے،
ں چیز حق کو حق سمجھ کر اس پر جم جانا اور اس کے لئے جد و جہد کرنا ہے، ایک مسلمان کا نصب العین اور مطمح نظر اللہ تعالیٰ
رضا کا حصول ہونا چاہئے، پس پھر چاہے اس کے گلے کو پھولوں کے گجرے نصیب ہوں یا جوتوں کے ہار، عوام و خواص کی داد و
ستائش میسر آئے یا ان کی ملامت اور گالیاں، پھول ملیں یا زخم وہ شخص ہر حال میں کامیاب ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک
ندیدہ ہے!

قیامت میں سزا اور جزا کا فیصلہ اس پر نہیں ہوگا کہ کس شخص کے جلوس میں کتنے لاکھ آدمی تھے، اور کس کے کتنے بہت سے
اخبارات میں چھپے تھے، وہاں نیت اور عمل کے اخلاص پر عذاب و ثواب کا فیصلہ ہوگا! ہاں! یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے
ں کو اس دنیا میں بھی قبول عام اور شہرت و ہر دلعزیزی میسر آئے اور آخرت میں بھی اس کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہو۔

اعت اسلامی نے کیا کیا

جماعت اسلامی گزشتہ دس برس کے زمانے میں ہر قسم کی پابندی اور خطرات کے باوجود
اعلاء کلمۃ الحق کے عظیم ترین فریضہ کو ادا کرتی رہی ہے، غیر مشروط جنگ بندی ہو، معاہدہ
شقند ہو، عائلی قوانین ہوں، خاندانی منصوبہ بندی ہو، صدارتی نظام ہو یا اور دوسرے جابرانہ قوانین اور لادینی نظریئے ہوں،
سلامی سوشلزم کا نعرہ ہو، مخلوط تعلیم، درسگاہوں میں رقص و سرود کے جشن ہوں،.... غرض ہر مسئلہ میں اور ہر موقعہ
ماعت اسلامی نے اعلان حق کیا ہے، اس حق گوئی کی پاداش میں جماعت اسلامی کو پے درپے زخم اُٹھانے پڑے ہیں، وہ خلاف قانون
رار دی گئی ہے اور اس کا سب کچھ سرمایہ اور دفتروں کا سامان ضبط کر لیا گیا ہے، جب ہمارے نووارد لیڈر موجودہ حکومت
مروں میں تھے، اُس وقت جماعت اسلامی کے کتنے ہی ارکان جیل خانوں میں محبوس تھے، خود امیر جماعت مولانا مودودی کو کئی بار
ظربندی کی مصیبتیں اُٹھانی پڑیں، جماعت کے بعض ارکان پر تو ایک ایک وقت میں کئی کئی مقدمے قائم ہوئے ہیں وہ بے چارے پولیس
ھانوں، عدالتوں اور کچہریوں میں مہینوں بلکہ برسوں کھینچے کھینچے پھرے ہیں، یہ اس زمانے کا قصہ ہے، جب ایک لفظ "خبر" کے
پر بھی اخبارات میں مشکل ہی سے شائع ہوتا تھا اور جرأت کے ساتھ اعلانِ حق کرنے اور قربانی دینے والوں کا نہ تو عوام
ستقبال کر سکتے تھے، اور نہ جلوس نکال سکتے تھے، شدید دباؤ کے تحت عوام کو اظہار جذبات کا موقعہ ہی حاصل نہ تھا۔
گمنام قربانیاں وہی لوگ دے سکتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی سے صلہ کی اُمید نہ رکھتے ہوں!

اب سے چھ سال قبل لاہور میں جماعت اسلامی کے سالانہ اجلاس میں مولانا مودودی پر گولی چلائی گئی، غنڈوں نے
س کو درہم برہم کرنے کے لئے خیموں اور شامیانوں کی طنابیں کاٹ دیں۔ جلسہ گاہ کے ایک حصہ کو آگ لگانے کی کوشش کی
ئی، یہ تمام سخت مرحلے اور آزمائشیں جماعت پر گزر چکی ہیں، اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان مصائب اور شدائد میں
مت کے کسی رکن نے کمزوری نہیں دکھائی، اتنی طویل اور صبر آزما عزیمت و استقامت کی مثالیں موجودہ دور میں کم ہی ملتی ہیں!

فیلڈ مارشل صدر ایوب خاں کی کتاب (FRIENDS NOT MASTERS) پر مولانا مودودی کے
" ترجمان القرآن" ہی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس میں پوری جرأت، بے خوفی، دقتِ نظر اور بصیرت و حکمت کے
ھ تبصرہ کیا گیا، تبصرہ مذکور کتابی صورت میں چھپنے کے قابل ہے کہ یہ تبصرہ سیاسی بصیرت کے علاوہ زبان و ادب اور استدلال

کے اعتبار سے بھی فن تنقید کا شاہکار ہے ـــــــ غرض جماعت نے کسی نہ کسی عنوان سے آزادی وجمہوریت کی بحالی اور آمریت کے خلاف احتجاج کی تحریک کو جاری رکھا، اس میں غلام اور فترت واقع نہیں ہونے دی۔

جماعت اسلامی نے تقریباً ۱۹۵۰ء سے کر اب تک جلوس بھی نکالے ہیں۔ احتجاجی جلسے بھی منعقد کئے ہیں جس جلوس جماعت کا تعاون بھی حاصل رہا ہے، اُس جلوس میں کوئی ناشائستہ نعرہ نہیں لگایا گیا کسی کا پتلا نہیں جلایا گیا۔ کوئی غیر سنجیدہ حرکت نہیں کی گئی، عوام اور حکومت کی کسی عمارت، دفتر، دکان، موٹر کار اور بس وغیرہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا گیا!

اسلامی جمعیتہ طلبہ کے جلوس عوام نے دیکھے ہیں اور ان دین پسند نوجوانوں کی تنظیم، ثقاہت وسنجیدگی اور نظم پسندی کی تعریفیں کی ہیں۔ جوانی کو دیوانی کہا گیا ہے مگر اسلامی جمعیتہ طلبہ کے ارکان کی جوانیوں کو "ہوشمند" اور فرض شناس دیکھا گیا ہے۔

اب کیا کرنا ہے؟ پاکستان کی سالمیت ووحدت اور آپس کے تحفظ وبقا اور استحکام کے لئے ہر کوشش ہمارا دینی فرض ہے اس کا چپہ چپہ ہمارے لئے مسجد کی طرح مقدس ہے اور وہ اس لئے کہ یہ ملک اسلام کے نام پر بنا ہے اور یہاں اسلام کے غالب اور برپا ہونے کی توقع ہے، بحالی جمہوریت کی تحریک تمام جماعتوں کے درمیان اتحاد کی متقاضی ہے ـــــــ مگر ملک میں جن حالات کا ہم مشاہدہ کر رہے ہیں، اُن حالات وحقائق سے صرف نظر بھی ممکن نہیں ہے۔

پاکستان میں شروع ہی سے کر اب تک کسی حکومت نے بھی اسلامی نظام کو اپنانے اور برپا کرنے کی کوشش نہیں کی، اور موجودہ حکومت میں یہ خرابی اور زیادہ بڑھ گئی، چوہدری محمد علی صاحب کے دور حکومت میں البتہ ایسا دستور مرتب ہوا تھا جو نافذ ہو جاتا تو اس سے اسلام اور جمہوریت کے تقاضے خاصی حد تک پورے ہو سکتے تھے، مگر اُس دستور کا جو حشر ہوا وہ سب کو معلوم ہے ـــــــ!

پاکستان کی وحدت وسالمیت "اسلام" کے سہارے قائم ہے' اور اس ملک کے مشرق ومغرب میں اسلام ہی اتحاد پیدا کر سکتا ہے اور اب تک اللہ تعالیٰ کے فضل سے پاکستان کے تمام علاقے اسلامی اخوت کے سبب ایک دوسرے سے متحد ہیں، مربوط ہیں اور ایک درخت کی شاخوں کی طرح جڑے ہوئے ہیں، اور انشاءاللہ رہیں گے! (آمین)

ہماری یہ تمنائیں اور دعائیں اپنی جگہ مسلّم مگر پاکستان میں حکومتوں کا رویہ اسلامی نظام، اسلامی اقدار اور شریعت کے تقاضوں کے ساتھ بے پروائی اور بیگانگی کا رہا ہے، معاشرے کو اسلامی اخلاق پر اُستوار کرنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی، اسلام میں جن کو "منکرات" کہا گیا ہے، اُن پر کوئی قدغن نہیں "امر بالمعروف" کی سرے سے ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی، پاکستان کے معاشرے کی حالت اُس مریض جیسی ہے جسے نہ دوا دی جا رہی ہے اور نہ بدپرہیزی سے روکا جا رہا ہے! بلکہ بدپرہیزی کی حوصلہ افزائی ہو رہی ہے۔

اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مشرقی پاکستان میں ہندوؤں اور کمیونسٹوں کی سازش کی بدولت "علیحدگی" کے رجحانات اُبھر رہے ہیں، اُردو زبان سے شدید بیزاری اور نفرت اس خرابی کا پہلا قدم ہے، کمیونسٹ اشتراکیت کے علاوہ کسی ملک کو بھی ایک نظریہ، ایک زبان اور ایک تمدن وتہذیب پر جمع ہونا پسند ہی نہیں کر سکتے، زبانوں اور تہذیبوں کے نام پر علاقائی تعصبات کو اُبھار کر ملک میں تفریق پیدا کرنا اور کسی ایک نظریہ اور زبان پر متفق نہ ہونے دینا اُن کا مشن ہے! ملک میں جو لوگ متجددین اور مغرب زدہ ہیں اور اسلامی تہذیب اور دینی اخلاق کے تقاضوں پر مغربی تمدن

ترجیح دیتے ہیں ، وہ بھی اسلام کے مقابلہ میں کمیونسٹوں کی ہم نوائی کرتے ہیں ! وہ "جے سندھ" کا نعرہ ہو یا کسی دوسرے
لاقہ کی امتیازی اور جداگانہ خصوصیت کا تصور ہو ، یہ سب باتیں اسلام کی وحدت اور پاکستان کی سالمیت کے لئے مضرت
ں اور ملک و ملت کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے والی ہیں ۔

جمہوریت کی بحالی ، بالغ رائے دہی کی بنیاد پر انتخاب ، صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کا صدارتی انتخاب
ں حصہ نہ لینے کا اعلان ——— یہ تمام تبدیلیاں یقیناً عوام کی فتح سے تعبیر کی جانی چاہئیں مگر اب اس کی ضرورت ہے کہ
پاکستان کے تمام دینی عناصر اپنے فروعی اختلافات کو تہ کرکے رکھدیں اور "جمہوریت اور آزادی" کو پاکستان میں اسلام
پا اور نافذ کرنے کا ذریعہ بنائیں اور بنیان مرصوص کی طرح متحد اور متفق ہو جائیں !

جہاں تک "اسلام" کے نام کو استعمال کرنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کا تعلق ہے یہ کھیل تو ہر دور حکومت میں بڑی
تیاری کے ساتھ کھیلا جاتا رہا ہے آج بھی بعض لیڈر "اسلام" کا نام لے رہے ہیں ، مگر دیکھنا یہ ہے کہ خود ان کے نظریوں اور
ندگیوں میں اسلام کا عمل دخل کہاں تک ہے ؟

پاکستان کی تمام دینی جماعتوں کو کھل کر اعلان کر دینا چاہیئے کہ جمہوریت اور آزادی کی بحالی اور انقلاب حکومت قابل تبریک و
سرت مگر حقیقی مسرت اس وقت حاصل ہوگی جب اس کے نتیجہ میں اسلام عملاً نافذ و برپا ہوگا ! بارش سے بچنے کے لئے اگر
نالہ کی پناہ لینی پڑے ——— تو ! ؟

حالات یہ ہیں کہ طلباء کی نئی نسل کا رجحان "سوشلزم" کی طرف بڑھتا جا رہا ہے اس سیلاب کو حکمت و تدبر سے روکنے کی ضرورت
، مذہبی طبقے اگر دین پسند طلباء سے تعاون کریں تو یہ فتنہ بڑی حد تک دب سکتا ہے اور اس کو دبانے کا طریقہ تشدد ، مار دھاڑ اور چھیڑ چھاڑ
یں ، تبلیغ و موعظت ہے ! جو طلبا کمیونزم کی طرف مائل ہو رہے ہیں اس کا بہت بڑا سبب کمیونزم کا پروپیگنڈا ہے ، ان کے دلوں میں
سوشلزم اور کمیونزم کی اچھائیاں تحریر و تقریر کے ذریعہ اتاری گئی ہیں اس کا توڑ اسی طرح ممکن ہے کہ اسلام کی صداقتیں اور اس
، محاسن جو دین و دنیا کی بہتری اور فلاح کے ضامن ہیں ، نوجوانوں کو بتائے جائیں تاکہ ان کے ذہن و فکر اور دل و دماغ اسلام کو معیشت
قتصاد اور سیاست و حکومت کے نظام کی حیثیت سے بھی قبول کرلیں اور اس پر پوری طرح ایمان لے آئیں کہ دین و دنیا کی فلاح
رف اسلام کی پیروی سے وابستہ ہے ! اور یہ بھی بتایا جائے کہ اسلامی حکومت میں کوئی شخص ننگا ، بھوکا اور بے گھر نہیں رہ سکتا ! مزدور اور
کسانوں کے لئے اسلامی نظام حکومت رحمت ثابت ہوگا ۔

موجودہ حالات اور مستقبل میں جماعت اسلامی کی ذمہ داریاں اور زیادہ بڑھ گئی ہیں اور ساب الجمنوں اور زکاتوں کا کھیل اور رنگ
، اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ وہ ان داعیانِ حق و صداقت کو حال و مستقبل کے مسائل سے نمٹنے کی بصیرت اور عزیمت
طا فرمائے گا ، زمانہ کا دھارا اور وقت کا رخ چاہے کچھ بھی ہو جماعت اسلامی انتہائی مشکلوں اور خطروں میں گھر کر بھی اسلام کے
پرچم کو بلند رکھے گی ۔ (انشاء اللہ العزیز)

ماہر القادری
۲۳ فروری ۶۹ء

ابوالاسرار ترمزی اناوی
ایم اے (علیگ) جودھپور

نجم الثاقب!

مئی ۱۹۵۳ء میں جب سورج کی شعاعیں بلند ہوئیں تو انہوں نے ہلاری اور تین زنگ (HILLARY AND TENZIG) کو دنیا کے سب سے اونچے پہاڑ (ایورسٹ) کی چوٹی پر کھڑا پایا ٹھیک اسی جنوری ۱۹۶۹ء کے سورج نے غالب کو شہرت کی بلند ترین چوٹی پر دیکھا۔

غالب ایک عظیم فنکار تھے۔ شعرائے عالم کی (GALAXY) میں ان کا نام آتا ہے۔ فرزدق، لبید، متنبی (عربی) ہومر (یونانی)۔ عاکف (ترکی)۔ نظیری، حافظ، سعدی (فارسی) تلسی داس، سورداس (ہندی)۔ والمیکی، کالیداس (سنسکرت) شکسپیئر، ملٹن (انگریزی)۔ اقبال (اردو فارسی)۔ گوئٹے (جرمنی)۔ ٹیگور (بنگالی) کی طرح۔ غالب بھی "ایک ممتاز "نجم الثاقب" (SHINING STAR) ہیں!

لسانی مغائرت اجازت نہیں دیتی اور نہ قومی تعصب اس کو برداشت کر سکے گا ورنہ غالب کی ثروت افکار —— RICHNESS OF THOUGHTS اس امر کی مستحق و متقاضی ہے کہ اس کو انیسویں صدی کا سب سے بڑا شاعر کہا جائے کالی داس اور شیکسپیئر کے بارے میں علمائے ادب نے یہ فیصلہ کن رائے قائم کی ہے کہ کالیداس اور شیکسپیئر کے مرتبہ کا شاعر کسی قوم کے اندر اب تک نہیں پیدا ہوا۔ ہمیں اس سے اتفاق نہیں یہ دعویٰ ان کے عہد کے لئے اور ان کے عہد تک موزوں اور مناسب تھا۔ SHAKESPEARE (۱۶۱۶—۱۵۶۴) شیکسپیئر کو گذرے ہوئے ساڑھے تین سو برس ہو گئے اور کالیداس نے چندر گپت بکرماجیت کے زمانہ میں چیت کے مہینہ میں جنم لیا، اس بات کو دو ہزار سے بھی کچھ اوپر سال ہونے کو آئے اس امر کا اظہار ناگزیر ہے کہ یہ دونوں ادیب ڈرامہ نویس (DRAMATIST) زیادہ اور شاعر کم تھے اور اسی مماثلت کی بنا پر یہ جملہ مشہور و معروف ہوا ہے "KALIDAS IS THE SHAKESPEARE OF INDIA"۔ ان دونوں کی شہرت اور مقبولیت ڈرامہ نویسی کی مرہون منت ہے، غالب ان کے بعد ایک ترقی یافتہ دور میں پیدا ہوئے ان کے "عبقری ذہن" نے "عصر آفریں ادب" کو جنم دیا۔ کالیداس سنسکرت کے مسلمہ شاعر ضرور سہی لیکن تاریخ کے روایاتی میوزیم میں ان کی حیثیت ایک ممی (MUMMY) سے زیادہ نہیں رہ گئی ہے اس لئے کہ وہ ایک مردہ زبان کے شاعر ہیں۔

ایک انشاءپرداز نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں دو ہی الہامی کتابیں ہیں۔ ایک گیتا اور دوسری "کلیات غالب" اسی طرح ایک تبصرہ نگار نے یہ ریمارک دیا ہے ۔۔۔ "غالب اور تاج محل عہد مغلیہ کی دین ہیں" غالب ایک "اختراع پسند" ادیب شاعر تھے وہ ایجاد

تلاش کرتے تھے ان میں تمام شاعروں کی انفرادی خوبیاں جمع تھیں ۔
اقبال کا "مردِ مومن" ان کے کلام میں تو نظر آتا ہے لیکن کہیں کہیں وہ خود کیا نظر آتے ہیں اس سے ان کی فنکارانہ عظمت پر کوئی
نہیں آیا ۔ غالب نے اپنی کمزوریوں کا خود ہی اعتراف کیا ہے گو انہوں نے ان گنت گوناگوں جذبات کی ترجمانی کی ہے لیکن پھر بھی ان
عری بے "نصب العین" ہے اقبال کی طرح انہوں نے شاعری سے نظریۂ عقیدہ اور نصب العین کا کام نہیں لیا ۔ اقبال نے اپنی
ادبی قسط "ہمالیہ" کی صورت میں "بانگ درا" کو سپرد کی ہے غالب نے اپنے دیوان کی بسم اللہ اس مطلع سے کی ہے ؎

نقشِ فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا　　کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

حمد باری تعالیٰ کا عجب انداز اختیار کیا ہے اپنی ہیچ میرزو کی فنا پذیری اور خدا کی قدرت کاملہ کو ایک ہی شعر میں سمو دیا ہے ۔
غالب انگریزی نہ جانتے تھے ، اور نہ ہندوستان سے باہر گئے تھے ۔ پھر بھی براوننگ ۔ بائرن ، شیکسپیئر وغیرہ کے "نظریاتِ حیات"
ان کے کلام میں ملتی ہے غالب کا کلام نئی نئی عمدہ ترکیبوں سے معمور ہے مثلاً "اقبال زنجری" ۔ "کنگرۂ استغنا" ۔ "طعنۂ نایافت"
رسوائی" ۔ "شعلۂ آواز" ۔ "شیرازۂ مژگاں" ۔ "برگِ عافیت" وغیرہ وہ مشکل نویس تو تھے ہی ان کا تخلیقی سرمایہ ان کی غزلیں
غزلوں میں بھی ایسی عجیب و دلپذیر ترکیبیں ملتی ہیں جو کسی شاعر کی غزلوں میں تو کیا نظموں میں بھی نہیں ملتیں اور آج ان کو نثر میں عموماً
استعمال کیا جاتا ہے جیسے زوال آمادہ (READY TO DECLINE) "بہشت شمائل" (PARADISIAC)
غالب نے نفسیات و خصائلِ انسانی پر شعر کہتے ہیں کلام میں (ORIGINALITY) اور اختراعاتِ فائقہ کا سراغ ملتا
وہ محققانہ نظر رکھتے تھے یہ جملے ان کی مجتہدانہ صلاحیتوں کے آئینہ دار ہیں :-
"یہ نہ سمجھو کہ اگلے جو لکھ گئے وہ حق ہے کیا اس وقت آدمی احمق پیدا نہ ہوتے تھے ؟" (از مکتوب غالب بنام ہرگوپال تفتہ)
اقبال نے اس مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے ؎

اگر تقلید بودے شیوۂ خوب　　پیمبر ہم رہِ اجداد رفتے

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی　　رستہ بھی ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

ہے دونوں بیزار تھے غالب کی تقلید بیزاری اُن کے اس شعر ہی سے ظاہر ہے ۔

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں　　مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

ایک وہ بھی دور تھا کہ غالب کے اشعار مہمل سمجھے جاتے تھے اور وہ اپنے گلشنِ ناآفریدہ کے ایک نغمہ سنج بلبل تھے جس کا جذبہ
ن سازی" مخالف ماحول میں زبانِ حال سے یوں فریاد کرتا تھا ؎

ہوا مخالف و گل بے وفا و لالہ دو رنگ　　دریں چمن بچہ امید آشیاں بندم

سوفیان زمانہ ان کے طرز ادا ~~ (~~ زبان (STYLE) ~~ (LANGUAGE) اور اسلوبِ اظہار ——
MANNER OF PRESENTATIO پر اعتراضات کرتے تھے اور غالب تھے کہ مغلوب نہ ہوتے تھے اور ان کی تنقید کا
تسری جواب دیتے ہوئے نہ جھکتے تھے ایک ناقد نے ناشائستہ زبان استعمال کر کے ان پر کیچڑ اُچھالی لیکن غالب نے اُس کا نوٹس
(NOTICE) نہیں لیا ۔ شاگردوں نے کہا کہ آپ نے سب کو خاموش کر دیا ان صاحب کو کیوں جواب نہیں دیتے ؟ فرمایا "اگر گدھا لات مارے
تو اس کے لات نہیں ماری جاتی" یہ طرزِ عمل ان کے اعلیٰ اخلاق کی نشاندہی کرتا ہے ۔ انہوں نے جوابِ جاہلاں باشد خموشی کے اصول
عمل کیا جو آسمانی صحیفہ کی تعلیم کے عین مطابق ہے "وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا" (قرآن حکیم)

ۓ ماخوذ از ریڈینس دہلی (RADIANCE , DEHI)

[illegible] کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جاتا رہا ہے عوام کالانعام کا ہر دور کی سفاکیوں سے تواضع کی ہے اور انہوں نے اس کا جواب خیر خواہی سے دیا ہے ؎

یزید سفاھۃ و ازید حلماً
کعود زاد فی الاحراق طیباً

کئی صدی تک رومی اور خسرو اور بیسویں صدی عیسوی کے ربع اول کے بعد سے اب تک اقبال کے اشعار محفلوں کو گرماتے رہے اور ان کے کلام کے دوسری زبانوں میں ترجمے ہوتے رہے آج یہ مقبولیت غالب کو بھی نصیب ہوئی مگر سو برس کے بعد۔ دانشوران وقت ان کی طرف متوجہ ہوئے ان کے کلام کا مطالعہ "چشم کشا" (EYE OPENER) ثابت ہوا آخر زمانہ نے یہ سوال حل کر دیا کہ غالب کا شعر بالغ تھا یا ناشناسایان غالب کا؟

اقبال، حالی، اکبر اچھے مبلغ ہیں اور تینوں ایک ہی راہ کے رفیق ہیں میں اقبال کو "جبریل سخن"۔ اکبر کو "قندیل سخن" اور حالی کو "انجیل سخن" کہنا زیادہ پسند کرتا ہوں۔ حالی نے "یادگار غالب" لکھ کر نہ صرف حق شاگردی ادا کر دیا ہے بلکہ غالب کو زندہ جاوید بنا دیا ہے مگر یہ کیا ستم ظریفی ہے کہ انہوں نے غالب کو "حیوان ظریف" کہا ہے، مجھے تو اس "حیوان ظریف" میں "انسان شریف" نظر آتا ہے۔ ثبوت کے لئے مذکورہ بالا ایک ہی واقعہ کافی ہے۔

---

(۱) عبداللطیف اعظمی (جامعہ ملیہ دہلی)
(۲) ماہر القادری

مولانا آزاد مرحوم کا سفرِ عراق

"فاران" کو نکلے ہوئے بیس سال ہو رہے ہیں اس مدت میں ہم نے کم و بیش ڈھائی ہزار کتابوں اور رسالوں پر تنقید اور بہت سی شخصیتوں، تحریکوں اور مذاہب
مکاتیب وغیرہ پر تبصرہ کیا ہے، مگر نقد و تبصرہ میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہم نے کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی اور جس بات کو ہم نے حق اور قرینِ صواب
و انصاف سمجھا ہے اس کے اظہار میں لاگ لپیٹ کو روا نہیں رکھا!
کئی مہینے ہوئے "مکاتیب ابوالکلام آزاد" پر "فاران" میں تبصرہ کیا گیا تھا، اس سلسلہ میں جناب محترم عبداللطیف اعظمی نے
جامعہ ملیہ (دہلی) سے جو خطوط ارسال فرمائے ہیں، وہ پورے کے پورے شائع کئے جا رہے ہیں! ہر شخص کو کسی متنازعہ مسئلہ میں اپنی یا
کسی دوسرے شخص کی مدافعت کا حق حاصل ہے!
ہم اُن لوگوں میں سے نہیں ہیں، جو اپنے کمزور موقف کی پردہ پوشی کے لئے طرفِ ثانی کی قوی دلیلوں کو نظر انداز کرنے کی کوشش
کرتے ہیں ——— (م۔ق)

جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵
۱۰ دسمبر ۶۸ء

(۱)

محترمی، السلام علیکم

ابھی ابھی فاران (بابت ماہ دسمبر ۶۸ء) موصول ہوا، ملتے ہی حسبِ معمول پورے رسالے پر ایک نظر ڈال لی۔ محمد اقبال سلمان صاحب
کا مراسلہ اور آپ کا جواب اور "مکاتیب ابوالکلام آزاد" پر آپ کا تبصرہ، دونوں میرے ذوق کے تھے۔ اس لئے ان کو غور سے پڑھا ان میں کچھ
باتیں ایسی تھیں، جن کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں، اس لئے فوراً لکھنے کا ارادہ کر لیا۔ ظاہر ہے اس روا روی میں جو چیز لکھی جائے گی
وہ مفصل اور ٹھوس نہیں ہوگی۔ مگر میں اس کمزوری سے ڈرتا ہوں کہ جو چیز ٹل جاتی ہے، اکثر ہمیشہ کے لئے ٹل جاتی ہے اس لئے اسی وقت لکھنا
ضروری سمجھا۔ علاوہ ازیں حبیب احمد صدیقی صاحب کے مضمون مطبوعہ فاران بابت ماہ اگست ۶۸ء کے جواب سے ابھی حال میں فارغ ہوا ہوں
اس لئے اس وقت جو کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں اس کے لئے ذہن حاضر ہے اور چند ضروری کتابیں بھی میز پر موجود ہیں۔ ایک معمولی سا سبب اور
دوپہر کا وقت ہے، روزہ بہلانے کے لئے کوئی دلچسپ مشغلہ چاہئے تھا، مراسلہ لکھنا میرے لئے دلچسپ ترین مشغلہ ہے۔
میری ذاتی رائے ہے کہ آپ زبان کے بارے میں جتنی سختی روا رکھتے ہیں وہ موجودہ حالات اور رجحانات کو دیکھتے ہوئے مناسب نہیں
۔ آجکل عام طور پر اور نوجوانوں کی تحریروں میں خاص طور پر جس بے راہ روی یا ہر پابندی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے جس جذبے کا
اظہار کیا جاتا ہے اس سے میں بالکل متفق نہیں ہوں، مگر بیچ کی ایک راہ یہ ہو سکتی ہے کہ ایک خاص معیار کے شاعروں اور ادیبوں کو آزادی دی

جائے کہ وہ اپنی پسند کے مطابق زبان و بیان میں نئی راہیں اختیار کرسکتے ہیں۔ میں نے شعراء اور نثر نگاروں کی ایک ایک فہرست تیار کی ہے، جن کو قدماء سے انحراف کرنے کا اختیار حاصل ہونا چاہیے۔ ان میں مولانا ابوالکلام آزاد کے علاوہ مولوی عبدالحق، پروفیسر رشید احمد صدیقی اور جعفر علی خاں اثر جیسے ادیب اور شاعر شامل ہیں۔ آپ نے اقبال سلمان صاحب کے ایک اعتراض کے جواب میں چکبست کی نثر سے سند پیش کرکے، یہ الفاظ دے کر میرے اس خیال کی تائید کی ہے مگر تعجب اس پر ہے کہ ایک طرف چکبست کی نثر سے استشہاد کرتے ہیں اور دوسری طرف مولانا آزاد کی زبان پر اعتراض کرتے ہیں جب کہ دونوں کے علمی و ادبی مرتبہ اور انشاء پردازی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

آپ نے اقبال سلمان صاحب کے اعتراضوں کے جو جوابات دئے ہیں اس میں شبہ نہیں کہ بیشتر معقول اور صحیح ہیں مگر بعض جوابات پر آپ غور کریں گے تو غالباً محسوس کریں گے کہ مولانا آزاد پر بہت سے اعتراضات کچھ اسی قسم کے تھے۔ جیسے آپ کی زبان پر کئے گئے ہیں، مثلاً پانچویں اعتراض میں۔ نبہ کے ساتھ مرجع کا ذکر نہ کرنے پر، یا سولہویں میں "بہتر" کے ساتھ "زیادہ" کے استعمال پر یا ستر ہویں میں "جس طرح" کی جزا کے نہ ہونے پر اعتراضات کئے گئے ہیں۔ میرے خیال میں محترم معترض کا مقصد اعتراض کرنا اتنا نہیں تھا، جتنا آپ کی گرفت کے خلاف ایک طرح کا احتجاج کرنے کا۔ معلوم نہیں وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے کہ نہیں، مگر مجھ جیسے لوگوں کو جو زبان کی صحت کے قدیم معیار میں تبدیلی یا قدرے ڈھیل کے قائل ہیں، لب کشائی کا ضرور موقع مہیا کردیا۔

آپ نے ایک اعتراض کو صحیح مان لیا ہے، سترہ اعتراضوں میں سے صرف یہی ایک اعتراض ہے جسے آپ نے تسلیم کیا ہے (بجز اس کے کہ ایک اعتراض کو آپ نے فصیح تر قرار دیا ہے) مگر عجیب اتفاق ہے کہ میں اس اعتراض کو صحیح نہیں سمجھتا۔ محترم معترض نے لکھا ہے کہ "ہر آزادی کی تحریک" کے بجائے "آزادی کی ہر تحریک" ہونا چاہیے۔ مجھے بھی یہی انداز پسند ہے اور اسی طرح لکھتا ہوں مگر پہلی صورت بھی، جو آپ نے اختیار کی ہے، غلط نہیں ہے، بلکہ گرامر کے عین مطابق ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ مرکب الفاظ، چاہے وہ مرکب اضافی ہوں، یا عطفی یا توصیفی ایک کلمے کی حیثیت رکھتے ہیں، اس لئے ضمائر تنکیر اور صفات ضمیری کلمے سے قبل لائے جائیں گے، اس وقت تفصیل میں جانے کا وقت نہیں صرف دو مثالوں پر اکتفا کروں گا:

مولوی عبدالحق صاحب: "... اور بعض اوقات جو کوئی اعلا درجے کی کتاب چھپتی تو اس کی تعریف کرتے"۔[1]

پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب: "... ایم اے او کالج کے کتنے طرح طرح کے کردار بے اختیار یاد آتے ہیں"۔[2]

محترم معترض کے ارشاد کے مطابق یہ دونوں فقرے یوں ہونے چاہیے تھے: "اعلا درجے کی جو کتاب چھپتی" اور "کالج کے طرح طرح کے کتنے کردار" مگر جو لوگ ذاتی ذوق اور پسند کو نہیں گرامر کے قاعدوں کو پیش نظر رکھتے ہیں، وہ اس طرح نہیں لکھیں گے۔ اس کی بیشمار مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

آپ نے اپنے جواب میں ایک بات بڑے پتے کی کہی ہے، وہ یہ کہ "نقد و احتساب کا معاملہ بڑا ہی نازک ہے، یہ عادت کہ سرسری طور پر کسی کے کلام یا مضمون میں کوئی کوتاہی نظر آئی اور تحقیق و تامل کے بغیر جھٹ اعتراض جڑدیا، معترض کو پشیمان کرتی ہے، بعض اوقات خود ہی خود رفع کرنے سے اعتراض رفع ہو جاتا ہے اس کے بعد کتابیں دیکھنے اور اہل علم سے پوچھنے کا نمبر آتا ہے اس جدوجہد کے بعد "اعتراض" اور "نقد و احتساب" کو قابل اعتماد وزن حاصل ہوتا ہے"۔ اس کو پڑھ کر جناب حبیب احمد صدیقی صاحب کا وہ مضمون مجھے یاد آگیا، جو اگست ۸۹ء کے فاران میں شائع ہوا ہے اور جس میں مولانا آزاد کی زبان کی غلطیوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ آپ کے مذکورہ بالا اصول

---

[1] چند ہم عصر، صفحہ ۱۱۶ [2] آشفتہ بیانی میری، صفحہ ۱۵۰

کے مطابق اگر فاضل مضمون نگار، غور و فکر سے کام لیتے، کتابوں بالخصوص لغات کا گہرا مطالعہ کرتے اور اہل علم سے مشورہ کرتے، تو مجھے یقین ہے کہ وہ بعض اعتراضات کو قلم زد کر دیتے، میں نے اس مضمون کا تفصیل سے جواب لکھا ہے، جسے بعض حوالوں کی تصدیق کے بعد گنجور آپ کی خدمت میں بھیجوں گا، مگر یہاں اس کا ذکر آ گیا ہے تو چند ایسے اعتراضات پیش کرتا ہوں، جن کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ اگر غور و فکر سے کام لیا جاتا تو قلم زد کر دئیے جاتے۔ مثلاً صدیقی صاحب نے اعتراض کیا ہے کہ "نشاط" کو مولانا آزاد نے مذکر لکھا ہے، حالانکہ مونث ہے اگر کسی کی پہنچ محض لغات تک ہوگی تو وہ یقیناً یہی سمجھے گا، لیکن اگر مطالعہ اور تحقیق و جستجو کے دائرے کو ذرا وسیع کر دیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مولوی عبدالحق صاحب نے "قواعد اردو" میں اس کو ان الفاظ میں شمار کیا ہے، جن کو اہل زبان مذکر اور مونث دونوں بولتے ہیں[1] صدیقی صاحب نے یہ اعتراض بھی کیا ہے کہ مصنفات اور محسوسات مذکر ہیں اور مولانا نے مونث لکھا ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے بڑی وضاحت کے ساتھ یہ اصول بیان کیا ہے کہ بجز چند مستثنیٰ الفاظ کے یہی قاعدہ یاد رکھنا چاہئے کہ مونث کی جمع مونث ہوگی اور مذکر کی جمع مذکر، ظاہر ہے "مصنفہ" اور "محسوسہ" کے مونث ہونے میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا۔ مولوی عبدالحق صاحب کے مذکورہ بالا اصول کے مطابق ان دونوں کی جمع "مصنفات" اور "محسوسات" بھی مونث ہی ہوئی۔ اس کے علاوہ فرہنگ آصفیہ نے "محسوسات" کو مونث لکھا ہے۔ صدیقی صاحب نے "پہر" کی بحث میں لکھا ہے کہ "البتہ جب دو یا سہ کے ساتھ مرکب ہو کر آتا ہے تو وہ مذکر لفظ مونث استعمال ہوتا ہے"[2] موصوف نے آپ کے لفظوں میں پوری جد و جہد سے کام نہیں لیا، ورنہ یہ بات ان کی نظر اور علم سے اوجھل نہ رہتی کہ لفظ "دوپہر" ایک خاص معنی میں مذکر بولا اور لکھا جاتا ہے لفظ "دوپہر" کے دو معنی ہیں، ایک دن کے بارہ بجے، یہ مونث ہے۔ مثلاً دوپہر ڈھل گئی، دوسرے معنی دو ساعت کے ہیں، مثلاً یوں کہیں گے "انتظار کرتے کرتے دوپہر ہو گئے"۔

یہ چند مثالیں یہاں بر سبیل برداشتہ لکھ دی ہیں، تفصیل میرے مضمون میں ملے گی۔

آپ نے "مکاتیب ابوالکلام آزاد" پر تبصرہ کرتے وقت جو سوالات اٹھائے ہیں، ان کے بارے میں بہت کچھ لکھنے کو جی چاہتا ہے مگر یہ مراسلہ اس کا متحمل نہ ہو سکے گا، اس سے صرف دو امور کے بارے میں عرض کرنا چاہتا ہوں آپ نے صفحہ ۵۸ پر لکھا ہے۔

> "مسٹر ڈیسائی نے مولانا کے حوالے سے اپنی کتاب میں لکھا کہ مولانا ابوالکلام نے جامعہ ازہر میں تعلیم حاصل کی۔ ان کے والد کی بھی یہی تمنا تھی، اس پر بحث چھڑی تو عبدالشاہد شیروانی صاحب نے اس واقعہ کی یوں تصحیح کی کہ مہادیو ڈیسائی کو غلط فہمی ہو گئی تھی، مولانا نے تو یہ فرمایا تھا کہ انھوں نے مصر کے سفر میں ازہر کے اکابر علماء سے استفادہ کیا تھا۔"

خود مولانا آزاد اپنی کتاب "انڈیا ونس فریڈم" میں مسٹر ڈیسائی کی تردید کر چکے ہیں، اس لئے اگر اس کا ذکر ضروری تھا تو شاہد شیروانی صاحب کے بجائے مولانا ہی کے حوالے سے لکھنا چاہئے تھا۔ ممکن ہے کہ مولانا کی یہ تردید بہت سے لوگوں کی نظر سے نہ گزری ہو، اس لئے ذیل میں نقل کرتا ہوں۔

> "یہاں میں چاہتا ہوں کہ ایک غلط فہمی کو دور کر دوں، جس کا مہادیو ڈیسائی کی بدولت بہت چرچا ہوا وہ جب میری سوانح عمری لکھ رہے تھے، تو انہوں نے بہت سے سوالات قلم بند کئے اور مجھ سے ان کے

---

[1] قواعد اردو صفحہ ۸۱ [2] قواعد اردو ص ۹۰ [illegible] فاران رابت ماہ اگست ۶۸ء ص ۲۱

جواب لکھنے کو کہا، ایک سوال کے جواب میں میں نے لکھا کہ جب میں قریب بیس برس کا تھا تو میں نے مشرق وسطیٰ کا دورہ کیا اور ایک عرصے تک مصر میں رہا۔ کسی اور سوال کے جواب میں لکھا تھا کہ مذاقی طریقۂ تعلیم صرف ہندوستان میں ناقابل اطمینان اور بے اثر نہیں ہے بلکہ مشہور دارالعلوم الازہر میں بھی اس کی حالت کچھ بہتر نہیں۔ مہاڈیسائی نے کسی وجہ سے ان باتوں سے یہ نتیجہ نکالا کہ میں جامعۂ ازہر میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے مصر گیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں ایک دن بھی وہاں طالب علم کی حیثیت سے نہیں رہا۔ شاید اس غلط فہمی کا سبب ان کا یہ خیال تھا کہ اگر کسی شخص نے کچھ علم حاصل کیا ہے تو اس نے ضرور کسی یونیورسٹی میں تعلیم پائی ہوگی، جب مہادیو ڈیسائی کو معلوم ہوا کہ میں نے ہندوستان کی کسی یونیورسٹی میں نہیں پڑھا ہے تو انہوں نے سمجھ لیا کہ میں نے جامعہ ازہر سے سند حاصل کی ہوگی۔"[1]

میری دوسری گزارش آپ کے اس ارشاد کے بارے میں ہے:۔

"فرانسیسی مستشرق لوئی مسینو کی جو شہادت مہیا کی گئی ہے اس نے مشتبہات کو دور کہاں کیا بلکہ اور الجھا دیا۔"

"مکاتیب ابوالکلام آزاد" ابھی تک میری نظر سے نہیں گزری ہے، اس لئے فاضل مرتب مرزا ابوسلمان شاہجہانپوری کی طرف وہ دوسری عبارت میرے سامنے ہے، جو آپ نے زیر بحث تبصرہ میں نقل کی ہے۔ مگر اس میں جس بحث کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جہاں تک مجھے یاد ہے وہ یہ ہے کہ سید سلیمان صاحب قبلہ نے سفر عراق سے بالکل انکار فرمایا تھا۔ جہاں تک اس انکار کا تعلق ہے، فرانسیسی مستشرق کے مذکورہ مضمون سے اس کی تو بہرحال تردید ہو جاتی ہے اور مولانا آزاد کے بیان کی تائید ہوتی ہے، اس لئے آپ کا یہ ارشاد نہیں ہے کہ شبہات کے رفع ہونے کے بجائے اس میں اور الجھاؤ پیدا ہو گیا اور یہ کہ "مستشرق لوئی مسینو صاحب کی شہادت نے اس شبہ اور غلط فہمی کو جسے علامہ سید سلیمان ندوی سے منسوب کیا گیا ہے دور کرنے کے بجائے اور زیادہ قوی بنا دیا۔"

رہے دوسرے سوالات جن میں آپ نے اس وقت اپنے تبصرے میں اٹھاتے ہیں اگر یکسوئی کے ساتھ ان پر غور کیا جائے تو ان کا حل بڑی آسانی سے نکل سکتا ہے آپ نے جو سوالات اٹھائے ہیں ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

(۱) "مولانا آزاد نے شیخ آلوسی زادہ لکھا ہے اور لوئی مسینو ان بزرگ کا نام استاد حاجی علی آلوسی بتاتے ہیں، یہ بات بھی خاصی غور طلب ہے کہ بغداد کی عام زبان عربی ہے، ان صاحب کو "ابن آلوسی" کے نام سے مشہور ہونا تھا۔ آلوسی زادہ تو فارسی ترکیب ہے۔"

(۲) "پھر مولانا آزاد نے ان "آلوسی زادہ" یا بقول لوئی مسینو "استاد حاجی علی آلوسی" سے شرف تلمذ اور تعلیم حاصل کرنے کا اپنے خطوں میں کہیں ذکر نہیں فرمایا، مگر مولانا آزاد کے سفر عراق کے شاہد اور مصدق لوئی مسینو صاحب نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ "مسجد مرجان میں ہم پہلو بہ پہلو تعلیم پاتے تھے۔"

ان دونوں سوالات پر کچھ عرض کرنے سے قبل میں فرانسیسی مستشرق کی اصل عبارت کا ترجمہ یہاں پیش کرنا چاہتا ہوں، کیوں کہ۔

---

[1] ہماری آزادی (ترجمہ از پروفیسر محمد مجیب) ص ۱۹

"مسلمانوں ... مولانا آزاد کے مقدمے سے جو اقتباس آپ نے نقل کیا ہے اس میں اور میرے سامنے جو ترجمہ ہے اس میں کچھ لفظی تفاوت پایا جاتا ہے۔ اگرچہ اس فرق کی وجہ سے اصل مضمون یا بحث پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مگر میں آپ کے اقتباس میں ایک ٹکڑے کا اضافہ بھی کرنا چاہتا ہوں۔ اس لئے بہتر ہے کہ جو ترجمہ میرے سامنے ہے اس سے پوری عبارت نقل کر دوں۔ ہمایوں کبیر کی مرتبہ انگریزی کتاب اس وقت میرے پاس نہیں ہے اس کا ترجمہ ہے زیر بحث "خطبہ" اس کتاب کا اقتباس حسب ذیل ہے:

"ان سے (یعنی مولانا آزاد سے۔ اعظمی) میری پہلی ملاقات پچاس سال پہلے ۱۹۰۸ء/۱۳۲۶ھ میں بغداد میں ہوئی تھی۔ ہم مسجد مرجان میں ملے تھے۔ ہم دونوں اپنے محترم استاد الحاج علی آلوسی کے شاگرد تھے، جن کا مرقد اسی مسجد میں ہے۔"

کچھ آگے چل کر پھر لکھتے ہیں:-

"ہم دونوں نے (مولانا اور میں) علی کی زبان سے وہ تعلیم حاصل کی تھی (جس سے مولانا پہلے ہی سے مانوس تھے) جس پر نواب سید صدیق حسن خاں بھوپالی کا گہرا اثر تھا۔ سید صدیق حسن خاں (وفات ۱۳۰۷ھ/۱۸۸۹ء) نے ہندوستان میں علی کو ان کے شباب کے زمانہ میں پڑھایا تھا۔"[1]

آپ فرماتے ہیں کہ بات صاف نہیں ہوئی اور الجھ گئی اور علامہ سید صاحب کا شبہ اور غلط فہمی اور قوی ہو گیا۔ مگر میں ایسا بالکل نہیں سمجھتا۔ عنصر عراقی کا تو ثبوت مل گیا، رہ گیا مولانا آزاد کے خط اور ڈاکٹر سید ... کے مضمون میں نام کا فرق تو ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ ایک نے مختصر نام لکھا ہوگا اور دوسرے نے مکمل۔ یہ اعتراض بھی بہت زیادہ اہمیت نہیں رکھتا کہ عراق کے کسی شخص کے نام کا جز "زادہ" نہیں ہو سکتا۔ جناب مالک رام صاحب سے اس کا ذکر آیا تھا، یہ بغداد میں دو سال رہ چکے ہیں، فرمایا کہ بغداد میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جن کے ایرانی خاندان کے نام پیستور باقی ہیں۔ جامعہ کے اہل علم کی ایک مجلس میں میں نے اس کا ذکر کیا تو ایک فاضل ندوہ نے "زادہ" کی تائید میں صحیح بخاری کے مشہور شارح ....

رہا یہ سوال کہ مولانا آزاد نے اپنے خط میں آلوسی زادہ سے تعلیم حاصل کرنے کا ذکر کیوں نہیں کیا تو اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ ممکن ہے خط میں اس تفصیل کا کوئی محل نہ رہا ہو اس وقت میرے سامنے "کاروان خیال" نہیں ہے، اس لئے یہ بات قیاساً کہہ رہا ہوں، دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ مولانا نے باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کی ہو، وہاں پہنچنے کے بعد ان کی شہرت سنی ہو تو کچھ اسباق میں بیٹھ گئے ہوں مگر بعد میں محسوس کیا ہو کہ ان کے درس میں کوئی خاص بات نہیں ہے، اس لئے اس کو قابل ذکر ہی نہ سمجھا ہو۔ میں نے جو اقتباس درج کیا ہے اس میں ایک جگہ بریکٹ میں ہے کہ "جس سے مولانا پہلے ہی سے مانوس تھے" یہ جملہ اگر فاضل مستشرق کا ہے اور کتاب کے عام انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ انہی کا ہے تو اس سے میرے اس قیاس کی تائید ہوتی ہے۔ بہرحال ان دونوں سوالات یا اعتراضات سے میرے خیال میں کوئی الجھاؤ پیدا نہیں ہوتا۔

معاف کیجئے گا، میرا یہ مراسلہ خاصا طویل ہو گیا، مگر مجھے امید ہے کہ اگر آپ شائع فرمائیں گے تو قارئین فاران اس کو پڑھ کر "بور" نہیں ہوں گے۔

آپ کا مخلص ۔ عبداللطیف اعظمی

---

۱۱ دسمبر ۱۹۶۸ء   محترمی   السلام علیکم   (۲)

ایک مراسلہ ہوائی ڈاک سے بھیجا ہے، مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں کہ ہندوستان اور پاکستان میں ہوائی ڈاک کا قابل اعتماد اور معقول

---

[1] مولانا ابوالکلام آزاد۔ کتاب ایک تذکرہ۔ جامع۔ ہمایوں کبیر۔ مترجم: ڈاکٹر میر ولی الدین (مطبوعہ ۱۹۶۱ء) صفحہ ۴۳

ہوتا ہے یا نہیں، پوسٹ آفس والوں نے بتلایا کہ ہوائی جہاز سے ڈاک جاتی ہے اور مجھے اس کی فکر تھی کہ جلد سے جلد آپ کو مل جائے اس لئے ہوائی ڈاک سے بھیجا ہے۔

مراسلے میں ایک جملہ نامکمل ہے اور اس میں ایک غلطی بھی ہے، اس لئے براہ کرم اسے مکمل فرما دیجئے اور ٹھیک بھی کر دیجئے۔ آلوسی زادہ کا جہاں ذکر ہے وہاں حسب ذیل عبارت لکھ دیجئے۔

جامعہ ملیہ کی ایک مجلس میں آلوسی زادہ اور اس پر اعتراض کا ذکر آیا تو ایک فاضل ندوہ مولانا عبدالسلام قدوائی نے بیضاوی شریف کے ایک شارح "شیخ زادہ" کی مثال پیش فرمائی۔ میں نے موصوف کا پورا نام دیکھنے کے لئے کتب خانہ سے بیضاوی شریف کا وہ ایڈیشن منگوایا جس کے حاشیے پر موصوف کی عربی میں شرح چھپی ہے۔ ایک جلد کے آخری صفحے پر یوں درج ہے۔ محمد محی الدین المشہور بشیخ زادہ۔ "بشیخ زادہ" عربی ٹائپ میں بالکل اسی طرح چھپا ہے جس طرح میں نے یہاں لکھا ہے۔ مزید تفصیل جاننے کے لئے میں نے "الاعلام" (قاموس تراجم) کو رجوع کیا تو اس وقت جلد میں تفصیل تو نہ مل سکی، البتہ جہاں شیخ زادہ کا ذکر ہے وہاں اسی طرح کا ایک اور نام نظر سے گزرا وہ ہے شیخی زادہ، پورا نام عبدالرحمن بن محمد۔

(حوالہ کے لئے ملاحظہ ہو:- کتاب مذکورہ، تالیف خیر الدین الزرکلی، الجزء الثالث صفحہ ۲۹۵ کالم اول اور صفحہ ۲۹۶ کالم دوم)

میں نے اپنے مراسلے میں فرانسیسی مستشرق کا نام اپنے قلم سے کہیں نہیں لکھا ہے، دوسروں کی عبارت میں آ گیا ہے تو یہ اور بات ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے اس کے تلفظ میں شبہ تھا اور مختلف لوگوں نے مختلف طریقے سے لکھا ہے۔ تلفظ کے معاملے میں میں پروفیسر محمد مجیب صاحب پر اعتماد رکھتا ہوں کیونکہ وہ یورپ کی متعدد زبانوں سے مثلاً انگریزی کے علاوہ جرمن، فرانسیسی اور روسی سے بخوبی واقف ہیں ان سے میں نے اس مستشرق کے نام کا تلفظ دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا۔ لوئی ماسینیوں۔ آپ مناسب سمجھیں تو کسی مناسب جگہ پر اس کا اضافہ کر دیجئے۔ امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

خاکسار عبداللطیف اعظمی

(۳)

جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵ - ۸ جنوری ۶۹ء　　محترمی،　　السلام علیکم

پانچ چھ روز کے بعد آج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے واپس آیا تو آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۲ جنوری ملا۔ پچھلا مراسلہ بھیجنے کے بعد مسلم یونیورسٹی کے ایک استاد سے ملاقات ہوئی جن کی اسلامیات پر گہری اور وسیع نظر ہے اور وہ ندوہ وغیرہ میں رہ چکے ہیں، ان سے معلوم ہوا کہ ادارہ علوم اسلامیہ کے کتب خانہ میں مستشرقین پر عربی میں ایک مفصل کتاب موجود ہے، دیکھنے کے بعد معلوم ہوگا کہ یہ پہلا ایڈیشن ہے جو مختصر ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن شاید تین جلدوں میں ہے وہ ابھی نہیں آیا ہے آرڈر دیا جا چکا ہے۔

مجھے دو چیزیں خاص طور پر دیکھنی تھیں، ایک مستشرق کی تعریف، دوسرے کیا کوئی مسلمان ایسا ہے جو مستشرق کہلاتا ہو۔ میرا قیام مختصر تھا اور کام بہت اس لئے صرف سرسری طور پر میں یہ کتاب دیکھ سکا۔ مگر انڈکس سے معلوم ہوا کہ ان میں کوئی مسلمان نہیں ہے ہاں ایسے چند نام ذہن میں تھے، جو پہلے مستشرق تھے بعد میں مسلمان ہو گئے، مثلاً جرمن مستشرق جرمانس، مگر ایسے مسلمان مستشرقین کے مزید نام معلوم کرنے کے لئے اس کتاب کو تفصیل سے پڑھنے کی ضرورت تھی جس کے لئے اس وقت موقع نہیں تھا۔ وہاں کے استاذ نے چند اور نام بتلائے ہیں جو بعد میں مسلمان ہو گئے، مگر میں تصدیق نہیں کر سکا ہوں، اس لئے یہ نام ابھی نہیں لکھ رہا ہوں۔

لوئی ماسینیوں کے بارے میں ضروری باتیں اس سے معلوم ہوئیں اگرچہ میں جو باتیں خاص طور پر معلوم کرنا چاہتا تھا وہ معلوم نہ ہو سکیں، البتہ تاریخ وفات معلوم ہو گئی اور اسی لئے میں یہ عریضہ لکھ رہا ہوں۔ دمشق کے ایک سہ ماہی عربی رسالہ مجلہ المجمع العلمی العربی (رابت جزء ۱۹۶۳ء) میں ظافر القاسمی کا ایک مفصل مضمون شائع ہوا ہے جس میں اس فرانسیسی مستشرق کا سال پیدائش ۱۸۸۳ء درج ہے اور تاریخ وفات ۳۱ اکتوبر ۱۹۶۲ء ہے دیگر تفصیلات، اگر ضرورت پڑی تو کسی اور موقع پر عرض کروں گا۔ امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

خاکسار عبداللطیف اعظمی

(۴)

جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵
۲۴ر دسمبر ۶۸ء۔ ۳ر شوال المکرم ۱۳۸۸ھ

محترمی، السلام علیکم

عید کی مبارک پیش کرتا ہوں۔ اگرچہ یہ مبارکباد باسی ہو چکی ہے، لیکن امید ہے کہ آپ قبول فرمائیں گے۔

آپ کے دونوں گرامی نامے، مورخہ ۱۴ر رمضان المبارک (۱۸ر دسمبر) اور ۱۹ر دسمبر، یکے بعد دیگرے کل او رآج موصول ہوئے آپ نے میرے عریضوں کے جس طرح پابندی کے ساتھ اور بروقت، جواب عنایت فرمائے ہیں، وہ عام مدیروں کی روایات اور آداب کے خلاف ہے اس خصوصی توجہ کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

آپ کا استفسار سمجھنے سے میں قطعاً قاصر رہا۔ آپ لکھتے ہیں کہ فرانسیسی مستشرق لوئی مسینیو "اگر مسلمان تھا تو الوکی زادہ سے اس کا تعلیم حاصل کرنا درست ہے۔ اگر مسلمان نہ تھا تو ایک مسجد میں مسلمانوں کے ایک عالم سے کس "فن اور علم" کی وہ تعلیم پاتا تھا اور اسے مسجد کے مدرسہ میں بیٹھنے کی اجازت کس طرح مل گئی ؟"

لوئی مسینو مستشرق کہلاتے ہیں تو ظاہر ہے کہ وہ مسلمان نہیں ہیں، لیکن ان کا مذہب جو بھی ہو، اس سے آلوسی زادہ سے تعلیم حاصل کرنے یا نہ کرنے کا ثبوت کیوں ملے گا ؟! کیا خدا نخواستہ آپ کا یہ خیال ہے کہ صرف ایک مسلمان ہی کسی عالم دین سے اسلامی علوم حاصل کر سکتا ہے، غیر مسلم نہیں ! اور کیا آپ خیال میں ایک اہل کتاب کو مسجد میں داخل ہونے اور کسی مسجد کے مدرسے میں تعلیم حاصل کرنے کی شرعاً اجازت نہیں ہے ؟ اگر واقعی آپ کا یہ خیال ہے تو ممنون ہوں گا اگر آپ اس کی وضاحت فرما دیں۔ اگر اسلام کے کسی علم کی وجہ سے یہ خیال ہو تو اس کو جاننا چاہوں گا اور اگر آپ اپنے کسی تجربے کی وجہ سے اس نتیجے پر پہونچے ہوں تو اس کی تفصیل شکریہ کا باعث ہوگی۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ ان مستشرقین نے، جو اپنے وسعت مطالعہ اور تبحر علمی کے لحاظ سے علامہ کہلانے کے مستحق ہیں، حصول علم میں کبھی تعصب اور تنگ نظری سے کام نہیں لیا ہے اور اس کے لئے اگر علمائے اسلام کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کا موقع ملا یا ضرورت پڑی تو فخر و مسرت کے ساتھ ان کی شاگردی بھی اختیار کی ہے اسی طرح علمائے اسلام کے متعلق بھی میرا تاثر یہ ہے کہ ان سے جو بھی فیض حاصل کرنا چاہے، وہ چاہے مسلمان ہو یا عیسائی یا ہندو، غرض وہ کسی مذہب و ملت سے تعلق رکھتا ہو، انہوں نے اپنے علم اور اپنی صحبت سے فیض یاب کرنے میں کبھی تامل نہیں کیا۔

ظاہر ہے سبھی مستشرقین ایک جیسے نہیں ہیں اور نہ ضروری ہے کہ ہر مستشرق اپنے تبحر علمی میں بلند مرتبے کا مالک ہو۔ بعض مستشرقین کی اسلام دشمنی کے متعلق ہمارے علماء نے جو لکھا ہے، اس کی صحت اور صداقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا، مگر اسی کے ساتھ اس کا اعتراف نہ کرنا بد دیانتی ہوگی کہ بعض مستشرقین نے اسلامی علوم کی بڑی گراں قدر خدمت کی ہے اور وہ اسلام اور مسلمانوں کے سچے دوست اور بہی خواہ ہیں۔ اس سلسلے میں مثال کے طور پر میں پروفیسر ولفریڈ کینٹول اسمتھ[1] کا نام پیش کر سکتا ہوں، جن کو قریب سے واقف ہونے والے، صوفی کہتے ہیں اور جو ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ جنوری ۶۴ء میں ہندوستان میں مستشرقین کی بین اقوامی کانگریس منعقد ہوئی تھی، جس میں مشہور مستشرقین نے شرکت کی تھی۔ مجھے ان کے مقالے اور ان کی بحثیں سننے کا موقع ملا ان کی علمیت اور ان کے وسیع اور گہرے مطالعہ کا نقش اب تک دل پر ثبت ہے، ایک مشہور مستشرق میکس مولر نے کسی موقع پر کہا ہے :

[1] اسمتھ صاحب اپنی تحریروں میں اسلام اور مسلمانوں کے ہمدرد نظر آتے ہیں مگر اسی ہمدردی کی آڑ میں نیش زنی بھی کرتے جاتے ہیں، متجددین اور ان

۔ ہمارے مقالوں کو دیکھئے اور ہماری بحثوں اور تبادلۂ خیالات کے طریقہ پر نظر ڈالئے تو اندازہ ہوگا کہ کس کس طرح اورینٹل اسکالرشپ کے اہم مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہماری کانگریس علوم شرقیہ کی تدوین و ترقی کی راہ میں دور آفریں ثابت ہوگی، کانگریس کے مختلف اجلاسوں میں ہم نے چونکا دینے والی باتیں بتائی ہیں، ہم نے ثابت کیا ہے کہ ہم میں اختلافات ہو سکتے ہیں، لیکن ہم نے اپنے مخالفوں کی رائے کا احترام کرتے ہیں۔"

نئی دہلی میں مستشرقین کی کانگریس میں جن لوگوں کو شرکت کا موقع ملا، وہ مذکورہ بالا بیان کی حرف بہ حرف تصدیق کریں گے۔
افسوس کہ زیر بحث مستشرق ـــ لوئی مسینو ـــ کے بارے میں میری ذاتی معلومات بہت کم ہیں۔ ان کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کرنے کی نہ کبھی ضرورت پیش آئی اور نہ کبھی یہ خیال آیا تھا کہ اپنی ناواقفیت پر کبھی افسوس کرنا پڑے گا، ورنہ جب وہ دوسری مرتبہ ہندوستان آئے تھے تو بہت کچھ معلوم کیا جاسکتا تھا۔ آپ کو فوری طور پر جواب لکھنا ہے اس لئے اس وقت ضروری معلومات حاصل کرنے کی گنجائش بھی نہیں ہے، جن لوگوں کے بارے میں یقین ہے کہ وہ بہت کچھ واقف ہوں گے ان میں سے بعض لوگوں سے جو ٹیلیفون پر آسانی سے مل سکتے تھے فون پر کچھ معلوم کرنے کی کوشش کی، مگر فی الحال یہ بھی نہیں معلوم ہوسکا کہ ان کا انتقال کب ہوا ہے افسوس کہ پروفیسر ہمایوں کبیر آج کل علیل ہیں اور ڈاکٹروں نے بات چیت کرنے سے منع کیا ہے، ورنہ ان سے بہت کچھ معلوم ہوسکتا تھا۔ بہرحال اب آپ نے ان کے بارے میں سوالات کئے ہیں تو ضروری معلومات حاصل کرنے کی پوری کوشش کروں گا اور جو کچھ معلوم ہوگا اس سے مطلع کروں گا۔

شروع میں میں نے ایک جملہ لکھا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی مسلمان مستشرق نہیں ہوسکتا۔ یہ جملہ میں نے قصداً لکھا تھا اور اس کا مقصد بحث کو دعوت دینا ہے۔ جہاں تک میری معلومات ہے اردو میں لفظ "مستشرق" کی کوئی جامع و مانع تعریف نہیں کی گئی ہے مختلف لوگوں سے دریافت کیا تو ان کے بیانات میں خاصا فرق نظر آیا۔ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صاحب نے ایک موقعہ پر اس لفظ کی وضاحت کی ہے، مگر میرے خیال میں ان کی وضاحت بہت مبہم اور ناکافی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے :-

"مجھے اجازت دیجئے کہ "مستشرق" کے بارے میں کچھ عرض کروں سنہ ۱۶۸۳ء میں یہ لفظ صرف ان لوگوں کے لئے استعمال ہوتا تھا جن کا تعلق یونانی یا مشرقی کلیسا سے تھا۔ سنہ ۱۶۹۱ء میں اس لفظ کو ان لوگوں کے لئے مخصوص سمجھا گیا، جو مختلف مشرقی زبانوں سے واقف تھے۔ لارڈ بائرن نے ایک جگہ مسٹر تھامسن کے سلسلے میں ان کے گہرے مستشرقانہ اشارات کا ذکر کیا ہے۔ ہند کے تعلیمی مسائل کی بحث کے دوران میں ۱۸۳۵ء میں میکالے کی یادداشت کی بنا پر یہ طے ہوا کہ وہ لوگ جو ہندوستانی علوم اور ادب کے علمبردار ہوں، وہ مستشرق کہے جانے کے مستحق ہیں۔"

اس تعریف یا وضاحت میں دو بڑی خامیاں ہیں، ایک یہ کہ ان موضوعات کا پورا استقصاء نہیں کیا گیا ہے جن میں کم از کم کسی ایک پر عبور حاصل ہونا ایک مستشرق کے لئے ضروری ہے۔ دوسرے یہ کہ اس میں یہ ضروری ذکر رہ گیا ہے کہ مستشرق کے لئے ضروری ہے کہ وہ یورپ سے تعلق رکھتا ہو۔ مستشرق کی عام طور پر جو تعریف کی جاتی ہے اس لحاظ سے مغرب کا کوئی شخص، جو مشرق کے مخصوص موضوعات، جن میں اسلام بھی شامل ہے، کا ماہر ہو اسے مستشرق کہتے ہیں، چاہے وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو۔ مگر میں نے بہت سے لوگوں سے دریافت کیا

مگر اب تک کسی نے بھی یہ نہیں بتلایا کہ کوئی مسلمان مستشرق کہلاتا ہو اگر آپ کے یا آپ کے حلقے کی کسی صاحب کی نظر میں ایسی مثال ہو تو براہ کرم مطلع فرما کر ممنون فرمائیے۔

یہ انتہائی افسوس ناک بات ہے کہ اردو میں مستشرقین پر کوئی مبسوط اور جامع کام نہیں ہوا ہے بعض مستشرقین پر کچھ کام ہوا، مگر وہ ان کے علمی کارناموں تک محدود ہے ان کی شخصیت، ان کے حالات اور عقائد پر اگر کہیں کوئی ذکر ہے تو بہت سرسری طور پر سنہ ... جب مستشرقین کی بین اقوامی کانگریس کا چھبیسواں اجلاس نئی دہلی میں منعقد ہوا تھا تو اس موقع پر میں نے ماہنامہ جامعہ کا مستشرقین نمبر نکالا تھا مگر میری انتہائی کوششوں کے باوجود صرف چند مضامین مل سکے یہ نمبر کسی لحاظ سے بھی مکمل نہیں ہے۔ مگر چونکہ اس موضوع پر جہاں تک مجھے معلوم ہے، اردو میں کوئی قابل ذکر چیز نہیں ہے اس لئے یہ نمبر فوراً ختم ہو گیا اور اب نایاب ہے۔

میرا یہ خط بہت طویل ہو گیا ہے مگر پھر بھی مجھے امید نہیں کہ آپ کے استفسار کا کوئی واضح اور قابل اطمینان جواب مل سکا ہو بلکہ ڈر ہے کہ کچھ نئے مسائل پیدا ہو گئے ہوں گے۔ آپ کا پہلا گرامی نامہ ملا تھا تو اطمینان سے، تحقیق و جستجو کے بعد لکھنے کا ارادہ تھا مگر دوسرے روز جب فوری جواب کی یاد دہانی موصول ہوئی تو اسی وقت لکھنے بیٹھ گیا اور جو کچھ ذہن میں آیا لکھ دیا، یہ سوچے بغیر کہ اس سے مسئلہ الجھ رہا ہے یا سلجھتا ہے بہرحال میری گذارش کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

۱۔ لوئی ماسینو نے اسلام تو قبول نہیں کیا تھا مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ مسلمانوں اور اسلام کا ہمدرد اور بہی خواہ تھا۔ اس سے قریبی تعلق رکھنے والوں کا بیان ہے کہ وہ ایک صوفی تھے۔

۲۔ مسجد میں داخل ہونے اور اگر مسجد میں، کوئی مدرسہ ہو تو اس میں تعلیم حاصل کرنے پر میری معلومات کے مطابق، اسلام نے غیر مسلم پر کوئی پابندی عائد نہیں کی ہے۔

۳۔ مستشرقین اپنے مخصوص مضمون کے متعلق علم حاصل کرنے کے لئے جس سے بھی استفادہ کرنے کی ضرورت ہو اور اس کا موقع حاصل ہو تو اس سے مستفید ہونے کی ضرور کوشش کرتے ہیں، چاہے وہ ماہر یا عالم کسی مذہب و ملت سے تعلق رکھتا ہو۔ اسی طرح علمائے اسلام نے بھی کسی طالب علم کو فیض پہونچانے میں کبھی تعصب سے کام نہیں لیا۔ اس لئے اگر لوئی ماسینو نے کسی ادارہ سے فیض حاصل کیا ہو تو یہ بعید از قیاس یا ناممکن امر نہیں ہے۔ والسلام

آپ کا مخلص عبداللطیف اعظمی

جامعہ ملیہ اسلامیہ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

(۵)

۲۴ جنوری ۹۱ء

محترمی، السلام علیکم

عنایت نامہ مورخہ ۱۵ جنوری ملا، میں نے لوئی ماسینوں کے بارے میں کافی معلومات جمع کر لی ہیں اور میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ میں نے اپنے پچھلے کسی خط میں ذکر کیا تھا کہ ان کے انتقال کے بعد مجلۃ المجمع العلمی العربی کے شمارہ بابت ماہ جنوری ۱۹۶۳ء (شعبان ۱۳۸۲ھ) میں ڈاکٹر فرانسس کا ان کے بارے میں ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے بعض حضرات کے اقوال بھی مرحوم کے بارے میں درج کئے ہیں اس مضمون کے چند مختصر اقتباسات ملاحظہ ہوں:

لقد اورثنا شهادة ارادات تكون اسلامية مسيحية معاً، شهادة الايمان في وجه الكفران ——
قال بول فلانان (F. A M A R D) وقلت له مرة: انت اكثر المسلمين نصرانية، ان لم تكن اكثر النصارى اسلاماً۔ وقد بدا لى ان هذا التعبير لم يسؤه۔

وقال باتایون (BATAILLON) مدیر الکولیج دوفرانس : کان مستمعو محاضراته من المسلمین
اذ ینصتون الی الشواهد العدیدة الموثوقة التی کان یستند الیها فی دراسة الحیاة المعاصرة للشعوب
الاسلامیة ، یلمسون الحسب الذی کان یتدفق وهو یبحث فی عقید تهم وتقالیدهم التی کان یعرفها
هذا المسیحی اعمق من معرفتهم بها ، کما کانوا یلمسون هذا الکمال فی النطق بلغة القرآن ۔
هذه مقتطفات مما قیل عن الراحل الکبیر الذی ترک اثراً عمیقاً فی الثقافتین الاسلامیة والفرنسیة
ما دراسة هذه الاثر فلیس الیوم زمانه ، ولا بد ان یولی ما یستحق من العنایة والاهتمام والاعجاب ۔

سفر بغداد کے سلسلے میں جو موشگافیاں کی گئی ہیں ، ان سے میں نے کبھی کوئی دلچسپی نہیں لی ۔ آپ کے استفسار کے بعد کچھ چیزیں
دیکھیں اور کچھ واقفیت حاصل کی ۔ اس سلسلے میں کچھ تاریخوں کا فرق بھی بتلایا جاتا ہے ، اسی کو سمجھنے کے لئے آج پہلی مرتبہ "کاروان خیال"
ایک دوست سے حاصل کرکے مولانا آزاد اور مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی کے وہ خطوط دیکھے جن میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا ہے
تاریخ یا سنہ تو مولانا آزاد نے لکھا ہے اور نہ مولانا شیروانی نے ۔ مولانا آزاد کے خط سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ عراق میں چند مہینے قیام
تھا اور اپنی عمر کے بارے میں لکھا ہے کہ " میری عمر بیس اکیس برس کی ہوگی " اس لحاظ سے یہ زمانہ ۱۹۰۸ کا ہوسکتا ہے اور ماسینیوں
نے لکھا ہے کہ " ۱۹۰۷ء یا ۱۹۰۸ء میں پہلی بار مولانا آزاد سے بغداد میں ملاقات ہوئی اس طرح زمانے کے بارے میں کوئی اختلاف نظر
نہیں آتا ۔ انڈیا ونس فریڈم سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے ۔

ابھی حال میں عربی کی ایک کتاب " من تراثنا الشعبی " مجھے ملی جس کے مؤلف عبدالحمید العلوچی ہیں اور ۱۹۶۶ء میں عراق
کی وزارت الثقافة والارشاد کے شائع ہوئی ہے اس میں ایک مختصر سا مضمون ماسینیوں کے بارے میں بھی ہے اس سے بھی یہی
معلوم ہوتا ہے کہ ماسینیوں ۱۹۰۷ء ۔ ۱۹۰۸ء میں بغداد گئے تھے ذیل کا اقتباس ملاحظہ ہو :-

> فالزمیل یدری لیحققه ان ماسنیون فی شتاء ۱۹۰۷ - ۱۹۰۸ قد نزل ضیفاً علی اسرة
> الآلوسی فی بغداد ، وهذا ما تنقضه الرسائل المتبادلة بین حمید اسحٰق ماسنیون
> والاب انستاس ماری الکرملی فی غضون سنة ۱۹۰۷ حول وجوب رعایة الشاب
> الباحث لویس ماسنیون البالغ من العمر الرابعة والعشرین ۔ فان ذوی هذا
> الشاب قبل ان یغادرهم الی بغداد فی بعثته الاثاریة شتاء ۱۹۰۷ قد اخبروا
> سلفاً الاب الکرملی برحلة ابنهم الی بغداد واوصوه به خیراً ، والتمسوا منه
> رعایته ۔ فالتزم الکرملی برجائهم ، حققه کما ینبغی ۔ والیه یعود الفضل فی توثیق
> اواصر الصلة بین السید المرحوم محمود شکری الالوسی وبین المستشرق الشاب
> ماسنیون ۔ ومما یؤید هذا المنزع ان ماسنیون نفسه لم یحبذ العیش تحت
> سقف واحد مع الاب الکرملی ، ولم یفکر فی النزول ضیفاً علی شیخ الاسرة الالوسیة

ملہ کاروانِ خیال (مطبوعہ سنگ میل پبلیکیشنز لاہور) صفحہ ۵۱

وانما استقر بداره احمد انما الواقعة فی محلة المیدان خانة من العاقولیة "

اس مضمون کی آخری دو سطریں حسب ذیل ہیں :-

" فرحمہم اللہ ما سیئون ۔ انہ کان مرابطنا بغداد یا قبل ان یکون من انباء باریس ، وکان متصرفا حلاجیا قبل ان یکون زاہدا کاثولیکیا "

جی ہاں ان ہی اسمتھ صاحب کا میں نے ذکر کیا تھا، جن کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے ۔ عرصہ ہوا وہ میک گل یونیورسٹی کے ادارہ علوم اسلامیہ کے ڈائرکٹر تھے ، مگر اب نہیں ہیں کچھ عرصہ وہ دہلی میں رہے اور اب امریکہ میں ہیں ۔ ہم لوگوں نے ان کو بہت قریب سے دیکھا ہے، ان کو اسلام کا ہمدرد اور دوست پایا اور مسلمانوں کا مخلص مان کی اسلام دشمنی پر کوئی مضمون میری نظر سے نہیں گزرا ۔ اگر آپ کسی مضمون کی نشاندہی فرمائیں تو ممنون ہونگا ۔ میں نے ایک دوست سے جو ادارۂ علوم اسلامیہ میکگل یونیورسٹی میں پڑھ چکے ہیں جب اس کا ذکر کیا کہ میں نے آپ کے خط میں اسلام دوست مستشرقین میں پروفیسر اسمتھ کا بھی ذکر کیا ہے تو انہوں نے فرمایا کہ پاکستان کے لوگ ان سے بہت خفا ہیں ۔ اس وقت میں نے عرض کیا تھا کہ اس کے سیاسی اسباب ہیں لیکن اگر اس کے مذہبی اسباب ہیں تو ——— میں واقعی جاننا چاہتا ہوں ۔　　والسلام　　مخلص عبداللطیف اعظمی

گزارش　　(ضمیمہ)

میرے پہلے مراسلے کی اگر ابھی کتابت نہ ہوئی ہو تو میری گزارش ہے کہ جہاں حبیب احمد صدیقی صاحب کے اعتراضات کا ذکر ہے وہاں حسب ذیل اعتراض کو بھی آپ شامل کر دیں تو بڑی عنایت ہوگی ، میرا جوابی مضمون اب آپ کو دیکھنے میں ملے گا ، میں نے اس قدر ترمیم و تنسیخ بعد میں کر دی ہے کہ اب اسے کوئی اور شخص نقل نہیں کر سکتا اور میں آج کل غالب صدی کے سلسلے میں اس قدر مشغول ہوں کہ میں خود صاف نہیں کر سکتا اس لئے اب طبیعت پر جبر کر کے طے کر لیا ہے کہ غالب صدی سے فارغ ہو کر ہی ادھر توجہ کرونگا ۔ اس درمیان میں میرے مراسلے پر ممکن ہے کہ کوئی گفتگو ہو اس لئے ان اعتراضات کا میں نے ذکر کر دیا تھا جن کے جواب میں ایک دو جملے لکھے جا سکتے تھے بعد میں خیال آیا کہ ذیل کا اعتراض بھی اس ضمن میں آتا ہے اور میرے جواب سے بہت لوگوں کو شاید اختلاف ہو اس لئے یہ بھی اگر میرے مراسلے میں شامل ہو جائے تو اچھا ہے سابق عبارت سے ربط پیدا کرنے کے لئے اگر میری عبارت میں ترمیم کی ضرورت پیش کرے تو بلا تامل کر دیجئے ۔

ایک اور اعتراض ہے کہ بارہ مہینہ کی بجائے بارہ مہینے ہونا چاہئے ۔ حسب معمول صدیقی صاحب نے وجہ نہیں لکھی ، لیکن وہ شاید سمجھتے ہونگے کہ بارہ کا معدود واحد کیسے ہو سکتا ہے ، جمع ہی ہونا چاہئے اس لئے انہوں نے تصحیح فرما دی ، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو میں دونوں طرح جائز ہے یہ بھی کہہ سکتے ہیں :

میں نے تین سو جلد چھپوائی اور بانٹ دی ۔

اور اس طرح بھی لکھ سکتے ہیں :- میں نے تین سو جلدیں چھپوائیں اور بانٹ دیں ۔

آتش کا مشہور شعر ہے جسے صدیقی صاحب نے ضرور پڑھا ہوگا ، مگر عدد معدود کی خشک بحث کی طرف ان کا ذہن نہیں گیا ہوگا :-

سفر ہے شرط ، مسافر نواز بہتیرے　　ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

" ہزارہا " کا معدود واحد ہے اور " راہ میں ہیں " نہیں کہا ، بلکہ " راہ میں ہے " کہا ہے ۔

علامہ سرسی سے تعلیم کی نوعیت کے بارے میں ابھی تک کچھ نہیں معلوم ہو سکا ہے جن سے بہت سے لوگوں سے گفتگو کی ہے لوگوں کا قیاس ہے کہ اس کی نوعیت باقاعدہ درس کی نہیں ہوگی جس طرح درس گاہوں میں پڑھایا جاتا ہے بلکہ لیکچر کی سی ہوگی جس طرح درسگاہوں میں پڑھایا جاتا ہے ——— جیسے کوئی شخص ،

فاران :- مولانا عبداللطیف اعظمی کے ہم شکر گزار ہیں کہ صاحب موصوف نے بڑے اخلاص کے ساتھ ایسے خطوط لکھے ہیں جن میں علم و ادب کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں اور جو معلومات آفریں بھی ہیں، ہم نے ان کے تمام مکاتیب ایک ساتھ چھاپ دئے ہیں کہ ایک ہی نشست میں اصل موضوع پر گفتگو ہو جائے، کوئی بات تشنہ اور وضاحت طلب نہ رہے اور ان کے ارشادات کے جوابات بھی جائیں۔

(۱) اطبار اور حکماء کا قاعدہ ہے کہ جس موسم میں جب مرض کا غلبہ ہو جاتا ہے یا جو مرض "وبائے عام" کی صورت اختیار کر جاتا ہے سب سے پہلے اس مرض کے ازالہ کی پوری کوشش کی جاتی ہے آج کل نئی نسل شعر و ادب اور تنقید و افسانہ میں "زبان" سے بے اعتنائی برت رہی ہے اس لئے ہم نقد و تبصرہ میں زبان کے تسامحات اور خامیوں پر خاص طور سے گرفت کرتے ہیں، زبان دانی سے غفلت کا حد ہو گئی کہ "غیظ" کو "غیض" "تلاطم" کو "طلاطم" لکھا جا رہا ہے اور "شعاعوں" کو "شعاؤں" املا کیا جا رہا ہے، بعض معروف اہل قلم "اٹنا" اور "پٹنا" کے استعمال سے واقف نہیں ہیں، ان کے یہاں اس قسم کے جملے ملتے ہیں!-

"میز کتابوں سے اٹ گئی"

حالانکہ یہاں "پٹ گئی" لکھنا چاہئے۔ "اٹنا" گرد و غبار اور کوڑا مٹی کے لئے آتا ہے! جس طرح جسمانی صحت کے معاملے میں کسی بد پرہیزی اور حفظانِ صحت کے اصولوں میں ڈھیل نہیں دی جا سکتی، اسی طرح زبان و روزمرہ میں بھی تسامحات اور بے جا تصرفات سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا! جس شخص کو زبان و روزمرہ اور اظہار و بیان پر پوری طرح قدرت نہ ہو وہ بڑا شاعر اور عظیم ادیب ہو ہی نہیں سکتا۔

زبان و بیان سے بے پروائی اور غفلت کے سبب اردو ادب میں بڑی گھٹیا قسم کی چیزیں آ رہی ہیں ہم اس ناقص مال کی درآمد کو روک دینا چاہتے ہیں! اب رہا زبان کی وسعت کا معاملہ تو ہم "فوق البھڑک" "بھلمنساہت" اور "جنگلات" کو بھی درست سمجھتے ہیں کہ اس قسم کے الفاظ "غلط العام" کے درجہ میں آ کر زبان میں شامل ہو گئے ہیں، ہم ان "عربی زدہ" حضرات کو "رجعی" سمجھتے ہیں جو "مشکور" کو غلط جان کر، اس کی بجائے "متشکر" یا "شکر گزار" بولتے ہیں۔

زبان میں اضافے بھی ہوتے رہتے ہیں مگر یہ "اضافے" زبان کے مزاج کے مطابق ہونے چاہئیں! مثلاً -

"وہ فطری شاعر ہے"

کی بجائے "وہ بنیادی طور پر شاعر ہے" اس قسم کے تصرفات کو ہم صحیح نہیں سمجھتے! زبان میں تصرف اور اضافہ زبان کے مزاج کے مطابق ہونا چاہئے، جس میں صوتی، لفظی اور معنوی حسن پایا جانا ضروری ہے، راقم الحروف کا تقریباً اٹھائیس سال پہلے کا کہا ہوا شعر ہے -

الجھیں ترے رخسار سے گستاخ نگاہیں
تو اور ہو مجروحِ تماشا مرے آگے

اس میں "مجروحِ تماشا" کی نئی ترکیب کی طرف اشارہ کرتا ہوا آگے بڑھتا ہوں!

اقبال سلمان صاحب (کوئٹہ) کے جن اعتراضات کے "فاران" میں جوابات دئے گئے تھے اور مولانا عبداللطیف اعظمی صاحب نے جن کی تحسین فرمائی ہے، فاضل معترض نے ان کے جواب میں پھر ایک مضمون بھیجا، جسے واپس کر دیا گیا۔ راقم الحروف کے مضمون کی تعریف اور تائید میں دو مضمون آئے تھے۔ ایک شاہجہاں پور (ہندوستان) سے اور دوسرا کراچی سے! وہ تائیدی مضامین بھی "فاران" میں شائع نہیں کئے گئے! یہ اعتراضات اتنے اہم نہیں تھے کہ جواب الجواب کے سلسلہ کو جاری رکھا جاتا

راقم الحروف کو جو عرض کرنا تھا عرض کر دیا گیا، معترض کے اعتراضات اور "فاران" میں دیئے ہوئے جوابات کو دیکھ کر ارباب نظر فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اعتراضات میں زیادہ وزن ہے یا جوابات میں!

اس سلسلہ میں دو خط ابتک سلمان صاحب کی حمایت میں آئے ہیں، جن میں راقم الحروف کو بُرا بھلا کہا گیا ہے اور "پاجیانہ" تک کی گالی دی گئی ہے۔ ان خطوں کا انداز اور قرینہ اس کی غمازی کرتا ہے کہ معترض کا ایماان میں شریک ہے، تحسین و منقبت کے ہجوم میں اس قسم کے "دشنام آمیز خطوط" شاید پندار و انکسار، اور غرور و خود شناسی کے درمیان توازن پیدا کرنے کے لئے مفید ہی ثابت ہوتے ہیں۔

(۲) حبیب احمد صدیقی صاحب کے مضمون کے سلسلہ میں فاضل مکتوب نگار نے جو چند باتیں کہی ہیں اُن پر اگر بحث چھڑ جائے تو یہ مضمون خاصہ طویل ہو جائے گا، جب اُن کا جوابی مضمون آئے گا اس وقت ضرورت محسوس ہوئی تو راقم الحروف کچھ عرض کرے گا ورنہ صدیقی صاحب پر اصل ذمہ داری عائد ہوتی ہے وہ چاہیں گے تو مفصل جواب دیں گے —— اعظمی صاحب کے آخری (پانچویں) خط میں "بارہ مہینہ" اور "بارہ مہینے" کا جو ذکر آیا ہے اُس پر لگے ہاتھوں اپنی رائے اور تحقیق عرض کر دینا چاہتا ہوں۔

عام طور پر فصحا، اہل زبان اور اہل قلم اس طرح بولتے اور لکھتے ہیں:-

"پان کے دو بیڑے لے آؤ" —— "مجھے اپنے وطن سے آئے ہوئے بارہ مہینے ہوئے"۔ مگر صوبہ بہار اور یو۔ پی کے بعض اضلاع جو بہار کی سرحد سے قریب واقع ہیں، (وہاں یوں بولتے ہیں (یا یوں بھی بولتے ہیں) :-

"دو بیڑا پان لے آؤ" —— اور "مجھے اپنے وطن سے آئے ہوئے بارہ مہینہ ہوا"۔ ممکن ہے لکھنؤ کے مضافات میں بھی اس طرح بولا جاتا ہو، مگر یہ بولی ٹھولی ہے، لکھنے کی زبان نہیں ہے اور فصحا اس طرح نہیں بولتے، مولانا ابوالکلام آزاد جو اپنے نام کے ساتھ "المکنیٰ بابی الکلام الدہلوی" لکھتے رہے ہیں، انہیں "بارہ مہینہ" بولنا اور لکھنا نہیں چاہئے تھا کہ دہلی کی زبان "بارہ مہینے" ہے، حبیب احمد صدیقی صاحب کا اعتراض اپنی جگہ درست ہے!

"میں نے تین سو جلد چھپوائی اور بانٹ دی"

اور

"میں نے سو جلدیں چھپوائیں اور بانٹ دیں"

ان دونوں جملوں میں دوسرا جملہ صحیح اور زبان و محاورہ کے مطابق ہے رہا آتش کا یہ شعر—

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

اس میں "ہزارہا" اسم جمع ہے اور اس طرح بولنا اور لکھنا ہے

"اُس جلسہ میں ہزارہا آدمی تھا" —— "سیلاب میں لکھوکھا جانور ہلاک ہو گیا"۔ —— زبان و روزمرہ کے اعتبار سے بالکل صحیح ہے، مگر اس طرح بولنا —— "اُس جلسہ میں پچاس آدمی تھا" —— "سیلاب میں چالیس جانور ہلاک ہو گیا"، "راستہ میں بارہ سایہ دار درخت تھا" —— یا

"دفتر سے پانچ قلم چوری ہو گیا"

اور

"میں نے تین سو جلد بیچ دی"

زبان و روزمرہ کے لحاظ سے عجیب سا معلوم ہوتا ہے، کانوں کے لئے نامانوس اور قلم کے لئے تو یہ اندازِ بیان بالکل اجنبی ہے یہ مفہوم اس طرح ادا ہونا چاہئے۔

"دفتر سے پانچ قلم چوری ہو گئے"

اور

"میں نے تین سو جلدیں بیچ دیں"

(۳) زبان و ادب میں یقیناً بعض شخصیتیں "سند" مانی جاتی ہیں، مگر یہ "مستند" شخصیتیں بھی غلطیوں سے محفوظ نہیں ہیں مثلاً "اردو ترقی بورڈ" (پاکستان) کی لغت کی جب پہلی قسط شائع ہوئی تو نامور نذیر فراق دہلوی جن کی تحریریں زبان و ادب میں سند مانی جاتی ہیں اُن کی یہ عبارت نگاہ سے گزری۔

"..... نوکریں اور مامائیں ....."

راقم الحروف نے اس پر تنقید کی کہ "نوکر" کا "مونث" "نوکرانی" ہے، جس کی جمع "نوکریں" نہیں "نوکرانیاں" ہے ـــ بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کی ادبی حیثیت سب کے نزدیک مسلم ہے مگر انہوں نے اپنے ایک مضمون میں "درخت بوئے گئے" لکھا ہے حالانکہ درخت لگائے جاتے ہیں بوئے نہیں جاتے، ہاں گنے کی پوریاں یا ٹکڑے جن کے لئے "بیج" کا لفظ استعمال ہوتا ہے اُن کے لئے "بونا" بولتے ہیں ا

مولوی عبدالحق صاحب نے "بیوی کی صحنک" اپنے مضمون میں استعمال کیا، دہلی میں "بیوی کی صحنک" اور "بی بی کی صحنک" دونوں طرح بولتے ہیں، مگر لکھنؤ اور یو۔پی کے اکثر و بیشتر اضلاع میں "بی بی کی صحنک" بولا جاتا ہے اور یہی درست ہے کیونکہ حضرت سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کا لقب "بیوی فاطمہ" نہیں "بی بی فاطمہ" ہے کہ "بی بی" اردو میں شریف عورت اور ناسہ کے لئے استعمال ہوتا ہے! گزارش کا مقصد یہ ہے کہ مولانا آزاد ہوں یا مولوی عبدالحق یا کوئی دوسرے مستند اہلِ قلم ان کی غلطیاں غلطیاں ہی سمجھی جائیں گی، اُن سے استناد نہیں کیا جا سکتا۔

مولانا آزاد کے بارے میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے سفر اور خاندانی حالات پر "فاران" میں نہایت تفصیل کے ساتھ کئی شماروں میں بحث آچکی ہے! اس کا خلاصہ یہ ہے کہ سب سے پہلے ندوۃ المصنفین کے مشہور علمی ارگن "برہان" میں مولوی مہر محمد خاں صاحب شہاب مالیر کوٹلوی کا مضمون راقم الحروف کی نظر سے گزرا اسے پڑھ کر انتہائی حیرت ہوئی پھر ۱۹۵۱ء میں مشہور انشا پرداز رئیس احمد جعفری مرحوم کا مضمون "فاران" میں چھپنے کے لئے آیا، جس میں اشاروں، کنایوں اور استعاروں سے ہٹ کر دوٹوک انداز میں یہ بات کہی گئی کہ مولانا آزاد کے عراق و ایران کی سیاحت و سفر کا واقعہ ایک افسانہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

میں اس مضمون کو "فاران" میں جوں کا توں چھاپ سکتا تھا، مگر میں نے تحقیق حال کے لئے مولانا آزاد کی خدمت میں عریضہ بھیجا، جس میں مولانا موصوف سے اُن کے مصر، ایران، شام اور عراق کے سفر و سیاحت کے بارے میں دریافت کیا گیا، یہ خط بہ نظرِ احتیاط ۱۵ر اگست ۱۹۵۱ء کو رجسٹری کے ذریعہ بھیجا گیا، اٹھارہ دن کے انتظار کے بعد میں نے دوسرا نیاز نامہ ۱۸ر ستمبر ۱۹۵۱ء کو اُن کی خدمت میں گزرانا، یہ خط بھی مستقل (REGISTRED) تھا اس یاددہانی کے باوجود مولانا نے جواب نہیں دیا۔ میرا سوالنامہ انتہائی مختصر تھا، کل دس بارہ سطریں، جسے تین چار منٹ میں پڑھ کر، چار پانچ سطروں میں جواب دیا جا سکتا تھا۔ بڑے آدمیوں کے مرنے کے بعد اُن کے وطن، سنہ پیدائش، تصانیف اور دوسرے حالات کے بارے میں تحقیق ہوتی ہے

اور طرح طرح کی بحثیں چلتی رہتی ہیں، ایک مصنف، ادیب، مفسر، عالم اور سیاسی رہنما کی زندگی ہی میں اس کے حالات پر بحث چھڑ جاتے تو اس عظیم شخصیت پر اس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے بارے میں صحیح معلومات دے کر بات کو صاف کر دے اور ان بحثوں کو مشتبہ، مبہم اور مابہ النزاع نہ رہنے دے!

اس کے بعد راقم الحروف نے مولانا آزاد کے سفر و سیاحت اور دوسرے حالات کا پتہ لگایا تو میری حیرت میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا کہ اپنے خاندان، والد اور اپنی سیر و سیاحت کے بارے میں اُن کی باتیں "افسانہ" ثابت ہوئیں۔

۱۹۴۰ء میں گاندھی جی کے پرائیویٹ سکریٹری مسٹر مہادیو ڈیسائی نے مولانا آزاد کی "بیاگرافی" ———— (A BIOGRAPHICAL MEMOIR) لکھی جس میں مولانا کی ابتدائی زندگی کے واقعات ظاہر ہے کہ اُنہی کی زبان سے سُن کر قلمبند کئے گئے تھے، اُس میں وہ مولانا آزاد مرحوم کی روایت کی بنا پر لکھتے ہیں:-

"...... وہ (یعنی مولانا آزاد کے والد) یہ چاہتے تھے کہ میں (یعنی مولانا آزاد) کسی نہ کسی طرح فاضل ترین علماء کی جماعت میں اپنا نام پیدا کروں، لہٰذا انہوں نے مجھے ۱۹۰۵ء میں اپنے ذاتی مصارف سے مصر بھیجا تاکہ قاہرہ کی مشہور یونیورسٹی الازہر میں عربی تعلیم حاصل کر سکوں وہاں دو سال تک مقیم رہا، اور ۱۹۰۷ء میں ہندوستان واپس آیا" (اُردو ترجمہ)

حالانکہ ۱۹۰۳ء اور ۱۹۰۴ء میں مولانا آزاد نے کلکتہ میں "لسان الصدق" کی ایڈیٹری کے فرائض انجام دئے ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۶ء میں الندوہ کے ایڈیٹر رہے اور ۱۹۰۶ء سے ۱۹۰۸ء تک "الوکیل" (امرتسر) کی ادارت مولانا ممدوح سے متعلق رہی! دو چار مہینہ کا فرق اور اختلاف ہو تو اُسے کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر واقعات کے تولیطہ میں فٹ کیا جاسکتا ہے مگر یہاں تو دو سال کی مدت کا فرق پڑتا ہے۔

مولانا آزاد کے سفر عراق کے بارے میں چہ میگوئیاں شروع ہوئیں اور یہ باتیں زبانوں سے تحریر میں آئیں تو ۱۲ فروری ۴۹ء کے "نیا ہندوستان" میں ایک مضمون "امام الہند" کے عنوان سے شائع ہوا، جس میں لکھا ہے:-

"..... آپ کا بچپن مکہ اور مدینہ میں بسر ہوا، مدینہ میں اُن کے والد کا مکان دینی تعلیم کا ایک بہت بڑا مرکز تھا، ابتدائی تعلیم آپ نے والد سے حاصل کی، آپ نے قاہرہ کی مشہور عالم یونیورسٹی الازہر میں بھی تعلیم حاصل کی ہے، پندرہ سال کی عمر میں آپ نے جامعہ الازہر میں علوم مشرقی کا نصاب پورا کر لیا تھا......."

یہاں پہونچ کر "کر لیا تھا" پر یہ نشان (سلہ) ثبت ہے اور حسب ذیل فٹ نوٹ درج ہے:-

"یہ غلط ہے کہ مولانا نے جامعہ ازہر قاہرہ میں تعلیم پائی ہے، مسٹر آصف علی کی طرح دوسرے سوانح نگاروں مہادیو ڈیسائی وغیرہ نے بھی دھوکا کھایا ہے، ۱۹۰۶ء میں مصر وغیرہ گئے تھے، ظاہر ہے اس وقت ۱۸ سال کی عمر تھی، اور ہندوستان کی صحافتی و علمی دنیا میں اپنے معرکۃ الآرا مضامین کی بدولت کافی شہرت و وقعت حاصل کر چکے تھے، تکمیل تعلیم ۱۵، ۱۶ کی عمر ہی میں ہو چکی تھی، یہ ضرور ہے، کہ مولانا نے علامہ شبلی نعمانی مرحوم کی طرح اکابر جامعہ ازہر اور مفتی محمد عبدہ کے دارالعلوم کے شیوخ سے استفادہ کیا اور ان کی علمی مجالس کی

> زینت بنے، اس کی تحقیق ۴ جنوری ۱۹۵۲ء کی ایک ملاقات میں خود امام الہند سے کر چکا ہوں، اس سفر میں برادرِ گرامی غلام یٰسین آہؔ مرحوم بھی امام الہند کے ساتھ تھے۔ مگر وہ عراق سے واپس آ گئے اور مولانا ۱۹۰۵ء میں ایک سال کی سیر و سیاحت کے بعد واپس ہوئے ـــــ شاہد شیروانی ـــــ"

مسٹر مہادیو ڈیسائی کی کتاب ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی تھی، ناممکن ہے مولانا نے اپنی سوانح عمری نہ پڑھی ہو (یا کسی سے پڑھوا کر سنی ہو) اس میں مسٹر ڈیسائی نے سفرِ مصر کے بارے میں غلط بات لکھ دی تھی تو اس کی مولانا کو تردید کرنی چاہئے تھی۔ مگر ایسا نہیں کیا گیا جب مولانا کا یہ سفر زیرِ بحث آیا، تو مسٹر ڈیسائی کی کتاب کی اشاعت کے سات آٹھ سال بعد اس کی توجیہ اور تاویل کی گئی۔ اور غلط نگار ڈیسائی کو ٹھیرایا گیا کہ انہوں نے مسٹر آصف علی کی طرح دھوکا کھایا ہے۔

"غبارِ خاطر" میں مولانا نے ایران و لبنان کی سیاحت کا بھی ذکر کیا ہے مگر حیرت ہے کہ اس سیاحت کے دوران مصر، عراق، ایران اور لبنان سے نہ کسی دوست کو انہوں نے خط لکھا، نہ کوئی سفرنامہ مرتب فرمایا اور نہ کوئی مضمون تحریر کیا حالانکہ ان ملکوں کے مشاہیر، کتب خانے، علمی درسگاہیں، قدیم عمارتیں، تاریخی مشاہد اور آثارِ قدیمہ ذکر کرنے کے قابل تھے، الندوہ، الوکیل اور الہلال کے صفحات کا اس سفر کے ذکر سے خالی رہنا بڑے اچنبھے کی بات ہے پھر مولانا اُن لوگوں میں سے بھی نہیں ہیں "جو کوتاہ قلم اور خاموش طبیعت ہوتے ہیں، جو شخص "چائے" کے ذکر میں صفحے کے صفحے لکھ سکتا ہے اور "بزدلی" کے تذکرے کو مستقل باب میں پھیلا سکتا ہے، وہ مصر، عراق، ایران اور لبنان کی سیر و سیاحت کرتا ہے اور اس کی زبان گنگ اور اس کا قلم ساکت رہتا ہے اور سیر و سیاحت کے حالات قلم بند کرنے کا کوئی ولولہ ہی اُس کے اندر پیدا نہیں ہوتا ایک مدت گزر جانے کے بعد ذکر بھی فرمایا تو استعاروں، کنایوں اور افسانوی انداز میں!

مولانا نے اپنے خاندانی حالات کے سلسلہ میں بہت کچھ لکھا ہے مگر "کھیم کرن" کا جو اُن کا آبائی وطن ہے کہیں بھولے سے بھی ذکر نہیں فرمایا، حالانکہ ان کے دادا عمر دین عرف "چھیکڑی" کھیم کرن ہی میں بود و باش رکھتے تھے۔ مولانا آزاد نے اپنے خاندانی حالات لکھتے ہوئے عہدِ مغلیہ میں "رکن المدرسین" کے عہدے کا ذکر فرمایا ہے کہ وہ ان کے اسلاف میں ایک صاحب کو ملا تھا۔ حالانکہ اس نام (رکن المدرسین) کا کوئی عہدہ اور لقب عہدِ مغلیہ کی تاریخ میں نہیں ملتا، یہ میری "ریسرچ" نہیں ہے، اس کی تحقیق دوسرے اہلِ علم بھی کر چکے ہیں۔

مولانا آزاد نے اپنے والد مولوی خیر الدین مرحوم کے بارے میں تحریر فرمایا ہے کہ اُنہوں نے مصر میں چار جلدیں تصنیف کی تھیں، ـــــ مگر کس موضوع پر؟ کتاب کا نام کیا تھا! اس کا ذکر انہوں نے نہیں کیا، مولانا آزاد نے اپنے والد کے متعلق یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ اُن کے والد نے اپنے معتقدوں کے ذریعہ بائیس لاکھ روپیہ چندہ جمع کر کے نہرِ زبیدہ کی مرمت کرائی تھی۔ "نہرِ زبیدہ" کی تاریخ دیکھی گئی تو اس حقیقت کا پتہ چلا کہ ہندوستان، ترکی، اور مصر وغیرہ ملکوں کے اکابر کی ایک کمیٹی بنی تھی جس نے رقم فراہم کی اور اس طرح نہرِ زبیدہ کی مرمت کا مرحلہ سر ہوا اس کمیٹی میں مولانا آزاد کے والد کا نام تک نہیں ہے، ہندوستان کے مسلمانوں کی نمائندگی مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے فرمائی، وہ اس کمیٹی کے رکن تھے!

لے "غبارِ خاطر" میں یہ تمام تفصیل موجود ہے۔

مولانا آزاد نے اپنے والد محترم کو دہلی میں مولانا صدرالدین آزردہ کی صحبتوں میں شریک ہونے والا بتایا ہے حالانکہ اُس دور کی یا اُس کے بعد کی کسی کتاب میں ان مشاہیر کی صحبتوں اور ہم نشینوں کے ذکر و بیان میں مولوی خیرالدین کا نام نہیں ملتا۔
سب سے زیادہ حیرت سہ روزہ مدینہ (بجنور) کے ۱۰ راگست ۱۹۵۱ء کا شمارہ پڑھ کر ہوئی، مدینہ کے ایڈیٹر نے مولانا آزاد سے اپنی ملاقات کا تفصیل کے ساتھ حال لکھا ہے:-

"۱۹۴۷ء میں مولانا حمید زماں صدیقی صاحب کی کتاب —— اسلامی نظریہ سیاست، مکتبہ دین و دانش بانکی پور پٹنہ سے شائع ہوئی ہے، مولانا سید سلیمان ندوی نے اس کا دیباچہ لکھا، دیباچہ کے حاشیہ پر ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے کہ "الہلال" میں چونکہ مضمون نگاروں کے نام نہیں لکھے جاتے تھے، اس لئے الہلال کے مضمونوں کے مجموعے شائع کرنے والوں نے — بلا تحقیق ہر مضمون کو مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کی طرف منسوب کر دیا، حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے "الطریق الی الاسلام" —— "تذکار نزول قرآن —— جلشہ کی تاریخ کا ایک ورق —— قصص بنی اسرائیل —— مشہد اکبر (نمبر اول) وغیرہ میرے مضامین ہیں"
"۱۹۵۰ء میں مکتبہ علم و حکمت بہار شریف (پٹنہ) نے، سید صاحب کے مضامین کا حصہ اول شائع کیا ہے، جسے الہلال ایجنسی لاہور نے کئی سال پہلے "حقیقت الصوم" نامی پمفلٹ کی شکل میں شائع کیا تھا —— میں نے (یعنی ایڈیٹر سہ روزہ مدینہ) نے اس بات کا ذکر کیا تو مولانا (ابوالکلام آزاد) نے فرمایا . . . . . . ہاں! سید سلیمان صاحب نے میرے ساتھ "اسسٹنٹ ایڈیٹر" کی حیثیت سے جو چھ مہینے تک کام کیا ہے وہ ترجمے بھی کرتے تھے اور مضامین بھی لکھتے تھے، خیر اگر وہ کسی مضمون کو اپنا بتاتے ہیں تو میری طرف سے آپ مدینہ میں اعلان کر دیجئے کہ وہ مضمون سید صاحب کا ہے، کچھ مضامین اگر میرے نام کے نہ ہوئے تو میرے بھائی! اس میں میرا بگڑتا کیا ہے؟"
"آخری جملہ کہہ کر مولانا (آزاد) نے اپنے مخصوص انداز میں، جس کی گونج اظہار بے نیازی کے موقع پر سنائی دیتی ہے ایک قہقہہ لگایا اور پھر سگریٹ کا کش لیا۔"

مولانا آزاد کا یہ جواب گول مول سا ہے، شان بے نیازی کا بھی اظہار اور "نفی و اثبات" کے دونوں رنگوں کی جھلک بھی! حالانکہ یہ بات سگریٹ کے کشوں اور قہقہوں میں اُڑا دینے کے قابل نہ تھی، علامہ سید سلیمان ندوی صاحب کے لکھے ہوئے مضامین کے بارے میں واضح الفاظ میں کہنا تھا، کہ یہ اُنہی کے ہیں، میرے نہیں ہیں، یہ پبلشروں کی غلطی ہے کہ سید صاحب کے لکھے ہوئے فلاں فلاں مضامین میرے نام سے منسوب کر دیئے [1]

سفرِ عراق

"کاروان خیال" میں مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے "سفر عراق" کا جو ذکر فرمایا تھا اس کے بارے میں "مکاتیب ابوالکلام آزاد" کے فاضل مرتب ابوسلمان شاہجہان پوری نے فرانسیسی مستشرق —

---

[1] فاران کے مختلف شماروں میں یہ تمام باتیں پوری تفصیل بلکہ تحقیق کے ساتھ لکھی گئی ہیں (م ۔ ق ۔ م)

ماتی ستشرقین کا حوالہ دے کر لکھا تھا کہ علامہ سید سلیمان ندوی جس سفر (عراق) کے بارے میں مشتبہ تھے، وہ غلط فہمی اب دور ہو جانی چاہئے، راقم الحروف نے ان کی تالیف (مکاتیب ابوالکلام آزاد) پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ اس اقتباس نے غلط فہمی کو دور نہیں کیا بلکہ اور الجھنیں بڑھا دیں۔[1]

میری اس تنقید پر مولانا عبداللطیف اعظمی نے جو خطوط ارسال کئے ہیں وہ مضمون کے آغاز میں درج کئے جا چکے ہیں ان میں مکتوب نگار نے مولانا آزاد کے دفاع میں جو لب ولہجہ اختیار فرمایا ہے وہ مجروعلمی ہی نہیں، تہذیب وشرافت کا آئینہ دار بھی ہے ۔

"مکاتیب ابوالکلام آزاد" پر جب اپنی تنقید کی کاپیاں تصحیح املا کی غرض سے میں پڑھ رہا تھا ۔ تو اس وقت "طاش کبری زادہ" کا نام خود میرے ذہن میں آیا تھا، فاضل مکتوب نگار نے "خیرالدین زرکلی" کی تالیف کا جو حوالہ اور اقتباس دیا ہے اس سے اپنے قیاس کے تسامح کا احساس ہوا، یہ کہ عرب اہل قلم کے ناموں کا جز "زادہ" ہو سکتا ہے اور اس کی شاذ ونادر ہی مثالیں ملتی ہیں۔

بعض عیسائیوں نے مسلمانوں کا بھیس بدل کر حجاز کا سفر تو کیا ہے مگر یہ واقعہ بہت زیادہ قابل غور ہے کہ ایک عیسائی نے کسی مسلمان عالم سے مسجد میں دینی علوم یا تصوف واخلاق کی تحصیل کی ہو، مگر جناب اعظمی صاحب نے "من تراثنا الشعبی" (تالیف عبدالحمید العلوجی) کا جو اقتباس درج فرمایا ہے اس سے ہمارے اس قیاس کی بھی تصحیح ہو گئی۔

اصل بات غور طلب یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے آلوسی زادہ سے مستشرق ماسینون کے ساتھ بغداد کی مسجد مرجان میں تعلیم پائی تھی، تو اس کا ذکر مسٹر مہادیو ڈیسائی کی لکھی ہوئی سوانحعمری (بہ روایت مولانا ابوالکلام آزاد) میں ضرور آنا چاہئے تھا! اب سے ساٹھ سال قبل بغداد کے کسی مشہور عالم سے ہندوستان کے ایک مسلمان طالب علم یا عالم کا تعلیم پانا یقیناً اس قابل تھا کہ اس کا ذکر کیا جاتا! اس کتاب میں یہ ذکر آنے سے رہ گیا تھا تو جناب شاہد شیروانی نے مسٹر مہادیو ڈیسائی اور آصف علی مرحوم کے تسامحات کی جو تصحیح کی ہے اس میں بغداد میں مولانا آزاد کے تعلیم پانے یا وہاں کے شیوخ سے استفادہ کرنے کا ذکر آنا چاہئے تھا۔

بحث ونظر، معلومات واطلاع اور ظن وقیاس کے اس گرد آلود مطلع کو مشہور عالم ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے مکتوب گرامی نے صاف کر دیا، انہوں نے راقم الحروف کو خط لکھا ہے :—

بسم اللہ

4 .R.

75 - PARIS VI

۱۳ ذی قعدہ ۱۳۸۸ھ چہارشنبہ

مکرمی ـ سلام مسنون

دسمبر کے "فاران" میں "مکاتیب ابوالکلام آزاد" مولفہ ابوسلمان شاہجہاں پوری پر تنقید چھپی ہے اور صفحہ ۵۸ - ۵۹ پر

---

[1] مفہوم کی ترجمانی (م۔ق)

مولانا ابوالکلام کے سفرِ عراق پر لوئی ماسینیوں کے بیان سے استدلال کا ذکر ہے۔

ماسینیوں اب آنجہانی ہو چکے ہیں، آٹھ دس سال کی بات ہے، ایک دن وہ مجھ سے پوچھنے لگے کہ آیا ابوا[لکلام] کبھی بغداد گئے تھے؟ میں نے لاعلمی ظاہر کی تو پریشانی کے انداز میں کہنے لگے کہ کوئی صاحب مجھ سے دریافت کر رہے [ہیں] اور میرے ایک بیان سے استدلال کرنا چاہتے ہیں، مگر مجھے اس کا کچھ علم نہیں اور غالباً یہ بھی کہا کہ "اب سے کوئی بیس سال [پہلے] میں نے کچھ کہا تھا، تو اب یاد نہیں۔"

ممکن ہے یہ ابو سلمان صاحب ہی کے خط کا معاملہ ہو، اگر ایسا ہے تو مناسب ہوگا کہ وہ ماسینیوں کے تازہ ترین بیان شائع کریں محض کسی پرانے بیان پر اکتفا نہ کریں، ابوالکلام عراق گئے تھے تو، نہ گئے تھے تو، اُن کی عظمت میں نہ کمی ہوتی، نہ زیادتی سے[1]

مخلص ـ حمید اللہ

اپنے سفر اور اپنے اسلاف و اکابر کے بارے میں مولانا ابوالکلام آزاد نے جو بعض واقعات تصنیف فرمائے ہیں اور [خاص] طور سے اُن کے سفرِ مصر کے متعلق راویوں کے بیانات میں جو تضاد ملتا ہے، اُس کی روشنی میں ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا [خط] پڑھنے سے مولانا آزاد کا "سفرِ عراق" اور زیادہ مشتبہ قرار پاتا ہے اور علامہ سید سلیمان ندوی نے مولانا آزاد کے "سفرِ عرا[ق]" کے بارے میں جس شبہ کا اظہار کیا تھا وہ اور قوی ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے نہایت معقول بات کہی ہے کہ سفرِ عراق کے اثبات و نفی سے مولانا آزاد کی عظمت نہ کمی ہوتی ہے نہ زیادتی ــــــ اُن کی شخصیت کو اسلاف کے کارناموں اور خاندانی عزت و وجاہت کا سہارا لینے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ مولانا آزاد نے ان "افسانوں" "سہاروں" اور "افسانوی واقعات" کی ضرورت محسوس [کی] ہے۔

مسٹر مہادیو ڈیسائی جو مولانا آزاد کے اولین سوانح نگار ہیں اور تحریکِ آزادی میں مولانا موصوف کے رفیق رہے ہیں مولانا آزاد کی طبیعت و مزاج سے واقف تھے، انہوں نے مولانا کے بارے میں یہ ریمارک دیا ہے:

A certain amount of legitimate pride that is born of a noble ancestry and aristocracy of learning may thus be said to return in the Maulana Sahib's blood ----.

یہی "فخرِ جائز" اور "غرورِ بجا" (legitimate pride) ہے جو طرح طرح کے قالب اختیار کرتا ہے۔ جس کی چند جھلکیاں اوپر دکھائی جا چکی ہیں۔

علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم ثقہ عالم تھے، عہد "الہلال" میں وہ مولانا آزاد کے ساتھ کام کر چکے تھے۔ انہوں نے م[ولانا] آزاد کے سفرِ مصر و عراق وغیرہ کے بارے میں جن "شبہات" کا اظہار فرمایا تھا وہ تحقیق کے بعد کمزور نہیں اور قوی ثابت ہو رہے [ہیں]۔

---

[1] میرے خیال میں یہ (ابو سلمان صاحب نہیں) کوئی اور صاحب ہوں گے۔ (ماہر)

مولانا آزاد کی زندگی ہی میں یہ بحثیں چھڑ چلی تھیں، ان کے انتقال کے بعد بھی ان باتوں کا کبھی کبھار ذکر آ جاتا ہے بے شک وفات پائے ہوؤں کا اچھے لفظوں میں ذکر کرنے کا حکم دیا گیا ہے مگر اس حکم" کا منشا یہ ہے کہ لوگوں کی اخلاق کمزوریوں کو ظاہر کرنے سے گریز کیا جائے، اگرچہ بعض حالات میں اس کی ضرورت بھی پڑ تی ہے!

— مگر —

مشاہیر کے حالات زندگی، سفر و سیاحت، تعلیم، تصانیف و تالیفات کی ریسرچ اور آن کو صحت کے ساتھ پیش کرنا یہ ایک علمی خدمت ہے جو ہر دور میں ہوتی رہی ہے۔ مثلاً مولانا آزاد کے ہم تخلص محمد حسین آزاد صاحب "آب حیات" نے اپنی کتاب میں شعراء کے بعض واقعات میں جو افسانوی رنگ پیدا فرمایا ہے اس پر ارباب نقد و نظر نے ریسرچ کرکے مولوی محمد حسین آزاد کی حاشیہ آرائیوں اور افسانہ طرازیوں کو بے نقاب کیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے سوانح حالات پر بھی یہ ریسرچ ایک تاریخی اور علمی خدمت کے طور پر انجام دی گئی ہے —— مولانا آزاد کی عظیم شخصیت کے پیش نظر یہ اکتشافات وغیرہ انگیز ہی نہیں عبرت خیز بھی ہیں! مگر کیا جائے کاغذ کے ان نقوش کو مٹایا نہیں جا سکتا!!
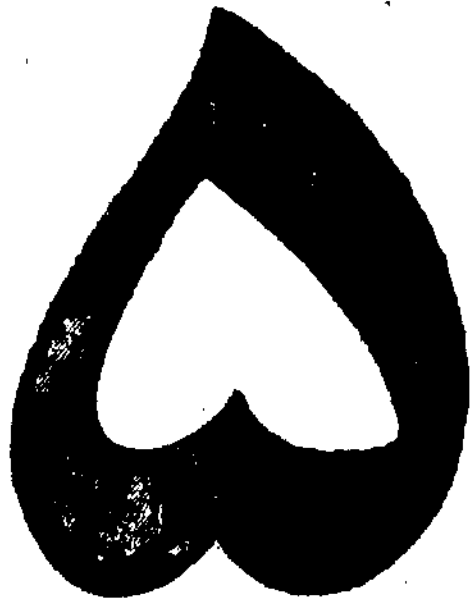
۵
آزمودہ دواؤں کا مرکب
انالجین
سر درد ۔ کمر کا درد ۔ دانت کا درد
ایام ۔ انفلوئنزا اور ہر قسم کے دوسرے درد کے لئے
یقینی زود اثر اور بے ضرر علاج ہے

الاستاذ سعید رمضان
ترجمہ :- مولانا عبدالمجید اصلاحی

نشانِ راہ

(۱)

لوگوں کو بجا طور پر یہ حق حاصل ہے کہ وہ کارکنانِ اسلام سے واضح انداز میں دعوت اسلامی کے مقاصد اور ذرائع کی وضاحت کا مطالبہ کریں۔ اور ہر پیچیدہ مشکل مسئلہ میں ان کے خیالات و افکار معلوم کریں۔ کارکنوں پر فرض ہے کہ وہ اس سلسلہ میں ذرا بھی کوتاہی اور غفلت سے کام نہ لیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ انہوں نے اپنی دعوت کو ہمیشہ واضح انداز میں پیش کیا ہے مگر چونکہ ان کے وسائل و ذرائع محدود ہیں اس لئے تمام لوگوں تک اپنی آواز نہیں پہونچا سکتے۔ علاوہ ازیں کئی برسوں سال سے کچھ اس طرح کے حالات پیش آ رہے ہیں کہ انہیں نوع بہ نوع کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اگرچہ ان کی خواہش تھی کہ وہ ان حالات سے اپنے آپ کو پاک رکھیں تاکہ دعوت اسلامی کی آواز لوگوں کے کانوں تک پہونچ سکے لیکن بات کچھ اس طرح کی تھی کہ استعمار پسندانہ طاقتوں کا مقابلہ کرنے کے سلسلہ میں انہیں اپنا رول ادا کرنا بھی ضروری تھا۔ اسی طرح صیہونی اژدہے اور اس طاغوتی نظام کا مقابلہ بھی ضروری تھا جو قوم کی آواز چھین کر اس کی زندگی کا رخ بدل دینا چاہتا تھا اور اس سلسلہ میں وہ ہر اس طاقت کو کچل دینا پسند کرتا تھا جو آوازۂ حق بلند کرنا چاہتی تھی اور منافقوں کا ساتھ دینا پسند نہ کرتی تھی۔

ان تمام حالات کے اندر فرض کی ادائیگی انہیں مختلف استعماری سازشوں، صیہونی پروپگنڈے اور حکومت کی جبر اور قہرمانیوں کا شکار بنا رہی تھی۔ ان عوامل کی موجودگی میں جو قیمت انہیں ادا کرنی پڑی اس کے باوجود انہوں نے اپنے اندر کسی طرح کا احساس پیدا نہیں ہونے دیا۔ کیونکہ تحریک کی علمبرداری انہوں نے اس علم کے تحت کی ہے کہ انہیں اس سلسلہ میں عظیم قربانیاں بھی پیش کرنی ہونگی۔ جن سے خیر کی کوئی دعوت بے نیاز نہیں ہو سکتی۔ البتہ ان کے دلوں میں لوگوں کو بدگمان کرنے اور اس حالت کا چہرہ مسخ کرنے کے ناپاک ہتھکنڈوں، عالمگیر پیمانہ پر صیہونی سازشوں اور ظالم حکومت کی افترا پردازیوں کی کامیابی کا امکان ان کے دلوں میں برابر کانٹے کی طرح کھٹکتا رہا اور اگر یہ ساری باتیں نہ ہوتیں اور یہ کارکنان ایسے ہوتے کہ ان کا بہکایا یا ان کے ضمیروں کو خریدا جا سکتا تھا تو جابر طاقتوں کے سامنے مسئلہ بالکل آسان تھا۔ وہ ان کو خرید لیتی اور انہیں کسی طرح کی کوئی گھبراہٹ نہ ہوتی۔

کسی بھی عدالت کے سادہ ترین اصولوں میں یہ بات داخل ہے کہ وہ کسی بھی مسئلہ میں یکطرفہ سماعت نہ کرے مگر یہاں حال یہ تھا کہ فریق ثانی کی آزادی سلب کی جا چکی تھی اور اسے ہر جگہ منتشر ہونے پر مجبور کر دیا گیا تھا صرف اس ایک اصول کی رعایت افترا پردازیوں کا سارا زور توڑ دینے کے لئے کافی تھی۔ اس طرح انہیں ہر اس ظالم کے مقابلہ میں اجتماعی ضمیر کی حمایت حاصل ہوتی، جس کے نزدیک کامیاب سیاست وہ ہے جس کا کوئی ضمیر نہ ہو اگرچہ افترا پردازیوں کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ برحق ہے ——

(وقد خاب من افتریٰ)

مگر یہ کارکنان دعوت ہر موقعہ پر لوگوں کو اپنی آواز کی حقیقتوں سے آگاہ اور پیدا کردہ شکوک و شبہات کا ازالہ کرنا فرض سمجھتے ہیں۔

ایک لہر

اسلام کے تمام ملکوں میں پیدا شدہ حالات سے واقف و آگاہ کسی شخص کے لئے یہ حقیقت مخفی نہیں رہی کہ ہر جگہ ایک صاف اور واضح اسلامی لہر موجود ہے جو اگرچہ اپنی قوت میں ایک دوسرے سے مختلف ہے لیکن ہر حال میں اپنی جگہ بے قرار ہے۔ اور اپنی راہ پر، ماضی قریب و بعید میں پیش آمدہ رکاوٹوں کے باوجود رواں دواں ہے یہ رکاوٹیں وہ بڑی طاقتیں ہیں جو اسلام سے بالکل ناواقف ہیں یا ان کی جانب حسد و رقابت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں وہ برابر اس کی راہ میں رکاوٹیں اور مشکلات لا کھڑا کرتی ہیں۔ اس لہر کو بعض حضرات کسی خاص جماعت کی طرف منسوب نہیں کرتے لیکن اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ اس دین کی تاریخ میں ور کی لہریں اٹھ چکی ہیں جو انشاء اللہ اپنے ساحل سے ہمکنار ہونگی۔ ہوائیں کتنی ہی مخالف کیوں نہ ہوں اور جھاگوں کا کیسا ہی شدید غلبہ کیوں نہ ہو، مگر یہ لہریں اپنے کنارے پر پہونچ کر رہیں گی۔ " فاما الزبد فیذھب جفاء و اما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض "

یہ قوم

لوگ اگرچہ اس لہر کو کسی خاص تحریک یا جماعت کی جانب منسوب کرنے میں اختلاف رکھتے ہیں مگر کسی کا اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ لہر اس امت کے اجتماعی ضمیر کی بیداری کا نتیجہ ہے جس کا تعلق اسلام سے کسی دن بھی الگ نہیں ہوا۔ باقی رہے اس کے مخلص کارکن تو ان سے کوئی بھی زمانہ خالی نہیں رہا اور یہی امت کے دل کی دراصل دھڑکنیں ہیں۔ رسول گرامی کا ارشاد ہے۔

لا تزال طائفۃ من امتی ظاھرین علی الناس یزیغ اللہ تعالیٰ قلوب اقوام فیقاتلونھم و یرزقھم اللہ منھم حتیٰ یاتی امر اللہ وھم علی ذلک۔ (رواہ النسائی)

میری امت کا ایک گروہ برابر لوگوں پر حاوی رہے گا اللہ تعالیٰ کچھ قوموں کے دلوں کو ٹیڑھا کر دے گا وہ اس سے لڑتے رہیں گے اور اللہ تعالیٰ ان سے انہیں اس حد تک رزق پہونچائے گا کہ اللہ کا فیصلہ آجائے گا اور وہ اسی حالت پر رہیں گے۔

درحقیقت جن حضرات کو اس قوم کی تاریخ کا علم ہے اور پھر انہیں اس امت کے افراد سے ملاقات کی توفیق بھی حاصل ہوئی ہو وہ یہاں عجیب و غریب باتیں پائیں گے۔ محیر العقول بات یہ ہے کہ یہ قوم زندگی اور خیر کے جذبات سے بالکل معمور ہے ایسا لگتا ہے کہ اس پر زمانہ کی مختلف چوٹوں کا کوئی سرے سے اثر ہی نہیں ہے اور نہ اسے ان سازشوں کا کوئی احساس ہے جن سے پوری تیرہ صدیاں بھری پڑی ہیں تاریخ کو ظلم و شقاوت اور اہرمنیت کی جتنی قسموں کا تجربہ ہے ان سب سے یہ قوم دوچار ہو چکی ہے، مورخین کے بیان کے مطابق اس قوم پر توڑے گئے ظلم و تشدد کا معمولی حصہ بھی قوموں کی تو کیا اور تہذیب و تمدن کی شاندار روایتوں کو تباہ و برباد کر دینے کے لئے کافی تھا۔ مگر یہ قوم اپنی جگہ پر قائم ہے۔

اس پر پہلا طوفان اس وقت آیا جبکہ اس کا وجود تازہ دم تھا، پھر اس پر بہادروں کی مختلف آندھیاں چلتی رہیں، بدگمانی، تنگ نظری، ہٹ دھرمی، جاہ طلبی، حقیقت اسلام سے بے خبری اور گھات میں رہنے والوں کی سازشوں کے طوفان آتے رہے پھر اسے مسلح حملہ کا سامنا کرنا پڑا جس نے عالم اسلامی کے مختلف گوشوں کو ہلا کر رکھ دیا، صلیبی جنگوں میں اور اس کے بعد یورپ والوں نے مسلمانوں کو ذبح کرنا شروع کر دیا یہاں تک کہ ان کے گھوڑے بیت المقدس کی فتح کے موقعہ پر مسجد اقصیٰ کے اندر ستر ہزار مسلمانوں کے خون میں تیر تیر گئے۔ صقلیہ، جنوبی

فرانس، سپانیہ، اور اندلس میں انہوں نے لاکھوں مسلمانوں کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا۔ حتیٰ کہ انہیں یہ تک گوارا نہ ہوا کہ اندلس میں کوئی مسلمان یا کسی مسلمان کی قبر باقی رہے۔ انہوں نے اس بات کا مطلق خیال نہ کیا کہ یہاں مسلمان آٹھ سو سال یا اس سے کچھ زیادہ مدت سے حکومت کرتے چلے آئے ہیں۔ جن ملکوں میں یہ مسلمانوں کو برباد نہ کر سکے وہاں ان کی استعماری حکومت اپنی اسی صلیبی روح کے ساتھ باقی رہی اور اصلاح و تعمیر کے جھوٹے دعاوی اور دعدوں کی آڑ میں مسلمانوں کا خون چوستی رہی۔

چنگیز خاں کی سرکردگی میں مشرق سے تاتاریوں کے حملے شروع ہوئے، پھر تیمور لنگ نے آکر اس قدر تباہی مچائی کہ اس نے ایران و اصفہان کے شہر ویران کرنے کے بعد ایک ہزار مسلمانوں کی کھوپڑیوں پر مینار تعمیر کیا۔

علاوہ ازیں اس امت پر تالیف و ترجمہ اور فلسفہ کے زمانہ میں جو ثقافتی حملے ہوئے اور پھر طریقہائے تعلیم کے ذریعہ جس کی تاسیس و حمایت میں صلیبی حکومت نے اپنی ماؤں کی نیندیں حرام کر لیں اور جس کی پشت پر عیسائی مشن کی انجمنیں قتل و اغوا کی مختلف صورتیں آزماتی رہیں جو جو چوٹیں اس امت کو پہنچائی گئیں وہ مسلح حملوں سے کچھ کم نہ تھیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ امت اسلامیہ پر یہ ساری ہی مصیبتیں ہر طرف سے ٹوٹیں مگر اس نے انہیں انگیز کر لیا۔ اس نے سازشوں کے جال میں آنے سے ابا کیا اور اپنی گذشتہ خونچکاں داستان کے اندر مقابلے کے لئے ہمیشہ ابھرنے کی کوشش کرتی رہی اور مختلف جگہوں پر وہ اسلامی ملکوں کو استعماریت کے پھندے سے آزاد کرانے میں کامیاب بھی ہوتی رہی، پھر عجیب بات یہ بھی ہے کہ ظالم اور سرکش طاقتوں کے اندر اس کی آواز سنی بھی گئی۔ حتیٰ کہ مختلف ملکوں میں آج ایک بے مثال شدید ردعمل رونما ہے جو روز بروز بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

اندیشے

یہ نئی لہر جو اسلام اور مسلمانوں پر عظیم مصیبتوں کے بعد پیدا ہوئی ہے کچھ ایسے اندیشوں کی زد میں ہے جو نامعلوم سے ہیں اس لئے کہ مسلمانوں نے ایک طویل زمانہ غلامی کا گذارا ہے جہاں وہ اسلام سے حسد و رقابت رکھنے والی طاقتوں کا ہمیشہ نشانہ بنتے رہے ہیں۔ ان طاقتوں کو خوب معلوم ہے کہ ان کی حکومت مسلمانوں کی دشمنی پر قائم ہوتی ہے چنانچہ وہ ہمیشہ چوکنی رہتی ہیں اور اسلام اور داعیان اسلام کے استیصال میں دن رات سرگرداں رہتی ہیں ابھی ہم نے کہا ہے کہ مسلسل ثقافتی حملے اور نصاب تعلیم کے زہریلے اثرات جسے استعماری طاقتوں نے عالمی مشن کر حرکت میں لا کر ترتیب دیا ہے مسلح حملوں سے کم خطرناک نہیں ہیں، چنانچہ اس کا سب سے پہلا خطرناک پہلو یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے قلوب و اذہان پر کچھ اس طرح چھا گئے ہیں کہ اسلامی افکار و نظریات کے نقوش بہت کچھ دھندلے پڑ گئے ہیں اور ان واضح نقوش کے بغیر اس حملہ کو روکنا ناممکن ہے۔ اسی طرح ان کے دلوں سے خیر و شر کے ناپنے کی تمیز بھی بالکل جاتی رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے جذبات اور افکار کو پریشان ہو ہو جانا پڑا۔ یہ ایک ایسی الجھن ہے جو بعض تعلیمیافتہ مہذب مسلمانوں کو حیرت انگیز طور پر الحاد و ضلالت کی جانب کھینچ لے گئی صرف وہ لوگ اس الجھن سے محفوظ ہیں جو اپنے ایمان کی حفاظت کر سکے یہ وہ گہرا اور مضبوط ایمان ہے جس کی بنیاد عدم شکوک اور پاکیزگی فطرت پر قائم ہے یہاں جہالت کا گذر نہیں بہت کم ایسے لوگ ہیں جنہیں حق کی ہدایت ملی جن کو اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے رہبروں نے حق کی روشنی دکھائی ایمان کے دل و نگاہ کو افکار غیر کے اثرات سے دور رکھا مسلمانوں کی تاریخ میں یہی حضرات حقیقی طاقت کے مرکز اور ہدایت کے مینارے ثابت ہوئے۔

تہذیبی اور تعلیمی حضرات کے ساتھ ساتھ یورپ سے وطنیت اور قومیت کی لہریں بھی اٹھیں جو جھاگ بنکر عالم اسلامی پر چھا گئیں۔ اس لہر کا سب سے خطرناک پہلو یہ ہے کہ وہ انسانوں کے حقیقی جذبات کو برانگیختہ کرتی ہیں۔ کیونکہ انسان وطن اور عادات

فطری طور پر محبت رکھتا ہے۔ لیکن وطنیت اور قومیت کی بنیادوں پر دی جانے والی اپیلیں انسان کو کہیں سے کہیں ڈال دیا کرتی ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دلوں میں حب الوطنی نے اولین جذبہ کی حیثیت سے قبضہ کر لیا جبکہ مسلمانوں کا اولین جذبہ حب الٰہی تھا اسی طرح وطنی تعصبات مصالح کو قابل احترام و لائق تقدیس ٹھہرایا گیا حالانکہ مسلمانوں کو ربانی تعزیرات حرمتوں اور مکارم اخلاق کا پابند بنایا گیا تھا اور یہی باتیں اس کی نگاہ میں محترم اور مقدس بھی قرار دی گئی ہیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ نئی لہر مسلمانوں کے ذہنوں میں ایک پچھی راہ سے داخل ہوئی یعنی — حب وطنی کی فطری پکار، لیکن یہ پکار اس لئے تھی کہ ان کے لئے ایک نیا بُت پیش کیا جائے جو وطن اور وطن کی مصلحتوں کی صورت میں رونما ہو۔ یہ ایک محدود قسم کا مادی خدا ہے حالانکہ قرآن میں آیا ہے کہ مسلمان اپنے جذبات کو صرف اللہ واحد کے لئے ہر طرف سے آزاد کر لیں۔

ففروا الی اللہ انی لکم منہ نذیر مبین ولا تجعلوا مع اللہ الٰہا اخر انی لکم منہ نذیر مبین

اس نئے مادی حملہ کا خطرہ اس وقت اور زیادہ کھل کر سامنے آتا ہے، جب کہ اس کے اثرات اسلامی معاشرے میں دیکھے جاتے ہیں خود اپنے جی سے سوال کیجئے کہ جب ایک لکھا ہوا قانون بھی ہو اور اس کے بالمقابل اللہ کی کتاب بھی ہو تو ایک مسلمان قاضی کا طرز عمل کیا ہوگا۔ کیا وہ اللہ کے حکم پر لکھے ہوئے قانون کو مقدم نہیں رکھے گا؟ کیا اس کا مطلب یہ نہیں ہوا کہ ہم نے معاشرہ اور اس کے قانون کو اپنا خدا بنا رکھا ہے اور اللہ کو چھوڑ کر اسے پوجنا شروع کر دیا ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ ہمارا پروردگار فرماتا ہے۔ "ومن یتبع غیر سبیل المؤمنین نولہ ما تولی و نصلہ جہنم وساءت مصیرا"

یہ خطرہ قومی اور وطنی نقطۂ نظر کے ساتھ خود بخود وجود میں نہیں آیا بلکہ یہ ایک سوچا سمجھا انجام ہے جو بدترین سازشوں کا نتیجہ ہے۔ مسیو شاتلیہ کے الفاظ اس سلسلہ میں لائق مطالعہ ہیں جسے وہ اپنے افتتاحی مقالہ میں سپرد قلم کرتا ہے یہ افتتاحی مقالہ اس کے فرانسیسی رسالہ "العالم الاسلامی" سے ماخوذ ہے جسے اس نے عیسائی مشنری پر ایک خصوصی نمبر کی حیثیت سے نکالا ہے۔ مقالہ کم و بیش چالیس سالہ پرانا ہے، وہ لکھتا ہے :—

"اس میں شک نہیں کہ عیسائی مشنریاں مسلمانوں کے ذہنوں سے اسلامی عقیدہ زائل کرنے میں ناکام و عاجز ہیں، یہ کام صرف اس وقت پایہ تکمیل کو پہونچ سکتا ہے جب کہ یورپین زبانوں میں موجود افکار و نظریات کی اشاعت کی جائے اس طرح اسلام یورپ کے اخباروں میں کسوٹی پر آنے لگا اور اس کی مادی ترقی کے لئے راہ ہموار ہوگی پھر عیسائی مشنریوں کو اسلام کے زاویہ نگاہ کو تباہ کرنے میں فیصلہ کن کامیابی حاصل ہوگی۔

جس کی قوت اور زندگی کا راز صرف اس ایک بات میں مضمر ہے کہ وہ الگ تھلگ رہے۔"

"سیاسی تقسیم (یعنی وطنیت اور قوم پرستی کی تقسیم) جو اس وقت اسلام کو درپیش ہے یورپ کے ثقافتی کاموں کے لئے راہ ہموار کرے گی۔ کیونکہ پایۂ تحقیق کو یہ بات پہونچ چکی ہے کہ اسلام سیاسی اقتدار سے کمزور ہو رہا ہے اور زیادہ زمانہ نہیں گذرے گا۔ کہ اسلام یورپین سلطنتوں سے گھرے ہوئے نظام حکومت کے اندر ایک محکوم اور قیدی بن کر رہ جائے گا۔"

پھر کہتا ہے :—

"ہمیں اس بات کی توقع نہ رکھنی چاہئے کہ تمام عالم اسلامی اپنی اجتماعی خصوصیات اور روایات

> کو بخیر باد کہہ دینے کے بعد کچھ دوسری خصوصیات اور روایات قبول کرے گا اس لئے کہ نظریہ اسلامی میں تدریجی ضعف اور اس کمزوری کے بعد لامحالہ پیدا شدہ اضمحلال ، جبکہ تمام سمتوں میں پھیل چکا ہوگا ، مذہبی روح کو بنیاد سے فنا کر دے گا۔

اس کے بعد آپ ہالینڈ کے مشہور مستشرق ہارگرونجا کی زبان سے سنئے جن کا شمار گنتی کے ان لوگوں میں ہے جن میں تعصب کی بو باس نہیں ملتی وہ اپنے ایک لیکچر میں کہتا ہے ۔ جسے اس نے جاوا کے مسلمانوں سے متعلق ۱۹۱۱ء میں دیا ہے ۔ اس وقت وہ ہالینڈ کی وزارت میں اسلامی اور عربی امور کا مشیر تھا۔

> "خلافت کا مفہوم اس پاپائیت سے بالکل الگ ہے جسے سیاست میں کوئی دخل نہیں ہے ۔ بلکہ وہ ایک سیاسی پیشوائی کا نام ہے ، مسلمانوں میں جو شخص بھی اس سے وابستہ ہوگا اسے کوئی بھی سیاسی اقتدار اپنے زیر اثر نہیں رکھ سکتا ۔ اور افسوس کی بات ہے کہ ان جزیروں کے مسلمان اپنے مذہب و رسوم میں مصر، حضرموت اور جزیرۃ العرب کے مسلمانوں کے مقلد ہیں ۔ عربی ممالک سے جو کتابیں نکلتی ہیں وہ انہی کا مطالعہ کرتے ہیں آج تک ان میں قومی جذبہ نہ ابھر سکا جو اس دینی جذبہ کا مقابلہ کر رہا ہو۔"

ثقافتی حملہ اور قومیت اور وطنیت کے فتنوں کے ساتھ ہم اس بات پر بھی نظر رکھیں کہ عالم اسلامی کے اندر بغاوت کی لہریں بھی اٹھ چکی ہیں اور یہ لہریں اسی نئی اسلامی لہر کو بھی اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہیں تو ہمارا اندیشہ بالکل صحیح ہے ہمیں ڈر ہے کہ کہیں ان کے قطاروں میں گنجائش پیدا نہ ہو جائے اور پھر اسے کوئی مستحکم اور مضبوط فکر برقرار نہ رکھ سکے اور نہ واضح اصول اس کی شیرازہ بندی کی ضمانت دے سکیں۔

ایک سرگرم دعوت کی ضرورت ۔

ان نئی لہروں خطروں اور رجحانات سے جن کا تذکرہ اوپر آچکا ہے صرف ایک ایسی دعوت بچا سکتی ہے جو مسلمانوں کو ان کے دین سے آگاہ کر سکے اور یہ بتا سکے کہ مسلمانوں کا ایجاد صرف اللہ اور حق کے لئے ہوا کرتا ہے ۔ انہیں بے راہ ہو کر نہ چلنا چاہئے ۔ اللہ تعالیٰ نے جس وقت قرآن کو اتارا اور نبی کو مبعوث فرمایا اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ اپنے تئیں خود تعمیر کی بنیاد فراہم کر دے ۔" ثم جعلناک علیٰ شریعۃ من الامر فاتبعھا " اور زمین اپنی فوج کے لئے دفاع و تحفظ کے اصول مقرر کر دے۔

عقیدہ اور نظام ۔

اسلام کی نمود دراصل عظیم الشان انسانیت کی نمود کا ایک مضبوط ترین اعلان تھا ۔ پس اسلام اصلاً آزادی کی ایک عظیم الشان تحریک ہے جو حیات انسانی کے تمام گوشوں کو حاوی ہوا کرتی ہے ۔ اس تحریک کا چشمہ فرد کے ضمیر سے ابلتا ہے اور اجتماعی زندگی کی جانب لپکتا ہے یہ ایک ایسی تحریک ہے جو اپنی راہ میں حائل ہونے والے ہر طرح کی روحانی ، عقلی اور اجتماعی بندھنوں کو توڑ کر رکھ دیتی ہے جو انسانی روح اور انسانی زندگی کا گلا گھونٹ دیا کرتے ہیں ۔ اس تحریک نے انسان کے مکمل حقوق کا اعلان کیا ہے اور انسانیت کی تقریباً تیرہ صدیوں تک کامیاب رہنمائی کی ہے۔

اسلام کی نمود عقیدہ کے میدان میں ایک ایسی تحریک کی نمود ثابت ہوئی جس نے انسانی ضمیر کو وہم و خرافات سے پاک کیا ، ذات الٰہی کو

لہ حاضر العالم الاسلامی پر امیر شکیب ارسلان کا نوٹ جلد ا صفحہ ۶۶ ، ۶۷

شرک کی آلودگیوں سے مطلقاً کنارہ کش قرار دیا۔ عبد اور معبود کے مابین راست تعلق پیدا کیا۔ یہاں اس نے کوئی اور وسیلہ نہ رکھا جو بندوں کے ساتھ اللہ کے تعلق کا نگراں ہو۔

اللہ تعالیٰ کی ربوبیت مطلقہ، رب اور عبد کے مابین راست تعلق ہی عالم عقیدہ کے اندر تنظیم اور اسی طرح آزادی اور غلامی کے درمیان واصل ایک فیصلہ کن حد فاصل ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ خدا اور بندوں کے مابین حائل ہونے والے کاہنوں اور مختلف مذہبی پیشواؤں نے انسانیت کو کس قدر نقصان پہونچایا ہے ہمیں اس ظلم اور قہرمانیت کی داستانیں اب تک یاد ہیں جن کا قرون وسطیٰ میں علماء اور آزاد فکر لوگوں سے سابقہ پڑا ہے۔ اسی وہ بغاوتیں بھی یاد ہیں جو یورپ میں، اللہ کی وکالت کے دعویداروں کے اقتدار کو پارہ پارہ کر دینے کے لئے ابھری تھیں۔

یہیں سے اس حقیقت کا اثبات ہوتا ہے کہ حریت فکر عقیدہ اسلامی کا ایک حقیقی نشان ہے جہاں وسیلہ کے نام سے اللہ اور بندوں کے مابین کوئی شخص حکومت نہیں کر سکتا اور نہ کوئی شخص زمین میں اللہ کی وکالت کا دعویدار بن سکتا ہے پس اسلام کسی ایسی جماعت یا مذہبی طبقہ کو اس مفہوم میں بالکل نہیں مانتا جس مفہوم میں یورپ، ہندوستان یا کسی بت پرست ملک میں مانا جاتا ہے۔

ایک اور پہلو سے اسلام کی نمود عالم عقیدہ میں ایک تحریک کی نمود تھی۔ اس کی تحریک نے دینی عصبیت کا قلع قمع کر دیا کیونکہ وہ حریت عقیدہ اور عبادت کی آزادی کا قائل تھا۔

لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی۔ (البقرہ ۲۵۶)

ولو شاء ربک لآمن من فی الارض کلھم جمیعا أفانت تکرہ الناس حتی یکونوا مومنین (یونس ۹۹)

عصبیت دینی کا خاتمہ اس لئے ہوا کہ اس کی جگہ وسعت وکشادگی پیدا ہو۔ بلکہ دوسرے آسمانی مذاہب سے اعتقادی تعلق رکھنے والوں کے لئے اسلامی ملکوں میں عقیدہ وعبادت کی آزادی مہیا کرنا ضروری ہوگیا۔ کیونکہ تمام انبیاء اور تمام کتب سماویہ پر مسلمانوں کا ایمان ہے۔ قرآن کہتا ہے وقولوا آمنا باللہ وما انزل الینا وما انزل الی ابراھیم واسماعیل واسحاق ویعقوب والاسباط وما اوتی موسیٰ وعیسیٰ وما اوتی النبیون من ربھم لا نفرق بین احد منھم ونحن لہ مسلمون۔

(البقرہ : ۱۳۶)

پہلی مرتبہ جب اسلام میں جنگ کا حکم آیا تو قرآن نے اس کی حکمت بھی بیان کی۔

اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا وان اللہ علی نصرھم لقدیر الذین اخرجوا من دیارھم بغیر حق الا ان یقولوا ربنا اللہ ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع وبیع وصلوات ومساجد یذکر فیھا اسم اللہ کثیرا۔ (الحج ۳۹، ۴۰)

صوامع سے مراد راہبوں کی عبادت گاہیں۔ بیع سے مراد گرجا گھر، صلوات یہود کے معابد ہیں اور مساجد مسلمانوں کی عبادت کے مقامات، اس میں مساجد سے پہلے صوامع، بیع اور صلوات کا تذکرہ کیا گیا ہے، مقصد یہ ہے کہ ان پر ہر طرح کی زیادتی کو روکا جائے اور ان کی زیادہ سے زیادہ حمایت کی جائے اس فیاضی کا حال یہ ہے کہ مشرکوں تک کو جو کسی آسمانی مذہب سے تعلق نہیں رکھتے ایک وقت تک کے لئے یہ حمایت و دفاع حاصل ہے کہ وہ مسلمانوں کو ان کے عقیدہ اور دین کے سلسلہ میں پریشان نہ کریں گے۔

وان احد من المشرکین استجارک فاجرہ حتی یسمع کلام اللہ۔ ثم ابلغہ مامنہ ذالک بانھم قوم لا یعلمون۔ (التوبہ : ۶)

عام ضابطے

(۱) دولت پر انسان کی ملکیت عارضی ہے، کائنات پوری کی پوری اللہ کی ملک ہے تمام مذاہب اس حقیقت کو یکساں تسلیم کرتے ہیں، اس سلسلہ میں یہاں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "اللہ کے لئے وہ سب کچھ ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے"۔

(۲) سماج مجموعی دولت کا وارث ہے، وہ اس بات کا ذمہ دار ہے کہ اسے حاصل کرے اور اصل مالک کے حدود میں رہ کر خرچ کرے "اور خرچ کرو ان چیزوں میں سے جن کا اس نے تمہیں وارث بنایا ہے"۔

(۳) شرعی اعتبار سے فرد جو کچھ کماتا ہے وہ اس کا حق ہے، یہ حق اللہ نے متعین کیا ہے، جماعت اس حق کی نگران ہوگی "مردوں کے لئے ان کی کمائی اور عورتوں کے لئے ان کی کمائی میں ایک حصہ ہے" اسی کو آج کل کی اصطلاح میں انفرادی ملکیت کہا جاتا ہے اسے یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک اجتماعی ڈیوٹی ہے جس کو فرد مذکورہ بالا دونوں اصولوں کے سایہ میں انجام دیتا ہے۔

(۴) صحیح دولت زندگی کا سرمایہ ہے، صحیح دولت کمانا، اسے عمدہ طور پر کام میں لانا اور نتیجہ خیز بنانا واجب ہے اسلام میں زہد و انتقار کا مفہوم وہ نہیں ہے جو لوگوں کو فقر و فاقہ کی حالت میں ڈھکیل دے۔ مال و دولت اور دنیا کی مذمت میں جو کچھ آیا ہے اس کا مطلب اس مطلب کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ سرکشی، فتنہ، فضول خرچی اور معصیت الٰہی کے موجب ہوا کرتے ہیں حدیث میں آتا ہے "کیا ہی عمدہ ہے مال، مرد نیک کے لئے"۔

(۵) دولت کا حصول اور اس کے سرچشموں کا دریافت کرنا واجب ہے۔ قرآن اور سنت اس تاکید سے لبریز ہیں کہ ملکوت الٰہی پر غور و فکر کیا کرو اور کائنات کے اسرار و رموز اور اس کی خوبیاں دریافت کرو۔ کیونکہ یہ پوری کائنات انسان کے لئے مسخر کر دی گئی ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے اور تم پر اپنی نعمتوں کو کھلی ہوں یا چھپی ہوں انڈیل دیا ہے"۔

(۶) کمائی عطیات الٰہی کا ایک مقدس حق ہے جس میں تمام لوگ برابر ہیں۔ اور ضروری ہے کہ سب کے سب ان مواقع میں برابر ہوں جو ہر ایک کے لئے حسب لیاقت اور طاقت کام فراہم کرتے ہوں نیز اس سلسلہ میں وہ ساری رکاوٹیں اور امتیازات ختم کر دیئے جائیں جن کا نام اور پیدا وار میں کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔

(۷) کمائی میں فرد کا حق جماعت کی مصلحتوں کے ساتھ مشروط ہے۔ فرد کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ ایسے وسیلہ رزق تلاش کرے جس سے دوسرے لوگوں کی مصلحتوں کو خطرہ پیش آجائے یا جماعت کی عام مصلحتیں اخلاقی اور مادی دونوں زد میں آجائیں اسی لئے محرمات کے ذریعہ تجارت اور ربوی اور مبنی بر حیلہ معاملات، وہ معاملہ جو اپنے مزاج کے اندر فریقوں کے مابین نزاع کے جراثیم رکھتا ہو اور وہ معاملات جس میں نفع ایک فریق کے لئے بالکل طے ہو اور دوسرے فریق کو کسی طرح کا اعتماد اور ضمانت حاصل نہ ہو، حرام ہیں ایسے ہی احتکار، سرمایہ کاری اور ظلم کی ہر شکل حرام ہے جو شرکاء یا کارکنوں یا مزدوروں پر کیا جاتا ہے اس سلسلہ میں عام ضابطہ رسول گرامی کا یہ قول ہے "لاضرر ولا ضرار"

(۸) زکوٰۃ اپنی تمام شکلوں میں دولت پر ایک معمولی حق ہے۔ اسے محدود مصارف میں خرچ کیا جائے گا، جو بچ رہے گا اسے بیت المال میں داخل کر دیا جائے گا پھر یہ افراد کی دولت شمار ہوگی جو امت کی ضرورتوں اور اس کی عام مصلحتوں پر اسی انداز سے خرچ ہوگی جسے نمائندہ ارکان شوریٰ نے طے کیا ہو اس کی بنیاد یہ ہے کہ معاشرہ جو دولت کا وارث ہے کفالت کا ذمہ دار ہوتا ہے ترمذی کی حدیث میں ہے "دولت میں زکوٰۃ کے سوا ایک اور حق ہے"۔

(۹) الٰہی انصاف ہی وہ میزان ہے جس کے ذریعہ حقوق وواجبات متعین کئے جائیں گے ، اس سلسلہ میں کسی گروہ یا طبقہ کے مابین امتیاز روا نہیں رکھا جائے گا۔ اسلام تو اسی لئے آیا کہ وہ طبقاتی اسپرٹ کو زائل کرکے لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لے آئے ۔ اس سلسلہ میں اس کا طریقہ یہ ہے کہ عقیدہ الٰہی کے زیر سایہ باہم اخوت اور شفقت و مہربانی کے جذبات پیدا کرتا ہے اور فقیر و محتاج کے لئے علم و عمل ، منصفانہ مزدوری ، اور زندگی کا شریفانہ معیار فراہم کرتا ہے اور اس معیار کی نگرانی کرتا ہے خواہ وہ عاجز ہو کام نہ کرسکتا ہو ، یا کام نہ پاتا ہو یا اس کی آمدنی کافی نہ ہو ، حکومت اس پر زکوٰۃ خرچ کریگی اور زکوٰۃ کافی نہ ہوگی تو دوسری مدوں سے مدد کی جائے گی مگر اسے ہرگز اجازت نہ ہوگی کہ وہ اسے صدقات کے لئے ہاتھ پھیلانے پر مجبور کرکے اس کی آب و تاب کے زائل ہونے کا موقعہ آنے دے ۔

اسلام ایک دوسرے پہلو سے مالدار پر فرض کرتا ہے کہ اس کی کمائی اور خرچ حلال ہوں اس کے جمع شدہ سرمایہ یا زکوٰۃ وغیرہ کے ذریعے گردش میں آنے والی دولت کو یکسر قانون وراثت کے ذریعہ منتشر کر دیتا ہے ، اہل شوریٰ کے لئے ضروری ہے کہ عام ضرورتوں کے مقابلہ میں وہ دولت کا اندازہ لگائیں اور مناسب ٹیکس عائد کرے اس سے قبل حضرت عمرؓ انگور پر بھاری ٹیکس عائد کر چکے ہیں کیوں کہ انگور دولت مندوں کا میوہ ہوا کرتا ہے جبکہ کھجور پر جو عام غریبوں کی خوراک تھی ہلکا ٹیکس لگایا تھا ۔

اسلام اس طرح لوگوں کے درمیان قربت پیدا کرتا ہے کہ ان میں رحم و انصاف کا جذبہ پیدا ہو اور کسی طرح کا ظلم یا حسد و کینہ پرورش نہ پائے تاکہ ایک معتدل اور تمام معاشرہ پر حاکم عقیدہ و فکر کے ذریعہ ایک مسلح نظام برپا ہو ، ہر فرد میں ایک قدرتی شخصی تمیز پیدا کرے ، نیز سرمایہ داری کی برائیوں سے بچائے جو بعض افراد میں پیدا ہو جایا کرتی ہیں اور اشتراکیت کے ان مہلکات سے محفوظ رکھے جو فرد کے وجود کو ختم کرکے اسے ایک آلہ کار بنا کر رکھ دیتا ہے ۔

(۱۰) اسلام سودی لین دین کو قطعی طور پر حرام قرار دیتا ہے ۔ کیونکہ وہ انسانیت کو ان تلخ نتائج سے محفوظ رکھنا چاہتا ہے جو آج سودی نظام کی پیداوار بن چکے ہیں یہ نظام سرمایہ دارانہ زمانہ کی ابتداء سے پچھلی پانچ صدیوں میں اقتصادیات کا محور بنا ہوا ہے ۔

بلاشبہ سودی نظام عقیدۂ کفالت اجتماعی سے بری طرح متصادم ہوتا ہے مال و دولت کو یا تو کسی صارف ضرورت کے تحت یا پیداواری ضرورت سے قرض میں دیا جاتا ہے ضرورت صارفہ کے لئے اسلامی معاشرہ کے کفالتی نظام میں کوئی جگہ نہیں ہے البتہ کمالی ضرورتوں کے اندر قرض حسن دیا جاسکتا ہے پیداواری ضرورت کا جہاں تک تعلق ہے تو قرض دینے والے کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ ایک متعین نفع حاصل کرے جبکہ قرض لینے والا ہمیشہ خسارہ اور نقصان کا نشانہ بنا ہوتا ہے باہمی معاملہ میں یہ ظلم ہے ۔ یہاں یہ جواب کافی نہیں ہے کہ مقررہ آمدنی نہیں ہے تو وہ بہت سے سرمائے معطل ہو جائیں گے جو خطرہ میں پڑنا پسند نہیں کرتے اسلام نے اس کا علاج اس انداز میں کیا ہے کہ سرمایہ کاری سے روکا ہے نیز تجارت ، پیداوار اور توکل علی اللہ کی تاکید کی ہے اسی طرح جمع شدہ دولت پر وہ ٹیکس بھی عائد کرتا ہے ۔ علاوہ ازیں سودی لین دین کا سب سے خطرناک پہلو یہ ہے کہ انجام کار میں نفع چند سود دینے والوں میں سمٹ کر رہ جاتا ہے سرمایہ انہی کے ہاتھوں میں سمٹ آتا ہے اور دنیا کی بڑی آبادی اس سرمایہ سے بالکل تہی دامن ہو جاتی ہے جس کی بدولت وہ سب کے سب سود دینے والوں کے مجبور مزدور بن کر رہ جاتے ہیں ۔

پچھلی پانچ صدیوں کے اندر یہ خوفناک نتیجہ تقریباً سامنے آگیا ہوتا اور تمام دولت چند سود خوروں کے خزانہ میں سمٹ چکی ہوتی ، انسانیت اس نظام کو جب تک پاش پاش نہ کرے گی یہ نظام ایک طرف خون کھاتے پیتے گا دوسری طرف عالمگیر سود خوروں کو لقمۂ تر فراہم کرے گا ۔ یہی وجہ ہے کہ ان خطروں کے سامنے آنے سے پیشتر ہی اسلام پورے چودہ سو سال قبل اس طرح کے لین دین کو ممنوع قرار دے چکا ہے ۔

ہم سودی نظام سے ابھرنے والی استعماری جنگوں پر گفتگو نہیں کرنا چاہتے اور نہ اس تباہی اور بربادی کی کہانی سنانا چاہتے جس سے پوری دنیا خطرہ کی زد میں آچکی ہے اس باب میں اتنے اشارے کافی ہیں۔

باقی رہی یہ بات کہ سودی نظام عالمی اقتصادیات کے لئے امر ضروری بن چکا ہے اس کے بغیر کوئی چارہ کار ہے ہی نہیں تو یہ ایک تسلیم شدہ بات نہیں ہے حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو سودی نظام کے بانی ہیں اس بات کو تسلیم نہیں کرتے اس بنیاد کو اشتراکی سماج توڑ چکا ہے پچھلی جنگ میں شکست کھانے سے پہلے جرمنی بھی اس نظام سے بے نیازی ظاہر کر چکا ہے۔ موجود ماہرین اقتصادیات میں بھی بہت سے حضرات اس کی مذمت کر چکے ہیں (PROUDHEN) نے اسے معاشی خلل قرار دیا اور SILVIOGISELL نے ایک اسکول بنایا جو معاشی نظام ایسی بنیاد پر استوار کر سکے جہاں فائدہ کے نرخ پر سود بازی نہ ہو" KEYNES LORD "نے FULL IMPLOYMENT میں ی حد تک عدم فائدہ کا قائل ہوا "HARROD" نے نرخ فائدہ کے خلاف آواز اٹھائی اور دنیا کو اس کے عظیم خطرات سے آگاہ کیا اس کے علاوہ نائٹ، ہیکس، شاکل وغیرہ سب کے سب اس بات پر متفق ہیں کہ "فائدہ" موجود اقتصادی بے چینیوں کا ایک سبب ہے جو مختلف صورتوں میں پیش آ رہی ہیں۔ مثلاً الجھنیں، بیداواری یا مال بوجھ یا آمدنیوں کی تقسیم میں عظیم و وسیع امتیازات وغیرہ۔

اسلام نے سود کو باطل قرار دینے کے ساتھ فائدہ اور نقصان میں شرکت کی معاملت قائم کی۔ ممکن ہے کہ تجارتی بنک شرکت کی اس بنیاد پر اپنا کام جاری رکھیں خواہ یہاں کوئی اپنی رقم امانت میں رکھے یا اس سے قرض لے۔ اگرچہ دونوں ہی کو امانت جمع کرنے یا قرض لینے سے پیشتر کچھ نئی ذمہ داریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

سودی کاروبار سے پاک اقتصادی نظام کے لئے قیام کی راہ میں اگر کوئی دقت ہو تو اسلام اسے اپنے نظام اور اس کی مقتضیات کی فراہمی کا موقعہ تصور کرتا ہے اس لئے وہ نہیں چاہتا کہ دفعتاً کسی منکر کے ازالہ کے لئے کسی بڑے فتنہ کا دروازہ کھول دے۔

ڈاکٹر ابراہیم الشریفی
ترجمہ :- خلیل حامدی

اس تاریخ سے یہ بات بالکل ناقابلِ انکار حد تک واضح ہے کہ بین الاقوامی طاقتوں نے مل کر اسرائیل کو جنم دیا ہے اور مغربی بلاک اور مشرقی بلاک (زیرِ قیادت روس) دونوں نے اس میں ملی بھگت کا ثبوت دیا ہے ۔ روس نے دراصل "دولتِ یہود" کے تصور کو اشتراکی بنیادوں پر جامۂ عمل پہنانے کی سعی کی اور اس معاملے میں اس کے پیشِ نظر اسی منصوبہ پر عملدرآمد کرنا تھا جو اشتراکی تحریک کے یہودی زعماء نے وضع کیا تھا یہی وہ زعماء تھے جنہوں نے لینن اور ٹراٹسکی کی قیادت میں خود روس کے بالشویک انقلاب کی منصوبہ بندی کی تھی۔ اسرائیل کے بارے میں بلاشبہ اس حد تک روس کا منصوبہ ضرور کامیاب ہو گیا کہ ایک یہودی ریاست وجود میں آگئی مگر روس کی یہ کوشش سعی ناکام ثابت ہوئی کہ یہ ریاست خالصتاً کمیونسٹ بن جائے اس کی وجہ زعمائے صہیون کی یہ اسکیم ہے کہ صہیونیت کو بیک وقت کمیونزم اور مغربی سرمایہ داری ، دونوں سے رشتہ برقرار رکھنا ہے اور دونوں سے اپنے مقاصد کی خدمت لینی ہے ۔

اسرائیل اور اشتراکی ممالک کے دوستانہ معاہدے | اب ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ اسرائیل کی یہودی ریاست قائم ہو جانے کے بعد اشتراکی ممالک نے اسے پروان چڑھانے کے لئے کیا کچھ کیا ہے ۔ مشرقی کیمپ اور خاص طور پر سوویت یونین ، یوگوسلاویہ ، چیکوسلواکیہ اور رومانیہ نے اسرائیل کے ساتھ اقتصادی ، ثقافتی اور فنی تعلقات کو قائم کرنے اور بڑھانے میں مغربی کیمپ سے ہمیشہ سبقت کی ہے چنانچہ اسرائیل نے سب سے پہلا معاہدہ جو کسی بیرونی ملک کے ساتھ کیا وہ وہ معاہدہ تھا جو اسٹالن کے عہد میں سوویت یونین کے ساتھ کیا گیا اس ابتدائی معاہدے کے بعد خروشیف کے دور میں پے در پے تجارتی ، ثقافتی اور سیاحتی معاہدات استوار کئے گئے ان سب پر مستزاد وہ معاہدہ ہے جو بحری تجارت کے میدان میں اسرائیل سے کیا گیا ہے اور جس کی رو سے روس کے تجارتی جہاز اسرائیلی بندرگاہوں کے لئے استعمال کئے جا سکتے ہیں چنانچہ اسرائیل بالفعل روسی جہازوں کے ذریعہ سے ہی ایشیا کی منڈیوں اور مشرقی یورپ اور افریقہ کے ممالک میں اپنی برآمدات منتقل کر رہا ہے صرف ۱۹۶۴ء میں اسرائیل اور روس کے درمیان تین معاہدات قائم ہوئے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے ۔

۱ ۔ تجارتی معاہدہ : اس معاہدے کی رو سے دونوں ملکوں کے درمیان تجارتی اشیاء کے تبادلہ کو ترقی دی جائے گی ۔ روس اسرائیل سے فاسفیٹ ، کیمیاوی اشیاء اور پارچہ جات خریدے گا اور اسرائیل روس سے انجن ، بجلی کے آلات اور ریشم درآمد کرے گا تاکہ اپنے کارخانوں میں تیار کر کے اُسے یہودیوں کی تجارتی کمپنیوں کے ذریعہ مغربی یورپ اور امریکہ میں فروخت کرے ۔

۲ ۔ سیاحت کا معاہدہ : دونوں ملکوں کے درمیان سیاحت کو ترقی دی جائے گی اور اس میدان میں ہر طرح کی سہولتیں بیش از بیش فراہم کی جائیں گی ۔ روسی مزدوروں اور اسرائیلی مزدوروں کے مابین روابط کو نشو و نما دیا جائے گا ۔ دونوں ملکوں میں فنکاروں ، سائنسدانوں

اور مصنفین کے باہمی تبادلہ اور دوروں کے لئے سالانہ پروگرام وضع کئے جائیں گے ۔ چنانچہ اس معاہدہ کی رو سے ۱۹۶۴ء میں ہزار ہا روسی سیاح اسرائیل میں داخل ہوئے ہیں اور ادھر یہودی نوجوانوں اور عمال کے متعدد وفد سوویت یونین کا دورہ کر چکے ہیں ۔

۳۔ بحری نقل و حرکت کا معاہدہ : دونوں ملکوں کے درمیان مشترک بحری تجارت کی درآمد و برآمد میں پوری سہولتیں مہیا کی جائیں گی ۔ اسرائیل کے تجارتی جہازوں کو اجازت ہوگی کہ وہ سامانِ تجارت کو لادنے اور اتارنے اور ایندھن حاصل کرنے کے لئے روسی بندرگاہ کو استعمال کریں اس کے بالمقابل روس کا تجارتی بیڑہ اسرائیلی بندرگاہوں کے استعمال کا مجاز ہوگا ۔

اسرائیل اور روس کے مابین جتنے معاہدات ہوئے ہیں ان کی دیکھا دیکھی دوسرے اشتراکی ممالک نے بھی ۱۵ سالوں کے اندر اسرائیل کے ساتھ متعدد معاہدات استوار کئے ہیں ان ملکوں کے ساتھ اسرائیل کے معاہدات کا اجمالی بیان یہ ہے ۔

	معاہدات	ابھی تک قائم اور جاری ہیں
یوگوسلاویہ کے ساتھ	۵ ۔	〃 〃
چیکوسلواکیہ کے ساتھ	۴ ۔	〃 〃
رومانیہ کے ساتھ	۳ ۔	〃 〃
بلغاریہ کے ساتھ	۳ ۔	〃 〃
پولینڈ کے ساتھ	۳ ۔	〃 〃
ہنگری کے ساتھ	۳ ۔	〃 〃

اشتراکی ممالک اسرائیل کی منڈی ہیں | اشتراکی ممالک کی ہر گونہ مدد کی بدولت جس میں اسرائیلی مصنوعات کے لئے منڈیاں مہیا کرنا اور اسرائیل کو ہر نوعیت کے میکانکی آلات فراہم کرنا بھی شامل ہے ، اسرائیل نے قلیل مدت میں ترقی کے کئی مراحل طے کر لئے اور اس کی پیداوار میں کئی گنا اضافہ ہو گیا یہ بات ہر خاص و عام کو معلوم ہے کہ اسرائیل اپنی فاضل زرعی پیداوار (پھل اور غلہ) کا ۶۰ فیصد ، کیمیاوی اشیاء کا ۴۰ فیصدی اور مختلف مصنوعات کا ۵۰ فیصد مشرقی یورپ کے ممالک اور روس کو برآمد کرتا ہے ان ممالک میں یوگوسلاویہ پیش پیش ہے جس نے اسرائیل کے ساتھ پچھلے چند سالوں میں تجارتی تعلقات کو بڑی وسعت دی ہے یعنی ۱۹۵۰ء تک اس کے تعلقات کی جو نسبت تھی اس کے بعد یہ نسبت تین گنی بڑھ گئی ۔

جو بات خاص طور پر توجہ طلب ہے وہ یہ ہے کہ اسرائیل اشتراکی بلاک سے جو اشیاء درآمد کرتا ہے ان کا بڑا حصہ افریقہ اور ایشیا کے مختلف ممالک کو برآمد کر دیتا ہے اسرائیل کی اپنی مصنوعات کا بھی یہ حال ہے کہ جو افریقی ممالک اسرائیل کے ساتھ تجارتی اور فنی معاہدوں میں منسلک ہیں ان کی منڈیوں میں اسرائیلی مصنوعات کی بھرمار ہو رہی ہے اور قریب قریب اسرائیلی مصنوعات نے منڈیوں پر قبضہ کر رکھا ہے ۔

(ترجمان القرآن)

قمر ہاشمی

سلام بہ حضور خیر البشر

(جناب قمر ہاشمی کی نظمیں سرمایہ و محنت کے مسائل اور سماجی ماحول و افکار کی ترجمان ہوتی ہیں۔ صاحب موصوف کو یہ شرفِ سعادت حاصل ہوا ہے کہ انہوں نے سرورِ کائنات، فخرِ موجودات حضور ختمی مرتبت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہِ انسانیت پناہ میں مخلصانہ ہدیہ عقیدت گزرانا ہے۔)

سلام اے آدمی کو آدمی ہی جاننے والے
سلام اے سب کی تکلیفوں کو اپنی جاننے والے

سلام اے عام لوگوں کی بھلائی چاہنے والے
سلام اے صرف مولا کی بڑائی چاہنے والے

سلام اے نخوتِ باطل کا نشہ توڑنے والے
سلام اے صرف حق سے اپنا رشتہ جوڑنے والے

سلام اے آسمانِ عدل کے مہرِ جہاں آرا
ہے تیری ذات امن و صلح کا خوش تاب مینارا

سلام اے تشنہ ماحول میں تسکین روحانی
سلام اے جبر و استبداد میں انصاف کے بانی

سلام اے فاتحِ عالم دلوں کو جیتنے والے
ترے جلوے بنا دیتے ہیں اندھیاروں کو اُجیالے

سلام اے نازِ گیتی، افتخارِ آدمِ خاکی
زمیں پر بیٹھنے والے مگر ہے شان لولاک کی

مجسم خیر تھا رحمت تھا آئین جہانبانی
کہ جس پر فخر کر سکتی ہے عقلِ نوعِ انسانی

اخوت سے محبت سے دلوں پر حکمرانی کی
نہ جاہ و مال کی خواہش نہ طاقت کی تمنا تھی

مگر سکھلا دیئے دنیا کو دستورِ جہاں داری
نہ سرکاری نہ درباری نہ زرداری نہ عیاری

سلام اے ساقیٔ کوثر! ترا دربار عالی ہے
میں اک مدت سے پیاسا ہوں مرا پیمانہ خالی ہے

سوز و ساز

حضرت سیماب اکبرآبادی :—

نا نہ آنے پائے کوئی خواب میں بھی سوئے دوست
رات پھر فرض تصور ہے طوافِ کوئے دوست

اختیارِ دوست دل پر ضبط پر قابوئے دوست
یہ مرا نالہ نہیں دراصل ہے "یا ہوئے دوست"

یاد ایام کہ تھا ہم رنگ ذوقِ حسن و عشق
رفتہ رفتہ میری عادت ہو گئی تھی خوئے دوست

ہو چکا ہوں بارہا عذرِ نزاکت کا شہید
کر چکا ہوں امتحانِ قوتِ بازوئے دوست

ہائے! وہ جو التفاتِ دوست پر کرتے ہیں ناز
اُن سے کہہ دو اک طرف بھی ہے جزو خوئے دوست

کارفرمائے دو عالم ہیں اشارے دوست کے
دونوں عالم ہیں خرابِ جنبشِ ابروئے دوست

تکیۂ سر تھا کبھی سیمابؔ زانوئے دوست کا
اب مرا سنگِ لحد ہے تکیۂ زانوئے دوست

شفقت کاظمی :— دشمن و دوست کی نظروں سے گرایا ہے مجھے
یہ بُرا وقت بھی قسمت نے دکھایا ہے مجھے

اپنے حالات پہ جب غور کیا ہے میں نے
اپنے حالات نے تا دیر رلایا ہے مجھے

آزمایا ہے مرے ذوقِ طلب کو برسوں
جب کبھی اُس نے حضوری میں بلایا ہے مجھے

اس سے پہلے کبھی ایسا میں پُر اُمید نہ تھا
تم نے شاید کوئی پیغام سنایا ہے مجھے

اپنے اس جوشِ تمنا کے میں صدقے جاؤں
جو تری بارگہِ ناز میں لایا ہے مجھے

کیا عجب شے ہے مرا فقر کہ جس نے شفقتؔ
دوست دشمن کی نگاہوں پہ چڑھایا ہے مجھے

ڈاکٹر اختر القادری :— مائل بہ کرم آج وہ دزدیدہ نظر ہے
لیکن مجھے اس خواب کی تعبیر کا ڈر ہے

آغازِ مسرت سے وہ خوش ہو نہیں سکتا
جس شخص کی انجامِ مسرت پہ نظر ہے

نسیم المہدی :— جو پہلے پہل تیری نگاہوں نے دیا تھا
پھر کوئی نظر لے کے وہ پیغام نہ آئی

ماہر القادری :—

اپنی آشفتہ سری پہ ہے بہت ناز مجھے
آپ کر سکتے نہیں اب نظر انداز مجھے

اُن کی محفل سے اُٹھا پھر نہ پلٹ کر دیکھا
وہ بھی دیتے رہے آواز پہ آواز مجھے

بازوؤں ہی میں سکت ہے نہ موافق ہے فضا
مار ڈالے گی مری کوششِ پرواز مجھے

چشمِ مشتاق نے وہ چوٹ لگائی ہے کہ ہائے!
یاد رکھے گی نگاہِ غلط انداز مجھے

جانے! کس حال میں کس وقت مرا آنا ہو
خوب پہچان لے اے انجمنِ ناز مجھے

ہماری نظر میں

الاتقان (حصہ اول)

تالیف :- علامہ جلال الدین سیوطی ؛ ترجمہ :- مولانا محمد حلیم انصاری ــــ تصحیح و تزئین :- مولانا عبد الحلیم چشتی و معراج محمد بارق ؛ ضخامت ۶۰۰ صفحات (مجلد، رنگین سرورق) قیمت اٹھارہ روپیہ
ملنے کا پتہ :- اصح المطابع (کارخانہ تجارت کتب) آرام باغ، کراچی

شیخ جلال الدین عبد الرحمٰن، سیوطی رحمتہ اللہ علیہ (۸۴۹ ـــ ۹۱۱ھ) شہرۂ آفاق شخصیت کے مالک ہیں، انہوں نے تقریباً ہر فن اور علم پر کتابیں تصنیف اور تالیف کی ہیں، علامہ سیوطی کی لکھی ہوئی اور جمع و تالیف کی ہوئی کتابوں میں "الاتقان فی علوم القرآن" سب سے زیادہ بلند، بسیط و جامع اور مفید تالیف ہے، اس تالیف کا اصل ماخذ علامہ زرکشی کی "کتاب البرہان" ہے۔

"سیوطی" کا علمی دنیا پر یہ احسان ہمیشہ یاد رہے گا، کہ اس نے زرکشی کی گوشہ گمنامی میں پڑی ہوئی کتاب کو الاتقان میں ذکر کر کے علمی دنیا کو اس سے روشناس کرایا، اور اس کو ہمیشہ کے لئے زندۂ جاوید بنا دیا" (مولانا عبد الحلیم چشتی)

"الاتقان" کا اردو میں ترجمہ مولوی عبد الحلیم انصاری رودلوی مرحوم نے کیا تھا جو فیض بخش اسٹیم پریس فیروز پور شہر نے اب سے ساٹھ سال قبل ۱۹۰۸ء میں شائع کیا تھا[1]۔ اس ترجمہ پر مولانا عبد الحلیم چشتی اور معراج محمد صاحب بارق نے نظر ثانی کی ہے اور صرف نظر ثانی نہیں فرمائی بلکہ ترجمہ کی "تزئین" کا کارنامہ انجام دیا ہے، ترجمہ کی غلطیوں کو درست کیا ہے، محاورہ اور روزمرہ کے استقام کی بھی تصحیح کی ہے! مولانا چشتی کا "مقدمہ" محققانہ اور عالمانہ ہے، جس کے مطالعہ سے قرآنی علوم پر لکھی ہوئی کتابوں سے تعارف ہو جاتا ہے۔

اس مقدمہ میں مسٹر غلام احمد پرویز کی چوری پکڑی گئی ہے کہ اس شخص نے مولانا عبد الرشید نعمانی کی لغات القرآن کا ادبی تعرف اپنی کتاب "لغات القرآن" میں منتقل کر لیا ہے۔

"الاتقان" کوئی شک نہیں قرآنی علوم و معارف کا بیش بہا گنجینہ ہے اور اس موضوع پر بے مثال کتاب ہے، قرآن کریم

---

[1] راقم الحروف نے تیس پہلے حیدرآباد دکن میں اس ترجمہ کو پڑھا تھا، مولانا صبغتہ اللہ بختیاری صاحب نے یہ کتاب مجھے پڑھنے کے لئے عنایت فرمائی تھی۔ (م۔ ق)

کے علوم کا بڑے سے بڑا عالم "الاتقان" سے بے نیاز نہیں ہو سکتا اس کا ہر صفحہ معلومات میں اضافہ کرتا ہے اور قرآنی بیان و معانی کے عجیب عجیب نکتے حریم قدس کے پردوں کی طرح کھلتے اور اٹھتے چلے جاتے ہیں، فاضل مولف نے سینکڑوں کتابوں کے مطالعہ کے بعد اس کتاب کو تالیف کیا ہے!

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کو اُن کی تمام علمی جلالت و تبحر کے باوجود حاطب اللیل کہا گیا ہے کہ وہ ہر قسم کی روایتیں اپنی کتابوں میں درج کر دیتے ہیں، فاضل مقدمہ نگار نے بھی اپنے مقدمہ میں لکھا ہے۔

"یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ جو مصنف کثرت سے کتابیں لکھتے ہیں اُن سے غلطیاں بھی بہت ہوتی ہیں کیونکہ لکھنے کے بعد اس کے دیکھنے کی اُنہیں فرصت ہی نہیں ملتی، یہی وجہ ہے کہ سیوطیؒ کے یہاں بھی بعض نہایت فاحش غلطیاں نظر آتی ہیں، الاتقان بھی اس قسم کی غلطیوں سے خالی نہیں ہے، شیخ محمد زاہد الکوثری ——— طبقات الحفاظ میں لکھتے ہیں:-

"الاتقان فی علوم القرآن" تمام تر بدر الدین زرکشی کی کتاب البرہان سے ماخوذ ہے اور یہ اس موضوع پر جلیل القدر کتاب ہے مگر سیوطیؒ نے اس کے مفید تر مقامات کو نظر انداز کر دیا ہے اور کھلی کھلی غلطیوں میں بھی اُن کی اتباع کر گئے ہیں، جیسے اسباب النزول کی بحث .... بہت سی ایسی روایتیں بغیر تحقیق بھر دی ہیں، جن سے دشمنانِ قرآن استدلال کرتے ہیں"

ترجمہ سلیس اور رواں ہے، ——— "ایک یہودی عمر بن الخطاب کو ملا" (سے عام ہونا چاہئے) صفحہ ۸۶ یا" ——— "اہل شام کے قرآتوں کے حروف" (صفحہ ۱۵۱) (کی قرآتوں کے حرف ترجمہ کرنا تھا) اس قسم کے تسامحات کہیں کہیں پائے جاتے ہیں: کوئی شک نہیں "الاتقان" کا ترجمہ اُردو ادب کی ثروت میں گراں قدر اضافہ ہے، علمائے کرام نے کس قدر عقیدت و خلوص، عرق ریزی اور محنت و جانفشانی کے ساتھ قرآنی علوم کی تحقیق اور خدمت کی ہے اس کا اندازہ اس کتاب سے ہوتا ہے (رحمہم اللہ تعالیٰ فجزاہم خیرالجزاء)

اعجاز القرآن فی تجوید الفرقان

مولفہ:- ابوالاشہد مولانا قاری سید محمد عنایت علی میرٹھی، ضخامت ۲۵۴ صفحات دیدہ زیب جلی کتابت، سفید کاغذ، سرورق حسین و رنگین، قیمت پانچ روپے ۵۰ پیسے

ملنے کا پتہ:- ادارۂ تبلیغ القرآن، سعود آباد ایس۔ ڈی بلاک نمبر ۴۸۰، کراچی ۲۲

فاضل مولف کے والد علامہ سید محمد لطافت علی میرٹھی مرحوم نے اب سے پہلے تقریباً چالیس برس پہلے "تحریک تبلیغ القرآن" کی بنا ڈالی تھی، قاری عنایت علی صاحب نے۔

اگر پدر نتواند پسر تمام کند

کے مصداق اس تحریک کو پروان چڑھایا، انہوں نے علم قرأت اور فن تجوید پر بڑی مفید بلکہ یوں کہنا چاہئے معرکۃ الآرا کتاب تالیف کی ہے انداز ترتیب اور اسلوب تفہیم دل نشین اور اپنی نوعیت میں منفرد ہے! قرأت و تجوید کے ضروری قاعدے اور اصول اس کتاب میں آگئے ہیں، جن کے مطالعہ سے اپنی کوتاہیوں کا اندازہ ہوتا ہے کہ ہم قرآن کریم کی تلاوت میں تجوید و قرأت کی کیسی کیسی غلطیاں کرتے ہیں۔ فن تجوید، اس حقیقت کو بھی واضح کرتا ہے کہ امت نے مہبط وحی حضرت ختمی مرتبت (علیہ الصلوٰۃ والتسلیم) کے لب و لہجہ تک کو محفوظ کر رکھا ہے!

"جس حرف پر یہ تشدید ہوتا ہے" (صفحہ ۲) "تشدید" مذکر نہیں مونث ہے۔ صفحہ ۱۱ پر "رباعیات" (ثنایا کے پہلو کے چار دانت) پیش (ضمہ) کے ساتھ کتابت ہوا ہے یہ کاتب کا سہو قلم ہے حالانکہ اس لفظ کے ساتھ قوسین میں ـــ را فتح کے ساتھ ـــ لکھا ہے!

صفحہ ۱۲۱ پر "تجوید" کی "د" پر کسرہ کتابت ہوا ہے، حالانکہ "تجوید" کی "دال" ساکن ہے ـــ صفحہ ۱۵ پر "واللہ اعلم بالثواب" پڑھ کر طبیعت منغض ہوئی یہ بھی سہو کتابت معلوم ہوتا ہے کہ "بالصواب" کی جگہ "بالثواب" چھپ گیا۔

کتاب کے آخر میں فاضل مولف نے اپنے والد محترم (رحمۃ اللہ علیہ) کے جو اشعار دئیے ہیں وہ فنِ شاعری کے اعتبار سے کمزور ہیں اور شاعر کی حیثیت سے اُن کا اچھا تعارف نہیں کراتے۔

"اعجاز القرآن" کی تعریف اور تصویب میں متعدد علماء کی قیمتی آراء اس کتاب میں درج ہیں، اللہ تعالیٰ صاحب تالیف کو اس محنت کا اجر عطا فرمائے۔

اسلام اور میرا مذہب　از:- حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی لکھنوی، ضخامت ۴۰ صفحات، قیمت:- دو روپے
ملنے کا پتہ:- مکتبہ فاروقیہ، برکات فاروق اے ۱۸۹ ایچ، شمالی ناظم آباد، کراچی ۳۳

حضرت مولانا عبدالشکور لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ کا نام اور اُن کی دینی خدمات کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں۔ اُن کی پوری زندگی دینِ حق کی تبلیغ، مدافعت اور خدمت میں گزری ہے حضرت موصوف کی زندگی اسلاف کی زندگی کا نمونہ اور یادگار تھی!

حضرت مولانا مرحوم کے صاحبزادے مولانا عبدالغنی فاروقی نے اس کتاب کے مقدمہ میں لکھا ہے۔

"شہر لکھنؤ میں ۱۹۱۳ء میں تمام مذاہب کی ایک کانفرنس بہت بڑے پیمانے پر یہ جاننے کے لئے منعقد ہوئی تھی کہ سب سے سیدھا سچا اور آسان مذہب کون ہے؟

اس کانفرنس میں تبدیلہ وکیپ . . . . . ـــ حضرت مولانا الحاج شاہ عبدالشکور فاروقی رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت کامیاب اور دلنشین انداز میں مذہب اسلام کی خوبیاں بیان کی تھیں، جن کا ملخص اس کتاب کی شکل میں اس وقت آپ کے سامنے ہے"

اس کتابچہ میں حضرت امام اہل سنت نے دینِ اسلام کی آٹھ خصوصیات بیان کی ہیں جو تمام محاسن اور خوبیوں کی جامع ہیں اور جن سے اللہ تعالیٰ کا دین دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں ممتاز و منفرد نظر آتا ہے! اس کے بعد وہ باتیں بیان فرمائی ہیں، جو اسلامی تعلیمات کا خلاصہ ہیں۔

وکذالک جعلناکم امۃ وسطاً لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا	اور اسی طرح ہم نے تم کو اے (اصحاب نبی) درمیانی گروہ بنایا کہ تم نمونہ ہو لوگوں کے لئے اور رسول نمونہ ہوں تمہارے لئے! (ص ۱۰)

"شہید" کا ترجمہ "گواہ" کی بجائے "نمونہ" کیا گیا ہے اسی طرح "امت وسطاً" میں پوری امت سے جو خطاب ہے اُسے قوسین میں "اصحاب نبی" سے منسوب کیا ہے ـــ ذہن میں اس "ترجمہ" نے کھٹک پیدا کی!

صفحہ ۲۰ پر ـــ "کما یعرفون ابناء ھم" کا ترجمہ "اپنے بیٹوں" کی جگہ "اپنے نبیوں" پڑھا گیا یہ کتابت کی غلطی ہے۔

"چنانچہ اس زمانہ میں سب سے بڑا ساحر قنوج میں رہتا تھا، جس کا نام سریانک تھا رسولِ خدا

صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان دعوت اُس کے نام صادر ہوا اور اُس فرمان کو لے کر بڑے اکابر صحابہ مثلاً اسامہ اور حضرت ابوموسیٰ اشعری قنوج تشریف لائے۔

(دیکھو اسد الغابہ چہارم ردیف میم)

یہ روایت بے اصل ہے اور تاریخ کا بس ایک لطیفہ معلوم ہوتی ہے۔ حضورؐ کے زمانہ میں کسی صحابہ کا ہندوستان کے کسی راجہ کے نام "نامہ مبارک" لیکر آنا ثابت نہیں ہے۔

"اسلام میرا مذہب" (تحفۃ الاسلام لجمیع الاقوام) اسلام کی حقانیت پر ایک قیمتی دستاویز ہے یہ کتاب اس قابل ہے کہ مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں میں بھی اس کی اشاعت کی جائے۔

صیانۃ الحدیث (حصہ اول)

مؤلفہ:- مولانا عبدالرؤف رحمانی جھنڈانگری، ضخامت ۳۲۸ صفحات۔ قیمت ۳ روپے ۵۰ پیسے
ملنے کا پتہ:- عبدالرؤف رحمانی جھنڈانگری معرفت قاضی تبارک اللہ ڈاکخانہ رام دت گنج ضلع بستی (

کتاب کا نام ہی اُس کے موضوع اور مضامین کی نشاندہی کر رہا ہے "صیانۃ الحدیث" کے چند اہم ابواب و عنوانات:-
منکرین حدیث کے شکوک ——— قرآن و حدیث کا باہمی تعلق ——— صحابہ کے عدول ہونے پر اجماع امت ——— کتابت حدیث ——— محدثین کا اہتمام کتابت ——— احادیث کے چند مجموعے ——— حضرت ابوبکرؓ احادیث نبویہ کے پہلے جامع اور حافظ کی حیثیت سے ——— احادیث کی روشنی میں فیصلے ——— حضرت عمرؓ کا سنن نبویہ سے احتجاج و استدلال۔ عبداللہ ابن مسعودؓ کے پاس احادیث کا ایک مجموعہ تھا ——— حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن عاص احادیث کے جامع کی حیثیت سے ——— آنحضرت کے عہد مبارک میں حدیث کا وجود اور عمل بر حدیث کے واقعات۔

مندرجہ بالا عنوانات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب کتنی مدلل، مفید اور ایمان افروز ہے، فاضل مولف نے سینکڑوں کتابوں کا خلاصہ اس ایک کتاب میں سمو دیا ہے۔ کتاب کے دیباچے (عرض حال) میں برق جیلانی صاحب کی "دو اسلام" کا ذکر بلکہ اُس پر طنز ہے، اگر اب جناب برق جیلانی اپنے سابقہ مسلک ضلالت سے تائب ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ استقامت عطا فرمائے (آمین)

نکاتِ حیات

از:- آغا صادق (ایم۔اے) ضخامت ۱۲۸ صفحات (مجلد، رنگین گردپوش) قیمت تین روپے
گلگشت کالونی ملتان اور مکتبہ آغا صادق، شارع نجم الدین، کوئٹہ

جناب آغا صادق کی رباعیات اور قطعات کا یہ مجموعہ "نکات حیات" کے نام سے شائع ہوا ہے، کتاب کا آغاز "قطعہ" سے ہوتا ہے، ارشد امروہوی نے کتنی برجستہ اور شگفتہ تاریخ کہی ہے۔

ایک نے اٹھ کے کہہ دیا فوراً
آغا صادق حسین زندہ باد

۱۳۸۸
―――
۱۳۸۷ھ

آغا صادق صاحب تعمیر پسند شاعر ہیں، ملت اسلامیہ کا درد اور خلق خدا کی اصلاح کا جذبہ شعر کے قالب میں ڈھل کر عبرت و موعظت کا نقش بن جاتا ہے۔ "نکاتِ حیات" اس قسم کے تعمیری نقوش سے لبریز ہے!

خیر مجسم رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم (

قدرت کی عجب شانِ رزاقی ہے — میخانے میں آج آدمِ ساقی ہے
آفاق کو خیرِ محض نے گھیر لیا — اب شر کیلئے کہاں جگہ باقی ہے

عشق رسالت مآب

بندوں کی یہ لوحِ حق سے لگا دیتا ہے — پردہ اسرار سے اُٹھا دیتا ہے
یہ عشقِ محمد کا تصرف دیکھو — انسان کو انسان بنا دیتا ہے

خاکی و نوری

قسمت میں مقدر سے جو ہونا ہو جائے — الفت ترا اوڑھنا بچھونا ہو جائے
خاکی ہے تو نوریوں کا ہو حلقہ بگوش — پارس سے جو چھو جائے وہ سونا ہو جائے

فریب نفس

کیا ذکر فروتنی جو ہر دل میں غرور — اس عجز میں بھی نفس پرستی ہے ضرور
لب پہ تو ہے "خاکسار، عاجز، بندہ" — دل میں یہ ہوس آپ کہیں مجھ کو حضور
"آپ" کی جگہ "لوگ" ہوتا —— تو!

تحفۂ درویش

سرمایہ پرست ہوں، نہ عشرت اندیش — بخشا ہے جو قدرت نے وہ کرتا ہوں میں پیش
شاعر ہوں مرا ہدیہ ہیں افکارِ حیات — برگ سبز است تحفۂ ایں درویش

نذرِ شاعر الحاد

کیونکر رُخِ کائنات پہچانے گا — کس طرح مقاماتِ بشر جانے گا
اللہ کو اللہ نہیں مان سکا — انسان کو انسان تو کیا مانے گا
تاریک ہے دل دماغ گو روشن ہے — خالق سے مذاق بھی کمالِ فن ہے
اے شاعرِ الحاد ترا ہر نکتہ — بوجہل کے دل کی آخری دھڑکن ہے

قطعات

تالیف:- مرے ٹوٹے ہوئے دل کے جو ٹکڑے — اُٹھائے اُس نے دستِ گلفشاں سے
انہیں جوڑا اور اِس خوبی سے جوڑا — نہیں کھلتا کہ ٹوٹا تھا کہاں سے

زبانِ دل:- محبت جذب و شوق و آرزو ہے — محبت امتزاجِ رنگ و بُو ہے
محبت بے نیازِ حرف و آواز — محبت دل سے دل کی گفتگو ہے

محرمِ راز:- محبت سوز بھی ہے، ساز بھی ہے — یہ خاموشی بھی ہے، آواز بھی ہے
جو محرم ہو تو عالم آشکارا — اگر محرم نہیں تو راز بھی ہے

مستقبل:- سورج کے اُبھرنے میں ابھی وقت لگے گا — یہ درد گزرنے میں ابھی وقت لگے گا
تعمیر کی فطرت میں ہے تاخیر پسندی — انسان کے سنورنے میں ابھی وقت لگے گا

دوسرا رُخ :-

جب عشق نہیں غزل نگاری بے سود — ہے دردِ جگر گریہ و زاری بے سود
کاغذ کے بنا رہا ہے گل بوٹے کیا — تخئیل ہے یہ ساری کی ساری بے سود (ص ۴۴)

تینوں مصرعے خاصے اچھے ہیں مگر چوتھا مصرعہ جسے سب سے زیادہ جاندار ہونا چاہئے تھا، کمزور بلکہ بے جان ہے۔

مژدہ کہ یہاں اہلِ قلم آئے ہیں — اربابِ کمال کے قدم آئے ہیں
جس روز سے آپ آگئے ہیں ہم میں — سچ پوچھئے تو آپ میں ہم آئے ہیں (ص ۴۳)

رُباعی میں کوئی لطف نہیں :

دریائے حقیقت میں بہے جاتا ہوں — انسان ہوں دُکھ درد سہے جاتا ہوں
ہے رنگ پرانا کہ نیا تم جانو — محسوس جو کرتا ہوں، کہے جاتا ہوں (ص ۵۵)

دریائے حقیقت میں بہنے اور دکھ درد سہنے میں کوئی مناسبت نہیں ؛ ہاں ! اس رُباعی کے آخر کے دونوں مصرعے خوب ہیں۔

تفریح کی جنس عام کرنے والو — تحسین کا اہتمام کرنے والو
کیا چہرہ کردار بھی دیکھا اپنا — تفسیرِ حسن کلام کرنے والو (ص ۵۸)

اس رباعی کا عنوان —— گفتار و کردار —— ہے ؛ مگر الفاظ کے دروبست سے بات بنی نہیں ؛ خاص طور سے چوتھا مصرعہ زبان اور ترکیب لفظی کے اعتبار سے عجیب سا ہے۔

انفاس کی موج موج کا تھم جانا — نبضوں کا رواں دواں ہو جم جانا
یہ موت نہیں، موت ہے نا اُمیدی — ٹوٹے ہوئے دل کو، ٹوٹتا دم جانا (ص ۶۰)

شاعر کا مفہوم ذہنی پوری طرح واضح نہیں ہوا، دوسرے اور چوتھے مصرعوں میں ژولیدگی پائی جاتی ہے۔

محبت ہے کسی سے لو لگانا — محبت ہے کسی دل میں سمانا
کسی کے پاس جانا تو نہیں ہے — محبت ہے کسی کو کھینچ لانا (ص ۱۰۳)

جب محبت کسی سے لو لگانے کا نام ہے —— تو پھر اس صورت میں تیسرے اور چوتھے مصرعے کا مفہوم مصرعہ اولیٰ کے معنیٰ کی تردید کرتا ہے کیونکہ عاشق جب کسی سے "لو لگائے گا" تو تصور میں یا عملاً محبوب کے کوچہ یا بزم میں اُسے جانا ہی پڑے گا اور طلب و جستجو کی پہل محبوب نہیں محب ہی کی طرف سے ہوگی :

اہلِ دل، اہلِ نظر ہیں اب بھی نخچیرِ انیس
دل میں نشتر گھونپتی ہے طرزِ تحریرِ انیس
ساحری سے ڈال دی ہر لفظ کے قالب میں جان
مائل تقریر ہے ایک ایک تصویرِ انیس (ص ۱۱۶)

"دل میں نشتر گھونپتی ہے" یہ کہاں کی زبان ہے "دل میں نشتر توڑتی ہے" کہنا تھا۔

تھوڑی بہت کور کسر ہر شاعر اور ادیب کی تحریر و کلام میں رہ جاتی ہے بحیثیتِ مجموعی طور پر "نکاتِ حیات" دلکش اور فکر آمیز رباعیات و قطعات کا مجموعہ ہے، توقع ہے کہ اس کتاب کی خاطر خواہ پذیرائی کی جائے گی۔

پانی کی زبان

از :- مظفر حنفی، ضخامت ۱۴۶ صفحات (مجلد، گرد پوش کے ساتھ)
ملنے کا پتہ :- شب خون کتاب گھر ۳۱۳ رانی منڈی الہ آباد (بھارت)

جناب مظفر حنفی شعر و سخن کی بزم میں "یکے از تازہ واردان بساطِ ہوائے دل" ہیں، مگر ان کی شاعری کا تعارف شہرت کی حد تک پہونچ گیا ہے۔ مظفر صاحب کا کلام ـــــ پانی کی زبان ـــــ ہمارے سامنے ہے، جس کا پروفیسر احتشام حسین سے انتساب کیا گیا ہے! "پیش لفظ" شاعر کا اپنا ایک شعر ہے ـــ

غلطی سے ہٹ کے ندرت و جدت کو ناپئے
ہم اور چیز، غالب و میر و فراق اور

"ناپئے" اس شعر میں غلط استعمال ہوا ہے، شعر و سخن کی ندرت و جدت اور محاسن کو ناپا نہیں جاتا، دیکھا، جانچا، پرکھا اور سمجھا جاتا ہے! اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر اظہار خیال میں زبان اور روزمرہ کی پروا نہیں کرتا۔

مظفر حنفی کی غزلوں میں یقیناً چونکا دینے والے اشعار ملتے ہیں، بعض شعر ایسے بھی ہیں، جو خیال و اظہار کے اعتبار سے ابھرتے ہیں ان میں خاصی کشش اور تاثیر پائی جاتی ہے! منتخب اشعار :-

دھواں دھواں سی فضا گرد گرد سا ہے افق　　سمندِ شوق یہ کس کا خلاؤں سے گزرا
ہوا کی چاپ سنے گا تو ٹوٹ جائے گا　　سکونِ صبح کا عالم حباب جیسا ہے
جامد نہ رہے زیست اگر شہر میں آجائے　　مجنوں سا کوئی ایک ہی سودائی صحرا
اس طرح کے بیشتر جوڑے ملے بازار میں　　یہ شترگربہ کا حال وہ شکستِ ناروا
احباب محبت کو بھی چیز نہ جانیں　　اس جذبۂ نازک سے کوئی کام لیا جائے
شاید کہ بہار آئے، جنوں پھر سے جواں ہو　　کچھ روز ابھی اور نہ دامن کو سیا جائے
جنم دے گی نئے اشعار کو دن کے اجالے میں　　وہ سرگوشی جو مجھ سے کی ہے راتوں کی خموشی نے
اب آشیاں جلے ہوں کہ چھٹکے ہوں ماہتاب　　اک روشنی سی آتی ہے باغِ مراد میں
ایسا ہوا کہ آج تری یاد آگئی　　ہم نے بھی جشنِ خونِ تمنا منا لیا
پرچھائیوں کا رقص تماشا نہیں کوئی　　کرنوں کو ماہتاب نے واپس بلا لیا
احباب کے فریب سے منسوب ہیں تو کیا　　ہیں ماحصلِ حیات یہی چند واقعات
حیات یہ ہے تو کچھ اور نام دو اس کو　　عجب طرح کا پریشان خواب سا دیکھو
پاؤں ہیں پل صراط کے اوپر　　سر پہ تلوار سی لٹکتی ہے
زندگی ہے کہ موت ـــ پہچانو　　ایک پرچھائیں سی بھٹکتی ہے
وہ اندھیرے بھی مقدس ہیں دیار نور میں　　روشنی کے واسطے دامن جو پھیلاتے نہیں
عکس حیرت مانگتا ہے کچھ سوالوں کا جواب　　اس لئے وہ آئینے کے سامنے آتے نہیں
ختم کبھی جو سانس بھی لی ہے سکون سے　　نشتر سا ایک دل میں اترتا چلا گیا
ہم کو ہمارے حال پہ دنیا جو چھوڑ دے　　ہم بھی مخل نہ ہوں گے کسی کے سکون میں

کھلتے ہیں پھول دل میں تری یاد کے لطیف   آتش کدہ تو دیر ہوئی سرد ہو گیا

دوسرا رخ :-

جانے کسی حسین کی تصویر تھی کہ خط   کاغذ بلک رہا ہے، کسی نے کچل دیا   (ص ۶)

کاغذ خشک ہوتا ہے اُس کو پرزے پرزے کیا اور مسلا جا سکتا ہے، کاغذ سے "کچلنے" کی نسبت درست نہیں کاغذ کا "بلکنا" اس عیب پر مستزاد !

الفاظ کو خیال کی تتلی چوم گئی   کچھ دیر لطفِ رنگ اُٹھا کر مسل دیا

مصرعہ اولیٰ تتلی کے پروں کی طرح حسین ہے مگر مجموعی طور پر شعر مہمل ہے ! شاعر غالباً یہ کہنا چاہتا ہے کہ خیال کی لطافت اور نزاکت الفاظ کے قالب میں گھٹ کر رہ گئی اور اس کا اچھوتا پن جاتا رہا۔ مگر بات اسی طرح کہی گئی ہے کہ الفاظ نے خیال کی تتلی کو مسل دیا۔ "کچھ دیر لطفِ رنگ اٹھا کر" یہ نفسیاتی طور پر خلافِ واقعہ ہے کہ الفاظ بس تھوڑی دیر خیال سے لطف اندوز ہوتے ہیں پھر خیال کو مسل دیتے ہیں !
مصرعہ اولیٰ میں "نے" اور مصرعہ ثانی میں "کو" آنا ضروری تھا۔ الفاظ نے خیال کی تتلی کو مسل دیا۔

پلنگ پہ جو میں بتی بجھا کے لیٹ گیا   خیال صبح بھی پہلو میں آکے لیٹ گیا
تنہا کھڑا تھا جو برگد کا پیڑ صدیوں سے   ندی کے پاس وہ ٹانگیں اٹھا کے لیٹ گیا

مظفر حنفی کے غزلوں میں اس قسم کے مزاحیہ اشعار بھی ملتے ہیں جو غزل کی ثقاہت کو مجروح کرتے ہیں اوپر نقل کئے ہوئے دوسرے شعر میں تو خاصہ ذم پایا جاتا ہے !

جگر کو خار، نظر کو گلاب جیسا ہے   سیاہ رات میں وہ آفتاب جیسا ہے   (ص ۱۲)

"وہ" سے مراد کوئی شخص ہی ہوگا۔ سیاہ رات میں محبوب کا چہرہ آفتاب جیسا ہے اور وہ آفتاب عجیب قسم کا ہے جو نظر کو "گلاب" جیسا لگتا ہے اور جگر کو خار! آخر یہ کیا مشاہدہ اور کیسا احساس ہے ؟

نگہ کے ہونٹ تجھے کس مقام سے چومیں   کہ تو تو سر سے قدم تک شراب جیسا ہے

مصرعہ اولیٰ میں "ذم" پایا جاتا ہے۔

پاس احساس کے دامن سے لپٹ جاتی ہے   ضبط کی ڈور مرے ہاتھ سے کٹ جاتی ہے   (ص ۳۰)

اگر اُردو غزلوں میں اس انداز کا رواج ہوگیا تو اُردو غزل کا حلیہ بگڑ کر رہ جائے گا ! غزل کا مخصوص لہجہ منفرد اسلوب اور خاص آہنگ ہے۔

اُنگلی پکڑ کے چاند مرے ساتھ ہو لیا   مشرق میں "من" کو ڈھونڈ رہا ہے سنپولیا   (ص ۲۶)

دور کی کوڑی لانے اور نئی بات کے شوق میں شعر کو معمہ اور چیستان بنا دینا، کوئی پسندیدہ فعل نہیں ہے۔

کاجل کی دلدلوں سے گزر جاؤ بے خطر   بہتی ہوئی ندی میں اگر ہاتھ دھو لیا   (ص ۲۶)

"کاجل کی دلدل" سے کیا مراد ہے ؟ پھر بہتی ندی میں (بہتی گنگا میں) ہاتھ دھو لینا اُردو کی مخصوص ضرب المثل ہے اُس کا اس شعر کے مفہوم سے آخر کیا ربط و نسبت ہے ؟

جھوم کر کیلے کے پودے نے بلایا تھا مجھے   وہ بھی نکلا کوئلے کی گرد میں لتھڑا ہوا   (ص ۲۸)

شاعری کے ساتھ اتنا سفاکانہ مذاق! پھر "لتھڑا" کو "لتھرا" ("ر" کے ساتھ) کتابت کیا گیا ہے، کوئلے کی گرد میں کوئی چیز

ٹ سکتی ہے، "بتھر" نہیں سکتی۔ "بتھرنے" کے لئے کسی گیلی چیز کا ہونا ضروری ہے!

الفاظ کی شدید نزاکت معاف ہو — معرفے کے ہاتھ میں ہر جذبہ کی تابش ہو (ص ۴۲)

الفاظ دیکھنے میں حسین رنگین مگر معنی کے لحاظ سے شعر چیستاں؟

ٹوٹنے والا ستارہ کس قدر تابندہ تھا — سوچ کر اس سیم تن کو جھرجھری سی آگئی (ص ۴۶)

ٹوٹنے والے ستارے کے دیکھنے سے محبوب سیم تن کے بدن میں جھرجھری کیوں آگئی؟ کوئی قرینہ، معنوی ربط، سمجھ میں آنے والی کیفیت؟

ٹوٹی ہوئی چوڑی کی مزے دار کہانی — خوابیدہ گھڑی جاگ پڑی آنکھ مسل کر (ص ۴۸)

کس کی ٹوٹی ہوئی چوڑی؟ مزیدار کہانی لانے کی کیا تک تھی؟ گھڑی سے کیا وقت بتانے والی گھڑی مراد ہے یا وقت کے معنی میں "گھڑی" لائی گئی ہے ——— پھر نیند اڑانے اور جاگنے کے لئے ہتھیلیوں سے آنکھوں کو ملا جاتا ہے، مسلا نہیں جاتا ———

آخر یہ کیا شاعری ہے؟

بھلا رہا تھا درد کوئی یاد آگیا — پلکوں پہ شام غم کے ستارے سجا گیا (ص ۵۲)

بھلایا کرتی ہے مگر درد کے بھلانے کو گوارا بھی کر لیا جائے ——— تو مصرعہ ثانی میں "شام غم" کا کیا کیا جائے ——— شام غم کی پلکوں پہ آنسو (ستارے) کہاں سے آگئے؟ "یاد" عاشق کو آئی تھی یا شام غم کو!

میرا مشاہدہ ہے کہ اکثر غیور لوگ — رکھتے ہیں اپنے ساتھ طرحدار سی فضا (ص ۵۹)

فضا طرحدار بھی ہوتی ہے؟ اس پر مستزاد غیور لوگوں کا اُسے ساتھ رکھنا! اس اونٹ کی کوئی کل بھی سیدھی نہیں ہے۔

بے چین دل کے ساتھ سلگنے لگی ہے رات — شہ رگ پہ رکھ دیا ہے تری آرزو نے ہاتھ (ص ۶۲)

آرزو نے شہ رگ پر کس طرح ہاتھ رکھ دیا؟ مصرعہ اولی بھی محل نظر ہی ہے۔

مہینوں سے جو خالی تھا وہ کمرہ اٹھ گیا شاید — یہ الھڑپن، یہ معصومی نئے معلوم ہوتے ہیں

سمٹ آئی تھی کس اپنائیت کے ساتھ وہ کٹیا — عمارت میں تو ہم دیکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں (ص ۶۳)

شاذ عارفی رام پوری نے بعض غزلوں کو "گھریلو" بنانے کی کوشش کی تھی۔ اُن میں ایک طرح کا قرینہ تو پایا جاتا تھا۔ مگر منظر حنفی کے یہاں وہ "قرینہ" "بے تکے پن سے بدل گیا ——— "معصوم" سے "معصومی" بنا کر اس شعر میں آخر کیا کام لیا گیا ہے؟ "کٹیا کا سمٹ آنا" اور وہ بھی "اپنائیت" کے ساتھ .... اس بے تکے پن کی کوئی حد و نہایت نہیں!

ہے منعکس حباب پہ گہرائیوں کا ناچ — ہر جشن ماہتاب ہے پرچھائیوں کا ناچ (ص ۸۱)

دریا، سمندر، تالاب یا چشمہ کی گہرائیاں کیا ناچا بھی کرتی ہیں! پھر حباب میں گہرائیوں کے ناچ کا منعکس ہونا، عجیب تر!

سانس روکو زور سے پلکیں نہ مارو چھپ رہو — ایک سایہ پھر اُدھر آتا ہے یارو چھپ رہو (ص ۸۷)

کسی بھوت کا سایہ معلوم ہوتا ہے، جس سے چھپنے کی تاکید کی جا رہی ہے۔

اس کھردری غزل کو نہ یوں منہ بنا کے دیکھ — کس حال میں لکھی ہے مرے پاس آکے دیکھ (ص ۹۱)

غزل کھردری اور چکنی بھی ہوتی ہے ——— واہ مظفر میاں!!

وہ مرا نام کچھ اس طرح لیا کرتے ہیں — کوٹ میں جیسے کوئی پھول سجائے جائے (ص ۹۵)

"نام لینے" اور "کوٹ میں پھول سجانے" میں کوئی دور کا بھی ربط پایا جاتا ہے؟ یہ کیسے شاعر ہیں جو "تشبیہ" اور "وجہ شبہ" کے

تقاضوں اور اصولوں کو نہیں جانتے !

ترازو ہی بھی نہیں تو لنا سمندر کا   اگر حباب کا میزان ٹوٹ جاتا ہے   (ص ۹)

سمندر تولا بھی جا سکتا ہے ! اور وہ بھی حباب کی ترازو میں ؟ اہمال ہی اہمال ، پھر "میزان" مونث نہیں مذکر ہے۔

اللہ رے قدر میرے گناہوں کی روزِ حشر
تعظیم کو کھڑی ہوئی میزان حساب کی

یہ امیر مینائی کا شعر ہے ، دوسرے شعراء نے بھی "میزان" کو مونث ہی نظم کیا ہے۔

نقش گل سیاہ بکھرتا چلا گیا   گہرائیوں سے خوف ابھرتا چلا گیا   (ص ۱۰۷)

ان نام نہاد "ترقی پسندوں" نے "اہمال" کو "صنعت" بنا دیا ہے ــــ فریاد !

گرمی جو آگئی تری یادوں کے خون میں   پرچھائیوں نے چھوڑ لئے سر جنوں میں   (ص ۱۱۵)

یادوں کا خون بھی ہوتا ہے ؟ پھر یادوں کے خون میں گرمی آنے سے ، بے چاری پرچھائیوں نے سر کیوں چھوڑ لئے ؟!

بستر ترے بغیر وہ بستر نہیں رہا   نرمی ہے روئی میں نہ وہ گرمی ہے خون میں   (ص ۱۱۵)

یہ غزل کے ساتھ مذاق نہیں تو اور کیا ہے۔

آسمان چھت ہے تو بستر فٹ پاتھ   کون کہہ سکتا ہے بے گھر ہم کو   (ص ۱۱۲)

یہ غزل کا نہیں نظم کا شعر ہو سکتا ہے۔

گر پڑے گا پچھاڑ کھا کر دن   شب کی گردن مروڑتے جاؤ   (ص ۱۱۳)

شب کی گردن مروڑنا ــــ یہ آخر کیا کنایہ اور استعارہ ہے ۔ پھر شب کی گردن مروڑ دینے سے بے چارہ دن پچھاڑ کھا کر کیوں گر پڑے گا ؟

جو ہم چکنی غزل کہہ دیں جو توصیف بتاں کر لیں   تو مطلع ہی سے اس محفل کو اپنا راز داں کر لیں   (ص ۱۱۵)

"کھردری غزل" کے بعد اس شعر میں "چکنی غزل" بھی آگئی ۔ چکنی غزل کہنے اور بتوں کی توصیف و ثنا کرنے سے محفل کو راز داں کس طرح بنا لیا جائے گا ، اس میں "راز داری" کی کیا بات ہے ؟

دن کے زخموں کا مداوا درکنار   رات ہے یا روشنی کا آبشار   (ص ۱۲۴)

مطلع ــــ دولخت ــــ ہے ــــ "درکنار" مصرعہ اولیٰ میں کس بری طرح کھٹکتا ہے۔

شہرت کے آسمان پہ اڑنے لگا تھا میں   رستے میں بے حسی کا خلا مل گیا مجھے   (ص ۱۲۴)

بے حسی کا بھی کوئی خلا ہوتا ہے ، جو شہرت کے آسمان کے رستے میں ملا کرتا ہے !

غوغا کھٹ پٹ ، چیخم دھاڑ   اُف آوازوں کے یہ جھنکاڑ   (ص ۱۲۵)

اس سے قطع نظر کہ اس قسم کے مصرعوں کو "غزل" سے منسوب کرنا غزل کو بدنام اور تباہ کرنا ہے ــــ مصرعہ اولیٰ میں ٹھکانے کے الفاظ بھی نہیں آتے ــــ "دھاڑ" تنہا کون بولتا ہے "مار دھاڑ" بولتے اور لکھتے ہیں ! "چیخم" بھی "چیخ" کے مترادف کی حیثیت سے مفرد نہیں بولا جاتا۔

اپنا گنبد چاند سنبھال   میرے سر پہ دھول نہ جھاڑ

"چاند" تو مونث ہے "گبھی چاند" نظم کرنی تھی۔

نیکی جو بھول سے کبھی سرزد ہوتی تو ہیں — دریا میں ڈال آیا خطاؤں کے سامنے (ص ۱۴)

"نیکی کر دریا میں ڈال" یہ ضرب المثل تو اپنی جگہ درست ہے — لیکن "خطاؤں کے سامنے" لانے کا کیا قرینہ تھا! دریا کو "خطاؤں" سے کیا واسطہ؟

لب بھی دبانے میں یوں مزہ نہ آئے گا — خوشنما پرندوں کو شاخ پہ پھدکنے دو (ص ۱۱۵)

اگر اردو میں اس قسم کی شاعری ہوتی رہی تو لوگوں کو اردو زبان سے نفرت ہو جائے گی،

"نئے خدا کا قہر" — ایک گیت ہے، اس کے بول سنئے —

بوڑھا برگد چیخ رہا ہے "مجھے پھول نہ توڑ"
مسجد کی مینار پہ لٹکی دو بیلوں کی جوڑ
مندر کی دیوار پہ چھپاں لڑشکی کا ناچ
الھڑ دوشیزہ بھڑکاتی عطر حنا کی آگ (ص ۵۹)

"دو بیلوں[1]" سے جانور مراد ہیں یا "بیلیں" (CREEPER) مراد ہیں — پھر ان "بیلوں" کی جوڑ مسجد کی مینار پر لٹکی ہوئی ہے اس سے شاعر کی آخر مراد کیا ہے! مسجد کی تحقیر، تنقید، طنز یا تعریف و توصیف — مسجد کے مقابلہ میں مندر کی دیوار پر "لڑشکی" کی تصویر نہیں بلکہ اس کا ناچ چھپاں ہے، "ناچ" کسی چیز پر کس طرح چھپاں یا آویزاں ہو سکتا ہے! ایسی انمل اور بے جوڑ باتیں حیرت ہے کہ ایک شاعر کے ذہن میں کس طرح آتی ہیں۔

"عطر" کی لپٹ تو ہوتی ہے، مگر "عطر حنا" کی آنچ کہنا وجدان کو کھٹکتا ہے! پورا گیت مفہوم اور اظہار کے اعتبار سے "کاواک" ہے۔

ہر غزل کے بعد ایک "بے سروپا نظم" ہے، سب سے پہلی نظم کا عنوان — یا اخی —ا— ہے ء۔

کارخانے سے نکل کر پارک میں آیا تو کیا
لاؤڈ اسپیکر پہ بھاشن
وانتخابی سلسلہ،
یہ اٹھائی ڈاکٹر ہے
وہ مداری
آپ دو پشتوں کے بھوکے
بول لیجئے! پالش کروں سرکار
مالش ہی کرالو
کوٹ میں بیلے کی یہ کلیاں سجا لو

---

[1] اس فکر و مزاج کے شاعروں کے یہاں "بیل" (جانور) بھی کسی خیال کی "علامت" ہو سکتے ہیں مگر "عطائی" بگڑ املا ہے اللف نہیں رہا ہے۔

ر پانچ پیسے فی کلی ،
گھڑگھڑاہٹ ، سنسناہٹ ، چیخ ......
شور وغل کا حملہ
آج اتوار بھی ضائع ہو گیا واحسرتا !
ہر طرف آواز دیتا ہے مجھے کرو ندا

اس "بے سروپا نظم" میں کوئی نغمگی ، کوئی پیغام ، کوئی فلسفہ ؟ یہ نہ سہی تو لفظوں کے دروبست ہی کا لطف ہوتا ، اس پر اگر بار یک قسم کی "علامتیت" اور "رمزیت" ہے تو وہ ایک اوسط درجہ کے دماغ کی سمجھ سے ماورا ہے ، شروع سے آخر تک نظم دیوانہ کی بڑ اور باولے آدمی کی بکواس ! اس کتاب کی تمام نظموں کا قریب قریب یہی رنگ ہے ! "ترقی پسندوں" پر طنز کس منہ سے کی جائے جب سنجیدہ و تعمیر پسند رسالوں تک میں اس قسم کی بے تکی نظمیں چھپتی ہیں !

مظفر حنفی صاحب اگر نام نہاد "ترقی پسند شاعری" کے اثرات اپنے دل و دماغ سے ہٹا کر شعر کہیں تو اُن میں اس کی پوری صلاحیت موجود ہے کہ وہ اچھی نظمیں اور دلکش غزلیں تخلیق کر سکتے ہیں ، خود ان کے اس مجموعے میں ایسے اشعار ملتے ہیں ، جو اُن کی فنکارانہ شخصیت کو اُجاگر کرتے ہیں !

شعلۂ خاموش

از :- کالیداس گپتا رضاؔ ۔ ضخامت ۲۰۸ صفحات (آرٹ پیپر) دیدہ زیب کتابت و طباعت ، پائدار حسین جلد سنہری لوح) قیمت ۵ روپے ۔ ملنے کا پتہ :- صبح اُمید ، بلاسس روڈ ، بمبئی ۳

جناب کالیداس گپتا رضاؔ بھارت کے سپوت ہیں مگر بیس سال سے کینیا (مشرقی افریقہ) میں مقیم ہیں اور پرائے دیس میں اُردو زبان و ادب کی شمع روشن کئے ہوئے ہیں ، صفحہ ۱۳۹ پر اُن کی ایک نظم (تعارفی قطعہ سے چند اشعار) ہے ، جس کے حاشیہ میں یہ عبارت درج ہے

" ۱۲ دسمبر ۱۹۵۹ء کو "بزم سخن" نیروبی کینیا کے ایک مشاعرے میں پڑھے گئے "

کینیا میں اردو اور مشاعرے — یہ دلیل ہے اُردو زبان کی مقبولیت اور ہمہ گیری کی ! بھارت میں اس کے مٹانے کی کوشش کی گئی اور پاکستان میں اُردو سے بے پروائی برتی گئی ۔ مگر اللہ تعالیٰ کے فضل سے اُردو زبان آج بھی زندہ اور پائندہ ہے ۔

"شعلۂ خاموش" پر آنریبل جسٹس چانن سنگھ جج ہائی کورٹ کینیا نے "پیش نامہ" تحریر فرمایا ہے جو رضاؔ صاحب کے کلام کا حسین تعارف ہے ، جسٹس چانن سنگھ کا یہ مقالہ اُن کے ذوقِ شعر و ادب اور ناقدانہ صلاحیتوں کا آئینہ دار ہے ، جسٹس موصوف نے دلنشین انداز میں "شعلۂ خاموش" کی بعض نظموں کا تجزیہ کیا ہے ، اس کے بعد جناب شکیل بدایونی کا مختصر سا پیش لفظ (حرفے چند) ہے

کالیداس گپتا رضاؔ نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے ، ان کے اس مجموعے میں نظموں اور غزلوں کے علاوہ قطعے ، رباعیاں یہاں تک کہ گیت بھی ملتے ہیں وہ ایک پرگو ، مشاق اور حساس شاعر ہیں ۔ اُن کی چند نظمیں کینیا (KENYA) کے ماحول کی بھی عکاسی کرتی ہیں اُن کے کلام میں وطن سے محبت کے جذبات بھی پائے جاتے ہیں ! انہوں نے اللہ تعالیٰ کی حمد بھی بیان کی ہے ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت کہنے کی سعادت بھی اُن کے حصہ میں آئی ہے ، کس عقیدت کے ساتھ کہتے ہیں —

شگفتہ ہے کلی کلی حسین پھول پھول ہے
یہ روزِ بے مثال ہے ولادتِ رسولؐ ہے

اُن کی ایک نظم کا عنوان "معرکہ بلا" بھی ہے ، کرشن کنہیا ، گورونانک ، رنجیت سنگھ ، جھانسی کی رانی ، دلکشم بائی یہاں

تک کہ ہیرو بقال پر بھی انہوں نے نظم کہی ہے، غالباً یہ پہلے ہندوستانی شاعر ہیں جنہوں نے ہیرو بقال کو ہیرو کی حیثیت سے پیش کیا ہے!
رضا کی نظموں میں "آپ بیتی" کا یہ رنگ ہے کہ ایک نظم میں اپنی بیوی سے جو بہت دنوں سے میکے میں ہے، شکوہ کیا ہے، اور اس شکوہ کی "لے" اتنی تند و تیز ہو گئی ہے۔

آنا تم ارتھی پر آنا
نفرت کے پھول چڑھا جانا

"شعلۂ خاموش" کے ایک باب کا عنوان "ماخوذات" ہے، اس میں وہ نظمیں (رماں کا خواب — فلسفۂ محبت، زندگی کا مسخرہ پن) درج ہیں، جو دوسروں کے افکار و خیالات سے ماخوذ ہیں! رضا صاحب علامہ اقبال ہی سے نہیں رابندر ناتھ ٹیگور سے بھی متاثر ہیں وہ نظمیں جن میں "گیت" کا انداز ملتا ہے اُن کے عنوانات خالص "سنسکرتی" ہیں۔ پیتھو پہ درشک (رہنما) اور دوڑھ نشچہ (رپکا ارادہ)!

منتخب اشعار:-

ہر ڈال پھلوں سے بوجھل سی ہر پات پہ موتی شبنم کے
ہر پنچھی مست ہواؤں میں گاتا تھا سروں میں پنچم کے

عشق وہ شے کہ سکھایا مجھے جینا جس نے — ہجر وہ درد کہ جس نے مجھے برباد کیا
چشم ساقی تو رہی مست اُسے کیا معلوم — کون ہشیار رہا، کون نہ ہشیار رہا
پھولوں میں دلکشی ہے نہ پتوں میں تازگی — مالی بدل گیا ہے کہ موسم بدل گیا

اے دل! نعرہ دین و حرم کا کون سُنے گا آج کے دن
ایماں والوں کی نہ چلے گی دور ہے بے ایمانوں کا

ہم وہ نہیں جو بھاگ کے ساحل کی لیں پناہ
موجوں کے ساتھ ساتھ لڑیں گے بھنور سے ہم

حُسن کے قرب سے مسرور ہوا جاتا ہوں — دین و دنیا سے بہت دُور ہوا جاتا ہوں
زندگی سجدۂ مسلسل ہے — میری صورت پرستیاں توبہ
ہائے وہ پھول جس کی ہر پتی — تیرے ہاتھوں بکھر گئی ہو گی
میں صدقے ترے اے سرشکِ ندامت — تو موتی کا موتی ہے پانی کا پانی
آنے والے دور میں اُمید خوشیوں کی بجا — عزم راسخ ہے تو سب کچھ اپنے مستقبل میں ہے
تم آتے ہو کہ نئی روح تن میں آئی ہے — نئی ہوا نئی خوشبو بدن میں آئی ہے

اتنے اچھے شعروں کے ساتھ اس قسم کے سطحی اور بھرتی کے شعر بھی ملتے ہیں۔

بگڑے بگڑے نصیبے پھونکا دیا انہیں — لینے لگے تھے مرے ارمان ظفر کے خواب
آبگینۂ زندگی سے بچ کر اے حریص — ورنہ پھنس جائے گا تو مثلِ مگس
اتفاقاً آ گئے ہیں شیخ جی — کیوں نہ اُن کو بزم میں شامل کریں

بے گنہ ہو تو اٹھو اور جھکا لو گردن — مغز جلاد سے ہر وہم نکل جانے دو
دل میں دنیا اُتر گئی ہوگی — روح دیندار مرگئی ہوگی
جو ساتھ چھوڑ گیا تھا مرا تغنفر ہے — خبر ملی ہے کہ وہ اب بھی تلاش راہ میں ہے
زندگی کیا ہے تغافل کیش گذاروں میں ہے — پائے بے جنبش کو تحریک عمل خاروں میں ہے
چین کیوں بے چین کرآنے لگا — کیا جواب باثواب آنے کو ہے

باصواب" کا املا "باثواب" یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے)

پروانو! کھلے بندوں نہ تم خود کا جلانا — عشاق بھری بزم میں رہ جائیں گے چھٹ کر

کالیداس گپتا رضا مشہور استاد فن ابوالفصاحت (پنڈت لبھورام) جوش ملسیانی سے نسبت تلمذ رکھتے ہیں، اس لئے ان کے یہاں عروض کی خامیاں نہیں پائی جاتیں۔ توقع ہے کہ اردو زبان وادب سے شغف رکھنے والے صاحب" شعلۂ خاموش" حوصلہ افزائی کا فرض انجام دیں گے۔

سوشلزم کی ناکامیاں — از :- اسعد گیلانی ،ضخامت ۸۰ صفحات ،قیمت پچاس پیسے۔
ملنے کا پتہ :- ادارۂ ادب اسلامی ،سرگودھا

"سوشلزم" آج کل کا چلتا ہوا نعرہ ہے؛ لوگوں نے "مساوات" کا نام حسن رکھا ہے؛ بہت کم ایسے ہیں جو زندگی میں اس "مساوات" سے واقف ہیں جو فطرت کے حدود میں رہ کر ممکن ہے!

"سوشلزم" اقتصادی مساوات کے نام پر ایک فریب ہے خود اس نظام میں اور اس کے فلسفہ میں بڑی خرابیاں، کوتاہیاں اور خامیاں پائی جاتی ہیں۔ جناب اسعد گیلانی نے سوشلزم کا تجزیہ کرکے بتایا ہے کہ یہ نظام عملاً ناکام ہو چکا ہے اور" سوشلزم" سرمایہ دارانہ نظام ہی طرح کا ایک مستبد نظام ہے!

یہ کتابچہ (سوشلزم کی ناکامیاں) زیادہ سے زیادہ اشاعت کا مستحق ہے، نئی نسل کو خاص طور سے اس کا مطالعہ کرنا چاہئے اور عام کی خاطر اس کتابچہ کے سو نسخوں کی قیمت بائیس روپے رکھی گئی ہے۔

اسلام یا ادیان — از :- احمد کمال عمر (ایم، بی، پی، ایس) ضخامت ۹۶ صفحات
ملنے کا پتہ :- مصنف سے اے/۵ ۶۷ نیشنل بی ایریا، کراچی ۳۸

دین کا مفہوم —— دین کی تاریخ سمجھنے کا طریقہ —— اسلام، ماضی، حال اور مستقبل کا واحد الٰہی ضابطہ —— اسلام اور وحدت عالم انسانی —— آخری نبیؐ کا انکار سلسلۂ نبوت کا انکار ہے —— موجودہ مسلم قوم —— اس کو سمجھ کر پڑھنے کے لئے چند ہدایات۔

یہ اس کتابچہ کے چند اہم عنوانات ہیں، ڈاکٹر احمد کمال عمر نے خاصے دلنشین انداز میں "اسلام" کی خصوصیات کو پیش کیا ہے جو بات کہی ہے پورے یقین کے ساتھ کہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کے سوچنے کا طریقہ "مفکرانہ" ہے، اس فکر کی جھلکیاں اس کتابچہ میں ملتی ہیں۔

ہفت روزہ "جمعیتہ ٹائمز" کا ضبط تولید نمبر — سرپرست :- حضرت مولانا مفتی محمد ضیاء الحق - ایڈیٹر :- امیر الحسن ،ضخامت ۶۴ صفحات۔
قیمت ایک روپیہ، ملنے کا پتہ :- ہفت روزہ "جمعیتہ ٹائمز" بازار مٹیا محل دہلی

ہفت روزہ "جمعیتہ ٹائمز" ہندوستان کے مسلمانوں کے جذبات کا بیباک ترجمان اور دینی شعائر کا مبلغ و محافظ ہے یہ جریدہ بھارت کے بعض سرکاری مولویوں کے کردار و اعمال کو بھی بے نقاب کرتا رہتا ہے، بھارت کی سیاست پر اس کے تبصرے بے لاگ اور جرأت مندانہ ہوتے ہیں۔

"جمعیتہ ٹائمز" نے "ضبط تولید نمبر" شائع کیا ہے، جس کے سرورق پر حضرت مفتی مولانا کفایت اللہ مرحوم کا یہ فتویٰ درج ہے۔

"برتھ کنٹرول یعنی ضبط تولید کے لئے کسی دوا کا استعمال کرنا اور کوئی جائز تدبیر عمل میں لانا اگر عورت
کی کمزوری یا صحت کی بنا پر ہو تو مباح ہے اگر کثرت اولاد کے خوف سے یا عورت کے حسن کے قائم رکھنے
کے لئے ہو تو یہ مقاصد ناقابل اعتبار ہیں اور ضبط تولید کے لئے اباحت نہیں بن سکتے"

اس کے بعد سید عبداللہ بخاری نائب امام شاہی جامع مسجد (دہلی) کا وہ فتویٰ منقول ہے جس کی علماء ہندوستان نے مخالفت کی ہے، فتویٰ مذکور اس خاص شمارے میں ان جلی "سرخیوں" کے ساتھ شائع ہوا ہے۔

"یہ ہے نائب امام جامع مسجد دہلی کا وہ گمراہ کن فتویٰ
جو
حکومت کی خوشنودی کی خاطر دیا گیا ...."

علماء سوء نے ہر دور میں بادشاہوں اور حکومتوں کی خوشنودی کے لیے اسی پست کردار کا مظاہرہ کیا ہے جس کی نمایاں جھلک سید عبداللہ بخاری کے فتوے میں نظر آتی ہے۔

"ضبط تولید نمبر" کے مضامین اپنے موضوع پر خوب ہیں، ہر مضمون میں عقلی اور نقلی دلائل کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے کہ "ضبط تولید" دینی اور اخلاقی نقطہ نگاہ سے ناپسندیدہ ہے اور اس کے نتائج انسانیت کے حق میں مضرت رساں ہیں، اس شمارے میں جامعہ ازہر کے پرنسپل کا فتویٰ درج کیا گیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ "تحدید نسل ممنوع ہے"

جمعیتہ ٹائمز نے بھارت کے بے دین ماحول میں صدائے حق بلند کر کے عزیمت ایمانی اور فراست دینی کا ثبوت دیا ہے۔

ماہنامہ جان نثار امرتسر کا "وفا نمبر" | مدیر:- رام لال بھنشالی، مدیر اعزازی: مہیندر پال، ضخامت ۸۰ صفحات قیمت فی پرچہ ۵۰ پیسے۔ (متعدد تصاویر کے ساتھ) ملنے کا پتہ:- ماہنامہ جان نثار ۸۲ سبھاش نگر، گنڈ شیر سنگھ، امرتسر

پنڈت میلا رام وفا مشہور صحافی اور معروف شاعر ہیں، موصوف کو "لسان الاعجاز" کا خطاب اور "راج کوی" کی پدوی دی گئی ہے جناب میلا رام وفا کی پوری زندگی اردو شعر و ادب کی خدمت میں گزری ہے۔

ماہنامہ "جان نثار" (امرتسر) نے "وفا نمبر" شائع کر کے پنڈت میلا رام وفا کی شخصیت اور خدمات کے اعتراف کا فرض انجام دیا ہے۔

"وفا نمبر" کا آغاز "جشن وفا لکھنؤ" کی دلچسپ روداد سے ہوتا ہے اور اختتام سپاسنامہ پر جو "جشن وفا" لکھنؤ کی تقریب (۱۹۶۲ء) کے موقعہ پر آں کی خدمت میں باشندگان لکھنؤ کی جانب سے پیش کیا گیا تھا۔ سپاسنامہ میں وفا کو ــــ "پنجاب کا حسرت موہانی کہا گیا ہے"

پنڈت میلا رام وفا جیسے صلح پسند اور امن دوست ہندو ہی بھارت کو تعصب کی وبا سے نجات دلا سکتے ہیں اور اُردو زبان "پریم اور ایکتا" کی فضا پیدا کرنے میں سب سے زیادہ موثر عنصر ثابت ہو سکتی ہے کہ یہ "سب کی زبان" ہے۔

نیشنل اور الفرڈ
ILFORD
ILFORD
HP3 FILM
ILFORD
HP3
ROLLFILM
ہمہ وقت
آپ کی
مسرتوں
کے ساتھی!
رضوی برادرز لمیٹڈ
کراچی —— لاہور —— ڈھاکہ

۱۹۶۹

گرمیوں میں
بہار
کا لطف!
گرمی کی زحمت اور سختی سے بچنے کے لئے
روح افزا کی تازگی بخش تاثیر سے فائدہ اٹھایئے اور
اس موسم میں اس کا مسلسل استعمال رکھئے۔ یہ خوش ذائقہ
فرحت بخش مشروب ہر شخص کو بھاتا اور گرمی میں
بہار کا سماں پیدا کرتا ہے۔
کوئی اور مشروب اس کا مقابل نہیں۔
روح افزا
مشروب مشرق
ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان
کراچی - لاہور - ڈھاکہ - چٹاگانگ